سالنامہ
Talat

Leather industry is the oldest in India.

In all its aspects, it is the largest industry in the country.

Its workers, over fifteen lakhs, are amongst the poorest. For centuries, the
ered from neglect.

Bharat Leather Corporation has been established as a national organisation
eve the full potential of the industry and improve the lot of its workers.

It has set about its task in right earnest.

A beginning has been made in marketing the products of artisans and
r quality by giving them new designs. A national leather emporium has
ted in Delhi. More are to follow in capital cities.

Improved shoe lasts in larger numbers will now be supplied through the
e Last Factory at Agra taken over by Bharat Leather Corporation.

A number of other far-reaching schemes to benefit the industry are on the

Soon the leather industry will be -

OLDEST, BIGGEST...............but STRONGEST

We, in India will rightly be proud of it.

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

سالنامہ

۱۹۶۸

○ جلد ۱
○ شمارہ ۱

○ ایڈیٹر : سید مصطفےٰ کمال
○ مجلس ادارت :
حمایت اللہ ٭ منظور احمد ٭ مسیح انجم

مجلسِ ادارت : راجندر سنگھ بیدی ٭ بھارت چند کھنّہ ٭ خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر ٭ مُجتبیٰ حسین

○ جنرل مینجر : سمیع جلیل
○ مینجر : بشیر انور

{ کارٹون سرورق :
طالب خوندمیری }

○ طباعت :
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان ۔ حیدرآباد
○ بائنڈنگ :
محمدیہ بائنڈنگ ورکس روبرو دربارِ حسینی ، پرانی حویلی ، حیدرآباد ۲

○ سالانہ : (۲۲) روپیے
○ بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ
○ فی پرچہ : (۳) روپے

خط و کتابت کا پتہ :
شگوفہ ۱۳/ مجرد گاہ ، معظم جاہی مارکٹ ۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ ○ فون : 52216

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

بالِ مفت (انشائیے)

نہیں آتی تو یاد ان کی (یادرفتگاں)

بال کی کھال (تبصرہ)

خرافات (مراسلے) ۱۰۷

چورن (نظمیں)

"سالِ نو"

ہر بارھویں مہینے بدلتا ہے سالِ نو
پھر کس طرح کہوں کہ انوکھا ہے سالِ نو

جب بھی ہمارے دیش میں آتا ہے سالِ نو
جنتا کے حق میں قہر ہی لاتا ہے سالِ نو

ہر سال ہوتا رہتا ہے اپنا یہ تجربہ
اک بے وفا کا وعدۂ فردا ہے سالِ نو

ہم نے منایا جشن کہ گزریگا خیر سے
لیکن خلاف اُمید کے نکلا ہے سالِ نو

پٹی میں آخر آپ نجومی کے آگئے
وقت آئے گا تو پوچھوں گا کیا ہے سالِ نو

مڈٹرم انتخاب کا چرچہ ہے آج کل
سرکار وقت کے لئے دھڑکا ہے سالِ نو

پنشن پہ گھر سدھاریں گے جو لوگ اِس برس
ان کے لئے تو غم کا پٹارا ہے سالِ نو

عمر عزیز گھٹتی ہے ہر سال آپ کی
پیری میں اک برس کا اضافہ ہے سالِ نو

یہ سالِ نو بھی کیوں نہ نحوست مآب ہو
منحوس سالِ رفتہ کا بچہ ہے سالِ نو

ہوتا ہے اپنی موت سے نزدیک ہر بشر
گھنٹی نہیں ہے، خطرے کا گھنٹہ ہے سالِ نو

سالِ گذشتہ جشن منایا تو کیا ملا !
شہزاد کان پکڑو پھر آیا ہے سالِ نو

شہزاد معصومی

فکر تونسوی

ہیلو! ——— ہیلو!!

جب میرا جنازہ اٹھنے لگا۔ حتیٰ کہ میری بیوی بھی سیاپے کے سبھی سُر انکال کر سامعین سے داد لے چکی تو ایک صاحب مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے نمودار ہوئے اور سٹنٹ فلموں کے پولیس انسپکٹر کے لہجے میں کہنے لگے "روک لو۔ یہ جنازہ نہیں اُٹھے گا۔ سرکاری آرڈر ہے"

ماتم گسار سہم گئے۔ ممکن ہے، سرکار نے اب جنازہ پر بھی پابندی لگادی ہو کہ مرحوم پورا انکم ٹیکس ادا کر کے جا رہا ہے یا نہیں۔ سرکاری قرضے کی کوئی قسط تو واجب الادا نہیں، دریا میں ڈوب کر مرا یا چلّو بھر پانی میں ———

ہاں، ماتم گسار سہم گئے بلکہ کئی ایک تو موقع پاکر کھسک بھی گئے۔ میری بیوی نے آگے بڑھ کر کہا "مسٹر! ہمارے پاس ڈیتھ سرٹیفکیٹ موجود ہے جو جنازے کے ساتھ نتھی ہے۔ لے کیوں نہیں جاسکتے"

وہ بولا "نہیں لے جاسکتے کیونکہ ان کا ٹیلی فون کنکشن منظور ہو گیا ہے۔"

پندرہ سال پہلے میں نے ٹیلی فون کے لئے درخواست دی تھی اور رواج کے مطابق دروغ بیانی کی تھی کہ میں دل کا مریض ہوں مجھے فوراً کنکشن دیا جائے اگرچہ یہ کچھ اتنی دروغ بیانی بھی نہیں تھی کیونکہ میں ان دنوں ایک حسینہ سے عشق بھی کر رہا تھا جس سے ہر لمحہ ہارٹ اٹیک کا خطرہ رہتا تھا۔ کئی برس تک جب مجھے ٹیلی فون نہیں ملا تو حسینہ نے کسی اور سے شادی کرلی۔ آخر کب تک انتظار کرتی اور یوں بھی ہر عشق کا یہی انجام ہوتا ہے ——— خودکشی یا شادی ——— بہرکیف اُس کی

شادی سے میرے ہارٹ اٹیک کا خطرہ ٹل گیا لیکن اب جو پندرہ سال بعد میرا جنازہ اُٹھنے لگا تو کنکشن منظور ہو کر آگیا اور میں جیسے ڈائیل ٹیون کی طرح بج اٹھا اور بیوی سے کہا " ڈارلنگ ! کیا تمہیں یوں نہیں لگتا کہ سرکار میرے جنازہ اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ بولی " میں تو پہلے ہی کہتی تھی مگر آپ مانتے ہی نہیں تھے۔ اگر جنازہ دو چار سال پہلے اٹھ جاتا تو کنکشن دو چار سال پہلے مل جاتا۔

میں نے ٹیلی فون کی رسم افتتاح اپنی سابقہ محبوبہ سے کی اور نمبر ملا کر کہا۔ " ہیلو ! جانِ من !"

جواب آیا " شٹ اَپ"!

میں نے کہا " شٹ اَپ سے نہیں، مسز پربھاکر سے ملا دیجئے "!

جواب آیا " وہ جہنم میں گئی ہے "!

پوچھا " ان کا جہنم کا ٹیلی فون نمبر "

" ڈائرکٹری میں دیکھ لو ۔ اے سن آف اے بچ !"

یعنی ٹیلی فون کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ محبوبہ کا ترجمہ شٹ اَپ ملا۔ سوچا، دراصل ٹیلی فون ہی غلط وقت پہ منظور ہوا۔ جب محبوبہ ہی جنت سدھار گئی تھی تو محکمہ ٹیلی فون کو کنکشن منظور کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ غصے میں آکر ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ کو ٹیلی فون کیا اور کہا " جناب ! کم از کم آپ پہلے تصدیق تو کر لیتے کہ میری محبوبہ اس دُنیا میں نہیں رہی اور یہ ٹیلی فون کنکشن مجھے صرف اس سے گفتگوئے عشق کے لئے مطلوب تھا !

جواب آیا " رانگ نمبر ! یہ دفتر زراعت ہے۔ ہمارا دفتر عشق سے ڈیل نہیں کرتا۔ آپ کلچرل اور سوشیل ویلفیر دونوں سے رجوع کیجئے . . ."

گویا حالت کافی دگرگوں تھی۔ یہ اچھا ٹیلی فون لگوایا ہے، رانگ نمبروں سے ہی ڈیل کر رہا ہے۔ محبوبہ سے ملاؤ تو جہنم سے جا ملتا ہے، ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ سے ملاؤ، تو زراعت سے جا ملتا ہے۔ تیسری مرتبہ ایک ڈاکٹر کو ٹیلی فون کیا جو میرے نروِس سسٹم کا علاج کر رہا تھا مگر وہ ڈاکٹر کی بجائے دفتر کی کسی خاتون سے جا ملا جو شاید اپنے خاوند کو جھڑک رہی تھی اور کہہ رہی تھی " بچہ رو رہا ہے تو میں کیا کروں، لوری کا ریکارڈ لگا دو ! چپ ہو جائے گا "!

اور شوہر کہہ رہا تھا " ریکارڈ مل نہیں رہا۔ تم ٹیلی فون پہ اُسے لوری سنا دو !"

خاتون چڑ کر بولی۔ " دفتر کی فائلوں میں لوری کی موسیقی ڈھونڈتے ہو۔ میں لوری نہیں دے سکتی۔ لیکن سنو! تم خود لوری کیوں نہیں دے دیتے، پل بھر کے لئے تم ہی ممی بن جاؤ "

وہ بولا " ہائے ! میں تو ڈیڈی بننے سے ہی کتراتا تھا اور تم ممی بننے کا حکم دے رہی ہو۔ چونکہ میں خاوند ہوں یہ حکم نہیں مانوں گا "!

اور اس کے ساتھ خاوند کے لوری دینے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چیخ کر ٹوکا " ابھی بند کیجئے یہ فضول شور۔ مجھے لوری نہیں، وٹامن بی کامپلکس چاہیئے "!

چنانچہ میں نے پہلے ہی دن گھر والوں کو وارننگ دے دی۔ " خبردار ! اس ٹیلی فون کو کوئی ہاتھ مت لگائے۔

میری بیوی کہنے لگی "مگر میرے انکل جالندھر ہسپتال میں ایڈمٹ ہوئے ہیں۔ ان کی خیر و عافیت پوچھنے کے لئے ہسپتال میں ٹیلی فون ضرور کرنا ہے؟"

میں نے کہا "سوچ لو، ہسپتال سے لاؤ گی تو شمشان گھاٹ کی گھنٹی بج اٹھے گی اور کوئی بول اٹھے گا۔ "سوری! ارتھی لکڑیوں کے بغیر قبول نہیں کی جائے گی کیونکہ آج کل لکڑیوں کی سخت قلت چل رہی ہے۔ مرحوم کو لکڑیوں سمیت لائیے تو تجہیز و تکفین کے لئے حاضر ہیں، ورنہ سوری!"

مگر میں نے بیوی سے یہ فقرے نہیں کہے، دل میں ہی کہے حالانکہ اُن کے انکل کی عمر چھیاسی برس تک پہنچ چکی تھی اور شمشان گھاٹ کے لئے یہ بے حد موزوں عمر تھی اور پھر ایک فائدہ یہ بھی ہوتا کہ شمشان گھاٹ سے ہمارا رابطہ قائم ہو جاتا۔ یہ ہمارے ٹیلی فون کا پہلا نمبر ہوتا جو صحیح مقام سے جا ملتا۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ہمارے محلے میں ابھی صرف دو ٹیلی فون ہی لگے تھے۔ ایک چرنجی لال سوداگر چوب کے۔ ٹیلی فون لگنے سے دو نتیجے نکلے۔ ایک تو ان کا نام بگڑ گیا یعنی چرنجی لال سے شری چرنجی لال جی ہو گیا اور دوسرے لکڑیوں کے بھاؤ چڑھ گئے۔

دوسرا ٹیلی فون ایک حکیم صاحب کے چوبی کھوکھے میں تھا۔ وہ ٹیلی فون کرنے کے آٹھ آنے چارج کرتے تھے سرکاری ریٹ چار آنے تھا۔ ان کی طبی پریکٹس کم چلتی تھی، ٹیلی فون زیادہ چلتا تھا۔ وہ ٹیلی فون کال کو نسخے کی پڑیا سمجھتے تھے۔ شکایت کیا کرتے تھے۔

"ارے صاحب! سالی ایلوپیتھی کا زور ہے، نسخہ بکتا ہی نہیں۔"

بہرکیف سیٹھ چرنجی لال کی لکڑیاں بکتی تھیں اور حکیم صاحب کی ٹیلی فون کالیں۔ بلکہ ایک مرتبہ مارکیٹ میں کال کا ریٹ بڑھ گیا تو حکیم صاحب نے بھی کال کا ریٹ بڑھا کر دس آنے کر دیا چنانچہ میرے ہاں بھی ٹیلی فون لگا تو مجھے لوگ آتے جاتے سلام کرنے لگے۔ مندر کا پجاری، میری بیوی کو دوسروں سے زیادہ پرساد دینے لگا۔ سکول کے پرنسپل نے میرے نالائق بیٹے کو کلاس کا مانیٹر بنا دیا۔ پرنسپل صاحب نے یہ ناشائستہ حرکت اس لئے کی کیونکہ وہ میرے بیٹے کے اندر ہیلو ہیلو کی صدائیں سُن لیتا تھا، مگر میں بہرا تھا۔

لوگ جب سلام کرتے تو میں عرض کرتا "فرمائیے"

وہ کہتے "مبارک باد قبول فرمائیے کہ اس محلے میں پہلی بار ایک بھلے آدمی کو بھلا تسلیم کیا گیا۔"

سلام کرنے والوں میں ایسے حضرات بھی شامل تھے جو کل تک میرے پہلو سے یوں نکل جاتے تھے جیسے کوئی بائیسکل پر دھول اڑاتے ہوئے گزر جائے لیکن میں ایک بھلا آدمی ٹیلی فون لگنے کے باوجود ابھی تک بائیسکل پر سوار تھا۔ ہر ایک سے عجز و انکسار سے پیش آتا۔ چنانچہ ایک مرتبہ سلام کرتی ہوئی میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ آواز آئی۔

"جناب! میں رگھبیر سنگھ قلفی فروش بول رہا ہوں۔ آپ مجھے جانتے ہیں نا!"

میں رگھبیر سنگھ سے زیادہ اس کی قلفی کو جانتا تھا کہ ایک بار کھائی تھی تو زبردست کھانسی ہو گئی تھی۔ ادھر رگھبیر سنگھ قلفی ... آگیا تھا۔ عرض کیا "اجی جناب شرمندہ کر رہے ہیں، ارشاد فرمائیے، تعمیل ہوگی۔"

"مہربانی، آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔ خدا میرے گھر بسے۔ پچاسی بڑے چچا تک جا کر معلوم کیجئے کہ ہم ...

گھر سے بھاگ گئی تھی وہ لوٹی کہ نہیں ؟"

میں پانچ سات منٹ بعد معلومات حاصل کرکے لوٹا تو اُسے بتایا کہ آپ کے گھر میں نہ صرف بھینس غائب ہے بلکہ بیوی بھی۔

اور پھر یونہی ہوتا رہا۔ دن میں پانچ سات مرتبہ گھنٹی بج اُٹھتی۔ کوئی کہتا۔ میرے گھر اطلاع دے دیجئے کہ آج رات کو لیٹ آؤں گا۔ میرے گھر میں ٹیلی فون لگتے ہی محلہ کے لوگ رات کو لیٹ بھی آنے لگے تھے۔ کوئی کہتا 'میری ماں سے کہئے کہ ڈاکٹر سے اپنے پوتے کے لئے دوائی لے آئے اور میں بڑھیا سے جاکر یہ کہتا کہ ساتھ ہی اپنے دمّے کی دوائی بھی لیتے آئیے گا ــــ کوئی ٹیلی فون پر حکم دیتا کہ میری بیوی کو جاکر پیام دے آئیے کہ آج پھر گوبھی کی سبزی مت پکائے۔ کیونکہ کل مجھے اس سے کھانسی ہوگئی تھی۔ شکر ہے کسی نے یہ حکم نہیں دیا کہ بازار سے گوبھی خرید کر میرے گھر دے آئیے۔

ایک مرتبہ ٹیلی فون پر آواز آئی "ہیلو! جناب کی صحت کیسی ہے ؟"

میں نے کہا "میری بیوی کو زکام ہے، مجھے ہونے والا ہے۔"

وہ بولے "ذرا احتیاط کیجئے، پوچھنا صرف آپ سے یہ تھا کہ کیا وہاں بارش ہورہی ہے ؟"

عرض کیا "دو بار ہوچکی ہے، تیسری بار ہونے والی ہے، اب کے شاید اولے پڑیں۔"

کہنے لگے، "بس! مجھے یہی خطرہ تھا۔ کیا ذرا آپ میرے غریب خانے تک قدم رنجہ فرمائیں گے ؟"

میں نے کہا "فرماؤں گا۔"

وہ بولے "بس اتنا دیکھ آئیے کہ کہیں ہمارے مکان کی چھت تو نہیں گر گئی۔ دیکھئے جی، آپ کے ہاں ٹیلی فون لگ گیا تو کتنی سہولت ہوگئی ــــ آپ کے پاس چھاتہ تو ہوگا ہی، بارش ہورہی ہے نا!"

میں نے کہا "صبح آپ کی بیوی مانگ کر لے گئی تھی۔ ابھی تک لوٹایا نہیں۔"

بولے "آہ! میری بیوی بھی کتنی نالائق ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا۔ نالائق نہ ہوتی تو کیا آپ سے شادی کرتی۔ لیکن یہ ایک بوسیدہ فقرہ تھا متروک قرار دے دیا اور کہا "ابھی جاکر چھت کی خبر لاتا ہوں۔ پلیز، ہولڈ آن!" واپس آکر انھیں اطلاع دی کہ آپ کی چھت اور میرے چھاتے کے علاوہ گھر میں سب خیریت ہے۔

المختصر سامعین کرام! جب میں رانگ نمبروں، خدمت خلق اور علاقے کے ٹیلی فون میکینک کی مٹھی گرم کرتے کرتے تنگ آگیا تو میں نے مکان اور ٹیلی فون دونوں ایک اور لکڑی کے سوداگر کے ہاتھ بیچ دیئے اور خود دوسرے محلے میں کرائے کے مکان میں منتقل ہوگیا۔

دوسرے مہینے ایک پبلک کال سے اپنے پرانے گھر میں ٹیلی فون کیا اور پوچھا:

"ہیلو! کیا میں فکر تونسوی سے مل سکتا ہوں!"

جواب آیا: "رانگ نمبر"

میں بڑا حیران ہوا کہ میرا ٹیلی فون نمبر ابھی تک رانگ نمبروں سے ڈائل کئے جا رہا ہے۔
پوچھا "مگر فکر صاحب پہلے تو اسی نمبر پر رہتے تھے"
جواب آیا "رہتے ہوں گے۔ جہنم رسید ہوئے"
میں نے پوچھا "جنازہ کب اٹھا"
بولے "پچھلے مہینے"
میرے منہ سے نکل گیا "اب صحیح وقت پر نکلا ان کا جنازہ!

رضا نقوی واہی

گو ہاتھ میں جُنبش نہیں

"جنتائی حکومت" کا یہ جنتا پہ کرم ہے
"گو ہاتھ میں جُنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے"
دو سال میں کیا کیا نہ تماشہ نظر آیا
ہر دوش پہ اقدار کا لاشہ نظر آیا
جس طور سے چھینکے پہ جھپٹ پڑتی ہے بلّی
تھی اہل سیاست کی نظر میں یونہی دلّی
باپو کی سمادھی پہ جو کھائی گئیں قسمیں
دو دن میں بھلائی گئیں کرسی کی ہوس میں
ٹوٹل ریوولیوشن کا اٹھا تھا جو تلاطم
رخصت ہوا دکھلا کے وہ جنتا کو فقط دُم
بدلے گئے اس لفظ کے مفہوم و مطالب
تکبند، خود اپنے کو سمجھنے لگے، غالب
"آزادیِ نو" کا تھا لبوں پہ جو سلوگن
ہر دل میں تھرکنے لگی لیلائے کرپشن
بس چشم زدن میں ہوئی ہر شئے تہہ و بالا
تہذیبی اِداروں میں لگایا گیا تالا
تعلیم کے شعبوں سے ڈسپلن ہوئی رخصت
دی جانے لگی فوج کو ترغیبِ بغاوت
باقی نہ رہا نام و نشاں امن و اماں کا
جو حال مدن کا تھا وہی نورمیاں کا
بیکاری و افلاس نے یوں قوم کو مارا
ہر شخص کو دن میں نظر آنے لگا تارا
بازار سے غائب ہوئیں اشیائے ضروری
سغبہ کھا کے خفائی سے ہوئے مات ظہوری
آکاش کو چھونے لگی پیٹرول کی قیمت
گھٹنے لگی نظروں میں ابوالہول کی قیمت
"دل بدلی" میں حاصل ہوئی اس درجہ مہارت
یاروں نے بنا ڈالا اسے قومی تجارت

اس عہد کی تاریخ ہے بے مثل و یگانہ
اِس دَور کی دریافت ہے "مشروب مثانہ"

عالم تاج پوری

دلّی میں چھچھوندر میں کس طرح ہو یارانہ
نیچر ہے ازل ہی سے دونوں کا جداگانہ
بھاشا کے مسائل پہ ہڑبونگ ہے ہر جانب
بنگال بہار ایسے صوبے ہوں کہ ہریانہ
امراض کو کہتے ہیں آسیبی کرشمہ ہے
اللہ رکھے قائم مُلّا کا شفا خانہ
پاکیزہ مقام اب تو اڈے ہیں سیاست کے
چاہے کوئی مسجد ہو چاہے کوئی بُت خانہ

اک حُسن کے پیکر کو کالج میں ذرا چھیڑا
ہینڈل مجھے چندیا پہ دینا پڑا جرمانہ

کچھ بھی نہ رہ جائے۔

یہ بحث بہت ہی پرانی ہے کہ امتحان میں نقل کرنا آرٹ ہے یا سائنس؟ نقل برائے نقل ہے یا نقل برائے زندگی؟ نقل جدیدیت ہے یا ترقی پسندی؟ خیر اس بحث میں کون پڑے۔

پرانے زمانے میں لوگ نقل کو آرٹ سمجھتے تھے۔ اس زمانے تک ایٹمی دھماکے نہ ہو سکنے کی وجہ سے سائنس کا اتنا زور نہ تھا۔ نہ نقل میں اتنا زور پیدا ہو سکا تھا کہ وہ کوئی دھماکہ کر سکتی یہ زور تو بعد کے زمانے کے نقلچیوں نے پیدا کیا۔

نقل برائے نقل تو خیر فطری ہوئی کہ خیر سے صاحبزادے یا صاحبزادی نقل مطابق اصل ہی کر لیتے ہیں اور کم از کم ان امیدواروں سے بہتر ہیں۔ جو نقل کے لیے بھی ایک مددگار۔ بطور "اسپیشل امتحان" رکھتے ہیں ورنہ اس کو ہمیشہ بیانگِ دہل نقل برائے زندگی مانا گیا ہے۔ پاس ہونا ذریعہ نجات ہی نہیں وسیلہ معاش ہی ہے کہ روٹی تو کما کھلائے کسی طور مچھندر۔ پاس ہو کر نوکری پائیں گے۔ زندگی میں نوکری یا چھوکری کے لیے پاس ہوں گے اور پاس ہونے کے لیے نقل کریں گے اور نقل کے لیے امتحان دیا کریں گے۔ گھی کہاں گیا کھچڑی میں کھچڑی کہاں گئی گھی میں۔

نقل برائے جدیدیت ان معصوم امیدواروں کے لیے تسلیم کی گئی ہے جو نہ پڑھ سکتے ہیں۔ نہ سمجھ سکتے ہیں نہ نقل کی نقل پیش کر سکتے ہیں۔ ان کے جواب علامتی ہوتے ہیں۔ اور تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں اس قدر ابہام ہوتا ہے کہ ابلاغ کا مکمل پورا نہیں ہو پاتا، لہٰذا ممتحن ان کی نقل کو جانچنے اور پاس کرنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ ان کا عالم یہ ہوتا ہے کہ اگر برابر بیٹھا ہوا امیدوار ادب کے پیچھے مثلث بنا رہا ہے تو جدیدیہ بھی مثلث بنا دے گا۔ اگر پڑوسی بڑے اعتماد سے غلط جواب نقل کر رہا ہو تو یہ بھی نقل کر دے گا۔

شکر خدا کا میں دس پونڈ کم ہوگئی

ترقی پسند نقل اسے کہتے ہیں جس میں صرف کن انکھیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ آس پاس جو امیدوار ذرا تیز نظر آیا اس کو حرف بہ حرف اُتار لیا۔ یا ہر سوال شروع کرنے سے پہلے باتھ روم کا رُخ کیا۔ سینے سے کتاب، کاپی، گیس پیپر، گولڈن یا سپورٹ وغیرہ نکال کر مطلوبہ صفحہ پھاڑ کر واپسی میں رومال کے نیچے رکھ کر اپنے یا صاحب کتاب کے الفاظ میں جواب دے مارا۔

نقل کے اس گئے گزرے زمانے میں جب اسے آرٹ سمجھا جاتا تھا۔ چھوٹی موٹی نقل تو لڑکیاں تک کر لیتی تھیں۔ ایک چشم دید واقعہ سنئے:

ایک گرلس کالج میں ایک گرل امتحان دینے خود گئی۔ اس کی ساڑی پر بھارت ورش کا نقشہ بنا ہوا تھا۔ دوسری کے جسم پر سلسلہ کوہ تھا۔ (جس کی علاحدہ سے چنداں ضرورت نہ تھی) اتفاقاً ساڑی ہونے کی وجہ دونوں پکڑی گئیں۔ ساڑی والی کا جغرافیہ

اور پہاڑیوں والی کا ڈرائنگ کا امتحان تھا۔ امتحان لینے والی ظالم نے دونوں کے کپڑے اُتروا لئے۔ یہ خبر بدیُں کر ہمارے دوست گرگھنٹال کے منہ میں پہلے تو پانی بھر آیا کہ افسوس وہ اس وقت کہاں تھے؟ پھر ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "نمایش کے شوق میں افسوس لڑکیاں کسی بھی چیز کو راز میں نہیں رکھ سکتیں۔ ارے، کیا تو میں نے بھی یہی تھا۔ مگر ڈسک ۔ ۔ نقل کے بعد رومال سے ڈسک صاف کر کے نقشہ اس طرح غائب کر دیا تھا جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔"

اتفاقاً دوسرے دن ممتحن نے ان کے نقل کے سینگ برآمد کر کے عورت مرد میں مساوات بحال کر دی۔

انہی کی طرح ابتداء میں گرگھنٹال بھی نارمل تھے۔ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ زندگی میں مسلسل ناکام رہنے اور ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے کہیں وہ پہلے لیڈر اور پھر وزیر بے تدبیر نہ ہو جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہ دودھ کے دھلے تھے۔ نقل اتنی ہی کرتے جتنی دال میں نمک۔ نمک میں دال کا نمبر تو بہت بعد میں آیا۔ ایک گڑبڑ یہ بھی کہ وہ نہ صرف پڑھتے تھے بلکہ رٹتے تھے۔ امتحان میں آنے والا شرطیہ سوال اگر رٹائی سے رہ جاتا تو چھوٹی سی پرچی پر لکھ کر اس کا تعویذ گھڑی کے پٹے میں چھپا لیتے۔ اگر اس میں سے کچھ آ جاتا تو اسے نقل کے ارادے سے مٹھی میں داب کر تھر تھر کانپتے کہ بس اب پکڑے گئے ۔۔۔ اور ۔۔۔۔ نقل کی ٹوہ میں رہنے والے ممتحن کے بیل کی طرح لال لال دیدے انہیں گھورتے، کمرۂ امتحان ناچتا نظر آتا۔ یہی بیل و نہار گرگھنٹال کے تھے۔ جو اپنے زمانے میں چوری چھپے نقل کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں ممتحن بھی کاپی شناس بلکہ چہرہ شناس ہوتے۔ کاپی کے بجائے طلباء کے چہرے دیکھ کر پہچان لیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس ناشدنی سوال کے دوسرے سوالوں کے جواب بھی دماغ سے غائب ہو جاتے اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگتا۔ یہاں تک کہ وہ پرچہ چپکے سے پھینک دیتے۔ پسینہ پونچھتے اپنی جیبیں سے پانی پیتے۔ بجلی ہوئی سانس دل۔ دماغ اور نروس بریک ڈاؤن پر قابو پاتے اور اگلے سوال کے جواب میں کاپی چھینے جانے تک وہ کھو جاتے۔

وہ ان کا بچپنا تھا۔ بچوں پر ماسٹروں کی گرفت بڑی سخت تھی۔ اس زمانے کے استاد دھلی گھی اور تازہ ہوا کھاتے ڈنڑ پیلتے، مگدر ہلاتے، پہلوانی کرتے۔ دس بیس میل پیدل چلا کرتے۔ لڑکوں کو اسکول میں پڑھانے کے لیے گھر پر پڑھتے۔ لاٹھی گھماتے ہوئے کلاس میں داخل ہوتے۔ ہوم ورک دیکھنے کے بہانے ایک ایک کا بھرکس نکال دیتے۔ گھنٹہ بھر تک سب کا ملیدہ بناتے رہتے۔ کوئی کونے میں مُنہ کیے کھڑا ہے۔ کچھ مرغا بنے ہوئے ہیں۔ کسی کو بچھڑا یا پری بنایا جا رہا ہے۔ کوئی کلاس سے نکال دیا گیا ہے۔ کوئی ایک ٹانگ سے کھڑا ہے اور کوئی بنچ پر۔ انگریزی، آمرانہ ماحول میں کھلم کھلا نقل یا استاد بہادر کے سامنے سر اٹھانے کا سرے سے سوال ہی نہ تھا۔ نقل کے شبہ تک میں لڑکے کو اسکول کے باہر کر دیا جاتا۔
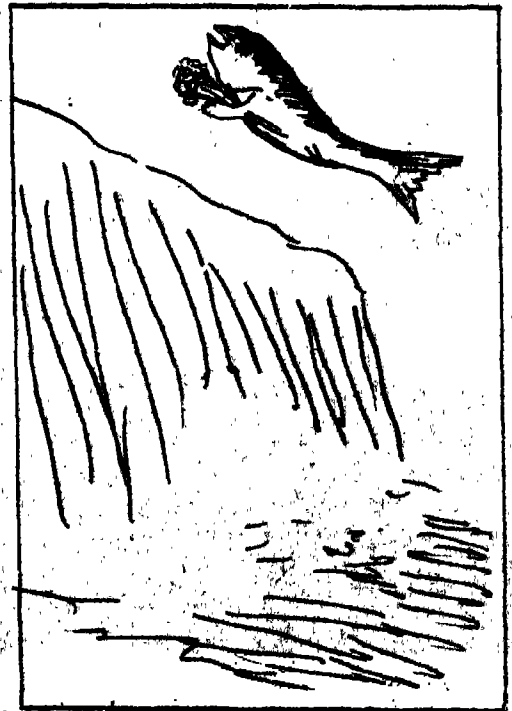
اس زمانے میں وطن عزیز پر بادشاہوں کے بادشاہ شہنشاہ مولا بخش کا ڈنڈا راج تھا۔ استاد سے کچھ پوچھنا موت کو دعوت دینا تھا کیونکہ وہ سب کچھ پڑھا اور آپ پڑھ چکے ہوتے۔ نقل کی آزمائش سے گزرنا جیحوں دریائے شور یا حبس دوام کو بھگتنے کے برابر تھا۔ استاد کی عزت و احترام، قدر و منزلت اتنی تھی کہ گھر کے براہ راست بزرگ تک انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے اور نالائق اولاد کے سلسلے میں بر سر محفل ڈانٹ کھانے میں فخر محسوس کرتے۔ اس زمانے میں درجہ میں اتنی زیادہ پڑھائی ہوتی، اتنا زیادہ پڑھایا جاتا کہ گھر پر ٹیوشن استاد کے لیے کسر شان اور شاگرد کی کند ذہنی سمجھی جاتی۔ استاد بجائے شاگرد سے روپیہ پیسے کا طالب ہونے کے اپنا سب کچھ شاگرد پر لٹاتے رہتے۔ اس لیے اسکول ماسٹر اور سالانہ امتحان کے نام سے سارے سال اچھے اچھوں کی مدح قسطوں میں قبض ہوتی رہتی۔ پڑھنے کے لیے لوگوں کو جگانا نہیں پڑتا بلکہ لڑکے گھر کے بڑے بوڑھوں سے پوچھتے آپ کو کس وقت جگا دیا جائے۔ عشاء، تہجد یا فجر کے وقت؟ دورِ غلامی میں طالب علم ایسے عابد شب بیدار ہوتے تب ہی قرآن کریم کے علاوہ پکر ورق۔ ڈکشنری اور آمدنامے کے بھی حافظ ہوتے۔

اس زمانے کے طلبا ہتھیلی پر سرسوں جما لیتے یعنی پورے پورے جواب ہتھیلی پر لکھ کر کاپی بھر آتے۔ باتھ روم کے بہانے جوتے سے سوال حل کرتے۔ ٹھاٹھ سے مونچھوں پر تاؤ دے کر پاس ہو جاتے۔

اس زمانے ہی میں گرو گھنٹال کے جوتے سے دھڑا دھڑ سوال نکلتے۔ جواب نکلتے۔ مگر جوتا پیر کا پیر ہی میں رہتا۔ نہ کہ اس زمانے کے اناڑی کے خالی خولی جوتا نکالنے کی گستاخی کے باوجود سوال کا جواب تک نقل نہ کر پاتے۔

ہمارے بچپن کے زمانے کے کمالات ملاحظہ ہوں گرو گھنٹال نے "نباتات" کے امتحان میں جاتے وقت اپنے کوٹ پر ساٹھ قسم کے

پھول لگائے اور ٹھاٹھ سے نقل کر لی۔ ماسٹر صاحب کی اس وقت سمجھ میں آیا جب وہ رخصت ہونے لگے۔ ان کے کوٹ پر نظر پڑتے ہی غضب ناک ہو کر بولے۔

"میاں صاحب زادے! کل "حیوانات" کا امتحان ہے۔ اگر کسی جانور کو کوٹ میں چھپا کر لاؤ گے تو درجہ سے نکال باہر کروں گا!"

ایک دفعہ کا پیاں جانچنے پر نقل کے شبہے میں استاد نے پوچھا۔

"بچو! کتے پر تم نے جو مضمون لکھا ہے وہ حرف بہ حرف سب کا ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

گرو گھنٹال جو کلاس مانیٹر بھی تھے۔ بڑی معصومیت سے بولے۔

جناب عالی! وجہ یہ ہے کہ ہم سب نے اسکول کے کتے پر مضمون لکھا ہے۔ اسکول میں صرف ایک ہی کتا ہے۔

ایک دفعہ "فٹ بال میچ" پر کلاس میں مضمون لکھنے کے لیے دیا گیا۔ سب لڑکے مضمون لکھنے میں مصروف اور ماسٹر صاحب سر۔۔۔
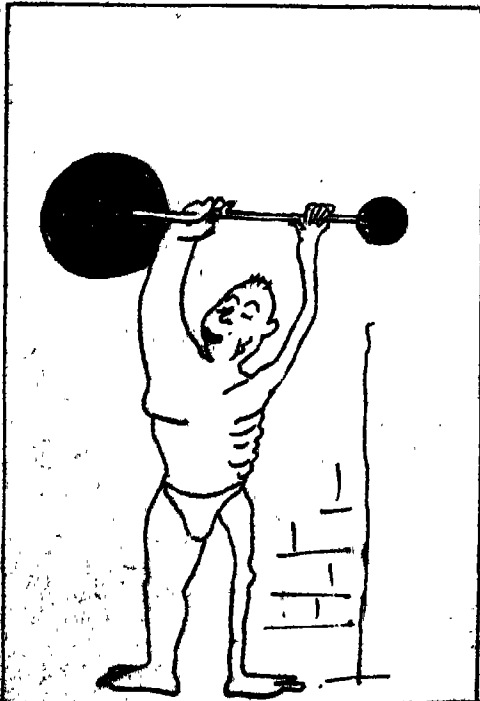
ہوتے۔ نقل کی گنجائش نہ تھی۔ اس لیے گردگھنٹال چند الفاظ لکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ استاد نے پوچھا۔

"میاں! مضمون کیوں نہیں لکھ رہے ہو تم؟" کاپی آگے بڑھاتے ہوئے بولے — لکھ چکا۔ ماسٹر صاحب نے دیکھا، کاپی پر لکھا تھا —

"قبلہ! پرچہ
بارش شروع ہو گئی اس لیے میچ نہ ہو سکا۔"

ایک دفعہ نقل کرتے ہیں۔ گردگھنٹال دھر لیے گئے۔ ممتحن نے خفا ہو کر پوچھا — "یہ کیا ہو رہا ہے؟" انھوں نے ڈھٹائی سے جواب دیا — "وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں۔"

ماسٹر صاحب نے بلا تامل پھر پانی میں ڈبو کر ان کی کاپی پر پھیر دیا۔ کری کرائی نقل پر پانی پھرتے دیکھ کر انھوں نے پوچھا "آپ یہ کیا کر رہے ہیں —؟" ماسٹر صاحب بولے — "وہی جو آپ دیکھ رہے ہیں —!"

خیر اس موقع پر وہ زیر ہو گئے۔ کیونکہ زبر ہونے کا موقع زیر ہو کر کھو چکے تھے۔ ذرا سی غلطی سے زیر بنا دیے جاتے۔ [illegible] سلوک کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا جو دھوبی اپنے گدھے سے روا رکھتا ہے۔ ایک دفعہ گردگھنٹال نے کمال ہی کر دیا۔

کلاس میں آخری لیکچر دیتے ہوئے استاد نے کہا۔

"لڑکو! شاباش! خوب محنت کرو۔ امتحان سر پر ہے پرچے پریس میں چھپنے جا چکے ہیں۔ اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہے تو پوچھ لے!"

گردگھنٹال نے ایک کونے سے کہا — "مجھے یہ پوچھنا ہے کہ پرچے آخر کس پریس میں چھپ رہے ہیں —؟"

پہلے نقل کا شمار آرٹ میں تھا۔ گردگھنٹال جیسے آرٹسٹ ہمیشہ دماغ لڑا کر ایسی تکڑم کرتے کہ بالکل ہی سے فاصلے سے نقل کی صورت پیدا کر لیتے۔ وہ پڑھتے بھی اور نقل بھی کرتے۔ غرض ملا جلا کاروبار چلائے جاتے۔ وہ پڑھنا کہاں چاہتے تھے۔ بس پڑھنا انہیں اس لیے پڑتا کہ درجے میں [illegible]

استاد آج کل کے ٹیچروں کی طرح نہیں تھے کہ صرف ٹیوشن اور کوچنگ کرتے اور کلاس میں ٹیوشن بیچنے آتے ہیں۔ کہا تو یہ گیا ہے کہ لڑکا پڑھائی میں تیز بھی ہو تب بھی پیچھے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ اس [illegible] غریب ٹیچر [illegible] کی کوشش کی۔ اسی غلط رجحان کے خلاف گردگھنٹال نے نقل کے ذریعے جنگ کر رکھی ہے اور دوستوں کی خاطر [illegible]

نقل کا ریکارڈ گرو گھنٹال نے اس وقت توڑ دیا جب انھوں نے پنسل سے ڈسک پہ ٹیلی گرافی اشاروں کی مدد سے امتحان میں نقل کی کہیں امتحان بعد ایک تار بابو کے بتانے پہ نگران صاحب کو یہ راز معلوم ہو سکا کہ وہ بذریعہ تار نقل کر رہے تھے۔ اس زمانے میں نقل کے بہانے لڑکے پورا کورس دُہرا ڈالتے۔ اسی لیے فیل ہونے والا طالب علم بھی پڑھے لکھوں میں شمار ہوتا اور نالائق کی قابلیت کی مثال دی جاتی ——

"کوئی ایسے ویسے تھوڑی میٹرک پلکڈ ہیں —— کوئی گرے پڑے نہیں۔ آخر مڈل فیل ہیں۔"

گرو گھنٹال کی نقل کا زبردست کارنامہ جس سے ان کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ اس میں ایک تو ان کا شارٹ ہینڈ کی مدد سے نقل کرنا تھا۔ کوئی بھی ممتحن انہیں اس لیے نہ پکڑ سکا وہ صرف لانگ ہینڈ جانتے تھے۔

جب نقل کے سارے فن استادوں کو اسی طرح معلوم ہوگئے جیسے ہمیں اپنی خوبیاں اور دوسروں کی کمزوریاں تو آخر میں پیپر آؤٹ کرانے کا منافع بخش دھندہ خود انھوں نے سنبھال لیا۔ جس کی وجہ سے نقل کا فن پھر آرٹ سے سائنس ہوگیا۔ اور محکمہ تعلیمات امتحانوں کی تجربہ گاہ بن گیا۔ آخر سائنس نام ہی تجربے کا ہے۔ اساتذہ نے پورے پورے سینٹر کو نقل کرا دینے اور آپس میں ایک دوسرے سے سفارش کرکے سب کو پاس کرا دینے کا کامیاب تجربہ کر دکھایا۔

گرو گھنٹال نے ایک امتحان کبوتر کے ذریعہ بھی پاس کیا تھا اور کالج کے طالب علم کہلائے جانے کے مستحق قرار دیئے گئے تھے۔ بغل میں کبوتر دبائے امتحان ہال میں پہنچے۔ پیپر ملتے ہی اس کے گلے میں باندھ کر اڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں وہ پوری کاپی جس پہ سب سوال حل تھے لے آیا اور وہ نقل میں سینٹ پرسنٹ کامیاب ہوگئے۔

ایک کبوتر باز لڑکے نے دوسرے دن ان کی نقل کی کوشش کی مگر بقول شاعر ؎

گھات میں بلّی ہے جب اور گارڈ اپنی چال میں
کس طرح لے جائے پرچہ اب کبوتر ھال میں

ممتحن چوکنا تھا۔ مقابلے کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ ابھی لڑکا جواب بھی نہ لے پایا تھا کہ ممتحن کی بلّی نے اُچک کر کبوتر کو دبوچ لیا۔

یہ اس زمانے کے قصّے ہیں جب امتحان میں نقل ہوتی تھی۔ جو اب اصلیت سے زیادہ لطیفے معلوم ہوتے ہیں۔ اِس زمانے میں امتحان میں نقل نہیں بلکہ نقل میں امتحان بلکہ نقل کا امتحان ہوتا ہے۔ جس کے عبرت ناک مناظر آپ بھی دیدۂ عبرت نگاہ سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہائی اسکول کے امتحان کا ایک سینٹر چاروں طرف سے پولیس کا سخت محاصرہ۔ سرپرست، والدین اور افسر اپنے بیٹوں بیٹیوں کو نقل کرانے کے لیے بے تاب و بے چین۔ سامنے سڑک پر گیٹ
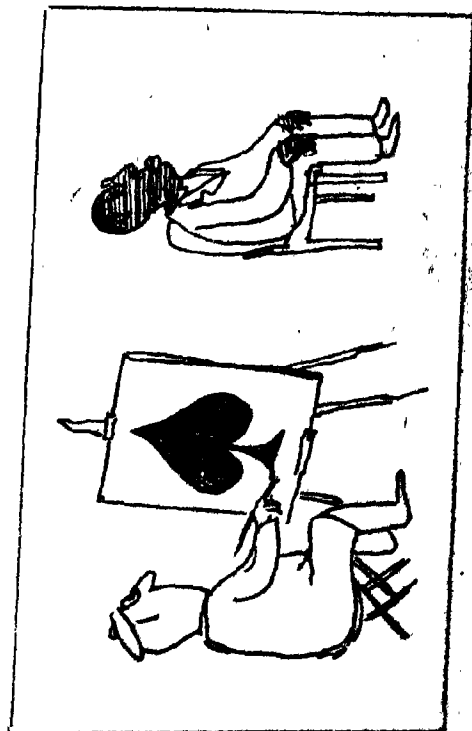
میں دوکانوں اور مکانوں کے برآمدوں میں۔ نٹ پاتھ پر جا بجا نقل کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔ امتحان شروع نہیں ہوا کہ امتحان کا پرچہ سینٹر سے بیس پچیس روپیہ میں خرید لایا گیا۔ پہلے فی سوال پانچ روپیہ لگا پھر بڑی تعداد میں اس کے غلط جوابات بڑی محنت سے بوجھ بجھکڑوں نے اگولڈن کی۔ ایزی پاسپورٹ اور شیور سکسیز کی مدد سے نقل کیے۔ ہر سوال کے جواب میں کاربن کی فوج لگی نقلیں تیار ہوئیں تو خریدار ٹوٹ پڑے۔ نوٹوں کی بارش ہوئی جناب محاصرہ یلغار ہوئی۔ ہر جواب پہ سوال نمبر سیٹ نمبر اور کمرہ نمبر لکھ کر جاں باز سپاہیوں کو پیش کیے گئے۔ وہ ایک روپیہ فی جواب اور ایک ساتھ دس جواب سے کم لینے پر تیار نہ ہوئے۔ وقت اتنا محدود کہ مول بھاؤ کی گنجائش نہیں۔ غرض ایک روپیہ والوں کی بھیڑ کم ہوئی تو اٹھنی والوں کی سنی گئی۔ غریب غربا نے بغاوت کی کوشش کی تو قانون شکنی کے الزام میں دھر لیے گئے۔

ایک طرف تو اتنا کڑی پہرہ، قاعدہ، قانون دوسری طرف بڑے لوگوں اور افسروں کے لیے ہیڈ ماسٹر سے چپراسی تک کلاس کلاس مارے مارے پھر رہے تھے۔ "بھئی رول نمبر...... آخر اپنا گڈو ہے...... صاحب کا صاحبزادہ ہے...... کی صاحبزادی ہیں۔ ان کا کوئی سوال غلط نہ ہونے پائے۔ مگر سب سے زیادہ باقاعدگی ہائی اسکول کے سکریٹری صاحب کی لڑکی کے سلسلے میں برتی گئی۔ جس مضمون کا امتحان ہوتا اسکا پڑھانے والا ماسٹر ایک ایک سوال ٹھیک ٹھیک حل کرتا۔ اس مضمون کے ماہرین کا بورڈ اسے پاس کرتا۔ پھر جواب ہیڈ ماسٹر خود دیکھ کر پاس کرتے۔ اس کے بعد امتحان کی کاپی پر خوش نویس اسے نقل کر دیتا۔ اس کے بعد کئی ماسٹر اس نقل کا پروف درست کرتے۔ جب پرچہ حل کرنے والے سارے سوال حل ہو جاتے تو سکریٹری کی لڑکی جو اس دوران اپنی کاپی پر اپنی سہیلی کو خط لکھ رہی ہوتی، اس کی کاپی بدل دی جاتی، اور وہ کاپی جمع کرکے واپس چلی جاتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ پورے اسکول نے ہیڈ ماسٹر کی ایڑی سے ماسٹر کی چوٹی تک کا زور لگا دیا مگر وہ بدنصیب "گریس" ملنے کے بعد بھی تھرڈ پاس ہو سکی۔ جس سے اس کی جہالت سے زیادہ اسکول کے ہیڈ ماسٹر اور ماسٹروں کی مجموعی قابلیت پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ تو تجربات ہوئے اسکول کے، اب ذرا کسی کالج یا اس کی یونیورسٹی میں جھانکیے۔

غریب لیکچرار ڈرتا، کانپتا، لرزتا، تھراتا، آیۃ الکرسی اور کلمہ شہادت پڑھتا کاپیاں اور پرچے لیے کلاس میں داخل ہوا ادھر گھنٹہ بجا۔ کاپی پیپر بٹا ادھر شروع ہو گیا نقل کا امتحان۔ ہر ایک کتابیں، کاپیاں کھولے اطمینان سے نقل کر رہا ہے۔ ایک دوسرے سے باواز بلند پوچھ رہا ہے۔ طریقہ جواب پر صلاح مشورہ کر رہا ہے۔ متعلقہ لکچرار کو جواب لکھانے کے لیے طلب کر رہا ہے۔ محقق معاشرے کے باہر بلی کی طرح دبا سہما ناول پڑھ رہا ہے۔ پرنسپل نا برخاستہ یا فلائنگ اسکواڈ گرانڈیل ہول لو
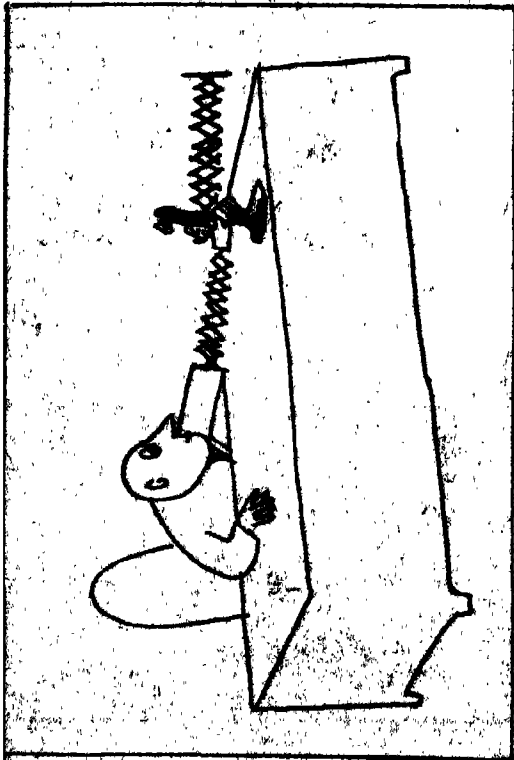
ممتحن کے فرائض میں داخل ہےکہ وہ کھانس کر ہر شریر کو اس کی موت سے آگاہ کرے۔ ڈسک پر کوئی چھرا گاڑے کوئی رومال میں پستول تک لے۔ ایک پورا بانو کر آکتا ہوں ، کاپیوں اور ایک درجن دوستوں کی مدد سے مصروف امتحان ہے۔ ممتحن کی کیا مجال جو دم بھی مار سکے۔ اگر کچھ ٹیچروں نے نقل رکوانے کی کوشش کی یا سختی کا ارادہ کیا تو سعادت مند طلباء نے ٹھونک ٹھانک دیا۔ افسر اور پلس خاموش تماشائی بنے رہے۔ کہ اگر نقل پہ پابندی ہوگی تو ان کے بھیا بھتیجے پاس کیسے ہوں گے ۔ ؟ ڈھول جھاڑنے کے بعد اساتذہ نے امتحان کا بائیکاٹ کر دیا۔ افسروں اور پولیس والوں کی پھر بن آئی ۔ انھوں نے امتحان دلوانے کی ذمہ داری انتہائی غیر ذمہ داری کے ساتھ سنبھال لی اور کالج کی اینٹ سے اینٹ بجنے یا عمارت کو بم سے اڑا دینے سے بچا لیا۔ نقل کے وارے نیارے ہوگئے۔

اس کے بعد تحریک شروع ہوئی کہ بلا امتحان کے پروموشن دیا جائے جس کے نتیجے میں نقل کے حق کی تحریک زور پکڑ گئی ۔ بلا امتحان کے درجے ملنے سے پروازیں کوتاہی کا شکوہ کیا گیا۔ کہا گیا کہ اس سے نقل کی موت واقع ہو جائے گی جو انسان کا پیدائشی حق ہے۔

ہمارا ماہرانہ مشورہ ہے کہ بلا امتحان دیئے درجہ حاصل کرنے سے کہیں بہتر ہوگا کہ امتحان نقل ہی کا ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اس کے بعد لڑکے اور لڑکیاں نقل کی ضد میں پڑھنا لکھنا شروع کر دیں گی ۔ اور اس قابل تو ہو ہی جائیں گی کہ کم از کم امتحان میں نقل کر سکیں ۔ شاید آپ بھی یہی پسند کریں کہ امتحان ہوتے رہیں ۔ خواہ ان کی شکل کچھ بھی ہو۔ اور سارے معاملے کو ، اس سے سمجھ لیں جو میں نے آپ کو نقل کر دی ہے۔ DZA

وجاہت علی سندیلوی

یہ زندگی ہماری ہے

جب ہمارے جیسے ناشکرے جنہیں اگر ساری خدائی بھی دے دی جاتی تو بھی بس نہ کہتے، بات بات پر "شکر خدا کا" کہنے لگیں تو اسے قرب قیامت یا پھر ہماری شامت ہی کی علامت کہا جا سکتا ہے۔

پانچ بجے شام کو تھکے ہارے کچہری سے گھر پہنچے تو دیکھا کہ سارے گھر میں 'شکر خدا کا' کا غلغلہ بلند تھا۔ خیال گزرا کہ شاید یہ شکر اس وجہ سے کیا جا رہا ہے کہ عین ہمارے دروازے کے سامنے جو مین ہول آج دو مہینے سے منہ پھاڑے کھلا پڑا ہے اور جس میں بیشتر کے حادثات کے علاوہ پرسوں نصیبن بوا کی ایک چپل اور کل دو مسلم بچے گر گئے تھے، اس کو پار کر کے ہم صحیح و سالم گھر آ گئے ہیں، لیکن یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ بیچ پچھواڑے میں ننھے میاں چارپائی پر بے سدھ پڑے ہوئے تھے۔ بھابی 'شکر خدا کا' کہہ کہہ کر ان کے منہ میں پانی ٹپکا رہی تھیں اور بیگم ان کے پنکھا جھل جھل کر 'شکر خدا کا' بڑبڑا رہی تھیں۔ چچی جان کسی جیتی ہوئی ٹرافی کی طرح، مٹی کے تیل کا ڈبہ سینے سے لگائے صحن میں دوسرے نابالغ خاندانی افراد کے ساتھ باجماعت بلکہ با قرأت 'شکر خدا کا' بار بار دہرا رہی ہیں۔

'شکر خدا کا' زور کچھ کم ہوا اور ننھے میاں کے ہوش و حواس اپنی جگہ پر واپس آئے تو پتا چلا کہ وہ روز کی محنت سے نیز ہزاروں دھکے کھانے کپڑے پھڑوانے ٹوپی گنوانے اور جوتے گم کرنے کے بعد وہ راشن کارڈ پر دو لیٹر مٹی کا تیل لانے میں کامیاب

ہوتے ہیں۔ واقعی اگر مٹی کے تیل جیسی آسائشی چیزیں، جب کہ روشنی کے لئے آفتاب عالم تاب پہلے ہی سے موجود ہے، آسانی سے ملنے لگیں تو عوام سُست اور کاہل ہوکر زندہ رہنے کا حوصلہ کھو بیٹھیں گے۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ حکومت کو یہ پتا نہیں چل پاوے گا کہ یہ چیزیں کون لوگ ضرورتاً خرید رہے ہیں اور کون محض تفریحاً۔

ہم یہ سوچ کر کہ ننھے میاں کی جوتیوں کی بدولت (استعارۃً نہیں بلکہ واقعتاً) آج رات کو ایک عرصے کے بعد ہمارے باپ دادا کی ڈیوڑھی پر بھی چراغ جلے گا، وفورِ جذبات سے آبدیدہ ہو گئے اور لپک کر نہ صرف ننھے میاں کو ان کے مٹی کے تیل سے بسے ہوئے کپڑوں سمیت گلے سے لگا لیا بلکہ اس امکان پر بھی آئندہ غور کرنے کا تہیہ کیا کہ کبھی اِن کپڑوں سے بھی روشنی کی حاجت رفع کی جا سکتی ہے۔ آخر ساتویں فلتے تو بلی بھی حلال ہو جاتی ہے۔ پیرہنِ حضرت یوسف سے تو صرف اُن کے پدر بزرگوار کی آنکھوں میں روشنی آئی تھی لیکن پیرہنِ ننھے میاں کے ناچکیدہ مٹی کے تیل سے سارے گھر میں روشنی پھیل جائے گی!

ہم اپنے کمرے میں پہونچ کر بے شکر کی پھیکی چائے اپنے حلق میں انڈیلنے کی کوشش ہی کر رہے تھے کہ باہر پچھواڑے اور صحن میں پھر ایک شور و غوغا بلند ہوا "شکر خدا کا"۔ یا اللہ یہ کون سی نئی نعمت گھر پر نازل ہو گئی؟ ہم جھپٹ کر باہر نکلے تو دیکھا کہ ہر کوئی گھڑا، بالٹی، پیپا، حتیٰ کہ گلاس اور کٹورا تک لئے نل کی طرف بھاگا چلا جا رہا ہے۔ ہمارے ہاتھ کچھ نہیں لگا تو ہجوم کی ہنگامی نفسیات کے ماتحت ہم سامنے رکھی ہوئی ایک چائے کی پیالی ہی لے کر دوڑے۔ "شکر خدا کا" کی گردان کرتا ہوا سارا گھر نل کا محاصرہ کئے ہوئے کھڑا تھا۔ اور نل سے ایک ایک بوند پانی تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایسے ٹپک رہا تھا جیسے کوئی بہت شرمیلی بلبل جو اس راز سے آشنا معلوم ہوتی۔ ع تھم جائے تو موتی، گر جائے تو پانی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اپنے آنسوؤں کو بہانے کے بجائے روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔

اس طرح نل سے پانی ٹپکتا دیکھ کر ہمارے دل سے خون کی بوندیں ٹپکنے لگیں۔ اگر کوئی ترکیب نکل سکتی تو یقیناً پانی سے جتنی دیر میں ایک پیالی بھرتی اُس سے پہلے ہمارے خون سے کم سے کم ایک بالٹی تو ضرور بھر جاتی۔ ہم اپنا خون پی کر رہ گئے لیکن اس سے کیا؟ ہمارا خون تو پانی سے کہیں زیادہ حقیر ہے۔ سنتے ہیں کہ بعض لوگ روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں لیکن ہمارے جیسوں کے لئے تو پانی روپیوں سے بھی زیادہ گولر کا پھول ہے۔ حضرت غالب کو بھی پنشن کے روپے تو مل گئے لیکن پانی کی ہوس میں غرقِ دریا ہونے کی تمنا صرف نقش بر آب ثابت ہوئی

نل کے اس طرح آنے پر جو نہ آنے سے بدتر تھا، ہم نے اپنی خجالت مٹانے کے لئے ننھو کو ڈپٹا:

"اگر ایک نل سے آدھے منٹ میں ایک بوند پانی ٹپکتا ہے اور ایک لیٹر میں پچاس لاکھ بوندیں ہوتی ہیں تو بتاؤ آٹھ لیٹر کی بالٹی کتنی مدت میں بھر جائے گی؟" وہ سمجھ گیا کہ ع ایک چھیڑ ہے مراد اس سے امتحان نہیں۔ لہٰذا برجستہ بولا "جتنی دیر میں ننھے میاں دو لیٹر مٹی کا تیل لائے تھے"۔ ہم نے اُس پر ہاتھ اُٹھانا چاہا لیکن ہاتھ میں صرف چائے کی پیالی تھی ـــــ نل سے پانی نکلنے کی مقدار کے مطابق غالباً سب سے مناسب ترین برتن ہمیں لے کر گئے تھے ـــــ لہٰذا "شکر خدا کا" کہتے ہوئے اپنے سنسان اور تاریک کمرے میں لوٹ آئے۔

صحن میں 'شکر خدا کا' ایک تازہ کہرام برپا ہوا تو پتا چلا کہ نل سے پانی کے قطرے اب ایک دھار میں آنے شروع
ہو گئے ہیں۔ وہ دھار خواہ رگِ گل کی طرح نہیں اور کمرِ معشوق کی طرح قیاسی سہی بہرکیف دھار تھی اور جب
اپنے کمرے سے نکل کر ہم نے اُسے دیکھا تو ہماری کچھ ڈھارس بندھی کہ مہذب دنیا سے ہمارا رشتہ لاکھ مجروح اور
مشکوک سہی مگر کچھ نہ کچھ تو ایسا باقی ہے کہ ہمارے پاس بھی واٹر چارج کا بل آئے گا۔

لیکن ہمیں بڑا تعجب ہوا جب ہم نے دیکھا کہ چچی جان نل کی طرف آنکھ جھپکائے بغیر دیکھتے ہوئے ہاتھ
کے اشارے سے سب کو 'شکر خدا کا' بجا لانے سے منع کر رہی ہیں۔ یقیناً ان کی تجربہ کار آنکھیں اس سنبھالے
میں مریض کی موت کی قربت دیکھ رہی تھیں اور پھر ہوا بھی یہی۔ نل نے ڈیڑھ ہچکی لی یعنی ایک پوری جس سے
دھار کا تواتر ٹوٹ گیا اور دوسری آدھی، جس سے قطرے ٹپکنا بھی بند ہو گئے اور نل ایسا خاموش اور جامد
ہوا جیسے اس بیچارے سے پانی نکلنے کی غلطی کبھی سرزد ہی نہ ہوئی ہو ؎

ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا   ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

ہمیں یقین ہے کہ اگر کوہکن سے جوئے شیر لانے کے بجائے ہماری نگر پالکا کے کسی نل سے پورے دن
میں ایک بالٹی پانی لانے کو کہا جاتا تو وہ تیشے سے پہاڑ کھودنے اور اپنا سر پھوڑنے کے بجائے شیریں کے عشق ہی
سے دست بردار اور سر پہ بالٹی رکھ کر فرار ہو جاتا۔

اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ چچی جان گھر کے مختلف حصوں میں رہنے والوں کے درمیان اس طرح مٹی
کا تیل بانٹنے بیٹھیں جیسے جلانے کے لئے تیل نہیں بلکہ لگانے کے لئے عطر مرحمت فرما رہی ہوں اور جب ورق تمام
ہوا اور مدح باقی ہے، کا مضمون آیا تو انھوں نے مجبوراً یہ آرڈیننس جاری کر دیا کہ سب لوگ اپنے اپنے کمروں
کے بجائے گھر کے مرکزی ہال میں لیٹیں اور وہاں صرف ایک چھوٹا سا لیمپ روشن کر دیا جائے۔ یقیناً ماہرین
عمرانیات کے لئے یہ نکتہ تحقیق طلب ہے کہ مشترکہ خوابگاہوں سے ضبطِ تولید کی تحریک کو کس انداز سے
بڑھاوا دیا جا سکتا ہے مگر کسی چھوٹے سے لیمپ کی شعاعِ امید کا کیا بھروسہ؟ شبے مانند شبے دیگر نمی ماند
پھر جہاں اندھیرا ہو تو اندھیر ہوتے دیر نہ لگے گی اور حکومت اگر اسے مٹی کے تیل کے حصول کے متعلق کسی
قسم کا بلیک میل نہ سمجھے تو ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ ضبطِ تولید کے ضبطِ تولید بن جانے کا بہت تشویشناک
اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

اور پھر برقِ تجلی چمکی، طور جلا اور حضرت موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ مرزا غالب نے فی البدیہہ
یہ شعر عرض کیا ؎

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر   دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

ان جملاتِ معترضہ مع شعر کے عرض کرنے سے اپنی اُس بدحواسی کا اظہار مقصود ہے جو ہم پر اُس وقت
طاری بلکہ مسلط ہو گئی تھی جب ہم مشترکہ خوابگاہ میں جانے کے لئے ٹٹول ٹٹول کر اپنا بستر گول کر رہے تھے۔ اور
دفعتاً ہمارے کمرے کا بلب یک بیک جگمگا اٹھا۔ ہم 'شکر خدا کا' کہتے ہوئے فوراً اپنی مسہری پر سجدہ ریز ہو گئے
بیہوش ہم غالباً نہیں ہوئے تھے کیونکہ سارے گھر میں 'شکر خدا کا' جو ہنگامہ مچا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے

کہ قوالی ہو رہی تھی اس کی تالی بچوں کے ساتھ ہم بھی بجا رہے تھے۔

ہم اپنے سرہانے دمکتے ہوئے بلب ع اک نگار آتشیں رخ، سر کھلا ... کی جانب نظر اُٹھاتے ہوئے شرما رہے تھے۔ اس کو نظر لگ جانے کے خوف سے یا نامحرم سمجھ کر نہیں بلکہ اپنے ان اندیشہ ہائے دور دراز سے کہ کہیں وہ ہمارا داہمہ یا کسی قسم کی نظر بندی نہ ہو ؂

اُمید تجلّی سے معمور ہو کر نظر رہ گئی شعلۂ طور ہو کر

ہم آرام سے بستر پر دراز ہو کر ایک جاسوسی رسالے کی وہ کہانی پڑھنے لگے جس کا آدھا حصّہ ہم پڑھ چکے اور باقی حصّہ آج آٹھ روز سے بجلی کے انتظار میں پڑھنے کو باقی تھا۔ کہانی آہستہ آہستہ اپنے نقطۂ عروج کی جانب بڑھ رہی تھی "ہیروئن نے اپنے چہرے سے مصنوعی مونچھوں کو نوچ کر پھینک دینے کے بعد اپنے نیکر کی جیب سے ایک ننھا سا آئینہ اور لپ اسٹک برآمد کی اور اپنے ہونٹوں کو سرخ بلکہ بہت ہی سُرخ کیا۔ پھر ان چیزوں کو واپس جیب میں رکھتے ہوئے ایک چھوٹا سا پستول نکال کر اپنے سامنے کھڑے دونوں نوجوانوں کی طرف تانا اور ڈپٹ کر بولی "اب میں بتاتی ہوں کہ تم دونوں میں سے میری دوشیزگی لوٹنے والا کون ہے؟" اور قبل اس کے کہ ہم اُس نیک بخت کے نام سے روشناس ہوتے ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا کیا ہم بے ہوش ہو گئے تھے؟ جی نہیں۔ کیا ہم اندھے ہو گئے تھے؟ جی نہیں۔ شکر خدا کا۔ صرف بجلی جا چکی تھی ــــــ

ہمارے قصبے میں بجلی نہیں صرف بجلی کے بل آتے ہیں۔ اور اُن کو دیکھ کر جو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں آنکھوں سے کچھ روشنی میسّر آ جاتی ہے۔ کبھی کبھی چند ساعتوں کے لیے جو بجلی کی کوندے کی لپک جیسی جھلک نصیب ہو جاتی ہے تو اس کی مثال ویسی ہی ہے جیسے بے ارادہ کسی حسینہ کے منہ سے ذرا سا گوشۂ نقاب ہٹ جائے۔ اس سے بجلی کے محکمے کے پردازوں کی کارکردگی پر کوئی حرف نہیں آنا چاہیئے۔ ہم نے ایک آہِ سرد بھر کر اپنے ہاتھ کا رسالہ کمرے کے بلب کی طرف پھینک مارا

؂ تیری فرصت کے مقابل اے بلب برق کو پابندِ حنا باندھتے ہیں

'شکر خدا کا' چچی جان کی ایک دل دوز چیخ سنائی دی۔ اب کیا ہوا؟ اب کون سی نعمت آنے کو باقی رہ گئی تھی؟ معلوم ہوا کہ بدھو صبح کی چائے کے لیئے بڑی حکمت علی سے پانچ روپے کیلو کے نرخ پر بلیک سے شکر خرید کر واپس لوٹ رہے تھے کہ اچانک بجلی گُل اور شکر کی پُڑیا گُم ہو گئی تھی۔ کسی زیادہ ضرورت مند نے ان کے ہاتھ سے اُچک لی تھی اور اُنھوں نے تعاقب کی کوشش کی تو مین ہول میں گرتے گرتے بچے تھے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ خیر سے بدھو گھر کو آئے۔ 'شکر خدا کا'۔

ہمارے گھر کے سامنے پارلیمنٹ کے دو امیدواروں کے لاؤڈ اسپیکر گرج رہے تھے۔ دونوں کا ٹیپ کا بند مشترکہ تھا "ہماری جیت آپ کی جیت ہے" ہم اس خیال سے خوش ہو رہے تھے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی جیتے یا ہارے ہم بہر حال جیتیں گے جیسے کہ آج تک ہر الیکشن میں جیتتے چلے آئے ہیں اور پھر اپنی جیت میں مگن ہم ایسے بے خبر سو گئے جیسے گھوڑے بیچ کر نہیں اپنے ملک کی آزادی کے بتیس سال بیچ کر سو رہے ہوں۔

آئینہ

بڑھاپا اور کبریٰ بیگم

از ـــــ رشید قریشی ایم۔اے

[یہ مضمون زندہ دلانِ حیدرآباد کے حالیہ ادبی اجلاس میں پڑھا گیا اور حاضرین کی مسلسل داد نے اسے "حاصلِ محفل" بنادیا ـــــ ادارہ]

کیا بات نئی ہم میں نظر آتی ہے
آئینہ ہمیں دیکھ کے حیران کیوں ہے

آئینہ کو آئینہ دیکھنے والے ہیں نئی بات جو نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ چہرہ کی جلد جگہ جگہ سے کٹ پھٹ کر جھریوں میں بدل گئی ہے اور سر کے بالوں کی چمکتی سیاہیاں بدرنگ بھوری پڑ گئی ہیں۔ جیسے بھونرے اُڑ گئے اور ان کی جگہ بگلے بیٹھ گئے۔

اصولاً بوڑھوں کو آئینہ دیکھنا ہی نہیں چاہیئے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ حتی الامکان اس سے مُنہ چھپاتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود آئینہ انہیں چوری چھپے دیکھتا اور ان پر ٹھٹھے لگاتا پھرتا ہے۔ اب ذرا اسی واقعہ کو لیجئے: ایک بزرگ کی نظر اتفاقاً ایک دوشیزہ کے دمکتے چہرہ پر پڑ گئی۔ پہلی نظر چونکہ جائز ہوتی ہے اس لئے یہ نظر وہاں کچھ زیادہ دیر ٹھیری۔ بس غضب ہوگیا! ـــ دوشیزہ کی آنکھوں پر لگی عینک کے رنگین شیشوں نے شور مچادیا کہ لوگو دیکھو یہ بڈھا بُری نظر سے گھور رہا ہے۔ اب وہ بزرگ کانپتے لرزتے یقین دلا[رہے] ہیں کہ بوڑھی آنکھوں میں بُری نظر کی سکت ہی نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ تو عینک کے شیشوں میں اپنی صورت کے ساتھ ساتھ جنت کی اس حور کی جھلک دیکھ رہے تھے جو بہت جلد ان کے تصرف میں آنے والی ہے۔ لیکن ان کے بیان کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور یہ فیصلہ سُنادیا گیا کہ بڑے میاں کا جسم تو بوڑھا ہوگیا' دل ابھی تک جوان ہے۔ جسم میں جوان دل کہاں؟ جسم بوڑھا تو دل بھی بوڑھا البتہ جوانی کی یادیں کبھی کوئی دھڑکن چنچل مچھلی کی طرح اچھل جاتی ہے اور پھر وہی بڑھاپے کا گندہ ٹھیرا ہوا پانی۔ اب اسی اتفاقی غیر محسوس خیال جوانمردی کو بھی ...

ہرایا جائے تو مایوس و مجبور و معذور بوڑھے از سر نو جوان ہونے کے جتن نہ کریں تو کیا کریں ؟ خود میں بھی اس
سے یں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں ۔

ہوا یہ کہ میں ایک دن گھریلو فضا کی گھٹن سے گھبرا کر پھاٹک کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا ۔ بھینسوں ،
یوں اور کتوں کو ذہنی اذیتوں سے محفوظ خوش و خرم دنیاداری کرتے دیکھ کر یک گونہ سکون مجھے حاصل
ہو رہا تھا کہ ..... ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو گھسیٹتی ہوئی میرے پاس پہنچ کر رک گئی غصہ سے اپنے
بڑے پھاڑتی اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلائی " اب سیدھی طرح اسکول چل ورنہ ...
یہ .... یہ ..... یہ بڈھا تجھے پکڑ لے گا " ...... یہ بڈھا ...... یہ ـ یہ بڈھا ...... میں
بڑی طاقت سے کھنکار اٹھا اور وہ روتا ، چنگھاڑتا ، اڑیل بچہ .... سہم کر یوں چپ ہو گیا جیسے میری
کھنکار نے اس کے سارے آنسو قبض کر لیئے ۔ میرا سر کرسی سے اچھلا جیسے تلوار سے قلم ہو گیا ! اور میں
پیچھے بغیر سر کے دھڑ کو گھسیٹتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا ۔ بستر پر گر کر میں نے وہ سارے آنسو تکیہ میں جذب
کر دیئے جو اس نٹ کھٹ بچے نے روک لئے تھے ۔ یہ مقام فضیلت مبارک ہو .... میں بڑبڑاتے
لگا .... اب تجھے رونے والے ضدی بچوں کو ڈرانے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے .... مبارک ہو ۔

"کس سے باتیں کر رہے ہیں جی آپ ؟" بیگم نے پوچھا ۔ میں نے جواب دیا ... " تمہارے تو کان بجتے
رہتے ہیں ۔ یہاں کون ہے جس سے میں باتیں کروں گا ؟" بیگم سرہانے آبیٹھیں اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے
ہوئے شفقت آمیز لہجہ میں کہنے لگیں ..." میں شرمندہ ہوں جی ۔ ان نواسوں ، نواسیوں ، پوتروں ، پوتریوں
کو سنبھالنے سنبھالنے میں آپ میرے ذہن سے بالکل اتر جاتے ہیں ... اور آپ اپنے سر کے بالوں پر استرا
پھروا لیجئے بہت سفید ہو گئے ہیں .... میری بچپن کی ایک سہیلی نے آپ کو دیکھا تو مجھ سے پوچھا
یہ تمہارے مرحوم خسر ہیں نا ؟ سن رہے ہیں نا آپ ... ؟ میں سب کچھ سن رہا تھا .. لیکن میں رو رہا تھا ..
بعد خشک آنسو رونے والا جواب دینے کی کوشش کرے تو چیخنے لگتا ہے ۔ اس لیئے میں دبکی مار گیا .. جیسے سو گیا ۔

دوسرے دن بیگم نے مجھے علی الصبح جگا دیا ۔ کہنے لگیں اب آپ روز صبح کو چہل قدمی کے لئے جایا کیجئے ۔
میں نے سنا ہے ، ریس کورس کی طرف آپ کے جیسے کئی وظیفہ یاب بوڑھے چھڑیاں گھماتے ... چہل قدمی کے لئے
آتے ہیں ... ان کی سنگت ۔ میں آپ کا وقت بھی دلچسپ گذرے گا اور صحت بھی اچھی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے
یہ نکما بڑھاپا بھی دور ہو جائے ۔ میں نے بیگم کی بات مان لی کیوں کہ اس طرح ان سے چند گھنٹے تو چھٹکارا میسر
آ سکتا تھا ۔ ایک دن میں چہل قدمی کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ بیگم نے رک جانے کو کہا ... " دیکھئے ادھر بچوں
کے لئے پتلا پانی دودھ ملتا ہے ... وہاں مارکٹ کے پاس جو دودھ والا ہے وہ اچھا دودھ دیتا ہے ۔ آپ یہ
دودھ کا کین اپنے ساتھ لیتے جائیں " میں حیرت سے بیگم کو گھورنے لگا تو انھوں نے سمجھایا ... " اس میں
مشکل ہی کیا ہے ؟ جاتے جاتے کین دودھ والے کو دیتے گئے اور آتے آتے دودھ بھرا کین لیتے آ گئے "
بچوں کے خیال سے میں اس مشورہ پر کاربند ہو گیا ۔ چند دن بعد بیگم نے کہا ... " اب آپ تھیلی بھی ساتھ لے جایا

کیجئے۔ اس طرح اصلی پوٹلے کا گوشت بھی آیا کرے گا۔ اس مشورہ میں اپنے ذائقہ کا سامان تھا اس لئے کین کے ساتھ تھیلی بھی میرے ہاتھ میں آگئی۔۔۔ اور دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں سے میری چہل قدمی جاری ہوگئی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک ہاتھ میں کین اور دوسرے میں گوشت کی تھیلی لئے گھر لوٹ رہا تھا کہ میرے ایک بہی خواہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے میری یہ دُرگت دیکھی تو خبردار کیا کہ تھیلی اور کین کی خانگی ملازمت سے ہاتھ چھڑالو۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔ دیکھو۔۔۔۔ اِدھر ہی آٹے کی گرنی بھی ہے۔۔۔۔ اور لکڑیوں کی ٹال بھی۔۔۔۔ بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے بیگم سے کہہ دیا۔ اب میری چہل قدمی ختم ہوتی ہے کیونکہ جس سڑک پر یہ چہل قدمی ہوری ہے اس پہ میرے ایک تیز قدم ہم قدم کو ہارٹ اٹیک ہوگیا اور اس واردات کی بنا پر اس سڑک کا نام ہی "دِلبند روڈ" مشہور ہوگیا ہے۔

بوڑھے شوہر جن کی زندگی کا بیمہ نہیں ہوتا بہت احتیاط سے برتے جاتے ہیں۔ ان کی بیماریوں کے مبہم اشارے بھی دور اندیش بیویوں کو حواس باختہ کردیتے ہیں۔ میں چہل قدمی کو موقوف کرکے گھر بیٹھ رہا تو بیگم نے حکیم قلع قمع کو بلوالیا۔

حکیم صاحب : آپ کیا بچپن سے بوڑھے ہیں ؟

میں : جی نہیں۔ بچپن میں تو میں بچہ ہی تھا۔

حکیم صاحب : تو کیا جوانی میں بوڑھے ہوگئے ؟

میں : جی نہیں، جوانی میں تو بیگم صاحبہ لاحق ہوئیں۔

حکیم صاحب : تو گویا بڑھاپے سے آپ بوڑھے ہوئے ہیں ؟

میں : جی۔۔۔ وہ تو ٹھیک ہے لیکن طب نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ بڑھاپا، بڑھاپے میں بھی کیوں رہے ؟

حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اس کے بعد پوچھ بیٹھے "آپ علاج پر کتنا خرچ کرسکتے ہیں"

میں نے جواب دیا ــــ "اگر میرا بڑھاپا دور ہوگیا۔ میرے بال کالے ہوگئے تو میں گریجوٹی کی پوری رقم آپ کی نذر کردوں گا"۔۔۔ کہنے لگے "میاں ــــ قلع قمع کے معنی ہی ہیں۔ بڑھاپا دفع۔۔۔ اور رہا بالوں کا کالا ہونا تو صرف اتنا کہوں گا کہ اگر میری دوا کسی سفید مرغ کو چالیس دن کھلائی جائے تو اکتالیسویں دن۔۔۔۔ ایک کالا کوا آپ کے سامنے حاضر ہوکر بانگ دینے لگے گا"۔ میں اور ایک سفید مرغ۔۔۔۔۔۔ ہم دونوں ایک ساتھ حکیم صاحب کی گولیاں کھانے لگے۔

اس اثناء میں خبر ملی کہ میری ایک عزیزہ کبریٰ بیگم جو چالیس برس پہلے کراچی چلی گئی تھیں اب بیوہ اور اکیلی واپس آگئی ہیں۔ یہ کبریٰ بیگم وہی تھیں جن سے میری شروع شروع کی جوانی نے پہلی پہلی محبت کی تھی اور ہوسکتا تھا کہ ہماری شادی بھی ہوجاتی لیکن میری بدقسمتی کہ محبت بھی ہوئی تو بخیل باپ کی بیٹی سے۔۔۔ اور آپ جانتے ہیں۔۔۔ پہلی محبت اندھیرا۔ دوسری محبت ٹھوکر۔ اور تیسری محبت گڑھا ــــ میں اندھیرے میں

شوہر رہ گیا۔ اور ایک پردیسی نے دوطرفہ شادی کا انتظام کرکے میری کبریٰ بیگم کا اغوا کرلیا۔ کبریٰ بیگم اب شاید میرے اغوا کے لئے آئی تھیں۔ کیونکہ رات کے ۱۰ بجے چائے پینے کے لئے بُلایا گیا تھا۔ میں نے سوچا اس دعوت کو ٹال جاؤں کیونکہ حکیم صاحب کے علاج کو صرف ۳۰ دن ہوئے تھے اور تکمیل کے لئے ابھی ۱۰ دن باقی تھے لیکن پھر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ ۱۰ گولیوں کی ایک گولی بنالی جائے اور کبریٰ بیگم کے ساتھ چائے پی ہی لی جائے۔

مثل مشہور ہے وقت مرد کی کمر توڑ ڈالتا ہے لیکن عورت کی صرف چوڑیاں توڑ سکتا ہے۔ کبریٰ بیگم دلہن تو نہ رہیں لیکن بیوہ بھی نظر نہ آئیں اور ایک خاص تبدیلی جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ جن آنکھوں سے بات بے بات آنسو ڈھلک پڑتے تھے اب وہاں ایک ابر سا چھایا رہنے لگا تھا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد کبریٰ بیگم نے پوچھا " یاد ہے ..... مولسری کے پاس کا وہ چھوٹا سا ویران کمرہ . . . آپ ایک رات وہاں مجھے شیطان دکھانے لے گئے تھے .... یاد ہے " میرا حلق سوکھنے لگا۔ "یاد ہے . . . " کبریٰ بیگم کو پھر کچھ یاد آیا . . . " آپ مجھے کبّو کہا کرتے تھے .... اور میں آپ کو اُلّو " میں نے حسرت سے کبریٰ بیگم کی طرف دیکھا . . اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کی آنکھوں کا ابر ... جھکتا جھکتا . . . میری طرف بڑھ رہا تھا . . . عین اسی وقت گولی کا خیال آیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ گولی کو منہ میں ڈال کر نگلنا چاہا تو .... وہ کھسکتی کھسکتی حلق کے ابتدائی حصہ تک گئی۔ لیکن اندر سے نکلنے کون سا دباؤ کارفرما ہوا کہ اچھل کر پھر منہ میں آگئی۔ زور لگا کر میں نے گولی کو پھر حلق کی سمت ڈھکیلا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا حلق پکڑ لیا۔ کبریٰ بیگم نے تشویشناک لہجہ میں پوچھا۔ " یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟" میں چپ رہا۔ لیکن کہنا چاہتا تھا "کبّو۔ میرے منہ میں انٹر کان ٹی نینٹل 'گولی بال' ٹورنمنٹ منعقد ہے ... مجھے گولی نگل جانے دے . . . پھر دیکھ کیا ہوتا ہے ؟" اچانک پیٹ کے پاتال سے ایک سائیکلونی ٹھسکہ اُبھرا۔ اس کو روکنے کی جان توڑ کوشش جو میں نے کی تو .... غٹ سے .... گولی حلق سے نیچے ــــ گولی کا حلق سے نیچے جانا تھا کہ ٹھسکہ مخالف سمت اختیار کرگیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا ..... اور تڑپ کر اُٹھا تو بچہ بردار کنگرو کی طرح زقندیں بھرتا .... یہ جا .... کبریٰ بیگم کا دروازہ .... وہ جا .... اپنا باتھ روم .... باہر سے بیگم نے حکم سنا دیا۔ اب اس حکیم کی دوا بند کر دیجئے۔ فائدہ وائدہ کچھ بھی نہیں اُلٹا پیچش لگ گئی۔ اس کے بعد ایک شادی میں کبریٰ بیگم سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں دلہن سے ایجاب قبول کے لئے زنانہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کبریٰ بیگم دلہن پر سایہ فگن کھڑی ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا " خیریت ؟" اور ان کی طنز بھری مسکراہٹ نے جواب دیا ..." میری خیریت پر مٹی ڈالو ... تمہارا ٹھسکہ کیسا ہے بولو ؟"

حکیم صاحب اپنی دوا کے اثرات کی تفتیش کے لئے آئے تو میں نے وہ اونگھتا سفید مرغ ان کے حوالے کر دیا اور سارے علاجوں سے تائب ہوگیا کیونکہ یہ حقیقت اب مجھ پر گہن سے نکلے سورج کی طرح روشن ہوگئی تھی کہ جو ... بارہ جوان بننا چاہتا ہے وہ بوڑھا بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

یہ سمجھنا کہ ہمارا معاشرہ، پہلے بے حد شرمیلا اور پردہ نشین قسم کا معاشرہ تھا
ور یہ کہنا کہ ہماری سابقہ نسل کے افراد، اس طرح کھلے بندوں نہیں پھرا کرتے تھے، صحیح نہیں ہے (اس میں کوئی قباحت
ہیں ہے کیونکہ آدمی، آدمی ہوا کرتا ہے، فرشتہ نہیں ہوتا)۔ غالب کے یہ چھ شعر جو ابھی آپ کی خدمت میں پیش کئے
انے والے ہیں اس لحاظ سے بہت اہم اور تاریخی ہیں کہ ان اشعار سے چند حقائق کھل کر سامنے آتے ہیں۔

آدمی کی نفسیات، عمر اور تجربے کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ اس کے سو
سمجھنے اور کرنے کرانے کا ڈھنگ بھی تبدیل ہوتا رہتا ہے کیونکہ آدمی خاک کا
تو ہے لیکن پتھر کا مجسمہ نہیں۔ آدمی کے خمیر میں بنیادی طور پر صرف چار ہی عن
ہیں جو ادب میں عناصر اربعہ کے نام سے مشہور ہیں۔ آب و آتش اور خاک و
(نمک، خون اور دیگر جراثیم بعد کی پیداوار ہیں۔ ان چیزوں کو فنی مشکلات کی
سے عناصر کہا بھی نہیں جا سکتا) آدمی کے جسم میں پانی اس لئے رکھا گیا کہ آنسو پانی
سے بنتے ہیں ــــ (گلیسرین والے آنسو صرف فلموں میں رائج ہیں) ــــ
ایک شاعر نے تو یہ تک کہا ہے کہ شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا ورنہ
ہم اگر رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہا دیں۔ اسی لئے ہندوستان میں دریا
کی تعداد زیادہ ہے اور ان میں وقفے وقفے سے طغیانیاں آتی رہتی ہیں
شاعروں کے جسم میں پانی کی مقدار، آدمیوں کے مقابلے میں ذرا زیادہ ہوتی
کیونکہ ان کے فرائض منصبی کی نوعیت الگ ہے ــــ دوسری چیز ہے آگ۔ آگ
آمیزش۔ اسی لئے ضروری تھی کہ آدمی بغیر پڑھے لکھے آتش بیان مقر

بن سکے اور مجمع عام میں تقریر کرتے وقت سامعین کے دانز اور غیر ضروری جذبات کو بھڑکا سکے ـــــ آدمی کے جذبات اگر نہ بھڑکا کریں تب بھی مشکل ہے ـــــ مٹی کی موجودگی اس لئے لازمی قرار پائی کہ زندگی گذارتے وقت آدمی کو خاک پھانکنے میں تکلیف نہ ہو۔ رہی ہوا تو اس کا داخلہ اس لئے ضروری تھا کہ گیسیں ہوا ہی سے بنتی ہیں اور بنا گیسوں کا آدمی ادھورا ہوا کرتا ہے۔ آدمی کے جسم میں مزید آٹھ دس عناصر اربعہ کی گنجائش تھی کیونکہ آدمی کا جسم تنگنائے غزل نہیں ہے لیکن اضافے کا یہ معاملہ حکیموں، ویدوں، طبیبوں اور ڈاکٹروں کے صوابدید پر چھوڑ دیا گیا اور یہ لوگ حسب مقدور اس مسئلے پر توجہ دے رہے ہیں۔

مروجہ چار عناصر اربعہ پر مشتمل آدمی ہر دور میں یکساں حالت میں پایا گیا ہے۔ شروع شروع میں وہ سمٹا سمٹا یا رہتا ہے، شرماتا ہے، لجاتا ہے۔ کئی معاملوں میں تکلف سے کام لیتا ہے اور اکثر موقعوں پر اُسے تامل ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ وہ آدمی بن جاتا ہے۔

غالب نے اپنے اوّلین اشعار میں سے ایک شعر میں اپنے محبوب کی ابتدائی شکل اور کیفیت کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسے کو پوچھتا ہوں میں مجھ کو بتا کہ یوں

اس شعر کے پہلے مصرعے کو تین چار مرتبہ پڑھا جائے تو تامل، تکلف، تذبذب، ذہنی کشمکش، ڈر اور خوف کے علاوہ شرم اور لحاظ کے عوارض اور عوامل کا اندازہ ہوتا ہے جن سے مشرقی تہذیب کی چار دیواری بنتی ہے۔ خود غالب بھی عرصے تک اسی تذبذب کے بندے رہے۔ انھوں نے اپنا حال اس طرح بیان کیا ہے۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

اس کے کئی دنوں بعد جب اُن میں کچھ ہمت پیدا ہوئی تو انھوں نے دست سوال دراز کیا اور محبوب نے ٹکا سا جواب دیا یعنی دور سے غنچۂ ناشگفتہ دکھا دیا (اسے انگوٹھا دکھانا بھی کہا جاتا ہے)

غالب نے اس کے بعد محبوب پر کڑی نگرانی رکھی۔ اس کی نقل و حرکت پر ان کا اتنا سخت پہرہ تھا کہ محبوب کہیں بھی آجا نہیں سکتا تھا۔ ایک مرتبہ محبوب کے پاؤں دُکھ رہے تھے تو غالب کو شبہ ہوا اور انھوں نے اپنے شک و شبہ کو چھپایا نہیں بلکہ فوراً کہا ـــ

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دُکھتے ہیں آج اُس بت نازک بدن کے پاؤں

(غالب خواب میں آنے جانے کے معاملے میں محاورے نہیں بدلا کرتے تھے۔ پہلا مصرعہ اصل میں یوں ہونا چاہیئے تھا، شب کو کسی کے خواب میں پہنچا نہ ہو کہیں ـــ لیکن صحیح محاورہ خواب میں آنا ہے نہ کہ جانا ہے اور پہنچنا)

اس کے بعد وقت تیزی سے گذرنے لگا اور محبوب نے اپنی روایتی شرم و حیا بالائے طاق رکھ دی (ہر گھر میں طاق ضرور ہوا کرتے ہیں۔ آرکیٹکٹ کتنا ہی عظیم الشان اور ماڈرن کیوں نہ ہو، دیواروں میں طاق ضرور بناتا ہے اور آج سے

سو ڈیڑھ سو سال پہلے تو گھر کم بنتے تھے اور طاق زیادہ) غالبؔ کی نظر بچا کر، چھپ چھپا کر محبوب اپنی خانگی مصروفیات میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگا اور غالبؔ ایک دن ہکا بکا رہ گئے۔ جب ذہنی محبوب جو دور سے غنچۂ ناشگفتہ دکھایا کرتا تھا، غالبؔ کے بالکل قریب آگیا۔ دن بدلتے دیر نہیں لگتی۔ غالبؔ بہت جز بز ہوئے اور انھوں نے اپنی ذہنی پریشانی کا اظہار اس طرح کیا۔

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

یہ معاشرتی انقلاب کا پہلا دھماکہ تھا۔ مشرقی تہذیب کی چار دیواری میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ غالبؔ کو پہلے تو صرف شبہ تھا لیکن ایک مرتبہ تو انھوں نے "چشم دید واقعہ" دیکھ لیا۔ اس دن غالبؔ بہت جھلائے اور اُن کے غصے کا پارہ چڑھ گیا (ہونا بھی یہی چاہیئے تھا) غالبؔ نے اس سے پہلے محبوب کو کبھی ڈانٹا نہیں تھا۔ کیونکہ محبوب ڈانٹنے کی چیز نہیں ہوا کرتا لیکن جب حالات قابو سے باہر ہو جائیں اور بات کہیں کی کہیں پہنچ جائے تو آدمی کتنا ہی بُردبار اور حوصلہ مند کیوں نہ ہو اپنے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا۔ غالبؔ نے اس لئے کہا۔

کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
بس چپ رہو، ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

سُنی سنائی بات ہوتی تو غالبؔ سمجھ بھی جاتے اور سابق میں اُنھوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ صرف شبہ کا اظہار کیا تھا کہ غیر کی صحبت میں یہ عادت نہ پڑی ہو لیکن آنکھوں دیکھے حال پر وہ کیسے صبر کر لیتے۔ چشم دید واقعات میں قصور وار شخص کو شبہ کا فائدہ دے کر بَری نہیں کیا جا سکتا۔

غالبؔ کے یہ پانچ شعر، واقعاتی شعر ہیں، بلکہ یہ شعر نہیں روزنامچہ ہیں (پولیس ڈائری کے اندراجات اسی نوعیت کے ہوا کرتے ہیں۔ غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے دکھانے والا نوعمر شخص، چند ہی دنوں میں اس منزل پر پہنچ جائے گا، یہ بات غالبؔ سوچ بھی نہیں سکتے تھے ــــــ غالبؔ چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن کوتوال شہر سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے اس لئے انھوں نے کوئی خطرہ مول لینا پسند نہیں کیا اور خود کو یہ کہہ کر تسلی دے دی۔

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

اِتنا لمبا پروگرام صرف غالبؔ ہی بنا سکتے تھے۔

لوفروں کی طرح

محبوب راہی

وہ بیویاں کہ جو لگتی ہیں شوہروں کی طرح
نچاتی رہتی ہیں مردوں کو بندروں کی طرح

مشاعرہ ہے عجب شئے کہ اچھے خاصے لوگ
اچھلتے کودتے رہتے ہیں جوکروں کی طرح

کبھی تو بند رکھو اپنی چونچ کو بیگم
نہ بھنبھناؤ شب و روز مچھروں کی طرح

تمہارے ٹھیکرے سونے سے بھی گراں تر ہیں
ہمارے لعل و جواہر ہیں پتھروں کی طرح

بنے گا منّا یقیناً وزیر بھارت کا !
ابھی سے کرتا ہے باتیں منسٹروں کی طرح

جو تھا فساد کا بانی وہ آج بستی میں
پھرے ہے امن کمیٹی کے ممبروں کی طرح

ملوکیت مری سسرال کی خدا رکھے
جہاں ٹریٹ میں ہوتا ہوں نوکروں کی طرح

ہے جن میں جھوٹ کا عنصر نناوے پرسنٹ
کرو نہ باتیں میاں ہم سے لیڈروں کی طرح

بیاہ کر کے کسی لکھ پتی کی بیٹی سے
رہیں گے ٹھاٹ سے ہم بھی تونگروں کی طرح

ہیں صبح و شام مسائل کے تانوں بانوں سے
ردا حیات کی بُنتا ہوں بنکروں کی طرح

بنا کے اپنے رقیبوں کے مقبرے اب ہم
پڑھیں گے فاتحہ ان پر مجاوروں کی طرح

تمہیں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اے راہی
نہ خود کو پوز کرو، یوں سخنوروں کی طرح

غزل

محمود نشتر

شادی کر کے نڈھال ہو گئے ہم
اچھے خاصے اُلّال[۱] ہو گئے ہم

بنا پانی کنال ہو گئے ہم
سوکھے جھاڑوں کی چھال ہو گئے ہم

حال بگڑا ہے کیا گرانی سے
شال تھے اب رُمال ہو گئے ہم

جو کنوارے ابھی ہیں ان کے لئے
ایک زندہ مثال ہو گئے ہم

لب ہلانے کی کیا ضرورت ہے
آپ صورت سوال ہو گئے ہم

اک زمانے میں کارخانہ تھے
اب تو لکڑی کی ٹال ہو گئے ہم

اپنے گُٹنے کا حال مت پوچھو
جیسے مردوں کا مال ہو گئے ہم

ہم تو گھر میں نہ تھے چونّی بھی
جا کے باہر ریال ہو گئے ہم

الٹی سیدھی غزل لکھے نشتر
شاعرِ باکمال ہو گئے ہم

۱ دکنی تلفظ

کچھ موڈ اور مزاج

خواجہ عبدالغفور
آئی اے ایس

انسان اشرف المخلوقات اس لیے کہلاتا ہے کہ وہ فکر و عقل و دانش اور سوجھ بوجھ کا مالک ہے۔ اس کے پاس صرف بصارت ہی نہیں بصیرت بھی ہے۔ لیکن اس طرح بہت ساری قوتوں اور صفتوں کے علاوہ جو خوبی اس کو دوسری مخلوق سے ممیز و منفرد بناتی ہے وہ اس کی گویائی ہے۔ جس کو اس نے ہزاروں صدیوں میں کامیابی کی حدود سے بہت زیادہ بلند و بالا مدارج پر پہونچایا ہے۔ اپنے مافی الضمیر، اپنے احساسات، تصورات، اپنی مرضی اور خواہشات کے اظہار کے لیے اپنے نطق کو وہ مختلف طریقوں سے استعمال کرتا ہے۔ کبھی حاکمانہ تو کبھی انکساری اور کبھی برابری کا استدعیہ۔ غرض کہ ہر موقعہ محل کے لیے اس کے پاس ایک خاص انداز بیان موجود ہے وہ شیریں مقال بھی ہو سکتا ہے اور تلخ گو بھی۔ اس کے منہ سے پھول بھی جھڑ سکتے ہیں اور شرارے بھی۔ جہاں وہ فصاحت و بلاغت سے کام لے سکتا ہے وہیں پر وہ لوچ، رکیک فحش ہو سکتا ہے۔ گالی گلوچ سے کام لیتا ہے، پگڑی اچھالتا ہے۔ کھلی اڑاتا ہے اور پھر طنز و استہزا کے وار چلا سکتا ہے ـــ یا پھر بذلہ سنجی ظرافت حاضر جوابی ہنس مکھ انداز میں گفتگو کر سکتا ہے ـ

حیثیت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو رلایا میں نے

یہ تو رہیں موڈ کی باتیں لیکن بہت سارے اپنے مزاج کو ہی کچھ اس طرح کا بنا لیتے ہیں کہ ہر بات میں گھوم پھر کر وہ اپنے ہی ... مخصوص انداز فکر اور اسی مناسبت سے انداز تکلم پہ اتر آتے ہیں۔ کتنی ہی سنجیدہ بات ہو، بعض لوگ اس میں مسخرا پن ہو گا ازی بھی یا سپاٹ باتوں پہ اتر آتے ہیں اور بعض کا رنگ ... باڑ دیتے ہیں۔ بعض تو ہر بات میں "میں نہ مانوں" پر اتر آتے ہیں اور ہر ایک کی ٹانگ کھینچنے لگتے ہیں۔ جن میں دوسروں پر طنز بھی ہوتا ہے اور ان کی ہجو بھی ہوتی ہے۔ ان سے بھی زیادہ غیر معمولی بات میں بھی میں میخ نکالتے ہیں بات کچھ بھی ہو، اس میں طنز و استہزا کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ کسی کے نیک اعمال یا خوش اخلاقی کی ـ بات کا اس کو اپنی فطرت کی وجہ سے برداشت نہیں کرتے۔ سمجھا کر کہیں گے، جی بڑے نیک خصلت ہیں۔ وہ تو۔ کوئی شام اللہ کی جام و صبح کے بغیر نہیں گزرتی ـ کسی کو کہتے سنئے نہیں کہ فلاں صاحب نے ڈوبتے ہوئے دو آدمیوں کی جان بچائی تو یہ اکڑ کر کہیں گے، وہ کی تو جان بچائی لیکن جو سلامت رہے ان کے تو جیب ہی انھوں نے کاٹ لی تھی کسر رکھ چھوڑی تھی۔

طنز کا وار بہت ہی گہرا اور کارگر ہونا چاہیے ورنہ یہ الٹا کر گھاؤ لگاتا ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوتا۔

کسی نے طنز یہ کہا "ارے بھئی تمہارا کیا ہے تم جب چاہو زمین آسمان کے قلابے ملا سکتے ہو" مخاطب نے جواب دیا۔ ہاں یہ صحیح ہے لیکن ذمہ دار تم ہی تو ہو کہ زمین پر خاک اچھالتے ہو، آسمان میں شگاف ڈالتے ہو۔

ایک چھوٹے سے پل پر دو موٹر کاریں آمنے سامنے آئیں اور راستہ بند ہو گیا۔ دونوں نے بھی خوب ہارن بجائے کہ دوسرا آدمی اپنی کار کو واپس لے جائے تاکہ اس کے لیے راستہ کھل جائے۔ جب دونوں ہی دیر تک اڑے رہے تو ایک صاحب نے بڑی حقارت سے دوسرے کو کہا۔ دیکھو جی ہم کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے لیے اپنی کار پیچھے لے جانے والے نہیں۔ دوسرے آدمی نے یہ سُن کر کسی طرح کے غیض و غضب کا اظہار کیے بنا طنزاً صرف اتنا کہا۔

"جی میں تو کر لیتا ہوں" ــــــ یہی کہتے ہوئے بھی اس نے دوسرے کو ایرے غیرے نتھو خیرے کے زمرے میں بٹھا دیا۔

کہیں طنز ہلکا پھلکا لطیف ہوتا ہے تو کہیں رکیک اور کثیف مزہ تو اس میں ہے کہ زبان خراب نہ ہو الفاظ پوچ نہ ہوں بات اتنی زبردست ہو کہ خوب خوب دھکا لگے اور دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر جائے۔

ایک صاحبزادے بڑے گھر کے چشم و چراغ تھے اسکول بڑے ٹھاٹھ سے قیمتی موٹر میں آتے اپنے باپ کی دولت کا ممنون طریقہ پر دکھاوا کرتے اور یہ امید رکھتے تھے کہ ان کے ہم جماعت ان سے مرعوب رہیں اور ان کی تعظیم و تکریم کریں۔ ان کو سر آنکھوں پر بٹھائیں۔ لیکن لڑکے تو لڑکے ہی ہوتے ہیں ان کی کوئی پرواہ نہ کرتا بلا موقعہ بے موقعہ ان کی گھمنڈ سے گمبھیر طریقہ پر اکڑ کر کہتے "تم لوگ جانتے ہیں میرا باپ کون ہے؟

یہ سوال سُن سُن کر سب ہی تنگ آئے ہوئے تھے۔ ایک دن انھوں نے جب یہی سوال دہرایا تو سب ہی نے یک زبان ہو کر پوچھا۔ ہم تو نہیں جانتے کہ تمہارا باپ کون ہے کیا تم خود بھی نہیں جانتے؟۔ اس طنز نے صاحبزادے کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔

طنز دو طرفہ ہوتا ہے کبھی تو بات کی ابتدا کرنے والا ہی طنز یہ تکلم اختیار کرتا ہے۔ جو کبھی تو مخاطب سے پچھلی چشمک جھڑپ یا پرخاش کی وجہ سے ہوتا ہے یا وہ کسی بات کو برداشت نہیں کر پاتا اس لیے بجائے راست جملہ معترضہ تنقید یا تنقیص کے ایہام اور رمز کی شکل میں دل کی بھڑاس نکلتا ہے۔

اوہو آپ تو آج اس شوخ و شنگ اور بھڑکیلے دار لباس میں بڑے جامہ زیب دکھائی دے رہے ہیں اس ریمارک پیرا اور اس کے انداز بیان پر ظاہر ہے کہ مخاطب شرم سے پانی پانی ہو جائے گا۔

کبھی کسی کے موضوع گفتگو انداز بیان یا کسی پست کینہ کپٹ کو محسوس کر کے وہیں کا وہیں روک تھام کرنے کی نیت سے اس آلہ کار کو استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً کسی نے تعلّی یا حماقت سے کہا۔ آپ جانتے ہیں آج کل کس قدر دھوم دھام سے ہمارا نام اخباروں میں لیا جا رہا ہے۔ اس کے ردعمل کے طور پر طنز یہ جملہ معترضہ ہوگا "کیوں نہ ہو صاحب آپ نے جس قدر چولے بدلے ہیں اور پارٹی یا پالٹکس کو الٹا پھیر دیئے ہیں تو پھر کیوں نہ آپ ہی کا نام روشن ہو" غرض کہ طنز یہ دو طرف سے استعمال ہوتا ہے۔ کبھی اپنی مدافعت میں بچاؤ کے لیے اور کبھی کسی کی خام خیالی اور اس کے کڑوے پن کو اس پر واضح کرنے کے لیے ڈھکے چھپے انداز میں۔

کوئی صاحب شیخی بگھارتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ ان کے والد بزرگوار ان کے لیے بڑی جائیداد املاک، کوٹھیاں، موٹریں، بنک بیالینس اور بہت کچھ چھوڑ کر مرے ہیں۔ سننے والے نے بڑے اطمینان سے کہا۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں میرے باپ بھی مرتے

..قت دنیا جہان کی ساری نعمتیں۔ قدرت کی ساری اچھی چیزیں اور بنی نوع انسان کے لیے اللہ نے جو کچھ بنایا ہے وہ سب میرے ہی لیے تو چھوڑ گئے ہیں۔

طنز جب بہت زیادہ چبھتا ہوا تکلیف دہ اور دکھ پہنچانے والا ہوتا ہے تو وہ استہزا ہو جاتا ہے کہ جس میں دبے دبے لفظوں یا ابہام سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ راست حملہ کیا جاتا ہے۔ اس میں تکلف مصلحت یا رحم کا جذبہ نہیں ہوتا۔ نیت یہ ہوتی ہے کہ کوڑے برسائے جائیں، تادیبی کارروائی سے شرمسار کیا جائے۔

رعب جمانے کی خاطر کوئی کہے کہ میں نے ۵ اکتابیں تصنیف کی ہیں دس کتابوں پر مجھے انعام ملے ہیں تو بطور ردعمل اور یا دربانی کی غرض سے کہ وہ کیا اور ان کی ادبی صلاحیتیں کیا اور کہ اتنی ساری کتابوں کے مصنف ہوں تو ان سے کہا جا سکتا ہے۔ ہاں جی آپ کے ناشر نے آپ کے نام سے یہ ساری کتابیں شائع کی ہیں لیکن اصل مصنف کون ہے اس کا نام تو بتایئے تاکہ اس کی بھی تعریف و توصیف ہو سکے۔

حضرت غالب اور عمر خیام نے تو اللہ تعالیٰ کو بھی طنز کا شکار بنایا ہے۔

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

●

جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں
ایسی جنّت کو کیا کرے کوئی

ایک بیگم صاحبہ اپنی شادی شدہ زندگی سے عاجز آ کر شوہر سے کہتی ہیں میں نے اپنی زندگی کے بہترین سات سال تمہاری نذر کر دیئے مگر تم نے کوئی قدر نہیں کی۔ شوہر نے جل بھن کر طنزیہ جواب دیا اچھا تو یہ آپ کی زندگی کے بہترین سات سال تھے؟

صرف اتنا کہہ کر انھوں نے واضح کر دیا کہ خدا جانے کیا ہو۔

طنز و استہزا کا آخری اور سب سے زیادہ مہلک حربہ ہجو ہوتا ہے کہ جہاں آؤ۔ تاؤ۔ داؤ نہ پیچ۔ رمز و کنایہ بھی نہیں۔ سیدھے سیدھے مخاطب کی تضحیک اور تذلیل کی جاتی ہے۔ اس کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔ اور پھر اس کو موقعہ ہی نہیں دیتا کہ اس پھیکے ہوئے اوارے سے سنبھل سکے۔

ہجو فصاحت کے ساتھ ہو تو ملیح ہوتی ہے ورنہ کھلم کھلا ہجو ملکا ہجو قبیح۔

جہاں استعمال بغض و عناد تعصب حسد حقارت کے جذبات کارفرما ہوں وہاں پر لطیفہ اتنا ہی سے کام لیا جاتا ہے ہجو پھر پھل بن جاتی ہے جو مبالغے کا عرصہ ہوتی ہے۔ شاکر ناجی کہتے ہیں ؎

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے
یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے
کوئی مل بیٹھا ب کو ڈانٹے کہ شہر ہے

ہجونگاری بالعموم شاعری میں زیادہ ہی لطف دیتی ہے میرؔ اور سوداؔ نے اس فن کو خوب سینچا اور سنوارا ہے۔ جعفر زٹلی، مصحفی، رنگینؔ اور انشاؔ نے اس کو نکھارا۔ سوداؔ نے شاہوں کی بزدلی، مصاحبوں کی کم ظرفی حکام کی نااہلی پر بہر صورت تیر برسائے۔
کسی موقعہ پر ایک اونچی پوری لمبی تڑنگی عورت کو دیکھ کر ناسخؔ نے مصرعہ جڑ دیا
" طولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے"
اور جب اس عورت نے یہ سُن کر منہ بنایا تو ناسخؔ نے ہجو کے اس مصرعہ کو مدح میں بدل دیا۔

طولِ شبِ فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے
وہ زلفِ مسلسل جو ترے رخ پہ پڑی ہے

شفیقہ فرحت

محبت والوں کی بات ہے۔ اب کتنے دنوں کی بات ہے یہ تو کوئی کمپیوٹر ہی نہیں بتا سکتا۔ ورنہ ہم بھی آپ کو بتا دیتے۔ بہرحال اتنے دنوں کی بات ضرور ہے جب آدمی مہذب کم اور انسان زیادہ تھا ـــ !

تو اس زمانے میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی بھی رہا کرتے تھے (ظاہر ہے کسی نہ کسی کو تو رہنا ہی تھا۔!) جنہوں نے میدان کو صاف ستھرا پا کر عاشق اور معشوق کی گدی سنبھال لی۔ پھر دونوں نے حماقت کے اس لمحے میں، کہ جو ایک نہ ایک دن ہر عاشق معشوق پر سوار ہو جاتا ہے۔ ایک دوسرے سے وعدہ کیا کہ اگر ہماری (مراد عاشق، معشوق، راوی کی نیت پر قطعی شبہ نہ کیا جائے ـــــ !!) محبت کا خاتمہ بالخیر قاضی کے دو چار بولوں پر نہ ہوا تو ہم دونوں (بہ صیغہ جمع ـــ !) ایک ساتھ اس دنیا سے منہ موڑ کر سب سے ناتہ توڑ کر عالم بالا میں اپنی شادی رچائیں گے اور ہلہ گلہ مچائیں گے۔" اور دونوں نے اس معاہدے پر زبانی دستخط کر کے مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔

پھر ہوا یوں کہ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتے بھی رہنے دینا چاہیے کہ لڑکی کے پوجیہ پتا جی نے اپنا ووٹ کسی اور امیدوار کی پیٹی میں ڈال دیا ـــــ بھولی کنیا دس بارہ سنگھار کر کرا حسب وعدہ زہر کا پیالہ میرا بائی اسٹائل سے کاندھے پر رکھے ٹھمک ٹھمک آئی۔ عاشق علی پہلے ہی جائے واردات پہ موجود تھے (دیکھا: دیکھا ـــــ !) مناسب فیر ول اسپیچز کے بعد معشوقہ نے آدھے سے کچھ کم زہر غٹاغٹ پی لیا اور آدھے سے کچھ زیادہ اپنے "اُن" کے لیے بچا دیا۔ کہ حصہ بقدر جثہ! پچاس فی صد وعدہ تو پورا ہو گیا ـــ ! اب جو باقی ماندہ ففٹی پرسنٹ کی نوبت آئی اور معشوقہ صاحبہ نے جاں کنی کے عالم میں پیالہ عاشق علی کے ہونٹوں سے لگانا چاہا تو عاشق علی ہستی بس کی سی لمبی چوڑی آہ بھر کے بولے ـــ "تم کو جی بھر کے دیکھ لوں۔ ورنہ مرتے مرتے دیکھنے کی حسرت رہ جائے گی۔

لڑکی پہلی مرتبہ جھنجھلائی۔ "ارے جلدی پیو۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ میں تم سے پہلے جنت میں لینڈ کر جاؤں اور بھائی رضوان پکڑ کے میرا نکاح کسی اور گلفام سے پڑھوا دیں۔" اتنا سنتے ہی شری عاشق کی غیرت

ذرا کسمسائی۔ انھوں نے دھارمک فلم کے ہیرو کی طرح اکڑ کے پیالہ یوں ہاتھ میں لیا جیسے سومن کا گرز اٹھا رہے ہوں اور اس سے پہلے کہ وہ وعدہ فائی کی باقی فارمیلیٹیز (formalities) کو ادا کرتے معشوق کی روح اپنے خلائی سفر پہ روانہ ہو چکی تھی۔ یہ دیکھتے ہی مسٹر عاشق نے پیالہ بمع جملہ اسباب شیرانی ویرلیش فی آتنی دور پھینکا جیسے ڈبل جھٹکا مار رہے ہوں۔ اور یہ کہہ کر جس راہ سے آئے تھے اسی راہ واپس لوٹ گئے کہ جب کنٹریکٹ کرنے والی پارٹی ہی نہ رہی تو کنٹریکٹ کیسا ——؟

پھر برسوں بعد دیکھنے والوں نے دیکھا کہ معشوق کی تو قبر بنی ہے اور عاشق علی بیگ کا محل ——!

تو سبق اس داستان سے یہ نکلا کہ جیسا ہر داستان سے نکلا اور نکالا جاتا ہے کہ وعدہ پچاس فیصد تک نبھایا جا سکتا ہے بشرطیکہ نبھانے کی ذمہ داری اور نتائج فریقِ ثانی پر بھی ہوں!

اس سے بھی قدیم زمانے میں سنا ہے وعدہ کی حالت اس سے بھی کچھ بہتر تھی۔ ویسے سنی سنائی پر اعتبار کرکے اپنی حماقت کا ڈھنڈورا کرنا تو نہیں چاہیے۔ مگر خیر کبھی تنہا بھی چھوڑ دیتے!

تو گویا اگلے سے اگلے وقتوں میں کچھ وعدے نبھانے کے لیے بھی ہوتے تھے۔ اور جتنی کچھ کہ تاریخ (کیلنڈر والی نہیں) فلموں کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے۔ اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ بابر، اکبر، پورس، سکندر قسم کے بادشاہ تو وعدہ نبھایا کرتے تھے۔ حالانکہ انہیں ڈر کس کا تھا۔ اور کوئی ان کا کیا بگاڑ لیتا۔ سیدھے مارے گئے ان کی شرافت کو یا پھر ہو سکتا ہے یہ اس زمانے کا فیشن ہو۔ جبھی فیشن کے لیے تو آدمی کیا کچھ نہیں کرتا ——!

وجہ کچھ بھی، تھوڑی نہ تھوڑی عزت تو تھی ہی وعدے کی ایسی خواری تو نہ تھی جیسی آج ہے اور ہم ان میں کیا ماف میں کمیشن ہی بٹھا دیں تو حسب مرضی ثابت ہو جائے گا کہ اس .... میں قوم شعرائے ہند و ایران و توران کا بڑا ہاتھ ہے۔ خیر صاحب ایران توران کے معاملات میں ہم کیوں دخل دیں۔ یہ تو کچھ وزارت خارجہ ہی کو شوبھا دیتا ہے۔ ہم تو اپنی شاعری کے گریباں میں جھانکیں۔ مگر خدا مغفرت کرے شاعروں کی بھی اور پڑھنے والوں کی بھی۔ شاعروں کی قسمت میں گریباں ہے کہاں۔ حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت ——!

خیر کچھ اٹکل اندازے سے کام چلانا پڑے گا ——!

تو عرض یہ ہے کہ سارا فساد شاعروں کا پھیلایا ہوا ہے۔ ایک تو پتہ نہیں کہاں سے اتنے سارے بد دماغ ظالم خونخوار محبوب پال رکھے ہیں اور پھر ان کی اتنی تعریف کہ وہ اور تیزی سے نیم پہ چڑھ گئے۔ میاں محبوب اور جو ہیں وہ تو ہیں ہی۔ اس پہ سے بے وفائی اور وعدہ خلافی میں بھی دس بارہ کلومیٹر آگے ہی ہیں۔ لاکھوں شاعروں کے کروڑوں اشعار میں ایک شعر کیا ایک مصرعہ بھی ایسا نہ ملے گا جس میں عزیزی میاں محبوب نے کبھی کوئی وعدہ وفا کیا ہو۔ ہاں بھول چوک کس سے نہیں ہوتی۔

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں
بھولے سے اس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے

جناب عاشق رات رات بھر ٹہل ٹہل کر اور چائے پی پی کے جاگ رہے ہیں۔ مگر اس نے کوئی عدالت میں حلف اٹھایا تھا کہ آتا۔ ہاں وعدے البتہ بیس فی منٹ کے حساب سے کر لیتا اور شاعر بھائی ہیں کہ سب کچھ جانتے سمجھتے یقین کیے جا رہے ہیں۔ انتہا یہ کہ خواب والے وعدے تک کو جھٹلانے کی ہمت نہیں۔

تا عمر پھر نہ نیند آئے انتظار میں
آنے کا وعدہ کر گئے آئے جو خواب میں

تو گویا وعدہ شکنی ادائے دلبری ٹھہری اور شانِ محبوبیت سمجھی جانے لگی۔ نتیجہ اس پروپیگنڈے کا کہ جو ہر پروپگنڈے کی طرح غلط سلط تھا یہ ہوا کہ جسے دیکھیے گھروں گھر جا جا کے وعدے کرتا پھرتا ہے۔ اور پھر بیچ چوراہے پر کھڑے ہو کر توڑتا ہے اور ٹوٹے ہوئے وعدوں کے ڈھیر کو دیکھ کر عقلا و حکماء کے قول پر ایمان کے فقدان کے باوجود ایمان لانا پڑتا ہے کہ اور وعدے

توڑنے کیلئے ہی ہوتے ہیں دل کی بات تو جانے دیجئے کیا کسی عبرت سوالے کا کوئی گرام کاشن کے کسی کونے میں ہی گھمکے بھی اتنا بڑا وقت نہیں آیا۔ اس کا سلسلہ تو عرش تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے مادل سپورٹ کے بغیر خدائی کارخانے کا چلنا بھی مشکل تھا۔ لہٰذا خدا کو فردوس بریں کا وعدہ کرنا پڑا ——— !

تو ثابت ہوا کہ وعدے کا افتتاحی پروگرام اور رسم اجرا فارن یعنی عرش معلی میں اللہ میاں کے ہاتھوں ہوئی۔ اور وعدہ وفائی کی ادا بھی اسی فارن کنٹری سے امپورٹ ہوئی ہے۔

اصل خدا کو ایفائے عہد کے لیے صرف ایک جنم درکار ہے مگر نقلی خداؤں کو کہ جن کی نقل بھی مطابق اصل نہیں، کئی کئی جنم ۔

تو پھر۔ کون جیتا ہے۔

اور اہل وفا فرماتے ہیں کہ کہتا کون ہے۔ آپ سے جینے کے لیے ٹھنڈے ٹھنڈے مر جائیے۔ تاکہ کم از کم ایک وعدے کے پورے ہونے کے امکانات تو روشن ہو جائیں ——— !

جو سخن فہم بھی ہیں اور غالب کے طرفدار بھی۔ اور اس کریلے کی بیل کو نیم پر چڑھانے کی خاطر گاہے گاہے حیادار اور سمجھدار بھی بن لیتے ہیں۔ وہ دو چار وعدوں کی ناکامی کے بعد بھی مانگے تانگے کا بچا کچھا سامان بیچ پہلے تو صاحب جائے واردات کے قریب کی ٹاکیز میں جا کر پکچر دیکھتے ہیں۔ پھر خودکشی کرنے یا قتل ہونے کے آرام دہ طریقوں پہ غور کرتے ہیں اور اس پہ صدق دل سے عمل کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ کامیابی، ناکامی تو اللہ کے ہاتھ ہے ۔ !

اور جو روحانیت کے اس بلند درجہ تک نہیں پہنچ جاتے ان کے پاس سوائے زندہ رہنے کے کوئی چارہ نہیں۔ تیرے میرے وعدوں کی کیفیت ان خطوں سے پوچھیے ——— !

وعدے کی بلند آہنگی مرتبے کی عظمت اور اختیارات کی وسعت کی دلیل ہے۔ بڑا آدمی بڑا ہی وعدہ کرے گا اور وہ دلاسا بھی بڑا ہی دے گا اور جلیبی بڑے بڑے اور لمبے لمبے کھلوائے گا۔ اور خدمتیں بھی بڑی بڑی لے گا۔ چھوٹے آدمی کے وعدے۔ چکر۔ نذر نیاز سب چھوٹے۔

وعدے انفرادی بھی ہوتے ہیں اور اجتماعی بھی اور یوں تو انفرادی اجتماعی ہر وعدہ پر گھڑی ہر پل کیا جا سکتا ہے۔ مگر جاڑا، گرمی، برسات کی طرح ایک موسم وعدوں کا موسم بھی ہوتا ہے جس میں گلی گلی کوچہ کوچہ سے رات دن وعدوں کے ایسے ایسے دریا بہتے ہیں کہ کیا برساتوں کی گنگا جی اور جمنا رانی ہوں گی۔ یہ موسم اجتماعی وعدوں کے لیے بہت سازگار ہوتا ہے۔ اس موسم میں قوم کا درد ایسے پھوٹتا پھیلتا ہے جیسے ہیضہ، پلیگ، جسے دیکھیے وہ درد میں بڑی آن بان اور دھوم دھام سے تڑپ رہا ہے اور تڑپتے تڑپتے ہر گلی کوچہ میں پھڑکتا پھر رہا ہے اور ہر نتھو اور چھتو اور خیرے اور خیرن سے ایسے ایسے وعدے کر رہا ہے جیسے آپ کے قبضہ قدرت میں ایک نہیں دس بارہ الٰہ دین کے چراغ اور بیس پچیس سرکار اور آنند قسم کے جادوگر ہوں۔ اس اوپر لکھا بڑا دق بسورتی دنیا کو قرضہ دے بلک جھپکتے میں جنت کی فوٹو اسٹٹ کاپی بنا ہی دیں گے۔ کہیں ڈیری کے دودھ کی نہریں بہہ رہی ہیں کہیں شہد کی۔ جہاں دیکھیے پھلوں سے لدے درخت کھڑے ہیں۔ من و سلویٰ کے برتن کے برتن دھرے ہیں اور آپ اپنے سونے چاندی، ہیرے موتی کے فلیٹس میں۔ آرام سے بیٹھے دور درشن بھارتی کا فرمائشی پروگرام سن رہے ہیں اور جو یہ ماڈل پرانا ڈیزائن اور ماڈل پسند نہ ہو تو ہر ایک کو ادی گرام اور لیگ سے اس کی مرضی کے مطابق جنت بنوا دی جائے گی۔

وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ یہ موسم کئی کئی برس بعد آتا ہے ورنہ بچارے ہم آپ اور بھولی دکھی جنتا ایسی الف لیلوی باتیں سن سن کر دیوانی نہ ہو جاتے اور جو کہیں اعتبار آ جاتا تو خوشی سے مر ہی نہ جاتے مگر ہمیں اعتبار ہی کب ہے۔

ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

■▬■

ہر سیوانی

مرد ہو زن کی طرح زلف بڑھاتے کیوں ہو
اور پھر ساڑی پہننے میں لجاتے کیوں ہو

ہیپیوں کو، تو جگہ ملتی ہے زن کی صف میں
بیچ مردوں کے مری جان تم آتے کیوں ہو

بال لڑکی کی طرح چال بھی لڑکی کی طرح
دامنِ مرد پہ تم داغ لگاتے کیوں ہو

مرد ہو تم تو کرو بات بھی مردوں کی طرح
مُنہ میں عورت کی طرح اُنگلی دباتے کیوں ہو

گنگنانے لگے تم کس کی غزل محفل میں
راگ آتا ہی نہیں ساز اُٹھاتے کیوں ہو

اِس سے بہتر ہے کہ باز آؤ غزل گوئی سے
شاعری آتی نہیں خون جلاتے کیوں ہو

مانگے تانگے کی غزل وہ بھی پڑھو ناموزوں
واقفِ راز سے پیٹ اپنا چھپاتے کیوں ہو

جب تمہیں شعر ہی پڑھنا نہیں آتا ہے تو پھر
ہوٹ ہوتے ہو تو مُنہ اپنا بناتے کیوں ہو

فن کے گڈھے میں کسی روز لڑھک جاؤ گے
فکر کی ٹوٹی ہوئی جیپ چلاتے کیوں ہو

میں نے مانا کہ غزل کہتے ہو خود ہی لیکن
چھپ کے اُستاد کے گھر رات میں جاتے کیوں ہو

کوئی دھوبی نہ کہیں سُن کے ہنکالے جائے
شب کی تنہائی میں تم بھیروی گاتے کیوں ہو

ضُعفِ معدہ کی ہے جب تم کو شکایت واعظ
مرغ پہ مرغ شب و روز اُڑاتے کیوں ہو

زہر فاسزم کا پھیلا ہے تو کس کا ہے قصور
دوستو، سانپ کو تم دودھ پلاتے کیوں ہو

ملک کی ساری زمیں خون خرابے سے ہے سُرخ
سبز باغ آج بھی جنتا کو دکھاتے کیوں ہو

منتظم سے ہے گوّیوں کو شکایت جوہر
شاعرِ طنز و ظرافت کو بُلاتے کیوں ہو

غزل

بانکے
(ٹنک)

جس شوخ کے چہرے پہ گری لٹ نہیں ہوتی
اس شوخ سے ہرگز مری کھٹ پٹ نہیں ہوتی

یہ سچ ہے عداوت کا کوئی گُل نہیں کھلتا
جب تک کہ محبت میں ملاوٹ نہیں ہوتی

ہر حکم بجا لاتا ہوں میں سر کو جھکا کر
بیوی سے کسی بات پہ جھنجھٹ نہیں ہوتی

دو تین بجے رات کو جاتا ہوں سدا گھر
اس طرح دبے پاؤں کہ آہٹ نہیں ہوتی

لے جاتے کہاں حسرت و ارماں کی چتائیں
محبوب کی دہلیز جو مرگھٹ نہیں ہوتی

کرسی کے لئے دیس میں لیڈر نہیں ملتے
بیکار وزیروں میں جو چٹ پٹ نہیں ہوتی

کرتا نہ اگر شربتی آنکھوں کا تصور
بانکے مرے شعروں میں تراوٹ نہیں ہوتی

عاتق شاہ

حضور اِدھر آئیے اِدھر!
یہاں پر ذبح کئے ہوئے بکرے کا
حلال گوشت بکتا ہے۔ آپ خود بہ نفسِ نفیس
ملاحظہ کیجئے۔ کیا عمدہ اور تر و تازہ گوشت ہے
ابھی ابھی میں نے اسے ذبح کیا ہے۔ ویسے یہ
بچہ تھا۔ لیکن اس میں جوانوں سے بڑھ کر طاقت تھی۔
جسم پر ہاتھ رکھنے ہی نہیں دیتا تھا لیکن میں نے اسے کس کر
اپنی گرفت میں لے لیا۔ چت لٹا کر اسے پانی پلایا اور دل ہی دل
میں بسم اللہ پڑھی اور تین بار با آواز بلند کہا، اللہ اکبر — اللہ اکبر!!
حکم دیجئے کتنا تول دوں۔ ایک کیلو۔ دو کیلو یا پوری ایک ران۔ یقین کیجئے،
ایک بھاپ پر گوشت گل کر مسکہ بن جائے گا صرف ایک بھاپ پر — پوٹلہ ہے پوٹلہ! ——

لیکن اس طرح آپ مجھے حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔ شاید آپ مجھ سے واقف نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس محلے میں نئے نئے آئے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ میں خود اپنا تعارف کرواتا ہوں۔ میں اس محلے کا، شہر کا مشہور قصاب ہوں۔ لیکن پتہ نہیں لوگ کیوں مجھے دارا مسیح کے نام سے پکارتے ہیں۔ حالانکہ اُس کے چہرے اور میرے چہرے میں کوئی مشابہت نہیں اور نہ پیشے میں۔ ویسے بھی مجھے اس تقابل سے کوفت ہوتی ہے۔ سچ پوچھئے تو میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں کہ کوئی میرے چہرے پر جلاد جیسا ٹھپہ لگائے۔ بھلا میں کہاں اور جلاد کہاں! جلاد تو ایک معمولی اور حقیر سی شخصیت کا نام ہے جو کسی کے حکم پر اپنا چھرا چلاتا ہے اور میں ——

میں تو قصائی ہوں، قصائی جو روز مسکراتے ہوئے اپنا تیز دھاری والا چھرا چلاتا ہے۔ اور کسی بھی جانور کو ذبح کرتے ہوئے جس کے ہاتھ کبھی نہیں کانپتے ـــــ

کیا شان ہے میرے مالک کی۔ کیا قوت دی ہے میرے مولا نے ان بازووں میں!!

تو حضور میں عرض کر رہا تھا کہ یہ پوٹلہ ہے اور یہ کرڈگہ۔ پوٹلے اور کرڈگے میں وہی فرق ہوتا ہے جو سولہ سال کے لڑکے اور تیس سال کے نوجوان میں ہوتا ہے۔ ان دونوں کی وہی پہچان ہے جس سے آپ واقف ہیں۔ لیکن عمر کے اس فرق کو سمجھنا اور کون سا گوشت کس کا ہے یہ پہچاننا ایک مشکل کام ہے۔ یہاں آپ کو قصائی کے بیان پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ بہت کم ایسے ہوتے ہیں جو سچی بات کہے۔ میری طرح۔ ورنہ آپ کو پوٹلے کا یقین دلاکر چھیلی کا گوشت دے دے گا۔ اور آپ جانتے ہیں چھیلی، بکرے کی مادہ ہوتی ہے اور عورت ذات پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا! بس پکنے کے بعد ہی پتہ چلتا ہے کہ اس کی ایک بوٹی نہیں گلی!

میں عورت ذات کے کبھی پیچھے نہیں بھاگتا اور نہ اُسے ہاتھ لگاکر بدنامی کے گڑھے میں گرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں بازار میں میری اپنی ساکھ ہے۔ اور کون بے وقوف ہوگا جو اپنی ساکھ کو متاثر کرے اس لیئے میں ہمیشہ پٹھے ذبح کرتا ہوں۔ اس لیئے آنکھ بند کرکے چلے آیئے اور اپنی مرضی و پسند کا گوشت حاصل کیجئے!

بعض حضرات بغل کا گوشت پسند کرتے ہیں، بعض سینے کا۔ اور بعض صرف ران کے عاشق ہوتے ہیں۔ کلیجی، گردے، آنکھ، زبان، دماغ اور دل کے خواہشمند اور ضرورت مند حضرات سے میں ہمیشہ گذارش کرتا ہوں کہ صبح صبح آئیں، ورنہ اُنھیں مایوسی ہوگی۔ لیکن اس تعلق سے میں ایک بات سامنے رکھدوں کہ میں ضرورت مندوں کی ضرورت پہلے پوری کرتا ہوں جو کسی حکیم یا ڈاکٹر کی ہدایت پر میرے پاس دوڑے دوڑے چلے آتے ہیں۔ ورنہ وہ حضرات جو ان چیزوں کو تفریحاً کھاتے ہیں اُن سے میری ادباً درخواست ہے کہ وہ پھر کبھی زحمت کریں!

میری دکان کی ہڈیاں شہر بھر میں مشہور ہیں۔ اگر کوئی بوڑھا چالیس دن پابندی کے ساتھ ران نلیوں کا شوربہ پیئے تو وہ بوڑھا نہ رہے گا بلکہ جوانوں کی طرح ڈشم ڈشم کرنے لگے گا۔ میں حکیم تو نہیں۔ لیکن یہ ہڈیاں اکثر امراض کا شرطیہ علاج ہیں!

اونٹ کا گوشت سال میں صرف ایک بار بیچتا ہوں۔ اور مقامی اخبارات میں اس تعلق سے اشتہار بھی دیتا ہوں۔ اونٹ کا گوشت کھانا سنت ہے اور اس کا بیچنا ثواب۔ اس کے کھانے سے کئی فائدے ہیں۔ ایک نمایاں اور فوری فائدہ یہ ہے کہ بچہ جوان ہو جاتا ہے۔ اور جوان ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑنے لگتا ہے۔ اور بوڑھا ـــــ آپ خود کسی بوڑھے سے پوچھ لیجئے۔ میں کیا بتاؤں! شرم آتی ہے مجھے!

شکریہ! آپ نے پوری توجہ سے میری باتیں سنیں۔ لیکن آپ اس طرح حیرت سے مجھے اور اس لٹکتی ہوئی ران کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں گرم گوشت کے نام پر ٹھنڈا گوشت بیچ رہا ہوں۔ حضور! دل سے یہ بُرا خیال نکال دیجئے۔ میں مرجاؤں گا۔ لیکن کسی کو دھوکا نہیں دوں گا۔ بے شک بعض گاہک ٹھنڈا گوشت پسند کرتے ہیں۔ اور خوشی خوشی اسے لے جاتے ہیں۔ میں ٹھنڈا گوشت پسند کرنے والے کو گرم اور گرم پسند کرنے والے کو میں کبھی ٹھنڈا گوشت نہیں دیتا۔ آپ کا چہرہ دیکھتے ہی میں سمجھ گیا تھا کہ آپ گرم آدمی ہیں۔ اس لیے گرم گرم گوشت پسند کریں گے۔ ٹھنڈا گوشت لے جانے والوں کی نفسیات ہی اور ہوتی ہے۔ وہ اپنی چال ڈھال، لب و لہجے اور انداز کے بڑے ٹھنڈے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔ چھیچھڑے بھی مار کر دے دیجئے تو کچھ نہیں بولیں گے اور خاموشی سے پیسے دے کر اور سر جھکاکر چلے جائیں گے۔ گاہک گرم ہو تو دکان پر بھی گرمی رہتی ہے۔ ورنہ ٹھنڈ میں کاروبار چلنے سے رہا!

میں آپ سے آپ کا نام نہیں پوچھوں گا۔ کیوں کہ گاہک کا ایک نام نہیں، کئی نام ہوتے ہیں۔ اور تاجر کا ایک نام ہوتا ہے۔ اور اچھا تاجر وہ ہوتا ہے جو اپنی دکان پر آنے والے تمام گاہکوں کے احساسات، جذبات اور مذہبی اعتقادات کا احترام کرے۔ اس لیئے میں کبھی گائے کو ذبح نہیں کرتا۔ اور نہ بُرے جانور کا گوشت بیچتا ہوں۔ بُرے جانور کا نام لینا بھی گناہ ہے۔ غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ کیونکہ ہندو اور مسلم دونوں میرے گاہک ہیں۔ اور دونوں میرے بھائی ہیں۔ اور میں نہیں چاہتا کہ کسی بھائی کی دل شکنی ہو!

اگر آپ کا ان دونوں فرقوں سے کوئی تعلق نہیں تو کوئی بات نہیں۔ آپ بھی میرے لیئے اتنے ہی قابل احترام ہیں جتنے یہ۔ یا دوسرے۔ اور ایک گاہک ہونے کے ناطے آپ کی جائز ضرورت کو پوری کرنا میرا فرض ہے۔ فرمایئے ——— اور بغیر کسی جھجک اور تکلیف کے کہیئے کہ آپ کو کیا چاہیئے!

بیل کا اتنا نفیس گوشت آپ کو دوں گا کہ آپ عمر بھر اس کے ذائقے کا لطف لیتے رہیں گے اور دوسرے جانوروں کے گوشت کے مزہ کو بھول جائیں گے ——— اور ——— !

اور بڑے جانور کا گوشت ایسا دوں گا کہ آپ بار بار میری دکان پر تشریف لائیں گے!

میں سچ کہتا ہوں بُرے جانور کا یعنی سُور کا گوشت کھانا۔ اور بیچنا میرے مذہب میں حرام ہے۔ لیکن خدمتِ خلق کی خاطر میں اس گناہ کا بھی مرتکب ہوا ہوں۔ اور ہو رہا ہوں۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں! ایک بار میں نے اس کے گوشت کا بھی ٹسٹ کیا ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا ہے۔ کیا بتاؤں اب تک زبان پہ ذائقہ ہے۔ یوں لگا جیسے کیا کھوپرا چبا رہا ہوں۔

بڑے جانور کے گوشت کے استعمال سے کئی فائدے ہیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ کہ صحت اچھی ہوجاتی ہے اور آدمی کی شخصیت دن بدن اُبھرنے لگتی ہے۔ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو کبھی غصہ آتا ہی نہیں۔ مجھ ہی کو دیکھئے میں اس کی زندہ مثال ہوں۔ یہی نہیں بلکہ دُنیا کے کسی المیئے کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔ یوں سمجھئے کہ دل مضبوط ہوجاتا ہے اور آدمی بہادر۔ آہاہا ـــــ آہاہا!! لیکن یاد رکھیئے آپ کو بڑے جانور کے گوشت کے لیئے اصیل مرغ اور بیل کے گوشت کے لیئے مرغی کا لفظ استعمال کرنا ہوگا۔ یہ ہمارے بزنس کے کوڈ ورڈ ہیں!!

لیکن اس طرح آپ کب تک کھڑے رہیں گے۔ ذرا چین سے بیٹھ جائیں تو میں آپ کو ایک اہم اور راز کی بات بتاؤں۔ آپ یقین نہیں کریں گے کہ یہاں آدمی کا بھی گوشت بکتا ہے۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہمارے سماج میں ابھی بہت سے آدم خور باقی ہیں جو منہ مانگے دام دے کر گوشت خریدتے ہیں۔
آپ بھی چند انسانی اعضا کے نرخ سُن لیجئے۔ زندگی میں شاید آپ کو یا آپ کے کسی دوست کو ضرورت پڑے۔

فی گردہ ـــــــــ : پچاس ہزار روپے
دو گردوں کے ـــــــــ : پچانوے ہزار روپے (پانچ ہزار کی رعایت)
فی آنکھ ـــــــــ : پچھتّر ہزار
دو آنکھوں کے ـــــــــ : سوا لاکھ (پچیس ہزار رعایت)
انسانی ہڈیوں کا مکمل ڈھانچہ : دو ہزار روپے

نوٹ : کم از کم چھ مہینے پہلے آرڈر بُک کروانا ہوگا اور پیشگی نصف رقم دینی ہوگی!

۲۔ 750 سی سی بلڈ گروپس کے مختلف بوتل ہم سے آدھی رات کو طلب کیجئے ـــــ
فی بوتل = دو سو روپے

لیکن آپ کبھی یہ پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کریں کہ آخر انسانوں کا گوشت اور اعضاء ہمارے یہاں کہاں سے آتے ہیں۔ کہیں سے بھی آتے ہوں گے آپ کو اس سے کیا مطلب ہے۔ آپ صرف اپنے کام کی حد تک کام رکھیئے مگر یہ بُرا خیال دل میں اور دماغ میں نہ آنے دیجئے کہ ہم آپ کی ضرورتوں کو قبرستانوں میں سونے والے مردوں سے پورا کرتے ہیں۔ توبہ اور استغفار کیجئے۔ ہم بزنس میں کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیتے۔ یہ سچ کہ ہم پیسے زیادہ لیتے ہیں۔ لیکن مال نمبر وَن دیتے ہیں۔ یقین کیجئے یہ تمام اعضا ہم زندہ انسانوں کے شکار سے حاصل کرتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو آزما لیجئے۔ اور کہیئے کہ آپ کو کس شخص کا گردہ یا دل چاہیئے!
لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور بات بھی نوٹ کر لیجئے کہ اگر کہیں آپ نے اپنی معصومیت اور بھولے پن سے اس راز کا انکشاف کیا تو میرا کچھ نہیں بگڑے گا.. آپ سالہا سال کے لئے سرکاری مہمان بن جائیں گے۔

اس کے علاوہ آپ کو ایک اور راز کی بات سناؤں۔ وہ یہ کہ آپ کو بظاہر ایک گوشت کی دکان نظر آرہی ہے لیکن یقین کیجئے اس کے اندر کئی گوشت کی دکانیں آباد ہیں۔ چلتی پھرتی بولتی ہوئیں۔ لیکن یہ کاروبار دن میں نہیں کرتا۔ رات میں دس بجے کے بعد ایک دوسری ہی شان سے یہ دکان جگمگاتی ہے۔ آپ کا کبھی جی چاہے تو بلا تکلف یہاں تشریف لائیے۔ لیکن سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی آپ کو یہاں سے لوٹ جانا پڑے گا!

یہاں پر ہر ایک کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اس لیئے مختلف عمروں، رنگوں، نسلوں اور زبانوں کی چیز یہاں آپ کو ملے گی!!

ایک کملا، رادھا، بلقیس اور نورجہاں پر کیا منحصر ہے آپ کو درجنوں کملائیں اور نورجہائیں یہاں ملیں گی۔ پہلے آپ تشریف تو لائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو مایوسی نہیں ہوگی!

میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ بزنس بہت صاف کرتا ہوں اگر آپ کو گوشت کی پرکھ ہے تو خود اندازہ کریں گے کہ میری باتوں میں کتنی صداقت ہے۔ یاد رکھیئے زندگی کی سب سے بڑی اور آخری سچائی گوشت ہے۔ اور وہ بھی گرم گرم۔ آگ کی طرح دہکتا ہوا۔ تو حکم دیجئے۔ کتنا تول دوں۔ فکر مت کیجئے۔ میں ہمیشہ ذبح کئے ہوئے بکرے کا حلال گوشت بیچتا ہوں۔

لیکن خدا کے لیئے قیمے کا آرڈر مت دیجئے ورنہ مجھے حکم نہ ماننے کی گستاخی کرنی پڑے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ قیمے میں وقت اور آدمی کی محنت دونوں کی تباہی ہے اور میں اسے اپنے گاہک کے زور و بازو پر چھوڑتا ہوں کہ وہ خود اپنی پسند کا قیمہ بنالے!

تو فرمائیے ــــــ کتنا تول دوں! ■■
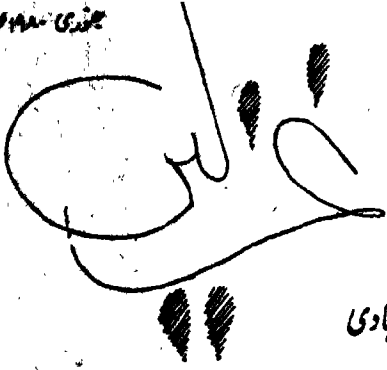
ظہیر ابن قدسی

گو فضاؤں میں اڑنے لگا آدمی
پھر بھی تھوڑا بہت ہے گدھا آدمی

بنتِ حوّا جہاں اک نظر آگئی
اس کے پیچھے اُچک کر چلا آدمی

بن گیا آج شاعر خدا کا غضب
کل تلک جو تھا اچھا بھلا آدمی

تیز اور سخت حالات کی دھوپ میں
آج تپ کر ہُوا پلپلا آدمی

جس طرف بھی ہو کوہِ گراں قرض کا
بھول جاتا ہے وہ راستہ آدمی

جھوٹ، مکر و فریب اور دغابازی میں
آج شیطان سے بڑھ گیا آدمی

دوسروں سے شکایت نہ ہوتی ظہیر
اپنے بچوں کو گر ٹھوکتا آدمی

ہاشم عظیم آبادی

تو وہ احمق ہے جو مئے خانے میں پانی مانگے
کوکوکولہ سے طبیعت کی روانی مانگے

تار لیلیٰ سے ڈوپٹے کا بھی مانگ لے مجنوں
تجھ سے گر تارِ گریباں وہ نشانی مانگے

میں اُسے غزنی و کابل کی حکومت دیدوں
ایک جلوہ کی جو قیمت وہ پٹھانی مانگے

نوجوانوں کو ہے جب حاجتِ تجدیدِ شباب
کیسے بڈّھا نہ حکیموں سے جوانی مانگے

ایک ہم ہیں کہ ادھر طالبِ ارزانی ہیں
اک طرف سیٹھ ہے جو اور گرانی مانگے

نئی پاپوش کے قابل بھی نہیں ہے ہاشم
اس کے سر کے لئے جوتی بھی پرانی مانگے

فیاض افسوس (اکولہ)

کیوں نہ ہوں لختِ جگر سر کے ہوئے
جب کہ ہیں مادر پدر سر کے ہوئے

ہم سرکتے جا رہے ہیں آج کل
مل رہے ہیں اس قدر سر کے ہوئے

تجھ سے ہم کیوں دُور رہتے ہیں سدا
کچھ تو اس پر غور کر سر کے ہوئے

آپ سے ہم کو نہ تھی ایسی اُمید
اِتنا پڑھ کر اس قدر سر کے ہوئے

میں تو تھا ہی دوستو خبط الحواس
مل گئے ہیں اب خُسر سر کے ہوئے

یہ زمیں، یہ رشکِ جنّت چھوڑ کر
جا رہے ہیں چاند پر سر کے ہوئے

جنگ رُکتی ہی نہیں سسرال میں
کچھ اِدھر ہیں کچھ اُدھر سر کے ہوئے

کیا کہیں افسوس ہم جائیں کہاں
شہر پاگل ہیں، نگر سر کے ہوئے

مسیح انجم
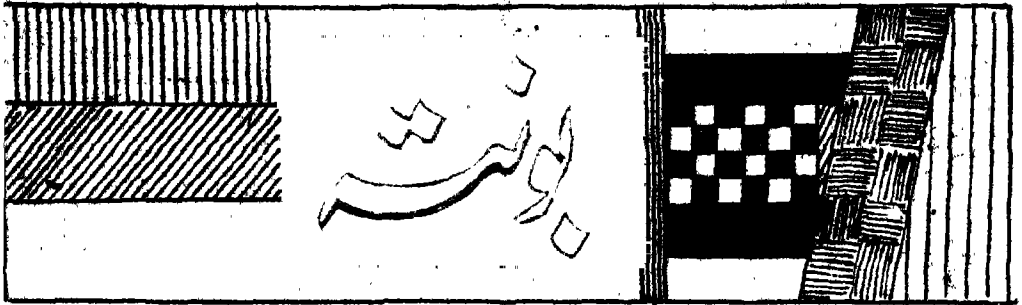
بونتہ
میرا بونتہ
ابّا جان کا بونتہ
ماں کا بونتہ
پیلی ساڑی کا بونتہ
بونتہ ، بونتہ ، ایک اور بونتہ
میں بور ہیٹے پہ لیٹا مسلسل بڑبڑائے
جا رہا تھا۔ میرے دانت بج رہے تھے
میرا جسم کپکپا رہا تھا۔ میری بیوی مجھ پر
اُڑھانے کے لیے گھر کے سارے افراد
کے بونتے اکٹھا کر رہی تھی۔ میرے دوست
صمدانی قریب ہی کرسی پر بیٹھے آنکھیں
بند کئے میری بڑبڑاہٹ سے کچھ اس
طرح لطف اندوز ہو رہے تھے جیسے
ٹیپ ریکارڈر سے مہدی حسن کی گائی
ہوئی کوئی غزل سماعت فرما رہے ہوں
جب بیوی سارے بونتے اکٹھا کر چکی
اور اُڑھانے کے لیے میری جانب بڑھی
تو صمدانی نے فرائض زوجہ کے درمیان
حائل ہوتے ہوئے کہا "بھابی! یہ آپ
کیا کر رہی ہیں؟ انھیں ڈسٹرب (DISTURB)
مت کیجئے۔ ان پر شعر کا نزول ہو رہا ہے
اگر آپ بونتے اُڑھائیں گی تو وہ جو آمد
کی کیفیت ہے، ختم ہو جائے گی اور کل
کے سب نقاد یہی کہیں گے کہ اس نظم میں

آمد" نہیں "آورد" ہے!"

بیوی نے ڈھیر سارے بونتے اُڑھاتے ہوئے کہا "میں اتنی بھی جاہل نہیں ہوں کہ شاعری اور بحرانی کیفیت میں تمیز کر سکوں! دراصل ان پر ملیریا کا شدید حملہ ہوا ہے۔ اور کپکپی کی وجہ سے بونتے اڑھانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔"

صدانی نے شرارتاً کہا "نہیں بھابی! ان پر ملیریا کا نہیں بلکہ جدید شاعری کا حملہ ہوا ہے۔ آپ سمجھی نہیں نا! وزن اور بحر کی پامالی اور لرزے کی کیفیت یہ سندیسہ دے رہی ہے کہ ان سے ضرور ایک "کھردری نظم" سرزد ہوگی!"

بیوی نے حیرت سے پوچھا "کیا شعر کہتے وقت شاعر کو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ اس پر کپکپی بھی طاری ہو جاتی ہے اور دانت بھی بجنے لگتے ہیں؟"

صدانی نے سمجھایا "ہاں بھابی! اس سے کہیں زیادہ ہی۔ پابند شاعر تو اس قدر بدحواس ہو جاتا ہے کہ تخلیقی کرب کے تحت کبھی لیٹ جاتا ہے اور کبھی اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہے۔ البتہ! صرف مینٹل ہاسپٹل لے جانا باقی رہ جاتا ہے۔!"

بیوی نے بھولپن سے سوال کیا "کل تک تو یہ شاعر نہیں تھے۔ یہ ایک دن میں کایا پلٹ کیسے ہوگئی!؟"

صدانی نے میرے خلاف ورغلانے کے لیے کہا "بھابی! کسی کا کیا بھروسہ؟ انسان کو بگڑتے دیر نہیں لگتی۔ اور شاعری میں تو انسان بہت جلد بگڑ جاتا ہے۔ کل سے آپ دیکھیں گی۔ یہ مشاعرے پڑھنا شروع کر دیں گے اور ایک آدھ آل انڈیا مشاعرہ پڑھتے ہی اپنے آپ کو "قوم کی امانت" کہلوانا پسند کریں گے۔"

بیوی نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا "آپ کا بھی جواب نہیں۔ آپ میری امانت قوم کو سونپ دے رہے ہیں۔ اگر واقعی "میری امانت" شاعری کے چکر میں پڑ کر ہاتھ سے نکل جائے گی تو قوم اُنھیں کیا دے گی؟"

صدانی نے برجستہ کہا "آپ بونتے اُڑھا رہی ہیں اور قوم ایک مثال کے وعدہ پر ٹرخا دے گی۔"

میں جو بڑی دیر سے بخار کی بھٹی میں تپتے اور ڈھیر سارے بونتوں کے نیچے کپکپاتے ہوئے دیور بھیّا اور بھابی کے مکالمے سُن رہا تھا، ضبط نہ کر سکا۔ کراہتے ہوئے بولا "صدانی! میں تمہاری ساری باتیں سُن رہا تھا۔ تم میری بیوی کو میرے خلاف ورغلا رہے ہو اور میری بڑبڑاہٹ کو جدید شاعری سے تعبیر کر رہے ہو۔ کیا جدید شاعری بڑبڑاہٹ کا دوسرا نام ہے؟"

وہ بولے "بخار کی حالت میں تم نے جو کچھ "عرض کیا ہے" اس میں کم از کم ایک قسم کا رِدھم اور بحر تو ہے جدید شاعری میں یہ بھی نہیں۔ اگر ثبوت چاہتے ہو تو رسائل پیش کر سکتا ہوں۔"

میں نے زِچ ہو کر کہا "تم ٹھیرے ہر لفظ کے معنیٰ لغت میں دیکھنے والے۔ یہ جدید شاعری تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اکیسویں صدی کی نسل بڑی آسانی سے سمجھ لے گی۔"

صدانی نے طنز کیا "یہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اکیسویں صدی کی نسل کے لیے جدید شاعر کو بیسویں صدی کی سٹیشنری (STATIONARY) اور نیوز پرنٹ ضائع کرنے کا کیا حق ہے"

میں نے کہا "یار! جب تک تم ابہام کو نہ سمجھ پاؤ گے، جدید شاعری تمہاری سمجھ میں نہ آئے گی۔ اگر میں معنی پہنانے بیٹھوں تو بخار کی حالت میں میں نے جو کچھ "عرض کیا ہے" وہ بھی ایک نظم ہے۔ اور "بونتہ" غریبی کی علامت ہے"

صمدانی نے قہقہہ بلند کرتے ہوئے کہا "تو پھر 'رضائی' 'امیری' کی علامت ہوئی!"

میری زبان سے بے ساختہ نکلا "بہت خوب! مکرّر ارشاد! تم روزانہ اسی طرح زائد ادب تہہ کرنے لگو گے تو دو چار دن میں جدید شاعری کو پوری طرح سمجھ پاؤ گے۔ فی الحال مجھ پر یہ کرم کرو کہ کسی میڈیکل شاپ سے ملیریا کے ٹیبلٹس (TABLETS) لادو"

صمدانی دوا لانے کے لیے چلے گئے۔ مجھ پر پھر کپکپی طاری ہو گئی اور میں پھر بڑبڑانے لگا۔

"بونتہ! بونتہ اڑھاؤ بونتہ!"

○

غالباً آپ نے بونتہ ضرور دیکھا ہوگا۔ نہیں دیکھا ہے تو جانے دیجئے۔ شاید آپ کا تعلق 'رضائی' یا 'لحاف' سے ہے۔ خیر ہم بتائے دیتے ہیں ـــــ ساڑی جب وظیفۂ حسنِ خدمت پر علیحدہ کر دی جاتی ہے تو سگھڑ خواتین اسے بونتہ کا روپ دے دیتی ہیں۔ بس یوں سمجھئے کہ پچپن سالہ مدتِ ملازمت کو بڑھا کر اٹھاون سالہ کر دیا گیا ہو۔ لیکن اس کے لیے ساڑی پُر زور مطالبہ نہیں کرتی! ـــــ بونتہ کیا ہے؟ ـــــ اچھے خاصے پیاچ ورک (PATCH WORK) کا نام بونتہ ہے! اس کی تیاری میں گھر کے سارے افراد کے پُرانے کپڑے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ مُنّا کی چڈی، مُنّی کی فراک، والد کی لنگی، بہن کا جمپر، بیٹے کا پاجامہ، بھائی کا بشرٹ، بھابی کا پیٹی کوٹ اور شیر خوار کی پھتلیاں۔ جب یہ ساری فہرست سلیقہ سے ترتیب دی جاتی ہے تو اس پر ماں کی ساڑی کو اڑھا کر بونتہ سی لیا جاتا ہے۔ یہ بونتہ کہاں ہوا؟ یہ تو ایک ایسا ناول ہوا جس پر ایک خوبصورت ٹائیٹل کور (TITLE COVER) چڑھا دیا گیا ہو۔ یوں بھی بونتہ ایک ایسے ناول کے مماثل ہوتا ہے جس کے محاسن بھی ہوں اور معائب بھی۔ اس بونتہ کا ہر پیاچ (PATCH) ناول کا ایک مکمل کردار ہوتا ہے اور ہر کردار کی ایک جیتی جاگتی کہانی بونتہ میں سانس لیتی رہتی ہے۔ مگر سوشیل ریفارمرس (SOCIAL REFORMERS) کو اتنی توفیق کہاں کہ وہ اس ناول کو پڑھیں اور سمجھیں۔

صوتی اعتبار سے "بونتہ" کانوں کو بھلا نہیں لگتا۔ یہ لفظ سنتے ہی آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے کسی نے آپ کے کانوں کے قریب تاشہ کو زور سے بجا کر آپ کی قوتِ سماعت کو چیلنج کیا ہو۔ دیکھنے میں بھی 'بونتہ' بڑے واہیات قسم کا لگتا ہے۔ 'بونتہ' بولتے ہوئے شرم کا احساس دامن گیر رہتا ہے۔ غریبی ہے ہی کچھ ایسی چیز! مگر جناب! بونتہ بڑے کام کی چیز ہے۔ بستر پر بچھائیے، بچھے گا نہیں، دھوپ میں سکھائیے اس کا رنگ اور نکھر آئے گا۔ پانی میں بھگو دیجئے

دھوبی کا دم نکل جاتا ہے۔ وہ ہاتھ جوڑ کر یہی کہے گا " میں تو باز آیا بونتہ دھونے سے!" جب بونتہ ایسا ہو تو اندازہ لگائیے کہ بونتہ کے پروردہ کتنے جفاکش اور محنتی نہ ہوتے ہونگے!

جہاں تک رضائی کا تعلق ہے، وہ بالکل چھوئی موئی قسم کی ہوتی ہے۔ پانی میں بھگوئیے، بھیگ کر گولہ بن جائے گی۔ دھوپ میں سکھائیے، اس کا کلر (COLOUR) فیڈ (FADE) ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ رضائی کو سینت سینت کر رکھنا پڑتا ہے۔

ہمارے ملک میں شمال والے "بونتہ" کو "گدڑی" کہتے ہیں اور آندھرا کے علاقے والے 'بونتہ'۔ نام بدلنے سے غریبی نہیں بدلتی۔ لے غریبی تیرے کئی نام!

ایک زمانے سے "بونتہ" میرے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ معاف کیجئے! غلط بیانی سے کام لیا۔ بچپن سے ہی 'بونتہ' میرے تحت الشعور میں چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے بونتہ پر آنکھیں کھولیں۔ ہوش سنبھالا تبھی تو بونتہ برابر میرے ساتھ تھا۔ بونتہ بچھاؤ۔ بونتہ اوڑھو۔ گھر میں بونتہ۔ باہر بونتہ۔ حد ہو گئی اسکول میں بھی بونتہ۔ مجھے وہ انگلش کے ٹیچر اکثر یاد آتے ہیں جو اُردو زبان میں انگریزی پڑھایا کرتے تھے اور لڑکوں کو مارنے کے لیئے بہانے کے متلاشی رہتے تھے۔ ایک دن نہ جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ اچانک ہم سے اینگلو اُردو (ANGLO - URDU) میں سوال کیا " بتاؤ YESTER DAY کسے کہتے ہیں ؟"

ہم نے سہل ممتنع میں جواب دیا " میں کل نہیں آیا تھا!"

" تو YESTER DAY کے معنی ـــــ میں کل نہیں آیا تھا ؟" ٹیچر نے " تھا " پر بہت زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہم نے ڈرتے ڈرتے وضاحت کی " سر! حقیقت میں میں کل نہیں آیا تھا "

غصّہ سے پوچھا " کیوں نہیں آئے تھے ؟ "

" سر! کل بارش ہوئی تھی!" ہم نے قدرت کا سہارا لیا۔

انھوں نے مادّی جواز پیش کیا " چھتری لگا کر آنا تھا!"

" سر! چھتری نہیں ہے!"

" تو کمبل اوڑھ کر آنا تھا!"

" کمبل بھی نہیں ہے!"

پیٹھ پر ایک زبردست گھونسہ جڑتے ہوئے فرمایا " ارے کمبخت! تو پھر بونتہ اوڑھ کر آنا تھا!"

اس حادثہ کے بعد تو مجھے بونتہ سے ایک چڑ سی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اسی روز اپنی ماں سے شکایت کی کہ " ماں! مجھ سے یہ بونتہ سہا نہیں جاتا۔ آخر یہ بونتہ کب تک ؟ مجھے تو رضائی چاہیئے رضائی!"

وہ اُداس ہو کر بولی " بیٹا! میں کب بونتہ کو پسند کرتی ہوں ؟ میں تو شادی کے وقت اپنے ساتھ رضائی لائی تھی۔ لیکن بونتہ میرا مقدر بنا دیا گیا۔ اب تو میرے پاس بونتہ کا ڈپلوما (DIPLOMA) ہے۔ صرف میں ہی کیا۔ بھارت کی ہر عورت شادی کے وقت اپنے ساتھ رضائی لاتی ہے۔ لیکن مرد آ سے

بونتہ کی اہلی بنا کر رکھ دیتے ہیں !" ـــــ اور پھر ماں نے بونتہ کے سلسلۂ حسب و نسب کو خاندان در خاندان اور نسل در نسل گزارتے ہوئے بالآخر دجّال سے ملا دیا اور بولی "عنقریب دجّال بونتہ اوڑھ کر آنے والا ہے۔ وہ ابھی بونتہ سی رہا ہے جیسے ہی وہ بونتہ سی لے گا، نمودار ہوگا۔ پھر دجّال کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوگا۔ خدا نہ دکھائے دجّال کے فتنہ کو ـــــ اور پھر ماں دجّال کے فتنہ کو دیکھے بغیر "بونتہ" ہمارے حوالے کر گئی کہ سنبھالو یہ پرکھوں کی امانت ہے!

اس طرح یہ "بونتہ" نئی نسل میں منتقل کر دیا گیا! ـــــ اور ایک دن ہماری شادی ہوگئی۔

شادی کی پہلی شب ہم نے دلہن سے پوچھا "آپ کی کوالیفیکیشن (QUALIFICATION) کیا ہے؟

اس نے جواب دیا "یہ آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ ماں سے بولوں گی!"

"ارے بھئی! میرا مطلب ہے آپ کہاں تک پڑھی ہیں؟"

وہ بولی "مجھے سینا پرونا آتا ہے اور میں بونتہ سینا جانتی ہوں۔ بونتہ سیوں گی۔ بونتہ اُڑھاؤں گی!"

اس قسم کی کوالیفیکیشن (QUALIFICATION) رکھنے والی لڑکیوں کی ہمارے ملک میں کوئی کمی نہیں۔ لیکن یہ لڑکیاں خلیجی ریاستوں کو برآمد کر دی جاتی ہیں۔ وہاں اُن کی بڑی مانگ ہے اور یہاں جہیز اور اور گھوڑے جوڑے کی رقم کی مانگ ہے۔

جب بھی میں ایک ہی خاندان کے سارے افراد کو بونتے اوڑھے سوتے ہوئے دیکھتا ہوں تو بڑی اُلجھن کا شکار ہو جاتا ہوں۔ میں اس رات کو کبھی نہیں بھول سکتا جو میرے لیے حماقتوں کا ایک طوفان اپنے ساتھ لائی تھی۔ ہماری شادی کو ہوئے چند ہی دن گزرے تھے۔ غالباً دوسری یا تیسری جمعگی تھی۔ ہم سسرال میں موج منا رہے تھے۔ ایک دن "بونتہ" کے مسئلہ پر بیوی سے تھوڑی سی ناچاقی ہوگئی۔ اور یہ بات سسرال والوں کو بڑی ناگوار گزری۔ سسرال کے سارے افراد ہم سے ناراض ہوگئے۔ اس رات بیوی نے یہی مناسب سمجھا کہ ہم ہجر کی کیفیت سے گزریں اور تارے گنیں۔

جب رات کے بارہ بج چکے تو ہماری پلنگ کے قریب بلّی کی آواز سنائی دی۔ رات کے وقت بلّی کی آواز ہماری کمزوری رہی ہے۔ ہم نے سوچا کہ بلّی سے ڈرتے ڈرتے صبح کرنے کی بجائے خوشامد کر کے بیوی کو منا لینا چاہیئے۔ ہم ہمت کر کے دبے پاؤں دالان میں پہنچے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ وہاں کا نقشہ ہی کچھ بدلا ہوا ہے۔ گھر کے سارے افراد بونتے اوڑھے سو رہے تھے۔ ہمیں یوں لگا جیسے سارے افراد رنگ برنگی ساڑیاں اوڑھے سو رہے ہیں۔ ہم ایک عجیب طرح کی ذہنی کش مکش میں مبتلا ہوگئے۔ ہمیں اپنی بیوی کا پتہ لگانا مشکل ہوگیا تھا۔ ہم میں اتنی قوت شامّہ تو ہے نہیں کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے تربیت یافتہ بلڈ ہاؤنڈ کی طرح بو سونگھ سونگھ کر یہ پتہ لگاتے کہ کس بونتہ کے نیچے ہماری نصف بہتر محو خواب ہے۔ کشتی یا پھر بن کر جگانے سے تو رہے۔ بالآخر عقل کو اپنا قطب نما بنایا اور ایک گٹھری نما چیز کو آہستہ سے ہلا کر کہا "اجی اٹھو!"

کھڑکی میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور ایک دھیمی آواز سنائی دی "کون ؟"
لہجہ سے پہچان گئے کہ وہ ہماری نصف بہتر نہیں بلکہ ان کی والدۂ محترمہ ہیں۔ چنانچہ ممناتے ہوئے جواب دیا "ہم ہم ہیں! یعنی کہ آپ کا غلام جسے دامادی کا شرف بخشا گیا ہے"۔
وہ کسی قدر تیز لہجہ میں بولیں "اتنی رات گئے کیا کام ؟"
ہم نے فدویانہ لہجے میں جواب دیا "قدم بوسی کے لئے حاضر ہوا تھا۔ کل کی رنجش کی معافی چاہتا ہوں"۔
انھوں نے مربیانہ لہجہ میں جواب دیا "صبح میں بھی تو حاضر ہو سکتے تھے!"
ہم نے تڑ سے وہ شعر پڑھ دیا جو زمانۂ طالب علمی میں بغیر سوچے سمجھے ہی بیت بازی کے مقابلوں میں اکثر سنایا کرتے تھے ؎

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

شعر سنتے ہی "مکرر ارشاد" کی بجائے "اچھا جاؤ معاف کیا!" کے جواب سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔
بونتہ میں اکیلا ہی نہیں اوڑھتا۔ بھارت کی نوّے فیصد آبادی بونتہ اوڑھتی ہے۔ گاؤں گاؤں۔ شہر شہر، قریہ قریہ، بونتے کی فراوانی ہے۔ اور ہر فرد کے ساتھ تخلص کی طرح بونتہ لگا ہوا ہے۔ بونتہ بھومیا بونتہ برہان الدین، بونتہ رام ریڈی، بونتہ کرشنا چاری، بونتہ ملّا، بونتہ غوثیہ بیگم۔ چنانچہ الیکشن کے زمانے میں ہمارے لیڈر اسی بونتہ کو بنیاد بناکر ووٹ مانگنے کے لئے آتے ہیں۔ بعض لیڈر تو بونتہ کو کچھ اس طرح اوڑھ لیتے ہیں کہ ان کی صورت تک دکھائی نہیں دیتی۔ اور وہ مجسم بونتہ بن جاتے ہیں۔ میں اس قسم کے لیڈروں کو جب دیکھتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں۔ کیونکہ اس بونتہ کے اندر دجّال چھپا ہوتا ہے لیکن عوام اس کو پہچان نہیں پاتے لہذا وہ اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ دجّال کا فتنہ اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ جلوس نکلتے ہیں۔ نعرہ بازی شروع ہو جاتی ہے۔

جیتے گا بھئی جیتے گا   بونتے والا جیتے گا

اور پھر دجّال الیکشن جیت جاتا ہے۔ جیسے ہی وہ اقتدار پہ آجاتا ہے فوراً بونتہ کو جھٹک دیتا ہے اور رضائی اوڑھ لیتا ہے۔ تب وہ بونتہ ستیہ نارائینا کی بجائے بی۔ ستیہ نارائینا کی نیم پلیٹ (NAME PLATE) لگاتا ہے۔ اب اس کو عوام سے کئے ہوئے وعدے یاد نہیں رہتے۔ وعدے تو خیر دور کی بات ہوئی۔ عوام کی سیدھی سادی زبان اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی مادری زبان بھول جاتا ہے اور اقتدار کی زبان میں بات کرنے لگتا ہے۔ یہیں سے ترسیل کا المیہ شروع ہو جاتا ہے۔ عوام اپنی مادری زبان اور سیدھی سادی اُردو زبان میں اپنا حق مانگتے ہیں ــــــ

ع "روٹی، کپڑا اور مکان"

وہ اقتدار کی زبان میں جواب دیتا ہے ــــ

ع "آپڑی تپڑی پوپتی کا پان"

یہ زبان عوام کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تب صحافت اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے یہ گرہ لگاتی ہے۔

ع "پکڑ دو اپنے لیڈر کے کان"

اس طرح اصنافِ سخن میں تین مصرعوں والی نظم "تپائی" کا اضافہ ہوجاتا ہے۔

روٹی کپڑا اور مکان
آپڑی تیڑی پوتی کا پان
پکڑ دو اپنے لیڈر کے کان

عوام اس "تپائی" کو اپنا نعرہ بنا کر لیڈر کی طرف لپکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں مڈ ٹرم الیکشن (MID-TERM-ELECTIONS) کی نوبت آجاتی ہے۔ تب کہیں جا کر وہ لیڈر بونتے والوں کی صف میں آ کھڑا ہوتا ہے۔ اور پھر "بونتہ" کا احیاء عمل میں آتا ہے۔ اس وقت تک لیڈر کی سوجھ بوجھ کافی اچھی ہوجاتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر کوئی پریس رپورٹر اس سے پوچھے کہ "بتائیے اس دنیا میں عارضی کیا ہے؟"

لیڈر کا جواب ہوگا "رضائی!"

"اور PERMANENT؟"

وہ بولے گا "بونتہ!"

لہٰذا ——————

بونتہ زندہ باد!
بونتہ پائندہ باد!

نصر قریشی

شہرِ سخن

ہر طرف شہرِ سخن میں لوگ بھی کیا کیا ملے
کچھ غزل گو، کچھ غزل گا، کچھ غزل پیما ملے

فکر کی دہلیز پہ الفاظ کے کاسے لیے
کچھ گدا، داتا کی صورت، کچھ نئے آقا ملے

کچھ لباسِ شعر و حکمت میں ابوجہلوں کے پیر
منبرِ شعر و ادب پر واعظِ کہنہ ملے

کچھ نئی نظموں کے خالق، کچھ نئے نقادِ فن
لے کے زنبیلِ غزل کچھ ذہن فرسودہ ملے

شہسوارانِ سخن کچھ، پا پیادہ کچھ غلام
صورتِ افواج میدانوں میں صف آرا ملے

صورتِ غولِ بیابانی، ہجومِ شاعراں
کچھ نئے اور کچھ پرانے، ہر طرف یکجا ملے

چائے خانے مرکزِ دانش وراں آئے نظر
ناروا جملے اگلنے میں سبھی اعلیٰ ملے

فن پہ بحثیں، ذاتی باتوں میں الجھ کر رہ گئیں
نصر اس شہرِ سخن میں کوئی تو دانا ملے

غزل

مسیح الدین انصاری شارق

نا رامن مجھ سے میری پڑوسن ہے آج کل
تقدیر سے بغل ہی میں دشمن ہے آج کل

انگلش نژاد مس سے کنکشن ہے آج کل
اپنا بھی کچھ عجیب سلیکشن ہے آج کل

فرصت اسے سنگھار سے ملتی نہیں ہے اب
آئینہ ہے، وہ شوخ ہے، جوبن ہے آج کل

وہ روٹھنا، بگڑنا، خفا ہونا ہر گھڑی
تم میں بھی جانِ من کوئی بچپن ہے آج کل

ٹیلی ویژن سے کرتے ہیں دنیا کی سیر ہم
جامِ جہاں نما ہے، نہ درپن ہے آج کل

فلمی جگت میں پائیں گے ہر اک کو جلوہ گر
نرگس ہے گلستاں میں نہ نوتن ہے آج کل

جوتا چلے گا دیکھنا بازار میں ضرور
دشمن میں اور ان میں فریکشن ہے آج کل

اک بھیڑ طالبوں کی ہے کوچے میں یار کے
سنتے ہیں عاشقوں کا الیکشن ہے آج کل

عرصے سے سنتے آتے تھے بیمار ہے غریب
شارق کے گھر میں کیسا یہ شیون ہے آج کل

اکھڑ دن بیٹھتا ہے۔"

ایک اور مشہور و معروف کہانی نویس و مکالمہ نگار ہیں، کسی زمانے میں جن کا طوطی بولتا تھا۔ وقت واحد میں آٹھ آٹھ فلمیں لکھتے تھے۔ کام کرنے کا ان کا طریقہ بالکل جداگانہ ہونے کے ساتھ مضحکہ خیز بھی ہوا کرتا تھا۔ کرتے یوں تھے کہ لکھنے کے کمرے میں فلموں کی تعداد کے حساب سے میز کرسیاں لگوایا کرتے تھے۔ کام کے اوقات کو بھی فلموں کی تعداد کی مناسبت سے برابر برابر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ پہلی کہانی کو مقررہ وقت دینے کے بعد دوسری کہانی کے لیے چھلانگ لگا کر دوسری میز پر پہنچ جاتے تھے اس کے بعد تیسری پھر چوتھی اسی طرح تمام دن چھلانگ لگا کر کہانیوں پر کام کیا کرتے تھے۔ موصوف چونکہ حقے سے بھی شغف فرماتے تھے چنانچہ حقے کی لمبی نے بھی موصوف کے ساتھ اچھلا کرتی تھی۔ چنانچہ ان دنوں سنتے ہیں۔ موصوف کا حقہ "میوزیم" میں پہنچ گیا ہے اور خود موصوف کسی سرکس میں بھرتی ہو گئے ہیں

بعض کہانی کار اس زور سے کہانی پر بیٹھتے ہیں کہ بے چاری کہانی کا کچومر نکل جاتا ہے۔ چونکہ کہانی نویس حضرات فلم ساز کی مرضی پر کہانی پر بیٹھتے ہیں اس لیے اس کی مرضی کے خلاف اٹھ نہیں سکتے اور جو کم عقل اپنی مرضی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں پھر انھیں کسی کہانی پر بیٹھنا تو در کنار "کھڑا" ہونا بھی نصیب نہیں ہوتا۔

کہانی پر کہانی کار کے علاوہ فلم ساز/ہدایت کار کے ایسے چمچے بھی بیٹھتے ہیں جو نام نہاد قسم کے دانشور ہوتے ہیں۔ روزنامہ اجرت پر کام کرنے والے ان پیشہ ور حضرات کا کام کہانی کو آگے بڑھانا نہیں ہوتا بلکہ کہانی کار کے کام میں روڑے اٹکانا ہوتا ہے۔ کہانی پر بیٹھنے والے جھگڑے میں سب سے تکلیف دہ پوزیشن یا تو کہانی کار کی ہوتی ہے یا پھر کہانی کی۔

اس قبیل کا ایک واقعہ بھی سن لیجیے ـــــ ایک میٹنگ کے دوران ہی فلم ساز کے چمچے کو یہ علم ہوا کہ کہانی کے تقاضے کے مطابق کہانی کار نے آخر میں ہیرو کو مار دیا ہے تو وہ دوڑا دوڑا گیا اور فلم ساز کو موقع واردات پر لے آیا۔ فلم ساز جس وقت کہانی کار کے سر پر پہنچا غصے سے بری طرح بھنایا ہوا تھا۔ آتے ہی برس پڑا۔ "منشی تم کا تنا مال دے کر کہانی پر اس لیے بٹھایا تھا کہ تم ہم کو ہی مار ڈالو"۔ کہانی نویس ہکا بکا رہ گیا۔ گڑبڑا کر بولا "میں کچھ سمجھا نہیں سیٹھ جی۔ میں آپ کو کیوں مار دوں گا۔ میں نے تو صرف ہیرو کو مارا ہے وہ بھی کہانی کی demand کے پیش نظر"۔ اب سیٹھ نے غضبناک نظروں سے اپنے چمچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بولتا ہے کہ اس نے ہم کو نہیں ہیرو کو مارا ہے۔" چمچے نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جواب دیا۔ "یہ سچ ہے سیٹھ جی کہ اس نے ہیرو کو مارا ہے لیکن آپ جانتے ہیں کہ اپنے من پسند ہیرو کو مرتا دیکھ کر پبلک آپ کو مار دے گی ہیرو تو لاکھوں روپے لے کر جھوٹ موٹ مرے گا پھر زندہ ہو جائے گا۔ لیکن فلم پٹ جانے کے بعد آپ کا سورگ باش ضرور ہو جائے گا۔" چمچے کی اس شاطرانہ چال نے یہ رنگ دکھایا کہ کہانی کار کو آن واحد میں کہانی پر سے ایسا اٹھایا کہ بے چارہ پھر مدتوں کسی کہانی پر نہیں بیٹھ سکا۔ بیٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔

فلم کہانی کے بارے میں سبھی جانتے ہیں کہ بہت کم لکھی جاتی ہے۔ زیادہ تر اڑائی جاتی ہے تو پھر کہانی پر بیٹھنے کا یہ کھڑاگ کس لیے پھیلایا جاتا ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اڑائی ہوئی کہانی میں کہانی نویس ایک ساتھ سر جوڑ کر "توڑ جوڑ" کرتے ہیں اور پھر بارہ مسالے کی ایسی چاٹ تیار کرتے ہیں جسے پبلک چٹخارے لے کر دیکھتی ہے اور فلم ساز روپے بٹورتا ہے اور ٹھاٹھ کرتا ہے۔ البتہ فلم پٹ جانے کی صورت میں "ٹھاٹ" کے بجائے "کھاٹ" فلم ساز کا منتظر ہوتا ہے۔ جس پر وہ اس وقت تک پڑا رہتا ہے جب تک کہ اس کی کوئی اگلی فلم "ہٹ" نہیں ہو جاتی۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ یہی کھاٹ بے چارے فلم ساز کو قبرستان یا شمشان گھاٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔

کہانی پر بیٹھکوں کا اہتمام زیادہ تر ہوٹلوں میں کمرے بک کرواکے کیا جاتا ہے۔ اچھے کہانی کاروں کی بیٹھک بھی اونچی ہوا کرتی ہے یعنی یہ سلسلہ اکثر دور دراز کشمیر کی برفیلی وادیوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو بیٹھک سطح مرتفع سے جتنی زیادہ اونچی ہوتی ہے کہانی اتنی ہی نچلی سطح کی ہوتی ہے یعنی وہی بات جتنی اونچی دکان اتنا ہی پھیکا پکوان۔

ہوٹلوں میں کمرے بک کروا کے جو بیٹھکیں ہوتی جاتی ہیں ان میں ایسے کہانی کاروں کا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ جو چھت سے محروم ہوتے ہیں۔ لیکن ایسے کہانی کار بھی ہوٹلوں میں بیٹھک کو ترجیح دیتے ہیں جو شاندار بنگلوں اور فلیٹوں میں رہتے ہیں اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہر کہانی کار ابتدا میں چھت سے محروم ہوتا ہے اور یہ محرومی چونکہ اس کے مرحوم ہونے تک پیچھا نہیں چھوڑتی اسی لیے اس کی زندگی اس مصرعے کی تفسیر ہوتی ہے ؎

کبھی ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر......!!

"پردۂ سیمیں" پر خواتین کی جس قدر بھرمار ہے، پردے کے پیچھے اتنا ہی کال، یعنی فلم کے فنی شعبوں میں ابتدا ہی سے مردوں کی عملداری رہی ہے۔ فلمی کہانی کے میدان میں بھی شروع سے مردوں کا اجارہ رہا ہے۔ کبھی کبھار ایک آدھ خاتون ادیبہ کے ناول پر فلم ضرور بنی ہے۔ ایک آدھ فلم کے مکالمے بھی کسی خاتون ادیبہ سے لکھائے گئے ہیں لیکن یہ فلمیں چونکہ باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکیں اس لیے پھر کسی نے ان کی ہمت افزائی کی ہمت نہیں کی۔ ابھی حال ہی میں ہماری ملاقات ایک ایسی خاتون ادیبہ سے ہوئی جو فلموں میں کہانی گیت اور مکالمے لکھنے کی خواہش مند ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ جیسا کہ آپ جانتی ہیں فلمی دنیا کے کسی شعبے میں بغیر جد و جہد اور [illegible] کے چانس نہیں ملتا آپ بھی یقیناً جد و جہد کے دور سے گزر رہی ہوں گی؟"

"جی ہاں۔" خاتون ادیب نے جواب دیا۔

"مردوں کی نسبت میں سمجھتا ہوں آپ کو اتنے حوصلہ شکن حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہوگا ــــ" ہم نے انہیں کریدا۔

"آپ کا کہنا کسی حد تک درست ہے لیکن آزمائشوں سے میں بھی بہرحال گزر رہی ہوں۔"

محترمہ کے اس سوال پر ہم نے پوچھا۔ "کہیں ان آزمائشوں نے آپ کو ناامید تو نہیں کر دیا"

"ہرگز نہیں جناب۔" موصوفہ نے تُرش لہجے میں کہا: "ناامیدی مجھے چھو کر بھی نہیں گزر سکتی۔ آپ کی دعا سے میں تو امید سے ہوں۔"

محترمہ کے اس جواب نے ہمیں اس قدر چونکا دیا کہ دوبارہ پھر ان سے ملاقات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ آج بھی جب موصوفہ کا خیال آجاتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ چل کر ملاقات کی جائے۔ ان سے نہیں ان کی امید کے نتیجے سے ــــ!

عام خیال یہ ہے کہ موجودہ رجحان کے مطابق فلمی کہانی لکھنا کچھ مشکل کام نہیں۔ لیکن اسے سُنانا ایک فن ضرور ہے اور یہ آرٹ کسی فائن آرٹس کالج سے حاصل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ اس آرٹ کے ڈانڈے کسی فائن آرٹس سے نہیں ملتے بلکہ مسمریزم، ہپناٹزم سے ملتے ہیں۔ بعض کامیاب کہانی کاروں کے بارے میں تو یہ افواہ مشہور ہے کہ "بھان متی" جیسا خطرناک جادو تک جانتے ہیں ــــ!

ایسے ہی ایک کہانی نویس کے تعلق سے مشہور ہے کہ کہانی سناتے ہوئے کہانی کا ایک حصہ ہی بن جاتے تھے۔ یعنی جب کہانی میں رونے دھونے کا سین آتا، موصوف خود دھاڑیں مار کر رونے لگتے تھے۔ اسی طرح مزاحیہ سین سناتے ہوئے خود ہنسی کا فوارہ بن جاتے اور مار... دھاڑ کے سین۔ سناتے وقت کافی خون خوار ہو جاتے تھے یعنی مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

سُنا ہے ایک مرتبہ کوئی نازک سا نوجوان پروڈیوسر موصوف کے یہاں کہانی سُننے پہنچا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد موقع واردات پر موجود راویوں کے بیان کے مطابق نوجوان فلم ساز کہانی نویس کے کمرے سے حواس باختہ نکلا اور بے تحاشہ سڑک پر دوڑتا چلا گیا۔ جب گھر کے بھیدی سے اس کی بات پوچھی گئی تو معلوم ہوا کہ کہانی نویس نے بیچارے فلم ساز کو کہانی کا وہ سین عملاً سنانے کی کوشش کی تھی جس میں ویلن ہیروئن کی آبرو ریزی کی کوشش کرتا ہے۔

موصوف کے متعلق سے چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ جو آخری کہانی انہوں نے سنانے کی کوشش کی تھی وہ ایک مرڈر مسٹری (murder mystery) سے بھرپور کہانی تھی جس کے پہلے ہی سین میں ایک قتل دکھایا گیا تھا۔ چنانچہ ان دنوں کہانی نویس موصوف قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ یہ تو خیر ایک ایسے کہانی نویس کی داستان تھی جنہوں نے راست اپنے ہاتھ خون میں رنگے تھے۔ اب ایک ایسے کہانی نویس کا قصہ سنئے جو چار چار قتل کرنے کے باوجود آزادانہ گھوم پھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ موصوف ایک عدد دھانسو کہانی کے ساتھ فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے۔ ایک فلم ساز کو پھانسا، کہانی سنائی۔ ادھر کہانی ختم ہوئی اُدھر فلم ساز ختم۔ دوسرے پروڈیوسر کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کے بعد ایک اور غافل فلم ساز ان کی کہانی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب اس خونی کہانی کے چرچے انڈسٹری میں اس قدر عام ہو چکے تھے کہ تمام فلم ساز چوکنے ہو گئے۔ اپنی جان سبھی کو پیاری ہوتی ہے۔ انہی دنوں ایک نئے فلم ساز کی آمد کی خبر سُن کر کہانی نویس اپنی خونی کہانی سمیت پہنچ گئے۔ لوگوں نے بے چارے نوآموز فلم ساز کی جان کی خیر منائی۔ لیکن اس وقت دیکھ کر سب دنگ رہ گئے جب نوآموز فلم ساز کہانی سُننے کے بعد بھی زندہ نظر آیا۔ ایک دن بیتا، دوسرا دن بیتا، پھر تیسرا اسی طرح چار دن بیت گئے۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ خطرہ ٹل گیا۔ لیکن پانچویں روز اچانک فلم ساز کے انتقال کی خبر پھیلی۔ نامہ نگاروں نے کہانی نویس کو جا گھیرا۔ سب کی زبان پہ یہی ایک سوال تھا ــــ پچھلے تین فلم ساز تو کہانی سنتے ہی ڈھیر ہو گئے تھے لیکن یہ چوتھا فلم ساز چار دن تک کیسے اور کیوں کر زندہ رہا ــــــ!"

سیدھے چلے آیئے!

جواب میں کہانی نویس نے چٹکی بجاتے ہوئے یہ مسئلہ حل کردیا۔ "دراصل اس فلم ساز کو میری کہانی چار روز بعد سمجھ میں آئی ـ بس ـــ!"

کہانی نویس کے ہاتھوں فلم سازوں کا حشر آپ نے سُنا لیکن جب کہانی نویس فلم ساز کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ اس واقعہ میں کہتے ہیں کہ ایک مشہور فلم ساز کے ہاں ایک نوآموز کہانی نویس کہانی سنانے پہنچا۔ کہانی جس وقت شروع ہوئی فلم ساز کے چھوٹے بچے بھی وہیں پاس بیٹھے کھیل میں مشغول تھے۔ تھوڑی ہی دیر
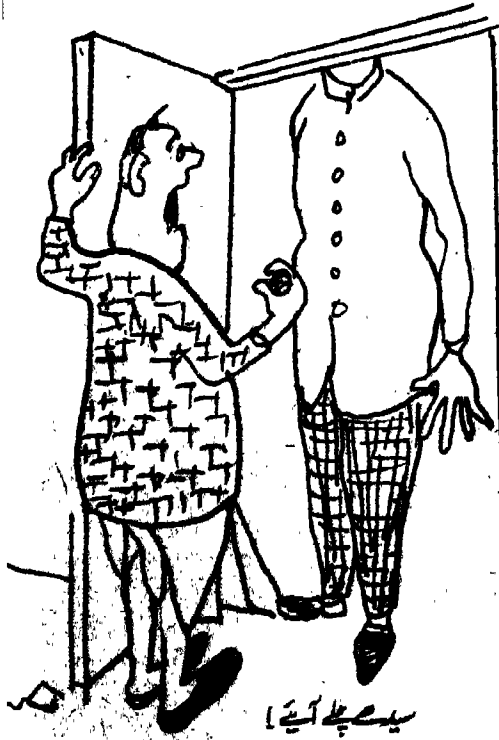
بعد کہانی نویس کو محسوس ہوا کہ فلم ساز کا دھیان کہانی کے بجائے اپنے بچوں کی طرف ہے، وہ اپنے بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ کہانی کے ساتھ ایسا ہوتا دیکھ کہانی نویس کو کھل گیا اس نے کہانی معطل کر دی اور جھنجھلا کر بولا "میں کہانی سنا رہا ہوں اور آپ کا دھیان بچوں کی طرف لگا ہوا ہے۔ آخر اس بے توجہی کی وجہ ــــــ؟"

فلم ساز نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "میں دراصل اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہوں"

یہ جواب سن کر کہانی نویس اور بھی جھنجھلا گیا اور بولا "مگر میری کہانی سے آپ کے بچوں کے مستقبل کا کیا تعلق ــــــ؟"

جواب میں فلم ساز نے اسی طرح سرد لہجے میں کہا "بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر میں نے آپ کی کہانی پر فلم بنا ڈالی تو پھر ان بچوں کا جو حشر ہوگا وہ مجھے ابھی سے صاف نظر آ رہا ہے"۔!! کہتے ہیں ہر فن کار کو تخلیق کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے چاہے فن کار مقدر کا سکندر ہو یا مقدر کا پھندر۔ تخلیق کا کرب اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اس تجزیے کی روشنی میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ کہانی کو جنم دینا کسی جیتے جاگتے، ہمکتے ہوئے وجود کو جنم دینے سے کم نہیں ہوتی۔ البتہ فلمی کہانی کا جنم عموماً غیر فطری ہوتا ہے۔ یعنی فلمی کہانی فطری طریقے سے خود بخود پیدا نہیں ہوتی بلکہ "سیزرین" کے ذریعے اسے فیلمی ذہن کا سے باہر لایا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو فلم ساز اور اس کی حاشیہ بردار چنڈال چوکڑی اس قدر دھما چوکڑی مچاتی ہے کہ جو کہانی جنم لیتی ہے وہ اس نومولود کی طرح نحیف اور کمزور ہوتی ہے جو ساتویں ہی مہینے میں تولد ہو جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ میں سے بہتوں نے کہانی پر بیٹھے ہوئے کہانی کار کو نہ دیکھا ہو لیکن انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی ضرور دیکھی ہوگی بیچارے کہانی کار کی کچھ یہی پوزیشن ہوتی ہے۔ اور جس طرح مرغی یہ نہیں دیکھتی کہ جن انڈوں پر اُسے بٹھایا گیا ہے وہ اس کے اپنے ہی ہیں یا کسی اور کے اسی طرح کہانی کار کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کہانی کس کی ہے۔ اس کا کام تو بس کہانی پر بیٹھنا ہوتا ہے۔ البتہ مرغی اس معاملے میں خوش قسمت ہوتی ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد انڈوں میں سے "چوں چوں" کرتے چوزے نکل آتے ہیں۔ جبکہ اکثر کہانی کار اپنی "چول چول" ڈھیلی کروانے کے بعد بھی کہانی کے انڈے میں سے چوزہ تو دور مردہ چوزہ بھی نہیں نکال پاتے۔ بس کڑک مرغی کی طرح "کڑ کڑاتے" رہ جاتے ہیں!!

□□

ناموں کا گورکھ دھندہ

نظر برنی

آج کل دنیا میں ناموں کی ہوئی مٹی پلید
نام اور کردار میں ہونے لگا فرقِ جدید
آیئے کچھ اک مثالیں سامنے رکھتے چلیں
ان کو پرکھیں اور کھنگا لیں سامنے رکھتے چلیں
آنکھ کے اندھے کو دنیا "نور" کیوں کہنے لگی؟
"شمس" کے چہرے پہ ظلمت کا اندھیرا چھا گیا
وہ بہادر یار ہو کر دھمکیوں میں آگیا
گندگی ان کا مقدر نام جن کا ہے "نفیس"
نام ہے "مختار" ان کا جو ہیں بیوی کے غلام
نام "عاشق" ہے مگر پھرتے ہیں بے نیل و مرام
صورتِ کالج نہ دیکھی نام لکھتے ہیں "علیم"
عقل سے پیدل ہیں تو کیا نام ہے ان کا "فہیم"
جو ہیں دادا شہر کے ان کا "شرافت" نام ہے
نام ہے "فیاض" ان کا بخل جن کا کام ہے
سر سے پا تک وہ ہیں بھونڈے نام جن کا ہے "جمیل"
جن کی صورت ریچھ جیسی ہے وہ کہلائے "شکیل"
نام "رحمت" ہے مگر زحمت میں یہ مشہور ہیں
شکریہ کیوں کر ادا کرتے کہ وہ "مشکور" ہیں
نام "جابر" ہے تو پھر کیا دیکھنے میں ہیں شریف
نام ہے "مشتاق"، لیکن سب سے وہ بیزار ہیں
جو سدا روتے ہیں بس وہ ہی سب "گلزار" ہیں
لاکھ ان کا نام ہو آتا نہیں ان کو "جلال"
نام رکھ کر وہ "کمال" بن گئے اہلِ کمال
نام تو "سلطان" ہے قرضے پہ کرتے ہیں گذر
چاند بی بی اتنی بھونڈی جیسے نالی کا گٹر

وہ "فقیرا" جس کی صورت سے نحوست آشکار
پاس اس کے ہیں زمینیں، باغ کوٹھی اور کار
نام ہے اس کا "شگفتہ" رونا دھونا کام ہے
ایک کوڑی جو نہ چھوڑے اس کا "حاتم" نام ہے
وہ ہیں محروم تکلم نام جن کا ہے "کلیم"
غنڈہ گردی میں بہت مشہور ہیں بھائی "سلیم"
نام ہے "دھن راج" لیکن فردھنوں کے ہیں امام
نام "زاہد" ہے مگر پیتے ہیں وہ ہر صبح و شام
نام ہے "کپتان سنگھ" اور ہل چلاتے دیکھیے
ہے "گھمنڈی" نام لیکن سر جھکاتے دیکھیے
نام ہے "رن بیر" لیکن رن کبھی جیتا نہیں
شیر سنگھ کہتے ہیں جس کو شیر تک دیکھا نہیں
نام ہے "تارا وتی" مکھڑے پہ کالی رات ہے
جس نے کاشی ہی نہ دیکھی ہو، وہ "کاشی ناتھ" ہے
نام "روشن" ہے مگر آنکھوں کی بینائی نہیں
سیٹھ "لکھپت" کی گرہ میں ایک بھی پائی نہیں
جس کے ماتا اور پتا نے نام رکھا "ستیہ پال"
پرورش پا کر ہوا وہ جھوٹ میں اہلِ کمال
نام "جیوتی" ہے مگر آنکھوں پہ چشمہ دیکھیے
آسماں والے کا یارو یہ کرشمہ دیکھیے
ایسے جوشی دیکھیے جو جوش سے محروم ہیں
جو فقط خادم لکھیں سمجھو وہی مخدوم ہیں
ہم کہاں تک نام کی اور کام کی چرچا کریں
یہ تو صدیوں کا چلن ہے اس کو کیا رسوا کریں
آیئے اس قول پر کر دیجیے قصہ تمام
"یا مسلماں اللہ اللہ، یا برہمن رام رام"

ں مناکوٹھی میں پانچ عدد پیارے پیارے پھول سے بچوں، بیوی اور متعدد ملازموں کے ساتھ رئیسانہ ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔ اتنے لوگوں کے بیچ رہنے والا شخص آج یکہ و تنہا بے بسی اور کس مپرسی کی حالت میں مرگیا۔ وہ شخص جس کے دستر خوان پر شہر کے بڑے لوگ بیٹھنا فخر محسوس کرتے تھے آج بھوک کی سختیاں اٹھاتا ہوا ختم ہوگیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کی شاندار حویلی کے پیچھے میرا چھوٹا سا گھر تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناطے ہم انھیں چچا فیض کہتے تھے۔ چچا کو بچوں سے بڑا پیار تھا۔ ان کی لڑکی فرزانہ سے میری پکی دوستی تھی میں ہر روز ان کے یہاں جاتی تھی کیونکہ ہر شام وہ بچوں کو جمع کرکے ٹافیاں بانٹا کرتے تھے۔ چچی برابر میرے گھر آتی رہتیں۔ اماں سے ان کی گھنٹوں گفتگو چلتی۔ وہ آنسو پونچھتی جاتیں اور باتیں کرتی جاتیں۔ اماں انہیں سمجھا بجھا کر ان کے گھر واپس بھیج دیتیں۔ لیکن چچا فیض کی رنگین طبیعت ان کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھیں۔ یہ سب کچھ وہ برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ ایک دن ہم نے سنا چچی اپنے بچوں کو لے کر میکے چلی گئیں ہمیشہ کے لیے اور ...... اس دن سے ان کے گھر پر سناٹوں کا راج ہوگیا۔

چچا فیض اس واقعہ سے ٹوٹ سے گئے انہیں چچی سے جو والہانہ محبت تھی اسے وہ سمجھ نہ سکیں۔ ان کی رنگین مزاجی محض ذوق نظر کی تسکین کے لیے تھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کا یہ ذوقِ نظر دیوانگی کی سرحدوں کو چھو رہا تھا جس کی تسکین کے لیے وہ مختلف بھیس میں مختلف شہروں میں جا کر حسیناؤں کا دیدار عام کیا کرتے۔ کبھی چوڑی والے کے بھیس میں، کبھی پھیری والے کی شکل میں، کبھی ٹینس کے کھلاڑی کے روپ میں کبھی ٹیوٹر کی حیثیت سے۔ چچی ٹھہریں ایک گھریلو عورت وہ ان تمام اونچی نیچ کیسے سمجھتیں۔ وہ تو ان حرکات کو حد سے گری ہوئی بات سمجھتی تھیں۔ انہیں باتوں نے چچی کو ان سے بہت دور کردیا۔

باہر سے خوش مزاج چچا اندر سے بہت دکھی رہنے لگے وہ جب کبھی ہمارے یہاں آتے چچی کی خیریت پوچھتے۔ ایسا کرتے وقت ان کے لبوں سے آہ نکل جاتی اور پھر ایک دن ہم نے سنا چچی سرحد پار کرکے دیارِ غیر میں جا بسیں۔

چچا کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ وہ اس میں بہہ گئے جائیداد بکنے لگی۔ عیش کے سامان خریدے جانے لگے۔ دوستوں کا ایک ہجوم ہر وقت ان کے اردگرد موجود رہنے لگا۔ انھوں نے اپنے خوب صورت باغ کو اپنے ہاتھوں ویران کردیا۔ گھر کے چاروں طرف کی زمینیں، کوڑیوں کے مول بکنے لگیں۔ ہر طرف اونچی نیچی، چھوٹی بڑی، ٹیڑھی ترچھی دیواریں کھڑی ہوگئیں۔ چچا کی آسمان کو چھوتی ہوئی کوٹھی اب صرف ایک منزل کی رہ گئی جس کے ہر کمرہ میں کوئی نہ کوئی کرایہ دار، رشتہ دار یا دوست بس گیا۔

گھریلو زندگی گذارنے کی خواہش ان کی حسرت بن چکی تھی۔ حسینوں کو تاکنے جھانکنے کا مرض شباب پر پہونچ چکا تھا۔ شہر میں شادی ہو یا بیاہ یا کوئی اور تقریب چچا کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر زنانخانہ میں پہنچ جاتے یا اس دروازے کے قریب کھڑے ہو جاتے جہاں سے خواتین اندر جاتیں۔ اس سلسلہ میں گالیاں بھی سنتے، دھکے بھی کھاتے لیکن جاتے ضرور۔ خوب صورت لڑکیوں کے نام اور پتے کے پیچھے سرگرداں رہتے۔ پھر ان کے والدین کے یہاں پیغام بھیجتے۔ نتیجہ کیا ہوتا، بتانے کی ضرورت نہیں۔

محلے کے لڑکوں کو ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا تھا لڑکیوں کی طرف سے ان کو خط بھجواتے۔ کچھ دنوں تک خط و کتابت چلتی پھر تحفے وصولنے کا سلسلہ شروع ہوتا۔ پھر ملاقات کا ایک دن مقرر ہوتا جو اس ([illegible] A) کا آخری دن ہوتا۔ ان کی مرمت ہوتی اور لڑکی کی مذمت، اور کچھ ہی دنوں بعد ان کا نیا عشق پھر شروع کر دیا جاتا۔

چچا فیض کو اپنی خوب صورتی اور جوانی کی پھر چپا فیض پر بڑا فخر تھا۔ ان کے خیال میں شہر کی ساری لڑکیاں ان پر جان دیتی تھیں۔ چنچل اور شریر لڑکیاں، ان کو اپنے مذاق کا نشانہ بناتیں۔ آخر ستر بہتر سال کے آدمی سے خوف کس بات کا ہو سکتا تھا۔

آخر وقت میں چچا فیض کی تمام رنگین مزاجی ایک عدد شادی کی حسرت میں بدل چکی تھی اور وہ غالباً مرتے دم تک شہر کی سب سے خوبصورت حسینہ کو اپنی دولہن بنانے کے خواب دیکھتے رہے۔ اس خواب کی تعبیر کو دیکھنے کے لیے انہوں نے نہ جانے کتنے دھکے کھائے۔ کتنے پیسے خرچ کیے

آج ہمارے چچا فیض اور شہر والوں کے پیٹ والے صاحب ختم ہو چکے۔ ایک لمبی کہانی ختم ہوگئی۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ آخری وقت میں ان کے سر کے نیچے پیٹ تھی ایک ہاتھ میں رومال اور دوسرے میں ایک لفافہ .... شاید آخری بار ان کی شادی کی بات چیت کہیں سے چھوٹی تھی ......!

مگر سلیقے سے

منیل ظریف

ظریف جیب اڑاؤ مگر سلیقے سے
غزل میں مال گلاؤ مگر سلیقے سے

لڑاؤ مرغ لڑاؤ مگر سلیقے سے
کسی کو جھانپ میں لاؤ مگر سلیقے سے

ہو بات ایسی کہ سن کر یقین آجائے
لگاؤ گپ بھی لگاؤ مگر سلیقے سے

نئی تراشش کی فیشن کا میں خلاف نہیں
نئے لباس سلاؤ مگر سلیقے سے

یوں دیکھ کر تمہیں بچے نہ رو پڑیں ڈر کر
حضور بال بڑھاؤ مگر سلیقے سے

حجامت اپنی بناؤ خود ہاتھ سے اپنے
بچاؤ پیسے بچاؤ مگر سلیقے سے

چمک ہو ایسی کہ چندیا میں چاند آئے نظر
گھٹاؤ سر بھی گھٹاؤ مگر سلیقے سے

جو ٹانگ اڑانے کا عادی ہے روک کر اس کو
گلی میں ہاتھ بٹاؤ مگر سلیقے سے

ڈھنڈورا پیٹ کے بدنام جو کرے تم کو
تم اس کا تاشا بجاؤ مگر سلیقے سے

یہ بھوت لاتوں کا باتوں سے کیسے مانے گا
محاورہ کو نبھاؤ مگر سلیقے سے

ہو شر پسندی کی خارش اگر پڑوسی کو
تم اس کی تالو کھجاؤ مگر سلیقے سے

کہیں ولیمہ کی تقریب ہو کہ ہو چوتھی
ڈنر پہ ویسے ہی جاؤ مگر سلیقے سے

جہیز میں مالِ غنیمت جو ہاتھ آیا ہے
اب اس کو چٹکلے لگاؤ مگر سلیقے سے

سلیقہ مند نہ ہو گر کوئی شریکِ حیات
سلیقہ اس کو سکھاؤ مگر سلیقے سے

ظریف قرض کسی کا کبھی نہ لوٹاؤ
بس اس کو گول پھراؤ مگر سلیقے سے

ع

جلتے جلتے دے گئے بھاشن میاں
ہفتے بھر کا کھا گئے راشن میاں

گھول کر بیوی رسالے پی گئی
اور دھوتے رہ گئے برتن میاں

لڑکیوں کا اب تو پیچھا چھوڑیئے
ساٹھ کا سن ہے، یہ کیا اچھن میاں

آزمالیتی ہے سارے داؤ پیچ
کیوں نہ بیوی سے ڈریں کلن میاں

نوکروں پر دھر دیا الزام سب
اور خود ہی کھا گئے مکھن میاں

دونوں بیٹے کام پر جانے لگے
پھر بھی کم ہوتی نہیں الجھن میاں

بدنصیبی آج کل نقدوں پہ ہے
جائیں گے اک روز ہم لندن میاں

دو کبوتر مار کر واحد بھی اب
رکھ کے کاندھے پہ چلے ہیں گن میاں

واحد محسن (بمبئی)

کوئی پڑوسی آکر میرے بچوں کی لڑنے کی شکایت کرتاہے تو میں وہیں پڑا پڑا بے ساختہ جواب دیتا ہوں لڑنے دو کیا ہوا ، بچے ہیں خود ہی مل جائیں گے
اور ہوتا بھی یہی ہے ۔ چارپائی پر لیٹنے کے عمل میں ایک طرح کی لذت ضرور ہے مگر عارضی اور جزوقتی ۔ کیونکہ سوچ کے یہ انداز جو چارپائی پر
وقوع پذیر ہوتے ہیں ، زندگی میں بیچ ثابت ہوتے ہیں اور بیچ ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ یوں ان میں ایک بے زار کن یکسانیت پائی جاتی ہے جبکہ سوٹ
میں ملبوس بوٹ تک خود کو جکڑ کے جب میں کرسی پر بیٹھتا ہوں تو دنیا کی بے سکونی کا غم پھر میرے کندھوں پر سوار ہوجاتا ہے اور میں انسانیت
کے بے پناہ دکھوں کے بارے میں انتہائی دکھ کے ساتھ سوچنا شروع کر دیتا ہوں ۔ ایسے میں اگر کوئی میرا ساتھ دے تو میں دنیا کے
بہترین موضوعات پر نہایت عمدگی سے گفتگو کر سکتا ہوں ۔ میں نے اپنی زندگی کی طویل ترین اور عمدہ ترین بحثیں کرسی پر بیٹھ کر کی ہیں ۔
ایسے موقعے پر اگر کوئی مجھے ایک لمحے کو کرسی سے اتار کر نیچے کھڑا کر دے تو شاید میں اپنی زبان ہی بھول جاؤں ۔

کرسی میری زندگی میں بذاتِ خود ایک صاحب کردار شخصیت کی حامل ہے ۔ تائید و تکذیب کے جتنے خوب صورت پلان
کرسی پر بیٹھ کر کیے جاتے ہیں اور کہیں نہیں کیے جا سکتے ۔ اس میں انسان کو چار دیواری کا سا مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے ۔ انسان ہمیشہ
بے سہارگی سے ڈرتا ہے لہٰذا سہارے کے بغیر وہ زندگی میں ایک قدم آگے نہیں چل سکتا ۔ بڑھاپا انسان کے لیے صرف اسی وجہ سے
بے چارگی کا باعث ہے کہ انسان بیساکھی کا محتاج ہو جاتا ہے یہ بیساکھی اسے مختلف شکلوں میں ہر وقت اپنی احتیاج کے لیے درکار
ہوتی ہے ۔ کرسی میں کمر کے لیے ٹیک اور دائیں بائیں دو ہتھے مکمل طور پر انسانی خود مختاری کے نشان ہیں ۔ یوں کرسی میں بیٹھتے ہی ہم ہر طرف
سے سہاروں میں گھر جاتے ہیں اور یہی وہ سہارے ہیں جو مل کر اعتماد ، طاقت اور حوصلہ عطا کرتے ہیں ۔ انہی سہاروں کے مقابلے میں
باس پستہ قد اور سینیئر زبونے دکھائی دیتے ہیں ۔

یہ کرسی ہی کا اثر ہے کہ جب میں اپنے باس کے کمرے میں جاتا ہوں تو مجھے اس کی ہر بات پر مسکرانا پڑتا ہے ۔ جبکہ میرے کمرے
میں جب اپنی کرسی پر ہوتا ہوں اور میرا باس کبھی کبھار ادھر آنکلتا ہے تو معاملہ بالکل برعکس ہو جاتا ہے ۔ اسے میری ہر بات کو لطیفہ سمجھنے
کا عارضہ ہو جاتا ہے ۔ لہٰذا میں اپنا فیصلہ ، ہر رائے اور ہر خیال اپنی ہی کرسی پر بیٹھ کر لکھتا ہوں اور اختلاف کی صورت میں اپنی کرسی پر
بیٹھ کر خوب سوچ لیتا ہوں ۔ پھر میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ، میرا تبادلہ ہو جاتا ہے ۔

کرسی کے لیے کسی مخصوص شکل و صورت کا ہونا ضروری نہیں لیکن اس کی ملکیت و خود مختاری شرط ہے ۔ ٹانگیں ٹوٹی ہوئی
ہتھے اکھڑے ہوئے ہوں ، ٹیک لٹک چکی ہو یا چولیں ڈھیلی پڑ چکی ہوں اور بے شک کتنی ہی پرانی اور قدیم کیوں نہ ہو ۔ اس سے کوئی فرق
نہیں پڑتا مگر کرسی ہو اپنی ، بالکل اپنی ۔ اور یہی اپنی ملکیت کا احساس ہی واحد ذریعہ ہے جو ہماری صلاحیتوں کو [illegible] کر
کے ہمارے سامنے لا کھڑا کرتا ہے ۔

خالی کرسی ہمیشہ دستِ سوال کی طرح دراز دکھائی دیتی ہے بلکہ بعض اوقات مجھے بہت حیرت ہوتی ہے کہ کرسی تو دکھی ہوگر
اس میں کوئی براجمان نہ ہو ۔ یوں میں کرسی کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتا ۔ کتنی مصروفیت ہو ، میں کیسے ہی کام میں محو رہوں مگر جب تک ارد گرد ،
پاس پڑوس میں کہیں بھی کوئی خالی کرسی میری نظروں سے گزر جائے ، میرے سارے پنڈے میں اضطراب سرایت کر جاتا ہے اور میں تندہی اور
لگن سے کام نہیں کر سکتا ۔ ایسا لگتا ہے جیسے کہیں کچھ نامکمل ہے ، کسی بہت ہی اہم معاملے کی ایک نہایت لازمی کڑی غائب ہے
اور ایک سیدھی سادی زندگی میں کہیں خلا آ گیا ہے ۔ لیکن اس کیفیت میں اسیر ہوتے ہی میں بھاگ کر ایک دم کرسی میں جا موجود ہوتا ہوں
اور پھر یوں ہوتا ہے کہ سارے خانے پر ہو جاتے ہیں ۔ سب کڑیاں مل جاتی ہیں اور خلا یکلخت غائب ہو جاتا ہے ۔

ایک لحاظ سے ہر انسان کی زندگی میں ایک مضبوط کرسی کی ضرورت ہر وقت موجود رہتی ہے اور انسان کے اس بنیادی حق
ناظت ہر شخص کا فرض ہے کہ اس حق کے حصول کے فوراً بعد انسان اعتماد، قوت اور دانش کے خزانوں سے مالا مال ہو جاتا ہے اور
ں کی چار ٹانگیں اس کا ہے کے دو سینگوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جن پہ ساری زمین کا دار و مدار ہے۔ یوں کرسی کی اہمیت ایک طاقتور
ے سے کسی طرح بھی کم نہیں - ا - اا - ااا

کمی کیا ہے

رنج کیا چیز ہے خوشی کیا ہے
ہم سے پوچھئے کی زندگی کیا ہے
جانی واکر ہوں میں تو وہ ٹن ٹن
میرا ان کا جوڑ ہی کیا ہے
ظلمت شب میں دیکھ کر ان کو
ہم نے جانا کہ روشنی کیا ہے
لسٹ فرمائشوں کی جب دیکھی
تب یہ سمجھے کہ عاشقی کیا ہے
دل سے اترے تو بھوتنی ہے وہ
دل کو بھا جائے تو پری کیا ہے
دفعتاً لگ گئی ہوا جو عدو
تب میں سمجھا کہ لاٹری کیا ہے
چاہو تو ڈیڑھ سو کو پڑھوا دو
شاعروں کی یہاں کمی کیا ہے
چاند پر تو ضرور ہو آئے
یہ نہ سمجھے کہ زندگی کیا ہے
لگ کے پی لی رقیب نے پھر بھی
میکدے میں تری کمی کیا ہے
مے نہیں ہے تو خالی بوتل ہی
مفت ہاتھ آ گئی تو بری کیا ہے
عشق خود کر کے دیکھ لو نرگس
[illegible] کو آرسی کیا ہے

نرگس سہسوانی

محبوب مانجھوی

ہیں پی ایچ ڈی پاس اور دو سال سے بیکار بیٹھے ہیں
کوئی بھی کام ہو کرنے کو ہم تیار بیٹھے ہیں

یہاں تو دال گلتی ہی نظر آتی نہیں یارو
یہاں مجھ سے بھی بڑھ کر اک سے اک عیار بیٹھے ہیں

کبھی پھولوں کے ہاروں سے تواضع جن کی ہوتی تھی
وہی پہنے ہوئے اب جوتیوں کا ہار بیٹھے ہیں

اشاروں ہی اشاروں میں ہوا کرتی ہیں اب باتیں
ندی کے اس طرف میں ہوں تو وہ اس پار بیٹھے ہیں

کوئی چارہ نہیں چپ چاپ رہنے کے سوا یارو
کرو گے کیا مجھ سے بھی تگڑے یہاں دو چار بیٹھے ہیں

جو پوچھا شغل کیا ہے آپ کا؟ کاہل نے فرمایا
"خدا کا شکر ہے ہم ان دنوں بیکار بیٹھے ہیں"

کروں میں کس طرح محبوب حالِ دل بیاں تجھ سے
ترے خادر تو ہاتھوں میں لیے ہتھیار بیٹھے ہیں

○

جس کسی سے پریم ہو میری کتھا سنے
کیا اہل دل کی بات کوئی سر پھرا سنے

گاؤں میں گیت کر رہا ہی تو اسے
آٹا اگرچہ سن نہ سکے ڈالڈا سنے

پانی سے دوستی نہیں کھانے سے پیار ہے
دعوت کبھی نہ دے جو مرا ناشتہ سنے

زلفِ دوتا میں باندھ دو کالی گھٹا کو
بتیسی بجاؤ نیند کی ٹھنڈی ہوا سنے

ملتا نہیں ہے ووٹ یہاں نوٹ کے بغیر
کوئی کسی کی بات سنے بھی تو کیا سنے

بے پر کے اڑ کے سیر کرے آسمان کی
پنگی مری غزل جو کوئی پر کٹا سنے

وسیم پنگی کشکی

ایک ستر سالہ خاتون کے بارے میں مشہور ہے کہ ان کا ابتدا سے یہ نعرہ رہا "جو ہوں، میں ہوں، میرے سوائے کوئی نہیں!" مطلب یہ کہ وہ گھر میں صرف اپنا راج چلایا کرتی تھیں۔ اپنا کھانا، اپنا پہننا، اپنی تفریح، اپنی دکھ بیماری، دوسرے جائیں بھاڑ میں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ اٹھیں تو لوگ بسم اللہ کہیں اور چلیں تو پلکیں بچھائیں۔ سنا کہ وہ ہفتہ میں ایک بار بے ہوش ہو جایا کرتی تھیں۔ بہو بیٹے ان کے انداز سمجھ تو گئے تھے، لیکن انجان ہو جاتے تھے۔ جب ان کی "ادائیں" برداشت سے باہر ہو گئیں تو ایک دن پوترے نے کھرے لہجے میں ان سے بے ہوش نہ ہونے کی اپیل کی۔ اس پر وہ اپنی ساڑی کے آنچل سے مصنوعی آنسو پونچھتے ہوئے بولیں "تمہارے دادا کی زندگی تک تو میں دن میں دو بار بے ہوش ہو جایا کرتی تھی، جنت نصیب اصلی خس کا عطر سنگھا کر مجھے ہوش میں لاتے تھے اور تم نافرمانوں کی یہ حالت ہے کہ آٹھ دن میں ایک مرتبہ بھی میرا ڈرامہ اسٹیج ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ آدھا آدھا گھنٹہ بے ہوش ہو کر پلکیں مارتی ہوں، کم بختوں میں سے کوئی گیاس کے تیل کا پھایا نہیں سنگھاتا۔"

ایک دفعہ گیارھویں کی دعوت میں انھوں نے ہمیں بھی مدعو کیا تھا۔ دعوت میں شرکت کر کے ہم گھر واپس آئے۔ دوسرے دن پڑوسن نے پوچھا "آپ جس وقت وہاں سے روانہ ہوئیں، صاحب خانہ کیا کر رہی تھیں؟" ہم نے کہا "قومی ترانہ پڑھ رہی تھیں" گیارھویں کی دعوت اور قومی ترانہ، پڑوسن چکرا گئی۔ ہم نے وضاحت کی کہ اس گھر کی مالکن دعوت ختم ہوتے ہی "آخری آئٹم" پیش کرتی تھیں۔ بہت سے عادی مہمان اس آئٹم کی تیاری دیکھ کر جلدی سے کھسکنا شروع کر دیتے تھے کہ کون ان کی مصنوعی بے ہوشی کے ختم ہونے کا انتظام کرے!

یہ صاحبہ بہت سی عجیب، مضحکہ خیز عادتوں کا شکار ہیں، جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا، ایک بات ان کے ذہن میں گھر کر گئی ہے کہ ان کی ناف روزانہ ٹل جاتی ہے۔ اس کے لیے وہ برسوں تجربہ کار دائی کی خدمات سے استفادہ کرتی رہیں یہاں تک کہ دائی دوسری دنیا کو سدھار گئی اور وہ بوڑھی ہو گئیں لیکن ناف اپنی حرکت سے باز نہیں آتی تھی۔ ان کو سائنٹفک طریقے سے سمجھایا گیا کہ ناف ٹلتی ہے نہ چلتی ہے۔ لیکن ان کا استدلال ہے کہ ادرک کے جیسے پنجے ہوتے ہیں۔ ناف کے بھی ویسے ہی پنجے ہوتے ہیں۔ جب کبھی دل، جگر وغیرہ سے اسے تکلیف پہنچتی ہے، اس کا جی اٹھ جاتا ہے۔ اور وہ اپنے پڑوسیوں کی شکایت کرنے لگتی ہے۔ بہر حال دائی کے انتقال کے بعد سے وہ بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں۔ مختلف لوگوں کو انھوں نے اس فن میں ماہر کرنا چاہا۔ لیکن وہ بات پیدا نہ ہو سکی۔ اکثر دفعہ تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی اناڑی نے ان کی ناف کو سمجھا منا کر جگہ پر لانے کا ذمہ لیا تو لینے کے دینے پڑ گئے۔ یہ صاحبہ فوراً دوا خانے دوڑیں۔ کیونکہ انھیں یقین ہو گیا کہ ان کی انتڑیاں ٹوٹ گئی ہیں! ادھر کسی نے ان کے سر میں تیل کی مالش کی، ادھر انھوں نے فلکی واویلا مچا دیا کہ مالش سے تالو بیٹھ گئی۔

بے کار بیٹھے رہنے اور اپنی ہستی پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ موت کا ڈر ان کے دل و دماغ پر چھا گیا ہے۔ کھاتے پیتے، سوتے جاگتے انھیں موت نظر آتی ہے۔ موت کے ڈر اور وہم نے سمجھوتہ کر کے انھیں زندہ درگور کر دیا ہے۔ لیکن ذکر بات یہ ہے کہ موت کا یہ ڈر سینما جانے کا نام لیتے ہی رفو چکر ہو جاتا ہے۔ ایک دن وہ اپنی طبیعت کی خرابی کا ذکر کر کے گھر والوں کو پریشان کر رہی تھیں کہ اب وہ چند منٹوں کی مہمان ہیں۔ اسی اثنا میں پکچر جانے کا پروگرام بنا۔ سب سے پہلے وہی صاحبہ تیار ہو گئیں۔ پانچ منٹ قبل اپنے مرنے کی تیاری کر رہی تھیں۔ انھیں سمجھایا گیا کہ خدا نخواستہ سینما ہال میں طبیعت بگڑنے لگی تو کیا کریں گی۔

اس پر انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "واہ! تم لوگ بھی

باتیں کرتے ہوئے سینما ہال میں مروں گی تو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا۔ میں ایسے مرتفع کراتے سے جلسہ دیا نہیں چاہتی۔ تین گھنٹے بعد جب بچھڑے واپس آئیں تو موت کا کوسوں پتہ نہ تھا!

ضعیفی میں بھی ان کی یہ حالت ہے کہ ریڈیو پر جب کوئی چلتا ہوا گانا لگتا ہے تو پھرتی سے کاغذ پنسل لے کر ریڈیو کے قریب آ جاتی ہیں اور خود کو انٹرمیڈیٹ سال اول کی لڑکی تصور کرتے ہوئے گانا نقل کرنے لگتی ہیں اور گاتی بھی ہیں۔ ..... "ابھی تو میں جوان ہوں ......" ان کی آواز سن کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے جمعرات کے بازار سے ایک گھسا پٹا گراموفون خرید لیا ہے جس کی سوئی بھی زنگ آلود ہے۔ آدھے الفاظ سنائی دیتے ہیں، آدھے بڑھاپے کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یہ صاحبہ اپنے ساتھ نوجوان خوب صورت لڑکی جیسا برتاؤ کرتی ہیں۔ گھر سے باہر نکلیں گی تو بن سنور کر۔ سیدھی کہیں چلیں گی بلکہ بار بار [illegible] پیچھے، دائیں بائیں شبہ کی نظروں سے دیکھتی ہوئی چلتی ہیں کہ کوئی ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ سنا کہ ایک مرتبہ ایک سولہ سالہ لڑکے نے انھیں ستانے کی خاطر کہا "نانی! آپ کے ہاتھ پر یہ گھڑی بڑی سج رہی ہے۔ مجھے دے دیجیے نا" ___ اس پر وہ بہت بگڑیں، شرم اور غصے سے لال پیلی ہو گئیں۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ ان کے اندازے کے مطابق وہ نانی کہلائے جانے کے قابل نہ تھیں۔ دوسرے انھیں اپنی "جوانی" کا اندیشہ تھا۔ اس حادثہ کے بعد دوسرے دن سنجیدگی سے کسی سے کہہ رہی تھیں۔ "خیر ___ میں کسی طرح انجان ہو جاتی۔ لیکن دیکھنے والوں نے کیا سوچا ہوگا!"

ضعیفی میں بعض خواتین الٹ پھیر کرنے اور جھوٹ بولنے میں ماہر ہو جاتی ہیں۔ عمر کی پختگی کے ساتھ یہ عادتیں بھی پختہ ہو جاتی ہیں۔ پیسے چھپا کر رکھنا، کھانا چھپا کر کھانا ان کا معمول بن جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک صاحب بڑے فکرمند رہا کرتے تھے۔ ایک دن وہ اپنے بچوں سے کہہ رہے تھے "پتہ نہیں تمہاری نئی ماں کو کیا ہو گیا؟ ان کا کھانا ہی بالکل بند ہو گیا ہے میں تو اس فکر میں گھلا جا رہا ہوں"۔ سوتیلا نواسا بڑا چالاک تھا۔ وہ مسلسل ٹوہ میں رہنے لگا۔ ایک دن نانی نماز پڑھ کر سلام پھیر رہی تھیں۔ "السلام علیکم یا انڈا۔ وعلیکم السلام یا روٹی"۔ اس کے بعد بڑی دیر تک وہ مراقبہ میں بیٹھی رہیں۔ اس اثنا میں نواسے نے گھر کے دوسرے لوگوں کو جمع کر لیا۔ یکایک نانی کو زوردار ٹھسکا جو لگا تو ابلا ہوا انڈا جا نماز پر گر پڑا اور گڑگڑا کر کہنے لگا۔ "خدارا بچا لیجیے مجھے۔ پندرہ منٹ سے میں اس بڑھیا کے پوپلے منہ میں تھا۔ آپ لوگوں کے ڈر سے نہ نگلتی تھی نہ اگلتی تھی"

ایک صاحبہ کا ہر روز کا معمول تھا کہ بہو سے جھگڑا کر کے گھر کی دوسری منزل پر جا بیٹھتی تھیں اور بیٹے کے آفس سے آتے ہی نیچے کود کر مرنے کی دھمکی دیتی تھیں۔ کون اولاد چاہے گی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے ماں دوسری منزل سے چھلانگ لگا دے اور وہ دیکھتی رہ جائے۔ لیکن اتفاق کی بات یہ کہ ایک دن لڑکا اپنے آفیسر سے جھگڑا کر کے آیا تھا۔ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں تھا۔ بوڑھی ماں چاندنی پر گئی۔ بیٹا بھی حسب معمول پیچھے دوڑا۔ جوں ہی ماں دیوار کے قریب پہنچی، بیٹے نے یہ کہتے ہوئے پیچھے ڈھکیل دیا "ممی! آج ڈراما ختم"۔

ایک خاتون پڑوسن سے اپنے فرماں بردار چہیتے لڑکے کی نافرمانی اور اچانک تبدیلی برتاؤ کا رونا رو رہی تھیں۔ "اب تک ایسا نہیں تھا، بیوی کے آتے ہی ایک دم بدل گیا"۔ پڑوسن نے پوچھا۔ "آخر اس نے کیا کیا؟" جواب ملا۔ "اب تک جہاں جاتا تھا مجھے بھی ساتھ لیے جاتا تھا"۔ پڑوسن نے پوچھا "آخر آپ کو کہاں نہیں لے گیا؟" بوڑھی خاتون بسور [illegible] کہنے لگیں۔ "اپنا ہنی مون منانے [illegible]"

ایک صاحبہ کو اپنی جان بہت عزیز ہے۔ ڈاکٹر کے منع کرنے پر بھی وہ ہر ماہ خون پیشاب وغیرہ کا امتحان کرواتی ہیں۔ وقتاً فوقتاً آنکھوں کا معائنہ کروانا بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ ایک دفعہ وہ آنکھوں کے ڈاکٹر سے یوں کیفیت بتا رہی تھیں "ڈاکٹر صاحب! اس عینک سے برابر نظر نہیں آرہا ہے۔ پرسوں ٹی وی دیکھنے گئی تھی تو امیتابھ بچن کا صرف دھڑ نظر آرہا تھا۔ چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی ایسی عینک دیجیے جس سے میں امیتابھ بچن اور زینت امان کو پردے پر رومانس کرتے ہوئے اچھی طرح دیکھ سکوں۔ اس قسم کی مضحکہ خیز باتوں کو بظاہر کوئی معقول ڈاکٹر برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ یہاں ڈاکٹر کی جیب کا سوال ہے جو گرم ہوتی رہتی ہے۔ اس لیے ماہر امراض چشم نے اپنی اس فلم زدہ مریضہ کے لیے اسپیشل تختیاں بنا رکھی ہیں۔ ان کے دواخانے میں قدم رکھتے ہی ڈاکٹر نے اب ت ٹ اور ABCD کے چارٹ نکال کر الگ رکھ دیئے۔ اور ایسے چارٹ لگانے شروع کئے جن میں سے کسی پر دھرمیندر کا چہرہ ہے تو کسی پر امیتابھ بچن کی ٹانگیں۔ آنکھوں کا چیک اپ اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچا جب ڈاکٹر نے اس مریضہ کو یقین دلایا کہ وہ دن میں تین پکچر دیکھ سکتی ہے۔ اور ہیما مالنی اور ریندرا کو سوامی میں بہ آسانی تمیز کر سکتی ہے۔

ایک خاتون کو اپنی عمر کے نام سے "الرجی" ہے۔ اپنی ہم عمر عورتوں کو وہ طغیانی کی پیدائش کہتی ہیں اور خود اپنی عمر کو ۵۷ سال یک لانے کے بعد انھوں نے مضبوط رسی سے باندھ کر روک دیا ہے۔ ماں کی رُکی ہوئی عمر ایمان دار بیٹے کے لیے نئے نئے مسائل پیدا کرنے لگی۔ ہوتے ہوتے خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بیٹے کی عمر ماں سے بڑھ گئی۔ ان کی ٹھیری ہوئی عمر ان کے فیملی ڈاکٹر کے لیے بھی ایک مسئلہ بن گئی۔ سات سال سے وہ ۵۷ سال ہی کی تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا "مجھے آپ کا علاج کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے۔ پلیز! بڑھائیے نا اپنی عمر"! اس پر وہ تعجب سے بولیں — "سچ! سات سال سے میں ۵۷ ویں سال میں ہوں!" اچھا ڈاکٹر! تم بھی کیا یاد کروگے۔ ایک سال اور بڑھالو۔ آئندہ سات سال تک میری عمر بڑھانے کا نام نہ لینا"! ڈاکٹر نے زیر لب کہا۔ بڑھیا! اس سال تیرا پتا کٹنے والا ہے۔

کہتے ہیں کہ انسان جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو وہ پھر سے بچہ بن جاتا ہے یعنی وہ بچکانی حرکتیں شروع کر دیتا ہے۔ جیسے وقفہ وقفہ سے کھانا، دوڑنا، بھاگنا، نظر بچا کر گھر سے باہر نکل جانا وغیرہ۔ بچہ گھر سے باہر نکلنا چاہتا ہے تو اسے سمجھا کر گود میں اٹھا کر واپس لایا جا سکتا ہے۔ بوڑھوں کا صرف دماغ بچوں جیسا ہو جاتا ہے۔ وزن بچوں کے برابر ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کوئی ضعیف خاتون بلا وجہ گھر سے نکل کر گھر گھر پھرنا چاہتی ہے اور اپنی ہی اولاد کی شکایت کے نتیجے میں گھر سے بے گھر ہو جانا چاہتی ہے تو اسے گود میں اٹھا کر واپس نہیں لایا جا سکتا۔

ضعیفوں کی ان حرکات کو دیکھتے ہوئے ہم رات دن خدائے تعالیٰ سے یہ دعا مانگنے لگے کہ وہ ہمیں بڑھاپے کی اس منزل تک نہ پہنچائے بلکہ "چلتا پھرتا" اٹھالے — ہمارے لیے آپ بھی دعا کیجیے۔ انشاء اللہ ہمارا مقصد حاصل ہو جانے کے بعد اوپر جا کر آپ کے لیے صدق دل سے یہی دعا مانگیں گے۔

کے لیے وقت پر دفتر پہونچنا چاہتے ہیں۔ آپ کا ارادہ کیا ہے؟

آپ ایک ہاتھ لحاف سے باہر نکالتے ہیں۔ پھر دوسرا، لحاف کو سینہ کے نیچے تک کھسکاتے ہیں اور ایک بار اپنی تمام قوت ارادی کو سمیٹ کر لحاف سے باہر نکلنا چاہتے ہیں۔ مگر دیکھتے دیکھتے لحاف اوپر کھسک جاتا ہے ہاتھ اس کے اندر چلے جاتے ہیں اور لحاف خود بخود آپ کے آدھے سر کو بھی ڈھک لیتا ہے اور آپ پھر خوابوں کی دنیا میں کھو جاتے ہیں۔ کتنا لطف ہے لحاف کے اندر! دفتر جائے بھاڑ میں!

ایک بار ایک انگریز کے لکھے انگریزی مضمون میں پڑھا تھا کہ ہندوستانی لوگ اس لیے سست ہوتے ہیں کہ یہاں کی آب و ہوا گرم ہے لیکن اس بچارے کو یہ پتہ نہیں تھا کہ سستی کی اصل وجہ گرم آب و ہوا نہیں بلکہ لحاف ہے۔ ہر ہندوستانی جاگنے کے بعد بستر سے اٹھ کھڑے ہونے میں اوسطاً آدھا گھنٹہ لگاتا ہے۔ لیکن اس آدھ گھنٹہ کا لطف بیان سے باہر کی چیز ہے۔ بھلا انگریزوں کو کیا پتہ کہ لذت لحاف کیا چیز ہوتی ہے ——

وہاں لحاف میسر کہاں ہے لوگوں کو؟

یہ تو آپ ہی ہیں کہ چھ بجے الارم سے جاگنے کے بعد تھوڑی سی دیر کے لیے دوبارہ سو گئے تو ساڑھے سات بجے تک آرام سے پڑے رہے۔ اس میں آپکا کیا قصور ہے۔ آپ تو واقعی اٹھنا چاہتے ہیں مگر ان دنوں لحاف اوڑھا جاتا ہے ان دنوں سردی بھی واقعی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ سارا قصور ہے ہندوستان کی آب و ہوا کا یا اگر آپ زیادہ پڑھے لکھے ہیں تو آپ کے تحت الشعور کا کہ آپ کو سست بناتا ہے مگر میں کہتا ہوں اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ انسان کو اپنے حالات کے مطابق اپنے کو ڈھال لینا چاہیے۔ آپ بھی لذتِ لحاف سے سمجھوتہ کر لیجیے نا! جب تک انتہائی مجبوری نہ ہو، جب تک آخری وقت (دفتر جانے کا) نہ آجائے لحاف میں پڑے رہیے۔ اس کے بعد اگر کوئی آپ کو سست اور نکما کہے تو شرمائیے گھبرائیے بالکل نہیں۔ آخر آپ کی یہ تعلیم اور یہ عقل کس کام آئے گی۔ آپ یہ سارا الزام اپنے تحت الشعور پر ڈال کر معترض سے بحث کیجیے اور اس کو شرمندہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ اس سلسلے میں فرائیڈ کا نام لینا ضرور یاد رکھیے۔

اور خدا نہ کرے اگر آپ کو شرمندگی کا احساس ہو بھی تو بجائے کسی کی بات مان کر صبح سویرے اٹھنے کی تکلیف اٹھانے کے، اندر منہ چھپا کر سو جائیے۔ "آرام بڑی چیز ہے منہ ڈھک کے سوئیے" والے شاعر کی بات مانئے۔ زندگی چار دن کی ہے۔ دو دن آرزو اور دو دن انتظار میں کاٹنے سے کیا فائدہ؟ ہندوستان میں گرمی اور جاڑے کے موسم کا تناسب ۱ اور ۳ رہتا ہے۔ اس حساب سے چار دن میں سے مشکل سے ڈیڑھ دن لحاف آنند کا ملتا ہے۔ اسے کیوں ضائع کیا جائے؟

کسی پرانے ویدنے کہا تھا کہ جاڑوں کے دنوں میں ادھار لے کر بھی گھی کھانا چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ جاڑوں کے دنوں میں چھٹی لے کر بھی لحاف کے اندر ٹھہرنا چاہیے۔ اگر آپ چھٹی کی درخواست میں جھوٹا بہانہ نہیں بنانا چاہتے تو درخواست انگریزی میں لکھ کر انگریزی الفاظ کے ہیر پھیر سے فائدہ اٹھائیے۔ لکھیے کولڈ کا مطلب زکام ہی سمجھے۔

لحاف کے اندر پڑے رہنے سے انسانی تخیل اور دماغی صلاحیت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ یہ بات تو مسلم ہے کہ تنہائی میں رہنے سے روحانی اور دماغی ترقی ہوتی ہے۔ آپ بیت الخلا کی تنہائی میں ہوتے ہیں تو دماغ کتنی تیزی سے کام کرتا ہے، کتنی بھولی بسری باتیں یاد آجاتی ہیں اور کتنی نئی باتیں سوجھتی ہیں۔ بیت الخلا میں گزرنے والے وقت کا وقفہ بڑھانا ہو تو قبض کی عادت ڈال لیجیے مگر آپ کو اس سے کافی تکلیف ہوگی۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ آپ لحاف کے اندر پڑے رہیں اور اس کی بہتر تنہائی میں تمام جسمانی، دماغی اور روحانی فائدے حاصل کریں۔ لحاف کی تنہائی میں شعر و شاعری تک کی تخلیق ہو جاتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر نظم کا ایک نیا خیال ہوتا ہے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ لحاف کے اندر پڑے رہنے سے
دن فائدوں کے علاوہ دوسرے دنیاوی فائدے بھی حاصل ہوتے
ہیں۔ آپ لحاف میں پڑے پڑے اپنے مستقبل کو سنوارنے، ایک
ٹھیا سا مکان بنانے، کاروبار کو بہتر بنانے وغیرہ کے منصوبے
نا سکتے ہیں۔ کیا دماغ چلتا ہے لحاف کے اندر؟ میری ناچیز
اے کے مطابق تو پلاننگ کمیشن کے افسران کو اتنا بڑا دفتر اور
نا قیمتی فرنیچر مہیا کرنے کی بجائے اگر ایک ایک پلنگ
اور ایک ایک لحاف دے دیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا
ں طرح ایک طرف سرکاری خرچ کم ہوتا اور دوسری طرف بہتر
نصوبہ بندی ہوگی۔

لحاف کے اندر انسان کی حالت ایسی ہی ہوتی
یسے برگزیدہ ہستی کی مراقبہ میں باہر کی دنیا سے کٹ کر وہ ایک
الگ ہی چھوٹی سی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ روحانیت سے الگ
مجھے لحافی دنیا میں رہنے سے ایک دنیاوی فائدہ اور بھی ہوا اور
یہ کہ پہلے میں سویرے اٹھ کر دودھ لاتا تھا اور ہاتھ منہ دھونے
کے لیے پانی گرم کر لیتا تھا۔ اور صاحب جب اسٹو جل ہی جاتا تھا تو
منہ دھوتے دھوتے ایک کپ چائے بھی بنا لیتا اور اپنے لیے چائے
بنانے کے بعد اسٹو بجھانے سے کیا فائدہ تھا۔ اس لیے ساری
فیملی کے لیے چائے کا پانی رکھ دیتا تھا۔ بیوی اٹھتی تھی تو بہت کچھ
تیار ملتا تھا۔ اب میں لحاف کے اندر رہتا ہوں تو یہ سارے دھندے
بیوی کو نپٹانے پڑتے ہیں اور مجھے بستر میں ہی بیڈ ٹی مل جاتی ہے
سو سو کر جاگنے اور جاگ جاگ کر سونے میں اور نیم خوابی کے عالم میں
گھر کے لوگوں کی آوازیں سننے میں بڑا مزا آتا ہے۔

لحاف کے اندر رہ کر زندگی کے جس آرام دہ فلسفہ کی
تشکیل میں نے کی ہے آپ بھی اس سے فائدہ اٹھائیے نا!

فیض الرحمٰن فیضؔ

●

بے وقت بھی گالیتے ہیں سرکار رجب ہے
جو کچھ بھی بجا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

مل جائیں انھیں مفت میں گر مرغ مسلّم
دو چار اڑا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

گر مدح سرائی نہیں مقصود تو پھر کیوں
چمچوں کو [illegible] ہیں سرکار رجب ہے

جاگیر کی فصلیں یہ رہن کرکے حویلی
کنکوے اڑا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

برسات کے موسم میں گھسیں میکے جو بیگم
روٹی بھی بنا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

اندیشہ انھیں کیوں ہوا میں کہہ نہیں سکتا
دامن جو چھڑا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

ہیلو جو کہے، کرتے ہیں "شیک ہینڈ" اُسی سے
shake hand
پہلو میں بٹھا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

غارت گرِ ایماں کی ادائیں ہیں قیامت
روٹھوں کو منا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

نیلام کی ہے اوڑھنی اور اس پہ یہ طرہ
جو کچھ بھی چھپا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

ہے اس کی رسائی پہ مجھے رشک رقابت
جب پرس چھپا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

جذبات تو تنہائی کے لب لعل میں غماز
دانتوں میں دبا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

تحسین و خوشامد جو کرے فیضؔ اسی کو
بس سر پہ بٹھا لیتے ہیں سرکار رجب ہے

●

اے ڈیڈی تیرا باہر کو جانا کام آنے کے قابل نہیں ہے
وہ تو اسّی برس کا ہے یا نکالا اب بھگانے کے قابل نہیں ہے

تم ہو ستّر برس کی وہ بڈھا کیسے پھولے پھلے گا یہ گلشن!
سوکھی ڈالی ہے قسمت ہماری گل کھلانے کے قابل نہیں ہے

روٹی کھائیں گے یا وہ معجون میں نے پوچھا تو ہنس کر وہ بولے
ان کا چوکھا کہیں رہ گیا ہے کچھ بھی کھانے کے قابل نہیں ہے

جب بھی آتے ہیں موٹر میں آئیں میں نے پوچھا تو شرما کے بولے
ان کے پیروں میں لرزا ہے طاری پیدل آنے کے قابل نہیں ہے

ناز آخر اٹھائیں گے کب تک میں نے پوچھا تو بل کھا کے بولے
دل بھی کمبخت اصلی کہاں ہے؟ ٹوٹ جانے کے قابل نہیں ہے

چار دن بعد ہی چھوڑ دیں گے یہ سمجھ کر خدا سا [illegible] دینے
عاقلوں کو اشارہ ہے کافی سب بتانے کے قابل نہیں ہے

●

محمد رحیم الدین

کہ وہ قطب شمالی یا قطب جنوبی چلے جائیں جس
پر پہنچنے پر انکشاف کیا کہ وہاں پہلے ہی سے کئی لوگ جو جنوبی
ہند سے تعلق رکھتے ہیں آباد ہیں اور اس ضمن میں انھوں نے ایک
صاحب کا نام لے کر بتایا کہ وہ ابھی ۳ ماہ قبل قطب شمالی سے اپنی
سالانہ چھٹیوں پر یہاں اپنے ایک عزیز کے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ جس پر
ہم سب نے ان سے ملنے اور وہاں کے حالات جاننے کی خواہش کا اظہار کیا تو
پتہ چلا کہ موصوف پچھلے دو ماہ سے سو رہے ہیں اور چار ماہ بعد جب ان
کی صبح ہوگی تو وہ بیدار ہوں گے۔ اتنے لمبے عرصے تک سونے کا راز
جب جغرافیائی اعتبار سے جاکی کو سمجھایا گیا تو وہ مچل گئے اور
بولے کہ اس سے بہتر اور مناسب جگہ میرے لیے کوئی اور
نہیں ہو سکتی۔ میں تو وہیں جاکر قسمت آزمائی کروں گا
لیکن جب موصوف نے یہ بتایا کہ چھ ماہ کی رات
کی طرح وہاں کے دن بھی چھ ماہ طویل ہوتے ہیں
تو جاکی نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ پھر وہ کہیں سے ایک
پھٹا ہوا اور بوسیدہ سا اٹلس اٹھا لائے اور پوری تن دہی
سے ایک مناسب اور موزوں ملک کی تلاش شروع کر دی۔ یورپی
ممالک کی ترتیب میں جب ایک مقام انھیں پسند آیا تو بعد میں پتہ چلا کہ
اس نام کا ملک اب وہاں بالکل نہیں ہے بلکہ اپنی اصلی جگہ سے نقل مقام
کر کے نئے اٹلس میں کہیں اور چلا گیا ہے۔ اسی طرح بعض ایشیائی شہروں
کو جب انھوں نے اپنا مسکن بنانا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ اب بعض
یورپی ممالک کی تحویل میں ہیں اور وہاں جانے کے لیے ویزا
مشکل سے ملتا ہے۔ ایک وقت جب انھوں نے یہ طے
کر لیا کہ ایران کو اپنا مسکن بنائیں گے اور اس سلسلے
میں تیاریاں بھی شروع کر دیں تو انھیں تیار ہونے میں
اتنا وقت لگا کہ ایران کے سیاسی حالات یکلخت بدل گئے
اور وہاں انقلاب آگیا۔ روزی روٹی کی تلاش میں کئی لوگ اپنے
وطن کو چھوڑ کر دوسرے ممالک کا رخ اختیار کرنے لگے اور تو اور شاہ کو
بھی اسی چکر میں امریکہ بھاگنا پڑا۔ امریکہ جانے کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں
کہ جس وقت بھی میں یہ سمجھوں گا کہ میرا وجود سماج اور سوسائٹی کے لیے بوجھ بن گیا
ہے اور شہر کی پولیس مجھے مشکوک افراد کی فہرست میں شامل کر چکی
ہے تو اسی وقت میں امریکہ کے لیے پرواز کر جاؤں گا۔ لندن انھیں
اس لیے پسند نہیں ہے کہ پتہ نہیں کب انگریزوں کا دماغ
الٹ جائے اور وہ لندن پہنچنے والی ایشیائی عورتوں
کے میڈیکل چیک اپ کی طرح ایشیائی مردوں کی بھی
جانچ پڑتال شروع کر دیں کہ آیا ایشیائی مرد، انگریز
عورتوں کے قابل ہیں بھی یا نہیں۔ عرب ممالک کی طویل فہرست
میں سوائے کویت کے کوئی اور ملک انھیں متاثر نہ کر سکا اور کویت
کے تعلق سے جب انھوں نے مواد اکٹھا کرنا شروع کیا تو اس کے تعلق
سے انھیں کئی ایک حیرت انگیز باتیں معلوم ہوئیں اور انھیں یہ جان کر بڑی
خوشی ہوئی کہ کویت میں ہر ہندوستانی چیز (سوائے لیڈر، لیڈری، تقریریں، وعدے
سیاسی پارٹیاں اور زبانی جمع خرچ کے) آسانی سے مل جاتی ہے اور یہاں دوسرے
ممالک کی طرح اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوتا چنانچہ وہ پوری
جستجو اور لگن سے کویت جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔ ویزا کے
حصول میں ایجنٹوں کے ہتھے چڑھے، کئی بار بمبئی کی سڑکوں
کی خاک چھانی۔ جب ہزاروں روپیہ برباد کر چکے تو
انھیں خدا خدا کر کے ایک خادم کا ویزا ہاتھ لگا۔
ویزا خادم کا ہو، آیا کا ہو یا مالی کا ہو اس
کے ذریعہ کویت پہنچ کر اور کویت میں اپنی تقدیر آزمانے کا کام
آسانی سے نکل سکتا ہے اور جاکی ویزا کے حصول کی بھاگ دوڑ میں
یہ بات اچھی طرح جان گئے تھے کہ ویزا چاہے حجام ہی کا کیوں نہ ہو
ایک بار ہاتھ لگنا شرط اولین ہے اگر مل جائے اور اس کے ذریعہ کویت
پہنچ جائیں تو پیشہ حجامت کو ویزا کی حد تک قید کر کے اپنے مطلب کا کوئی اچھا
سا کام تلاش کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔
ویزا کے حصول کے بعد کسٹم اور امیگریشن کی ساری
کارروائی (پچھلے دروازے سے) مکمل کرنے کے بعد خدا خدا
کر کے ان کی روانگی کا دن قریب آ لگا۔ اور وہ [illegible]

بچے، بوڑھے اور پڑھے) نے ضروری جانا کہ ان کے وہ تمام ضروری
سامان پر نظرِ ثانی کر لی جائے جو وہ اپنے ساتھ سفر میں لے جا رہے تھے۔
موٹے نے ایک برش سنبھال کر جاکی کے سوٹ کیس پر
ان کا حسب نسب لکھنا شروع کر دیا۔ نام، ولدیت، پتہ، وزن،
عمر اور جاکی کے کویت جانے کی غرض و غایت تحریر کرنے کے بعد
موٹے بولے "جاکی بھائی۔ ساری چیزیں تو میں نے لکھ دی ہیں اب اور
تو کچھ باقی نہیں رہا؟ تو پڑھے بول اٹھے "سارا اعمال نامہ تو تحریر کیا
جا چکا ہے۔ اب آپ از راہ کرم کاتبین کی جگہ دستخط فرما دیں۔
جاکی کا جملہ سامان جو صرف ایک سوٹ کیس اور ایک ائیر بیگ پر
مشتمل تھا ایک بار پھر کھولا گیا تاکہ آخری بار جانچ پڑتال کی جا سکے
سوٹ کیس میں اس خصوصی موقعہ پر سلوائے گئے دو سوٹ ہینگر
سمیت بے ترتیبی سے رکھے ہوئے تھے۔ دوسرے کپڑوں میں
لنگیاں، قمیص، پاجامے، پتلونیں، بش شرٹ اور ناڑے (سب
کے سب برانڈ نیو) ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک کونے
میں اصلی گھی کا ڈبہ اور اچار کے چند مرتبان رکھے ہوئے تھے اور
اس کے قریب چند مٹھائی کے ڈبے موجود تھے۔ جو مختلف حضرات
نے کویت میں مقیم اپنے اپنے عزیزوں اور پیاروں کو پہنچانے کی خاطر
جاکی کے حوالے کیے تھے۔ سوٹ کیس کے اوپری پاکٹ میں خطوط کا
ایک پلندہ ٹھنسا ہوا تھا اور یہ وہ خطوط تھے جو مختلف لوگوں نے
(پوسٹل اسٹامپ کا خرچ بچانے کی خاطر) کویت میں مقیم اپنے اپنے
عزیزوں کے نام لکھ رکھے تھے۔ ایک پلاسٹک بیگ میں (جو
ٹکٹ کی خریدی کے وقت ٹراول ایجنٹ نے جاکی کو بطورِ تحفہ
عنایت کیا تھا) پاسپورٹ، ہوائی جہاز کا ٹکٹ، تھوڑی ریزگاری
اور ایک چھوٹی سی نوٹ بک موجود تھی جس میں جاکی نے ازراہ احتیاط
چند نہایت ہی اہم اصحاب کے پتے و ٹیلیفون نمبر درج کر رکھے
تھے تاکہ ایمرجنسی صورت حال میں اگر ان کے عزیز انہیں ایرپورٹ
لینے نہ آ سکیں تو وہ نوٹ بک میں درج کسی ٹیلیفون نمبر یا پتے پر جا کر
[illegible] رابطہ قائم کر سکیں [illegible] جاکی [illegible]

اور پولیس کے مخبر شامل کرنے سے کس طرح چوک گئے۔
ائیر بیگ میں کئی طرح کی الّم غلّم چیزیں بے ترتیبی سے
ٹھنسی ہوئی تھیں جن میں یہ تمیز کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ جرابیں کونسی
ہیں اور رومال کسے کہا جائے۔ شیونگ کریم کون سی ٹیوب میں ہے
اور ٹوتھ پیسٹ کہاں رکھی ہے۔ تولیہ میں لپٹا ہوا سوکھے کباب کا
ایک پیکٹ بھی بیگ میں رکھا ہوا تھا اور یہ سوکھے کباب بیگم جاکی
نے ضرور اس گوشت سے بنائے ہوں گی جو پچھلی بقر عید پر ان کے
پڑوسیوں اور رشتہ داروں نے انہیں بھیجا تھا۔ بیگ کے دوسرے کونے
میں پسے ہوئے ادرک لہسن کا ایک مرتبان بھی رکھا ہوا تھا جس پر ایک
پرچی چسپاں تھی "ان کے لیے پیار کے ساتھ" جاکی نے بتایا کہ یہ ادرک
لہسن ایک محترمہ نے جو ان کے گھر کے قریب رہتی ہیں...

میں وعدہ کرتا ہوں کہ اندھیرا ہونے سے پہلے تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔

ہیں اپنے میاں کے لیے دیا ہے۔ کیونکہ ان کے میاں صرف اپنی بیوی کے ہاتھ کا پسا ہوا اسٹک بس ہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اسی قبیل کی دوسری کچھ اور چیزیں بھی بیگ میں موجود تھیں جا کی دوسروں کے لیے جا رہے تھے۔ ہم نے مناسب یہی سمجھا کہ سارے سامان کو اس کی اپنی حالت میں بالکل اسی طرح چھوڑ دیا جائے جیسی حالت میں وہ بیگ میں ٹھنسا ہوا ہے۔

سامان کی چیکنگ اور پیکنگ کے بعد گھر میں موجود تمام ضروری و غیر ضروری افراد کے لیے جاکی کے سسرال والوں کی طرف سے دسترخوان چنا گیا اور اعلان کیا گیا کہ یہ دعوت بہ سلسلہ روانگی جاکی عمل با عزو منعقد کی جا رہی ہے تمام لوگ اس سے مستفید ہو کر جاکی کے حق میں دعائے خیر فرمائیں کہ ان کا سفر بخیر و خوبی انجام پائے کھانا کھا کر مرشے نے ایک خالی خولی سی ڈکار لی اور بولے "سبحان اللہ کیا دعوت کی ہے جاکی کے سسر صاحب نے جی چاہتا ہے کہ دعائے خیر کے بجائے دعائے مغفرت کی جائے۔"

پرشے بولے "آج کل پتہ نہیں کیا بات ہے جو سب بھائی ہر دعوت کو دعوت چہلم سمجھنے لگے ہیں۔"

بچے نے لقمہ دیا "جسم میں ضرور کسی مجاہد کی روح حلول کر گئی ہوگی۔"

دعوت کے بعد رخصتی کا دور شروع ہوا۔ جاکی کو ان کے سسرال کے تمام رشتہ داروں نے اپنے نرغے میں لے لیا اور امام ضامن باندھے جانے لگے۔ کسی نے دعا دی تو کسی نے آخری بار اس بات کی یاددہانی کرائی کہ جاکی کویت پہنچتے ہی ان کے بچے کے ویزا کی کوشش کریں گے۔ جاکی کے سسر صاحب نے انہیں اپنے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "پردیس کا معاملہ ہے جتنی جلد ہو سکے اپنی بیوی کو اپنے پاس بلانے کی کوشش کرو، اب میں بھی چراغ سحری کی مانند ہو گیا ہوں۔ نہ جانے کب زندگی کا ٹمٹماتا دیا بجھ جائے۔ ایسے وقت تم مجھے کندھا بھی نہ دے سکو گے۔" اس پر پرشے آگے بڑھے اور بولے "چچا جان آپ بالکل فکر نہ کریں جاکی کی جگہ ہم تمام لوگ موجود ہیں۔ انشاء اللہ آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔"

جاکی کی رخصتی اور ملاقاتوں کے وقفہ کے دوران، دو چار لڑکوں کو بڑی سڑک کی طرف دوڑایا گیا تھا کہ ایرپورٹ پہنچنے کے لیے آٹو رکشاؤں یا ٹیکسی کا انتظام کریں۔ کچھ دیر بعد لڑکوں نے آکر بتایا کہ تمام آٹو والے معقول کرایہ سے تقریباً دوگنا کرایہ زائد مانگ رہے ہیں اور اس تعلق سے ان کا یہ استدلال ہے کہ خوشی کا موقع ہے اور جاکی اپنا مستقبل سنوارنے باہر جا رہے ہیں اس لیے کرایہ زائد لیا جائے گا۔" جوں توں کر کے دو چار رکشاؤں کا کرایہ ٹھیک کیا گیا اور پھر یہ قافلہ ایرپورٹ کی جانب رواں دواں ہونے لگا۔ راستے میں جاکی خواہ مخواہ لوگوں کو سلام کر کے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پرشے جو جاکی کے بازو بیٹھے ہوئے تھے اس صورت حال سے محظوظ ہوتے ہوئے بولے۔

"میاں یار، پیسے تسمیہ خوانی کے دولہے لگ رہے ہو صرف لقمہ کی کمی رہ گئی ہے۔"

پرشے کے اس ریمارک پر کچھ دیر تک ان کا [illegible] جیسے ہی ہم ایرپورٹ کے حدود میں داخل ہوا جاکی نے پھر سے سلام کرنا شروع کیا [illegible]

...بیگموں نے آپس میں چندہ اکٹھا کر کے دو چار فلم رول بھی خرید کر ... رکھے تھے تاکہ وہ سب دوستوں کی انفرادی، اجتماعی اور ... کے ساتھ تصویر کھینچ سکیں۔ چنانچہ پہلے تو انفرادی نوعیت ... تصویروں میں موٹے نے ایرپورٹ کی کینٹین کے پاس کھڑے ... کر، بچے جہاز کے پس منظر میں رکھتے ہوئے بالکنی میں ٹھہر کر اور ... نے سوٹ کیس ہاتھ میں لے کر "ٹکٹ" کاونٹر کے پاس ٹھہر کر ... طرح کا پوز دیتے ہوئے تصویر کھنچوائی کہ جیسے وہ بھی کوئی ... مسافر ہوں اور جہاز سے سفر کرنے جا رہے ہوں۔ اس کے بعد ... طے پایا کہ تمام احباب ایک ایک کر کے جاکی کو ہار پہناتے جائیں ... اور بابا قادر العکس عین ہار پہناتے وقت تصویر اتار لیں۔ ہماری ... اور بچے کی باری تو خوبی سے گذر گئی لیکن جب موٹے پھول کا ہار ... لے کر جاکی کی جانب لپکے تو عین اسی وقت کیمرے نے کلک ... ہونے سے انکار کر دیا۔ پتہ چلا کہ فلم کی رول ختم ہو گئی ہے۔ اب ... بابا جب تک کیمرے میں دوسری رول بدل کرتیار رہو ... اس ... وقت تک موٹے پھول کا ہار اپنے ہاتھوں میں تھامے اس طرح ... کھڑے رہے جیسے ہار نہ ہوا کوئی پھانسی کا پھندہ ہو جسے وہ ... بابا کی گردن میں پہنانا چاہتے ہوں۔ خدا خدا کر کے جب فلم لوڈ ... ہوئی تو بابا نے پھر ایک بار اپنا پوزیشن سنبھالا اور بولے "ریڈی... ... ون... ٹو... تھری..."

تھری کے ساتھ ہی ہار ایک بار پھر جاکی کے گلے میں ... جا پڑا لیکن اب کی بار کیمرے کے فلیش نے چمکنے سے انکار کر دیا۔ پھر موٹے تیسری بار ہار کی طرف لپکے تو جاکی نے جھنجھلا کر وہی ہار ... اپنے گلے سے نکالا اور موٹے کو پہنا کر بولے "لو یار تمہارا ہار تمہیں ... ہی مبارک ہو۔ اب میں اسے قطعی نہ پہنوں گا۔" اس دوران بابا کا ... فلیش چمک اٹھا اور موٹے کی ایک یادگار تصویر کلک ہو گئی۔

دوستوں سے فارغ ہو کر بابا نے جاکی کی بہت ساری ... تصویریں ان کے رشتہ داروں وغیرہ کے ساتھ اتاریں۔ پھر بچے ... کہیں سے جاکی کی بیگم اور ان کے رشتہ داروں کو پکڑ لائے اور

بابا بولے "غیر ضروری تصویریں تو بہت ہو گئیں۔ اب ایک اہم تصویر جاکی اور ان کے پسماندگان کی بھی اتار لیں۔"

بعد میں جب تصویریں دھلوانے اور انہیں پرنٹ کروانے کا وقت آیا تو پتہ چلا کہ سارے کے سارے رول کسی بھی قسم کی شبیہ سے بالکل صاف اور کورے ہیں اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ بابا نے تصویر کشی کے شوق۔ اور جلدی میں کیمرے کے لینس کا کور (ڈھکن) الگ ہی نہیں کیا تھا۔ ویسے بھی بابا کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کتنے ہی یادگار موقعوں پر ان سے اس قسم کی حرکت سرزد ہو چکی ہے۔ ابھی پرسوں پاشا بھائی نے اپنے بچے کی رسم ختنہ میں انہیں مدعو کیا تھا۔ اور اس بات کی خواہش کی تھی کہ اس تقریب کی چند اہم تصویریں اتاریں تو یہ عین وقت پر اس قدر محو نظارہ ہو گئے کہ تصویر اتارنا ہی بھول گئے۔ پھر بچے کی رونے کی آواز سن کر انہیں یاد آیا کہ وہ

کس لیے تشریف لائے ہیں۔ بقول چرشے انہیں دوسروں کی تصویریں اتارنے کے بجائے خود اپنی ذات کی تصویریں بنانے میں خاص ملکہ حاصل ہے اور وہ اکثر و بیشتر کیمرہ میں خود کو فوکس کر کے آٹومیٹک طریقہ کار سے اپنی ہی تصویر اتار لیتے ہیں۔

جیسے جیسے جہاز کی روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا ویسے ویسے جاکی کی گھبراہٹ اور بدحواسی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کی واحد وجہ صرف یہی تھی کہ جاکی کے لیے جہاز سے سفر کرنے کا یہ بالکل پہلا تجربہ تھا۔ ویسے بھی ان کی شادی کا تجربہ بھی ان کے لیے پہلا تجربہ تھا لیکن شادی کے موقع پر انہیں بہت سارے کامیاب دوستوں کا ساتھ میسر تھا اور وہ اس حادثہ سے بچتے

ر۔ کھیلتے نکل آئے تھے۔ لیکن اب مصیبت یہ تھی کہ جہاز کے سفر کا (سوائے ان کے ماموں زاد سالے کے) کسی کو بھی تجربہ نہ تھا جو ان کو ڈھارس بندھاتا۔ اس کے برخلاف ہر شخص جاکی سے کچھ اس طرح مل رہا تھا جیسے اب کے بعد وہ جاکی کو پھر کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ شاید اسی جذبے کے تحت بگے نے جاکی سے پوچھا کہ جاکی کے جانے کے بعد ان کی بیوی اور ہونے والے بچے کا کیا ہوگا تو جاکی نے کہا۔ "پہلے تو انہیں خدا کا سہارا ہے اور دوسرے میں نے ہوائی سفر کی انشورنس پالیسی بھی لے رکھی ہے۔" اس پر چرشے بولے "فضول ہے" "ایسی پالیسیوں کا فائدہ صرف خوش قسمت افراد کو ہی ہو سکتا ہے۔" اتنے میں لاؤڈ اسپیکر سے جہاز کی روانگی کا وقت ایک بار پھر دہرایا گیا اور مسافرین سے خواہش کی گئی کہ وہ اپنے اپنے عزیز و اقارب سے آخری بار مل کر سکیورٹی چیک کو لیں۔ یہ اعلان تھا کہ جاکی آخری بار تیزی سے سب سے گلے ملنے لگے۔ اس افراتفری میں وہ کئی غیر متعلق لوگوں سے بھی گلے مل گئے۔ جو کوئی ان کی زد میں آ رہا تھا وہ اسے گلے سے لگائے بغیر نہیں چھوڑ رہے تھے اس طرح جب وہ ایرپورٹ لاؤنج میں موجود تقریباً آدھے لوگوں سے گلے مل چکے تو بیگم کی جانب بڑھے (جنہیں ان کی سہیلیاں اور رشتہ کی بہنیں اپنے درمیان لیے دلاسہ دلا رہی تھیں) اور نہایت رقت آمیز لہجے میں گنگنائے۔

"بیگم اجازت دیجئے ہم جا رہے ہیں" (اس موقع پر ہمیں مشہور فلم کا وہ منظر بے اختیار یاد آ گیا جب انارکلی کہ اس کی آخری خواہش کے مطابق اکبر اعظم اپنی بہو تسلیم کر لیتا ہے اور اس کے سر پر ہندوستان کی ملکہ کا تاج رکھتا ہے۔ تاج پہننے کے بعد انارکلی کہتی ہے "جہاں پناہ ...... جنازہ اب رخصت کی اجازت

جب ہم تاج سے پرواز کر کے دو سپنے ورے بیٹھ گئے تو پھر بھی سے کویت سے کیے جاکی کی فلائٹ بک تھی ... اب پروگرام یہ تھا کہ ہم جاکی کو ایرپورٹ چھوڑ کر ہم تمام احباب بذریعہ ٹرین بمبئی جائیں

اور جاکی کو بمبئی ایرپورٹ سے وداع کر کے گھر واپس ہو جائیں۔ جاکی اسٹیشن پر ہمارے منتظر تھے۔ بمبئی ایرپورٹ پر عجیب افراتفری کا عالم نظر آیا جس کسی کو دیکھو کسی نہ کسی تعاقب میں بھاگتا ہوا نظر آیا۔ لوگوں کے ہجوم میں اس بات کا پتہ چلنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ کون سا شخص باہر جا رہا ہے اور کون لوگ اسے وداع کرنے آئے ہوئے ہیں چنانچہ اسی ہڑبونگ اور بھاگ دوڑ کے عالم میں چند لوگوں نے جاکی کو بھی پھولوں سے لاد دیا۔ پھر وقت مقررہ سے کوئی دو گھنٹہ بعد جاکی سب کو اداس اور تنہا چھوڑ کر فضاؤں میں گم ہو گئے۔ ہم تمام احباب جاکی کی جدائی کا بوجھ اپنے دلوں میں لیے تھکے تھکے قدموں سے اسٹیشن واپس ہوئے۔ رہ رہ کر یہی خیال ستا رہا تھا کہ جیسے زندگی کی چمک میں ہم کہیں اپنا پیارا سا دوست کھو نہ بیٹھیں۔ پپّو اور موٹے کا خیال تھا کہ جاکی کی یاد سے چھٹکارا پانے کے لیے ایک آدھ روز بمبئی میں قیام کیا جائے۔ لیکن ہمارا صبح کا دل مزید تفریح کی طرف قطعی مائل نظر نہ آتا تھا۔ چنانچہ اسی شب تمام لوگ ٹرین میں سوار ہو گئے۔ رات تو کچھ اونگھتے کچھ سوتے اور کچھ جاکی سے باتیں کرتے گزر گئی۔ لیکن جب صبح نمودار ہوئی تو جاکی کی یاد شدت سے جاگ اٹھی اور جی کرنے لگا کہ جاکی یہیں کہیں ٹرین میں اچانک ہی کہیں سے آ جائیں اور ہمیں وہ ساری خوشیاں لوٹا دیں جو ان کے ساتھ ہونے سے ہم تمام لوگوں کو میسر تھیں لیکن ایسا سوچنا سوائے دل کو تسلی دینے کے اور کچھ نہ تھا۔ خدا خدا کر کے ۱۱ بجے ٹرین سکندرآباد پہنچی۔ ہم لوگ تھکے تھکے سے اپنی جگہ سے اٹھے۔ سامان ہاتھ میں لیا اور پلیٹ فارم پر نکل آئے۔

لیکن ...... یہ کیا ...... پلیٹ فارم پر جو ناقابلِ یقین منظر ہم لوگوں نے دیکھا۔ وہ ہمارے ہوش و حواس گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ جاکی اپنی تمام تر جامتوں اور چہرہ پر امڈتی ہوئی بے حساب خوشی کے ساتھ ہمارے استقبال کو کھڑے تھے۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی وہ دوڑنے کے انداز میں آگے بڑھے اور تقریباً ایک ساتھ سب کو لپٹا کر رندھی ہوئی آواز میں بولے

"یار میں تم لوگوں سے ہرگز جدا نہیں ہو سکتا اور شدید کا بھی منتظر نہیں رہ سکا میں تم لوگوں کے بے انتہا خلوص اور پیار کے اتھاہ سمندر کو چھوڑ کر دینار و ریال کے سراب کے پیچھے بھاگوں۔ دیکھو تمہارا جاکی پھر تمہارے پاس آ گیا ہے"

ہم لوگوں کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی بے حد تعجب ہوا کہ جس شخص کو ہم لوگوں نے بمبئی میں اپنی آنکھوں کے سامنے کویت کے طیارے میں سوار ہوتے ہوئے دیکھا تھا اور جس طیارے نے ہمارے سامنے ہی کویت کے لیے اڑان بھری تھی۔ وہ پھر سے کس طرح واپس ہو گیا اور جاکی حیدرآباد کس طرح پہنچ گئے۔

بعد میں جاکی نے تمام تفصیلات بتائیں کہ جب وہ امیگریشن اور کسٹم کے سارے مراحل طے کر چکے اور کویت ایرپورٹ پر ان کا جہاز لینڈ کر چکا تو یہ اپنے پاسپورٹ پر کویت ویزا لگوانے اور دوسرے امور کی تکمیل کے لیے کاونٹر پر جا پہنچے۔ کاونٹر کلرک نے دوسرے کاغذات کی جانچ پڑتال کے بعد جب ان کا پاسپورٹ دیکھا تو پتہ چلا کہ پاسپورٹ میں درج کیے گئے قابلِ سفر ممالک کی طویل فہرست میں کویت کا کہیں بھی نام و نشان نہیں ہے۔ چنانچہ آدھے گھنٹے کی بحث و تکرار کے بعد ایرپورٹ کے حکام نے انہیں بمبئی جانے والے ایک دوسرے طیارے میں سوار کرا دیا۔ اس طرح وہ بمبئی پہنچ کر صبح حیدرآباد کی فلائٹ سے گھر پہنچ گئے۔ پھر کچھ عرصہ بعد پاسپورٹ آفس سے رجوع ہونے کے بعد ان کے پاسپورٹ پر دنیا کے تمام ممالک کو سفر کرنے کی اجازت کا اسٹامپ لگا دیا گیا مگر اب وہ اپنے پہلے تلخ تجربہ کے بعد دوسرا تجربہ کرنے کے لیے قطعی تیار نہیں ...... بالکل اپنی شادی کے پہلے اور آخری تلخ، تیز، تند و شیریں تجربہ کی طرح ......

ناقابلِ اشاعت مضامین
کسی صورت
واپس نہیں کیے جائیں گے

ہاں تو بات "حجام کے آئینہ" کی چل رہی تھی۔ تو "حجام کا آئینہ" سب کچھ تو ہوتا ہے، لیکن آئینہ نہیں ہوتا۔ اور اس میں سوائے کے سب کچھ نظر آتا ہے۔ پارہ تو پتہ نہیں کس صدی میں اس سے پیچھا چھڑا کر پارہ پارہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ زنگ آلود نظر آتا۔ اسی آئینہ میں حجام گاہک کی صورت دکھانے کی لاانتہا ہی کوشش کرتا ہے۔ کسی شاعر نے سچ کہا ہے

چہرے میں ہے آئینہ کہ آئینہ میں چہرہ
معلوم نہیں کون کسے دیکھ رہا ہے

حجام مصلحتاً ایسا آئینہ رکھتا ہے تاکہ لوگ اپنی حقیقت سے واقف ہو جائیں ورنہ حجامت اس کی بن جاتی۔ بہر حال دیکھنے والا اور آئینہ دکھانے والا دونوں خوش۔

"حجام کا آئینہ" حجام ہی کے پاس ہو تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں لیکن جب اس کی شہرت اور لوگوں نے سنی تو بطور فیشن اسے دو نے بھی رکھنا شروع کیا مثلاً آٹو رکشا میں، ڈرائیور کے پاس جو آئینہ لگا رہتا ہے وہ ٹریفک دیکھنے کے لیے رہتا ہے یا نہیں، اس کا ہمیں نہیں۔ البتہ سواریوں اور خصوصاً زنانی سواریوں کے لیے اس کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ باقی ماندہ میک اپ وہ اس آئینہ کے بھروسے گھر پہ نہیں کرتیں۔ اور جب آٹو میں ایسا آئینہ لگا ہو تو ان کی حسرتیں دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں۔

اسی آئینہ کا ایک اور مصرف ہے جسے "آرسی مصحف کی رسم" کہا جاتا ہے۔ یہ خاص رسم شادی کے روز جلوے کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ جب کہ ہر طرف پبلک کا شور و غل اچھے خاصے نوشہ میاں کو بھی نیم جاں بنا دیتا ہے۔ ایک تو وہ خود آٹھواں عجوبہ بنے رہتے ہیں، دوسرا اس پہ سہاگہ یہ ہنگامہ آرائی۔ اسے ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق ؛ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

اس شعر کے دوسرے مصرعے کے پہلے حصے کی تشریح، تو اس آرسی مصحف کی رسم کے بعد حقیقت کا جامہ پہن لیتی ہے۔ یہ عموماً میراثن ادا کرتی ہے۔ وہ جب چادر اڑھا کر دولہے کو دلہن کی صورت دکھاتی ہے تو اکثر مذکورہ بالا آئینہ ہی استعمال کرتی ہے۔ وا بے چارہ، اس اندھیرے اجالے میں جو کچھ دیکھتا ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ مشاطہ نے جسے چندے آفتاب چندے ماہ تا تھا وہ تصویر کا دوسرا رخ نظر آتی ہے۔ لیکن دولھوں کو اس کے سوائے کوئی اور چارہ نہیں رہتا کہ وہ اپنی دلہنوں کو بھگتیں۔

لہٰذا "حجام کا آئینہ" اپنے لفظی معنی کے لحاظ سے جو کچھ بھی ہو مرادی معنی کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔

کچّا چٹّھا

سلیم مقصود

ہمارے ایک دوست ہیں بے چارے نہایت ہی مخلص۔ یہ بے چارے اسٹیٹ سنٹرل لائبریری میں ملازم ہیں۔ ان کو
جاسوسی ناولوں کے مصنف ابن صفی کے کیریکٹر قاسم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قاسم طویل
ہے اور یہ پاکٹ سائز۔ ہم اکثر کتابیں پڑھنے لائبریری جایا کرتے ہیں تو ان سے ضرور مل لیا کرتے ہیں کیو
ہمارے آئندہ بقیہ حیات رہنے کا دار و مدار ان سے ملتے رہنے ہی پر منحصر ہے۔ یہ ہمیں اچھی
اچھی کتابیں فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کی سخت نگرانی کرتے ہیں کہ ہم کسی کتاب کے
عنوان کے سوا کچھ نہ پڑھ سکیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم کسی کتاب کے پڑھنے میں
مصروف رہتے ہیں اور یہ پیچھے سے آکر ہماری گردن دبوچ لیتے ہیں۔ ایک بار
ہم کوئی جاسوسی ناول پڑھ رہے تھے جس میں ناول کا ویلن پیچھے سے آکر
ہیرو کی گردن تھام لیتا ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے ہمارا
گردن پکڑ لی ہو۔ ہم اس عمدہ منظر نگاری پر عش عش کیے بغیر نہ رہ سکے
ادھر ہیرو کا دم گھٹنے لگا۔ اور ادھر ہمارا۔ ہم نے محسوس کیا
کہ اگر اس منظر نے کسی قدر اور طول کھینچا تو ہم ایک ایسی موت کا
شکار ہو جائیں گے کہ جس کا زمانہ ضرور افسوس کرے گا۔ ہم نے
جوں ہی اپنے ہاتھ گلے کی طرف بڑھائے دیکھا کہ یہ تو ہم
کی آہنی گرفت میں پھنسا ہے۔ ہم جوں جوں گرفت چھڑانے کی
کوشش کرتے یہ گرفت اور تنگ ہوتی جاتی۔ لائبریری کے
سارے ریڈرس اور ملازمین ہماری زندگی کا یہ خطاب سین دیکھ
رہے تھے۔ کوئی ہمیں دوستی کی اس خطرناک اور جان لیوا گرفت سے
چھڑا نہ رہا تھا۔ سارا منظر کرشن چندر کی "دو گز کی دوڑ" والا تھا۔ اب یہ
مسئلہ گردن چھڑانے والے اور گردن دبانے والے کے وقار کا مسئلہ بن
چکا تھا۔ ہم نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ اپنی گرفت ڈھیلی کر دیں اور شکست
تسلیم کر لیں۔ غرض اس طرح اتفاقاً عقل نے ساتھ دیا ورنہ ایسے موقعوں پر تو
عقل بھی تماشائی ہو جاتی ہے۔

ایک بار یہ ہمارے طویل بیماری کے بعد صحت یاب ہو کر رجوع بہ کار ہوئے
اور ہر شخص سے گلے مل کر اس سے اپنی بیماری کے بعد کی حالت کے بارے میں پوچھنے لگے کوئی
کہتا۔ "اسے بھلا ان بیماری نے تو آپ کو بالکل گلا دیا۔ کہاں وہ پہاڑ جیسا ڈیل ڈول اور کہاں یہ
مرغی جیسا جسم۔" کوئی کہتا۔ "اللہ جانتا ہے میں جب سے حیران ہوں کہ آپ کی آواز کدھر سے آرہی ہے
دیکھتا ہوں تو آپ کا جسم نظر ہی نہیں آتا۔ افسوس بیماری نے آپ کو کتنا ناتواں کر دیا۔" غرض پوری "فسانہ آزاد"

کی ہچکی اس پر جمتی تھی۔ جب انھوں نے ہم سے پوچھا تو ہم تھوڑی دیر تک انھیں ٹالتے رہے۔ جب ان کا اصرار بڑھا
ہم نے ان سے کہا کہ آپ میں اور ہم میں اتنا ہی فاصلہ رہنا چاہیے جتنا آپ میں اور عقل میں ہے۔ تب ہم اپنی (۳) بلا سودی
رائے کا اظہار کریں گے۔ غرض ہم نے سچ بات کہی اور جان بچا کر بھاگ نکلے۔ ان کے قرض دینا اور سودی قرض لینا : لوگوں
پانچ شوق (HOBBIES) ہیں۔ کو سودی قرض سے بچانے کے لیے بلا سودی قرض دیتے
(۱) مچھلی پکڑنا (۲) چاند بسکٹ کھانا (۳) بلا سودی قرض ہیں اور خود سودی قرض لے کر مہاجنوں کی جیبیں گراں کرتے
دینا اور روپیوں کی کمی کو پورا کرنے سودی قرض لینا (۴) ہیں۔
(۴) سلام کرنا۔ سلام کرنے کا شوق تو جبر کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ سلام کرنا (۵) پکے گانے گانا۔ اب ان شوقوں کا
مختصر حال بھی سن لیجیے۔ آپ لوگوں کو اس طرح سلام کرتے ہیں جیسے ہم چھوٹے بچوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلاتے
(۱) مچھلی پکڑنا: مچھلی پکڑنے ہیں۔ آپ کو سلام کرنے میں جب کوئی پہل کرتا ہے تو اسے اس طرح غصے سے گھور کر دیکھتے
کے انسٹرومنٹ آپ نے دنیا کے کونے کونے ہیں کہ وہ بے چارہ سٹپٹا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور آئندہ محتاط ہو جاتا ہے بلکہ انجان ہو جاتا
سے اکٹھا کر رکھے ہیں۔ ان کے پاس ہے۔ تب آپ اسے نہایت گرم جوشی سے سلام کرتے ہیں اور گویا اپنے سابقہ سلوک کی معافی چاہتے ہیں۔
مچھلی پکڑنے کی ڈور اتنی لمبی ہے آپ دنیا کے واحد آدمی ہیں جن کے احساسِ برتری کو سلام کرنے سے سکون ملتا ہے۔
کہ اگر کوئی مچھلی اسے منہ میں پکڑ کر ۵۔ پکے گانے گانا۔ پکے گانے گانے میں ہم نے آپ کا یا پھر آپ کے استاد کا ثانی نہیں
بحرالکاہل کے ایک سرے سے دیکھا۔ ایک بار آپ نے پکے گانوں کے مقابلے میں نہ جانے کون سا تباہی لانے والا راگ چھیڑ دیا کہ محفل
روانہ ہو تو وہ دوسرے سرے پر زلزلہ آ گیا۔ سارے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ صرف سعادت مند استاد " اور قابلِ فخر شاگرد ہال
تک بہ آسانی پہنچ سکتی ہے۔ مچھلی میں باقی رہ گئے۔ استاد کا یہ حال کہ کبھی شاگرد کو گانے سے باز رکھتے ہیں اور کبھی چاہتے آپ کی بے تالی نغمہ
پکڑنے کے جال اتنے ہیں کہ ان کی سے بچانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح دونوں میں "جنگل بندی" چلتی رہی اور جوں ہی آپ نے گانا بند
مدد سے کسی دریا کی لمبائی اور چوڑائی کیا استادِ محترم طبلہ چھوڑ کر کھڑکی کے راستے سے جان بچا کر یوں فرار ہوئے کہ جاتے جاتے اپنا
معلوم کی جا سکتی ہے۔ طبلہ بھی لینا بھول گئے۔ سنا ہے کہ "تلاشِ گمشدہ" کے کئی اشتہار دیے گئے مگر استادِ محترم کا پتہ
(۲) چاند بسکٹ کھانا: چاند نہ چل سکا۔
بسکٹ آپ کی کمزوری ہیں۔ چاند بسکٹ سے قدرت کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ ایک کو ڈیل ڈول دیتی ہے تو دوسرے کو عقل
آپ کو اس قدر محبت ہے کہ جب تک وہ چار درجن حالانکہ اتنے بڑے تن و توش کو توازن میں رکھنے (یعنی سنبھالنے) کے لیے عقل کا
بسکٹ روزانہ آپ کے گنبد نما شکم میں نہیں اترتے۔ ہونا ضروری ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ قوی ہیکل لوگوں کی عقل اور جثے کے
آپ کی طبیعت میں جولانی نہیں آتی نہ آپ کی روح کو تسکین نہیں درمیان ایک ناقابلِ طے شدنی فاصلہ رہتا ہے۔ اس لیے یہ عجیب
ملتی۔ کئی بار ہم نے اس کی وجہ تسمیہ جاننے کی کوشش کی لیکن ہر بار جہاں عقل کی ضرورت رہتی ہے وہاں ڈیل ڈول
ان کی آنکھوں میں تاروں کی طرح جھلملاتے ہوئے آنسوؤں نے ہمیں ان سے ہے اور جہاں ڈیل ڈول کی ضرورت رہتی
جواب بہ اصرار نہ کرنے کی منت کی۔ غرض چاند بسکٹ میں اور ان میں وہی تعلق ہے جو محض دیوانہ ہے وہاں
چاند اور چکور۔ عاشق اور معشوق میں ہو سکتا ہے۔

نامپلی اسٹیشن سے رائل سیما ایکسپریس ابھی ابھی روانہ ہوئی ہے، کوئی تین منٹ ہوئے ہوں گے۔ اب چھک چھک کرتی کا پل ہے حیدرآباد میرا حیدرآباد، مجھ سے دور ہوتا جا رہا ہے۔ یوں پوچھیے تو نامپلی اسٹیشن میں داخل ہوتے ہی حیدرآباد کی رونقیں اور رعنائیاں کہیں دور چھپ جاتی ہیں۔ لیکن اب تو رہی سہی جھلکیاں بھی نظروں سے اوجھل ہو رہی ہیں۔ باغ عام، خیریت آباد، ادھر لیک ویو گیسٹ ہاؤز، راج بھون اور دلکشا ـــــ اور ـــ ساگر کے اس پار سکندرآباد کی روشنیاں مجھے الوداع کہہ رہی ہیں، شام کے دھندلکے گہرے ہوتے جا رہے ہیں ـــــ بیگم پیٹھ پر شاید ٹرین دو ایک لمحوں کے لیے رکی ہے اور پھر چل پڑی ہے۔ ایسا لگتا ہے حیدرآباد ہی نہیں میں اپنے آپ سے بھی دور ہوتا جا رہا ہوں۔ اپنی شخصیت سے، اپنے وجود سے، اپنے آپ سے! بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں سے ان چار چھ دنوں میں خاصی ملاقاتیں رہیں۔ آج بھی کئی ایک سے ملنا ہوا۔ سب یاد آ رہے ہیں۔ وہ بھی جن سے ملاقات نہیں ہو سکی ـــــ لیکن ایک شخصیت ہے کہ مسلسل یاد آ رہی ہے، ایک نام ہے کہ حافظے میں جگہ بنائے ہوئے ہے۔ ایک چہرہ ہے کہ نگاہوں سے اوجھل ہونے کا نام نہیں لیتا اور اسی سے وابستہ بے پناہ یادوں کا ہجوم،

(ڈاکٹر) سلیمان اطہر جاوید

کون جانے کہاں کہاں کی یادیں، ذہن کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میں اور سب کچھ بھولتا جا رہا ہوں، بھول چکا ہوں۔ پتہ نہیں ٹرین کہاں کہاں ٹھہری، ٹھہری بھی یا نہیں ـــــ وقارآباد آ چکا ہے۔ وقارآباد رائل سیما کے لیے Meal station ہے۔ اس ڈبے میں کوئی چہرہ جانا پہچانا نہیں، سب کھانا کھانے میں مصروف ہیں۔ میری ماں نے بھی بڑے شوق سے بڑی چاہ سے اپنے ہاتھوں سے پکائی روٹیاں اور سالن ساتھ دے دیا تھا اور اس نے بڑھ کر یہ تاکید بھی کی تھی کہ ضرور کھانا لیکن کیا کروں؟ بھوک نہیں لگتی اور ایسا نہیں کہ سیری کا احساس ہو، بس وہی چہرہ، میرے سامنے ہے، سلیمان خطیب کا چہرہ!

ـــــ لیکن خطیب صاحب! یہ کیا؟ آپ تو کچھ بات ہی نہیں کر رہے ہیں۔ آپ جیسی مجلسی اور باغ و بہار شخصیت، یوں خاموش، یوں چپ چاپ، مہر بلب! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہیں آپ خفا تو نہیں؟ یقیناً، آپ مجھ سے خفا ہوں گے اور ہونا بھی چاہیے آپ علیل تھے اور میں آپ کی عیادت کے لیے نہیں آیا ـــــ صوفی ازم کانفرنس میں شریک ہونے، ایک روز قبل حیدرآباد پہنچا تھا کسی عزیز نے بتایا، آپ علیل ہیں اور دواخانہ عثمانیہ میں شریک۔ اس روز اخبارات میں آپ کے بارے میں اچھی اطلاع شائع ہوئی تھی کہ آپ

صحت بہتر ہے۔ وقت نہ ملا کہ آپ کی عیادت کے لیے آتا۔ دوسرے روز ۱۲ / اکتوبر کو باغِ عام میں منعقدہ صوفی ازم کانفرنس میں کئی احباب سے آپ کا تذکرہ رہا۔ جب میں نے اپنے ایک دوست سے کہا۔ وہ بھی آپ کی عیادت کو چلنے کے لیے آمادہ ہوگئے۔ لیکن کہا، کل اتوار ہے، کل چلیں گے۔ لیکن کیا پتہ تھا اب آپ کی زندگی میں کبھی اتوار نہیں آئے گا، کوئی اتوار نہیں آئے گا۔ کل۔ کل تو آپ کہیں اور جا چکے ہوں گے وہاں، جہاں جا کے لوگ واپس نہیں آتے۔ مجھے اور مجھ جیسے کئی ایک کو شرمندہ کرتے ہوئے کہ آپ کی مزاج پرسی کو نہ آسکے۔ آپ کی خودداری نے گوارا نہ کیا کہ احباب کی عیادت کا احسان بھی اٹھائیں۔ آپ تو چلے گئے لیکن ہم سب یہ شرمندگی کب تک برداشت کرتے رہیں۔ آپ سے بھی شرمندہ، اپنے آپ سے بھی شرمندہ!

اتوار، ۲۲ / اکتوبر ۱۹۷۸ء کی صبح۔ بستر سے اٹھا ہی تھا کہ میرے ایک عزیز نے کہا: "آپ کے سلیمان خطیب صاحب کا انتقال ہوگیا!!!" ——— جیسے کسی نے دل کو نچوڑ دیا ہو ——— خطیب صاحب آپ اپنی منظومات میں بھی تو یہی کیا کرتے تھے تقریباً نصف نظم تک ہنساتے، سامعین کو بے تحاشہ قہقہے لگانے پر مجبور کرتے اور پھر لوگوں کو مغموم بنا دیتے۔ کئی ایک کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ——— اب بھی ایک عرصہ تک ہنساتے رہے، آپ تو اب بھی ہنس رہے ہوں گے۔ لیکن بھلا بتائیے، ہم کب تک روتے رہیں ———

گھر سے نکلا ہی تھا کہ حیرت بدایونی روڈ پر نرگس حیدرآبادی سے ملاقات ہوئی۔ آپ کی زندگی کی آخری شام تھی۔ وہ آپ کی عیادت کے لیے دواخانہ پہنچے تھے۔ انھوں نے آپ کی آخری حالت کے بارے میں بہت کچھ بتایا (کاش، میں بھی آپ کی عیادت کو چلا آتا) آپ ہی کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی، ان ایک ہی سے نہیں، ان ایک دو روز میں جن جن سے ملنا ہوا، ہر ایک سے غمزدہ ملا۔ آپ کا ذکر کرتا رہا۔ آپ کی عیادت کو نہ آنے کا افسوس سب کو تھا ہی اس سے زیادہ افسوسناک امر یہ تھا کہ ہم آپ کا آخری دیدار بھی نہ کر سکے۔ کیا کم نصیبی ہے اہلِ حیدرآباد کو یہ حق ملنا ہی چاہیے تھا۔

محترم عابد علی خاں صاحب سے نیاز حاصل ہوا۔ موصوف نے آپ کی حالت اور مرض کی پیچیدہ صورت اختیار کر جانے کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور یہ بھی کہ ۲۲ / اکتوبر کی اولین ساعتوں ہی میں پچھلے پہر، آپ کی میت (خطیب صاحب کیا بتاؤں یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے دل پر کس قدر جبر کرنا پڑ رہا ہے) گلبرگہ شریف لے جائی گئی۔

واڑی جنکشن آچکا ہے۔ رائل سیما، واڑی سے گنٹکل کی سمت روانہ ہوگی۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ یہ گلبرگہ کی سمت چلنے لگے کاش ایسا ہوتا! گلبرگہ تو یہاں سے بے حد قریب ہے۔ غالباً دوسرا اسٹیشن ہے، زیادہ سے زیادہ (۴۰) میل! آپ تو وہاں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے قدموں میں کہیں ابدی نیند لے رہے ہوں گے۔

گلبرگہ شریف اور حضرت گیسو دراز سے آپ کی وابستگی کا میں بھی گواہ ہوں ——— میں اور خطیب صاحب ایک وقت درگاہ شریف کی زیارت کے لیے جا رہے تھے۔ گنبد مبارک سے کچھ ہی دور تھے کہ قوالی کی آواز آئی۔ درگاہ شریف کے پاس کھلے صحن میں چند قوال خطیب صاحب کی وہ نظم گا رہے تھے جس میں انھوں نے حضرت بندہ نواز گیسو دراز کو عقیدت پیش کیا ہے۔ خطیب صاحب نے میری طرف دیکھا، ان پر کچھ محویت کا سا عالم طاری ہوگیا۔ وہ کچھ کھو سے گئے۔ اور میں بھی ماحول میں رہتا ہوا ماحول سے بہت دور ہوگیا ——— جیسے دور سے، بہت دور سے، نہیں، قریب سے، بے حد قریب سے، اپنے ہی دل کی گہرائیوں سے آواز آرہی تھی ———

بندہ نواز تیری کشتی بھرانے آئیوں
کشتی بھرانے آئیوں، چھیلا چڑھانے آئیوں
میں خالی ہاتھ آئی دنیا میں تمارے
پلکاں سے جھاڑو دے کر، آنسو چڑھانے آئیوں
بندہ نواز تیری کشتی بھرانے آئیوں

چاندی کا تیرا گنبد کوئی بنائے تیرا
میں تو دِوانی تیری، اپنا بنانے آئیوں
تیری لگن میں خواجہ، خود آپ جل رہی ہوں
پھر بھی چراغ تیرے در پہ جلانے آئیوں
بندہ نواز تیری کشتی بھرانے آئیوں
کشتی بھرانے آئیوں

اس موقع پر گلبرگہ شریف جانے سے قبل میں نے یونہی آپ کو خط لکھا تھا۔ آپ کا خط آیا، اصرار کے ساتھ آپ نے تحریر کیا تھا۔ آپ کے ہاں یا نی محل ہی میں قیام کروں ــــ میں اسٹیشن سے سیدھا پانی محل پہنچا۔ آپ نے جس اپنائیت کے ساتھ پذیرائی کی میں اس کو کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ وہ میرے آرام کا ہر لحظہ خیال، وہ پر تکلف دستر خوان، وہ ہر وقت اپنے بچوں کو تاکید کہ مجھے کوئی تکلیف نہ ہو ــــ نہ تو آپ کے دفتر کی مصروفیات میں کمی آئی اور نہ دیگر سماجی خدمات میں، اس وقت تین چار روز گلبرگہ شریف میں رہنا ہوا، خطیب صاحب اپنے اسکوٹر پر مجھے ساتھ ساتھ لیے رہتے چاہے درگاہ شریف کی زیارت کے لیے جانا ہو، چاہے سجادہ صاحب قبلہ سے نیاز حاصل کرنے، بلدیہ کے دفاتر جانا ہو یا کسی اور دفتر میں انھیں اپنے کام کے لیے۔ طیب انصاری سے ملنا ہو یا منیر پاشاہ صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ سے ـــ اسکوٹر اس لیے استعمال کی جاتی ہے کہ کم وقت میں زیادہ فاصلے طے ہو، لیکن خطیب صاحب کے وقت پر اسکوٹر کا کوئی اثر نہیں تھا۔ کہیں سے کہیں جانا ہو، راستے میں چار چھ مقامات پر خطیب صاحب کو کوئی نہ کوئی ضرور روک لیتا۔ وہ ٹھیرتے، اپنے لیے نہیں، اوروں کے لیے۔ کوئی بے روزگار ہے، کوئی ترقی کا خواہاں ہے، کوئی تبادلہ چاہتا ہے۔ بلدیہ کے دفاتر میں کسی کے گھر یا جائیداد کا کوئی مسئلہ ہے یا کسی اور دفتر میں کسی کا کچھ اور کام ـــــ ہر ایک خطیب صاحب کی سماجی حیثیت اور مقبولیت سے استفادہ کرنا چاہتا تھا اور خطیب صاحب کہ ان سب کے مسائل اور شکایات کی شنوائی یوں کرتے جیسے خود ہی عہدیدار متعلقہ ہوں اور ابھی احکام صادر کر دیں گے۔ متعلقہ فرد مطمئن ہو جاتا گویا اس کی حاجت روائی ہو چکی ہے۔ ایسی دل آسانی اسی شخص سے ممکن ہے جس کا اپنا دل بھی مطمئن ہو۔ اس کا اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ اپنی شاعری کی وجہ ہی سے نہیں بلکہ لوگوں کے معاملات میں اپنے طور پر اعانت کے باعث بھی خطیب صاحب ان سب کے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ ان کی رہائش گاہ پانی محل پر بھی وہ چار اہلِ غرض موجود ہوتے اور خطیب صاحب برآمدے میں بیٹھے ان کی پریشانیاں سنتے اور خود بھی پریشان ہوتے تھے ـــــ یوں وہ گلبرگہ شریف کے عوام پر بے تاج کی حکمرانی کرتے رہے۔ خدا را اور اعلیٰ عہدیداروں سے اپنے مراسم کا انھوں نے ہمیشہ بے کس اور دوسروں کے لیے بہت زیادہ استعمال کیا۔ محمد علی صاحب سابق وزیر ٹرانسپورٹ، ریاست کرناٹک سے خطیب صاحب کے چند دو

صاحب خانہ یا اُن کی اہلیہ کسی نے کچھ دیر بعد ماما سے کسی کام کے لیے کہا لیکن وہ سننے سن گوری رہی ۔ ایک دو بار یہی ہوتا رہا۔ جب ماما متوجہ ہوئی تو اس کا تاثر کچھ ایسا تھا، گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہو۔ "وہ اتنا اچھا کلام ہو رہا ہے اور ہم ذوق وشوق سے سن رہے ہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ یوں مداخلت کر دی گئی ــــــــ" حقیقت بھی یہی ہے کہ خطیب صاحب معاشرے کے کمزور اور پست طبقات کے جذبات کی ترجمانی اور انہی کی زبان اور لب ولہجہ میں کچھ ایسی حقیقت پسندی اور ہمدردی کے ساتھ کرتے تھے کہ ان طبقات کے افراد کے دلوں میں ان کی جگہ بن گئی تھی - وہ دکنی ہی نہیں ، دکنیوں کے بھی محبوب شاعر تھے!

سنجیدہ شاعری کے ذکر پر یاد آیا۔ خطیب صاحب کو لوگ عام طور پر دکنی اُردو کے اور مزاحیہ شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اس سے قطع نظر بھی ان کا انداز بڑا معتبر تھا۔ دکنی اور مزاحیہ شاعری سے قبل وہ اس طور اور اس رنگ کی شاعری کر چکے تھے اور اب بھی کبھی کبھار ان سے ایسے اشعار ہو ہی جاتے تھے ۔ خطیب صاحب کی شاعری کے اس رنگ سے ان کے قریبی احباب اور ایک محدود حلقے کے علاوہ بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ ان کی اس رنگ کی شاعری میں بھی بڑی طرحداری ہے۔ ایک آن بان ، لطافت ، ندرت اور نکھار جس شاعر سے آپ نے "ساس بہو" "پہلی تاریخ" "یتیم کے پیٹے" اور "ٹیڈی بوائے" جیسی منظومات کی سماعت کی ہو۔ آ[illegible] اس نوع کی منظومات اور ایسے اشعار آج بے طرح یاد آتے ہیں۔ کیسے خوب صورت شعر ہیں ~

ہوں ظلمتوں کا دشمن ماہ تمام جیسے ؎ لڑتا ہوں ہر بدی سے رن میں امام جیسے
کس سے کہوں میں دل کی اب کون یاں سنے گا ؎ جھوٹوں میں یوں کھڑا ہوں لنکا میں رام جیسے
ہر تیغ پہ ، تیر پہ ، زنداں پہ نام میرا ؎ قاتل کو یاد ہے بس میرا ہی نام جیسے
ہر نبض ڈوبی ڈوبی ، ہر شے بجھی بجھی سی ؎ دن دھاڑے آگئی ہے مقتل کی شام جیسے

اس موقع پر خطیب صاحب نے اس رنگ کے چند اور اشعار سنائے تھے ۔ وہ ایسے اشعار کبھی کبھار کہہ لیتے ہوں لیکن عام مشاعروں میں میں نے انھیں ایسے اشعار سناتے کبھی نہیں پایا، ممکن ہے اس طرح ان کی مقبولیت متاثر ہو جاتی لیکن مرتبت میں بلاشبہ اضافہ ہوتا۔ ہمارے بیشتر شاعروں کا وطیرہ یہی ہے ۔ وہ اپنی مقبولیت خاص طور پر مشاعروں میں مقبولیت کی خاطر ایک خاص طرح کی شاعری کہتے ہیں اور اپنے شاعرانہ اور ادبی مرتبے کی قربانی کر جاتے ہیں ۔

نصف شب بیت چکی ہے، ڈیڑھ دو کا عمل ہے ۔ گنتکل جنکشن آچکا ہے ۔ یہاں ٹرین نسبتاً زیادہ دیر ٹھہرے گی۔ میں اپنی جگہ پر لیٹا ہوں۔ ریلوے انجنوں کی آوازیں آرہی ہیں۔ اسٹیشن پر ٹرینیں آتی جاتی محسوس ہوتی ہیں ۔ پلیٹ فارم پر ویسے کوئی زیادہ گڑبڑ نہیں لیکن میرا ذہن تو بالکل خالی ہے۔ کچھ سوجھائی بھی نہیں دیتا۔ کچھ ہی دیر میں ٹرین چل پڑتی ہے اور خیالات کا سلسلہ بھی ــــــــ

خطیب صاحب ، پھر آپ ہی کا خیال آتا ہے ، آپ کی باغ و بہار شخصیت کا ، آپ کی بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا۔ لطیفے تو آپ گھڑ لیا کرتے تھے۔ کسی نہ کسی شخصیت کو نشانہ بنانا اور اس سے کسی نہ کسی لطیفے کو منسوب کر دینا۔ آپ کے لیے بات ہی کیا تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ۔ ایک اخبار کے مدیر ، جو بدلتے فیشنوں کے ساتھ بدلتے جا رہے تھے (شاید اب بھی بدلتے ہوں) ــــــــ کبھی بال بڑھا لیتے ، کبھی خط ، کبھی مونچھ ، کبھی داڑھی۔ کبھی ان کا عجیب وضع کا پتلون ، تو کبھی ان کا مجموعۂ روزگار ملبوس ــــــــ غرض ان کی ہیئت ، وضع قطع ہمہ وقت وہ نئی ہیئت میں ہوتے ــــــــ ایک مرتبہ میں اور آپ کہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ موصوف آ گئے ، نئی ہیئت میں آپ نے ان کو دیکھا ، چند ثانیوں کے لیے توقف کیا اور پھر کہنے لگے : "اوہو ، تم ہو بھئی ، تم اپنے ساتھ Identity card رکھا کرو

تم کو اندکا بھلا پینے میں آسانی ہوگی ۔" اور پھر وہ صاحب آپ بلبلغ طنز اور لطیفوں کا شکار ہوتے جو نئے موسم بہار میں نئے معشوق
کی چاہت میں جانے کتنی شادیاں کر چکے تھے۔ اور کرنے والے ہیں ـــــ یہاں بھی خطیب صاحب کا مقصد ان کی آمدنی نہیں
معاشرے کی بے راہ روی کی سمت توجہ دلانا تھا۔ خطیب صاحب کی منظومات ، "چھوڑا چھوڑی" "سانپ" "پہلی تاریخ" "ساس بہو"
اور "مصیبت خانہ" اور "محبوب بی" کی روشنی میں سوچیے تو اندازہ ہوگا کہ خطیب صاحب معاشرے کی ناہمواری اور بے جا رسموں کو اجاگر
کرنا چاہتے تھے کہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی لوگ اپنی بہن اپنی بیٹی گویا ان کے پیچھے باندھ کر گوارا کر لیتے تھے کہ لوگوں کے نزدیک ان
بہن بیٹیوں کا کوئی مستقبل نہیں۔ اقدار کا افلاس اور ان کی شکستگی اس سے فزوں اور کیا ہوگی ؟ یہ خطیب صاحب کی شخصیت کا
ایک خاصہ تھا اور ان کی شاعری کا بھی۔ معاشرے کی دکھتی رگوں پر ان کی انگلیاں تھیں۔ کہنے کو وہ ہنساتے تھے لیکن درحقیقت
وہ معاشرے کی صحیح تصویر پیش کرتے ہوئے لوگوں کے احساسات کو بیدار کرتا۔ ان کو غیرت دلاتا اور لرزہ طاری کرنے والے پیکروں، نشے
چہروں، لرزتی آوازوں اور سسکتی روحوں کی جانب ان کو متوجہ کرانا چاہتے تھے۔ ظرافت تو خطیب صاحب کے لیے بس ایک نقاب
تھی اور انھوں نے اس نقاب سے خوب خوب کام لیا۔ سنجیدہ شاعری کے ان کے موضوعات اور تھے۔ لیکن جن موضوعات اور
مسائل پر انھوں نے دکنی میں اور مزاحیہ انداز میں توجہ دلائی یہ وہاں ممکن نہ تھا لیکن خطیب صاحب صرف مزاحیہ شاعری کا نہیں
تھے ان کے پیش نظر ایک مقصد تھا، اپنے ماحول کی اصلاح و فلاح کا مقصد!

خطیب صاحب کو میں نے ہمیشہ مسرور اور مطمئن پایا۔ گلبرگہ شریف میں، جشن سلیمان خطیب "تھا خطیب صاحب کے ایما
پر مقالہ پڑھنے کے لیے میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ خطیب صاحب اس موقع پر بے حد شاداب اور شادماں تھے۔ ہم سب کی میزبانی
تو ایک کمیٹی تھی لیکن منیر پاشاہ صاحب نے مجھے اپنی میزبانی سے لطف اندوز ہونے کا شرف عطا کیا اور مجھے اپنے ہمراہ لے گئے
خطیب صاحب کو مہمانوں کی فکر تھی یہ سب ان کے اپنے مہمانوں جیسے تھے۔ اس امر کا وہ بہرکیف خیال رکھتے کہ کہیں کسی کو کوئی تکلیف
نہ ہو۔ میں جشن کے دوسرے روز واپس ہوا اور خطیب صاحب کو آخر وقت تک مہمانوں کے لیے متردد اور متفکر پایا (بس خطیب
صاحب ایسے ہی مواقع پر متردد ہوا کرتے تھے) انتظامات خوب تھے لیکن خطیب صاحب کو افسوس تھا کہ وہ جیسا چاہتے تھے
ویسا انتظام نہیں ہو سکا۔ "جشن سلیمان خطیب" خطیب صاحب کے شایانِ شان تو نہیں تھا لیکن اس زاویے سے غنیمت تھا کہ
خطیب صاحب کی حیات ہی میں انھیں پہچاننے کی کوشش کی گئی۔ "کیوڑے کا بن" کی اشاعت اسی موقع پر عمل میں آئی۔ یہ دھنک
سے ضخیم سہی لیکن خطیب صاحب کی شاعری کا محض انتخاب ہے۔ گلبرگہ شریف یا حیدرآباد کہیں سے خطیب صاحب کی شاعری کا
بھرپور شائع ہونا چاہیے۔ ایسے وقت جب کہ دکنی کی ادبی حیثیت بڑھائے جانے کا کام ہو رہا ہے اس کی اشاعت گرانقدر ہوگی۔

چھ بجنے ہی والے ہیں۔ ٹرین کرنپے اسٹیشن پر پہنچ چکی ہے۔ کئی لوگ اتر رہے ہیں۔ صبح ہونے والی ہے، پو پھٹ رہی ہے یہاں
سے تروپتی صرف ڈھائی گھنٹے کا راستہ ہے۔ سوچا تھا ایسے ہی کسی علاقے میں مشاعرے میں شرکت کے لیے خطیب صاحب آئیں تو
کبھی انھیں اپنے ہمراہ تروپتی بھی لیتا جاؤں گا۔ تروپتی جیسے علاقے میں مشاعرے کی فضا تو خیر کیا ہوتی اور نہ میں مشاعرے کے انعقاد
کی کوئی نیت رکھتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ایک دور خطیب صاحب کا ساتھ ہو۔ لیکن کسی انسان کی [illegible]
[illegible] ـــــ چنانچہ یہ خواہش بھی دل ہی دل میں رہ گئی۔ جب بھی خطیب صاحب سے [illegible]
ملتے یہ احساس [illegible] ملاقات ہو رہی ہے [illegible] گفتگو کرتے اور اعتراف [illegible]

سب کے بارے میں اپنی آرا کا دوٹوک اظہار کرتے۔ دوست احباب کو یاد کرتے اور ان کے واقعات سناتے رہتے۔ خاص طور پر ان اصحاب کو جن کے نام لفظ "سلیمان" سے شروع ہوتے ہیں، چنانچہ سلیمان اریب مرحوم اور سلیمان سکندر صاحب کا تذکرہ ضرور آتا۔ مزاج کی شگفتگی اور شادابی ساتھ نہ چھوڑتی، لطیفے سناتے، خوب ہنساتے، لیکن ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے احباب کو، عزیزوں چاہنے والوں کو اور پرستاروں کو آنسوؤں کے علاوہ اور کچھ نہ دیتے۔ رُلاتے رہتے۔ خطیب صاحب نے بھی یہی کیا اور یہی کریں گے۔ اُن کو گلبرگہ روتے گا۔ حیدرآباد روئے گا۔ گلبرگہ اور حیدرآباد ہی کیا سارا دکن اور ہر وہ شخص جو دکن، دکنی اور دکنی تہذیب کا پرستار ہے روئے گا۔ خطیب صاحب دکن کے لعل دوانے تھے۔ دکنی زبان اور دکنی تہذیب کی آبرو تھے۔

اب ۱/۲ ۸ ہو چکے —— ٹرین تروپتی پہنچ چکی ہے اور میں پلیٹ فارم پر اُتر رہا ہوں۔ میں نے خطیب صاحب کے ہمراہ کوئی سفر نہیں کیا۔ لیکن آج خطیب صاحب کی یادیں حیدرآباد سے تروپتی تک ہمسفر رہیں۔ ۱/۲ ۱۴ گھنٹے کا سفر! اور اس سارے سفر میں خطیب صاحب کی یادوں کی رفاقت! خطیب صاحب! یہ سفر ہی کیا، اب تو زندگی بھر آپ کی یادیں ساتھ رہیں گی۔ زندگی کے سارے سفر میں ہمسفر! ——

○○

گلی نلگنڈوی

۲ر جنوری کے اخبار سیاست میں یہ اطلاع چھپی کہ مشہور دکنی شاعر گلی نلگنڈوی انتقال کر گئے۔ ادھیا دن سے ان کی نعش مردہ خانہ میں پڑی ہے تو یقین نہ آیا کہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ فوری دفتر شگوفہ پہنچا۔ سیاست کے سب ایڈیٹر نسیم عارفی اور گلی نلگنڈوی کے ایک دوست میرے منتظر تھے۔ انھوں نے اس خبر کی توثیق کی کہ گلی کے عزیزوں کو اطلاع دی گئی ہے۔ نلگنڈہ سے ان کے رشتہ داروں کی آمد کے بغیر کوئی کارروائی نہیں جا سکتی تھی۔ تحقیق پر پتہ چلا کہ گلی کے کرم فرمانے ۲۸ ڈسمبر کو انھیں دواخانہ عثمانیہ میں شریک کروایا تھا۔ یوں تو وہ عرصۂ دراز سے علیل تھے۔ حال حال تک محبوب نگر کے دواخانہ میں کئی دن تک زیر علاج بھی رہے۔ وہیں سے زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ لیکن اس بار کوئی سوچا بھی نہ ہوگا کہ دواخانہ میں شریک ہونے کے دوسرے ہی دن انتقال کر جائیں گے۔ فساد زدہ اور کرفیو زدہ پرانا شہر کے دواخانہ عثمانیہ کی حالت بھی بری تھی کہ ڈاکٹر پچھلے کئی دنوں سے ہڑتال پر تھے۔ گلی کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ چنانچہ انتقال کے بعد ان کی نعش مردہ خانہ بھجوا دی گئی۔ ان کے بہنوئی یکم جنوری کی شب مزاج پرسی کے لیے پہنچے تو بڑی تلاش کے بعد انھیں اس سانحہ کا علم ہوا۔ اردو اکیڈیمی کی مدد سے ۲ر جنوری کی شام ان کی میت کو نلگنڈہ روانہ کرنے کا انتظام کیا گیا۔ جہاں فوری تجہیز و تکفین عمل میں آئی۔

معین الدین خاں گلی کی عمر بمشکل ۴۲ سال رہی ہوگی۔ بلانوشی اور بے اعتدالیوں کے باعث وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ خود ان کے الفاظ میں

اماں کدھر کی، باوا کدھر کی، جورو کدھر کی، بچے کدھر کی
تنخواہ میخانہ کو جاری شیشوں سے شیشے ٹکرا رئیں

لیکن موت کا خوف انھیں کبھی نہ رہا چنانچہ زندگی اسی ڈگر پہ چلتی رہی۔ اور ہزاروں لاکھوں چاہنے والوں سے دور کسمپرسی کے عالم میں اس نے موت کو گلے لگا لیا ——— انا للہ وانا الیہ راجعون

خدا سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے

انتقال سے چند روز قبل گلی نے شگوفہ کے لیے ایک نظم "الکشن" اور ایک تازہ غزل روانہ کی تھی جو شریک اشاعت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کے کلام کا مجموعہ شائع ہو۔ ہمیں امید ہے کہ مجموعہ کلام کی اشاعت کا یہ کام بھی کسی صورت انجام پائے گا ——— مدیر

رگی نلگنڈوی مرحوم

(تازہ کلام)

الکشن

تم کسی طرح کسی کرسی پر ڈٹ جاؤ گے
بھول کر پچھلے الکشن کی کئی باتوں کو
بھول کر پچھلے الکشن کے کئی وعدوں کو
پھر الکشن میں نیا روپ لیے آؤ گے
تم کسی طرح کسی . . . .

گڈ مفسٹو جو بنے دام بھی راشن کے بڑھے
بھوک بھوکوں کی مٹے گی تو کہو کیسے مٹے
جب کہ تم مرغِ مسلّم کی غزل گاؤ گے
تم کسی طرح . . . .

ہر الکشن میں نئی بات کہا کرتے ہو
دن بھی ہوتا ہے اگر رات کہا کرتے ہو
تم تو ہر تیغ کے آگے بھی سکوں پاؤ گے
تم کسی طرح . . . .

جل کے خود ڈھیر ہوا خاک میں مل جانے کو
بخدا ہم نے جلایا نہیں پروانے کو
گھر جلاؤ گے مرا جھوٹی قسم کھاؤ گے
تم کسی طرح . . . .

کبھی اس جھاڑ سے اس جھاڑ ٹھکانہ بدلے
جیسے بے دم کا ہو بندر جو مسلسل ناچے
اپنے اسٹیج پہ تم قوم کو نچواؤ گے
تم کسی طرح . . . .

کس کا سرمایہ الکشن میں کیسے ہے دوسرے
وقت کے جادوگرو! وقت ہی کا تم سے پوچھے
وقت بدلے گا کسی وقت تو پچھتاؤ گے
تم کسی طرح . . . .

باغ سرسبز دکھاتے ہی رہے ہو اکثر
خوش نما پھول کھلاتے ہی رہے ہو اکثر
ایک جنت بھی خیالات کی مہکاؤ گے
تم کسی . . . .

تم کو فرصت بھی ملے گی کبھی اس دھندے سے
کام کوئی سے چلا اور کبھی ڈنڈے سے
اب نہ ممکن ہے کسی گلی کو گرماؤ گے
تم کسی طرح کسی کرسی پہ ڈٹ جاؤ گے

میں کیا کروں!

دردِ سر شاعری ہے تو میں کیا کروں
بات دل کو لگی ہے تو میں کیا کروں
سیدھی سادھی گلہر اُڑایا تھا میں (خوب صورت پتنگ)
اُن کی ڈِگی کٹی ہے تو میں کیا کروں (چھوٹی پتنگ)
میرا جھگڑا کسی بڈھے مینڈک سے تھا
مینڈکی کو سُتی ہے تو میں کیا کروں
ہے میرے شعر میں قافیہ کفتری
ان کی چڑ کفتری ہے تو میں کیا کروں
میں ہوں کوئی کلر کانے سونے کا دل
ان کی ماں چھپکی ہے تو میں کیا کروں
غزلوں غزلوں میں کیا رشتہ ہوتا نہیں
ان سے ٹکرا گئی ہے تو میں کیا کروں
میرا بوکڑ کدھر ہے کی ڈھونڈتا ہوں میں
ان کی بکری جنی ہے تو میں کیا کروں
بات حق کی تھی پرکھنے سے جو گلی اُڑی گاؤں میں سنسنی ہے تو میں کیا کروں

منسٹر کی موت پر چمچوں کا مرثیہ

باوارے، داتا رے، کہاں کی جاتا رے، جاتا رے
تیرے دم سے زندہ تھے، سارے کے سارے مگر پالے بچے
اماں باوا، جورو بچے زندہ مر گئے، ہائے رے
تیری ڈش میں کھاتے تھے اب کس کی ڈش میں کھاتا رے

باوارے ....

تیری چھوٹی فارن کی وہسکی پیتے تھے، اب کیا پیتا رے
چھوٹا گر ملیہ بھی نئیں ملا تو بول رے کیسا جیتا رے
ساقی تھا نے خانہ تھا، جمشید کا تھا پیالہ نہ رے

باوارے ..

تیرا ایک ہی ایک بیٹا، اللہ میاں کی گائے اَن
ہمارا کیا کلیان کرے گا، پیدا برہمچاری اَن
شیطان کے پیٹ میں ولی کے جیسا ان کو ہوا اُنے پیدا رے

باوارے

کون سا الکشن لڑنے کو جارا، یہ خواب میں آ کو بتلا دے
سب کو دھوکا دیتے سرکا ہمنا نکو دھوکا دے
جینا تیرا دھوکا تھا، یہ مرنا بھی ہے کیا دھوکا رے

باوارے ....

بغیر سیکوینس رمی پور میاں، گھیلوں پہ کھیلے کرتے تھے
جو کر کاں کی رہتا تھا، پیارے، اپنا دھندا کرتے تھے
تاش کے باون پتوں میں تو ایکوں میں تھا اک یکہ رے

باوارے

اسمگلنگ اور بلیک مارکٹ ایک دم سے بند ہو جائیں گے
تیرے ٹیبل کے نیچے بول بتا پھر کیا کھائیں گے
سونے کا انڈا دیتا تھا سو تھا تو اصلی مرغا رے

باوارے

تیرے الکشن کی گڑبڑ میں کتنے قتل ہم کر ڈالے
تیرے دم سے چپ تھی سی آئی ڈی اب کیا کرتی کی مار رے
گلے میں جلدی پڑنے کو دیکھ رہے پھانسی کا سندر پھندا رے

باوارے

تیرے بجائے چمچوں میں سے چمچوں کے بچے مرنا تھا
چمچوں کے بچے نئیں مرے تو چمچوں کے سگے مرنا تھا
تیری بلا سے کیوں نئیں مرا رے چمچوں میں سے کوئی چمچہ رے

با وارے ....

تیرے آدمی ہم کو سمجھ کو سارے لوگاں ڈرتے تھے
شہر میں جتنے بھی تھے طوائف جھک کو سلاماں کرتے تھے
ہار مونیم بند ہو گئی ہے بجتا ہے غم کا ڈھیرا رے

با وارے ...

کار میں تیری تن کو پھرتے تھے دنیا کو منہ کیا دکھائیں گے
قبر میں تیری جگہ ملی تو بازو تیرے سو جائیں گے
دسواں، بیسواں، نئیں تو نئیں کون دیں گا قل کا ڈھیلا رے

با وارے ...

کل تک راتک ٹھاٹ تھا اپنا، آج فقیر بن گئے ہم
اماں بھی تو تھا باوا بھی تو تھا، یتیم یسیر بن گئے ہم
بنسری بجا کو گلی گلی بھیک منگ کو چندہ رے

باوارے .... باوارے ....

کیا کرنا دل گھٹ کر لیں گے تجھ کو ہم دفنا دیں گے
تیری قبر کے اوپر گنبد بھی ایک بنا دیں گے
تربت کے اوپر چمچہ بیٹھیگا کوئی اک سجادہ رے
باوارے
تازہ قبر الحزا کے کچھ تڑپے بھیجے کیساں تھے
تھا میں اک بنک لٹ سو ہم پہ ہی الزاماں تھے
گلی کے سر کیا اٹھتے تھے کیساں ڈنڈوں کا تھا تو ڈنڈا رے

باوارے ...

کون سے ہاتھوں سے اب تجھ کو یوں یہیں دفنا نا ہے
پلاٹینم تھا، پارس تھا، تو مٹی میں کیسے ملانا ہے
میوزیم میں اب رکھ کو جنازہ سب کو ٹکٹ سے دکھانا ہے
یادا رہے ....

زندہ دلانِ حیدرآباد (چشم بددور) یہ یہ کیا گردش ہے کہ پہلے خطیب نے زندہ دلوں کا ساتھ چھوڑ دیا، پھر ناظر خیامی نے منہ موڑ لیا اور اب گگی بھی پرائی ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ان کے انتقال کی خبر سے تعجب تو نہیں ہوا (اس لیے کہ ہر شخص کو اس مزہ چکھنا ہے) لیکن گہرا دکھ، رنج وملال ان کی عالم کس مپرسی میں عبرت ناک موت پر ہوا کہ وہ بے انتہا مقبول اور جانے پہچانے عوامی شاعر ہونے کے باوجود ان کی نعش دواخانہ عثمانیہ میں تین دن تک بے گور و کفن پڑی رہی! گگی نے ماضی کے عظیم "شاعروں کی سنت" پر بڑی سختی سے آخری سانس تک عمل کرتے ہوئے، اپنے عظیم شاعر ہونے کا ثبوت دیا۔ مرزا روقی کا یہ شعر انھوں نے حضرت صفی کے سانحہ ارتحال پر کہا تھا ان پر صادق آتا ہے ؎

دنیا نے کیا سلوک کیا ہے صفی کے ساتھ
افلاس میں جیا تو مرے بے کسی کے ساتھ

گگی کی زندگی سلیقے و طریقے سے بے نیاز تھی اس میں شک نہیں کہ وہ عوام کے ہر دل عزیز اور پسندیدہ شاعر تھے ان کے منفرد لہجے نے ان کی شاعری میں اور بھی نکھار پیدا کیا تھا۔ گگی زندہ دلانِ حیدرآباد کی جان اور مشاعروں کی شان ہوا کرتے تھے، ان کی عام و خاص نظمیں عرصہ دراز تک لوگوں کے دلوں کو مسکراہٹوں اور قہقہوں سے مسرور کرتی رہیں گی۔ زندہ دلان کے مشاعروں میں ان کی غیر موجودگی ایک کمی کا احساس دلاتی رہے گی۔

گگی نلگنڈوی

گیت نے تجھ کو اچھالا زیست کے میدان سے
اڑ گیا تو زور پہ خود اپنے رگگی کی طرح
آسماں کے کن خرابوں میں ہوا آیا دیپھر
داستاں تیری سنی جائے گی دِتی کی طرح
آدمی جاتا نہیں ہے، پھر بھی ہے کس کو خبر
دم دبائے چل رہا ہے وقت بلّی کی طرح

کھل اٹھا تھا شاعری میں خود مگر مرجھا گیا
جاتے جاتے شعر کا مطلب ہے کیا سمجھا گیا

رشید عبدالسمیع جلیل

گگی کے انتقال سے بطور خاص زندہ دلان حیدرآباد کو ناقابل تلافی نقصان ہوا گگی نے اپنے ہزاروں چٹکلوں کے لیے اپنا کوئی مجموعہ نہیں چھوڑا میں مدیر شگوفہ سے گزارش کروں گا کہ وہ شگوفہ کا ایک خاص "گگی نمبر" شائع کریں تو یہ گگی کے لیے صحیح خراج عقیدت ہوگا۔ اب یہ ہاتھ گگی پر بجائے کچھ لکھنے کے دعائے مغفرت کے لیے اٹھنا چاہتے ہیں۔

صدق دل سے دعا کرتا ہوں کہ گگی کو خدائے تعالیٰ زندگی بھر قہقہے بانٹنے پھرنے کے عوض ان کو بخشش دے اور جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

آمین۔ ثم آمین۔!

بچشم نم
ان پڑھ بھونگیری

ڈیڑھ متوالے

ڈھکن رائچوری

عجب جان آفت میں آکو پڑی ہے!
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے!

مری شادی کرنے کی اماں نے ٹھانی
کچھ ایسی بی پٹی پڑھائی جٹھانی
میں کیا بولوں باشا نصیباں کی کانی
ملی ایک پیشانے کو اک پھلجھڑی ہے
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

اُنے پینڈولم ہے سکنڈ کا میں کانٹا
کبی بھول کرچ اگر اس کو ڈانٹا
میرا کلا رہتا ہے ہور اس کا چانٹا
بمثل موت کے میرے سر پو کھڑی ہے
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

عمر میری کھیلنے کی تھی اٹھا چماں
مصیبت کو گلے چپتی ہے گھڑوماں
اُنے بارہ بچوں کی پہلے سے اماں
مہر میں اُنے پن کی دی دھن مڑی ہے
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

میں اک بات بولیا تو دس ان سناتی
سنگات لی سو دولت کے ہے گن گناتی
ہر ایک بات پو رعب اپنا جماتی
جو شادی ہوی سوچ دلبند رگھڑی ہے
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

نہ موں ہے نہ موکھا ہے تن گوری چمڑی
ہے کن کھاتی چال ہور ہے جھک کو کمرٹا
مچاتی ہے نیّن نیّن سو ہر روز بمڑی
مجھے گیدڑ بولتی ہے خد لومڑی ہے
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

ہے کھدڑاتی جاتی مجھے چو طرف سے
اُنے طعنے ماری ہے ہر ہر حرف سے
پلاتی ہے پانی ملا کو برف سے
دن ہنگامہ اک رات اک گڑبڑی ہے
میں گدڑا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

جو بیٹھے تو گالیاں اُٹھے کی تو گالیاں
سو بچ ہنستیں سن اس کو سالے ہور سالیاں

خوشی سے بجاتے ہیں چھرواداں تالیاں — میں ہولہ چُڑا ہوں وہ سشانی چُڑی ہے
میں گڈا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

سنگات اس کے جاتی تو آوازاں کستیں — ہمنا ویڑھ متوالے بول بول کو ہنستیں
سواگت میں پوتوں کی سیٹیاں بی بجتیں — جہیز میں مینجے ساس نے دی سیڑھی ہے
میں گڈا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

پڑوسیاں کا میرے پو گر تاپچ نز لہ — ہے قسمت کی گڑ بڑ مقدر کا گھپلہ
مرے سر پہ بجتا ہے روز طبلہ — جو تھی کھوپڑی چکنی اب کھڑ بڑی ہے
میں گڈا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

سمٹ کر اپیچ کھاتی ہے دودھ پیڑھے — چباتی ہے اکڑ سے پاناں کے بیڑے
نکالتی ہے ڈھنڈ ڈھنڈ کو یا تاں میں کیڑے — ہے منطق میں طاق حجت الکھیکڑی ہے
میں گڈا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

میں ہوں دل تو جورو میرے دل کی دھڑکن — ہری مرچ اُن ہے تو میں اودا بیگن
گویا چیکیا شیشی کا شیشے پوڈھکن — یہ کی انکھیاں میں انجواں کی جھڑی ہے
میں گڈا ہوں جورو سرو کی چھڑی ہے

غزل
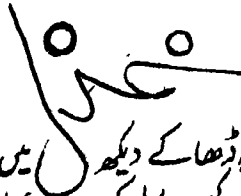
جتنا ستم تو چاہے مرے دل پہ ڈھاکے دیکھ — میں بے حیا ہوں مجھ کو ذرا آزما کے دیکھ
پھسلنا ہے گر تجھے کسی بکرے کی کھال کو — پہلے چنے کے جھاڑ پہ اس کو چڑھا کے دیکھ
بوڑھا ہوا تو کیا ہوا دل تو جوان ہے — خوابوں میں مینو سنگھ کا جلوہ بسا کے دیکھ
جھک کر سلام کرنے لگیں گے تمام لوگ — لیڈر کا اپنے آپ کو چمچہ بنا کے دیکھ
رنگی کی محفلوں میں یا سیندھی شراب میں — باوا کی جائیداد کو چھکلے لگا کے دیکھ
اولاد کی بھلائی کا گر ہے تجھے خیال — اولاد کو تو ان دنوں لیڈر بنا کے دیکھ
داداگری میں وہ کسی دادا سے کم نہیں — دعویٰ اگر ہے تجھ کو تو ان سے کُھبا کے دیکھ
کھونگے بھی داد دیں گے تجھے جھوم جھوم کے
بھینسوں کے آگے بین تو اپنی بجا کے دیکھ

ان پڑھ بونگری

بال کی کھال (تبصرہ)

مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا جریدہ

نورس

مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکیڈیمی کے سکریٹری جناب
خواجہ عبدالغفور کی زیر نگرانی ایک ادبی جریدہ "نورس" کے
اجراء کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ جس کا پہلا شمارہ ۲۴۵ صفحات پر مشتمل
جناب حسن کمال (مدیر ہفت روزہ بلٹز) کی زیر ادارت نہایت
آب و تاب کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ محترمہ سلمیٰ صدیقی جریدہ کی شریک
مدیر ہیں۔ خوب صورت اور حسین ترین سرورق اچھی کتابت و
طباعت اور گٹ اپ کے ساتھ بڑے سائز پر شائع شدہ یہ ضخیم
شمارہ مہاراشٹرا اسٹیٹ اُردو اکیڈیمی کا ایک اور کارنامہ ہے
جس کے لیے اکیڈیمی کے سکریٹری مبارک باد کے مستحق ہیں۔
جریدہ کو ملک کے اہم تخلیق کاروں کا تعاون حاصل ہے
نظمیں، غزلوں، افسانوں کے علاوہ مضامین کا حصہ بھی
کافی وقیع ہے۔ مختلف النوع مضامین کے علاوہ آخر میں مہاراشٹرا
میں اُردو افسانہ، اُردو صحافت، آزادی کے بعد مہاراشٹرا میں
اُردو طنز و مزاح، آزادی کے بعد اُردو طنز و مزاح
اورنگ آباد میں اُردو ادب پر ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر قمر رئیس، عنایت اللہ
انصاری، خواجہ عبدالغفور، سلمیٰ صدیقی اور ڈاکٹر عصمت جاوید
کے مقالے شریک ہیں جو شاید اکیڈیمی کے زیر اہتمام منعقدہ سیمینار
میں پڑھے گئے۔ ان میں سے اکثر مضامین کو پڑھنے کے بعد تشنگی سا

احساس ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ سیمیناروں کے لیے سینیئر اور مصروف
ترین ادیبوں و نقادوں سے مضامین لکھوانے کی بجائے ان کی صدارت
میں سیمینار منعقد ہوا اور مضامین ایسے ادیبوں سے لکھوائے جائیں
جو وقت دے سکیں اور موضوع سے انصاف بھی کر سکیں —
نورس کے آخری حصہ میں مہاراشٹرا اردو اکیڈیمی کی
سرگرمیوں اور آئندہ پروگراموں کا تعارف اور تصاویر شامل
ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ "نورس" اسی معیار کا نکلتا رہے تو اکیڈیمی کے
وقار میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

(م ۔ ک)

ثبات

مجموعہ کلام محبوب راہی

ثبات، مہاراشٹرا کے دُور افتادہ چھوٹے سے
قصبہ بارسی ٹاکلی کے شاعر محبوب راہی کا مجموعہ کلام ہے۔ محبو
راہی پچھلے چند برسوں سے مسلسل لکھ رہے ہیں اور ملک کے تمام ا
رسالوں میں چھپتے ہیں۔ وہ سنجیدہ کے علاوہ مزاحیہ کلام بھی
ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محبوب راہی کی وجہ سے بارسی ٹاکل
کو ادب میں شہرت ملنے والی ہے!

"ثبات" محبوب راہی کی خوب صورت غزلوں کا مجمو
ہے۔ راہی کی غزل قدیم و جدید کے امتزاج کا بہتر نمونہ ہے۔ رد
کے وہ پابند نہیں لیکن اپنی آواز کی انفرادیت برقرار رکھنے میں کا
ہیں۔

"ثبات" اہتمام کے ساتھ چھپا ہے۔ کتابت و طبا
عمدہ ہے۔ قیمت دس روپیہ۔ حنیف بک ڈپو مومن پورہ ناگ
سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

○
○

خرافات

(مراسلے)

احمد جمال پاشا۔ سیوان :

شگوفہ باشا کو سال نو + سالنامہ مبارک ہو۔

عزیز گرامی ! آپ کی سالانہ خیریت ملی۔ میں تو خلوص پر جیتا ہوں۔ حساب دوستاں کا قائل نہیں۔ ادیب خواہ مزاح نگار ہی کیوں نہ ہو اس کے خلاف ہوں کہ چوراہے پر کھڑا رہے یا ٹریڈ یونین لیڈر ہو جائے۔ اگر وہ تاریخ کے جھروکے سے اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہے تو دماغ کی کھڑکی نہ کھولے۔ میں گزشتہ ۳۰ سال سے یہی تماشہ میدانِ ظرافت میں دیکھ رہا ہوں، کیسے کیسے آئے کیا کیا دھومیں مچائیں مگر اب نام بھی نہیں سنائی دیتا، ادب میں ذرا دھوم دھڑکا ہوا اور پہونچا ظریف ادب سے صحافت میں اور پانی کے بلبلے کی طرح غائب ہو گیا۔

میں گوشہ نشین ادیب ہوں۔ مجھے لکھنے سے زیادہ پڑھنے میں "مزاح" آتا ہے۔ آج کل بری طرح دو کاموں میں الجھا ہوا ہوں۔ ایک تو "مزاحیہ ادب کی تاریخ" جواب تقریباً تیار ہے۔ دوسرے "مزاحیہ ادب پر تنقید کے اصول"۔ اس دوران مطالعے سے ایک افسوس ناک پہلو اردو ظریفوں کا سامنے آیا وہ یہ کہ ان میں سے نوے فیصد صحافت کی قربان گاہ پر چڑھ جاتے ہیں اور ادب کے دائرے میں نہیں آتے۔

شفیع [illegible] بھوپال :

وہ جو کسی نے کہا ہے (اور اگر اب تک نہیں کہا تو موقع سے فائدہ اٹھا کر یہ خاکسار ہی کہے دیتا ہے) کہ ہنسی میں "الفنسے لے کر ی" تک سارے وٹامن وافر سے بھی کچھ زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ شگوفہ کی صحت کلی اور آب و تاب دیکھ کر اس پر اعتقاد لانا ہی پڑتا ہے اس سے ایسے ہی قہقہے لگوا لیجئے تاکہ یہ بھی عمر خضر پلائے اور (پڑھنے لکھنے) والے بھی دو چار صدمات جھیلنے کے قابل ہو سکیں —!!

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید (تروپتی)

آپ لوگ "شگوفہ" کے ذریعہ ہر ماہ قہقہے بکھیرتے ہیں سالنامہ کے ذریعہ تو ڈھیر سارے قہقہے! یہ مضمون ممکن ہے آنکھ کو نم کر دے۔ بہرکیف خطیب صاحب سے آپ کا بہار رشتہ اس موقع پر ان کی یاد، یقین ہے سب گوارا کریں گے۔

شجاعت علی سندیلوی

شگوفہ بہت اچھا نکل رہا ہے۔ میری دعائیں آپ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ ہیں۔ آپ اسی طرح کامیابی کے ساتھ شگوفے کھلاتے رہیں۔

جوہر سیوانی

یہ خبر انتہائی مسرت خیز ہے کہ جنوری کا "شگوفہ" سالنامہ ہوگا۔ آپ کے ادبی ذوق سے ادب کو ہمیشہ تقویت ملی ہے۔ امید ہی نہیں بلکہ ایمان کی حد تک یقین ہے کہ آپ سالنامے کو ایک ادبی شاہکار کی شکل دیں گے۔

فیض الرحمٰن رانچی

اخبارات کے ذریعہ جناب گلی ملکنڈوی کے انتقال کی اطلاع ملی۔

خلیب کے صدمے سے ابھی دوچار ہی تھے کہ گلی نے بھی داغ مفارقت دے دی۔ قلیل عرصہ میں گلی نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ گلی کی موت نے دکھنی میں جو خلا پیدا کیا ہے بمشکل سے ہی پُر ہوگا۔ خدا مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل۔

رؤف خوشتر۔ لکچرار گلبرگہ

سوونیر نمبر ملا۔ ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالا۔ مال مسروقہ یوں بھی دلکش ہوتا ہے۔ یہ کرنل محمد خاں کا انداز فکاہیہ واقعی دلچسپ ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر حبیب ضیاؔ اور ابراہیم یوسف بھی اپنا اثر چھوڑ گئے ہیں، فکر صاحب کی تو بات ہی اور ہے۔

سید نصرت۔ کویت

شگوفہ کا سوونیر ملا۔ سوونیر کے ساتھ میرے چھوٹے بھائی محمود نے ادبی اجلاس کی ساری کارروائی بھی (جو کیسٹ پہ ریکارڈ کی گئی تھی) روانہ کی ہے۔ سُن کر بہت لطف آیا اور یوں لگا جیسے میں خود بھی گاندھی بھون پہنچ گیا ہوں۔ پرویز میاں ریڈیو آرٹسٹ ہیں اس لیے نظامت کو اچھی طرح نباہ گئے۔ ڈاکٹر حبیب ضیا ہماری محفلوں میں پہلی بار آئی ہیں لیکن خوب آئی ہیں۔

انصاری اصغر جمیل ناگپور

"شاہد کبیر کی اشاعت کا شکریہ۔ اس خاکہ کے سلسلے میں مبارک بادی کے کئی خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان خطوط کی آمد صرف اور صرف "شگوفہ" کی وجہ سے ہے۔ وہ شگوفہ ہی ہے جس کے توسط سے میں نے لکھنا شروع کیا۔

○

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

(اداریہ)

شگوفہ کا یہ سالنامہ بڑے نامساعد حالات میں نکلا ہے۔ مہینہ کا بڑا حصہ فساد اور کرفیو کی نذر ہوگیا۔ ریاستی حکومت کے اشتہارات سے تمام رسائل و جرائد ہنوز محروم ہیں۔ خدا خدا کرکے جب پریس کو کاپیاں گئیں تو بار بار برقی کے بریک ڈاون کی وجہ سے دنوں کا کام ہفتوں میں انجام پایا۔ تاہم ہمیں یقین ہے کہ سالنامہ اپنی آب و تاب برقرار رکھ سکا۔

● پچھلے دنوں میں اردو کی دو اہم شخصیتیں ہم سے جدا ہوگئیں۔ سہیل عظیم آبادی اچھے افسانہ نگار، ناول نگار اور ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ مجاہد اردو بھی تھے۔ شگوفہ کے لیے بھی انھوں نے دو تین بار بطور خاص انشائیے لکھے۔

مشہور ترقی پسند ادیب رضیہ سجاد ظہیر نے اپنی تحریروں اور روسے سے ایک نسل کو متاثر کیا۔ پچھلی پیڑھی سے تعلق رکھنے والی ان عظیم ہستیوں کے انتقال سے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پُر ہونا مشکل ہے۔

ہم مرحومین کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں

Late GILLI NALGONDAVI

22/68 **SHUGOOFA** Postal Regd. No. H.HD 6

ANNUAL NUMBER

31 Bachelor Quarters, M. J. Market, Hyderabad 1 January 1980 Phone. 57716

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

- [illegible] بدست محترمہ [illegible] بدست
جناب [illegible] صدر نشین [illegible]
- اکیڈیمی میں تین مطبوعات کی اشاعت۔ (الف) "[illegible]" [illegible]
(ب) "نوائے طالب" (طالب رزاقی مرحوم)
(ج) "چاند تارے" حافظ عبدالقوی باقوی [illegible]
- اکیڈیمی کی مالی اعانت سے شائع ہونے والی ۵۵ سے زائد کتابوں کی اشاعت۔
(ہر کتاب کی طباعت کے لئے پندرہ سو روپے کی امداد)
- پہلی سے پانچویں جماعت تک اردو کی درسی کتابوں کی تیاری کے پہلے مرحلے کی تکمیل (یہ کتابیں [illegible]
کے ماڈل اسکولس میں پڑھائی جا رہی ہیں اور جون ۱۹۸۰ء کے نئے تعلیمی سال سے عام مدارس میں بھی رائج ہو جائیں گی۔
- اردو اکیڈیمی کی سرگرمیوں کو غیر مرکوز کرنے کی اسکیم کے تحت تین علاقائی مراکز کا قیام:
پہلا علاقائی مرکز وجے واڑہ میں (افتتاح بدست وزیر تعلیم بی۔ وینکٹ رام ریڈی۔ بتاریخ ۵ اگست ۱۹۷۹ء)
دوسرا علاقائی مرکز کرنول میں: (افتتاح بدست وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی۔ بتاریخ ۸ ستمبر ۱۹۷۹ء)
تیسرا علاقائی مرکز نظام آباد میں: (افتتاح جی۔ راجہ رام وزیر مالیہ بتاریخ یکم مارچ ۱۹۸۰ء)
- اکیڈیمی کے ماہانہ خبرنامے کی اشاعت۔
- عدالتوں اور تعمیر کے شعبوں میں اردو کے لئے تعین کردہ قانونی موقف پر عمل آوری کی [illegible] اعداد کا جائزہ۔
- اردو رائٹرس اینڈ جرنلسٹس ویلفیر فنڈ کا قیام (افتتاح بدست جناب ایم۔ باگا ریڈی صدر اکیڈیمی (وزیر [illegible])
اس فنڈ میں پانچ لاکھ روپے کے ٹارگٹ کے منجملہ پچاس ہزار روپے کا اکیڈیمی کی جانب سے عطیہ دیا گیا۔
استفادہ کنندگان میں نو ادیب اور اخبار نویس اور ان کے لواحقین کو فی کس پچاس روپے ماہانہ وظیفہ کی اجرائی
اور ادیبوں اور صحافیوں کو علاج معالجے کے لئے منجملہ آٹھ ہزار روپے کی امداد۔

(سلسلہ [illegible])

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

شگوفہ

فبروری ۱۹۸۰ء

جلد ۱۳ —————— شمارہ ۲

ٹائٹل : سعادت علی خاں
جنرل منیجر : سمیع جلیل
منیجر : بشیر انور

سالانہ ۲۲ روپے
بیرون ہند سے ۳۵ شلنگ
فی پرچہ ۲ روپے

طباعت: نیشنل فاین پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ؛ بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس پرانی حویلی

خط وکتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱-مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

(ادبی لطائف)

ایسی کی تیسی (تنقید)

اڑیں گے پرزے (خاکے)

چورن

او دنیا کے رکھوالے!

اکمل حیدرآبادی
(حال مقیم، سعودی عرب)

او دنیا کے رکھوالے، سُن درد بھرے مرے نالے
سُن درد بھرے مرے نالے
آس نراس کے دو رنگوں سے دِلّی تُو نے سجائی
جنتا، جن سنگھ ہم نے بنائی تو نے کانگریس آئی
جا دیکھ لیا ہرجائی
چھوٹ گئی ٹوٹی ہوئی کرسی ۔ اب تو مجھ کو اٹھا لے
اب تو مجھ کو اٹھا لے ـــ
اندرا کو لانے والے
سُن درد بھرے مرے نالے
چاند کو ڈھونڈے پاگل سورج ۔ جیسے ڈھونڈے چکوری
میں بھی ڈھونڈوں اس کرسی کو ہو نہ سکی جو موری
پکڑی گئی موری چوری
ہائے مرے اس اونچے محل کے دوار پہ پڑ گئے تالے
او دنیا کے رکھوالے ...

کرنل محمد خان

(ایران)

یہ آپ کے سینے پر دال کیسی ہے ؟

خیابانِ سعدی سے خیابانِ فردوسی میں آئے جہاں بڑے بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور یا فروش گاہیں ہیں لیکن مقصد خرید نہ تھا بلکہ خالص دید تھا۔ کیونکہ تہرانی قیمتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اگر پوری آئل کمپنی کی نہیں تو کم ازکم دو چار چشموں کی ملکیت لازم ہے اور نہیں تو یہاں کسی پانی کی ٹونٹی پر بھی گلّی اختیار نہ تھا۔ لیکن خیابانِ فردوسی کی دید مفت تھی اور وہاں دیکھنے کو کیا کچھ نہ تھا ؟ وہ سلیقے سے سجی ہوئی دکانیں - وہ طریقے سے گھومتے ہوئے خریدار اور وہ عقیقے کی طرح مونڈھے ہوئے دکان دار۔ پھر ان سیدھے لمبے بارونق بازاروں کے وہ کوچہ کوچہ سبزہ زار اور وہ خیاباں خیاباں ارم، وہ روش روش گلزار اور سب سے بڑھ کر تہران کے لوگ : مرد خوش شکل اور خوش پوش اور وضع میں خالص فرنگی۔ عورتیں خوب رو اور خوش لباس لیکن وضع میں مختلف منازل ارتقا، پر اٹکی ہوئی بیشتر لڑکیاں "منی اسکرٹ" اور "ہاٹ پینٹس" کی منزل میں یا کسی قدر آگے۔ لیکن کئی ایک سکرٹ پہننے کے باوجود اوپر کالی چادر میں ملفوف ، اگرچہ ایرانی چادر بھی اب پاکستانی برقعے کی طرح دیارِ حرماں سے کوسوں نکل چکی ہے۔ ہمارے یہاں تو خیر، اب برقعے کے علاوہ دوپٹہ بھی رخصتی سلام کر رہا ہے کہ ایک عرصے سے دوپٹے کی صرف "د" ہی باقی ہے اور وہ بھی محض علامتی شکل اختیار کرنے والی ہے - یعنی کسی دن کوئی پائنیر□ مزاج خاتون دوپٹے کی بجائے سینے کی جیب پر ریشم سے حرف 'د' کاڑھ لے گی اور پارٹی میں نکل آئے گی ۔

خیابانِ فردوسی سے شاہراہ رضا شاہ کو نکلے - یہ سیدھی قصرِ گلستان کو جاتی ہے جہاں شہنشاہ ایران رہتے ہیں ہم محل کے اندر تو خیر جا سکے لیکن اتنے قریب ضرور منڈلاتے رہے جتنا کوئی بن بلایا مہمان منڈلا سکتا ہے - اگر اندر سے شہنشاہ کسی کو ذرا اونچی آواز دیتے تو ہم شک کا فائدہ اٹھا کر حاضرِ خدمت ہو کر کہہ سکتے تھے : "ارشاد، جہاں پناہ" ــــ

□ PIONEER کسی بڑے کام کی پہل کرنے والا یا والی ۔

لیکن شہنشاہ لوگ کسی کو زور سے آواز دے کر بلانے کے عادی نہیں ہوتے ——— شاہی کاروبار اشاروں سے ہی ہوا کرتا
اور اس محل میں کسی اشارے کا روئے سخن ہماری طرف نہ تھا سوائے پاسبان کی ٹکٹکی کے۔ اور پاسبان کے قدم لے کر غالب
نے کیا پایا تھا جو ہم یہ بے وقوفی کر بیٹھتے؟ بہر حال ہم نے دل ہی دل میں شاہ کو درازئ عمر کی دعا دی اور چل نکلے۔
دن کا ایک بج رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کی حالت دیکھی تو اس بات پر متفق ہو گئے کہ بھوک لگ
رہی ہے۔ جمال بولے:

"یہ تاریخی بھوک کسی معمولی ریسٹوران میں ضائع کرنے کی نہیں۔ یہ رائل تہران ہلٹن کی مستحق ہے" ——— اور ا
لمحے کار کا رخ ہوٹل ہلٹن کی طرف تھا۔

کسی عورت کا تیسرا خاوند بننے میں احتیاط لازم ہے:

تہران شہر سے ہوٹل ہلٹن جانا ایسا ہی ہے جیسے راولپنڈی سے اسلام آباد سکریٹریٹ کو جانا۔ وہی گہرے نیلے
کا پس منظر، وہی تازہ تازہ، اُجلی اُجلی بکھری بکھری عمارتیں، وہی عمارتوں کے درمیان وسعت کیسہ مالکوں کے بے شمار
پلاٹ اور یوں ان جدید عمارتوں کے درمیان چونے اور سیمنٹ کے ساتھ جنگلی گھاس اور تازہ مٹی کی خوشبو جو تمام نئی
کا خاصہ ہے۔ لیکن ایک دفعہ ہلٹن میں پاؤں رکھا تو جنگلی گھاس اور تازہ مٹی تو درکنار، خود تہران کسی بغلی دروازے
کھسک گیا اور ہم ایک چھوٹے سے امریکہ میں آنکلے! وہی قطار اندر قطار امریکی ٹورسٹ لگاتار جگالی کرتے ہوئے اور
ہنستے ہو وہ گمیں جو جگالی کرتے ہوئے برآمد ہوں۔ اکثر ناک کے رستے نکلتی ہیں۔ چنانچہ بعض اوقات یہ غلط شبہ ہونے لگتا
امریکیوں کے حلق میں خدا نے بنی بنائی تنوین رکھ دی ہے۔ یعنی جب منہ کھولیں معلوم ہوتا ہے آناً فاناً وطوعاً وکرہاً کا
کر رہے ہیں)۔ لیکن ایک دفعہ ان کے لہجے سے کان مانوس ہو جائیں تو امریکی ہیں رونقِ محفل۔ انگریزوں کی طرح انہیں
قبض نہیں۔ ایک تو خوش ہاضمہ آدمیوں کی طرح کھل کر ملتے ہیں۔ دوسرے اپنے مخاطب سے ہم سطح ہو کر بات کرتے ہیں۔
کی طرح دم گفتگو نسلی ایڑیاں نہیں اٹھا لیتے۔ چنانچہ لونج میں داخل ہوتے ہی ناواقف امریکیوں اور امریکنوں نے بھی نظریں
ہی بھری مجلس میں ہنسی بھری علیک سلیک کی۔ اِکا دُکا تہرانی بھی نظر آئے۔ ان لوگوں نے اظہارِ تواضع میں ابتدا تو نہ کی
ہم نے پہل کر دی۔ تو نہایت شیریں ادائی سے جواب دیا:

"مرحمت شما زیاد۔ سایہ عالی مستدام۔۔۔۔۔"

اور ہم نے محض فارسی کے میٹھے جملے سننے کے ہر ایرانی اور ہر ایرانن کو دیکھتے ہی سلام مسنون پہنچانا شروع کر
اور ہر بار شہد میں لپٹی ہوئی رسید پائی۔ تا آنکہ ایک تاب شکن ایرانی دوشیزہ تک جا پہنچے جو خالص شہد کی ٹیوب لگتی تھ
ایسی ٹیوب کہ شہد حاصل کرنے کے لیے اسے کسی مقام پر دبانے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ خود بخود بات بات پر لچک کھا کر تھو
شہد انڈیل دیتی تھی۔ جمال کو دیکھتے ہی بولی:

"چہ خوب شد، شما را دیدم۔ بفرمایید۔ چشم ما روشن، لطف فرمودید۔"

جی ہاں، وہ تھی تو ہلٹن کی ایک افسر مہمان داری لیکن اگر وہ ہوٹل کا مخصوص لباس اُتار کر سر پر تاج رکھ دے

چھوٹے چھوٹے شہزادے اسے تخت بھی پیش کر دیتے۔ بہرکیف اگلے نصف گھنٹے میں اس کی تخت نشینی کا امکان نہ تھا۔ لہٰذا اس ہو سکنے والی ملکہ نے نہایت اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ ہماری ـــــ یا یوں کہیں کہ جمال کی ـــــ تواضع کی اور بیرے کو ہماری خاطر خصوصی ہدایات دیں ـــــ تعارف پر معلوم ہوا کہ جمال کی پیاری کرم فرما ہیں اور روحی کہلاتی ہیں ـــــ کھانا آیا تو لذیذ پایا لیکن روحی یا روحی کی باتوں سے زیادہ لذیذ نہ تھا۔ بار بار کہتی:

"خواہش می کنم آنیں طر میل دارید"۔

"چشم بہر طور کہ میل شما باشد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

روحی اپنی باتوں کے رستے براہ راست ہمارے دل میں اترنے لگی تو ان دونوں کی فارسی گفتگو میں ہم اردو میں مخل ہوئے اور جمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"جمال، یہ کتنی پیاری لڑکی ہے یار۔ میری مانو تو اس سے آنکھیں بند کر کے شادی کر لو۔"

"جمال نے اردو میں جواب دیا: "بہت اچھا۔ مگر کسی عورت کا تیسرا خاوند بننے سے پہلے تھوڑی سی آنکھیں کھول لی جائیں تو کوئی حرج ہے؟"

ہم ٹھٹک سے گئے اور کسی قدر بوکھلا کر بولے:

"کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ محترمہ اس عمر میں دو خاوندوں سے سبک دوش ہو چکی ہیں؟"

جمال سنجیدگی سے بولا:

"حضور! یہاں تک آپ نے ٹھیک سمجھا ہے اور اس کے بعد آپ کو یہ سمجھنے میں دقت نہیں ہونی چاہیے کہ محترمہ اب تیسرے کی گھات میں ہیں اور ایسے شکار کے لیے ہلٹن سے بہتر کوئی کمین گاہ نہیں۔"

تو اقبال نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ بلبل فقط آواز ہے طاؤس فقط رنگ۔ ہم نے بیرے سے ٹھنڈے پانی کا گلاس مانگا۔ جمال سے باتوں میں مخل ہونے کی معذرت چاہی اور اس کی شادی کا منصوبہ منسوخ کرتے ہوئے صرف روحی کی روح افزا باتیں سننے لگے کہ بطور بیوی کتنی ہی مضرِ صحت سہی، بطور ہم نشین روحی سے زیادہ صحت بخش کوئی جنس نہ تھی۔ باتوں باتوں میں آخرکار جمال پر اپنے جادو کا گھیرا تنگ کرتے ہوئے کہنے لگی:

"دیشب بخیالِ تو بخواب رفتم۔ باور کن، تا صبح نقش روئے تو در دیدۂ من بود۔"°

روحی کے کلام کا ہم پر پھر اثر ہونے لگا۔ روحی فقط آواز سہی لیکن آواز تو بلبل کی تھی۔ ہم نے چپکے سے جمال کو کہا۔ میاں شادی نہ سہی، اسے جھوٹ موٹ ہی دل تو پیش کر دو ـــــ لیکن جمال کو ... تہران کے سہ سالہ خوابوں کا تجربہ رکھتا تھا، جادو کا گھیرا توڑتے ہوئے بولا:

"روحی از لطف شما خیلے ممنونم۔ اِمشب من ہم بخیالِ تو بخواب خواہم رفت۔ حالا بل بیار ۔ ۔ ۔ ۔"●

° کل رات تمہارے خیال میں سو گئی اور یقین جانو کہ صبح تک تمہاری تصویر میری آنکھوں میں رہی۔

● روحی تمہاری مہربانی کا شکریہ، آج رات میں بھی تمہارا خیال کرتے کرتے سوؤں گا اب ذرا بل لاؤ۔

گویا ہدیہ دل پیش کرنے کی بجائے جمال کہہ رہا تھا کہ بل پیش کیجئے۔ چنانچہ بل آیا، ادا ہوا اور ہم سیر تہران کے لئے گئے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

طے پایا کہ ابھی مضافات تہران کی گردش کی جائے۔ اور شام کرنل نقی کے ساتھ گذاری جائے۔ جمال نے کرنل نقی کو فون کیا تو ادھر سے جواب آیا:

آپ نے میرے پاس آنے کے لیے بڑا صحیح دن چُنا ہے کہ آج ہی بیوی گھر میں نہیں۔ افراد کی زندگی میں ایسی نادر ساعتیں قسمت سے ہی آتی ہیں۔ آئیے، یہ جشن مل کر منائیں۔ میں دو دوست اور بھی بلا رہا ہوں گا

ایران میں جملہ جذبات بوسوں کی راہ ہی اظہار پاتے ہیں

الوند کے دامن میں دربند کی طویل سیر کے بعد شام کو نقی منزل پہنچے جہاں کرنل صاحب کو انتظار کرتے پایا۔ توقع سے زیادہ کم عمر نکلے۔ جمال نے بتایا تھا کہ ابھی ابھی فوج سے ریٹائر ہوئے ہیں لیکن شکل وصورت سے یوں لگتے تھے جیسے کپتانی ہی میں استعفیٰ دے دیا ہو۔ لب و رخسار جانانہ، اطوار عاشقانہ اور گفتار فاسقانہ۔ ہم سے بغلگیر ہوئے تو ہمارے گلے پر دونوں طرف دو دو بوسے ٹائپ کر دیئے۔ پوچھا:

کیا ایک ایک کافی نہیں"؟

بولے: "دو تمہارے لیے اور دو کشورِ عزیز پاکستان کے لیے۔"

پتہ چلا کہ کچھ عرصہ قبل کشور عزیز پاکستان کے مہمان رہ چکے ہیں اور اب تک اپنے لب و دہن میں پاکستانی تواضع کا ذائقہ محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ اب پاکستانیوں کو دیکھ کر ان کا جوش ممنونیت لب و دہن کے رستے ہی اُمڈ آتا تھا ——— ویسے بھی ایران میں جملہ جذبات شوق بوسہ کی راہ ہی اظہار پاتے ہیں خواہ مقابلے میں کرپال سنگھ ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ واضح تھا کہ نقی چار بوسوں کے بعد بھی کسی قدر تشنگی محسوس کر رہے ہیں اور جو کنارے رہنے کا مقام ہے۔

صحن میں چند خالی کرسیاں رکھی تھیں۔ جمال نے پوچھا:

"تو کیا ابھی تک دوسرے دوست نہیں آئے؟"

نقی بولا: "اندر بیٹھے ہیں۔ آئیے۔"

ڈرائنگ روم میں گئے تو صوفے خالی پڑے تھے بیٹھنے لگے تو نقی بولے

"اور اندر آئیے۔"

اور اگلا دروازہ کھلا تو اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا۔ حیرت میں ہمارے منہ سے نکلا:

"خدایا! ہم رنگ و بو کی کونسی دنیا میں آنکلے ہیں؟"

نقی نے مسکراتے ہوئے ہمارے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا اور کہا:

"گھبرائیے نہیں۔ اپنا ہی گھر ہے، فقط آپ نے خاکسار کے پرائیویٹ بار میں قدم رکھا ہے۔"

ایک کرنیل کے گھر میں پرائیویٹ بار! ایک پورا ذاتی مے کدہ! یعنی اپنے ہی خم اور اپنی ہی صہبا، اپنے ہی سبو، اور اپنے ہی جام، اپنے ہی ساقی اور اپنے ہی بہلنے۔ اس عیاشی کا یقین نہیں آتا تھا۔ آخر ہم بھی کرنیل تھے لیکن جتنے نقی کی بار میں آبگینے تھے، اتنے ہمارے گھر میں آبخورے بھی نہ تھے۔ کیا ہماری کرنیلی محض کاغذی کرنیلی تھی؟ کیا ہمیں آزاد اور خود مختار مملکت پاکستان نے کمشن نہیں دیا تھا؟ کیا وہ مزدور کی خدائی تھی؟ اور چلو تو تی ٹوٹلر● فقیر سہی، ہم نے پاکستان اور انگلستان میں کئی اصلی مے نوش کرنیلوں کے گھر بھی دیکھے تھے اور وہ سب اس تہرانی گھر کے مقابلے میں جیل کے گھونسلے لگتے تھے۔ پھر کرنل نقی کوئی رائج الوقت کرنل بھی نہ تھے۔ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور قاعدے کی رو سے انہیں یوں لگنا چاہیے تھا جیسے "وہ جا رہا ہو کوئی شب غم گزار کے" لیکن وہ یوں لگتے تھے جیسے مستقل طور پر حجلۂ عروسی میں قیام پذیر ہوں اور فقط ہوا خوری کے لیے باہر نکلے ہوں۔ ہم یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے:

"کرنل صاحب" گستاخی معاف۔ ریٹائرشدہ کرنیلی میں یہ للّے تلّے کیسے؟"

نقی بولے: "ہمارے ہاں پنشن تنخواہ سے قدرے زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں ریٹائرڈ کرنل کچھ اور زیادہ گراں بہا ہو جاتا ہے" ــــــ ایلیمنٹری، مائی ڈیئر واٹسن!

ہم خاموش ہو گئے کہ ہمارے ہاں یہ خوبی فقط ہاتھی میں پائی جاتی ہے۔ اور ہاتھی کو بھی اس خوبی سے فائدہ اٹھانے کے لیے پہلے ذرا مرنا پڑتا ہے۔ ایرانی کرنل کو اتنا انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ صرف ریٹائر ہونا کافی ہے ــــــ اور ابھی ہم نے سارے اللّے تلّے بھی نہ دیکھے تھے۔ نقی کے دو دوست بار کے روبرو اپنے چرمی سٹولوں پر ہماری طرف پشت کیے بیٹھے تھے۔ ہم قریب پہنچے تو ان دونوں نے اٹھے بغیر اپنے رخ ہماری جانب موڑے۔ بار کی دھیمی روشنی میں معاً ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے کسی سامنے سے آنے والی کار نے اچانک ہیڈ لائٹس روشن کر دی ہوں۔ ایک مدت تک ٹمٹمانے کے بعد ہماری چندھیائی ہوئی آنکھوں کی بینائی بحال ہوئی تو دو رخشندہ نجوم کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ہم نے نقی سے پوچھا:

"آپ کی پرائیویٹ بار میں کیا یہ آپ کے پرائیویٹ ستارے ہیں؟"

بولا: "آج کی رات یوں ہی سمجھ لیں۔ اور آئیے ملیے ان ستاروں سے: یہ ہے زہرہ اور یہ ہے نجمہ۔"

اگر زہرہ واقعی زہرہ تھی تو نجمہ محض نجمہ نہ تھی، آفتاب تھی۔ ہم نے ان نجوم سے ہاتھ ملایا تو جیسا کہ ناگزیر تھا، ایک پل میں، زمین کی کشش سے نکل کر آسمان پر پہنچ گئے اور جتنی دیر ہاتھ میں ہاتھ رہا یوں محسوس ہوا جیسے بے وزنی کے عالم میں خلا میں تیر رہے ہوں۔ ہم تو خیر ہاتھ چھوڑ کر جلد ہی زمین پر اتر آئے لیکن جمال ایک مدت تک خلا نوردی کرتے رہے کہ ایک مدت تک نہ انہوں نے ہاتھ چھوڑا، نہ اس نے چھڑایا۔ یعنی جب تک کہ نقی نے ان کے ملے ہوئے ہاتھوں پر انگلی رکھ کر یہ یاد نہ دلایا کہ مصافحہ دوامی نہیں ہوا کرتا ــــــ آخر جب ہمارے قدم مضبوطی سے زمین پر ٹک گئے تو ہم نے نظر بھر کر زہرہ اور نجمہ کو دیکھا اور ہمارے منہ سے اس قدر پرخلوص

● شراب سے اجتناب کرنے والا۔

سبحان اللہ لگی جیسے ہماری ٹھوڑی سے بالشت بھر داڑھی بھی لٹک رہی ہو، بلکہ اس پر ہم نے غالباً فرضی ہاتھ بھی پھیرا۔
اتنے میں لقی کے اشارے پر زہرہ اپنی نشست سے اٹھی اور بار کے پیچھے جانے لگی۔ ہمیں زہرہ کا سراپا نظر آیا تو ساتھ
ہی احمد ندیم قاسمی کا شعر بھی یاد آیا :

یاد آئے تیرے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی

اور ہمیں پیکر زہرہ دیکھ کر نہ صرف اپنی کوتاہیٔ فن یاد آئی بلکہ درۂ خیبر کی ریلوے لائن بھی یاد آئی گو اس کے موڑ تعداد میں
کسی قدر کم ہیں۔ [illegible]۔ زہرہ کیا تھی؟ چند حسین دائروں اور رنگین قوسوں کی پیچاں و لرزاں موج! اور زہرہ کا اپنی جگہ
سے اٹھ کر بار کے پیچھے جانا کیا تھا؟ اس لرزاں و پیچاں موج کا بے پرواخرام! لیکن یہ سب بڑی ناکام تشبیہیں ہیں۔
جہاں شاعر فیل ہو گیا، ہم یہ پیر مارلیں گے۔ بہرحال یہ شاعری کا نہیں، شیدا ہونے کا مقام تھا۔ یعنی ایک ٹھنڈی آہ
بھر کر خاموش رہنے اور زہرہ کو دیکھتے رہنے کا۔

زہرہ بار کے پیچھے جا کھڑی ہوئی اور پھر اس نے وہی کچھ کیا جس کے لیے مشیت نے اُسے وضع کیا تھا: ساقی گری حاضرین
مجلس سے پوچھے بغیر ساقی نے اپنی پسند کے مشروبوں سے پانچ جام بھرے اور اس انداز سے کہ ساغر کو رنگ بادہ سے پُرنور
کر دیا۔ پھر جملہ شرکائے مجلس کو ——— جو بار کے گرد کھڑے تھے ——— یکے بعد دیگرے پیش کیے۔ ہماری سمت بھی زہرہ
نے ایک کف ملا، پیالہ بڑھایا۔ ہم جھجکے تو ساقی نے ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ مے بے شک حرام ہے۔ لیکن
سوال یہ تھا کہ چشم ساقی کا اشارہ پانے کے بعد بھی حرام تھی؟ مفتی صاحب تو وہاں تھے نہیں، اپنے دل سے پوچھا۔ دل نے
کہا مباح ہے۔ چنانچہ ہاتھ بڑھا کر جام تھام لیا۔ باقی ساتھیوں نے دل سے فتویٰ لیے بغیر ہی جام اٹھا رکھے تھے۔ اور اس انتظار
میں تھے کہ کب ہم اپنا جام ہاتھ میں لے کر بلند کریں کہ پانچوں ساغر باہم کھنکھنا کر لبوں تک لے جائیں۔ ہم نے منتظرین کی
بے تابی دیکھی تو اپنا جام ان کے جاموں سے کھنکھنایا۔ معاً ہمارے ساتھی ایک نعرۂ مستانہ بلند کرتے ہوئے پینے لگے۔ لیکن
ہم سوچ میں پڑ گئے۔ ہم نے انگریزی میسوں میں ہزار طعنوں اور تحریصوں کے باوجود مے کو منہ نہ لگایا تھا لیکن آج کی رات کے تقاضے
مختلف تھے۔ برٹش میسوں میں ہمیں کسی زہرہ نے جام بھی تو پیش نہیں کیا تھا اور آج جب ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا تو ہمارے
اندر کا جگر بیدار ہوا اور پھر جیسا کہ جگر کا دستور تھا، رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا۔ لیکن معاً کھلا کہ رحمت کا بہلانا
غیر ضروری تھا: ہمارے ساغر میں کوکا کولا ہی تھا! اتنے میں ایک چہاردہ سالہ لڑکا گلے میں وائلن لٹکائے اور ایک دلآویز
دُھن بجاتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ نجمہ کے پاس آیا اور وائلن کو بجاتے بجاتے جھک کر اسے سلام کیا۔ جواب میں نجمہ نے
ایک لمحہ کے لیے وائلن کے تاروں کے ساتھ اپنے دل اور گلے کے تار ملائے، پھر ذرا گنگنائی اور آخر میں ایک دلربا سی لے میں
نغمہ پیرا ہوئی :

بازبہ سرمہ تاب دہ چشم کرشمہ زائے را
ذوقِ جنوں دو چند کن شوق غزل سرائے را

ہم مطلع سے ہی پہچان گئے کہ غزل اقبال کی ہے۔ اور ہمارے میزبانوں کی طرف سے خاص تحفے کے طور پر پیش کی
جا رہی ہے۔ اقبال کا کلام اور نجمہ کی آواز ہم پر دوہری مستی چھانے لگی اور جب نجمہ نے یہ شعر دُہرایا :

بزم بہ باغ و راغ کش زخمہ بہ تارِ چنگ زن
بادہ بجوش، غزل سرا، بندکُش قبائے را

تو جملہ حاضرین نہ صرف شریکِ غزل سرائی ہوگئے بلکہ شریکِ بندکشائی بھی ہوگئے ـــــ الغرض غزل کے ختم ہونے تک حال وقال کی کوئی ایسی کیفیت نہ تھی جو اہلِ مجلس پر نہ گزری ہو۔ وہ ابتدائے سفر کی آرزو کہ ہمارے سفر کی انتہا کسی ترکِ شیرازی کے اس دل نشین کلمے پر ہو کہ "بُوہے وچ تاں کھلی آں مت ماہیا آ نکلے"۔ ضرورت سے بڑھ کر پوری ہو چکی تھی ترکِ شیرازی نے گلی کی بجائے حریمِ ناز میں باریابی بخشی تھی اور اس طرح علاقائی تعاون کو علاقائی وصال کی حد تک فروغ دے دیا تھا۔ غزل کے خاتمے پر نقی نے مغنّیہ اور وائلن نواز کو مشروبِ خاص کے دو جام لبطورِ انعام پیش کیے۔ وائلن نواز لونڈے نے اپنا جام مغنیہ کے جام سے کھنکھنایا اور ایک ہی سانس میں پی کر دوسرے کی اُمید پر پھر وائلن بجانے لگا۔ لڑکے کو دیکھ کر ہم حیران ہو رہے تھے۔ اس چھوٹی عمر میں مے و نغمہ کا یہ لپکا؟ ہم نے نقی سے پوچھا:

"یہ لڑکا کون ہے؟"

نقی بولا: "این حسن است۔ پسرِ خودِ من است۔ خیلے سعادت مند است°۔"

"پسر؟" میں نے حیران ہو کر دل میں کہا۔ پھر لپسر سے آنکھ بچا کر پدر سے کہا:

"کرنل صاحب۔ اس محفل میں حسن کو شریک نہ کرتے تو بہتر نہ ہوتا؟"

بولے: "نہ۔نہ۔نہ۔باہر جاتا تو کوئی بُری بات سیکھ کر آتا۔"

چنانچہ حسن کے ساتھ ہم نے بھی اچھی باتیں سیکھنا شروع کیں۔ جب آخری سبق پر پہنچے تو حسن تو گریجویٹ ہو چکے تھے اور ہم بھی اچھے خاصے منشی فاضل ہونے کو تھے۔ مگر اب رات ڈھلنے لگی تھی اور سحر کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ یعنی رخصت کا وقت قریب تھا۔ ایرانی اپنے مہمانوں کو رخصت بھی بوسوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب پورے چھ نفر ایک دوسرے کو دو بوسے فی رخسار فی سیکنڈ کے حساب سے الوداع کہہ رہے تھے۔ ہماری ریاضی کمزور ہے مگر غالباً بوسوں کی مجموعی تعداد کوئی ایک سو بیس بنتی تھی قصہ مختصر بوسوں کے نزول کا یہ عالم تھا گویا ڈاک خانے میں مہریں لگ رہی ہوں۔ (ختم شد)

° یہ حسن ہے۔ میرا بیٹا۔ بڑا سعادت مند بچہ ہے۔

الکشن کے بعد

رضا نقوی واہی

سُنو یارو، اگر اب کے الکشن جیت جاؤں گا — تو اپنے ووٹروں کو ناچ تگنی کا نچاؤں گا
اگرچہ آج کہتا پھر رہا ہوں بے وقوفوں سے — پسینے پر تمہارے خون اپنا میں بہاؤں گا
تمہاری ہر خوشی پر بَلّیوں اُچھلے گا دِل میرا — تمہارے غم کو میں اپنا غمِ ہستی بناؤں گا
عوام الناس، اپنے بال بچوں کو سمجھتا ہوں — عوام الناس کی خدمت میں تن من دھن لگاؤں گا
غریبوں اور اقلیت کے جتنے بھی مسائل ہیں — انھیں سعی و عمل کے حل کے رستے پر چلاؤں گا
زبردستی کیا تھا ظالموں نے آختہ جن کا — میں ان کو سرجری سے کارآمد پھر بناؤں گا
مگر یارو یہ سب وعدے الکشن جیتنے تک ہیں — پھر اس کے بعد اپنی اصلیت پر لوٹ آؤں گا
فراغت ہوگی جونہی اس جھمیلے سے تو سُن رکھو — 'الف' سے لے کے 'یے' تک سارے وعدے بھول جاؤں گا
پھر اگلے پانچ برسوں تک کہاں میں اور کہاں جنتا — قسم لے لو، نہ بھولے سے بھی ان کے پاس آؤں گا
مجھے ناکوں چنے چبوا دیئے اِن شوربہ پُشتوں نے — ذرا دم لے لوں، ان کی شوربہ پُشتی پھر مٹاؤں گا
گلسرین ڈال کے آنکھوں میں، مشقِ گریہ کرتا تھا — اب ان کے حال پر رونے کے بدلے مسکراؤں گا
ابھی ایوان میں گھُسنے تو دو، پھر دیکھنا، ان کو — چھٹی کا دُودھ یاد آئے، مزہ ایسا چکھاؤں گا
چلے گی منتری منڈل بنانے کی مہم جس دم — تو اپنی گرگٹیّت کو بروئے کار لاؤں گا
قلمدانِ وزارت جب تلک ہتھیا نہیں لیتا — کبھی اِس دَل میں آؤں گا کبھی اُس دَل میں جاؤں گا
میں نٹورلال اور مستان سے گانٹھوں گا یارانہ — اور اُن کے کاروباری آرٹ پر صیقل چڑھاؤں گا
غریبی دُور کرنے کے سلوگن کو ہوا دے کر — میں سب سے پہلے خود اپنی غریبی کو مٹاؤں گا

غرض محکوم اور حاکم کا جو رشتہ ازل سے ہے
اس رشتے کو میں اپنے لیئے ماڈل بناؤں گا

افاقہ

ناوک حمزہ پوری

آنکھوں کا اک مریض گیا ڈاکٹر کے پاس — بولا علاج کے لیئے حاضر ہوا ہے داس
سُرخ و سیاہ دائرے آنکھوں کے سامنے — آتے ہیں کچھ دنوں سے نظر ناچتے ہوئے
آنکھوں کی جانچ کرکے دوا ڈاکٹر نے دی — پھر دوسرے دن آنے کی تاکید اُس کو کی
پھر آیا جب مریض تو بولا یہ ڈاکٹر — بتلایئے جناب افاقہ ہو کچھ اگر

"اتنا افاقہ ہے، یہ بتایا مریض نے
کچھ اور صاف اب نظر آتے ہیں دائرے"

٭ گرگٹ صفتی

محمد برہان حسین

اور آنا لندن سے ماہر ٹرافک کا...

شہر حیدرآباد میں لندن کے ماہر ٹرافک کی آمد نے کھلبلی مچادی۔ لوگ اُسے دیکھنے جوق درجوق آتے اور اُس کے سرپر کچھ نہ دیکھ کر مایوس لوٹ جاتے۔ دراصل دنیا کا ہر ماہر کچھ نہ کچھ نشانی اپنے لباس یا وضع قطع میں بنالیتا ہے جیسے ڈاکٹروں کے گلے میں اسٹتھسکوپ، وکیل کا کالا لباس، مرشد کی ٹوپی وغیرہ اسی طرح ماہر ٹرافک کے سر پر ٹرافک کے سگنل، ہری لال اور پیلی روشنیوں کی نشانیاں ہونی چاہیئں۔

اس بغیر سگنل کے ٹرافک کے ماہر کو ہمارے ذمہ کیا گیا۔ ہم اس کو ایک گھنٹہ سے عابڈس کے چوراہے پر لیے کھڑے ہیں۔ اُس نے کہا "ول سرا یہ ٹرافک تو بالکل آل رائٹ ہے"

ہم نے کہا "آل رائٹ نہیں ہے۔ ہم تمہیں بتائیں... یہ سامنے جو بلڈنگ نظر آرہی ہے یہ پیلس ٹاکیز یعنی سینما ہاؤس ہے۔ یہ اس جگہ سے پورے دو کلومیٹر دور ہے"

"یہ — یہ سامنے والا بلڈنگ۔ مجھے بے وقوف نہ بناؤ" اس نے کہا۔

ہم نے اس کو اسکوٹر پر پیچھے بٹھایا اور کہا "چلو، وہاں چلتے ہیں" اور ہم مخالف سمت میں روانہ ہوگئے۔ اس نے کہا "ارے اُدھر جانے کے لیے اِدھر کیوں جاتا ہے؟"

ہم نے گاڑی روک کر کہا "یہی تو یہاں کی ٹرافک کا مسئلہ ہے بچے۔ اس سامنے کی بلڈنگ تک جانے کے لیے پہلے ایک کلومیٹر اُدھر جانا ہوتا ہے پھر لوٹ کر آنا ایک کلومیٹر۔ چونکہ یہ یک رخی راستہ یا وَن وے ہے۔

اُس نے کہا "ہاؤ فنی"

ہم نے کہا "یس، ویری فنی"

ہم اُسے چار مینار لے گئے۔ مگر وہ چار مینار کو دیکھنے کی بجائے بیچ سڑک پر بیٹھے ہوئے بیل کو دیکھنے لگا پھر بدمعاشی سے مسکرا کر پوچھنے لگا "یہ اصلی ہے"۔ ہم نے اس کا جواب دینے کی بجائے اُسے ٹرافک کی طرف متوجہ کیا۔ وہ سیٹی بجا کر بولا "او۔ یہ ٹرافک میلے کا ہے فیر کا، مین روڈ ٹرافک کا آدمی ہوں۔
ہم نے کہا "یہ میلہ نہیں ہے مسٹر، روز کا ٹرافک ہے"
ہم نے اُسے اسکوٹر پہ بٹھایا اور گولکنڈہ قلعہ کی جانب روانہ ہوئے۔
ہم نے خوشی سے اس سے کہا "وہ دیکھو قلعہ نظر آرہا ہے"
مگر دفعتاً اسکوٹر اُلٹ گئی اور ہم منہ کے بل سڑک پر گر پڑے۔
"اسپیڈ بریکر تھا" .... لوگوں نے ہمیں اور اُسے اٹھا کر سامنے کی ہوٹل پر منہ دھلایا اور چائے پیش کی۔ چائے پی کر ہم نے منہ میں پان دبایا مگر جیسے ہی پان کو چبایا، منہ سے ایک دلدوز چیخ نکل گئی۔ ہم پان والے پر بپھرے "ارے کیا پان میں پتھر ڈالا ہے"
اس نے اطمینان سے کہا "دانت ہوگا صاحب دانت"
"دانت"
ہاں صاحب۔ آپ کا اسپیڈ بریکر کا کیس ہے نا....... یہاں سب کا یہی حال ہوتا ہے صاحب"
ہم نے کہا "ارے اسپیڈ بریکر اتنے اونچے بنائے جاتے ہیں؟"
وہ بولا "دیوار ہے صاحب نظر نہ آنے والی دیوار..... بے چارہ تاناشاہ کو یہ آئیڈیا نہیں سوجھا۔ یہ تین تین فصیلوں کی بجائے اگر ایسے گپت اسپیڈ بریکر بنوا دیتا تو اورنگ زیب کی فوج کے سارے گھوڑے ٹھوکر کھا کھا کے یہیں ڈھیر ہو جاتے تھے۔
لندن کے ماہر ٹرافک نے کہا "بھئی ایسے اسپیڈ بریکرز سے کیا فائدہ؟
ہم نے کہا "یار! ان سے شادی شدہ نہ ہوں تو فائدہ ہوتا ہے ورنہ نقصان"
اس نے ہنس کر وضاحت طلب کی۔
ہم نے کہا "دیکھئے ایک آٹو رکشا میں ایک کرکٹ کھلاڑی اور اس کی فیمیل کزن سوار ہیں۔ دونوں اس قربت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں لیکن ہمت نہیں پڑتی۔ اتنے میں آٹو رکشا ایک اسپیڈ بریکر پہ سے اُچھلتا ہے اور فیمیل کزن، میل کزن پر آگرتی ہے۔ میل کزن چونکہ کرکٹ کھلاڑی ہے اُسے دونوں ہاتھوں میں جھیل لیتا ہے اور عادتاً اس کے منہ سے "ہاوزٹ" نکل جاتا ہے۔ آٹو رکشا ڈرائیور پلٹ کر دیکھتا ہے اور انگلی اٹھا کر کہتا ہے "اِٹ اِز یور وکٹ سر" وہ خوب ہنسا "اور شادی شدہ ہوں تو؟"
ہم نے کہا "ایک جوڑا تھا جو سدا جھگڑتا رہتا تھا۔ بیوی کے گھر والے ان جھگڑوں کی خبروں سے بیزار ہو چکے تھے۔ ایک دن شوہر نے بیوی سے کہا "آج کے بعد ہم ایسا کبھی نہیں جھگڑیں گے۔
بیوی نے کہا "پکا وعدہ؟"

شوہر نے کہا "بالکل پکّا ڈارلنگ"
وہ بولی "تو پھر اسی خوشی میں نکالو ایک ساڑی کے پیسے"
شوہر اس دن بالکل حاتم طائی بن گیا تھا فوراً مٹھی بھر نوٹ اس کی طرف بڑھا دیئے۔
بیوی نے کہا "تو پھر ہم شاپنگ کر کے امّی کے گھر بھی جائیں گے" شوہر نے کہا "ضرور۔ ضرور"
دوسری صبح بیوی خوش خوش بازار گئی اور بہت سی چیزیں خریدیں اور سارے پیاکٹ اور ڈبے آٹو رکشا میں جما دیئے اور امّی کے گھر چلی۔ راستہ میں آٹو رکشا "اسپیڈ بریکر" پر سے اُچھلا اور بے چاری سڑک پر آ گری۔ سر پہ زخم آیا۔ لوگوں نے اس کے سر پہ پٹی باندھی، سامان دوبارہ آٹو میں جما دیا اور وہ دوبارہ روانہ ہوئی۔
اب جو گھر پہ آٹو رُکا تو وہ اس طرح اُتری کہ سر سے خون رِس رہا ہے اور سامان کے ڈبے اور گٹھڑیاں ساتھ ہیں۔ بیوی کے بھائی نے بہن کو جو اس حالت میں دیکھا تو سمجھا کہ بہنوئی نے اُسے مار کر زخمی کر کے گھر سے نکال دیا ہے۔ پس وہ چپکے سے پچھلے دروازہ سے نکل گیا اور بہنوئی کو چھرا گھونپ دیا۔
دوسرے دن اس نے کہا کہ وہ ٹرافک کی بہتری کے لیئے کچھ تجاویز پیش کرنا چاہتا ہے۔ اس نے کہا "ول مسٹر! آپ کے شہر کا دو حصّہ ہے ایک ندی کے اِدھر دوسرا اُدھر۔ ایک پُرانا شہر ہے دوسرا کم پُرانا۔"
ہم نے کہا "نیا اور پُرانا کہیئے"
وہ بولا "نو نو۔ ہم اس کو نیا نہیں کہہ سکتا۔ پُرانے شہر کا ٹرافک قابلِ دید ہے کم پُرانے شہر کا کم قابلِ دید"
ہم نے کہا "یار! تم وصیت نامہ لکھا ہے۔ الفاظ کے استعمال میں اس قدر احتیاط کی کیا ضرورت ہے"
اس نے کہا "یہاں دراصل فیملی پلاننگ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ آپ ٹرافک کو یونہی چھوڑ دیجئے۔ ٹکرا ٹکرا کر آدھی آبادی صاف ہو جائے گی" اب تجاویز سُنیئے . . .
"پہلی تجویز یہ ہے کہ آپ اپنے شہر کو ڈبل اسٹوری کر لیجئے جیسے ہم نے یورپ میں کیا ہے۔ زمین کے اندر ریلیں، سینما گھر، دوکانیں اور زمین کے اوپر کھلی سڑکیں"
ہم نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیئے کہ یہاں سمنٹ اصلی نہیں ملتی۔ اور نقلی سمنٹ بھی کنٹراکٹر کم ملاتا ہے نتیجہ یہ کہ جو بھی ایک بار زمین کے نیچے جائے گا کبھی اوپر نہیں آئے گا۔
اس نے کہا "تو پھر آپ یوں کیجئے کہ رکشے بند کر دیجئے چونکہ یہ سڑک کو گھیرے رہتے ہیں۔
ایک جمعدار نے کہا "پھر ہم کو کیا ملتا صاحب۔ ہم موٹر والوں کو تو چالان نہیں کرتے" وہ سمجھا نہیں
اس نے کہا "رکشے نہیں تو سیکلیں بند کر دیجئے"
ہم نے کہا "میاں انگریز! اس شہر کے لوگوں سے سیکل چھینوگے تو وہ جیتے جی مر جائیں گے۔ یہ سیکل ہی ہے جو اِن لوگوں کو دنیا کے سارے غموں سے دور رکھتی ہے۔ یہ نہ شیکسپیئر کو جانتے ہیں اور نہ شکنتلا کو۔ نئے شہر کا آدمی صبح سیکل گھر سے باہر لاتا ہے اور دس پیسے دیکر دونوں پہیوں میں ہوا بھراتا ہے۔ پُرانے

شہر کا آدمی خود ہوا بھر کر پمپ والے کو پانچ پیسے دیتا ہے۔ پھر وہ ہیں اور ان کی سیکلیں۔ شام تک شہر کا ایک چکر لگا کر دم لیتے ہیں۔"

وہ پوچھنے لگا "مگر یہ کم پتہ اپنے شہر کا آدمی پل پار کر کے پرانے شہر کو کیوں آتا ہے؟"

ہم نے کہا۔ "بڑی مجبوریاں ہیں صاحب ان کی۔ یہی دیکھئے اگر نئے شہر کا آدمی کپڑا خرید کر پاجامہ سلوا بھی لے تو کمربند خریدنے اسے پرانے شہر کو آنا ہی پڑتا ہے۔"

اس نے کہا "یہ اتنے جانور سڑک پر دوڑنے بھاگتے اور بیٹھے رہتے ہیں۔ آپ ان کو سڑک سے ہٹا دیجئے"

ہم نے کہا "واہ میاں انگریز۔ حیرت ہے تم کو اس ملک میں گھومنے کے بعد بھی انسان اور حیوان کا فرق یاد رہا۔ دیکھو میاں! جس طرح بنڈی میں بیل جُتا جاتا ہے اسی طرح رکشا میں آدمی جُتا ہوا ہے اگر تم اس انسان کو سڑک پر رکھو اور بیل کو ہٹا دو تو یہ بیل سے ناانصافی نہ ہوگی۔" پھر بھی تمہاری تجاویز تو اچھی ہیں۔ یعنی

یہ مسائل ٹرافک یہ تیرا بیان غالب"

مگر قابلِ عمل نہیں اور تم کو ان پر وقت اور اپنا ہارس پاور ضائع کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔

اس نے بگڑ کر کہا "واہ تو پھر مجھے کیوں بلایا گیا تھا؟"

ہم نے کہا "صرف اس لیئے کہ ہماری ٹرافک پولیس کے سالانہ بجٹ میں رقم بچ گئی تھی اور سال ختم ہو رہا تھا۔ اب آئندہ سال اسی بجٹ میں، میں تم سے اِنہی مسائل پر مشورہ کرنے لندن آؤں گا۔

"گڈ بائی۔ بی ہیپی اینڈ ویٹ فار می۔"

وہ بولا۔۔۔ "اوکے۔ مگر لندن آنا تو واپس ضرور جانا۔"

ارشد علی خان

آبِ رواں کے اندر مچھلی بنائی تو نے
مچھلی کے تیرنے کو آبِ رواں بنایا

یہ راز جس دن مینڈک پر کھلا اس نے پانی کو لات مار دیا اور خشکی پر نکل آیا۔ لات مارنے کی وجہ
۔اس کے پچھلے پیر کافی لانبے ہو گئے، ساتھ ہی خودی بھی بلند ہو گئی۔ کاش ہمارے سیاست داں اپنی کرسی
لات مارنا اس سے سیکھ لیتے!

اکثر سننے میں آیا ہے کہ مینڈک کے چار پیر ہوتے ہیں۔ جب سب کہتے ہیں تو حقیقت بھی یہی ہوگی غرض
لے پیروں کو وہ تختِ طاؤس کے طور پر استعمال کرتا ہے اور ہمیشہ اس پر براجمان رہتا ہے۔ اگلے پیر محض اس
ہیں کہ جب کبھی وہ تختِ طاؤس کو حرکت میں لائے تو وہ اسے سنبھال لیں۔ بس اس کام کے سوا اور کوئی خاص
، نہیں ہے ۔۔ اس عمل کو پھدکنا کہتے ہیں۔ اس کے پھدکنے میں جو وقار ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ (اگر
ب ہو جائے تو وہ بدنصیب ہے) جب وہ پھدکتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی فربہ شخص کرسی سمیت اچھل
رہا ہے!

مینڈک کو دو بڑی بڑی آنکھیں ہوتی ہیں، پلکوں اور ابروؤں سے یکسر پاک (ایسی آنکھوں ہی کو...
NAKED EY کہتے ہیں) جس کی بدولت وہ اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھتا ہے اور آنکھ مارنے کی بری عادت
بچا رہتا ہے۔

مینڈک کہاں سوتا ہے، کس طرح لیٹتا ہے اور اس کی مصروفیتیں کیا ہیں۔ اس پر کمیشن بیٹھنا ضروری ہے
ا اس سے دنیا آج تک ناواقف ہے۔ جس دن مینڈک کے اس سربستہ راز سے پردہ فاش ہوگا، دنیا

جنّت نشاں بن جائے گی۔

بعض سَنتِ قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ مینڈک ہمیشہ مَرن برت رکھتا ہے، بعض کا کہنا ہے کہ وہ مُون برت کا بھی ماہر ہے، البتہ جب بارش ہوتی ہے تو اس کی اَنا کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کسی تالاب کے کنارے صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔

مینڈک اور مینڈکی کی پہچان ایک دِقّت طلب مسئلہ ہے، لاکھ اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے باوجود یہ ہی نہیں چلتا کہ دونوں میں HE کون ہے اور SHE کونسی ہے۔ یہ مسئلہ خوش حال ملکوں کی آبادی کا ہے۔

مینڈک تجرد کی زندگی گذارنے کا عادی ہے۔ اُسے اپنی مادہ کا مطلق خیال نہیں آتا۔ اسمیں کچے برہمچاری کو اگر کوئی ریکارڈنگ کے ذریعہ مینڈکی کی یاد دلانے کوشش کرتا ہے تو وہ وہاں سے بھاگ نکلتا ہے۔ اُسے بھگانے کے لیئے یہ گانے آزمودہ اور مجرب بتائے جاتے ہیں۔

پہلا گانا : او ساتھی رے، تیرے بنا بھی کیا جینا

دوسرا گانا : ساون کے جھولے پڑے، تم چلے آؤ، تم چلے آؤ

تیسرا گانا : ہائے ہائے یہ مجبوری، یہ موسم اور یہ دُوری، میرا لاکھوں کا ساون جائے رے
ڈنگ ڈنگ، ڈنگ رنگ ... ڈنگ رنگ وغیرہ وغیرہ۔

مینڈک کو آج تک کسی نے پانی پیتے نہیں دیکھا پھر نہیں وہ کیا پیتا ہے۔ بہرحال یہ بتانا بے حد دشوار ہے کہ وہ کس طرح پانی پیتا ہے اگر کوئی دیکھ لے تو "ہول" میں مبتلا ہو جاتا ہے اور فوراً پانی میں ڈوب مرجاتا ہے۔ اس طرح یہ راز، راز ہی رہتا ہے۔

مینڈک کی آنکھوں اور پیروں کو جوڑنے کے لیئے پیٹ لگایا گیا ہے۔ ورنہ پیٹ کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اگر پیٹ الگ کر دیا جائے تو صرف آنکھیں اور پیر ہی تو رہ جاتے ہیں یہ صد آسان حساب ہے۔ اسکا سائنس کے طلباء کو مینڈک ہی پر طبع آزمائی کرائی جاتی ہے۔ اس کو چیرا پھاڑا جاتا ہے۔ صرف تین چیزیں ہی ہوتی ہیں آنکھیں، پیٹ اور پیر ___ پیٹ کے اندر کیا ہوتا ہے۔ یہ تو مینڈک بھی نہیں بتا سکتا ___

دنیا میں ہزاروں شاعر پیدا ہوئے لیکن کسی کو بھی مینڈک پر کچھ لکھنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی سب حسرت لے کر مرے (مینڈک کو بھی اس کی کوئی پرواہ نہیں ہے) پتہ نہیں شعراء حضرات حشر میں کیا جواب دیں گے ___ اس کو اگر پر نکل آئیں تو وہ خشکی کو بھی تیاگ کر جائے۔ یوں خشکی و آبی میں ایک دھوم مچ جائے۔

دنیا میں مینڈک اگر کسی کو محبوب ہے تو وہ ہیں سانپ اور چینی (دونوں ایک ہی نسل کے معلوم ہوتے ہیں جبھی تو انگریز چینی لوگوں کو زرد اژدہا کہتے ہیں) ان دو موذیوں سے اگر وہ کسی طرح بچ جاتا ہے تو طبعی موت مرتا ہے۔

کنویں اور سمندر کے مینڈک میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا، دونوں کی معلومات یکساں ہوتی ہیں

بالکل اسٹیٹ اور مرکز کے منسٹروں کی طرح ـــــ

مینڈک بڑا امن پسند جانور ہے، کھربوں سال کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس اہنسا کے پجاری نے کبھی کسی سے لڑائی نہیں لڑی نہ اپنی ذات برادری سے اور نہ غیر ذات والوں سے ـــ اگر وہ جنگجو ہوتا تو بحر و بر کا سب سے خطرناک جانور ہوتا ـــ لیکن بیچارہ لڑے گا بھی تو کس طرح ؟

ع لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مینڈک کے ناک اور کان نہ ہونے کی وجہ سے وہ عینک نہیں لگا سکتا، البتہ CONTACT LENSE استعمال کر سکتا ہے۔ کان کی عدم موجودگی کی وجہ سے وہ اپنی "ٹرٹر" سے اکتا تا نہیں، دوسرے اکتا جاتے ہیں، اس میں اس کا کیا قصور، اس سے فائدہ اٹھانے کی ایک ہی ترکیب ہے یعنی جب کسی مہمان کو بھگانا مقصود ہو تو ایک درجن مینڈک چھوڑ دیئے جائیں ـــــ

بعض بہتان تراش حضرات کہتے ہیں کہ مینڈکی انڈے دیتی ہے اور مینڈک بڑی شان سے انھیں سیتا ہے۔ بھلا ایسے واہیات کاموں کے لیئے اسے وقت کہاں ملتا ہوگا۔ اگر فی الواقعی انڈے موجود ہوتے تو ضرور ہوٹلوں میں دستیاب ہوتے۔

مینڈک اعلیٰ ذات کا ہے یا کہ ادنیٰ اس کا پتہ ہنوز نہ مل سکا۔ ویسے وہ خود اپنی ذات سے بیزار نظر آتا ہے جہاں تک عقیدے کا تعلق ہے اس معاملہ میں وہ کافی کمزور نظر آتا ہے چنانچہ وہ کبھی پانی پر بھروسہ کرتا ہے اور کبھی خشکی پر ـــــ

بہرحال مینڈک ہر ایک کی سمجھ سے بالا تر ہے۔ اس کو سمجھ لینا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں

ع اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں۔

ساری دنیا مینڈک کی جیسی قدر کرنی چاہیئے نہیں کرتی۔ آئندہ دو چار سو سال بعد اُمید کی جاسکتی ہے کہ اس کی قدر و منزلت شروع ہوجائے گی ـــ دراصل وہ کھربوں سال پہلے غلطی سے پیدا ہوگیا تھا ـــ عموماً بڑی چیز یوں ہی پیدا ہوجاتی ہے مطالعہ سے یہ بات روشنی میں آتی ہے کہ اس کی تحقیر کی وجہ ـــ اس کی اپنی کمزوری ہے۔ اگر اسے ہاتھی کی سونڈ، گھوڑے کی رفتار، لومڑی کی چالاکی، شیر کا دل اور گدھے کی دولتی مل جاتی تو ساری دنیا خود بخود اس کے آگے جھک جاتی۔ کم از کم وہ دودھ دینا شروع کر دیتا تو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ـــــ

قدیم حکماء کے اقوال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اگر اس کو ٹھنڈے پانی میں اُبال کر سالم نگلا جائے تو بیمار کو دو تین دن کوئی بیماری نہیں آتی، صرف موت آتی ہے۔ اسی طرح اس کی "ٹرٹر" متواتر ڈیڑھ گھنٹہ پابندی سے کسی اختلاج قلب والے کو سنایا جائے تو اختلاج ختم ہوجاتا ہے، اسی طرح حرکت قلب بھی بند ہوجاتی ہے۔ بعض اوقات غلطی سے جُلاب شروع ہوجاتے ہیں، لہٰذا ہوشیاری اور کمال احتیاط لازمی ہے۔

اس مضمون کو قلم بند کرنے کا مقصد سوائے اس کے کچھ اور نہیں کہ مینڈک اسے بغور پڑھ کر عبرت حاصل کرے اور اپنی دھاک سارے عالم پر بٹھانے کی بھرپور کوشش کرے جس طرح ہٹلر نے کی تھی۔

"میں کوئی وقت نہیں ہوں کہ گذر جاؤں گا"

[illegible]

میں اگر دیگِ سیاست میں اُتر جاؤں گا
جھوٹ کی آنچ پہ تپ تپ کے نکھر جاؤں گا

طنز کی اوٹ سے دیتے ہیں جو بندر بھکی
وہ نہ سمجھیں کہ میں اس جھانسے سے ڈر جاؤں گا

سر پہ منڈلاتا رہوں گا ترے مانند اجل
"میں کوئی وقت نہیں ہوں کہ گذر جاؤں گا"

دشمنِ فن کو نگل جاؤں گا مثلِ خرگوش
جس گھڑی شیر کی مانند بپھر جاؤں گا

وہ تو بادل سے بھی آگے نہ پہنچ پائیں گے
اور میں تا حدِ خورشید و قمر جاؤں گا

اپنے حاسد کو ذرا اور جلانے کے لیئے
اس کے گھر لے کے میں شہرت کا شجر جاؤنگا

فکر کی گھاس نہیں کھاتا مرا اسپِ سخن
لے کے میں اس کے لیئے فن کا مٹر جاؤں گا

خانہ داماد کا ہے حشر نگا ہوں میں مری
بھول کر میں نہ کبھی ساس کے گھر جاؤں گا

وہ تو بیمار ہیں پھر کھانا بنے گا کیسے
لے کے بازار سے میں نان بُڑ جاؤں گا

فکر کی بوجھ سے زلفوں کی طرح بکھرا ہوں
میں ترے حسن کے درپن میں سنور جاؤں گا

دل جو ممکن نہیں، رخسار کا تل ہی دیدے
تیرے در سے یہی موتی لیئے گھر جاؤں گا

دیکھیئے کون سی چیز اُن کو پسند آتی ہے
لے کے ان کے لیئے میں قلب و جگر جاؤں گا

نازنیں کوئی سرِ راہ نہ گھس جائے کہیں
بھول کر میں نہ کبھی دل کا شہر جاؤں گا

لاٹھیاں برسیں کہ بم گالی کے پھینکے جائیں
حشر جو بھی ہو ترے در پہ مگر جاؤں گا

تیرے ہی نام سے لکھوں گا یہ دل کا بنگلہ
کون کہتا ہے کہ وعدے سے مُکر جاؤں گا

قہقہے پھوٹیں گے ہر شخص کے لب سے جوہر
میں جہاں لے کے ظرافت کا گہر جاؤں گا

غزل

نشتر امروہوی

روز دَورِ شراب ہوتا تھا
روز انڈے کباب ہوتا تھا

بے اثر ہوگئی ہیں فارن کی
کوئی دیسی شراب ہوتا تھا

مانگ میں اک طرف سفیدی ہے
اور گہرا خضاب ہوتا تھا

ہوا نازل بہ صورت بیگم
جو بھی مجھ پر عذاب ہوتا تھا

جس کو پڑھ کر گدھے بنیں انساں
کوئی ایسی کتاب ہوتا تھا

قبر عاشق کی بن گئی دلدل
اس کی مٹی خراب ہوتا تھا

گائے کہتی تھی اس الکشن میں
بیل کا انتخاب ہوتا تھا

دل حسینوں کا جیتنے نشتر
نقد زر بے حساب ہوتا تھا

ہاں ہاں اچونکیے مت صاحب "بزم زندہ دلاں مردہ دلوں کی بستی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ سرخی تو
ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ آپ چونکیں اور ہمارے مضمون کو پڑھیں۔ کیونکہ ایسی ہی کئی چونکنے والی
وارداتیں ہمارے ساتھ ہو چکی ہیں۔ ہر صبح ناشتے سے پہلے اخبار کی صورت میں خبریں میز کی سطح
پر چھپ کر گھات لگا لیتی ہیں اور تاکتی رہتی ہیں ہماری صورت کو کہ کب ہم
انھیں پڑھ سکیں اور کب اپنے سکون کا قلع قمع کر دیں۔

نجمی (بمبئی)

بزم زندہ دلاں مردہ دلوں کی.....

وارداتیں ہم ان خبروں کو اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ایک دن
ہمارے پڑوس سے علی الصبح رونے پیٹنے
کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم نے سوچا شاید
ان کے یہاں سے
بھی کوئی
"فوت"

۔
۔ زور سے
ۓ وانا الیہ راجعون"
ر مرنے والے کی بخشش کی دعا مانگی۔ اور
ں کے دروازے کی گھنٹی دبا دی۔ دروازہ کھلا۔ اور
ہی بھاری بھرکم جسامت والی ایک خاتون روتی پیٹتی ہمارے
سے لپٹ گئیں اور مرحوم کی خوبیوں کو (جو ان کی زندگی میں ان کی خامیاں تھیں)
یک کر کے گنوانے لگیں۔ ہم سے جہاں تک بن پڑا ہم نے تسلی دی۔ اور مرحوم کا آخری دیدار
یا۔ پتہ چلا کہ مرحوم فی الحال ایرپورٹ پر ہی ہیں۔ وجہ یہ تھی کہ آج صبح کے اخبار میں انھوں نے یہ خبر پڑھی
دم جس جہاز سے بمبئی آنے کے لیے روانہ ہوئے تھے، اُس جہاز کو حادثہ پیش آیا ہے۔ گھر کے مرد، مرحوم کی بچی کھچی نعش کو سمیٹ
، دفن کا بھی معقول انتظام ہو چکا ہے۔ ہم نے سوچا واقعی مرنے والا اگر گھر میں دم توڑتے تو کم سے کم اپنوں کی نزدیکی کا احساس تو ہوتا ہے۔
سی کو ایسی بے چارگی کی موت نصیب نہ کرے۔

رفتہ رفتہ آنے والیوں سے پرسا دینے والوں سے مرحوم کا بھرا پُرا گھر بھر گیا تو ہم نے سوچا کہ اپنا کمرہ کھول کر پڑوسی ہونے کا حق ادا
ب۔ مگر ہمارا کمرا کھولنے سے پہلے ہی مرحوم زندہ، صحیح سلامت اسی جہاز سے خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ اب ہمارے چونکنے کی باری تھی۔ لہٰذا

گھر کے افراد تو وہ لوگ جو مرحوم کی خوبیاں رو رو کر گنوا رہے تھے۔ اب اخبار والوں کی سات پشتوں کی خامیوں کو انگلیوں پر گن رہے تھے۔ ا
لیے نہیں کہ مرحوم زندہ سلامت لوٹ آئے تھے بلکہ اس لیے کہ مہنگائی کے اس دور میں خواہ مخواہ کفن دفن کا خرچ اور پرسا دینے والوں کی چا
کے صرفے کا بار ان پر پڑ گیا تھا۔ اخبار کی خبر میں صرف "آنے" اور "جانے" کی غلطی کاتب سے ہوئی تھی اور بس باقی خیریت تھی۔ دراصل حاد
نہیں پیش آیا تھا۔" جانے والے جہاز" کو اور اخبار میں چھپ گیا۔ آنے والا جہاز حادثہ سے دوچار ہو گیا۔

اب ہمارے لیے ایسی خبریں زیادہ اہمیت اس لیے بھی نہیں رکھتیں کہ ہم خود بھی ایک ایسے ادارے سے منسلک ہو چکے ہیں۔ جسے
عرف عام میں "شعبہ اشتہار بازی" کہا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر اوڑھنے، پہننے، جینے مرنے کے سا
تک کی پبلسٹی ہوتی ہے۔ ہم راست کانوں سے بات کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں عوام کی آنکھوں کو تکلیف دینے سے پرہیز کیا جاتا ہے؟
بھی ملاوٹ کے اس دور میں کون سی شئے خالص ہے، جسے دیکھنے کے لیے بینائی کو خواہ مخواہ تکلیف دی جائے۔ ہاں تو صاحب ہم ریڈیو پبلـ
سے وابستہ ہیں۔ ہمارے یہاں کڑوی گولیوں کو بھی شکر میں لپیٹ کر دینے کا قانون رائج ہے۔ پہلے تو ہم ہر خاص و عام کو فلمی موسیقی کی ل
کے جال میں پھانس لیتے ہیں۔ اور جب سیدھی سادی جنتا ہمارے جال میں پھنس جاتی ہے تو ہم اشتہار بازی پر اتر آتے ہیں۔ "محبت
اندھی ہوتی ہے۔" کی مثال کو اپناتے ہوئے ہمارے ہر کہے سنے کو "آمنا صدقنا" کہتے ہوئے گرہ میں باندھ لیتے ہیں اور اپنی گرہ کی جمع پو
کو ہارنے لگتے ہیں۔

ہماری اشتہار بازی میں عوام کے لیے فلموں کی پبلسٹی بھی شامل ہے۔ اب اسے جنتا کی "اندھی محبت" نہیں بلکہ گونگی اور بہری محبت
نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ ایک بار ہمارے پاس ایک فلم پبلسٹی کے لیے آئی۔ ہمیشہ کی طرح ہم نے زور و شور کے ساتھ کہا " فلاں پروڈیوسر کی
دھماکے دار، ایکشن پیکٹ فلم۔ جھومے جھومے دل مرا۔ جس میں پہلی بار دیکھئے۔ ہیما مالینی کی باہوں میں دھرمیندر کو" لوگ سنتے رہے
جھنتے رہے ہمیں داد دیتے رہے۔ اور جوق در جوق فلم دیکھنے جاتے رہے۔ یہ تو بھلا ہو ہماری اس عادت کا کہ ہم اپنی ریکارڈ کی ہوئی آواز دوبارہ
سننے کے عادی ہیں۔ جب ہم نے سنا کہ ہم "جھومے جھومے دل میرا" فلم کے ریڈیو پروگرام میں جھوم کر کہہ گئے ہیں تو ہمیں جونک کاٹنے لگی اور
ہم نے پروگرام کا ٹیپ ریڈیو اسٹیشن سے واپس منگوایا۔ اپنی غلطی درست کی اور ہیما مالینی کو دھرمیندر کی باہوں میں پہونچا کر ہی دم لیا۔

ایسے انسان کی ہمیشہ ہی مٹی پلید ہوتی ہے جو سچ بولنے کو ایمان سمجھتا ہو۔ اور اپنا پیٹ کے لیے مبالغہ آمیز باتیں کرنے کا
بھی سزا وار ہو۔ اس دوغلے گناہ سے بچنے کے لیے ہم اکثر ایسا بھی کرتے ہیں کہ فلم کے بارے میں ساری جھوٹی سچی کہنے کے بعد
اپنے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے غیر شعوری طور پر پروگرام کے آخر میں ریکارڈ لگا دیتے ہیں۔" جھوٹ بولے کوا کاٹے "۔ مانا کہ اس سے
سارے گناہ تو معاف نہیں ہو جاتے نہ ہی عوام کی بد دعائیں دامن چھوڑتی ہیں، مگر بوجھ قدرے ہلکا اور بد دعائیں کم اثر ہو جاتی ہیں

ویسے بھی اس ملاوٹی دور میں آپ کس کس شئے کے خالص ہونے کا ذمہ لے سکتے ہیں۔ دعاؤں، بد دعاؤں اور کوسنوں تک
میں ملاوٹ ہونے لگی ہے۔ بیوی کوسنے کو تو میاں کو کوس لیتی ہے۔ میاں ناراض ہوتے ہیں، گھر کی فضا مکدر ہوتی ہے تو کہہ دیتی ہے۔ اجی جی
بُرا کیوں مانتے ہو، تم تو جانتے ہی ہو میں دل کی بُری نہیں ہوں، بس ذرا زبان بُری ہے اور پھر دل سے کب کچھ کہتی ہوں۔ خدا میری نیت
پہچانتا ہے۔ خدا گواہ ہے میری نیت کبھی بُری نہیں رہی "۔ ہاں صاحب خدا کے دربار میں نیت سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

لگے ہاتھوں ہم آپ کو ایک بات اور بھی بتاتے چلیں کہ ان کوسنوں اور بد دعاؤں کا اثر ہوتا ہو، یا نہ ہوتا ہو، مگر بعض اوقات
شعبہ پبلسٹی کے کرتا دھرتا اور ان کے ساتھی اچھی خاصی زندگیوں میں ہلچل مچا دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قدرت نے زبان جیسی انمول

نے انھیں دی ہے۔ اس کا جائز استعمال یہ ہے کہ زبان کو تالو سے لگائیے۔ الفاظ کو سانچوں میں ڈھالیے، اور جو کچھ بھی کسی کے بارے میں کہنا ہو بلا تامل کہہ ڈالیے۔

بناوٹ کی اس دنیا میں وہ لوگ جو زیادہ بناوٹ اور مصنوعات کے قائل ہوتے ہیں ان کا شمار سرپٹ دوڑنے والے گھوڑوں میں ہوتا ہے۔ چاہے یہ اندھا دھند دوڑ کسی کنویں ہی میں کیوں نہ ڈھکیل دے۔ رہے سادگی اور نفاست پسند لوگ۔ تو وہ اگر ریس میں دوڑنے والے گھوڑے بھی ہوں، تب بھی تانگے میں جوت دیئے جاتے ہیں۔

بناوٹ اور جھوٹی تعریف کا عمل دخل زندگی میں اس قدر رچ بس جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر اوقات اپنی تعریف اپنے کپڑوں کی تعریف اور میک اپ کی شان میں قصیدے سننے کی خاطر آپ کے سادہ کپڑوں کی تعریف کی جاتی ہے۔ جواباً آپ مسکرا کر کہتے ہیں کیوں دروغ گوئی سے کام لے رہی ہیں۔ ہمارا شمار ہی کیا آپ تو برسوں تک کسی کی ساڑی کو Repert نہیں کرتیں۔ جواباً وہ اپنے پورے بتیس دانتوں کی نمائش کر دیں گی اور ساتھ ہی اپنے کپڑوں کی پوری تاریخ سنا کر اچھی خاصی پبلسٹی کریں گی۔

یہاں اور سب کچھ تو ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بے چارے ادیب اور شاعر یہاں بھی بخشے نہیں جاتے۔ اکثر و بیشتر نوسکھے ادب کے الف۔ ب سے ناواقف لوگ کرسیوں کے مالک ہوتے ہیں۔ جب کوئی ادیب اپنا لکھا ہوا شاہکار پیش کرتا ہے تو اس کی ایسی مٹی پلید کر دی جاتی ہے کہ اچھا خاصا غالب کا شعر کسی نابالغ کا شعر بن جاتا ہے۔ جیسے شن کر بچے بھی داد نہیں دیتے۔ اکثر اوقات تو غریب شاعر یا ادیب اپنا شاہکار ڈھونڈھتا ہی رہ جاتا ہے۔ پھر یہ کہہ کر دل کو تسلی دے لیتا ہے کہ چلو شاہکار گیا تو گیا، خون پسینے کی اس لکھائی کی روٹی سے کم سے کم بچوں کے خون میں چند قطرے تو جمع ہو ہی جائیں گے اب رہ گئے ہم، تو ہم بس ایسے لوگوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھتے ہی رہتے ہیں اور کڑھنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں

ہمارا سب سے بڑا جرم تو یہ ہے کہ ہم سمندر میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرتے ہیں۔ سطحی طور پر ہم نے اس ماحول کو اپنایا ہو تو اپنایا ہو، مگر اندر سے ہم بالکل کھرے اور سچے انسان ہیں۔ ہمیں بناوٹ سے قطعی نفرت ہے۔ ہاں مبالغہ آمیزی تھوڑی بہت کر بھی لیتے ہیں تو وقت اور حالات کے تقاضے کی بنا پر۔ پھر ایک وجہ تسلی یہ بھی ہے کہ ریڈیو پبلسٹی کا کام کرتے ہوئے ہمارے گناہوں کا بوجھ چاہے کتنا ہی بڑھ کیوں نہ گیا ہو مگر ایک اچھی، وفا شعار، غمگسار، وفادار، خیر خواہ بیوی ہونے کے ناطے ہم ہمارے سرتاج کا حق تذکرہ جیسا پوری طرح ادا کرتے ہیں ان کی پبلسٹی کرکے۔

شعبۂ اشتہار بازی کو اپنانے کے بعد ایک تغیر ضرور آیا ہے۔ ہماری زندگی میں اب پڑھنے سے ہمارا تعلق قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے نہیں مرحوم کے پرسہ دینے والوں کے لیے ہم نے کمرہ کھولنے کی کوشش کی تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اب ہمارا شمار بھی انھوں نے "بوگس خبروں" کالی سرخیوں اور سستی اشتہار بازی کرنے والوں میں شامل کر لیا ہے مگر جہاں تک ہماری سمجھ کا تعلق ہے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اشتہار بازی کرتے ہیں۔ مگر وارداتوں کی حد تک نہیں۔ مبالغہ آمیزی کرتے تو ہیں مگر ایمان داری کے سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے۔ اب اخبار پڑھ کر ہم اپنے دل کو نہیں دہلاتے نہ اپنی بینائی کو زک پہنچاتے ہیں بلکہ ریڈیو کا سوئچ آن کر کے اپنی ہی کڑوی کسیلی گولیوں، کی تلخی کو کم کرنے کے لیے اپنے سرتاج کی اُن (ایوارڈ) شیلڈ کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جو یاد ہیں ہمارے مجازی "ماشاءاللہ میاں" نے فادر مدر غذا کا کام ہمارے حق میں ادا کرتی ہیں۔ مجازی خدا کو نہ دیکھتے ہوئے شیلڈ کو دیکھنے کا کام تو ہم من مار کے، دل مسوس کے کرتے ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہمیں مبالغہ آمیزی کی مزید مشق کے لیے روانہ ہونا ہوتا ہے اور ہمارے مجازی خدا صرف سچ بولتے ہیں۔ اور سچ کے سوا کچھ نہیں بولتے۔

کرگس سہوانی

میخانے میں

بھول کر آئے جو کرگس کبھی میخانے میں جوتیاں چلنے لگیں شیشہ و پیمانے میں
خم میں، شیشے میں، غرض جو بھی ہو میخانے میں ساقیا سب ہی الٹ دے مرے پیمانے میں
وقت کے ساتھ ہر اک چیز کا بدلا ہے مزاج ایک الّو نظر آتا نہیں ویرانے میں
مرے حصے میں جو آتی ہے وہ گر جاتی ہے ہاتھ میں رعشہ ہے یا چھید ہے پیمانے میں
ہائے رے عشق میں کچھ ایسا کچھ مر نکلا کوئی مستی نہ رہی اب ترے دیوانے میں
کوئی پیتا ہے، کوئی دیکھ کے رہ جاتا ہے کیسا اندھیر ہے ساقی ترے میخانے میں
پھر وہیں کھینچ کے لے جانے کو دل کہتا ہے جس جگہ تھوڑی کسر رہ گئی مر جانے میں
جو بھی سنتا ہے وہ ہنستا ہے اڑاتا ہے مذاق کوئی خامی ہے یقیناً مرے افسانے میں
ہم کو معلوم تھا گو لاکھ مآلِ الفت پھر بھی آنا ہی پڑا آپ کے بہکانے میں

کوچۂ یار کے پھیروں پہ لگائے پھیرے
عمر کرگس کی کٹی جوتیاں چٹخانے میں

اظہارِ محبت

شادی کی خبر سُن کے مسرت سی لگے ہے انجام مگر سوچ کے دہشت سی لگے ہے
یہ مجھ سے جدائی کی کرامت سی لگے ہے یعنی ترے چہرے پہ نحوست سی لگے ہے
کرنے کو تو بیٹھا ہوں اظہارِ محبت اب غور کیا ہے تو حماقت سی لگے ہے
سچ کہنے کو جی میرا بہت ہوتا ہے لیکن جھوٹ اس لیے بولوں ہوں کہ لذت سی لگے ہے
تھانے کے رجسٹر میں سہی "ہسٹری شیٹر" چہرے پہ مگر اس کے شرافت سی لگے ہے
ممکن ہے کہ عذرا کو ہو وامق سے محبت یہ گذری ہوئی بات حکایت سی لگے ہے
ہر شب وہ مری جیب کا لے لیتے ہیں جھاڑا یوں وصل کی ہر بات حجامت سی لگے ہے
گننے بھی میں لگتا ہوں جو فرمائش اُن کی سچ جانیئے الفت بھی تجارت سی لگے ہے
بیوی مری جا پہنچی ہے گو ساٹھ کے لگ بھگ چہرے پہ مگر اب بھی ملاحت سی لگے ہے
"ہسٹر" جو بنی گرل، تو "مس" بن گئے لڑکے کردار سے دونوں کے ندامت سی لگے ہے
لے سکتا ہوں ٹکر تو میں ہر ایک بلا سے چاہت کے مگر دیو سے وحشت سی لگے ہے

کرتا ہے سدا نظم وہ سب بے تکی باتیں
اب شاعری کرگس کی حماقت سی لگے ہے

مختار یونس
(مالیگاؤں)

رُخِ محبوب کا جغرافیہ

محلِ وقوع :

محبوب کا چہرہ جزیرہ نما ہے اس کے تین طرف زلفوں کا سمندر ہے اور جنوب میں دھڑ پایا جاتا ہے۔ گردن کا سہارا پاکر چہرۂ مبارک محوری گردش کرتا ہے۔ "انکار" کی حالت میں محوری گردش تیز تر ہو جاتی ہے۔ اس تیز محوری گردش سے عاشق کی دنیا تاریک ہو جاتی ہے۔

آب و ہوا :

مزاج یا موڈ کو جغرافیۂ عشق میں آب و ہوا کہتے ہیں۔ عاشق کی موجودگی میں آب و ہوا گرم شدید اور تند و خشک ہوتی ہے۔ رقیب کے آتے ہی آب و ہوا تبدیل ہو جاتی ہے۔ معتدل و خشک ہوا کے جھونکے چلنے لگتے ہیں۔

بارش :

غم کے عالم میں گالوں کے گلابی میدان میں آنسوؤں کی موسلا دھار بارش ہوتی ہے (تقریباً ۸۰" انچ)۔ اشکوں کے سیلاب میں عاشق و رقیب کے قلب و جگر بہہ جاتے ہیں۔ معشوق بعض اوقات اشکوں کی "مصنوعی بارش" بھی برساتا ہے (کسی خاص مقصد کے تحت) مورخین کا کہنا ہے کہ بارش نمبر دو میں معشوق کی فرمائش پوری ہوتی ہے اور عاشق کی جیب میں خلاء پیدا ہوتا ہے۔

اہم مقامات :

جنگلاتی خطہ : سر کے چٹیل میدان میں زلفوں کے گھنے جنگل ہیں۔ سیاہ لچک دار بیلیں بکثرت اُگتی ہیں جسے شرفاء گیسو کہتے ہیں۔ اس جنگل کے میدان سے ایک پگڈنڈی گزرتی ہے جسے عاشق صاحبان "مانگ" کہتے ہیں۔ یہ مانگ رنگوں سجانے کے کام آتی ہے۔ بعض معشوق صفت برادرے کی کہکشاں سجاتے ہیں اور بعض سیندور چھڑک کر سہاگن بن جاتے ہیں۔ گیسوؤں کے جنگل میں صرف "جوں" نامی جانور رہتا ہے۔ تجربہ کار عشاق

کہتے ہیں "یہ جوں محبوب کے کانوں پر رینگتی ہی نہیں۔ محبوب کا سر ہمالیہ سے کم نہیں۔ اس میں بھی چوٹیاں ہوتی ہیں جسے آج تک کوئی عاشق سر نہیں کر سکا۔ غالب نامی سیاح نے اپنے سفرنامہ میں تحریر کیا ہے کہ
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

پیشانی کا سطحِ مرتفع :

بالوں کے نیچے پیشانی کا "سلوٹ نما میدان ہے۔ گرمی کی شدت سے، گھبراہٹ کے عالم میں اور حیا کے آنے سے اس میدان میں پسینے کے شبنمی چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ پیشانی کے صدر مقام پر بندیا ہوتی ہے۔ اس بندیا کے کر ہوائی اڈہ پر نگاہ عاشق "کے طیارے اترتے ہیں اور محبوب "رنگا خوش" ہو جاتا ہے۔

ہلالی گھاٹ اور جھیل :

پیشانی کے جنوب میں "ابرو" کے ہلالی گھاٹ ہیں جن پر "سیاہ سبزہ" اگا ہوا ہوتا ہے ماہر عشقیات کی نظر میں یہ بھی اسلحہ جات ہیں۔ بعض اسے کٹار کہتے ہیں اور بعض خنجر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہ مشرقی اور مغربی گھاٹ آنکھ کی دو جھیلوں کے کنارے واقع ہیں۔ یہ "نین جھیل" بہت گہری ہوتی ہے۔ اس میں اشکوں کے سوتے جاگتے ہیں۔ اس میں مگرمچھ کے آنسو بھی ہوتے ہیں جو ٹسوے بہانے کا کام کرتے ہیں اس جھیل کی پرسکون سطح پر کبھی کبھار غم و غصہ، پریشانی و حیرانی کے مدوجزر اٹھتے ہیں جو عاشقوں کو حیران و پریشان کر دیتے ہیں۔
نیند کی نشیلی گھٹا چھاتی ہے تو اس جھیل کو پلکوں کے کواڑ ڈھانک دیتے ہیں اور جھیلوں کا علاقہ "ڈریم لینڈ" بن جاتا ہے۔

گلابی میدان :

نقشۂ محبوب میں جھیلوں کے نیچے رخساروں کے گلابی میدان ہیں جن پر "غازہ" کی گرد جمی ہوتی ہے۔ اس میدان میں اکا دکا "تل آباد" ہیں۔ گویا تل دھرنے کی کافی جگہ ہے۔ اس گلابی میدان پر اردو و فارسی کے شعراء نے اپنے قلم سے یا رہا ہل چلایا ہے اور دیوان کے خرمن کھڑے کر دیئے ہیں۔

کوہِ ناک :

گلابی میدان کے بیچ شمالاً جنوباً ایک پہاڑ کھڑا ہے جسے کوہ ناک کہتے ہیں اس نوک دار پہاڑ میں دو قدرتی سرنگیں ہیں جو درّہ کسار اگھاٹ کی یاد دلاتی ہیں۔ موسم سرما میں زکام کی حالت میں ان سرنگوں میں لوکل ٹرینیں چلتی ہیں جو دادر آتی ہیں اور پھر واپس چرچ گیٹ وبوری بندر اسٹیشن کو لوٹ جاتی ہیں۔ عام دنوں میں یہ کوہ ناک خوشبو و بدبو ٹیسٹ کرنے کی تجربہ گاہ ہے۔

وادیِ دہن و زبان :

ناک کی ترائی میں ہونٹوں کا کمپا ونڈ ہے جو عاشقوں کے لیے صحت افزا مقام بھی ہے اور عشق افزا مقام بھی اس پر لپ اسٹک کا پلاسٹر چڑھا ہوتا ہے یہیں سے دہن مبارک کی زمین دوز دنیا شروع ہوتی ہے۔ دانتوں کے پہاڑی سلسلے اوپر نیچے "جبرالٹر" تک پھیلے ہوئے ہیں۔ گویا بندھیاچل کے سلسلے نے کوہ ست پڑا "گھونگھٹ پڑا"

کردیا ہو۔ یہ پہاڑی سلسلے "بنا کا برانڈ" معلوم ہوتے ہیں۔ دانتوں کے سلسلے کے درمیان گوشت کی متحرک سڑک ہے جسے زبان کہتے ہیں۔ یہ سڑک "خلیج حلق" کے نیچے تک جاتی ہے اس سڑک کے مسافر کا نام "مسٹر لقمہ" جو دانتوں کے "سنگ میل" سے بڑھتے بڑھتے معدہ کی کھائی میں گرجاتا ہے۔ یہ زبان کئی زبانیں بولتی ہے مثلاً مادری زبان راشٹر بھاشا وغیرہ زبان و حلق کے نقطۂ وصال پر ایک ریڈیو سٹیشن ہے جہاں سے گانے بھی نشر ہوتے ہیں اور نقرئی گالیاں بھی گویا "زبان شریف" کثیر المقصد (Multipurpose) ہے

کان کی دولت :

میدان رخسار کے مشرق و مغرب میں جبڑوں کے اوپر کان واقع ہیں جو ہمیشہ چوکنے رہتے ہیں۔ ان کانوں میں سونے چاندی اور پیتل کی دولت ہوتی ہے (بالیوں اور ایرنگ (Ear Ring) کے روپ میں) کان کی گہرائی میں سینما اسکوپ پردہ ہوتا ہے جس سے عاشقوں کی فریادیں ٹکرا کر ناکام لوٹ جاتی ہیں۔ یاد رہے محبوب کے کان آہ و زاری سننے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ زیورات کی نمائش کے لیے "آرٹ گیلری" ہوتے ہیں۔

نوٹ : اس جغرافیہ حسن کو داخلِ نصاب کرنے کی محکمہ تعلیم کو پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

(مصنف)

تمام مرد (بے چارے شادی شدہ) اس بات پر متفق ہیں کہ عورتیں شوہر کی جان اور پڑوسن کا پان کھانا اپنا بنیادی حق تصور کرتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا جبکہ لوگ اپنے پڑوسیوں کا مرغ ہڑپ کر جاتے اور اس طرح اپنے چہرے پر سرخی لاتے۔ پر اب وہ معاشی خوش حالی اور پڑوسیوں کی مرغیاں کہاں ؟

چنانچہ اب وہ بجائے مرغ کے پان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ مقصد تو بہر طور سرخی سے ہے۔ لیکن ہم جو واقعہ بیان کر رہے ہیں وہ ہماری جان کے مابین کشمکش سے عبارت ہے۔ ہوا یوں کہ ہمارے چپراسی ولی احمد کہیں سے دو چار پان کے بیڑے بندھ کر لائے۔ اور جلدی میں تمباکو زدہ بیڑہ ہمیں تھما دیا۔ ہم پورے خلوص اور اُن سے اندھی محبت کے پیش نظر سارا پان مفت کا سمجھ کر ہڑپ کر گئے۔ کام و دہن کی گذر گاہوں سے ہوتا ہوا جب وہ ہمارے شکم میں پہنچ کر اپنا رنگ دکھلانے لگا تو ہمیں دن میں تارے نظر آنے لگے اور ہم پر غشی چھانے لگی۔ نیم وا آنکھوں سے ولی احمد کو دیکھا، ذہن میں غالب کا مصرعہ گونجا "تجھے ہم ولی سمجھتے۔" وہ بے چارہ ندامت اور گھبراہٹ سے زردہ کی بدولت زرد و سرد ہو رہا تھا۔

ہمیں ایک آرام دہ کرسی (جسے خود آرام کی ضرورت تھی) پر لٹایا گیا۔ ہمارے ساتھی پروفیسر ڈاکٹروں کی ایک ماہر ٹیم کی طرح ہم کو گھیرے ہوئے تھے۔ ہماری نظروں کے سامنے بیمہ اور پراویڈنٹ فنڈ کی جمع شدہ رقومات کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ ہم نے اپنے لواحقین و پسماندگان کی جملہ تعداد کی مناسبت سے ان رقومات کو تقسیم کیا اور حاصل ہندسہ نکالا تو معلوم ہوا کہ ہر ایک فرد کے حصے میں آنی رقم آنے والی ہے کہ ہمارا جینا اور مرنا برابر تھا۔ اس لیے اپنے آخری سفر کے لیے تیار ہو گئے۔ اُدھر کسی نے رائے دی کہ جب تک ان کو قے نہیں ہوگی آرام نہیں ہوگا۔ اب قے ہو تو کیسے ہو۔ سیاسیات کے پروفیسر نے لپک کر تازہ اخبار اٹھایا اور صفحۂ اول کو ہمارے آگے کیا۔ یہ صفحہ سیاسی قائدین کی تصاویر، سیاسی خبروں، جماعتی بے وفاداریوں اور بلند بانگ وعدوں پر مشتمل تھا صفحہ دیکھتے ہی ہمیں قے ہوئی پان باہر نکل آیا۔ اور ہمیں سکون نصیب ہوا۔

ہمارے معاشرے میں آن بان شان کے علاوہ پان بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ہر زمانہ اور ہر دور میں پان تاریخ کا ایک لازمی جز رہا ہے۔ اسی پان کا بیڑا اٹھا کر بہادر کسی عزم کا عہد کرتے تھے۔ اگلے وقتوں میں صرف صاحبِ آن بان اور شان جو حویلیاں بھر دھان والوں کو ہی پان نصیب ہوتا تھا۔ اب تو خیر جمہوری دور ہے اور بلا ذات و پات سبھی اس پتہ کے شائق ہیں۔ اب کوئی کسی کو پان چباتے دیکھ کر اُسے ٹوک نہیں سکتا۔ ورنہ وہ آپ کے لباس اور چہرہ پر پان کی گل کاری سے تجریدی آرٹ کے نمونے پیش کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ آزادیٔ خورد و نوش سب کا بنیادی حق ہے۔

قومی یک جہتی کی سچی تصویر ہمیں سیاست دانوں کی زبان سے زیادہ پان کی دوکانوں پر ملی۔ پان والا نہایت حسن و خوبی اور نفاست سے کلکتہ، بنارس، مدراس، دہلی، کانپور، بمبئی، حیدرآباد اور دوسرے شہروں کے پان ایک پٹے پر تہوں میں اس انداز سے سجاتا ہے کہ وہ آپس میں بغل گیر ہو کر ایک عجیب تاثر پیش کرتے ہیں۔ کاش ہمارے رہنما پان والوں سے قومی یک جہتی کا سبق سیکھتے اور تمام ہندوستانیوں کو اسی طرح محبت و رفاقت سے بغل گیر ہونے کا راستہ بتاتے۔

معاشی و طبقاتی مجبوریوں کو ڈھانپنے کے لیے پان سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز نہیں۔ غریب و نادار خواتین اس کو چبا کر اپنے لبوں کو سرخ کر لیتی ہیں۔ جس سے لپ اسٹک کا خرچ بچ جاتا ہے۔

مفلوک الحال میزبان، بجائے اشیائے خورد و نوش کے اگر مہمانوں کے سامنے پان رکھ دے تو مہمان سمجھ جاتے ہیں کہ اب یہاں کھانے کو ملنے والا نہیں۔ کسی دوسرے کے یہاں ڈیرا جمانا چاہیئے۔

ہر دور میں پان کا جداگانہ اور نت نئے انداز میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ عصر حاضر میں اس کا ایک اور مصرف نکل آیا ہے۔ ہمارے ایک دوست آفس سے مکان جاتے وقت ساتھ ایک فاضل پان کا بیڑا رکھ لیتے ہیں۔ اس کا استعمال انھوں نے یوں بتلایا کہ وہ پان مکان پہنچتے ہی اپنی بیوی کے منہ میں ٹھونس دیتے ہیں اور اس طرح کچھ دیر بیوی کی بلا عنوان اور بے مصرف تقریر سننے سے بچے رہتے ہیں۔ ہم بھلا اپنے عزیز کانوں کی حفاظتی تدبیر کے طور پر ایک عمدہ پان بنوا کر مکان پہنچے اور چاہا کہ پان کو بیگم صاحبہ کے منہ میں ٹھونس دیں۔ بیگم نے پہلے تو پان کو ہاتھوں ہاتھ اور ہمیں آڑے ہاتھ لیا اور کہا کہ "ترکیب پان" روز اول، روزِ دیگر نیست" پھر سختی سے وجہ تاخیر پوچھی اس سے پیشتر کہ وہ ہمیں چباتیں، ہم کپڑوں اور جوتوں سمیت امور خانہ داری میں جٹ گئے اور وہ پان چبانے لگیں۔

ہر وقت جگالی کرنے والے جانوروں کی طرح ہم پان چبانا ایک محبوب مشغلہ سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری طبیعت میں ایسا رچ بس گیا ہے کہ اس علت کو ترک کرنے میں ہم اپنی زندگی بے رنگ اور پھیکی سمجھتے ہیں۔ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ ایک قاتل محض پان کی عادت کی بنا پر گرفتار ہو سکا۔ وہ ایک قتل کے بعد جنگل میں روپوش ہو گیا تھا۔ چھپ کر بستی میں پان کی دوکان پر آتا اور پان خرید کر پھر چھپ جاتا۔ ایک دن پان والی اُسے چونا لگا گئی یعنی پولیس کو اس کی خبر کر دی۔ بالآخر پان کی سرخی کی روشنی میں قاتل کا ٹھکانہ مل گیا۔ پولیس افسر شاعرانہ مزاج کا مالک تھا۔ اس نے اس گرفتاری کا سہرا پان والی کے سر باندھا۔ اُسے تعزیراتِ ہند کے قوانین کے علاوہ اشعار بھی ازبر تھے۔ پان والی کی خدمت میں اُسے یوں خراج تحسین پیش کیا۔ ع

ترے پتوں کی گل کاری بیاباں سے چمن تک ہے۔

ooo

آج کے دور میں آسان ہے لیڈر بننا

اصغر جمیل انصاری (ناندیڑ)

کہتے ہیں کہ جو انسان زندگی میں کچھ نہ بن پائے وہ ایک کامیاب شاعر بن جاتا ہے۔ لیکن مجھے اس مقولے سے اختلاف ہے۔ حالات حاضرہ کو دیکھتے ہوئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ جو انسان زندگی میں کچھ نہ بن پائے اور ہر جگہ دھتکارا جائے وہ ایک کامیاب ترین لیڈر بن سکتا ہے۔ لیڈر بننا شاعر بننے سے زیادہ آسان ہے۔ شاعر بننے کے لیے زبان سے کچھ واقفیت اور کچھ صلاحیتوں کا ہونا ضروری ہے جبکہ لیڈر بننے کے لیے دونوں میں سے کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں۔ اس لیے مزاحیہ شاعر رضا نقوی واہی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے یہ کہنے پر مجبور ہیں ؎

وہ لوگ آج کل جنھیں فکر معاش ہے — آسودگیٔ زیست کی جن کو تلاش ہے
اس کے عوض کہ جا کے کہیں نوکری کریں — واہی کا مشورہ ہے کہ وہ لیڈری کریں

اگر آپ کو جھوٹ بولنے میں ید طولیٰ حاصل ہے تو آپ آج کے دور کے بہترین اور کامیاب ترین لیڈر بن سکتے ہیں اور اس میدان میں کوئی مائی کا لال آپ کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ عوام اسی لیڈر کو زیادہ پسند کرتے ہیں جو سب سے زیادہ جھوٹ بولے۔ اور وعدہ کبھی وفا نہ کرے۔ اگر آپ کو جھوٹ بولنے میں مہارت نہ بھی حاصل ہو تو لیڈر بننے کے بعد آپ کے جھوٹ بولنے کی رفتار سات الفاظ فی سکنڈ بڑھ جائے گی۔ آپ کے دل میں عوام کے لیے صرف یہی جذبہ ہونا چاہیے ؎

مفلس کی لنگوٹی تک باتوں میں اُتروا لیں
احسان کے پردے میں چوری کا سلیقہ دے

پرانے دور کے لیڈر کھدر کے کپڑے زیب تن کیا کرتے تھے اور [illegible] پا[illegible] پہنتے تھے۔ لیکن

آج کے دور میں لیڈر بننے سے پہلے یا بعد میں نہ تو آپ کو کھدّر کے کپڑے زیب تن کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی پدیاترا کی موجودہ لیڈروں نے اسے بہت ہی آسان کر دیا ہے۔ پدیاترا کی بجائے آپ جتنی عالی شان موٹر میں سفر کریں گے، جتنی عالی شان اور کشادہ بلڈنگ میں رہیں گے، اتنی ہی زیادہ مقبولیت آپ کو حاصل ہوگی۔ اگر یقین نہ ہو تو شروع کر دیجیے آج ہی سے لیڈری۔ آئیے آج ہم آپ کو لیڈر بننے کی صرف ایک ہی ترکیب بتائے دیتے ہیں جس سے آپ آج کے کامیاب لیڈر نہ بن گئے تو ہمارا ذمہ۔ ترکیب کے ساتھ ہی ساتھ لیڈر بننے کے فوائد بے شمار ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اس کا علم ہم دونوں کے علاوہ کسی تیسرے کو نہ ہونے پائے۔

انمول ہے یہ جنس تجارت کے واسطے
ترکیب لکھ رہا ہوں سہولت کے واسطے

ترکیب : ایک دن چند وزرا کو (جو آپ کے شہر میں کسی سرکاری کام سے وارد ہوئے ہوں یا اپنے کسی دوست کی شادی یا موت میں) اپنے دولت کدہ پر چائے پارٹی پر مدعو کر لیں (یہ چائے پارٹی صرف نام کی چائے پارٹی ہونی چاہیے جنہیں نوش فرمانے کے بعد وزرا تو وزرا ان کے چمچے بھی ڈکاریں لینے پر مجبور ہو جائیں گے)۔ اس پارٹی میں آپ اخبار نویسوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں مدعو کریں تاکہ دوسرے دن آپ کو چھپر پھاڑ کر شہرت دیں (یہ یاد رہے کہ ان اخبار نویسوں کو پارٹی میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے ورنہ آپ کی تصویر اور اسم مبارک اخباروں کے صفحۂ اول پر شائع ہونے سے محروم رہ جائیں گے۔

آپ کے لیڈر بننے سے ملک کو بہت فائدہ ہوگا۔ اپنے ملک میں بیروزگاری کا دن بدن مسئلہ درمسئلہ ہوتا چلا جا رہا ہے کسی حد تک حل ہو جائے گا۔ وہ اس طرح کہ آپ جب لیڈر بن جائیں گے تو لامحالہ اپنے ہمراہ کچھ چمچے بھی لیے پھریں گے جو ہر جگہ اور ہر موقع پر آپ کی ہاں میں ہاں ملائیں گے اور آپ کی ہر بات کی تائید کیا کریں گے خواہ آپ کہیں کہ ناگپور "ٹائمز" بمبئی سے "انقلاب" دہلی سے اور "شگوفہ" بمبئی سے شائع ہوتا ہے یا مدھیہ پردیش کی راجدھانی "دہلی" اور ہندوستان کی راجدھانی "جھمری تلمیا" ہے۔

لیڈر بننے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ آپ کو تقریر کرنی آتی ہو، آپ کی یہ مشکل آپ کے چمچے آسان کر دیا کریں گے (اگر وہ اس لائق ہوں تو)

لیڈر بننے کے بعد آپ کی جان پہچان پولیس والوں سے بہت بڑھ جائے گی جس کی آڑ میں آپ اپنے حریفوں سے بدلہ لے سکتے ہیں اور کوئی مائی کا لعل آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

لیڈر بننے کے بعد ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جو لوگ آپ کی سدا مخالفت کرتے آئے ہیں وہ ادبی، سماجی یا مذہبی جلسے منعقد کریں گے۔ اس کی صدارت آپ ہی کے ذمہ ہوگی یا پھر مہمان خصوصی کی جگہ آپ کا نام ہوگا۔ لہٰذا اس طرح آپ کی مقبولیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔

□□

رام لعل نابھوی

تو کون میں خواہ مخواہ

تو کون میں خواہ مخواہ ایک محاورہ ہے۔ یہ محاورہ کس نے ایجاد کیا۔ کب ایجاد ہوا۔ کن حالات میں اس کی پیدائش ہوئی۔ اس کے بارے میں بہت سراغ لگایا گیا مگر کچھ پتہ نہ چل سکا۔ سب سے بڑی لغات سے لے کر سب سے چھوٹی لغات دیکھیں۔ کہیں ذکر نہ ملا۔ علماء سے بتلایا۔ مگر لاحاصل۔ مدیرین کو خط لکھے لیکن سب بے کار گئے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ محاورہ کسی منچلے کے دماغ کی اختراع ہے۔ وہ منچلا کون تھا۔ کس ملک یا شہر کا باشندہ تھا یہ بھی پتہ نہیں لگ سکا۔ امید تو نہیں کہ پتہ چلے مگر ہماری کھوج جاری ہے۔

آئیے آپ کو اپنے ایک دوست سے ملائیں۔ ان کا نام تجویز کرنے سے پہلے ان کے والدین نے مختلف شہروں کے مختلف سکولوں کے طلباء کے ناموں کی فہرستیں منگوائیں۔ دانشوروں کی ایک کمیٹی نے آٹھ نام چھانٹے، ایک نام کا فیصلہ کرنے میں ممبروں کا اختلاف تھا۔ آخر قرعہ ڈالا گیا۔ پرچہ ہمارے دوست سے ہی اٹھوایا گیا۔ چنانچہ جو نام نکلا وہ ان کا نام تجویز ہوا۔ سکول پہنچے۔ پڑھنے میں ہوشیار تھے۔ اُستاد سوال اردو میں پوچھتے تو یہ جواب انگریزی میں دیتے اور انگریزی میں پوچھتے تو جواب ہندی میں دیتے۔ ان کی عادات اور حرکات کو دیکھ کر ان کا نام علامہ پڑ گیا۔ اصل نام لوگ بھول ہی گئے اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھی یاد نہیں آ رہا۔ کالج پہنچے۔ تعلیم حاصل کرنے میں جٹے رہتے۔ دوستوں کو بتاتے تھے کہ اب وہ ہمہ دان ہو گئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا کرتے کہ شاعری ہو یا نثر نگاری ظرافت ہو یا مزاح نگاری انشائیہ ہو یا غنائیہ۔ فقرہ ہو یا کرشمہ۔ ادب ہو یا فلسفہ سائنس ہو یا تصوف، تحقیق ہو یا تدقیق، اصل ہو یا ترجمہ۔ تالیف ہو یا تصنیف۔ تفسیر ہو یا تشریح حکمت ہو یا تدبیر، تقریر ہو یا تحریر، نقاشی ہو یا مصوری وہ سب پر حاوی ہو چکے ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ وہ دانش وریاں کر رہے ہوتے۔ یہ ٹھٹھک جاتے۔ ان کی بات چپکے سنتے اور اچانک ان کے پاس پہنچ کر اپنا نظریہ بتا دیتے بلکہ فیصلہ سنا دیتے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو لوگ "تو کون میں خواہ مخواہ" کہنے لگ گئے اور یہ لقب ان کو ایسا ملا کہ لوگ ان کا نام تو بھول ہی چکے تھے انہیں علامہ کہنا بھی چھوڑ گئے اور یہ لقب ہی ان کا نام بن گیا۔

بڑی بڑی محفلوں میں پہنچ جاتے حالانکہ منتظمین کی یہی خواہش ہوتی اور کوشش رہتی کہ وہ محفل میں تشریف نہ لائیں اور جب سوالات کا سلسلہ شروع ہوتا تو ایسے سوال کرتے جن کے مضمون سے کوئی تعلق نہ ہوتا اور جب محفل میں ہنسی کا فوارہ چھوٹتا تو فرماتے، ایسے سوال وہی شخص کر سکتا ہے جس کا مطالعہ وسیع ہو۔ جس نے دنیا کا علم جانا ہوا اور سیکھا ہو۔ جس طرح سوال کرنا ہر شخص

کے بس کی بات نہیں ۔ اس طرح سوال سمجھنا بھی ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ۔ محفل کے اختتام پر چائے پہ پہنچتے تو چائے کے فوائد اور نقصانات پر ایک تقریر کرتے ۔ چائے کے ساتھ دوسری منشیات بھی زیر بحث آجاتیں اور بات شراب کی قسموں پر ختم ہوتی غرضیکہ بن بلائے جاتے ۔ بغیر اجازت نئے سوال کرتے اور خود ہی جواب دیتے ۔ کئی بار ایسا ہوا کہ سننے والا کوئی بھی موجود نہ ہوتا اور ان کی تقریر چل رہی ہوتی ۔

ہمارے بچپن کے دوست تھے ۔ گھر پر عموماً آجاتے ۔ ہمیں متوجہ نہ پا کر بچوں سے دل بہلاتے ۔ بچوں کو ٹافیاں مل جاتیں اور وہ بے صبری سے انتظار کرتے ۔ ہمارے گھریلو مسائل میں دخل دیتے ۔ حل بتاتے اور جب تک ہم سے نہ منوا لیتے کہ ان ہی کی تجویز معقول تھی پیچھا نہ چھوڑتے ۔ ہم نے اپنے مسائل کو بہت چھپایا مگر بچوں کو بہلا پھسلا کر کچھ نہ کچھ پتہ لے لیتے ۔ ہم نے بھی اپنی عادت بدل ڈالی ۔ وہ جو کچھ کہتے ہم ہاں کہہ دیتے ۔ بہت خوش ہوتے کہ ان کی ہر بات مانی جاتی ہے ۔

ایک روز ہم اپنے گھر میں سو کر اٹھے ہی تھے کہ حضرت تشریف لے آئے ۔ کہنے لگے پچھلی رات نیند نہیں آئی ۔ شعر دماغ میں کلبلا رہے تھے ۔ کاغذ قلم اٹھایا پوری آٹھ غزلیں لکھی گئیں ۔ طبیعت ایک مقالہ لکھنے پر آئی تو مقالہ لکھ ڈالا ۔ دن ڈھلا تو تمہاری طرف چلا آیا ۔ سوچا غزلیں اب سنا آتا ہوں مقالہ شام کو سہی ۔ ہم اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سوچ رہے تھے اور وہ ہمارا موڈ بنانے کی تیاری میں لگے ہوئے تھے کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی ۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ اب ان کی غزلوں سے جان بچے گی ۔ دروازہ کھولا تو دیکھا ہمارے بڑے بھائی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سامان لدے کھڑے ہیں ۔ ہم حیران تھے کہ یہ تو کنیڈا میں مقیم تھے ۔ اچانک یہاں کیسے ۔ ہم نے پوچھا کہ بھائی جان خبر تو دی ہوتی تو ہم ہوائی اڈے پر پہنچ جاتے ۔ کہنے لگے میں ، surprise دینا چاہتا تھا ۔ ان کی بات ہمارے دوست نے بھی سن لی ۔ ہمارے بھائی سے اپنا تعارف خود ہی کرایا ۔ اور ان کا تعارف کتنا طویل ہوگا ۔ اس کا اندازہ آپ کر ہی سکتے ہیں ۔ تعارف ختم ہوا تو لفظ surprise پر بات شروع کر دی ۔ ہم نے مجبور ہو کر ٹوکا ، تو کہنے لگے اچھا شام کو آؤنگا ۔ غزلیں بھی سناؤں گا اور مقالہ بھی پڑھوں گا اور مہمان کو surprise بھی دوں گا ۔ ہم خوش کہ وہ تشریف لے گئے ۔ شام کو ان کی تشریف آوری سے پہلے ہم رفو چکر ہو جائیں گے ۔

جب ہم بہت لیٹ گھوم پھر کر اور شاپنگ وغیرہ کر کے لوٹے تو دیکھا حضرت لان میں ٹہل رہے ہیں ۔ کہنے لگے ۔ بھائی صاحب تمہارا چلے جانا اور پھر دیر سے آنا مجھے بہت سودمند رہا ۔ کچھ قطعات تو میں نے یہیں کہہ دیئے ہیں ۔ رباعیات دن میں لکھ لی تھیں ۔ اب آپ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو جائیے تو کلام پیش کروں ۔ کھانے میں انھوں نے ہمارا ساتھ دیا ۔ ہم تھکے ماندے آئے تھے اور پھر دیر بھی ہو گئی تھی ۔ آنکھوں میں غنودگی چھانے لگی ۔ عین اس وقت حضرت نے اپنا پٹارہ نکالا ۔ ہم تو خاموش رہے لیکن ہمارے بڑے بھائی نے کہہ ہی دیا کہ آپ ڈرائنگ روم میں بیٹھئے اور خود کو ہی سنائیے ۔ ہمیں تو نیند نے آ دبوچا ہے ۔ ہم جب صبح اٹھے تو دیکھا کہ حضرت شیشہ سامنے رکھے غزلیں سنا رہے ہیں ۔ شعروں کی داد دے رہے ہیں اور خود ہی داد لے رہے ہیں ۔ اور لکھ رہے ہیں ۔ جو لکھ چکے ہیں انہیں پھر سے سنا رہے ہیں اور جو سنا چکے ہیں انہیں پھر سے لکھ رہے ہیں ۔ ہم نے اٹھایا ۔ چائے پلائی اور وہ چلے گئے ۔ بھائی صاحب نے ہم سے کہا نام تو ان کا یاد نہیں ۔ لوگ انہیں " تو کون میں خواہ مخواہ " ہی کہتے ہیں ۔ پھر ہنسی کا ایک فوارہ پھوٹا ۔

میری نظر میں ابھی تک یہ محاورہ ریسرچ کا موضوع نہیں بنا ۔ علم دوست حضرات ۔ ریسرچ اسکالروں اور یونیورسٹیوں میں مستحقوں کو چاہیے کہ وہ ادھر توجہ دیں ۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے دوست ان کی پوری مدد کریں گے ۔

مناظر عاشق ہرگانوی

پیکرانِ بے سخن

(۱)

سری نگر میں مظہر امام کے یہاں کھانے پر باتیں ہو رہی تھیں۔ فیاض رفعت، مبینہ امام، مناظر عاشق ہرگانوی، شہپر امام اور کئی لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ بات فیاض رفعت کی صاف گوئی پر ہونے لگی تو مظہر امام نے بتایا یہاں سری نگر سے ایک رسالہ "لا" نکلا ہے۔ پہلے شمارے کا اجراء حامدی کاشمیری کے یہاں تھا۔ زبیر رضوی نے تقریر کرتے ہوئے نوجوان ایڈیٹروں سے کہا "یہ پہلا شمارہ ہے اس میں آپ نے بعض ایسی چیزیں شائع کی ہیں جو غیر معیاری ہیں۔ آئندہ سے معیار کا خیال رکھئے گا۔ خواہ بڑے نام ہی کیوں نہ ہوں۔"

"ہاں، اگلے شمارہ سے ان کی چیز مت چھاپنا۔ اس بار تو چھاپ ہی دی ہے۔" فیاض رفعت نے برجستہ کہا۔

"لا" کے ہی رسم اجراء کے موقع پر حامدی کاشمیری اپنی ایک غزل سنانے کے بعد بولے "میں ایک اور غزل سنانا چاہتا ہوں۔"

فیاض رفعت اپنے سامنے رکھے ہوئے بسکٹ کے پلیٹ کی طرف اشارہ کر کے بولے "پلیٹ میں جب تک بسکٹ موجود ہیں، آپ سناتے رہیئے، کسی کو ذرا بھی اعتراض نہیں ہوگا۔"

۳

جب علی گڑھ آبزرور کے نگران فیاض رفعت تھے تو انھوں نے ایک بار سرخی لگائی "لنگڑے پر بہار ہے"
اور خبر میں یہ مضمون دیا "راہی معصوم رضا جب بھی شمشاد مارکٹ سے گذرتے ہیں، ایک آم فروش یہ آوازیں لگاتا ہے "لنگڑے پہ بہار ہے"

۴

ڈاکٹر قمر رئیس کے یہاں رتن سنگھ سے فیاض رفعت کی ملاقات ہوئی۔ رتن سنگھ نے تعارف کے بعد فیاض رفعت سے کہا "یہ لیجئے میرے افسانوں کا مجموعہ، لیکن میں اس کی قیمت لوں گا"
"قیمت کیا ہے؟" فیاض رفعت نے پوچھا
"پندرہ روپے"
"پھر میں آپ سے تیس روپے لوں گا"
"جی؟"
"جی ہاں، کیونکہ مجھے پڑھنا پڑے گا اور میں پڑھنے کی قیمت لوں گا"

۵

سنٹرل اکسائز کے سپرنٹنڈنٹ نعیم الحق کے یہاں ڈاکٹر وہاب اشرفی، ڈاکٹر شان احمد صدیقی، حسین الحق، مناظر عاشق ہرگانوی، عین تابش اور کئی حضرات بیٹھے باتیں کر رہے تھے ہرگانوی نے وہاب اشرفی سے کہا "آپ نے میرے خط کا جواب نہیں دیا، خاص طور پر مظہر امام صاحب کے خط کے سلسلے میں جواب کا منتظر تھا"
دراصل وہ خط تفصیلی جواب چاہتا تھا اور آپ جانتے ہی ہیں کہ پچھلے کئی ماہ سے میں عدیم الفرصت ہوں پھر اس خط کے جواب سے ہنگامہ کھڑا ہو سکتا تھا۔
"میں ہنگامہ خیزی کے لیئے ہی جواب چاہتا تھا"
تب تو جواب نہ دے کر میں نے اچھا کیا۔ کم از کم بلڈ پریشر تو نہیں بڑھا" وہاب صاحب نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

۶

حامد علی گردش نے ایک بار بتایا کہ "بہت عرصہ پہلے کی بات ہے، گیا میں قیوم خضر دوکان کیا کرتے تھے۔ پتر پچھ کا میلہ تھا۔ علامہ سریر کابری، آوارہ مظفر پوری، شاہ لعل قادری، میں، قیوم خضر اور معین شاہد دوکان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک جوان لڑکی ادھر سے گذری۔ ہم سب کی توجہ اپنی طرف پاکر وہ بار بار پلٹ کر دیکھنے لگی۔ شاہ لعل قادری نے علامہ سے کہا "استاد، اسی ادا پہ کوئی شعر ہو جائے"
سریر کابری نے برجستہ کہا ؎

گذر کر سامنے سے اس لیے پھر اس نے دیکھا ہے
گرا، یا کہ نہیں وہ صید جس پہ تیر پھینکا ہے

۷

ایک مشاعرہ میں کسی شاعر نے پڑھنا شروع کیا ع منزل دور ہے اور جانا ضرور ہے
سامعین میں سے ایک نے اٹھ کر کہا۔
"پیدل مت جائیں، رکشا کر لیں"

(۸)

انجم مانپوری نے بدر الزماں خاں کو چائے آفر کیا
وہ بولے "میں چائے نہیں پیتا"۔
انھوں نے سگریٹ پیش کیا۔ خاں صاحب انکار میں
سر ہلانے لگے "میں سگریٹ نہیں پیتا۔!"
تب انجم مانپوری نے پوچھا "آخرت میں بخشائش کے
لیے آخر کیا انتظام کیا ہے ؟"

(۹)

رانچی میں مشاعرہ تھا۔ اناؤنسر کوئی شاعرہ تھیں۔ اس
مشاعرے میں شوہر گیاوی کو بھی پڑھنا تھا۔ جب ان کا نمبر
آیا تو اناؤنسر نے انھیں نام سے پکارا۔ شوہر اسٹیج پر آکر
بولے "اناؤنسر صاحبہ نے مجھے نام سے پکارا ہے جبکہ
آپ حضرات جانتے ہیں کہ میں شوہر کہلاتا ہوں"۔
سامعین میں سے کسی نے کہا "آپ کی والدہ محترمہ
آپ کو کیا کہتی ہیں ؟"

(۱۰)

شوہر گیاوی چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ
ڈاکیہ خط دیا گیا۔ خط پڑھ کر وہ نڈھال سے ہو گئے اور
بڑبڑانے لگے "خدایا رحم کر ۔ خدایا رحم کر"۔
دوستوں نے گھبرا کر پوچھا "آخر کیا ہوا ؟"
شوہر نے برجستہ کہا ؎ خدایا رحم کر شوہر کے حالِ زار پر اپنا
خبر آئی ہے پرسوں پھر ولادت ہونے والی ہے

ترقی اُردو بورڈ کی مطبوعات

ادب اور لسانیات :

حیاتِ جاوید	مولانا الطاف حسین حالی	24=00
توضیحی لسانیات	ایچ اے گلیسن جونیر / عتیق احمد صدیقی	23=00
غزل اور غزل کی تعلیم	اختر انصاری	10=25
عربی ادب کی تاریخ	عبدالحلیم ندوی	13=00
ہند آریائی ہندی	ڈاکٹر ایس۔ کے چیٹرجی / ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی	13=50
دیوان حسرت عظیم آبادی	مرتبہ ڈاکٹر اسما سعیدی	18=00
امریکی ادب کا جائزہ	سلامت اللہ خاں	9=50
انیس کے مرثیے	مرتبہ صالحہ عابد حسین	20=00
ہندی ادب کے بھگتی کال پر مسلم ثقافت کے اثرات	ڈاکٹر سید اسد علی / ڈاکٹر ماجدہ اسد	17=00

تاریخ۔ نفسیات اور عام مطالعے کی کتابیں :

قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب تاریخی پس منظر میں	ڈی۔ ڈی۔ کوسمبی / بالمکند عرش ملسیانی	13=00
جدید ہندوستان کے معمار	این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی / احمد	9=75
ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ اول)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	18=75
ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ دوم)	بمل دت / غلام ربانی تاباں	23=00
شہیدانِ آزادی (حصہ اول)	بی۔ این۔ چوپڑا / بھگونت سنگھ	24=00
شہیدانِ آزادی (حصہ دوم)	بی۔ این۔ چوپڑا / بھگونت سنگھ	20=00
تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورینس / ڈاکٹر سلامت اللہ	41=75
مفتاح التقویم	حبیب الرحمان خاں صابری	28=00
فرہنگ آصفیہ	مکمل چار جلدوں میں	150=00

بچوں کے بین الاقوامی سال کے موقع پر ترقی اُردو بورڈ نے مندرجہ ذیل کتابیں بھی شائع کی ہیں :

بچے کی صحت	ڈاکٹر ستیہ گپتا / ڈاکٹر شمیم نکہت	5=75
باپو اور بچے	بی۔ ڈی۔ ٹنڈن / تاجور سامری	2=25
مولانا روم کی کہانیاں	مرتبہ محمد حفیظ الدین	2=00
نصوح کا خواب	مرتبہ حفیظ عباسی	3=50
پودوں اور جانوروں کی دنیا	اطہر پرویز	2=50

سید محی الدین قادری ہادی
لکچرر عربی، ادارالعلوم کالج حیدرآباد

اقبال کی شاعری میں طنز و مزاح

علامہ اقبال کے کلام میں جہاں اسرار خودی، امید و یقین، بلند ہمتی، اعلیٰ حوصلگی اور تصوف کے بلند پایہ مضامین ملتے ہیں وہیں کچھ طنز و مزاح اور ظرافت کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ اقبال کی ظریفانہ شاعری میں طنز کے چبھتے ہوئے تیر اور مزاح کی چاشنی دونوں پائے جاتے ہیں۔ انھوں نے کئی موضوعات کو بہتر انداز میں بزبان شعر پیش کیا ہے جیسے مشرق و مغرب کا مقابلہ، عورتوں کی تعلیم، بے پردگی کی برائیاں، شیخ و برہمن کے مسائل، کاہلی کی برائیاں اور سرمایہ داروں کا ظلم وغیرہ۔

مشرقیوں کی کاہلی اور مغربیوں کی تیز رفتار ترقی کے تعلق سے اقبال کہتے ہیں ؎

مشرق میں اصول دین بن جاتے ہیں۔ مغرب میں مگر مشین بن جاتے ہیں
رہتا نہیں ایک بھی ہمارے پلے۔ واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

اتنا کہنے کے بعد بھی اقبال خاموش نہیں رہتے بلکہ اپنی قوم کو خواب غفلت سے جگاتے ہوئے، ان کی سستی پر ملامت کرتے ہوئے اور ان کے ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے کس لطیف پیرائے میں طنز کرتے ہیں ؎

انتہا بھی اس کی ہے آخر خریدیں کب تلک
چھتریاں، رومال، مفلر پیرہن جاپان سے

اپنی غفلت کی یہی حالت اگر قائم رہی
آئیں گے غسال کابل سے، کفن جاپان سے

جہاں اقبال نے مغرب کی تیز رفتار ترقی کی تعریف کی ہے وہیں جدید مغربی تعلیم کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

تعلیم مغربی ہے بہت جرات آفریں
پہلا سبق ہے بیٹھ کے کالج میں مار ڈینگ

اسی مضمون کو ایک قطعے میں اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

دیکھیے چلتی ہے مشرق کی تجارت کب تک؟
شیشۂ دیں کے عوض جام و سبو لیتا ہے
ہے مداوائے جنوں نشتر تعلیم جدید
میرا سرجن رگِ ملت سے لہو لیتا ہے

نئی تہذیب کی برائیاں اور خامیاں بیان کرتے ہوئے اس سے نفرت کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

اٹھا کر پھینک دو باہر گلی میں
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گندے

پرانی تہذیب کی تعریف اور نئی تہذیب کی تضحیک کرتے ہوئے دونوں کا موازنہ ان اشعار میں کرتے ہیں ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے

بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ داری اور ساہوکاری کی مذمت کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

چٹے بٹے ایک ہی تھیلی کے ہیں
ساہوکاری، بسوہ داری، سلطنت

اسی سرمایہ داری کی برائی کرتے ہوئے ایک لطیف مثال ان تین چھوٹے چھوٹے اشعار میں اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

رات مچھر نے کہہ دیا مجھ سے ماجرا اپنی ناکامی کا
مجھ کو دیتے ہیں ایک بوند لہو صلہ شب بھر کی تشنہ کامی کا
اور یہ بسوہ دار بے رحمت پی گیا سب لہو اسامی کا

ایک جگہ سرمایہ داروں پر اس طرح چوٹ کرتے ہیں ؎

سنا ہے میں نے کل یہ گفتگو تھی کارخانے میں
پرانے جھونپڑوں میں ہے ٹھکانا دستکاروں کا
مگر سرکار نے کیا خوب کونسل ہال بنوایا
کوئی اس شہر میں تکیہ نہ تھا سرمایہ داروں کا

مزدوروں کی محنت اور سرمایہ داروں کے ظلم کے خلاف اقبال نے اس طرح علم بغاوت بلند کیا ہے ؎

محنت و سرمایہ دنیا میں صف آرا ہو گئے
دیکھیے ہوتا ہے کس کس کی تمناؤں کا خون!

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

کارخانے کا ہے مالک مردکِ ناکردہ کار
عیش کا پتلا ہے محنت ہے اسے ناسازگار
حکم حق ہے لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی
کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

ایک اور مقام پر یوں رقم طراز ہیں ؎

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

کسان اور مالک کی گفتگو کو اور اس گفتگو کے حاصل کو چار اشعار میں علامہ اقبال نے اس طرح قلمبند کیا ہے ؎

تکرار تھی مزارع و مالک میں ایک روز — وہ تو یہ کہہ رہے تھے مرا مال ہے زمیں
کہتا تھا وہ، کرے جو زراعت اسی کا کھیت — کہتا تھا یہ، کہ عقل ٹھکانے تیری نہیں
پوچھا زمیں سے میں نے کہ ہے کس کا مال تو؟ — بولی مجھے تو ہے فقط اس بات کا یقیں
مالک ہے یا مزارعِ شوریدہ حال ہے — جو زیر آسماں ہے وہ دھرتی کا لال ہے

نیوٹن کے کلیہ سوم "عمل اور رد عمل" کو اقبال نے بزبان شعر یوں ادا کیا ہے ؎

ہر عمل کے لیے ہے ردِّ عمل
دہر میں نیش کا جواب ہے نیش

علامہ اقبال عورتوں کو مغربی تعلیم دلوانے کے خلاف تھے اور اس کے برے نتائج و عواقب پر اُن کی گہری نظر تھی بالخصوص ان عورتوں کے لیے جو حصولِ علم کے بعد دوسروں کے علاوہ اپنے آپ کو بھی فراموش کر جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر اس طرح کہتے ہیں ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت

٥

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت

اس مضمون کو دوسرے انداز میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پوری قوم کے لیے ایک تازیانۂ عبرت ہے ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈلی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغرب ہے مدنظر وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین؟ پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

م نہاد واعظ اور شیخ کو بھی اقبال نے معاف نہیں کیا اور ان کی مکاری وفریب کاری کا ملمع اتار پھینکتے ہوئے
یں فرماتے ہیں ؎

کچھ غم نہیں جو حضرت واعظ ہیں تنگ دست
تہذیبِ نو کے سامنے سر اپنا خم کریں
ردِ جہاد میں تو بہت کچھ لکھا گیا
تردیدِ حج میں کوئی رسالہ رقم کریں

دوسرے قطعے میں شیخ صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہتے ہیں ؎

ہاتھوں سے اپنے دامنِ دنیا نکل گیا رخصت ہوا دلوں سے خیالِ معاد بھی
قانون وقف کے لیے لڑتے تھے شیخ جی پوچھو تو وقف کے لیے ہے جائیداد بھی؟

شیخ اور واعظ کے علاوہ حضرتِ مُلّا کی بحث وتکرار کی درگت بناتے ہوئے اس طرح کہتے ہیں ؎

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرت ملا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی میری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور وشراب ولبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل وقال اقوال
بحث وتکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

اکبرالہ آبادی کی طرح علامہ اقبال بھی پردے کے حامی تھے۔ چنانچہ عورتوں کی بے پردگی کے خلاف انھوں نے
بھی طنز کے تیر اس طرح چھوڑے ہیں ؎

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو؟ جب مرد ہی زن ہو گئے

سماجیات کے علاوہ اقبال کی گہری نظر سیاست پر بھی تھی۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کیا خوب امیرِ فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام ونسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا

[illegible] جگہ مختلف سربراہان ممالک پر لطیف طنز کرتے ہوئے اس طرح کہتے ہیں ؎

شام کی سرحد سے رخصت ہے وہ رعبِ امیری　　لکھ کے میخانے کے سارے قاعدے بالائے طاق
یہ اگر سچ ہے تو کس درجہ ہے حیرت کا مقام؟　　رنگ اک پل میں بدل جاتا ہے یہ نیلی رواق
حضرت کرزن کو اب فکر مداوا ہے ضرور　　حکم بیداری کے معدے میں ہے درد لایطاق
وفد ہندوستان سے کرتے ہیں سر آغا خاں طلب　　کیا یہ چورن ہے پئے ہضم فلسطین و عراق

مضمون کے آخر میں وہ دو اشعار پیش کرتا ہوں جن میں اقبال نے اجیر میں ڈھائی دن میں مسجد بنانے والوں پھر پور [illegible]ز کرنے کے علاوہ اچھا آپ پر بھی طلامت کی ہے علاوہ ازیں ان اشعار کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں اقبال نے ہندی الفاظ کو بہت خوب صورتی سے استعمال کیا۔ ملاحظہ کیجئے ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا کردار کا غازی بن نہ سکا

کل ہند جشن ظرافت پٹنہ ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۸۰ء

۲۴ فروری - پہلی نشست سمینار - شرکاء، ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی صدر شعبہ اردو سیفیہ کالج بھوپال - ڈاکٹر وہاب [illegible]ی، صدر شعبہ اردو، رانچی یونیورسٹی، ڈاکٹر طلحہ رضوی برق مگدھ یونیورسٹی، ڈاکٹر حامد حسین، بہار یونیورسٹی - ڈاکٹر [illegible] الرحمن وائس چانسلر بہار یونیورسٹی صدارت کریں گے۔

دوسری نشست - شرکاء، فکر تونسوی، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، شفیقہ فرحت اور نریندر لوتھر۔

۲۵ فروری - بزم لطیفہ گوئی اور مزاحیہ مشاعرہ - افتتاح، جناب اخلاق الرحمن قدوائی، گورنر بہار - صدارت، [illegible]ٹس سید سرور علی، پٹنہ ہائیکورٹ۔

شعراء: رضا نقوی واہی - حمایت اللہ، مصطفیٰ علی بیگ، پوگس حیدرآبادی، طالب خوندمیری، محمود نشتر [illegible] رنجی بھوپالی، ہلال سیوہاروی، شہباز امروہوی، مشتاق پردیسی، آفتاب لکھنوی، ناظم انصاری، علامہ [illegible] آرزو، جوہر سیوانی، صابر بہاری، پروفیسر مہدی علی، علامہ اسرار جامعی، شہزاد مصری اور واہی۔

دعوتیں پہلے اور اب

احمد سلطان

کوئی دعوت میں جب بُلاتا ہے — عہدِ ماضی کا یاد آتا ہے
کیا زمانہ تھا کیسے انساں تھے — ایک دل تھا ہزار ارماں تھے
اللہ صاحب کا مان کر احسان — جا کے ہر گھر بُلاتے تھے مہمان
آٹھ دن پہلے آ کے ٹکتے تھے — میزبانی میں گھر بھی بکتے تھے
دُھن یہ رہتی تھی نام ہو جائے — پورا شادی کا کام ہو جائے
سُننی پڑتی تھی نانی دادی کی — لاکھ رسمیں تھیں ایک شادی کی
ہوتی دعوت برائے خاص و عام — شرکتِ عقد اور اس پہ طعام
صبح سے شام تک جو پکتا تھا — اس کو کھانے سے کون تھکتا تھا
ایک کے بدلے چار آتے تھے — بے حیائی سے ڈٹ کے کھاتے تھے
کیسے دن تھے وہ کیسی راتیں تھیں — ہر گھڑی دعوتوں کی باتیں تھیں
ناڈیہ کے شباب کی باتیں — ہوگئیں اب تو خواب کی باتیں
اب تو چھپتے ہیں رُقعے ہی خالی — پینے ملتی ہے چائے کی پیالی
لوگ کم ہوں تو پوری پیالی ہے — ورنہ سمجھو کہ آدھی پیالی ہے
خوبصورت ڈزائن رقعہ کا — اور مضمون فائن رقعہ کا
خط کا مضمون ہے لفافے میں — اور کٹتی ہے راحت فاقے میں
لسٹ میں جن کا نام ہوتا ہے — اسپیشل انتظام ہوتا ہے
خوب ان کو تپا کے رکھتے ہیں — یعنی پہروں بٹھا کے رکھتے ہیں
جب بہت لوگ ہوتے ہیں رخصت — تب کہیں ان کو دیتے ہیں زحمت
جب کہ ہو جاتے ہیں سبھی بیزار — پیدا دعوت کے ہوتے ہیں آثار
کیک بسکٹ مٹھائی اور کھارا — ہے پلیٹوں میں بس یہی سارا
صدقہ تھوڑا بہت سے شیطاں ہیں — یوں تو کہنے کو سب ہی انساں ہیں
ٹوٹ پڑتے ہیں، سب پلیٹوں پر — جیسے بچے لڑیں سلیٹوں پر
جو ملا ہاتھ میں وہی گھٹ ہے — آنکھ کیا جھپکی سمجھو سب چٹ ہے
رسم چوتھی کی یا ولیمے کی — رہ گئی ہے جہاں کہیں باقی
رنگ رقعوں کا کچھ بدلتے ہیں — کارڈ چھوٹا سا اس میں رکھتے ہیں

کارڈ کی جس کو دید ہوتی ہے
اس کو دعوت میں عید ہوتی ہے

بہزاد فاطمی
(پٹنہ)

واہی کی کہانی میری زبانی

رضا نقوی واہی کے ساتھ ایک اور قیمتی ہستی ان کے یارِ غار اور عزیز یحییٰ نقوی سے میری مڈبھیڑ پہلے پہل سنہ ۱۹۴۳ء میں
ری۔ گرمیوں کا زمانہ۔ پٹنہ کالج کی روایتی شان و شوکت۔ ڈچ بلڈنگ کی بالائی منزل۔ انگریز پرنسپل مسٹر ایچ لیمبرٹ کے فرمان
کا انتظار اور پھر آئی اے کے فرسٹ ایر میں داخلہ کا مرحلہ۔ ہم لوگ، مختلف اسکولوں سے ایک اور انگریز مسٹر میکفرسن
الس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے فرمانِ قتلِ عام کی زد سے بچ نکلے تھے۔ میٹرکولیشن کی سرٹیفکیٹ عطا کرنے کی رسم اس وقت
نیورسٹی ہی کے دائرہ اختیار میں تھی۔ اس اعزاز کو پانے والوں کی طویل فہرست چھاپنے کا رواج نہ تھا۔ اس سال تو بحکم
الس چانسلر بہادر اور بھی قیامت برپا تھی۔ پچھتر فی صد سے بھی زیادہ "جگر کے ٹکڑے" درجۂ شہادت پہ فائض ہوئے۔
ہم لوگ اس سعادت سے محروم رہے۔ لہٰذا اب دوسری منزل سامنے تھی۔ اسی تاریخی پس منظر اور ماحول میں "ان قلیتی
ریافنوں" کا واقعہ عالمِ ظہور میں آیا۔

میں خالص عظیم آبادی، رضا اور یحییٰ دیہاتی شہری۔ وصفِ اضافی میں "اجتماعِ ضدّین" اس لیے کہ ان "سادات کرام"
کا مولد و مسکن ریاستِ بہار کی مشہور اور مردم خیز بستی کھجوا ضلع سیوان، لیکن مقام "اندرونِ شہر پٹنہ" اب تو ایک دیہاتی،
خاندانے شہر کا قبالہ ہی اپنے نام کرالیا ہے اور ہیں۔ انقلابات ہیں زمانے کے۔ ان "ذواتِ مقدسہ" کی مجلسی زبان تو صاف
ستھری اُردو لیکن گھریلو بھاشا سے بہیں تفاوت رہ، رضا کو اپنی مادری زبان پر فخر ہے اور ان کا دعویٰ ہے "یہی زبان میر
تقی میر کے یہاں بھی مستعمل تھی۔ میں اس وجہِ افتخار کی قدر کرتا ہوں لیکن کہتا ہوں "شاید اسی زبان کے جھٹکوں کی تاب
نہ لاکر میر صاحب نے اپنے ہم سفر کے ساتھ گفتگو کرنے سے انکار کر دیا تھا۔" اس وقت ان کا تیور قابلِ دید ہوتا ہے۔ جیسے
کہنا چاہتے ہوں۔ "

"اہلِ عظیم آباد کیا جانیں ۔ یہ میرے گھر کی زبان ہے ۔"
بہرحال پہلی ہی مڈبھیڑ میں آغاز گفتگو اور تعارف اس طرح ہوا ۔
"آپ کی تعریف ؟"
"سید محمد رضا نقوی"
"اور آپ — ؟"
"فقط یحییٰ" روایتی مکتوب کے اس اختتامیہ نے روشنی طبع کی لو کو اکسایا ۔
"آپ لوگ شاید نمازِ عید پڑھنے آئے ہیں — ؟"
تازہ دھلی ہوئی بیداغ زرد روشیروانیوں جن کے بٹن باقاعدگی سے گلے تک بند ۔ نئے اُجلے پاجاموں ۔ چمک دار بادامی جوتوں ۔ مُرکیوں والے سیاہ بیور کی گول ایرانی ٹوپیوں کی "شانِ کج کلاہی" اور سج دھج دیکھ کر ایسا ہی گمان ہوتا تھا ۔ اب یہ ٹوپیاں نایاب ہیں ورنہ پٹنہ میوزیم کے نوادرات میں اہم اضافہ ہوتا ۔
"یحییٰ نے برجستہ جواب دیا ۔ "گھبرایئے نہیں ۔ فطرے کی رقم آپ کے گھر بھیج دی ہے ۔"
"جزاک اللہ ! تو پھر آیئے گلے مل لیں ۔ مجھے سلطان احمد نبیرۂ حضرت شاد عظیم آبادی کہتے ہیں ۔" تیکھے ناک نقشہ والے رضا اور چھوٹے قد کے یحییٰ جیسے "باراں دیدہ" کب دھونس میں آتے ہیں ۔ وار خالی گیا ۔
"ماشاء اللہ ! ماشاء اللہ ! بڑی متبرک ذات ہے آپ کی" رضا کا خندۂ زیرلب قیامت تھا ۔
"اور قابل قدر بھی !" یحییٰ نے لقمہ دیا ۔
ابتدائی مختصر نوک جھونک ، استوار اور طویل دوستی کا پیش خیمہ بنی ۔ تقریب جشن ، کوچۂ مرادپور میں فالودے کی مشہور دکان پر منائی گئی ۔
"آج نقد کل اُدھار" رضا کا اشارہ دوکان میں آویزاں ایک چوکھٹے کی طرف تھا ۔
"اور ادھر بھی کچھ لکھا ہے ۔"

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

"استغفراللہ ! کیا گھٹیا شعر ہے !"

o

رضا مسلم ہوسٹل (موجودہ اقبال ہوسٹل) میں مقیم ہوئے ۔ یحییٰ اپنے ایک عزیز کے ڈیرے میں استعابت ہوگئے ۔ میں پٹنہ سٹی اور پٹنہ کالج کے درمیان "آواگون" کے فلسفہ پر غور کرتا رہا ۔ لہٰذا متعلمی کے زمانے میں ملاقاتیں کالج کیمپس اور اس میں ہونے والی علمی ادبی تقریبات تک محدود رہیں ۔ ویسے یہ دونوں "ذات شریف" طوبار غریب خانے پر بھی تشریف لائے ۔ ایک دفعہ محلہ کی محفلِ نوروز کی شرکت کی غرض سے اور دوسری مرتبہ تمنائی کے ساتھ جب رسالہ شمیم کے لیے تبرکات شاد لینا تھا ۔ کالج میں ہم لوگوں کے اختیاری مضامین مختلف تھے ۔ لیکن ادبی ذوق مشترک ۔ انگریزی اور اردو کمپوزیشن کی کلاسوں

میں ساتھ ہو جاتا۔ جہاں پڑھنے لکھنے سے زیادہ یادگار شرارتیں مرغوب تھیں۔ یحییٰ باتونی، رضا نسبتاً کم سخن۔ پتی تلی گفتگو کے عادی لیکن بیر بلی اور ملا دو پیازگی میں اشتراکِ عمل مساوی ہو اور ایک تیسرا دیوانہ درمیانی وقفوں میں کہیں مل بیٹھتے تو خوب گزرتی۔ کبھی لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوٹ رہی ہیں۔ کبھی برجستہ شعروں کے انار گلفشانیوں کے جلوے لٹا رہے ہیں کبھی علمی اور ادبی بحثوں کی چرخیاں گھوم رہی ہیں۔ کچھ نہیں تو بے پرکی ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔ باذوق طلباء لطف اندوز بھی ہوتے اور مرعوب بھی۔ بدذوقے بدمزہ ہوتے۔ منہ بناتے اور اپنی راہ لیتے۔ اساتذہ خوش فہمی میں مبتلا کہ "یہ لڑکے نہایت ذہین اور ہونہار ہیں۔" صرف ایک ہی پروفیسر ایسے تھے جن کی رائے بالکل بالعکس تھی۔ وجہ چپقلش صرف اتنی سی بات کہ مرحوم نہایت ایمانداری اور سختی سے قاعدے قانون کے پابند اور ایسی ہی پابندی طلباء سے کرانا چاہتے تھے۔ اپنی مومنیت کی بنا پر اس تلخ حقیقت سے باخبر نہ تھے کہ

طبع آزاد پہ قیدِ رمضان بھاری ہے۔ ممدوح کی شان میں بہترے مزاحیہ اشعار موزوں ہوئے جن کا سراغ لگانا اب دشوار ہے

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

٥

یہ وہ زمانہ تھا جب نوجوان طبقے میں جوش ملیح آبادی کی شاعری سکۂ رائج الوقت تھی۔ کسی کو "مہترانی اور جامن والیاں" پسند تھیں۔ کسی کو "رقصِ بتانِ آذری" پر وجد آتا۔ کوئی شاہین صفت منچلا، انقلابی شاعری کو "لہو گرم رکھنے کا بہانہ" سمجھتا۔ کوئی خطیبانہ انداز کا شیدا۔ کوئی نشستِ الفاظ کی خوبی پر فریفتہ۔ کوئی شوکتِ بیان کا گرویدہ۔ کوئی تشبیہوں اور رنگین استعاروں سے مسحور۔ کوئی زورِ کلام کے شکنجوں میں مقید۔ بعض ایسے بھی بالغ نظر تھے جو کچھ جگہوں پر صرف لہجے کی گھن گرج اور خطیبانہ طرزِ بیان کو آفاقی شاعری کے منافی قرار دیتے۔ رضا اور یحییٰ جوش کی شاعری سے کافی متاثر تھے۔ دونوں نے کچھ عمدہ نظمیں ان کے رنگ میں لکھیں۔ میں نے بھی دو نظمیں "آرزو" اور "مجاہد" لکھی تھیں۔ "آرزو" منشی دیانرائن نگم کے مشہور ادبی رسالے "زمانہ" کانپور میں چھپی۔ "مجاہد" کو نگار کے حاشیہ نشینوں میں بھی جگہ نہ ملی۔ نظم بیرنگ واپس آئی۔ فاضل مدیر حضرت نیاز فتح پوری کے خیال میں "تنافر۔ تناقص۔ شکست ناروا۔ محاورے کی غلطی۔ مصرعوں کی بے ربطی وغیرہ" عیوب موجود تھے۔ خفت نہ ہوئی۔ اس لیے کہ یہ تمام دعوے بغیر کسی دلیل اور سند کے بطور حاشیہ درج تھے۔ ٹکٹ کے پیسوں کا البتہ افسوس ہوا۔ آپ کی اطلاع کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ نظمیں بزمِ ادب پٹنہ کالج کے سالانہ انعامی مقابلے کے لیے بڑی کاوش سے کہی گئی تھیں۔ اساتذہ اور سخن فہم حضرات سے جن کی پٹنہ میں کمی نہ تھی کافی داد ملی تھی۔ اگر ان بزرگوں نے ایک نوجوان شاعر کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہا تھا تو اس کا علم انہیں کو ہوگا۔ بزمِ نگار میں باریاب نہ ہونے کی وجہ سے یاروں کو خوش طبعی کے لیے ایک مزیدار شگوفہ ہاتھ آیا۔

"کھسیانی بلی کو کھمبا نوچتے دیکھا ہے؟"
"دیکھا ہے۔ لیکن اعتراف کے بعد ہوائیں اُڑنے لگی،،"

اسی زمانے میں یحییٰ کی ایک خوب صورت نظم "اعتراف" نگار میں چھپی تھی۔

"اگر ہمت ہے تو تم بھی چاہو"

"ہوا پر اڑنا چیل کووں کا کام ہے۔ میں زمین ہی پر شان سے چلتا اور قدم بڑھاتا ہوں۔"

٥

بزم ادب پٹنہ کالج اور بزم سخن سائینس کالج کے سالانہ جلسے اور مشاعرے بڑے اہتمام اور بڑی شان و شوکت سے منعقد ہوتے۔ بی۔ان کالج اور مدرسہ شمس الہدیٰ میں بھی بہت اچھے مشاعرے ہوتے۔ مقامی اور غیر مقامی شعرا اور اساتذہ مدعو ہوتے۔ ہوٹنگ کے مرض نے شدت اور وبائی شکل اختیار نہ کی تھی۔ بقدر پیمانۂ فکر مناسب اور برمحل داد ملتی۔ کبھی کبھی طلباء اور نوجوانوں کو خوش طبعی کے موقعے بھی مل جاتے۔ بسا اوقات برجستہ جواب پاتے۔ اودھ کشور پرشاد کشتہ گیاوی کو زحمتِ سخن دی گئی۔ مائک پر تشریف لائے۔ مجمعے سے آواز آئی

"تل کٹ (گیا کا مشہور تحفہ) لائے ہیں؟"

"جی ہاں! بہت سے تھے۔ حضرت بیگ (پروفیسر عبدالمنان) کو پسند آگئے۔"

بسمل الہ آبادی، اپنے ترنم عام فہم شاعری اور پختہ کلام کی وجہ سے مشہور و مقبول تھے۔ شعر پڑھا ؎

داغِ دل کام آیا مرنے پر قبر میں بھی چراغ جلتا ہے

"فرشتے فوراً پہچان گئے ہوں گے!"

جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

گورکھپور سے فطرت واسطی آئے۔ زیادہ تر رومانی نظمیں ترنم سے سناتے۔ اختر شیرانی کی "سلمیٰ" کی طرح شاید ان کی بھی کوئی "شیاما" تھی۔ نظم شروع کی ؎

"وعدہ کیا تھا لیکن اب تک نہ آئی شیاما"

"بڑی بے وفا نکلی!"

"اسی کو تو شکایت ہے"

مصرعۂ طرح تھا ؎

ہماری جان صدقے، نوجواں قاتل کے غصّہ پہ

پرویز شاہدی نے اپنی غزل کے ایک شعر کا دوسرا مصرعہ پڑھا ؎

حُبابوں کا کلیجہ پھٹ گیا ساحل کے غصہ پہ

"سی ڈالیے"

"آپ ہی اپنے ہنر کا کمال دکھائیں۔ مجھے خیاطی نہیں آتی"

حمید عظیم آبادی کے کسی شعر میں لفظ "چار" نظم ہوا تھا۔

داد دی گئی "حدودِ شرع کے اندر ہی ہیں"

برجستہ جواب۔ "چونکہ میرے یہاں متعہ جائز نہیں"

مجاز آئے تو پہلی ہی بار ہاتھوں ہاتھ لیے گئے۔ ان کی آواز۔ ترقی پسند شاعری اور سب سے زیادہ سادگی اور شگفتہ مزاجی نے

دیریا نقوش چھوڑے ۔

"تیرے ماتھے پہ آنچل ...."

نظم شروع ہی کی تھی کہ گیلری سے کسی بچہ کے رونے کی آواز آئی ۔ اس فریاد بے ہنگام کو خاموش کرانے کے لیے مجاز نے غالب سے مدد مانگی ۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

نقش تازہ کی فریاد آنچل تلے گم ہوگئی ۔

ساغر نظامی اپنے وجیہہ قد و قامت نفاست پسندی مخصوص ترنم اور بعض معرکہ آرا نظموں کی وجہ سے کافی ہر دلعزیز رہے۔ بار بار پڑھوائے جاتے ۔ فرمائشیں ہوتیں ۔ نہایت فراخ دلی سے پورا کرتے ۔ ایک دفعہ کسی نے ارادی یا غیر ارادی طور پر نعرہ داغ دیا۔

"شاما ! شاما !"

"وہ میرے باغ میں نہیں چہچہاتی ۔"

مقامی اساتذہ میں مولانا نظام الدین بلخی تخلص کا پورا نام ہی تخلص تھا ۔

نظام الدین بلخی کہہ رہا ہے حال دل اپنا

اور مبارک عظیم آبادی کافی خراج داد و تحسین وصول کرتے ۔ مبارک عظیم آبادی کے تحت اللفظ پڑھنے کا ایک خاص انداز تھا ۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں کبھی بند ہوتیں اور کبھی کھل جاتیں ۔ ہاتھوں اور انگلیوں کی جنبش تیز ہو جاتی ۔ کبھی ادھر مخاطب ہوتے اور کبھی ادھر ۔ ایک بار طلبا کی طرف متوجہ ہوئے ۔

عشق کی چوسر کس نے کھیلی ، یہ تو کھیل ہمارے ہیں

دل کی بازی مات ہوئی تو جان کی بازی ہارے ہیں

عمر کٹی ہے لالہ رخوں میں ، دیکھی ان کی فصل بہار

آج بھی گل سے گالوں والے ہم کو مبارک پیارے ہیں

ان کے مخاطب صحیح دراصل ایک نوجوان ، خوب رو شاعر تھے جو اس وقت ضرورت سے زیادہ شور مچا کر اپنی روشنیٔ طبع بکھیر رہے تھے ۔

طلبہ کی جماعت میں یحییٰ اور رضا تحت اللفظ پڑھتے ۔ یحییٰ ہم عمروں کی برمحل داد و بیداد پر شکریہ کے ساتھ مسکرا دیتے رضا زبان نثر اور شعر ، دونوں میں ڈانٹتے ۔ میں ترنم سے پڑھتا ۔ اساتذہ دل بڑھاتے ۔ ہم سخن کبھی کبھی جلہ بازیوں کے پھول نچھاور کرتے ۔ ہم عصروں میں ہیجور سہسرامی مرحوم جوان دنوں مدرسہ شمس الہدیٰ کے طالب علم تھے ۔ اپنی بلند آواز ، دلکش ترنم اور کلام کی خوبی سے ایک سماں باندھ دیتے ۔ ان کی طرح غزل کا ایک شعر اب بھی یاد ہے ۔

پہلے تو بھر محبت میں تھپیڑے کھا لوں

پھر تو جس موج کو کہہ دوں وہی ساحل ہو جائے

ایک اور ہم عصر کا نام بے اختیار یاد آ گیا ۔

ہر شاخ پہ اُلو بیٹھے ہیں، انجام گلستاں کیا ہوگا

یہ مصرع اکثر موقعوں پر دہرایا جاتا ہے۔ لیکن آج تک کسی کو پتہ نہیں کہ اس کا خالق کون تھا۔ میں بتاتا ہوں۔ سیّد محمد ہاشم عظیم آبادی مرحوم۔ "الف۔ بے" کے زمانے سے میٹرک تک میرے ساتھی رہے ہیں۔ مشقِ سخن کی مشقّت کا آغاز بھی ساتھ ہی ہوا۔ میٹرک کے بعد میں آرٹس کی جانب رجوع ہوا۔ انھوں نے سائنس کا رُخ کیا۔ کالج کے زمانے میں سنجیدہ اور مزاحیہ دونوں قسم کی شاعری کے نمونے مشاعروں میں پیش کیے۔ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تو وہاں کی رنگینیاں خالص غیر ملکی اور مخلوط ملکی اور غیر ملکی حسن ملیح و صبیح کی عطر بیزیاں اور شعلہ سامانیاں متاثر نہ کر سکیں۔ دامن بچا کر صاف نکل گیے۔ ڈاکٹر بنے۔ ممتاز عہدوں پر فائض ہوئے۔ مصروفیت کے باوجود، مشقِ سخن جاری رہی۔ دل کش کلام کے نمونے ایک ضخیم بیاض کی شکل میں محفوظ تھے۔ نہ جانے کیا ہوئے۔ سید نظیر حیدر مرحوم (سابق ام۔ ال۔ سی۔ روزنامہ صدائے عام پٹنہ کے مالک اور اڈیٹر) سے قرابت قریبہ تھی۔ ممکن ہے ان کے ورثا کو علم ہو۔ ہاشم مرحوم کے مصرع کی اصلی شکل یوں تھی ؂

ہر شاخ پہ اُلو بیٹھے تھے، انجام گلستاں کیا ہوتا

اس زمین میں، میں نے بھی کچھ یوں ہی سی سنجیدہ غزل کہی تھی جس کو حافظہ نے یاد کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

ہ

پٹنہ کی ادبی فضا اُس وقت کیا تھی اس کی ہلکی سی جھلک آپ نے دیکھ لی۔ مشاعرہ بازی کے سلسلہ میں ایک اور دل چسپ باب کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ انہیں دنوں، رضا کی تحریک پر صنعتِ معرّا عن المعنی یعنی بے معنی اشعار کہنے کی مہم چلائی گئی۔ کچھ انفرادی، کچھ پنچایتی کوششوں سے اس مہم نے بعض موقعوں پر شان دار کامیابی حاصل کی۔ اس امر کی نشان دہی ضروری ہے کہ اس صنف شاعری کی ایجاد کا سہرا پنچایت والوں کے سر نہیں۔ بنیاد بہت پہلے حضرت آتش یا ان سے بھی قبل پڑ چکی تھی ؂

مور رچہ محمل میں دیکھا، آدمی بادام میں
ٹوٹی دریا کی کلائی، زلف الجھی بام میں

حضرت شاد نے بھی اپنی نوجوانی میں احباب اور بے تکلف دوستوں کی تفریحِ خاطر کے لیے اس صنف شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں۔ اس کا ذکر "شاد کی کہانی شاد کی زبانی" میں موجود ہے۔ ان بزرگ اساتذہ کی سعی کامراں، محض سخن ناشناسوں کی آزمائش اور انبساط طبیعت کے لیے تھی۔ اس صنف سخن کی کوئی ارتقائی یا لیدہ شکل سامنے نہیں آئی۔ اراکین پنچایت نے اسے بہ طور فن اختیار کیا اور بہت سے نادر نمونے پیش کیے۔ صنعت معرّا عن المعنی میں اشعار کی تخلیق سے پہلے، پنچایت میں بہ اتفاق رائے یہ فیصلہ ہو جاتا تھا کہ کس رکن یا اراکین کو مل کر اس وقت کے کس کس اہم مشہور اور مقبول شاعر کے لباس سخن میں طبع آزمائی کرنی ہے۔ اور کون سا مقام اس طبع آزمائی کی نمائش کے لیے موزوں ہوگا تاکہ بہتر سے بہتر دادِ تحسین کے انعامات مل سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں۔ اس کے علاوہ، بامعنی الفاظ کی بے معنی نشست۔ تشبیہوں اور استعاروں کا بہ ظاہر حسن کارانہ استعمال اور تمام لوازماتِ شاعری کی پابندی کے ساتھ ایسے اشعار کی تخلیق، جو طلوعِ آفتاب کے وقت دریا کی سبک رو موجوں کی طرح جگمگاتے اور چمکتے نظر آئیں، لیکن ذرا ڈوب کر دیکھا جائے تو دریائے معنی کا کوسوں پتہ نہیں، بہت مشکل ہے

اس لحاظ سے مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے خیالِ خاطرِ احباب نے مہمیز بھی کی تو سمندِ فکر ذوقِ سکندری کھا گیا۔ اس منزل سے آگے قدم نہ بڑھ سکے۔

کاش سے لے ڈوبے تپ شوقِ لعا کشتی یاس
آہ سوزاں مری خمیازۂ طوفاں ہو جائے

پروفیسر کلیم الدین احمد اپنے مخصوص انداز میں رقمطراز ہیں "ایک زمانہ تھا کہ غالب نے اعتراضوں سے تنگ آکر کہا تھا۔

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور آج ان کے بھدے اور بے معنی اشعار میں فنی حسن کاری اور لطیف، گہرے معانی کی تہیں پائی جاتی ہیں۔" اس رائے میں اس حد تک تو ضرور متفق ہوں کہ غالب کے آفاقیت بداماں اشعار کی صف میں کچھ ایسے شعر بھی نظر آجاتے ہیں جن کے مفہوم آج تک میری ذہنی گرفت میں نہ آسکے۔ احباب اگر میری کند ذہنی کا ماتم بھی منائیں تو غم نہ ہوگا۔ غالب تو خیر ایک عظیم شاعر تھے اہلِ علم تاویل کا کوئی نہ کوئی گوشہ نکال ہی لیتے۔ اگر مندرجہ بالا اشعار میں بھی کوئی سخن فہم "لطیف، گہرے معانی کی تہیں" پالینے میں کامیاب ہو جائے تو مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔ رضا بھی یقیناً خوش ہوں گے جنہیں با معنی اور بے معنی دونوں قسم کے اشعار کہنے پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

کالج سے نکلنے اور ملازمتوں میں آنے کے بعد بھی یہ روایت جاری رہی۔ کیسے کیسے سخن سنج اور سخن فہم اس کی زد میں آئے اور حکمہ کھا گئے، تفصیل نہ پوچھیے اوروں کا تو کیا ذکر اپنوں ہی میں ایک صاحب جو پنچایتی شاعری کے ایک اہم رکن تھے، ایک دفعہ زبردست غچہ کھا گئے۔ نہ جانے اس شاعری کے یادگار نمونے کہاں گم ہو گئے! پنچایت کو ان کی ادبی اور تاریخی اہمیت کا احساس نہ تھا۔

(سلسلہ شمارہ مارچ میں)

(مراسلے)

● سالنامہ پسند آیا۔ بہت خوب ہے۔

یوسف ناظم۔ بمبئی

● آپ کا ڈرامہ نمبر اہم ہے مگر ترتیب اور مضامین میں کسر رہ گئی۔ (ڈاکٹر) اخلاق اثر، بھوپال

● شگوفہ کا ڈراما نمبر دیکھا۔ چند خامیوں کے باوجود بہت خوب ہے۔ خصوصاً اُردو رسائل میں یہ ایک یادگار دستاویز ہوگی آپ اور ساگر صاحب کی پُرخلوص کوشش پر مبارکباد قبول فرمائیں۔

شاہ نواز اثر، بمبئی

● قہقہوں کی نو بہ نو سوغات لیے شگوفہ کا سالنامہ نازل ہوا۔ حسبِ روایت اس بار بھی آپ نے ہندوستان کے سب سے زیادہ قد آور، مزاح نگاروں کی محفل جمادی ہے۔ میر محفل ہیں بکر تونسوی (خدائے برتر انہیں صحت و تندرستی کی لازوال نعمتوں اور فکر و تخیل کی بے مثال شگفتگیوں کے ساتھ برسہا برس رکھے) کہ جو دکھوں کی تاریکیوں کو مزاح کی پھلجھڑیوں سے مسلسل روشن کئے ہوئے ہیں۔ احمد جمال پاشا نے امتحان پاس کرنے کے بے حد کارآمد مجرب اور آزمودہ نسخے پیش کئے ہیں یقیناً بہتوں کا بھلا ہوگا۔ وجاہت علی سندیلوی صاحب مانا کہ "یہ زندگی ہماری ہے لیکن ایک نظر ادھر بھی کہ رشید قریشی جو آئینہ لیے کھڑے ہیں اس میں بڑھاپے کے جھریوں دار خدوخال دیکھ کر یوسف ناظم نے اپنا تمام پروگرام بالائے طاق رکھ دیا ہے وہ تو خواجہ عبدالغفور ہیں کہ ایسے میں بھی طنزیہ موڈ بنا کر مزاح پیدا کرنے کی جستجو میں مگن ہیں۔ تعجب ہے کہ شفیقہ فرحت اس ایٹمی دور میں بھی دمڑوں پر جی رہی ہیں جبکہ عاتق شاہ نے گوشت کی دکان کھول کر موقع شناسی کا ثبوت دیا ہے جہاں مسیح انجم اپنا بوننا لیے پہنچ گئے ہیں۔ مراقبے، چلّے، گھوڑے اور گدھے کے علاوہ ایک اور مخلوق ہے جو انڈوں پر بیٹھ کر تخلیق کے نشہ میں سرشار دکھائی دیتی ہے۔ یہاں پرویز یداللہ مہدی کہانی پر بیٹھے ہیں۔ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔ چونکہ مسعود کمال نے ہیٹ والا صاحب کے انتقال کی خبر سنائی طارق جامی کرسی پر ڈٹ گئے۔ ادھر ڈاکٹر حبیب ضیا سوچتے رہیں کہ اب تک ایسا نہیں تھا جبکہ فرحت قران تمام باتوں سے بے نیاز لذتِ لحاف سے اکتسابِ فیض کر رہے ہیں۔ سید نصرت نے ان تمام مسخروں کے لیے کویت ایک اسپیشل بس بھجوائی ہے جس کی پیشانی پر حیدرآباد۔ کویت حیدرآباد جلی حروف میں لکھا ہے۔ اتنے میں لئیق صلاح کسی حجام کی دکان سے آئینہ اٹھا لائیں۔ کہ پہلے ذرا اپنے مضحکہ خیز چہرے تو ملاحظہ فرمالیں بطور اختتامیہ سلیم مقصود نے تمام شرکاء محفل کا کچا چٹھا بیان کردیا۔ لیکن اختتام سے پہلے اچانک ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید نے سلیمان خطیب (مرحوم) اور ان پڑھ بھونگیریا نے گلی ملنگ دی (مرحوم) کی یاد دلا کر ارباب محفل کی آنکھوں کو نم کردیا۔ چلتے چلاتے 'نورین اور ثبات' کو سامنے رکھ کر بال کی کھال نکالی گئی.....

اور ہاں ان انواع و اقسام کے لذیذ چٹخارے دار اور مرغن کھانوں کے ساتھ اس دسترخوان طنز و ظرافت پر جابجا چٹنیوں کی خوش رنگ شیشیاں بھی رکھی تھیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اس بار چٹنیاں زود اثر ہوسکنے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسا ذائقہ دار تھا کہ اکثر مدعوئین نے کھانوں پر کم توجہ دی لیکن تمام چٹنیاں چٹ کر گئے۔ خدا خیر کرے۔

محبوب ماہی، آکولہ

● سالنامہ نظر نواز ہوا۔ امید سے زیادہ مضامین و شعریات کی رنگینیاں آنکھوں کو چکا چوند کر گئیں۔ آپ کی کاوشیں واقعی ارتقا کی منازل طے کر رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کا اردو ادب آپ کے بامقصد مزاحیہ ادب پر ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔

بے دھڑک

مدراسی

میر شمس الدین فیض
CARTOON ; SHOEB
TITLE PRINTED AT STANDARD

shoeb

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ماھنامہ

جلد ۱۳ شمارہ ۳

مارچ ۱۹۸۰ء

سالانہ ۲۲ روپے
بیرونِ ہند سے ۳۵ شلنگ
فی پرچہ ۲ روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد
بائنڈنگ : محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس ، پرانی حویلی

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون : 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

کرنل محمد خاں

لندن: تجدیدِ مُلاقات

تاریخ ہوائی جہاز میں بھی اپنے آپ کو دہراتی ہے

جنیوا سے لندن تک کا سفر مختصر بھی تھا اور بے ہنگامہ بھی۔ یہ نہیں کہ مختصر وقت میں کوئی کارآمد واردات نہیں ہوسکتی۔ مثلاً مسز ش ہی اپنی نشست سے اُٹھ کر حسبِ سابق خیر سگالی کا چکر کاٹ سکتی تھیں اور چیدہ چیدہ مسافروں کو اپنی عارضی رفاقت کا سُرور بخش سکتی تھیں لیکن خلافِ توقع موصوفہ نے اپنی جگہ سے جُنبش نہ کی اور ــــــ بقول ایر ہوسٹس ــــــ یہ نہیں کہ وہ خود آمادۂ جنبش نہ تھیں، بے حد تھیں۔ فقط یہ اُن کی جفا کار نیم بالغ بیٹی انہیں مانعِ خرام تھی۔ یعنی ظالم نے مادرِ مجبور کے حفاظتی بند کا سِرا مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ ماں دُخترِ آزاد ہو کر جہاز نوردی نہ شروع کر دے۔ نتیجتاً بے چاری شکم بجولاں ماں سر پھیر کر پیچھے آزاد ہمسفروں پر حسرت کی نگاہ بھی نہ ڈال سکتی تھی۔ ہاں سامنے کی کھڑکی سے تیرتے بادلوں اور اُڑتے سارسوں کے قافلے دیکھ کر اپنی قید کی گھڑیاں ہلکی کر سکتی تھی ــــــ خیر یہ واقعہ تاریخ میں پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔ اس سے قبل آگرے کے قلعے میں ایک باپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی سلوک ہو چکا تھا۔

خوشدامن برطانیہ ناراض معلوم ہوتی ہے

پھر اچانک لندن کے قرب کا اعلان ہوا اور کھڑکی سے لندن کے بُرج و بام نظر آنے لگے، چند دس سال پہلے کے جانے پہچانے مگر بے شمار اَن دیکھے، اَن جانے۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایرپورٹ پر اُترے تو پُرانے تعلقات

کے باوجود اُسے پہچان نہ سکے اور یہ اجنبیت ائیر پورٹ کے در و دالان اور راہ و رسم تک ہی محدود نہ تھی۔ اس کے مزاج میں بھی ـــــ جو کبھی دوستانہ ہوا کرتا تھا ـــــ ایک واضح بیگانگی بلکہ مخاصمت سی تھی۔ وہ مہر و وفا کے پتلے یعنی کسٹم اور امیگریشن کے کارندے اب بچھو کے ڈنک کی طرح علامت استفہام بنے بیٹھے تھے۔ سارے آنے والوں کے لیے نہیں صرف کالوں کے مقابلے میں اور کالوں میں سے بھی پاک و ہند سے آنے والے مسافروں کے خلاف حیرت ہوئی۔ سوچا، کیا وجہ ہے؟ بلکہ ایک پاس سے گزرتی ہوئی میم سے دبی زبان سے پوچھا بھی کہ میڈم:

اب وہ الطاف نہیں ہم پہ عنایات نہیں
بات یہ کیا ہے کہ پہلی سی مدارات نہیں

میڈم بے رُخی سے دیکھتی ہوئی جواب دیئے بغیر گزر گئی۔ اگرچہ اس کی خاموشی باآوازِ بلند کہہ رہی تھی کہ خورشدامن برطانیہ پاک و ہند کے سمدھیانے ہی میں رہ کر مہربان ہوتی ہے کہ داماد سے زیادہ اُسے داماد کے خزانوں سے محبت ہے لیکن خانہ دامادوں سے اُسے پیار نہیں کہ اُسے سودے میں گوری بیٹی ہی ہاتھ سے نہیں جاتی اور ـــــ اس کے جانے کا ایسا رنج بھی نہیں ـــــ انگریزی زر بھی جاتا ہے جس کا رنج بے شک گراں ہے۔ پاک و ہند کے مسافر لاکھ کہیں کہ اے زیر پرستانِ برطانیہ، ذرا تاریخ دیکھو۔ تمہارے پونڈوں کے نوٹوں میں ہمارے پسینے کی بُو ہے اور اے عشوہ گرانِ انگلیسیہ، تمہارے عارضوں کی سرخی میں ہمارے جگر کا لہو ہے لیکن انہیں تاریخ یاد دلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ کہتے ہیں: "کون سی تاریخ؟ برطانیہ کی سرکاری ہسٹری میں تو ایسی کسی واردات کا ذکر نہیں۔ وہاں" صرف انگریزی خون پسینے کی باتیں ہیں)۔"

تلخ نوائی معاف، دراصل ہماری خفگی اپنے لیے نہ تھی۔ اپنے وطن اور ہم وطنوں کی خاطر تھی جنھیں دروازے پر گستاخانہ جرح کے لیے روک لیا گیا تھا ورنہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ ہم تو ہرمیجسٹی کے اپنے مہمان تھے۔ چنانچہ ہم سے چار و ناچار ایک درمیانہ درجے کے وی آئی پی کا سا سلوک کیا گیا۔ ادھر ہم جنگلے کے پاس پہنچے، ادھر سامنے سڑک کے کنارے باوردی شوفر نے کالے رنگ کی کار روکی جس سے ایک معتبر سا انگریز نکلا اور سیدھا ہم تک پہنچا۔ پھر حسب معمول ایک پلاسٹک کی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سے مخاطب ہوا:

"میرا خیال ہے آپ ہی سٹرخان ہیں؟"

یہ ہمارا گائیڈ تھا ـــــ ہم نے اس کے خیال کی تائید کی اور اس کے اشارے پر ہمارے کاغذات پر مؤدبانہ مہریں ثبت ہونے لگیں۔ یہ ہو چکا تو ہمیں باملاحظہ کار تک لے جایا گیا۔ کار میں داخل ہوتے ہوئے پیچھے دیکھا تو مسز شں کا الوداعی بازو بلند ہو رہا تھا جیسے بیٹی شں اُبھرتی سے پست کرنے میں مصروف تھی۔ بہرحال اس کمسن آمرہ کو اپنی ماں کے بازو پر اختیار سہی، ہمارے بازو پر اختیار نہ تھا۔ چنانچہ جواب میں ہم نے اپنا بازو پورے پاکستانی جوش سے لہرایا لیکن مسز شں ابھی برطانوی نکیرین کے سامنے اپنے نامۂ اعمال کی انگریزی ہی بنا رہی تھی کہ ہماری کار شہر کو چل دی۔

ہم انسان ہیں پیالے نہیں

کوئی آٹھ بجے شام کا وقت تھا لیکن سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں اور موسم خوشگوار تھا۔ چنانچہ طبیعت میں بتدریج خفگی کی جگہ شگفتگی لینے لگی۔ ائرپورٹ سے باہر نکلے تو گائیڈ نے ایک لفافہ پیش کیا اور استدعا کی کہ اسے ابھی کھول کر پڑھیں کہ اس میں کل اور اگلے چند روز کا پروگرام ہے۔ یہ بات ہمیں بابوانہ سی لگی کہ چلتی گاڑی ہی میں فائل کھول کر بیٹھ جائیں لیکن ناچار لفافہ کھولا۔ اس میں دو کاغذ تھے۔ پہلا ایک مس پیرس کی طرف سے محبت نامہ تھا کہ ڈیئر کرنل سے شروع ہوتا تھا اور لکھا تھا کہ فدویہ کو برطانوی ادارے کی طرف سے آپ کے پروگرام آرگنائزر ہونے کی عزت اور خوشی نصیب ہوئی ہے اور اب آپ سے ملاقات کے لیے چشم براہ ہوں۔ لیکن ملاقات سے پہلے کیا آپ کل صبح چار بجے کی گاڑی سے ایڈنبرا جانا پسند نہ کریں گے؟ میرا خیال ہے ضرور پسند کریں گے کہ سکاٹ لینڈ کا حسن آج کل جوبن پر ہے۔ چنانچہ یہ ریل کا ٹکٹ ارسال خدمت ہے۔ آپ کے رات کے قیام کے لیے گریٹ ناردن ہوٹل میں، جو کنگ کراس اسٹیشن کے پہلو میں ہے، کمرہ ریزرو کر دیا گیا ہے۔ آپ کو ہوٹل سے گاڑی تک جانے میں صرف چند قدم چلنا ہوگا —— اور آخر میں بآرام قیام اور پُرلطف سفر کی دعاؤں کے بعد ہماری مخلص مس پیرس کے دستخط تھے جسے گائیڈ مس پارس کہنے پر مُصر تھا، انگریزی الفاظ کے متعلق ہمارا تجربہ ہے کہ ان کے ہجوں کی بجائے تلفظ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ ہمیں پارس اور زیادہ پسند آیا کہ شاید موصوفہ اسم بامسمیٰ ہوں —— دوسرے کاغذ میں سکاٹ لینڈ کے مختلف لوگوں سے ملاقاتوں اور مصروفیتوں کی تفصیل درج تھی۔ کچھ سوچنے کے بعد ہم پر منکشف ہوا کہ ہم گھر سے مہمان ہو کر آئے ہیں لیکن سلوک ہم سے ذرا معزز سے ہرکاروں کا سا کیا جا رہا ہے یعنی ابھی منزل پر قدم رکھا نہیں اور اگلے سفر کا سامان تازہ ہو چکا ہے۔ ہم نے سوچا کہ اس غلطی کا اسی وقت ازالہ ہونا چاہیئے چنانچہ گائیڈ سے کہا:

دیکھو میاں۔ ہم سات روز سے سفر میں ہیں۔ اتنی فوری گردش ہمیں موافق نہیں کہ اور بہت کچھ ہونے کے علاوہ ہم انسان بھی ہیں، پیالہ و ساغر نہیں۔ سمجھے؟"

غالباً کچھ نہ سمجھا لیکن ہم نے سلسلۂ کلام جاری رکھا:

اور باقی رہی مس پارس، تو اسے تمہاری معرفت، بعد از سلام محبت واضح ہو کہ ہم فی الحال ایک دو روز لندن ہی میں قیام کریں گے اور تازہ دم ہو کر کسی وقت اسے ملنے کو بھی آئیں گے اور پھر آرام سے مزید گردش اور پیار کی باتیں کریں گے؟ —— اور دل ہی دل میں سوچا:

"کیا عجب کہ آج کل مس پارس کا حسن بھی سکاٹ لینڈ کی طرح جوبن پر ہو؟"

گائیڈ سرِ تسلیم خم کرنے میں ذرا ہچکچایا لیکن ہمارے تیور دیکھ کر خاموش ہو گیا اور ہمیں ہوٹل میں اُتار کر رخصت ہو گیا۔

انگریزی بولنے سے میمیں مطیع ہوتی ہیں

گریٹ ناردن ہوٹل لندن کے پاش ہوٹلوں میں سے تو نہیں لیکن اس کا ایک اپنا قدیمانہ انداز اور رئیسانہ

ماحول ہے۔ جدید ہوٹلوں میں اور اس میں وہی فرق ہے جو گلبرگ کے بنگلوں اور قلعہ معلّی کے محلات میں ہے ـــــ اور ہمیں یہ ماحول بہت بھایا کہ ہم بھی وطن میں دیسی رؤسا میں شمار ہوتے ہیں اگرچہ وطن میں "دیسی شرفاء کے لیے بہترین ہوٹل" لنڈے کے گرد و نواح ہی میں پائے جاتے ہیں۔

ہر چند کہ ہماری شہرت برطانوی میزبانوں کی معرفت ہوٹل کے رجسٹروں تک پہنچ چکی تھی تاہم ہم نے ہوٹل کی استقبالیہ سے اپنا اور اپنے پاسپورٹ کا تعارف کرایا۔ ریسپشن کلرک سے کہ ایک شیریں دہن ساحرہ تھی، فوراً بے تکلفی کے ساتھ ایک دل لگی کی بات کی۔ کمرے کو جاتے ہوئے پورٹر سے سرپرستانہ گفتگو کی۔ کمرے میں پہنچ کر روم میڈ سے مشفقانہ علیک سلیک کی اور کمرے کے ٹیلی فون سے "سروس" سے چند سوال کیے۔ اِس اثنا میں ہم نے جو کچھ کہا کہ ہو جائے، ہوگیا اور جو کچھ چاہا کہ آجائے، آگیا۔ گویا ہم ان لوگوں سے باتیں نہیں کر رہے تھے، الہ دین کا چراغ رگڑ رہے تھے۔ ہمارے کام سوئٹزرلینڈ اور لبنان میں بھی رُکے تو نہ تھے لیکن ایسی آسانی اور روانی کے ساتھ کبھی چلے بھی نہ تھے۔ وجہ ڈھونڈی تو وجہ یہ نکلی کہ ہم زبانِ یار بھی اتنی ہی آسانی اور روانی سے بول رہے ہیں جیسے خود یار بولتا ہے اور فقط بولتا کیا؟ انگریز کی غلامی، برابری اور آقائی کے دنوں میں ہمیں انگریزی پر اس قدر عبور حاصل ہوگیا تھا کہ انگریزی میں بولنے کے علاوہ لڑ بھی سکتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تھوڑی دیر پہلے گائیڈ لاجواب ہوکر اور کورنش بجا لاکر نہوڑائے چلا گیا تھا۔ اور اب روم میڈ ہماری انگریزی سن کر حیرت سے پوچھنے لگی تھی کہ کیا ہم کبھی کیمبرج میں بھی رہے تھے؟ جس کے جواب میں ہم نے کسی قدر لاپرواہی سے کہہ دیا "او یس" اور اس میں کچھ مبالغہ ضرور تھا لیکن جھوٹ نہ تھا کیونکہ پچھلی مرتبہ جب ہم انگلستان آئے تھے تو پورے دو گھنٹے کیمبرج میں گزارے تھے یہ دوسری بات ہے کہ کیمبرج کے قیام کا سوال ہم سے روم میڈ ہی نے پوچھا۔ کسی پڑھے لکھے انگریز کو ایسی خوشگوار غلط فہمی کی توفیق نہ ہوئی ـــــ لیکن خیر، وہ انگریزی بھی بُری نہیں ہوتی جس سے نچلے درجے کے انگریز اور میمیں مطیع ہو جائیں۔ چنانچہ اس رات ہم ایک فتحمندی کے احساس سے موئے اور ساری رات روم میڈیں ہمارے پاؤں دابتی رہیں: خواب میں۔

دوسرے روز ناشتے سے فارغ ہوکر لونج میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ ایک انگریز ہمارا نام لیتے ہوئے ہم تک پہنچا۔ معلوم ہوا ہمارا گائیڈ ہے جو کل والے گائیڈ سے مختلف ہے اور یہ کہ اس کا نام جو کچھ بھی تھا، اِس کا نام نارمن گولڈہل (NORMAN GOLDHILL) ہے اور مزید یہ کہ ہمیں مس پارس تک لے جانے کو آیا ہے کیونکہ موصوفہ کا جیا ہماری ملاقات کے لیے بیقرار ہے۔ ہم نے مصلحتاً یہ نہ پوچھا کہ مس پارس نے پچھلی رات بھی اختر شماری ہی میں کاٹی تھی یا یہ درد کی ٹیسیں آج صبح دفتر میں آکر اٹھی تھیں اور اس کے ساتھ ہولیے۔

(باقی آئندہ)

معذر

بس اسٹینڈ

بس اسٹینڈ اس جگہ کا نام ہے جہاں بسیں آتی اور جاتی ہیں سوائے اس بس کے جو ہمیں مطلوب ہے۔ یہ گاڑیاں اکثر لیٹ آتی ہیں اور آکر بے فکری سے لیٹ جاتی ہیں اور مسافروں سے بے نیاز لیٹی ہی رہتی ہیں۔ یہ یقیناً ایسا ہی ہوتا ہے جیسے کوئی دلہن حجلۂ عروسی میں استراحت فرما ہو۔ اب کوئی بے صبرا اُسے چھیڑ دے تو مختلف سمتوں سے خاکی وردی والے اُسے اندر اور باہر سے جھنجھوڑ ڈالتے ہیں۔ ان وردی پوشوں کے ہوش کبھی ٹھکانے نہیں رہتے۔ گردن ہمیشہ ٹیڑھی پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی ٹیڑھی گردن میں جو حلق ہوگی اس سے نکلنے والی ہر بات ٹیڑھی ہی ہوگی۔ ان لوگوں کے پاس ہر سوال کا ایک ہی جواب ہوتا ہے معلوم نہیں، اور اس 'نہیں' کی نوک سے یہ ظالم گویا کلیجہ ہی نکال لیتے ہیں۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کوئی بس آئے گی بھی یا نہیں اور آئی تو کہیں لے جائے گی بھی یا نہیں۔ اس صورت حال پر گنہ گاران سفر اندر ہی اندر ہی اندر کھنچتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں کہ بس اسٹینڈ پر اس کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔

یہاں کوئی کسی کی فکر نہیں کرتا۔ ہر نفس سر پر پاؤں رکھے بھاگنے کی فکر میں ہوتا ہے۔ آہ! کتنے اچھے تھے وہ دن جب ہمارے پاؤں تو ہمارے سر پر نہیں تھے اور موجودہ تیز رفتاری ہماری زندگی میں داخل نہیں ہوئی تھی مگر اب تو داخل ہو چکی ہے اور ہمیں یہ سوچ کر صبر کر لینا چاہیے کہ جو چیز ہو جاتی ہے اسے سنبھالنا ہی پڑتا ہے۔ آج ایک دو نہیں ہزاروں لاکھوں کے کندھوں پر اس قسم کا بوجھ ہے۔ غرض بس اسٹینڈ پر سب "نفسی نفسی" کے عالم میں ہوتے ہیں! کیا جوان کیا بوڑھے، کیا مرد کیا عورتیں۔

عورتیں یہاں دو قسم کی موجب ہنگامہ ہوتی ہیں۔ وہ جو ریزگاری گنتی رہتی ہیں اور وہ بھی جن کا نوٹ صحیح سالم ہوتا ہے۔ کرارے نوٹ جن عورتوں کے پاس ہوتے ہیں وہ عموماً ناک چڑھی ہوتی ہیں۔ مزید برآں آتش زیر پا۔ اس طرح صنف نازک کا زبردست ہنگامہ وقفے وقفے سے بس اسٹینڈ کے مختلف کارنرس میں سفر کرتا رہتا ہے۔ سڑکوں پر بسیں اور بس اسٹینڈ پر ہنگامے گردش کرتے رہتے ہیں۔

بس اسٹینڈ پر جیب کترے نام کی بھی ایک مخلوق پائی جاتی ہے۔ یہی ان کی جائے پیدائش، یہی ان کی تربیت گاہ اور میدان عمل ہوتا ہے۔ وہ یہیں آپس میں ایک سے "دو" اور مسافروں سے دو چار ہوتے ہیں۔ دو چار ہونا اور نو دو گیارہ ہونا اُن کے دل چسپ کھیل ہیں۔ نو دو گیارہ ہونے میں پانوں کا کمال دکھایا جاتا ہے۔ غالب کے دیوان میں شب رو کا نقش قدم مل جائے گا مگر بس اسٹینڈ پر جیب کتروں کا نہیں ملتا۔ ایک بہت دل چسپ بات یہ ہے کہ آپ کی جیب میں جیب کترے کی انگلیاں نہ بھی داخل ہوں تو رقم کی ڈیلیوری بہر حال ہو جاتی ہے

بس اسٹینڈ تک آنے والی سڑکوں سے کوئی بازی نہیں لے جاسکتا۔ ہر آن بڑھتی ہوئی بھیڑ سے ایسا خوف ہوتا ہے گویا یہ سب ہمارے گھر پیدا ہو رہے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی سے سرکار اس سیلاب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے جو ایک عام گھریلو زندگی کا سکون بہا لے جاتا ہے مگر یہ سڑک جو بھرا بھڑ، بھیڑ اُگل رہی ہے اس پر ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا کوئی منصوبہ پورا نہیں اترتا اور بس اسٹینڈ کی "رونق" میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہاں اس رونق میں اکثر ایسا اضافہ ہوتا ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ بہر حال ہماری شرافت ہے کہ ہم ٹکٹ کے حصول کے لیے ٹکٹ کی کھڑکی پر لائن میں لگ جاتے ہیں۔ فرض کیجیے اس قطار میں ہمارا نمبر سولہواں ہے۔ بڑھتی بھیڑ دیکھتے ہی دیکھتے ایسا چکر چلاتی ہے کہ ہمارا نمبر چونسٹھواں ہو جاتا ہے۔

جی ہاں! یعنی ہم سے آگے والا ہر ہاتھ بجائے ایک کے چار ٹکٹ والا ہو جاتا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ٹکٹ کی کھڑکی تک پہنچیں ہماری قسمت کے پٹ بند ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اب بس کا دروازہ کیونکر ہم پر کھل سکتا ہے۔ شراب کی دوکان، سینما کی ٹکٹ، غرض ہر جگہ لگنے والی قطار کسی نیتا کا دربار ضرور ہوتی ہے مگر برا ہو بس اسٹینڈ کا کہ اس کی ہزاروں اولادوں میں سے کوئی مشرف بہ لیڈری نہیں ہوتا۔ یہاں ارسطو کا مقولہ کہ "انسان سماجی حیوان ہے" کی صحت پر شبہ ہونے لگتا ہے۔

حصولِ ٹکٹ کا ایک نہ بھولا جانے والا تجربہ ہماری یادداشت پر چسپاں ہے۔ ہوا یہ کہ ایک بار ہم نے اہلیہ محترمہ کو قطار میں کھڑا کر دیا کہ یہ قطار مختصر سی ہوتی ہے (اہلیہ سرو قد ہیں اور یہ وضاحت احتیاطاً ضروری ہے) اہلیہ نے دو ٹکٹ کے لیے آواز اور پیسے آگے بڑھائے تو شرف قبولیت ایک ٹکٹ کو حاصل ہوا اور باقی پیسے انھوں نے میرے حوالے کر دیئے۔ اور خود بس میں جا دھمکیں۔ حسب روایت پروانہ وار کوشش کے باوجود ہمیں پروانہ سفر نہ ملا۔ غالب کے بغیر کوئی کام بند نہیں ہوا تو بھلا کون ہماری پرواہ کرتا۔ پھر بھی ہم خوش تھے کہ بس میں جگہ نہیں ملی یہی کیا کم ہے کہ اب ہم اہلیہ کے بس میں نہیں ہیں۔ وہ اپنے میکے جائیں گی اور ہم چند روز اپنی من مانی کا لطف اٹھائیں گے۔ مگر یہ دنیا ہے جہاں آدمی کو بھی انسان ہونا میسر نہیں تو ہم شادی شدہ ہوکر چند دن کے لیے سہی کنوارے کیونکر بنے رہ سکتے ہیں۔ ہم نے پلکیں جھپکاتے ہوئے دیکھا کہ ایک ٹکٹ کے پیسے بھی گئے اور اکیلے پن کا جو خواب بنا تھا، ٹوٹ گیا یعنی اہلیہ نہیں گئیں۔ مع ٹکٹ کے اتر پڑیں کہ میرے بغیر جانا اس آفت جاں نے پسند نہیں کیا۔ اس آفت کی شکایت خدا سے بھی کیا کرتا کہ مانگنے والا بھی میں ہی تھا!

بس کی لائین میں آگے بڑھنے کو میں سُلو رننگ اسپورٹ، کہتا ہوں۔ اس دوڑ کا ٹریک بہت تنگ اور ناک کی سیدھ میں ہوتا ہے۔ آگے اور پیچھے کے حریفوں سے لنک جوڑے چلنا پڑتا ہے جہاں ٹریک سے ذرا اِدھر اُدھر ہوئے کہ لائین فری ہٹ لگا دیتی ہے۔ یہاں ریفری بھی کھلاڑی ہی ہوتے ہیں۔ اور ان کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوتا ہے۔ ایک بار ہم نے دوبارہ اِنٹری کی کوشش

ی بھی تھی مگر پیدا شدہ خلا کو پُر کرنے والے نے دھمکی دی کہ وہ ہم پر پاکٹ مار ہونے کا الزام عائد کر دے گا۔ چونکہ ہم جانتے ہیں آج کل ہمارے یہاں الزام اور جرم 'مختلف المعنی لفظ نہیں سمجھے جاتے اس لیے باعزت طور پر اپنی شکست کو تسلیم کر لیا۔

سنتے ہیں کہ بنی نوع انسان نے تہذیب کے نام پر ہزاروں سال میں جو کچھ جمع کیا ہے یہ سب دریا میں ڈالا جانے والا ہے۔ ہماری رائے ہے کہ پوری تہذیب کا بوریا بستر لپیٹنے والے تہذیب کے ایک عنصر صرف بس اسٹینڈ کو سمیٹ لیں تو کیا ایسا نہیں ہو سکتا؟

بڑی طاقتوں کو اس مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے۔

میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے

▽△

فرحت قادری
(گیا)

کیوں دخترِ انگور کے نخرے کوئی جھیلے
چھنتی ہے جو گودام سے وہ ساغر میں انڈیلے

خالی ہے ابھی اندھی دشاؤں کا جزیرہ
افکار کی گاڑی کوئی اس سمت ڈھکیلے

اولاد کیا کرتی ہے تنہائی کا شکوہ
اجداد رہا کرتے تھے پیڑوں پہ اکیلے

مچلے تو خلاؤں کی بھی مٹی میں نہائے
انساں ابھی بچہ ہے کوئی کھیل تو کھیلے

رومال کے رکھنے سے کہیں سیٹ بچی ہے؟
ہیرو نہ کوئی آکے جگہ آپ کی لے لے

اُردو کی کتابوں کا اک انبار لگا تھا
ردّی کی دکاں پر نظر آئے کئی ٹھیلے

یہ چوہا مرے شوکیس کا بے باک ہے کتنا
کھا جائے جو خانی بھی اور ڈنڈ بھی پیلے

○

○

جلنے لگتی ہے تو پھر کچھ بھی جلا لیتے ہیں لوگ
غیر کے چولھے پہ دال اپنی گلا لیتے ہیں لوگ

تیل اور ماچس کے پیسے اب بچا لیتے ہیں لوگ
گھپ اندھیرا ہو تو اپنا دل جلا لیتے ہیں لوگ

عقل سے مُنہ موڑ کر شادی رچا لیتے ہیں لوگ
اچھی خاصی زندگی دوزخ بنا لیتے ہیں لوگ

عیب ہو گر آنکھ میں تو یوں چھپا لیتے ہیں لوگ
رات میں بھی دھوپ کا چشمہ لگا لیتے ہیں لوگ

کیا غضب ہے ناگہانی موت سے ڈرتے نہیں
ہو اگر دعوت کہیں تو ڈٹ کے کھا لیتے ہیں لوگ

ہر طرف بس خیریت ہی خیریت ہے ان دِنوں
پوچھ کر پھر خیریت کیوں، بددعا لیتے ہیں لوگ

حیرت و افسوس ہے کہ آدمی ہوتے ہوئے
شکل اپنی ریچھ کی سی کیوں بنا لیتے ہیں لوگ

فیاض افسوس۔ اکولہ

ڈاکٹر کے۔ بھگت وتسل راؤ

کہتے ہیں کہ سیرت کا صورت سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن صورت کئی اجزاء کا مجموعہ ہے۔ مثلاً آنکھ، ناک، کان وغیرہ۔ المیہ شاعری میں رنج کے آنسو بہہ جاتے ہیں تو رزمیہ شاعری میں خوشی کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ دو موتیوں کی طرح اگر آنکھیں ہیں تو ناک جوہر کی طرح ہے۔ یہ صورت کے بیچوں بیچ ہوتی ہے۔ جانوروں کے نتھنے ہی ناک کہلاتے ہیں۔ لیکن انسان ہی ایک ایسا حیوان ہے جسے ناک کا یہ عطیہ خوب صورتی کے لیے ملا ہے۔

نوزائیدہ بچہ یا بچی کی ناک بالکلیہ دبی ہوئی ہوتی ہے۔ جوں جوں مہینے گزرتے جائیں گے آنکھیں ٹھیک ٹھاک ہوتے ہی ناک سامنے آجاتی ہے، لوگ بچوں کو ہمیشہ ناک دبا کر پیار کرتے ہیں۔ حالانکہ بچہ چیخیں مارنے لگتا ہے۔ تب کہہ دیتے ہیں کہ بچہ نئے لوگوں سے ڈرتا ہے ہچکچاتا ہے۔ اس وقت بچے کو ماں کی آغوش میں جانے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں رہا۔ چھوٹے بچوں میں ناک صاف کرنے کی عادت نہیں ہوتی۔ سردی ہو یا بخار کا حملہ پہلے ناک پر ہوتا ہے۔ نہر بن جاتی ہے۔ چند لوگوں کو ناک میں انگلی رکھنے کی عادت رہتی ہے چاہے لیکچر دیں، ہوائی جہاز میں سفر کریں، موٹر گاڑی میں بیٹھیں۔ باضابطہ ایک انگلی سے ناک کی خدمت میں لگے ہوئے رہتے ہیں۔

ناک فیثا غورث کے مثلث کا ہی خاکہ ہے۔ اگر لب پر شگاف ہوتے تو نتھنے ایک نمائشی اشیا رہیں۔ تیز تکونی ناک بھی ہوتی ہے۔ مثلاً ہٹلر کی ناک۔ عجز وانکساری زیادہ رکھنے والے انسان کی ناک، ناک کا آخری حصہ بالکلیہ منجمد نظر آتا ہے، غصیلے انسان کی ناک کے آخری حصہ پر پسینہ کا کر، دو بوند میں ہمیشہ تبخیر کے لیے تیار رہتی ہیں بلکہ پر لالی کا پایا جانا عرق

میں داخل ہے۔ اگر کوئی کہے "ناک کٹوا دوں گا" تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ آپ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے والا ہے۔ یوں تو ہر ایک کے چہرے پر ناک ہوتی ہے۔ لیکن ادیبوں کی ناک، شرابی ناک، جنتا سیوک کی ناک ذرا الگ ہیں۔ محنت کش عوام کی ناک ذرا سخت ہوتی ہے۔ نسوانی ناک موم جیسی ملائم ہوتی ہے۔ ناک معاش کا ذریعہ بھی ہے۔ چند لوگ ناک سے فلوٹ بھی بجاتے ہیں۔ چند لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ناک کے دو سوراخوں سے 'سوہم'، 'داؤہم' کی آوازیں نکلتی ہیں۔ یوگا سن میں ناک کو ٹھیک طریقہ سے نہ رکھیں تو خون کے بہنے کا احتمال رہتا ہے۔ چند لوگ دستی سے، انگلی سے، قلم سے وقت بے وقت ناک صاف کرتے رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ اگر دو منٹ پکڑ لیں تو بے چین نظر آتے ہیں۔ بچّہ یا بچی کی ناک چھیدنے کی رسم بھی لوگوں میں عام ہے۔ اس رسم کی خوشی میں مٹھائی بانٹی جاتی ہے۔ اڑیسہ کے علاقوں میں وزن دار گہنے ناک میں سوراخ کر کے پہنتے ہیں۔ دیکھنے والے کو رحم آتا ہے۔ زیور میں "بلاکی" اہم ہے جو ناک کا گہنہ ہے، کوچی پوری، بھرت ناٹیم، منی پوری میں ناک کی آہٹ سے رقص کا طریقہ بھی رائج ہے۔ عورتیں حیرت کے اظہار کے لیے ناک پر انگلی رکھ لیتی ہیں۔ پتہ پوچھنے پر ہم فوراً کہہ ڈالتے ہیں کہ ناک کی سیدھ سے چلے جاؤ۔ بعض لوگ ناس کے عادی ہوتے ہیں یعنی کہ ناس اُن کی ناک کی غذا ہے۔ وہ اپنی ناک میں ناس کچھ اس طرح بھرتے ہیں جیسے بیگن یا مرچ میں مصالحہ بھرا جاتا ہو۔

اشیائے خورد و نوش کی پہچان زبان سے زیادہ ناک ہی کرتی ہے۔

واہ! ناک بھی انسان کی خدمت میں کس طرح مصروف ہے، لہذا ناک کو سنواریئے، سجایئے اور پاک و صاف رکھیے۔

○○

لئیق صلاح

آج کا اخبار

یہہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ لوگ اسے آج کا اخبار کیوں کہتے ہیں ؟ پتہ نہیں فہم کا قصور ہے یا حقیقت ہے۔ غالباً لوگ پہلے صفحہ کی سرخی سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہوں گے۔ لیکن ذرا نیچے نظر دوڑائیے تو آپ کو سب گزرے ہوئے کل کی خبریں ملیں گی۔ جسے پڑھ کر ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ یہ خبریں تازہ ہیں !

واقعی سوچیئے تو سہی بعض اہم خبریں جس کا جلد سے جلد ہم تک پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ اُس میں اگر تاخیر ہو تو آپ کو کیسا محسوس ہوگا ۔؟ ۔ مثلاً امریکہ کے وزیر خارجہ جان فاسٹر ڈلس اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے ۔ یہہ ایک عظیم سانحہ ہے ۔ جن کے لئے بڑے بڑے ممالک پرچم سرنگوں کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تجہیز و تکفین کے بارے میں مزید معلومات آنے والے دن کے اخبار سے وصول ہوتی ہیں۔

ھاں ! اس سے زیادہ اہمیت رکھنے والی خبریں کرکٹ میچ کی ہوتی ہیں۔ لیکن افسوس جن کے پاس ریڈیو رہتا ہے وہ کامنٹری سن کر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے ہیں ۔ اور بے چارے اخبار پڑھنے والے رات بے تابی سے گذارتے ہیں کہ کب اخبار آئے گا ۔ اور وہ بھی اپنے ساتھیوں سے ، اس کے بارے میں گفت و شنید کر سکیں گے ۔ اتفاق سے پہلے ہی مڈبھیڑ ہوجائے تو ان کو اپنی لاعلمی کا ثبوت نہایت شرمندگی سے دینا پڑتا ہے ۔ ان کی حالت حقیقتاً قابلِ رحم ہوتی ہے ۔ کاش اخبار کا سالانہ چندہ جمع کر کے ریڈیو لے لیتے تو اس شرمندگی سے کیوں دوچار ہوتے ۔

بعض اوقات ریڈیو بھی ان خبروں کے پہنچانے میں نا اہل ثابت ہوتا ہے ۔ جیسے کوئی سانحہ درمیانی رات میں واقع ہو اور زیادہ اہمیت کا حامل ہونے کے باوجود ہم بے خبر ۔ ان خبر رساں ایجنسیوں سے تو ہماری عوام بہتر ہے ۔ جو آناً فاناً معمولی سے معمولی خبر کو ، گو اُس کا سراپا تبدیل کر کے کیوں نہ ہو ہم تک پہنچا دیتی ہے ۔ حکومت ، صحافت اور دوسرے محکمہ جات مثلاً محکمہ اطلاعات و نشریات پر جو کثیر رقم خرچ کرتی ہے ۔ اُس سے تو بہتر ہے کہ ایسے لوگوں کو کم سے کم خرچ پر ملازم رکھ لے ۔ جو بے تار کے تار کی طرح ، ملک کے گوشہ گوشہ میں نئی نئی خبریں پہنچاتے ہیں ۔ عوام کا بھی فائدہ اور حکومت

کے مرفہ میں صد فی صد کمی واقع ہوگی۔

جہاں ایسی خبر رساں ایجنسیوں سے کچھ فائدے پہنچتے ہیں۔ اس کے ساتھ پس پردہ کچھ نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ حال ہی میں، ایک، دو واقعات ہوئے ہیں پہلے آپ بیتی سنیئے۔ پھر پر بیتی۔

۱۹۷۰ء میں حیدرآباد میں، دو چار دن موسلا دھار بارش ہوئی۔ خدا کے فضل سے ہمارے ارباب بلدیہ اس قدر چاق و چوبند ہیں کہ، پانی آنے کے بعد پل باندھنے کو وہ اپنی پہلی Activity سمجھا کرتے ہیں۔ اسی لئے آپ دیکھیں گے کہ سڑک کے کنارے جو Gutters ہوا کرتے ہیں۔ اُن کی صفائی اور ترمیم بارش شروع ہونے کے بعد ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء میں بھی بلدیہ اپنے کارہائے نمایاں سے شہریوں کو حیرت زدہ کرنے ہی والی تھی کہ قدرت کی ستم ظریفی نے "افضل ساگر" کے نالے کو اس قدر طوفان خیز بنا دیا کہ، بلدیہ والوں کے ظرف کی آزمائش اور زیادہ کٹھن ہوگئی۔ اس نالے نے وہ تباہی مچائی کہ بہت سارے جان و مال سے ہاتھ دھو بیٹھے اس کی دہشت سب کے دلوں پر طاری ہی تھی کہ اچانک ایک روز شام یہ افواہ وبا کی طرح پھیل گئی کہ "گنڈی پیٹ" کا بندھ ٹوٹ گیا۔ اب دیکھئے شہریوں کی جو دُرگت بنی، وہ مضحکہ خیز بھی ہے، اور قابل ہمدردی بھی۔

نیا پل، پُرانا پل، مسلم جنگ کا پل اور چادرگھاٹ پل سب پل صراط بن گئے۔ کمال یہ تھا کہ، پرانے شہر والے نئے شہر کی طرف دوڑ رہے تھے اور نئے شہر والے پرانے شہر کی طرف۔ اِن لوگوں نے سنا تھا کہ گنڈی پیٹ سے پانی اُن کی طرف آرہا ہے۔ اور پرانے شہر والے، موسیٰ کی طغیانی کے ڈر سے دوڑے دوڑے نئے شہر کا رُخ کر رہے تھے۔ غرض کسی کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ اس بات پر غور کریں کہ ایک دوسرے کی مخالف سمت کیوں دوڑ رہے ہیں۔ کوئی پیدل، کوئی سواری میں جس کی اپنی ذاتی سواریاں تھیں انھیں زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا، بلکہ ایک ایمرجنسی پکنک منا لیئے لیکن جنھیں کرائے کی سواریوں میں بھاگنا پڑا، اُن کی تو اچھی خاصی حجامت بن گئی۔ منہ مانگے دام دینے پڑے۔ بعض اصحاب تو اور حیرت انگیز کارناموں کے موجب بنے۔ کوئی کوہ پیمائی کرتے ہوئے نوبت پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گئے۔ کسی نے شیر کی طرح درخت پر چڑھنا تو سیکھ لیا، لیکن اُترنے سے محروم رہے۔

چند اشخاص جو اُسی وقت اضلاع کی بسوں سے ڈپو پر اُترے تھے۔ اُنھوں نے جب دوسروں سے سنا کہ دوڑو، دوڑو، تو انھوں نے ایسی دوڑ لگائی کہ کیا کرکٹ کا بہترین کھلاڑی لگاتا ہوگا۔ مکان تھا مراد نگر میں لیکن ناک کی سیدھ میں جو دوڑے تو بس شیر آباد پہنچ گئے۔ ہنگامہ آرائی ختم ہونے کے بعد گھر جو پہنچے تو چار دن بستر سے نہ اُٹھ سکے۔ سنا کہ اسقدر اعضا شکنی ہوئی کہ وہ تلوؤں کو اس سے بہتر سمجھنے لگے بہرحال! بچپن میں "ننھے چوزے" کی جو کہانی پڑھا کرتے تھے۔ وہ من و عن سچ محسوس ہونے لگی۔

۔۔۔ رے چنے پرکاش نرائن "بے موت مرگئے"۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بعد کی زندگی کو دوسرا جنم کہیں یا کیا؟ خیر جانے دیجئے اُن کے جنم والی بات تو بعد میں ہوگی۔ پہلے تو اس خبر رساں ایجنسی کی خبر لینی ہے۔ جس نے ۲۲ مارچ ۸۰ء کو ہی چنے پرکاش جی کو آنجہانی بنا دیا تھا۔ اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ بے چارے کو اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دراصل بے موت چنے پرکاش جی نہیں مرے بلکہ وہ مرگیا۔

عمر حنیف
(امراؤتی)

مجھے صبح ہی فون پر آفس کی طرف سے ہدایت مل چکی تھی کہ میں ٹھیک دس بجے سٹی ہال پہنچ جاؤں جہاں تمام گدھوں کی طرف سے ایک کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ اگر مجھے یہ بات فون پر میرے آفس کا کوئی اور آدمی بتاتا تو میں اسے مذاق ہی سمجھتا۔ لیکن فون پر خود ہمارے اخبار کے چیف ایڈیٹر نے مجھ سے یہ بات کہی تھی ـــــ دماغ اصل بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ مجھے کافی حیرت ہو رہی تھی کہ بھلا گدھے بھی کہیں کانفرنس منعقد کیا کرتے ہیں ؟ میں نے تو اپنی زندگی میں لیڈروں کی وکیلوں کی، ڈاکٹروں کی، فلمی اسٹاروں کی ـــــ اور عام انسانوں کی کانفرنسیں دیکھی تھیں۔ لیکن یہ کیا، اب گدھے بھی اپنی کانفرنس منعقد کرنے لگے تھے ؟ شاید بیسویں صدی میں صرف یہی ایک کام ہونا باقی رہ گیا تھا۔

میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا کہ اگر حقیقت میں ایسی کانفرنس ہو رہی ہے تو چل چل کر دیکھا جائے کہ یہ گدھے اپنی کانفرنس کس سلسلہ میں منعقد کر رہے ہیں ـــــ اور پھر اخبار کا رپورٹر ہونے کے ناطے مجھے اس کانفرنس کی کارروائی بھی نوٹ کرنی تھی۔

میں وقت سے دس منٹ پہلے ہی سٹی ہال پہنچ گیا۔ سٹی ہال کے سامنے ایک اچھی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ پھر گدھے قطار در قطار ہال میں داخل ہونے لگے۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ آخر اتنے سارے گدھے کہاں سے آ گئے! کیونکہ شہر میں تو مشکل سے دو تین نظر آیا کرتے تھے۔ لیکن یہاں تو سینکڑوں کی تعداد میں ابل پڑے تھے۔ ہال کے باہر عام لوگوں کا بھی کافی ہجوم تھا۔ لیکن ہال میں صرف پریس رپورٹر ہی اپنا شناختی کارڈ دکھا کر داخل ہو سکتے تھے۔ باقی عام لوگوں کے داخلے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

میں ہال میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ ہر گدھا سلیقہ سے اپنی نشست سنبھالے ہوئے ہے۔ شور و غل نام کی کوئی چیز نہیں ـــــ اگر کسی وجہ سے کوئی گدھا اپنے بازو والے گدھے سے بات بھی کرتا تو بالکل آہستگی سے۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ گدھے واقعی آج کی ایک سلیقہ مند مخلوق ہے۔ اگر کوئی نظم و ضبط سیکھے تو ان گدھوں سے!

ہم پریس رپورٹر کیلیے کرسیوں کی ایک قطار مختص کردی گئی تھی۔ میں نے اس لائن میں چپکے سے اپنی سیٹ سنبھال لی۔ سامنے اسٹیج پر پانچ کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کرسیوں کے سامنے ایک میز رکھا ہوا تھا جس پر ایک گلدستہ سجا ہوا تھا ـــــ کچھ وقفہ بعد پانچ گدھے جو کافی موٹے نظر آرہے تھے۔ اسٹیج پر نمودار ہوئے اور پانچوں نے اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

ہال ایک گہری خاموشی میں غرق تھا! اور مجھے باربار یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ آج کا گدھا ایک انسان سے زیادہ عقلمند ہے۔ ہال میں سینکڑوں گدھے موجود تھے۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی گدھا کسی قسم کا شور و غل کرے۔ میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ آج کا انسان عقل سلیم رکھنے کے باوجود گدھا ہے۔ سینکڑوں کی کیا بات، اگر ہال میں پچاس آدمی بھی موجود ہوں تو اتنا شور و غل ہوگا کہ بےچارے اناؤنسر کا انھیں خاموش کراتے کراتے گلا بیٹھ جائے گا۔ لیکن پھر بھی لوگوں کا شور بند نہ ہوگا!

اچانک ایک گدھا اسٹیج پر اپنی کرسی سے اٹھا اور مائیک کے ٹھیک سامنے کھڑے ہوکر مخلصانہ لہجے میں کہنے لگا ـــــ

"حضرات! آپ تمام صاحبان اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہم نے آج کی یہ کانفرنس کس سلسلہ میں منعقد کی ہے۔ میں ایک ہی بات کو بار بار دہرانا مناسب نہیں سمجھتا۔ کیونکہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ ہمارے کچھ مطالبات ہیں جنھیں ہم اپنی سرکار کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں ـــــ اور ہمیں امید ہی نہیں بلکہ پورا یقین ہے کہ ہم اپنے مطالبات اپنی سرکار سے منوا کر ہی رہیں گے ـــــ اور ان مطالبات کے سلسلہ میں تفصیل وار گفتگو آج کے ہمارے صدر آپ کے سامنے کریں گے، آج کے صدر جناب "ہوشونگ پا" سے درخواست کروں گا کہ اب وہ اس جلسہ کی کارروائی کو آگے بڑھائیں اور ہمارے اس کانفرنس کے اصل مقصد کو تفصیل وار پیش کریں" ـــــ

تالیوں کے شور سے سارا ہال گونج اٹھا۔ لیکن میں نے تالیاں نہیں بجائیں۔ میں ایک انسان ہوکر گدھوں کی بات پر تالیاں بجاؤں؟ تالیاں بجانے کا مطلب اپنے آپ کو بہت بڑا بےوقوف ثابت کرنے کے برابر تھا۔

پھر ایک بار کانفرنس کے صدر، یعنی گدھوں کے صدر "ہوشونگ پا" کی ایک گرجدار آواز ہال میں گونجی ـــــ "میں ہماری برادری کے تمام حضرات سے یہ بات گوش گذار کرتا چلوں کہ آج ہم جو اپنے مطالبات پیش کرنے والے ہیں انھیں بہرقیمت سرکار سے منوا کر ہی رہیں گے ـــــ اور اگر ان مطالبات کی خاطر میری جان بھی چلی جائے تو مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ میری جان میرے ہی برادری کے کام آجائے اس سے اچھی بات میرے لیے اور کیا ہوسکتی ہے۔

پھر ایک بار زبردست تالیوں کے شور سے ہال گونج اٹھا۔

"ہمارے مطالبات کے بارے میں سب سے پہلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہماری سرکار اس بات پر سختی سے پابندی عائد کردے کہ ہمیں کوئی انسان "گدھا" کہہ کر مخاطب نہ کرے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا نام بدل دیا جائے۔ ہم نے اس نام کے عوض جو دوسرا نام تجویز کیا ہے وہ عقلمند ہے ـــــ ہمارے نام پر ہمیں اس لئے اعتراض ہے کہ تمام اولاد آدم گدھے کے نام سے ہی یہ تصور کرنے لگتی ہے کہ یہ بےوقوف، جاہل اور گنوار کا نام ہے! نہ جانے کیوں تمام انسانوں نے اپنے ذہن میں یہ بات بٹھا لی ہے کہ گدھا "بےوقوف اور بےعقل ہوتا ہے ـــــ جو کہ سراسر غلط اور بےبنیاد بات ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی عقل رکھتے ہیں۔ ہمارے اندر بھی سوجھ بوجھ کا مادّہ موجود ہے ـــــ پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ ہمیں گدھا کہیں؟ اس کے باوجود ہمیں اپنے نام پر کوئی اعتراض نہ ہوتا جبکہ کسی انسان کی خطا پر اسے "گدھا" نہ کہا جاتا۔ چنانچہ اسی لیے ہم اپنا نام تبدیل کروانا چاہتے ہیں کیونکہ ہماری قوم بےوقوف اور جاہل نہیں ہے!!.......... (تالیاں)

ایک بے عقل انسان کو گدھا کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ گدھے غلطی کرتے ہیں! اور ان کے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی! انسان
نے نہ جانے کیوں یہ تصور کر رکھا ہے کہ گدھوں کے عقل نہیں ہوتی۔ وہ بے وقوف ہوتے ہیں۔ جاہل ہیں ـــــ غیر مہذب ہیں ـــــ تہذیب
وتمدن نام کی کوئی چیز ان کے پاس نہیں! ـــــ لیکن اصل میں دیکھا جائے تو ان میں سے کوئی بات بھی صحیح نہیں۔ سب لغو اور
بکواس ہے ـــــ سچ تو یہ ہے کہ ہم لوگ بھی عقل سلیم رکھتے ہیں ـــــ سوجھ بوجھ کا مادہ ہم میں یہ انسانیت کا دعویٰ
کرنے والی قوم سے کہیں زیادہ ہے۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ انسان جس نے اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھ رکھا ہے
یہ اس خطاب کے لائق ہی نہیں ـــــ صرف اس نے اپنے عیبوں اور برائیوں کو چھپانے کے لئے اپنے آپ پر اس
نام کا ایک خول چڑھا رکھا ہے ـــــ اصل میں اس "اشرف المخلوقات" کی کھوپڑی میں عقل سلیم نام کی کوئی شے ہی نہیں۔
لیکن اس کے باوجود بھی اس کی اکڑ دیکھو کہ ہم لوگوں کو ہمیشہ حقارت بھری نظروں سے دیکھتا ہے اسے ہمارا نام تک لینا گوارا
نہیں اور اگر غلطی سے نام لے بھی لے تو ایسی صورت بناتا ہے۔ جیسے اس کے حلق میں کوئی کڑوی دوا انڈیلی جا رہی ہو ـــــ
لیکن یہ اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھا ہے کہ کیا عقلمندی خون کی ندیاں بہانے کا نام ہے؟ کیا اس کی تعلیم اس کی تہذیب
اسے یہی سکھاتی ہے کہ یہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ہی بھائیوں کا قتل عام کرے؟ کیا انسانی عقل کا یہی تقاضا ہے کہ اپنوں
کے ساتھ وحشی درندوں جیسا سلوک کرے؟" (تالیاں) ـــــ

اس پر بھی یہ ہٹ دھرمی کہ یہ انسان اپنے آپ کو علم اور تہذیب کا دعوی دار ثابت کرتا ہے ـــــ کیا تہذیب یہی
سکھاتی ہے۔ کھلے عام جوا، شراب، زنا کا بازار گرم کرے، کیا انسانیت اسی کا نام ہے؟ کیا اشرف المخلوقات کا خطاب ان
ہی خصوصیات کا حامل ہے؟ ـــــ اور تو اور یہ انسان کوئی ایسی مثال پیش کر سکتا ہے کہ ہم لوگوں نے کہیں فرقہ وارانہ
فساد برپا کیا ہو ـــــ ہم نے اپنے ہی بھائیوں کی گردنوں کو اپنے ہی ہاتھوں کاٹا ہو۔ کیا ہماری قوم میں الگ الگ فرقہ ہے
کیا ہم لوگوں میں مختلف ذاتیں ہیں؟۔ اگر اس کی تاریخ اٹھا کر دیکھی جائے تو کہنا پڑے گا کہ یہ اصل میں انسان کہنے کے لائق ہی
نہیں! ہر دوسرے تیسرے مہینہ یہ خبر سننے میں آتی ہے کہ فلاں جگہ فرقہ وارانہ فساد میں نتّو آدمی مارے گئے۔ فلاں جگہ آپسی فساد
میں دوسو آدمی گھائل ہو گئے۔ کیا مذہب یہی سکھاتا ہے؟ کیا انسانیت یہی کہتی
ہے؟ ـــــ اور دولت تو اس کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ یہ دولت کی خاطر بھائی بھائی کا خون کر بیٹھتا ہے۔ بیٹا باپ پر
سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب یہ درندگی پر اتر آتا ہے تو ہر رشتہ کو مسمار کر کے رکھ دیتا ہے اور پھر وہ برا کام کر جاتا ہے
جسے آج تک کوئی اور مخلوق نہیں کر پائی ہے! . . . . . .

. . . . . . "لیکن اتنی ساری جہالت اور بے وقوفی کے بعد بھی انسان اشرف المخلوقات ہے اور ہم گدھے ہیں،
جاہل ہیں، بے وقوف ہیں! ـــــ اور ہمیں حقارت بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے!" . . . .

. . . . . لہٰذا ان تمام حقائق کی روشنی میں حکومت کو چاہیے کہ وہ ہمارا نام بدلنے کی اس تجویز پر جلد از جلد غور کرے"

ایک بار پھر ہال تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ اور بے خودی میں میں بھی تالیاں بجا بیٹھا کیونکہ بات ہی کچھ ایسی تھی میرا سر تو شرم
کے مارے جھکا جا رہا تھا (حقیقت کو کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے؟) میں دل ہی دل میں گدھوں کی ذہانت کی داد دیتا رہا۔

صدر کی آواز دوبارہ ہال کی دیواروں سے ٹکرائی ـــــ "یہ ملک ہمارا پیارا ملک ہندوستان یہاں ہو جانی وا۔

کو برابر کا حق حاصل ہے۔ ہر کسی کو کہنے اور بولنے کی پوری آزادی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہماری قوم کو ایک پچھڑی ہوئی قوم کی ایک طرف ڈال دیا گیا ہے۔ انسانوں میں تو پچھڑی ہوئی قوم کی طرح ایک طرف ڈال دیا گیا ہے۔ انسانوں میں تو پچھڑی ہوئی قوموں کو سہولتوں پر سہولتیں دی جارہی ہیں۔ لیکن ہماری کوئی پرواہ نہیں کرتا —— ملک کے ہر بڑے شہروں میں گھوڑوں کے لیے ریس کورس قائم کیے گئے ہیں۔ لوگ ہزاروں روپیہ کی رقم گھوڑوں پر لگاتے ہیں۔ اور ہم ہیں کہ یہ تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہزاروں روپیہ گھوڑوں کی ذات پر لٹایا جاتا ہے پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔ گھوڑوں کی قیمتیں آسمان کو چھو رہی ہیں۔ ہمیں کوئی پچاس روپیے میں بھی خریدنے کو تیار نہیں۔ آخر اس کی وجہ؟ کیا ہم بوجھ اٹھانے کے لائق نہیں؟ کیا ہم دوڑ نہیں سکتے؟ کیا ہم طاقتور نہیں؟ کیا ہم صرف تین ہی پیر رکھتے ہیں؟ —— پھر کیا وجہ ہے کہ ملک میں گھوڑوں کے ریس کورس کے ساتھ ساتھ ہمارے لیے بھی ریس کورس کیوں قائم نہیں کیے جاتے؟ اور معاف کرنا جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم میں دوڑنے کی صلاحیت نہیں تو میں کہوں گا کہ ان کی عقل پر پردہ پڑ چکا ہے! ہم میں تو نہ جانے کتنی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں لیکن کیا کریں کہ ہمیں ابھرنے موقع ہی نہیں دیا جاتا۔

"اس لیے میں ہماری حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ہمارے لیے جگہ جگہ ریس کورس قائم کرے۔ اور ہمیں ان میں داخلے کی اجازت دے!

ایک اور بات! —— آج کل کچھ ایسا ہی رواج شادیوں کا ہو چکا ہے۔ ہم اکثر دیکھتے ہیں کہ لوگ اپنی بارات صرف گھوڑوں پر ہی نکالتے ہیں۔ کیا ہم پر یہ باراتیں نہیں نکالی جا سکتیں؟ کیا کوئی انسان بتا سکتا ہے کہ اس معاملے میں گھوڑوں ہی کو کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ جبکہ انسان اگر ہم پر سواری کرے تو اسے پتہ چلے گا کہ خطرہ کے وقت وہ اپنے دونوں پیر زمین پر ٹیک سکتا ہے جس طرح کہ اسکوٹر چلاتے وقت کیا جاتا ہے —— اس لیے اس معاملے میں ہمیں ترجیح دی جائے۔ یا پھر ایسے لوگ جو اپنی پہلی شادی کر رہے ہوں اور اپنی بارات ہم پر نکالنا مناسب نہ سمجھتے ہوں تو حکومت کچھ ایسا قانون نافذ کرے کہ وہ لوگ اپنی بارات ہم پر نکالے جو دوسری یا تیسری شادی کر رہے ہوں!"

یہ پُر مغز تقریر سن کر میری تو عقل دنگ رہ گئی۔ اتنی سلجھی ہوئی باتیں —— ایسے مطالبات جو اپنی جگہ بالکل درست تھے۔

تقریر کے اختتام پر گدھوں کے صدر نے یہ وارننگ دی کہ اگر حکومت ہمارے ان مطالبات کو جلد از جلد عملی جامہ نہ پہنا سکی تو ہم بھی کوئی ایسا لیڈر تلاش کرلیں گے جو ہمارے لیے مرن برت شروع کر دے گا۔ ○○
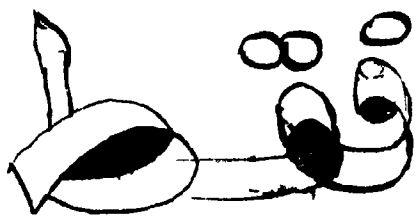
شکیل رضا
بنگلوری

بولتی ہوئی آنکھیں

اس دنیا میں جتنے بھی انسان رہتے ہیں سب کے سب اپنے مُنہ سے ہی بولتے ہیں۔ کوئی اپنے سر یا کان سے نہیں بولتا مگر کچھ لوگوں کو اپنا گلا پھاڑ پھاڑ کر بولتے ہوئے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آسمان پر بادلوں کی جنگ چھڑ گئی ہے اور فضا میں جنگی جہاز چنگھاڑ رہے ہیں۔ جہاں اس طرح غیر مہذب و خلاف انسانیت بولی بولنے والے بستے ہوں وہاں کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو اپنی نکٹی چپٹی یا دو فٹ لمبی ناک سے بولتے ہوئے عجیب سے لگتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کسی زیر مرمت ٹرانسسٹر سے عجیب عجیب سی آوازیں نکل رہی ہیں۔ اور کسی بل میں سلینکر دل چوہے اچھل کود رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ہاتھوں اور لاتوں سے بولنے لگتے ہیں جیسے ان پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہو۔

ایک صاحب جو کنجوس مکھی چوس کے نام سے مشہور تھے۔ ایک دن کسی بات پر وہ اپنی نازک اندام پھول جیسی پتنی کی لاتوں اور مکھوں سے مرمت کر رہے تھے۔ عین اس موقعہ پر ان کے سسر صاحب گھر میں داخل ہوئے تو ان کے ہوش اُڑ گئے اور وہ اپنی ادھ مری پتنی کو چھوڑ کر، ہوا میں اس طرح ہاتھ پیر چلانے لگے۔ جیسے ان پر مرگی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ داماد کو اس طرح ہاتھ پیر مارتے دیکھ کر سسر مہاشے اُلٹے بھاگ کھڑے ہوئے اور وہ پھر سے اپنی پتنی کی مرمت کرنے لگے!

اگر کسی فلمی، سیاسی یا کسی قومی ادارے نے بے تکان بولنے کا مقابلہ منعقد کیا تو اس مقابلے میں عورتوں کے سوا کوئی اماں کا لال جیت نہیں سکتا۔ کیونکہ بولنے کے معاملے میں عورتوں کا شمار صف اول میں ہوتا ہے کیونکہ عورتیں تو اپنی عمر کا

ایک تہائی حصہ بولنے میں گزارتی ہیں اور وہ کونسی جگہ ہے جہاں عورتوں کی آواز سنائی نہ دیتی ہو! جدھر دیکھو، عورتیں ہی بولتی ہوئی، چیختی ہوئی روتی ہوئی، گاتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، جیسے اپنے مُنہ سے آواز نکالنا ہی ان کی زندگی کا مقصد ہے!!

جہاں عورتوں کے بولنے سے بے چارے شوہر عاجز رہتے ہیں اور اپنے کانوں میں روئی کے پا ہے ٹھونس رہتے ہیں وہاں ان کی گز بھر کی زبان دیکھ کر شیطان بھی بدکتا ہوگا! اگر حکومت کی جانب سے عورتوں کے بولنے پر پابندی لگا دی جائے تو پھر، گھر ہوٹل، گلی کوچہ، سڑکیں، میدان، سینما اور ریڈیو پُرسکون ہو جائیں گے اور دنیا کا ایک تہائی شور بند ہو جائے گا اور اس کے ساتھ ہی دنیا کے سارے گونگے بہرے، خوشی کا ترانہ گانے لگیں گے!

صنفِ نازک میں کچھ ایسے عناصر بھی پائے جاتے ہیں جنہیں منہ سے بولنا ہی نہیں آتا۔ کیونکہ ایسے عناصر اپنی انگلیوں سے بولنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں، جہاں پر اپنی آنکھوں سے بولتے ہیں۔ وہاں کبھی کبھی اپنی سینڈلوں اور چپلوں سے بھی بولنے لگتے ہیں۔

ایک دن ہم کالج کے لان میں ٹہل رہے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ لڑکے لڑکیاں غول درغول اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ ایک لڑکا جو بڑی دیر سے کسی ان دیکھی محبوبہ کے فراق میں موم کی طرح پگھلا جارہا تھا۔ ایک لڑکی کو لائبریری سے نکلتے ہوئے دیکھ کر کہنے لگا۔ ہائے جانِ من تمہاری آنکھیں تو بولتی ہیں" لڑکے کی اس بات پر لڑکی کھڑی ہوگئی اور کہنے لگی، جی حضور، صرف میری آنکھیں ہی نہیں بولتیں، میری سینڈل بھی بولتی ہے!!

قصور اس میں اس لڑکے کا نہیں ہے۔ قصور تو اس محاورے کا ہے "بولتی ہوئی آنکھیں" جو مجنوں اور فرہاد کے قبیل کے نوجوانوں کو بولنے پر اُکساتی ہیں۔ اس محاورے کے حسب نسب کا پتہ لگانے کے لیے باقاعدہ ہم نے اس محاورے پر ریسرچ کیا تو یہ راز کھُلا کہ کن آنکھوں کو بولتی ہوئی آنکھیں کہنا چاہیے۔

ایک شاعر صاحب جو ہمیشہ اپنی ان دیکھی محبوبہ کے فراق میں کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ اور محبوبہ کے حسن کی تعریف اپنے شعروں میں بیان کرتے تھے جو انھیں عشقیہ خطوط لکھا کرتی تھیں۔ ایک دن ان کی ملاقات اس محبوبہ سے ہوئی تو وہ اپنی محبوبہ کی آنکھیں دیکھ کر بے ہوش ہوگئے اور ایک ہفتہ بعد جب انہیں ہوش میں لایا گیا تو وہ اتنا کہہ کر دوبارہ بے ہوش ہوگئے تھے کہ "اس کی آنکھیں تو بولتی ہیں"

دراصل شاعر صاحب کی بے ہوشی کی وجہ یہ تھی کہ ان کی محبوبہ کی آنکھیں ترچھی تھیں!!! اس صورتِ حال کے پیشِ نظر بھلا شاعر صاحب کے ہوش کہاں قائم رہ سکتے تھے۔ اور ایک شاعر نے تو کسی کی بولتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر یہ حق ادا کر دیا کہ ؏

تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

احمد سرور

بیگم، بذاتِ خود ایک بھاری بھرکم لفظ ہے پھر سونے پر سہاگہ ہماری بیگم اس کا چلتا پھرتا ثبوت ہیں۔
نکلتا قد، بھاری بھرکم ڈیل ڈول مضبوط ہاتھ پاؤں، اونچی آواز، تیز نظر، سرخ و سپید چہرہ، مختصر یہ کہ ایک فیلِ بے آنکس ہے کہ گھر میں چنگھاڑتا پھرتا ہے،

ان کی سلطنت میں ہماری کیا مجال کہ عدول حکمی کریں اسکا شائبہ بھی آج تک ہمارے دماغ میں نہ رینگ سکا۔

فلو کی ہوا چلی۔ یہ لہر کیا اٹھی کہ ہر شخص نڈھال، ہر چہرہ اترا ہوا، ہر کمر دُہری۔

اس لہر نے ہم کو جو اپنی لپیٹ میں لیا تو بس گویا بسترِ مرگ کا جز ہو گئے۔

کمر سے درد کی ایسی ٹیسیں اٹھتی کہ الامان والحفیظ۔ ہاتھ پاؤں اس طرح دکھ رہے تھے کہ کسی تھانہ سے پٹائی کے بعد پھینکے گئے ہوں

بیگم سے رہا نہ گیا، بولیں، آپ اس قدر درد سے بلبلاتے رہیں اور میں بیٹھی ہوئی تماشہ دیکھتی رہوں، آخر آپ کے بعد ہی بھی ایک دن مجھے بھی تو خدا کو منہ دکھانا ہے۔

آپ ذرا کروٹ ہو جائیے میں پاؤں دبا دیتی ہوں۔ بیمار کیا چاہے۔ ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا اور فوراً حکم بجالایا۔

بیگم نے پاؤں دبانا شروع کیا۔ پاؤں کیا رکھا! بس ایسے لگا جیسے کسی نے پاؤں کچل ڈالا ہو۔

تڑپ کر پلٹنا چاہا تو دیکھا کہ ایک نوزائیدہ بچہ کی طرح بے بس ہیں نہ سانس لے سکتے ہیں نہ آہ بھر سکتے ہیں۔

دانتوں کو مضبوطی سے دبا کو پلٹ کر کروٹ بدلی۔ کیا پوچھیے صاحب غضب ہو گیا۔

ہرن کی چوکڑی سنی تھی۔ گھوڑے کی دلکی سنی تھی لیکن بیگم کے توازن کا بگڑنا نہ سنا نہ دیکھا تھا۔

بیگم کا توازن جو بگڑا تو وہ کٹے شہتیر کی طرح ہم پر آگریں۔

وہ بوجھ جو ہم پندرہ سال سے اٹھا رہے تھے۔ پورے قد کے ساتھ ہم پر لد گیا۔ ایک چیخ کہاں سے نکلی خود ہم کو نہیں معلوم؟

بعد میں سنا کر پورا گھر دوڑ کر ہمارے کمرے میں آ دھمکا تھا۔ سب کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری بیگم مکمل ناٹ کی طرح فرش پر گری ہیں۔ ہمارا نہ تو پتہ چلتا ہے اور نہ سراغ لگتا ہے۔

سب دم بہ خود کھڑے تھے کس میں ہمت تھی کہ نیل پیدس کو اٹھائے۔ بیگم نے دیکھا کہ اگر ان کے اٹھنے میں تاخیر ہو جائے تو بیوہ ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں رہے گی۔

خود پوری طاقت لگا کر اٹھ بیٹھیں تو مجمع نے ہم کو دیکھا جو دین اور دنیا سے بے نیاز آنکھ بند کیے پڑے تھے۔

ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے ہوش جگائے تو دیکھا کہ ہم رکشا میں پڑے ہیں اور بڑے بھائی جراح کے ہاں لے جا رہے ہیں۔

سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا لیکن کیا کرتے قہر درویش برجان درویش۔

یہ تھا ہماری بیگم کا تعارف۔ اب بتائیے کہ ہماری کسمپرسی کا کیا عالم ہوگا۔!

لیکن اللہ کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ہمارے گھر خوش حالی آئی۔

اس خوش حالی نے ہماری بیگم کی بیگم پیدا کر دی وہ بیگم ہے ہمارے گھر کی ماما۔ آج کے دور میں سب مل سکتا ہے لیکن بہتر ماما نہیں مل سکتی۔ محترمہ کا نام ہے بوا نصیبن، تین بیٹیاں باہر بیاہی گئی ہیں۔ گھر میں لکشمی ناچتی ہے چونکہ غریبی کے زمانہ میں بیگم نے ساتھ دیا تھا اس لیے وہ رشتہ ابھی تک نباہ رہی ہیں۔

بیگم پر کسی کی چلتی ہے تو بوا نصیبن کی، جن دنوں ہم سودا لایا کرتے تھے۔ بیگم کوڑی کے سو چکر کراتی تھیں۔ کبھی ہانڈی پٹک دیتیں کہ یہ کوئی سودا ہے۔ غرض دفتر کے وقت تک سودا لانا اور بیگم کے حضور میں رہنا نوشتہ قسمت تھا

بوا آئیں تو ہم نے محسوس کیا کہ سکون نے ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے۔

ہم بھی اڑ گئے کہ اب نہ سودا لائیں گے اور نہ گھر کا کوئی کام کریں گے آدمی آ گیا ہے۔ ۵۰ روپیہ ماہوار لیتا ہے۔ تین وقت کا کھانا اور دو وقت کی چائے اڑاتا ہے۔

یعنی خربوزہ کو دیکھ کر خربوزے نے رنگ پکڑا۔ اب بیگم کی حالت زار بس کچھ نہ پوچھیے۔ بوا کی شرط تھی کہ وہ ایک سے زیادہ چکر بازار کے نہیں کریں گی جو کچھ منگوانا ہے ایک ہی وقت میں منگوا لیں۔ لیکن یہ نہ ہو سکتا تھا کہ سودا ایک دم منگوا لیں۔ چنانچہ دال بغیر نمک کی پکتی تو سالن میں کچھ اور کمی ہماری گڑبڑ سے سارا محلہ جان جاتا کہ ہمارے ہاں کیا پکا ہے اسی طرح میاں بیوی کی لڑائی اور ہماری آمدنی سارے محلہ میں عام ہو گئی

اس طرح بیگم کی بیگم نے ہمارے گھر کو کھلی کتاب بنا دیا تا کہ محلہ والے جب چاہیں اپنے مطلب کا سبق پڑھ لیں۔

بوا نے کہہ دیا تھا کہ ۷ بجے تک تمام ناشتہ کے برتن خالی ہو جائیں۔ وہ برتن دھو کر ۹ بجے تک چلی جائیں گی۔

بیگم ۶ بجے اٹھتی ہیں ناشتہ بناتیں ۔ سب کو ناشتہ کراتیں تاکہ برتن ۷ بجے تک بوا کو مل جائیں ۔
بوا نے سنا دیا کبھی برتن پھسل سکتے ہیں۔ اگر رکابیاں ٹوٹ جائیں تو وہ ذمہ دار نہیں۔ ہر روز کچھ نہ کچھ ٹوٹتا اور بیگم سر پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔

آج بوا نے بم چھوڑ دیا، ان کی بیٹی ایک عدد بچہ جنم دینے کے لیے دواخانہ جا رہی ہیں گھر میاں بیوی کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس لیے بوا کی ساری پلٹن کل سے ہمارے گھر میں بوا کے ساتھ آتی جاتی رہے گی۔ ہم نے احتجاج کیا تو بیگم نے دھمکی دی کہ وہ میکے چلی جائیں گی۔ بیگم کا استدلال تھا کہ آج کل آدمی ملتا کہاں ہے بچے گھنٹہ دو گھنٹہ رہ کر بوا کے ساتھ چلے جائینگے گھر کو کھا تو نہیں جائیں گے ۔

ہم استدلال کے قائل ہوگئے ۔ رانی کے غلام نے گردن ہلا دی ۔

دوسرا دن قیامت بن گیا ، بچے ایک ساتھ آدھمکے وہ دھما چوکڑی مچی کہ ہم ایک گھنٹہ پہلے دفتر کے لیے روانہ ہوگئے شام لوٹے تو دیکھا کہ کئی برتن ٹوٹ گئے ہیں سارا کھانا غائب ہے ۔ اور ہر جگہ غلاظت ہے

ہم سے رہا نہ گیا۔ جھنجھلا اٹھے کہ بوا کل نہیں آئیں گی۔ چونکہ گھر کا سارا منظر دیکھ کر بیگم بھی متنفر ہو چکی تھیں اس لیے انھوں نے بھی اپنا سر جھکا لیا اور بیگم یعنی بوا سے کہا کہ وہ کل سے نہ آئے ۔

اس طرح ہم کو بیگم کی بیگم سے نجات ملی ۔

OO

اطلاع نامہ بابت ماہنامہ شگوفہ

از روئے فارم نمبر ۴

وقفہ اشاعت	ایک ماہ
ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر	سید مصطفیٰ کمال
قومیت	ہندوستانی
پتہ	۷۶۸-۶-۱۷ دبیرپورہ ، حیدرآباد ۲۳
مالک	قیصر کمال
قومیت	ہندوستانی
پتہ	۷۶۸-۶-۱۷ دبیرپورہ ، حیدرآباد ۲۳

میں سید مصطفیٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا اطلاعات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں ۔

یکم مارچ ۸۰ء

سید مصطفیٰ کمال
ایڈیٹر پرنٹر پبلشر

دو غزلیں

سرپٹ حیدرآباد

کس لیے آتے ہیں ہم اور کدھر آتے ہیں
ہو جہاں مال وہیں چور نظر آتے ہیں

بانٹ لیتے ہیں سب اعداد میرے سارے رقیب
میرے حصّے میں ہمیشہ ہی صفر آتے ہیں

رہتی ہے پیشِ نظر ان کے صفائی میری
وہ میری دھول جھٹکنے میرے گھر آتے ہیں

کبھی پیدل، کبھی ٹٹو پہ، کبھی رکشا میں
جب وہ آتے ہیں بہ اندازِ دِگر آتے ہیں

چھوڑ جاتے ہیں پدر کام ادھورے جو بھی
پورے کرنے کو وہی کام پسر آتے ہیں

اپنے عشاق کو وہ جب بھی طلب کرتے ہیں
جھومتے، ناچتے، منظورِ نظر آتے ہیں

رخصتی کرتے ہیں جب بیٹی کی خود باوا بھی
ساتھ ہی بیٹی کے داماد کے گھر آتے ہیں

یا ہے بُت خانہ اِدھر یا ہے گرجا ہے خانہ
شیخ جی آپ یہ روزانہ کدھر آتے ہیں

مبتلا ہوتے ہیں جب عشق کی بیماری میں
رنگ کچھ اور حسینوں کے نکھر آتے ہیں

جو بھی دھتکار دیئے جاتے ہیں ان کے دَر سے
پھر نہ آنے کی قسم کھاتے ہیں پر آتے ہیں

اپنی عادت سے ہیں مجبور جناب سرپٹ
جوتے کھاتے ہیں تو مسرور نظر آتے ہیں

○

وہ سُدھرتے ہیں اگر یوں ہی سدھرنے دو اُنہیں
جو نہیں کرتے ہیں کچھ بھی عشق کرنے دو اُنہیں

اپنے وعدوں سے مُکرتے ہیں، مکرنے دو اُنہیں
ان کو عادت ہے پسرنے کی، پسرنے دو اُنہیں

جا نہیں سکتا کسی صورت سے ان کا غنڈہ پن
جو بھی ان کے دل میں آتا ہے وہ کرنے دو اُنہیں

اک نہ اک دن وہ سرِ بازار پکڑے جائیں گے
جیبیں لوگوں کی کترتے ہیں کترنے دو اُنہیں

سلب ہوگی قوتِ گفتار، چُپ لگ جائے گی
کر رہے ہیں وہ میری غیبت تو کرنے دو اُنہیں

عشق میرا بے خطر ہے، حُسن ان کا پُرخطر
میں نہیں ڈرتا کسی سے کچھ بھی ڈرنے دو اُنہیں

اپنے کرتوتوں کی پا جائیں گے وہ اک دن سزا
غیر کے کھیتوں میں چرتے ہیں تو چرنے دو اُنہیں

ان کی فرقت میں مجھے مرنا تھا میں تو مر چکا
اب وہ میرے ہجر میں مرتے ہیں مرنے دو اُنہیں

جا رہا ہوں میں تو سرپٹ اپنی راہ صدق پر
جھوٹ کے پُل سے اترنا ہے اُترنے دو اُنہیں

خواجہ بختیار حسن

کاونٹی میاچ دیکھنے کے لیے دو ٹکٹس (۲۰) بیس روز پہلے ہی اڈوانس کرالیے گئے تھے۔ لیکن ہماری بدقسمتی کہ آٹھ روز سے میرا دوست بیمار تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ زائد کا کیا کیا جائے۔ معاً خیال آیا کہ کیوں نہ اپنے مُنہ بولے چچا کو ساتھ لیا جائے جو پرسوں ہی اپنے گاؤں سے آدھمکے تھے۔ میں نے چچا سے بعد از سلام پوچھا "شاید آپ آج فرصت میں ہیں؟" انھوں نے اپنی زبان سے کچھ کہے بغیر اپنی گردن معہ پانچ پونڈ" کے" شملہ" کے ساتھ "ہاں" میں ہلائی۔ میں نے کہا "دیکھیے یہ دو ٹکٹس ہیں۔ آپ بھی میرے ساتھ کھیل دیکھنے چلیں گے۔" یہ سنتے ہی چچا نے اپنا بھاری سر کو اٹھا کر مجھے تکنا شروع کر دیا تعجب و حیرت کے ملے جلے آثار لئے اور پھر کہنا شروع کر دیا۔

"اے میتے! کیا ادھر کھیل دیکھنے کے لیے روپیہ دینا پڑتا ہے؟ واہ! بوت تعجب کی بات ہے۔ آخر تم لوگاں ٹھیرے شہر والے۔ یہ شہر والے پیسوں کی قدر کیا جانے؟"

میں نے ان سے ضد کرنے کے انداز میں کہا

"دیکھیے چچا با" دراصل بات یہ ہے کہ یہ کھیل "پاکستان" اور ہمارے ملک کے درمیان ہو رہا ہے بڑا مزہ آئے گا۔"

"ہوں"! آئیں۔ کیا کھیل دیکھنے کو دوسرے ملکوں سے لوگاں آتیں۔ بھئی" میتے اس کا کچھ پتا پچ نہ تھا نہ تھا۔ ہمیں لوگاں تو بس آنا پچ دیکھے تھے کہ ایک باڑے والے دوسرے باڑے والوں سے گیماں کھیلتیں"۔ میں نے پوچھا کہ "یہ باڑے" کیا ہوتے ہیں۔ انھوں نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "تم شہر والے لوگاں اس کو محلہ کہتے ہیں محلہ" میتے تو "بوت" اچھا یاد ہے۔ میں نوجوانی کے زمانے میں دھوم مچا کر رکھ دیا تھا۔ میرا کبڈی کا کھیل دیکھنے کو دوسرے گاؤں سے لوگاں بنڈیاں میں بھر بھر کو آتے تھے۔ اب میں ان کی تقریر کو طویل ہوتے دیکھ کر ان کی تعریف میں ایک لمبا چوڑا قصیدہ پڑھ ڈالا اور بات بنتے دیکھ کر ان سے کہا آپ تیار ہو جائیے۔ آج ہم کبڈی کا کا کھیل دیکھنے چلیں گے۔ کبڈی کا نام سنتے ہی چچا کا چہرہ مسرتوں سے دمک اٹھا اور وہ غیر ارادی طور پر کبڈی کبڈی دو تین مرتبہ

دہرا گئے۔

آٹو سے اُتر کر میں ابھی بل ہی ادا کر رہا تھا کہ اک دم پیچھے سے آواز آئی۔ "ارے ممد — ممد! ارے وہ گادنٹی لمبو تو کدھر"! چچا نئے شناسائی کی طرف دوڑے اور اس کے قریب پہنچ کر اتنا جھکے کہ میں سمجھا وہ قدم بوس ہو رہے ہیں لیکن مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا کیونکہ اب وہ دونوں گلے مل رہے تھے۔ چونکہ نئے شناسائی کا قد بہ مشکل چار فٹ چار انچ تھا۔ خاصے موٹے بھی تھے جبکہ چچا چچا ساڑھے چھ فٹ کے تھے۔ چچا کے دوست شاید کھیل دیکھنے ہی آئے تھے۔ چچا کا ہاتھ تھامے یا چچا ان کا ہاتھ تھامے اسٹیڈیم کی طرف رواں دواں تھے۔ وہ دونوں اتنے تیزی سے چل رہے تھے کہ مجھے انہیں اوورٹیک کرنے کے لیے دوڑنا پڑا۔ اکثر راہ گیروں کی نظریں اس جوڑی پر لگی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شاید یہ آسمانی مخلوق ہو۔ کچھ لڑکے اس جوڑی پر فقرے کس رہے تھے۔ کوئی کہتا "گلی ڈنڈ" تو کوئی "امیتا بھ جیا" تو پھر کوئی کہتا "۱۰ نمبری"

اب چچا کی نظریں میدان کے گرد گھوم رہی تھیں۔ چلتے ہوئے رولر دیکھ کر اپنے دوست سے پوچھنے لگے "ارے چھوٹو کیا میدان کے بیچ میں روڈ ڈال رہیں"۔ چچا کے دوست چھوٹو کہنے لگے تو تو پورا گادنٹی ہے۔ عقل بڑی یا بھینس بڑی تو تم کہتے والے ہو "بھینس" اب تم کو کیا سمجھایا جائے۔

پچ کے لیے رولر چلایا جا رہا ہے۔ چچا پھر کہنے لگے "عقل مند کے پٹھے، تو اب مجھے یہ بتا کہ دونوں طرف تین پتلی لاٹھیاں کائیکو لگائی گئی ہیں پھر خود ہی کہنے لگے۔ "ہاں، ہاں! اب میں سمجھا یہ نشانی کے لیے لگائی گئی ہوں گی کہ اس کے آگے نیں جانا"۔ کھیل شروع ہونے میں کچھ دیر تھی۔ چچا اب پورے قد سے کھڑے ہوئے اپنی نیم آستین کے تھیلی نما جیب سے تمبا کو نکال کر ہتھیلوں پر ڈال کے اس طرح رگڑ رہے تھے کہ بیچارہ "شعلے" کا گبر سنگھ یاد آئے بغیر نہ رہ سکا۔ پھر بس کیا تھا۔ "شعلہ" کے مکالمے ادا ہونے لگے کتنے آدمی تھے!..... وہ دو او رتم تین۔ پھر بھی واپس ——————

اب فیلڈ جمنی شروع ہوگئی تھی۔ امپائر بھی آ چکے تھے۔ چچا کے دوست چچا سے کہنے لگے۔ "واہ، واہ، کھیلنے والے آگئے ہیں"۔ چچا کہنے لگے۔ کیا دوسرے ملکوں کے لوگاں کپڑے سمیت کھیلتیں، کچھ کھوپڑی میں نہیں بیٹھ رہیا۔ اتنے تنگ کپڑوں سے پاٹ لک کیسے ماریں گے"! اور پھر فخریہ انداز میں کہنے لگے۔ "بلیر تو اُج ہے جو ڈھیلی ڈھالی بنیان پہن کے کھیلے۔ اب اوپنرز آتے دکھائی دیے۔ چچا کہنے لگے۔ "دیکھ چھوٹو تو تو بس شہر والوں کی تاریف (تعریف) کرتا ج نا۔ ابس گیا اٹھ، نو سال شہر میں رہیا کی دماغ تالو پہ ہے۔ خیر اب تو پچ دیکھ یہ شہر والے کتنے ڈرپوک ہوتے ہیں۔ ماروں سے بچنا ہے تو کبڈی کھیلتے کائیکو۔ یہ مردوں کا کھیل ہے بچو! سمجھیا —— دیکھ تو پچ دیکھ ڈر کے مارے ہاتھ پاؤں پو کیا کیا کی لپیٹ لیکو آئیں"۔ چچا اب تک یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ کبڈی کے ہی کھلاڑی ہیں۔ میں نے ان سے معذرت کرتے ہوئے کہا "دیکھیے! چچا...... کبڈی کا کھیل اس کے بعد ہونے والا ہے جب تک یہ دیکھ لیتے ہیں۔ اور یہ ہے کرکٹ۔

لیکن! چچا.... اک دم اپنی جگہ سے اُچھلے، پریشانی و گھبراہٹ کے ملے جلے آثار لیے کبھی قمیص جھٹکتے کبھی پاجامہ تو کبھی آستین۔ صرف ہونٹ جنبش کر رہے تھے پھر انھوں نے اپنے پیروں کو یکے بعد دیگرے اتنی زور سے جھٹکا کہ ان کا ایک جوتا جالی کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا میدان کے اندر جا گرا۔ اب چچا سہمی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے "کدھر گیا گرگٹ — کدھر گیا گرگٹ۔

آخر پیچھے سے کسی نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ان کی گردن کو چھو لیا۔ ان کی بدحواسی میں اور اضافہ ہو گیا۔ وہ

گرگٹ ابھی تک ان کی گردن پر ہی محاصرہ کیے بیٹھا ہے۔ اس طرح انھوں نے اپنی گردن پر ایک دو ہاتھ مارے اچھال دیا۔ چونکہ ہم سے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کی نگاہیں ادھر ہی مرکوز تھیں ان میں سے ایک نے اس گرتے ہوئے شملہ کو کیچ کرلیا۔ کوئی کہتا کیچ آوٹ تو کوئی ہنسی میں کہتا وُل کاٹ۔ پیچھے سے آواز گونجی " ایرپورٹ" پھر بس کیا تھا " ایرپورٹ" ایرپورٹ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ان لوگوں نے چچا کے سر کو دیکھ لیا تھا جو بالوں سے بے نیاز تھا۔

اب " برسات شروع ہوگئی "۔ بن بادل برسات " موزوں، سنتروں کے چھلکوں کی۔ پھر ایک بم چچا کی چکنی پر پڑ کر پھٹ گیا اور اس بنجر و چکنی زمین کو اپنے رس سے سیراب کردیا۔ وہ بم کیا تھا بس لال ٹماٹر تھا ——

اب چچا سر پر شملہ باندھے، سیدھے پیر میں جوتا پہنے کھیل کے ختم ہونے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے جب وہ گھر جانے پر زور دیتے تو میں کہتا۔ جب تک کھیل ختم نہ ہو، آپ کا جوتا مل نہیں سکتا، اور جوتا ملنے کے بعد ہی آپ جا سکتے ہیں۔ اس طرح میں نے چچا کو عجیب داؤ میں پھانس کر رکنے پر مجبور کیا۔

جب بالر گولہ پھینکنے کے لیے دوڑنا شروع کرتا تو چچا اپنی دونوں آنکھیں اس وقت تک بند کرلیتے جب تک کہ گولہ بیاٹ سے ٹکرا نہ جائے یا پھر وکٹ کیپر کے ہاتھ میں نہ چلا جائے تاکہ وہ بیٹسمین کو مار لگتے نہ دیکھ پائیں۔ ایک دفعہ چچا نے آنکھیں کھول کر مجھ سے پوچھا " منے وہ لال گولہ دکھتا نہیں ہے کدھر تو بھی گیا۔" میں تالیاں بجانے میں مشغول تھا کیونکہ بیٹسمین نے ایک فل ٹاس بال کو پویلین کے اندر مارا تھا۔ چھکے کے لیے میں نے چچا سے کہا۔ چھکا مارا ہے چھکا۔ وضاحت بھی کردی کہ وہ جو کھیلنے والا ہے نا! وہ گولے کو اتنی زور سے مارا کہ گولہ پرے بیٹھے ہوئے لوگوں کے پاس پہنچ گیا۔ واہ، واہ بہت زبردست چھکا مارا۔ نہ جانے کیوں، چچا کسی قدر مسکرائے ..... اور ہنستے ہوئے کہنے لگے، آج کل چھکے "پنجے بھی کھیلتے ہیں۔

لنچ ہونے پر میں اور چچا گھر کی طرف روانہ ہوئے 'چچا' کھڑک مرغی کی طرح کُڑکُڑا رہے تھے۔ میرا آج کا دن بے کار گیا۔ مجھے بہت کچھ دیکھنا تھا، چار مینار، مکہ مسجد، قطب مینار، تاج محل، نہ جانے چچا غصہ میں کیا کیا بکے جارہے تھے۔ میں نے انہیں نہیں ٹوکا اور صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا اور ۱۹۸۰ء کی ترقی کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس سال قطب مینار اور تاج محل کا تبادلہ کچھ دنوں کے لیئے حیدرآباد کر دیا گیا ہے —— !

OO

دل اور جگر

جاوید لیاشہبازی
علی گڑھ

تھانے میں ایک شخص بصد درد و اضطراب
آکر پکارا لُٹ گیا میں تھانے دار "صاب!"

دل کا سکون رات کا آرام لُٹ گیا
حلقے میں آپ کے میں سرِ شام لٹ گیا

سرمایۂ حیات تھے دل اور جگر میرے
اک "رہزنِ شعور" نے دونوں اُڑا لیے

زندہ تھا جس کے دم سے وہ دولت نہیں رہی
اب کیا کروں کہ جینے کی صورت نہیں رہی

مردہ صفت ہوں میں مجھے زندہ کریں حضور
یعنی میرے غموں کا مداوا کریں حضور

سن کر یہ تھانیدار کو کچھ رحم آگیا
کچھ دیر سوچا سوچ کے سر کو جھکا لیا

دیوان سے کہا کہ بیاں اس کا لیجیے
اور اس پر ارتھی کی رپٹ درج کیجیے

ہر تھانے میں یہ نقل رپٹ بھیج دیجیے
اور سب سے فکر خاص کی درخواست کیجیے

کچھ دن کے بعد نکلا یہ حاصل تلاش کا
چالان آیا تھانہ میں اک بدمعاش کا

پوچھا گیا یہ خاص طریق و اصول سے
"اغوا کیے ہیں تونے ہی دو بچے پھول سے

دل ایک کا تھا دوسرے کا نام تھا جگر
ان دونوں نونہالوں کی سچ سچ بتا خبر"

رو کر کہا یہ اس نے کہ میں بے قصور ہوں
البتہ اتنی بات ہے واقف ضرور ہوں

جس کا جگر تھا نام جہاں سے گزر گیا
یعنی مراد آباد میں تھا اور مر گیا

ہاں دل کو ڈھونڈنا ہے تو کچھ دور دیکھیے
اس کو حضور شاہجہاں پور دیکھیے

○

چھوپٹ حیدرآباد

اسنو پوڈر کی مہربانی ہے
بڈھیوں پر جو یہ جوانی ہے
آج پہچان ہے بہت مشکل
کون نانا ہے کون نانی ہے
بن ٹکٹ سیر وہ بھی جنت کی
یہ تو گانجے کی مہربانی ہے
خوب جوڑی جمے گی دونوں کی
یہ کھٹارہ ہے وہ پرانی ہے
مال مُردوں کا لوٹ کر کھانا
اُن کا پیشہ یہ خاندانی ہے
توڑ کر میری ٹانگ وہ بولے
یہ میرے پیار کی نشانی ہے
سیلفا ، بار ، ہوٹل آباد
کون کہتا ہے اب گرانی ہے

بہزاد فاطمی
(پٹنہ)

واہی کی کہانی اور میری زبانی

بسلسلۂ گذشتہ

کتابِ عمر ہو پیشِ نظر چشمِ تصور میں
اُلٹتے ہیں ورق بھولے سبق کو یاد کرتے ہیں

اوراق تیزی سے الٹتے چلے گئے۔ مناظر بدلتے رہے۔ کچھ تابناک، کچھ تاریک۔ کاروانِ حیات بڑھتا گیا۔ منزلیں آتی رہیں۔ کسی نے ساتھ چھوڑا، کوئی ساتھی بنا۔ اب یاد ہی نہیں کون کب چھوٹا، کون کب ساتھی بنا۔

۱۹۴۳ء میں لیلائے سول سروس کے عشق کی تہمت لگی۔ زلفوں کی حراست میں آیا۔ شکر ہے پتلون، لنگوٹی ہونے سے بچی۔ جلا وطنی اور خانہ بدوشی سزا ہوئی۔ یاروں نے جے جیکار کے نعروں۔ پھولوں کے ہار اور نیک خواہشات کے ساتھ ہنسی خوشی رخصت کیا۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے کی توفیق کسی کو نہ ہوئی۔ جلا وطنی کچھ ایسی مانوس ہوئی کہ ۳۴ سال کی میعادِ با مشقت کاٹنے کے بعد بھی اس سے پیچھا نہیں چھوٹا ؎

یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

ایامِ جلا وطنی اور خانہ بدوشی میں ہم صفیرانِ چمن یاد آتے تو فارسی کا شعر بے اختیار زبان پر آجاتا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوانِ عشق
او بہ صحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم

عالمِ رسوائی میں، رضا کا کوئی پیار بھرا خط کبھی کبھار ملا کسی نوٹس کے آدھمکا تو ؎

جس طرح چونک پڑتا ہے انسان خواب سے

میں بھی چونک پڑتا ہوں۔ بیدار ہونے پر محسوس ہوتا "میں ابھی زندہ ہوں"۔ فوراً جواب دیتا ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

پھر ایسا ہوا —

زمانہ چال قیامت کی چل گیا

۱۹۴۶ء کے ہولناک فسادات، بٹوارہ، خون کی ہولی، اِدھر بھی اُدھر بھی، ملازمت کی نوعیت نے یہ روح فرسا مناظر بہت قریب سے دکھائے۔ آتشِ نمرود کے شعلوں کے پاس بھی گیا۔ ناشکری ہوگی اگر اس حقیقت کا اعتراف نہ کروں کہ اس قیامت میں بھی خداترس اور انسانیت دوست عناصر کی کمی نہ تھی۔ طوفان تھا۔ ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کا تاریخی دن جشنِ آزادی کی دیپاملی۔ ہوش ٹھکانے ہوئے تو بھولے بسروں کی یاد آئی۔ کچھ عرصہ بعد وطنِ عزیز آیا۔

"ارے تم! یہ تم ہی ہو!" پہلی بار رضا کی آنکھوں میں چند قطرے آنسو کے ٹپک پڑنے کے لیے بیتاب نظر آئے۔

"دیکھ ہی رہے ہو۔ یحییٰ کہاں ہیں؟"

"پاکستان سدھارے"

"تمنائی؟"

"ارضِ پاک کی تمنا لے گئے"

"فلاں؟"

"وہ بھی"

"اور فلاں؟"

"اور وہ بھی"

کہاں تک پوچھتا! استفسار کو مختصر کرنا پڑا

"کچھ اور پنکھ بکھیرو؟"

"آشیانوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر"

"تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"قطب از جا نمی جنبد"

کوچہ مراد پور میں فالودے کی دوکان تصور میں آگئی۔ "آج نقد کل اُدھار" اور اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑا۔ جو کچھ ہے "آج" ہی ہے۔ "کل" کا کیا بھروسہ۔ نہ جانیں کیا ہو اور کیسا ہو؟ اور پھر —

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

اور میں سوچنے لگا۔ یحییٰ نے کہا تھا "استغفر اللہ کیا گھٹیا شعر ہے!"

۱۹۵۳ء یا اس سے کچھ قبل اخبار ساتھی، پٹنہ کے کالم پر ایک نظم نظر آئی، غالباً "لیڈری کا نسخہ" از قلم واہی۔ کون ہے یہ واہی؟ کبھی نام ذہن میں آئے۔ غور و فکر کے سب مسترد۔ ہوگا کوئی۔ نظم اچھی ہے۔ آئندہ شماروں میں بھی کچھ ایسے ہی رنگ و آہنگ کی نظمیں دیکھیں۔ شاعر کا نام جاننے کی فکر ہوئی۔ سہیل عظیم آبادی مرحوم "ساتھی" کے ایڈیٹر تھے رجوع کیا۔ جواب آیا "تمہارے ایک گہرے دوست اور ساتھی لاہی بننا چاہتے تھے۔ مصلحتِ وقت نے واہی بنا دیا۔ تفصیل جاننے کے لیے پٹنہ آؤ۔" اس "بوجھو تو جانیں!" کے انداز نے مزید الجھن میں ڈال دیا۔ ہماسے شوق تیز تر ہوگئی۔ پردۂ ذہن پر تلاطم آگیا۔ پہلی بار ایک پیارا سا نام ابھرا۔ "رضا نقوی" مگر نہیں۔ سنجیدہ شاعری کرنے والوں کی صف میں ایک خاص مقام کا مالک، اسمبلی میں سرکاری نوکر۔ اہل سیاست سے سروکار۔ عقل و ہوش سے قریب۔ کیونکہ اس جسارت رندانہ کا مرتکب ہو سکتا ہو! وہ بھی "ساتھی" کے اوراق پر جو ایک ممتاز سیاسی رہنما کا اخبار ہے۔ متعلی کے زمانے ایک خاص پروفیسر کی شان میں ہجویہ اشعار۔ گاؤں کے مخصوص افراد کے ساتھ "البت" اور "دست گوبرا" کے لہجے میں چھیڑ چھاڑ تا پھر اپنے یارِ غار کی تقریب شبِ عروسی کے پس پردہ گل افشانی۔ لیکن اس قسم کی شاعری کو سنجیدہ، طنز و مزاح کی صف میں شامل کرنا، ظلم صریح ہوگا۔ سہیل مرحوم کا پر لطف جواب معمہ بن گیا۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ پروفیسر اختر اورینوی مرحوم کے دست خاص کی ایک تحریر آل انڈیا مشاعرہ کے مطبوعہ دعوتی کارڈ کے ساتھ موصول ہوئی۔ یہ تحریر دراصل حکم نامہ تھی جس کے رو سے مجھے تاریخ مقررہ سے چند دن پہلے ہی پٹنہ پہونچنا تھا تاکہ میری طرف سے انھیں ہر طرح کا اطمینان ہو جائے۔ ملازمت کی مجبوریوں سے حکم کی تعمیل جزوی طور پر ہو سکی۔ عین مشاعرے کے وقت انجمن اسلامیہ ہال پہونچا۔ رضا اپنی مخصوص مسکراہٹ اور عینک کے غلاف سے ادھر اُدھر جھانکتی ہوئی شریر آنکھوں کے ساتھ نظر آئے۔ ہاتھوں میں "واہیات" کا پلندہ۔ تو یہ ہیں حضرت رضا نقوی واہی۔ ستم ظریفی دیکھیے۔ درمیانی عرصہ میں کئی بار ملاقات ہوئی۔ خطوں سے بھی نوازا۔ لیکن اس انقلاب عظیم کی مطلق خبر نہ تھی سے

دہر میں کیا کیا ہوئے ہیں انقلاباتِ عظیم
آسماں بدلا نہ زمیں بدلی نہ بدلی خوئے دوست

اسی خوئے دوست نے تو گرویدہ بنایا۔

رازِ مصلحت آمیز کے منکشف ہونے کے بعد پٹنہ جانے کا اتفاق ہوا تو اکثر موقعوں پر حضرت واہی کی زیارت سے محروم رہا۔ ایسے ہی جوابوں کا سامنا کرنا پڑا جیسے جواب عموماً بیمہ کمپنی کے ایجنٹوں اور قرض خواہوں کو ٹالنے کی غرض سے دیئے جاتے ہیں۔ آج ہی ٹرین سے گیا چلے گئے۔ مظفر پور گئے ہیں۔ رانچی سے ابھی واپس نہیں آئے۔ ابھی کلکتہ گئے ہوئے ہیں۔ دلی گئے مدراس گئے۔ حیدرآباد گئے۔ بمبئی سے واپس نہیں آئے۔ ٹالنے کی بات تو خیر نہیں تھی۔ اس گیڈر گشتی کی اصل وجہ کچھ اور تھی۔ مشاعرے کی شرکت کا بلاوا آیا اور میرے شہنے "واہیات" کا پلندہ سنبھالا! کبھی "طنز و تبسم" کا سہارا لیا۔ کبھی "نشتر و مرہم" کو سینے سے لگایا۔ کبھی "کلامِ نرم و نازک" کو رفیقِ سفر بنایا۔ غرض یہ کہ سے

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے

متعہ واہی تباہی، متاع واہی کی منزل ابھی دور تھی۔ لیکن حضرت واہی کے دیدار کا شرف جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ قسمت نے یاوری کی اور یہ سعادت نصیب ہوگئی تو شیرینیٔ اخلاق و گفتار ایسا چمٹی کا چھٹنا مشکل۔ نہ جانے کیسے کیسے داؤں پیچ اس ستم پیشہ کو آتے ہیں۔" اختر صاحب سے نہیں ملوگے۔ تم کو بہت یاد کرتے ہیں۔" بستر کھلا رہ گیا۔ اس کے برعکس غالب کا شعر یاد کیجئے ؎

دریا پہنے دی ہگہ اور دیکھے کیسا پھر گیا!

"چلو پروفیسر احتشام حسین سے مل لیں۔ بہت دنوں بعد پٹنہ آئے ہیں۔" واپسی کا ارادہ ملتوی۔ "آج بہا والدین صاحب سے ملنا ہے۔" میں کیا جواب دیتا۔ "میرا خیال ہے آج رک جاؤ تو اچھا ہے۔ یہیں آنے والے ہیں۔ پروفیسر مغنی بھی رہیں گے۔" بستر تسلیم "کل کہنا بھول گیا۔ آج کچھ نئے فن کاروں کو چائے پر مدعو کیا ہے۔" اشتیاق نے بیریکیڈ لیے۔ خلاصہ یہ کہ دو تین دن کا مختصر پروگرام، ہفتہ عشرے کی طوالت میں بدل گیا۔ سر پیر نہیں، نوکری کا واسطہ دیا تو بستر باندھنے کی اجازت ملی۔ بستر چھوڑ کر بھاگنے کی نہ تو استطاعت تھی اور نہ ہمت۔ ایسا پیارا دوست کس کو ملتا ہے۔ اب تو خیر سے سمدھی بھی ہیں۔ لیکن رشتہ سے قدر و منزلت میں اضافہ نہ ہوا۔ ایک مکالمہ ملاحظہ ہو۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ تم سے سمدھیانہ قائم کرنے میں سخت غلطی کی۔"

"یہ الہام کیا ابھی ہوا ہے!"

"تمہارے ایسا دہاتی، کوڑھ مغز ان باریکیوں کو نہیں سمجھ سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"کچھ قدر ہوتی۔ کچھ خاطر مدارات ہوتی جب کہ دنیا کا دستور ہے!"

"اور پھر لڑائی بھی ہو جاتی"

"اس کی تم میں مطلق صلاحیت نہیں۔"

"ارے طاہر! زعفرانی شربت۔ ورق لگے پان اور پھولوں کے گجرے کا انتظام کر۔ اپنی گھر والی سے کہہ دے ڈھولک لے کر شروع ہو جائیے۔ سمدھی صاحب روٹھ گئے ہیں۔"

دیکھا آپ نے ٹیپ کا بند! ڈھولک لے کر شروع ہو جائیے! ایسے موقعوں پر زنانے گلوں کی کمانوں سے نی البدیہہ تک بندیوں کے تیر و تفنگ کی جو بارش ہوتی ہے اس سے بچنے کے لیے جیب کو تھوڑا ہلکا کرنا ہی پڑتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ ڈاکا اسی کو کہتے ہیں۔ اور واللہ کس خوب صورتی سے ٹرخا دیا۔ پلاؤ، قورمہ، مرغ مسلم، شامی کباب وغیرہ کا ذکر ہی نہیں حالانکہ جب موڈ میں آتے ہیں تو خود بھی ڈٹ کر کھاتے ہیں اور مار مار کر کھلاتے ہیں۔ یہ علٰحدہ بات ہے کہ اس بلا نوشی کا نتیجہ پھنول کھانے کی بات آتی ہے۔ یا ڈاکٹر کے یہاں آدمی دوڑے جاتے ہیں۔

مجنوں، چمنستانِ ادب کے صحرا میں حسن جنوں کی شان دکھاتا اور جیب و دامن کی رونقیں بکھیرتا رہا اور اس کا ہم سبق! ــــــ گلے میں غم دوراں کی تختی لگائے، سرابوں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ کبھی یہاں، کبھی یہاں، کبھی وہاں، زندگی کے کئی سال

اسی دوا دوش میں گزر گئے - ایک بار پھر خاک وطن نے اپنی طرف کھینچا اور اس جذبہ کے ساتھ ؎

جہاں کی خاک بھی پیاری ہے زندگی کی طرح
اسی دیار سے گزرے ہیں اجنبی کی طرح (بہزاد فاطمی)

واہی سے پہلے، شہزاد معصومی سے ملاقات ہو گئی - حالات معلوم ہوئے ؎ یا

یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے

ملک کے طول و ارض میں چکر لگانے والا جسم، دفعتہً شیشہ میں کیسے تبدیل ہو گیا؟ گردنی باغ کا رخ کیا۔ رکشہ سے اُترنے بھی نہ پایا تھا کہ معجزہ ہو گیا۔ شیشے کے جسم سے رضا کی مانوس آواز قلقل مینا کی صدا کی طرح سامعہ نواز ہوئی۔ "خیریت تو ہے۔ اتنی مدت کے بعد چاند کدھر سے نکل آیا!" قریب آیا تو گلے ملنے کی بے تابی۔" ارے کیا غضب کرتے ہو۔ ٹھوکر لگے گی تو چور ہو جاؤ گے۔" آدمی ذہین ہیں سمجھ گئے۔ "چلئے یا ناشتہ بھی؟" "اگر توفیق ہو تو دونوں۔ مگر پہلے بتاؤ، یہ کیا حماقت ہے؟" دلآویز تبسم بکھیرتے ہوئے اس طرح دیکھا جیسے اس غیر ضروری سوال کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

نصیب دشمناں، واہی کے تنِ ناتواں پر کن امراض کا آسیبی تسلط ہے، یہ تو شہر کے مشہور طبیب اور شاعر حکیم غیاث بھی بتائیں گے جو اپنے مریض خاص کو نہایت فراخ دلی سے ماء اللحم پلاتے اور طرح طرح کے لذیذ معجون مرکب کھلاتے ہیں۔ مجھ تک جو حالات حدیث دیگراں اور علمی مشاہدے سے پہونچے ہیں۔ ان کا خلاصہ "بہر خاص و عام کی آگاہی کے لیے" درج ذیل ہے -

ٹرین سے سفر کرنا، ایک احمقانہ اور خطرناک فعل سمجھتے ہیں۔ کمپارٹمنٹ میں آکسیجن کے بٹوارے کے لیے دھینگا مشتی کی نوبت آجاتی ہے۔ بعض خود دار ادیب و شاعر نے تو اس افراتفری کے پیش نظر سانس لینے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ بس کی سواری تو خیر، یوں بھی شریفوں کے لیے نہیں ہے۔ بھیڑ بکری کے لیے نہیں ہے۔ بھیڑ بکری کے لیے موزوں ہے یا جنہیں ذوق تماشائے لب بام ہو، ان کے لیے۔ لہٰذا شہر سے باہر جانے کا ارادہ کسی قیمت پر ممکن نہیں۔ دعوتی کارڈ بھیجنے والے، برائے مہربانی نوٹ کر لیں۔ بیٹے کی شادی میں بھی نہیں آئے اور نہ اپنی بیگم ہی کو اندیشہ ہائے دور و دراز کے پیش نظر اجازت دی۔ اس کی مجھے اب تک شکایت ہے۔ شہر کے اندر بھی احاطہ سے باہر اسی وقت قدم نکلتے ہیں جب شمیم فاروقی کسی پروگرام میں زحمت سخن دیں۔ اس مختصر سے سفر کے لیے محفوظ ترین سواری ٹیکسی ہی ہے پھر بھی کسی ہم نشین کا ردیف کی طرح رہنا ضروری تاوقتیکہ سنبھلا رہے اس دوہری احتیاط کے فائدے تو بہت ہیں میں صرف اہم فائدوں کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ کنٹریکٹ سے ملنے والی رقم سے غریب ٹیکسی والے کی کفالت! در ثواب کے مستحق خود حضرت واہی اور شمیم فاروقی۔ دوسرے یہ کہ زحمت سخن سے پہلے اگر قافیہ کی منہ زوری، ردیف سے سنبھل نہ سکی تو بہ سرعت تمام طبیعت کو موزوں کرنے کے لیے گھر لوٹ سکیں۔ بفرض محال ٹیکسی نہ ملی یا کوئی ایسی ہی مجبوری ہوئی تو نظر انتخاب رکشہ جیسی خطرناک سواری پر پڑتی ہے۔ اس میں بھی ردیف کی شرط لازمی۔ وقت "نشستن" یمین و یسار کا لحاظ ضروری۔ آگے پیچھے سے آنے والی بلاؤں کا مقابلہ ہم نشین کے سر، جس کی نشست اس وقت حذب مخالف کی جگہ پر ہوتی ہے۔ روانگی کے وقت منزل مقصود کا پتہ بتانا، حساب دوستاں در دل کی مد میں آتا ہے۔ یہ راز قسطوں میں منزل بہ منزل منکشف ہوتا ہے تاکہ راہ سفر کے انتخاب کے جملہ حقوق بنام خود محفوظ رہیں۔ کیا پتہ، رکشہ والا

بد دیانتی سے ایسے راستے کا انتخاب کر کے جو کڑی بھرنا شروع کرے جہاں ٹرافک زیادہ ہو اور پانی بھی نہ ملے۔ سر تھوڑی دور پر صدائے العطش بلند کرنا نہیں بھولتے مگر پانی مانگنے کا فرض ہم نشین کی گردن پر۔ ہم نشین کے سپرد ایک اور اہم کام بھی کبھی شکم مبارک کو ٹھونکنے بجانے جانا ہے۔ یوں تو یہ کام خود بھی انجام دیتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہیں اندر ہی اندر زحمتِ سخن سے باز رکھنے کے لیے خفیہ منصوبے تو نہیں بن رہے ہیں۔ رکشہ والے سے جو سوال و جواب کے ذریعہ تھوڑی بے تکلفی بھی ہو جائے تو یہ بھی احتیاطی کارروائی ہے۔ ایک دفعہ اسی سوال و جواب کے پھیر میں اور رستے کے گھوم گھماؤ کے چکر سے رکشہ والا متوحش اور خائف ہو گیا۔ اڑیل ٹٹو کی طرح اڑنے اور بدکنے لگا "نہ جانے یہ ذات شریف کون بزرگ ہیں!" یہ تو نہ کہہ سکے کہ میں بل میدانِ ظرافت ہوں بہ آہستگی ارشاد ہوا۔ چلو تھوڑا سا ناشتہ کر لو۔ شاید تمہیں بھوک لگی ہو اور تھک گئے ہو۔ اڑیل ٹٹو کو بدل دینا، وضع داری کے خلاف سمجھے۔ ناشتہ کے علاوہ کچھ فاضل پیسہ دینے پڑے تو کیا ہوا، آن بان تو باقی رہی۔ ریڈیو اسٹیشن پہنچنے کے بعد اگر شمیم فاروقی سے بروقت ملاقات ہو گئی تو علیک سلیک کے بعد پہلا سوال" باتھ روم کدھر ہے؟" اب تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں

چک تو ریڈیو اسٹیشن سے ملتا ہے لیکن ایک گلاس ٹھنڈا پانی اور چائے کی گرم پیالی بروقت آمد و رفت شمیم فاروقی کی طرف سے۔ یہ وضع داری اب تک بند رہی ہے اور میری دعا ہے کہ دونوں اپنی اس وضع داری پر ہمیشہ قائم رہیں۔ آمین کہنے کی ضرورت نہیں کیونکہ مجھے یقین کامل ہے کہ دعا مستجاب ہوگی۔ تھوڑی دور پیدل چلنے کی زحمت اس لیے گوارا نہیں کی کہ سانس تیز ہو جاتی ہے۔ گرمیوں میں پسینہ آنے لگتا ہے۔ جاڑوں میں ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ اور برسات میں زکام ہو جاتا ہے شاید آپ کو اس کا علم نہ ہو کہ کالج کے زمانے میں سو گز کی دوڑ میں ہمیشہ اول آئے اور اب بھی چہل قدمی کا کبھی ارادہ فرماتے ہیں تو جھرنے کی روانی آپ آپ ہو جاتی ہے۔

مزے دار بات یہ ہے کہ ان سب محاسن کے باوجود، سالانہ جشنِ ظرافت کے موقعہ پر یہ تمام احتیاطی تدبیریں اور خود اختیاری وضع داریاں نہ جانیں کس کونے میں منہ چھپا لیتی ہیں۔ شاید اس میں بھی کوئی ظریفانہ گوشہ ہو۔ ریسرچ کے شائقین خانقاہ داہی کا رخ کریں۔ اگر ناشتہ یا کھانے کا وقت ہوا ہو تو کہ

چہ دشمن چہ دوست

کے مزے میں شامل ہو جانا لازمی۔ اگر وقت نہ ہوا تو لب دوز، لب سوز اور لبریز چائے کی پیالیاں حاضر، کش لگانے کا بھی شوق کیپسٹن کے خود ساختہ سگریٹ ہاتھ باندھے حاضر۔ پانی، زردے کی موہوم ڈیپارٹمنٹ کے اختیار خصوصی میں ہے۔ اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پان کھانے والے احاطہ سے باہر پیک پھینکنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔ قیلولے کی حاجت ہو تو ہوس عظیم آبادی کی طرح تخت اعظم پر بے تکلف ہو جائیں۔ تخت اعظم اس لیے کہ اس کا ثانی ملنا مشکل ہے۔ آپ کا بے تکلف ہو جانا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ داہی کو پیوتوں کے بھاری پن کو وقفہ وقفہ پر ہلکا کرنے کی حاجت ہوتی ہے۔ اگر آپ نمازی ہیں اور ڈاکٹر عبدالمغنی کی طرح خیر الامور اوسطہا کی تفسیر مجسم، تو بسم اللہ! تخت اعظم کے کسی بھی حصہ پر دست بستہ کھڑے ہو جائیں۔ کارِ خیر کے ثواب کا ایک حصہ تو اہل خانقاہ کو مل ہی جائے گا۔ سجادہ نشین اسی لیے نہیں کہ داہی کو اس تقدس کا دعوی نہیں۔ اگر آپ حضرت شہاب دسنوی کی طرح کسی حد تک زلف دراز کے حریف ہیں تو کچھ اور سمتِ قبلہ کھسک جائیں ورنہ جھولتے

ہوئے پنکھے کی ظریفانہ وسعت سے قیام میں خلل کا اندیشہ ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس گناہ کا خمیازہ شخص بے گناہ کو بھگتنا پڑے۔

ایک اور چیز جو خانقاہ واہی میں مل سکتی ہے وہ ہے "خالص اور میٹھا دہی"۔ واہی کو سر پر ٹوکرا رکھ کر کوچہ د بازار میں "لے دہی" کی صدا بلند کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی۔ ضرورت مند خود ہی آکر لے جاتے ہیں۔ باہر سے بھی فرمائش دے کر منگواتے ہیں۔ اس بات کا البتہ خیال رکھیں کہ اس قیمتی شے کو فرج یا کولڈ اسٹوریج کی آب و ہوا راس نہیں آتی۔ اگر اس ضروری ہدایت کو آپ نے نظر انداز کر دیا تو پھر بدذوقی کے الزام سے نہ بچ سکیں گے۔

ورق تمام ہوا ـــــ لیکن ٹھہریئے اس بحرِ بیکراں کی ایک سربلند موج بھی دعوتِ نظارہ دے رہی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ادھر بھی چلیں۔

●●

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	-/۱۵ روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۳/۵۰
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	"	-/۶
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	-/۶
نقطہ	یوسف ناظم	"	-/۶
در پردہ	مسیح انجم	"	-/۶
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	-/۱۰
چوٹی کے غلام	" "	مضامین	-/۷
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	-/۸
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	-/۸
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	-/۸
بہر حال	مجتبیٰ حسین	مضامین	-/۷
انڈین کاجو	عاتق شاہ	"	-/۸
شوشے	ارشد علی خاں	"	-/۱۰

مہنگائی کا راج

مہنگائی کا راج ہے پیارے   چوپٹ کام اور کاج ہے پیارے
اصل سے دونا بیاج ہے پیارے   سیٹھوں کے سر پہ تاج ہے پیارے
کل سے بدتر آج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

گیہوں مہنگا ، مہنگی مکا   راشن کے ڈیپو پر دھکا
دھنیا مشتی ، بھیڑ بھڑکا   جائیں کہاں اب چودھری مکا
سونے کے داموں ناج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

آلو مہنگا ، بینگن مہنگا   مرچ مسالہ روغن مہنگا
بجلی مہنگی ، ایندھن مہنگا   چکلا مہنگا ، بیلن مہنگا
پانچ روپیہ کا چھاج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

بھوکے ننگے نرادر ناری   مہنگی روٹی ، مہنگی ساری
بیٹا کنوارا ، بیٹی کنواری   بکی گرہستی ، باری باری
کوڑھ کے ساتھ اب کھاج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

کرسی پر لالچ کے بندے   مجبوروں کی کھال یہ رندے
سو میں نوّے انڈے گندے   چار طرف رشوت کے پھندے
رشوت کیا ہے باج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

راشن کوٹے کی بلہاری   جنتا ناخوش ، خوش ادھیکاری
سارق ساہوکار میں یاری   چور "بلیکئے" پنچ ہزاری
کوا بھی درّاج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

بچے بھوکے ، بھوکی رانی   گھر گھر فاقے کی مہمانی
کیسے جئیں بے دانہ پانی   کب تک آخر آنا کانی
سب کو یہی غم آج ہے پیارے
مہنگائی کا راج ہے پیارے

اعجاز وارثی
(سنبھلی)

رپورٹ از یونس حیدرآبادی

ریاست بہار کے شہر پٹنہ میں ۲۴ اور ۲۵ فروری ۱۹۸۰ء کو چوتھا جشن ظرافت منایا گیا۔ جشن ظرافت کمیٹی کی مجلس انتظامیہ میں یہ حضرات شامل تھے۔

ڈاکٹر اے۔ آر۔ قدوائی گورنر بہار (سرپرست اعلیٰ) جناب ایس امیرالہدیٰ (صدر نشین) جناب رضا نقوی واہی (صدر) جناب شبیر حسین اور جناب ایس ایس مشہدی (معتمدین) جناب اے۔ آر نقوی (خازن) اور ارکان میں جناب محمد حسین آزاد (سابق وزیر ریاست بہار) ڈاکٹر جے سی کندرا آئی اے ایس، ایچ پی ماتھر، ایچ رشید، شاہ مشتاق احمد، ایس اے عباس، ایس این پوری، آئی پی ایس، ڈاکٹر بی بھٹاچاریہ، ایس ایم احسن، ڈبلیو ایچ خان، ہدایت اللہ خاں، محمد سراج الدین، شفیع جاوید، تسنیم فاروقی۔ جوہر سیوانی، اسرار جامعی، شہزاد معصومی، ایس احسن، آنقوی اور ممتاز احمد۔

۲۴ فروری بروز اتوار بوقت ۱۰ بجے صبح گورنمنٹ اردو لائبریری میں طنز و مزاح پر سمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ ابتدا میں جناب ایس ایس مشہدی نے چوتھے جشن ظرافت کی تفصیل سے واقف کروایا۔ سمینار کی صدارت بہار کی معزز شخصیت ڈاکٹر شفیق نے کی۔ مہمان خصوصی جناب نریندر لوتھر چیرمن بھارت لیدر کارپوریشن (دہلی) تھے۔

خیر مقدمی تقریر سے پہلے جناب ایس ایس مشہدی نے پٹنہ کے مشہور ادیب سہیل عظیم آبادی اور دو مزاح نگار جناب ابرار ساغر جناب ماہ منوری کے انتقال پر ملال پر تعزیتی قرارداد پیش کی۔ سمینار کی خیر مقدمی تقریر ڈاکٹر عبدالمغنی صدر انجمن ترقی اردو ہند (پٹنہ) نے کی۔ جشن ظرافت میں آئے ہوئے مہمانوں کا پرجوش خیر مقدم کیا اور طنز و مزاح کی اہمیت پر بصیرت افروز مختصر سی تقریر کی۔

جناب ایس ایس مشہدی نے سمینار کی کارروائی چلائی۔ پہلا مقالہ جناب تاج پیامی نے پڑھا۔ ان کے مقالے کا موضوع تھا "سودا کی ہجو نگاری"۔ دوسرا مقالہ ڈاکٹر حامد حسین پھیروی پروفیسر آرہ کالج نے پیش کیا۔ مقالے کا موضوع طنز و مزاح کا تہذیبی اور سماجی پس منظر تھا۔ تیسرا مقالہ ڈاکٹر سید طلحہ رضوی صدر شعبہ اردو و فارسی آرہ کالج نے طنز و مزاح اور رضا ہی پر اپنا مقالہ پیش کیا۔ چوتھا مقالہ ڈاکٹر عبدالقوی دسنوی صدر شعبہ اردو بھوپال کالج نے "اقبال کا طنزیہ و مزاحیہ کلام" پر پیش کیا۔ سمینار کے دوران طنز و مزاح پر اہم سوالات کیے گئے اور مقالہ نگاروں نے جواباً عرض ہے کے تحت سوالات کرنے والوں کو مطمئن کیا۔ گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ کا وسیع ہال طنز و مزاح کے شائقین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ صدر جلسہ اور نریندر لوتھر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ایس ایس مشہدی کے شکریہ پر سمینار کا اختتام عمل میں آیا۔ مہمانوں اور مدعوئین کے لیے شاندار لنچ کا اہتمام کیا گیا تھا۔

۲۴ فروری اتوار ہی کے روز بوقت ۶½ بجے شام سا ہو جین ہال میں ادبی اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اسی ہال میں جشن ظرافت کے گذشتہ دو کل ہند مشاعرے منعقد ہو چکے ہیں۔ ہال وسیع اور بہت ہی خوب صورت ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق ۲ ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ ادبی اجلاس کی صدارت جناب ایس کے سریواستوا آئی اے ایس نے کی۔ خیر مقدمی تقریر ایس ایس مشہدی نے کی۔ افتتاح جناب ایس علی حیدر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ صدارتی تقریر، ادبی اجلاس شروع ہونے سے قبل جناب ایس کے سریواستوا آئی اے ایس نے فرمائی۔ طنز و مزاح کے تاریخی پس منظر کو پیش کیا اور موجودہ حالات میں اس فن کے احیا پر زور دیا۔ مہمان خصوصی جناب محمد حسین آزاد سابق وزیر ریاست بہار ڈاکٹر جے سی کندرا آئی اے ایس تھے۔ ادبی اجلاس میں پہلا مضمون جناب مجتبیٰ حسین نے "لوٹ پیچھے کی طرف" پیش کیا۔ ڈاکٹر جے سی کندرا جو انگریزی میں طنز و مزاح پر کئی کتابوں کے مصنف ہیں اپنا پہلا اردو مزاحیہ مضمون "گدھوں کی تعداد" سنایا۔ جناب نریندر لوتھر نے اپنا مزاحیہ مضمون "بیٹھنے" پیش کیا۔ جشن ظرافت کے سلسلے میں شائع کیے گئے ساوینیر کی رسم اجرا ممتاز طنز نگار جناب فکر تونسوی نے انجام دی۔ آخری مضمون جناب فکر تونسوی نے "گھر میں چور" پیش کیا۔ ادبی اجلاس کے چار مضامین کے ختم ہوتے ہی جناب شفیق مشہدی نے اعلان کیا کہ اس مرتبہ جشن ظرافت کمیٹی نے زندہ دلانِ حیدرآباد کی تقلید میں محفل لطیفہ کا اہتمام کیا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی سارے ہال میں زبردست تالیاں بجنے لگیں۔ مشہدی صاحب نے تالیوں کو روکا۔ محفل لطیفہ کے آغاز کے لیے بوگس حیدرآبادی کا نام پیش کیا۔ اس کے بعد طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ اور محمد حمایت اللہ نے لطیفے سنائے۔ ڈاکٹر جے سی کندرا آئی اے ایس نے بھی دو لطیفے سنائے۔ ادبی اجلاس و محفل لطیفہ کے کنوینر شفیع مشہدی نے شکریہ ادا کیا اور یہ قہقہہ زار محفل اختتام کو پہنچی۔ ادبی اجلاس و محفل لطیفہ کے اختتام پر انجمن ترقی اردو ہند (پٹنہ) کی جانب سے ترتیب دیئے گئے ڈنر میں مہمانوں اور مدعوئین کا قافلہ روانہ ہو گیا۔

۲۵ر فروری بروز دوشنبہ جشن ظرافت کمیٹی کی جانب سے ہوٹل پرنسس میں مہمانوں اور مدعوئین کے لیے لنچ ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل پرنسس کسی زمانے میں میر علی امام کی رہائش گاہ تھا جو بہار میں ایک اعلیٰ عہدہ پہ مامور تھے اور یہی علی امام ریاست حیدرآباد کے بھی وزیر اعظم رہ چکے تھے۔

۲۵ر فروری کی رات سری کرشنا میموریل ہال پٹنہ میں کل ہند مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ یہ گنبد نما ہال ہے۔ اس میں تین تین ساڑھے تین ہزار افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے کہ یہ ریاست بہار کا سب سے بڑا ہال ہے۔ اس میں تشری بے پرکاش نارائن کی میت کو عوام کے درشن کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس ہال میں ڈاکٹر جے سی کندرا آئی اے ایس کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ جناب امیر الہدیٰ وہاردن رشید معتمد انجمن ترقی اُردو ہند کی تقاریر ہوئیں مشاعرہ کا آغاز نوگس حیدرآبادی کے کلام سے ہوا۔ ان کے بعد اس ترتیب سے شعرائے کرام نے محفل کو گرمایا: ناظم انصاری، واقف آردی، محمود نشتر، ناوک حمزہ پوری۔ مشتاق پردیسی، صابر بہاری، جاہل سلطان پوری، نرگس سہسوانی، شہزاد معصومی، طالب خوندمیری، سجنی بھوپالی، بخشش حسین، مصطفیٰ علی بیگ، جوہر سیوانی، نریندر لوتھر، پروفیسر مہدی علی، اسرار جامعی، رضا نقوی واہی اور محمد حمایت اللہ

مشاعرہ کا دوسرا دور بھی ہوا۔ مشاعرہ کی کامنرطی بھی جناب شفیع مشہدی نے بہت ہی خوب صورت انداز میں دی اور ان ہی کے شکریہ پہ جو پچھلے کل ہند مشاعرہ کا اختتام عمل میں آیا۔

۲۶ر فروری بروز سہ شنبہ دوپہر پٹنہ یونیورسٹی میں زندہ دلان حیدرآباد کے شعرا کا خیر مقدم بجانب بزم اُردو پٹنہ یونیورسٹی کیا گیا۔ یونیورسٹی کے طلبار، اساتذہ، ہندی ڈپارٹمنٹ کے اساتذہ وطلبار کی بڑی تعداد ہال میں جمع تھی۔ جناب مطیع الرحمٰن، صدر شعبۂ اردو نے صدارت کی۔ مہمان خصوصی جناب کلیم عاجز تھے۔ یونیورسٹی کے طلبار خورشید، آذر اور جمیل نے کلام سنایا۔ نرگس حیدرآبادی نے زندہ دلان حیدرآباد کی سرگرمیوں اور ماہنامہ شگوفہ اور اپنے ساتھی شعرار کا تعارف کروایا۔ طالب خوندمیری، مصطفیٰ علی بیگ۔ اور محمود نشتر نے کلام سنایا۔ طلبار کی خواہش پہ مصطفیٰ علی بیگ نے غالب صدی تقاریب' خاکہ سنایا۔ ڈاکٹر اسلم آزاد پروفیسر پٹنہ یونیورسٹی نے شکریہ ادا کیا۔ ۞

تاج پیامی
(بہار)

سودا کی ہجو نگاری

ادب قدیم اور جدید نہیں ہوتا۔ ہم جسے پرانا ادب کہتے ہیں، اس میں بھی بعض ایسی خوبیاں اور خصوصیات پائی جاتی ہیں جو دورِ حاضر کے حالات اور واقعات سے بھی یکسانیت اور مطابقت رکھتی ہیں۔ ان کا از سرِ نو جائزہ لینا سودمند ثابت ہوتا ہے۔ آج سودا کی ہجو نگاری پر یہ مضمون لکھنے کا سبب بھی یہی ہے۔ جس صورت حال سے سودا دو چار تھے ہم بھی ہیں۔ سیاسی کشمکش، اقربا پروری، رشوت ستانی اور بدانتظامی اس وقت بھی تھی اور اس وقت بھی ہے۔ اخلاقی، سماجی اور مذہبی قدریں بھی پامال کی جا رہی تھیں اور آج بھی کی جا رہی ہیں۔ سودا نے اپنے وقت کی ان ساری برائیوں اور کوتاہیوں کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور ان ہی پر ہجو کہی۔ ان حقائق کے پیشِ نظر ہم سودا کو ادب عالیہ کے عظیم شعرا کے ساتھ شمار کرتے ہیں۔

یورپ کی ادبیات میں ہجو کی بھی ایک روایت ہے، ہوریس (HORACE) کوپر (COWPER) وغیرہ کی ہجو ہلکی پھلکی، پرمزاح اور تہذیب کے اندر ہوتی ہے جبکہ لوسیس (LUCIUS)، جووینل (JUVENAL) مارسٹن ہال (HALL) وغیرہ کی ہجو سے نفرت، غصّے اور تلخی کا اظہار ہوتا ہے۔

اردو ادب میں ہجو نگاری کے سرسری جائزہ میں ہم اکبرالٰہ آبادی، اقبال، رضا نقوی واہی، دلاور فگار وغیرہ کو پہلے گروپ میں سودا، کسی حد تک نظیر اکبر آبادی، جوش، ہنیر آروی وغیرہ کو دوسرے گروپ میں رکھ سکتے ہیں۔

ایک ہجو نگار اخلاقی قدروں کا پرستار ہوتا ہے، وہ اپنے دور کی ناانصافی، ریاکاری کو بڑپن، بدنما مناظر، سیاسی

رہناؤں کی گمراہیوں اور مذہبی پیشواؤں کے تعصب کی نشاندہی کرتا ہے۔ وہ کبھی ان پر ہنستا ہے اور کبھی طنز کے نشتر چلاتا ہے تاکہ ان خامیوں کو دور کیا جاسکے۔

یہاں انگلینڈ کے دو مشہور ہجو نگار کے نظریے جاننا مناسب ہوگا۔ ڈرائیڈن (Dryden) کہتا ہے:

"The trues end of satire is the amendment of vice by correction. And he who writes honestly is no more an enemy to the offender than the physician to the patient, when he prescribes harsh remedies to an inevitable desease."

ڈرائیڈن کے نزدیک ہجو کا مقصد ہی برائیوں کو دور کرنا ہے۔ ہجو نگار کا کام اذیت پہنچانا نہیں بلکہ اس ڈاکٹر کی طرح ہے جو بیماری کو دور کرنے کے لیے تلخ دوائیاں تجویز کرتا ہے۔

اور پوپ (Pope) کا ہجو کے بارے میں خیال ہے:

"O sacred weapon, left for truth defence"

یعنی ہجو ایک متبرک ہتھیار ہے جس سے حق کی حفاظت کی جاتی ہے۔

ہجو ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس میں ایک ناراض اور برہم شاعر اور فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ کسی شخص یا سماج کی خرابیوں اور خامیوں کی نشاندہی اس چابک دستی سے کرتا ہے کہ اس کے ذاتی جذبات اور خیالات ہمہ گیر اور عالمگیر بن جاتے ہیں۔ ہجو گو شاعر طنز و مزاح دونوں سے حسبِ ضرورت کام لیتا ہے۔ سودا کے ہجو میں بھی ہم یہ خوبیاں پاتے ہیں۔

آیئے ہم سودا کا موازنہ ڈرائیڈن اور پوپ سے کریں اور دیکھیں کہ ان دونوں میں جو خوبیاں اور خامیاں ہیں وہ کس حد تک سودا میں پائی جاتی ہیں۔ سودا ۱۷۱۳ء میں پیدا ہوا۔ ڈرائیڈن ۱۷۰۰ء میں مرچکا تھا۔ پوپ ۱۶۸۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۴۴ء تک زندہ رہا۔

ڈرائیڈن خوش طبع اور نکتہ سنج ہے (Humorous and witty)

پوپ نکتہ سنج ہے۔ ڈرائیڈن کے ہاتھ میں ہجو، ہجو قبیح (Lampoon) بن جاتی ہے۔ لیکن اس میں جوش نہیں۔ سودا، ڈرائیڈن ہی کی طرح ظریف اور بذلہ سنج ہے

اس کے ہاتھ میں ہجو، ہجو قبیح ہو جاتی ہے لیکن ڈرائیڈن کی نسبت سودا کے یہاں جوش زیادہ ہے۔

پوپ اپنی ہجو میں ذاتی نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ وہ پہلے ایک عام بات (General statement) کہتا ہے، پھر اُسے مخصوص بناتا ہے۔ وہ ایک ہی بات کو مختلف انداز میں بیان کرتا ہے اور نفرت کی لہریں تہ بہ تہ ابھرتی جاتی ہیں۔ پوپ اپنے کردار کی ایک ہی خامی کو طرح طرح سے بیان کرتا ہے۔ ڈرائیڈن اپنے کردار کی تشکیل میں فن کارانہ چابک دستی سے کام لیتا ہے۔ اس کے کردار رفتہ رفتہ تکمیل کے مراحل طے کرتے ہیں۔ اس کے کردار کی مکمل شخصیت آہستہ آہستہ ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

سودا پوپ کی طرح اپنے کردار کی ایک ہی خامی کو طرح طرح سے بیان کرتا ہے، وہ ڈرائیڈن کی مانند اپنے کردار کی تعمیر نہیں کرتا، سودا کے کردار کی شخصیت آہستہ آہستہ مکمل ہو کر ہمارے سامنے نہیں آتی۔ وہ شاذونادر ہی اپنے کردار کی تشکیل بحسن وخوبی کر پاتا ہے۔

ڈرائیڈن اپنے کردار کی خامیوں کو تلاش کرتا ہے اور ان پر خوش ہوتا ہے وہ کریکچرسٹ ہے اور تل کو تاڑ بنا کر پیش کرتا ہے۔ پوپ کو افسوس ہوتا ہے کہ کوئی شخص اتنا بُرا کیوں ہے۔ وہ میچرسٹ ہے اور قدآور کو بونا بنا دیتا ہے۔ پوپ کے برخلاف اور ڈرائیڈن کی مانند سودا بھی اپنے کردار کی خامیوں کی جستجو میں سرگرداں نظر آتا ہے اور ان کی یافت پر خوش ہوتا ہے۔ وہ انہیں اور زیادہ مضحک بنا کر پیش کرتا ہے اور ان پر قہقہے لگاتا ہے۔

سودا، اپنے کردار کی خامی بیان کرنے کے شوق میں، تحقیق سے قطعی کام نہیں لیتا، وہ بلاتحقیق ہجو لکھ دیتا ہے۔ مثلاً سودا کو کسی سے معلوم ہوا کہ اللہ محدث نے اپنی کسی کتاب میں حضرت امیر معاویہ کو خلیفہ پنجم لکھا ہے۔ پھر کیا تھا، اس بے بنیاد بات پر سودا نے بڑی نازیبا باتیں لکھ ڈالیں۔ پوری ہجو یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی سے بھری ہے۔ اس طرح عقائد اور مذہبی جوش میں آکر سودا نے ایک ہجو مولوی ساجد پر لکھ دی جسے کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہجو کے خاتمہ پر فارسی کا یہ شعر ہے ؎

مکن تو لعن بہ شمر و یزید و ابنِ زیاد
بگو بہ مولوی ساجد مدام لعنت باد

ان ہجویات میں تمسخر، پھکڑپن اور فحاشی ہے، اکثر سودا غصے میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ وہ جس سے ناراض ہوتا ہے صرف اسی پر ہجو نہیں کہتا بلکہ اس کے عزیز و اقارب کو بھی نہیں چھوڑتا۔ مثلاً میر ضاحک پر ہجو کہی تو ساتھ ہی اس نے ایک "مخمس در ہجو اہلیہ میر ضاحک" بھی لکھ ڈالی اور مولوی ندرت کشمیری کی ہجو کے علاوہ "مسدس در ہجو دختر مولوی ندرت"

بھی قلمبند کرڈالی۔ ایک دوسری ہجو میں سودا نے مولوی ندرت کشمیری کی جہالت، صرف ونحو سے ناواقفیت اور شعر پڑھنے کے انداز کا مذاق اُڑایا ہے۔

دفع شعر خوانی کی آپ کی گر بتایئے
کپّی میں ڈال کسنکری اس کے تئیں پلایئے
بزم میں شاعروں کی آپ ہو دیں تو واں نہ جایئے
جایئے بھی تو آپ منہ پر یہ کہلے آیئے

گھوڑے کو دو نہ دو لگام، منہ کو لگام دو

میں یہاں سودا کی "ہجو اسپ" اور فولاد خاں کوتوال کی ہجو کا تفصیلی جائزہ لوں گا۔ ہجو اسپ بڑی جان دار اور زوردار نظم ہے۔ لیکن اس میں مبالغہ آرائی کے ساتھ فنی خامیاں بھی ہیں۔ فولاد خاں کوتوال کی ہجو میں زور کم ہے مگر اس کے کردار کی تعمیر قابل تعریف ہے۔

ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) کیٹس (Keats) پر اپنے ایک تنقیدی مضمون میں تحریر کرتا ہے کہ کیٹس بیانیہ نظم (Narrative poem) کا ماہر نہ تھا۔ نظم کے ہر شعر کو ایک دوسرے سے مربوط اور مبسوط ہونا چاہیے۔ کیٹس کے یہاں یہ بات نہیں۔ بیچ بیچ سے کئی کئی اشعار نکال لیں نظم اپنی جگہ برقرار رہے گی بلکہ کچھ اور زور دار ہو جائے گی۔

شارب ردولوی "افکار سودا" میں سودا کے متعلق لکھتے ہیں:

"مرثیہ اور ہجویات سے کچھ شعر نکال دیئے گئے ہیں لیکن اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اچھے اشعار نظر انداز نہ ہونے پائیں اور کہیں بے ربطی نہ ہو۔"

اس اقتباس سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے اول یہ کہ سودا کے یہاں اچھے اشعار کے علاوہ بُرے اشعار بھی ہیں، دوئم کچھ اشعار نکال دیئے جائیں تو بے ربطی پیدا نہ ہو۔ میرے نزدیک یہ نظم کی بہت بڑی خامی ہے۔ سودا کے یہاں یہ خامی محض اس وجہ سے ہے کہ وہ ایک ہی بات کو باربار مختلف الفاظ میں دہراتا ہے، اس سے ایک اور خرابی پیدا ہوتی ہے۔ سودا کے کردار مکمل طور پر اجاگر نہیں ہو پاتے۔

سودا قصیدہ گوئی میں ماہر ہے . اس لیے اس کے کلام میں زور بیان بدرجۂ اتم موجود ہے۔ گھوڑے کی ہجو میں بھی اچھے اشعار نکالے ہیں لیکن اکثر اس نے شاعرانہ ضبط سے کام نہیں لیا ہے۔ چند اچھے اشعار ملاحظہ ہوں۔

ناطاقتی کا اس کے میں کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں بیاں
مانند نقشِ نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہو دیں نہ استوار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار
مانند اسپِ خانہ شطرنج اپنے پاؤں
جز دستِ غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

ان چھ اشعار میں صرف دو باتیں کہی گئی ہیں۔ گھوڑے کی فاقہ کسی اور لاغری اور پھر یہ اشعار:-

کہتا تھا کوئی ہے "بزکوہی" نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار
اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے، اس دن ہوئے تھے گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے واں گزار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

مندرجہ اشعار کے تعلق سے میرا بھی وہی خیال ہے جو جناب کلیم الدین احمد کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"پہلے دو شعر تک تو مضائقہ نہ تھا۔ یہاں جائز حد تک گھوڑے کی ہجو کی گئی ہے لیکن بقیہ اشعار میں ضرورت سے زیادہ مبالغہ ہے۔ پھر ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ پہلے شعر میں کہنے والے واقعی گھوڑے کو بز ہی یا ولایت کا حمار نہیں سمجھتے۔ دوسرے شعر میں بھی کہنے والے نے محض ظرافت اور اچھی ظرافت سے کام لیا ہے۔ لیکن بعد کے شعروں میں اس گھوڑے کو واقعی گدھا تصور کیا جاتا ہے اور پھر اسے خرس بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مبالغہ ذوقِ لطیف کے لیے بے لطفی کا سبب ہوتا ہے۔ پھر یہاں تکرار مذاق صحیح پر گراں گزرتی ہے۔"

ہجو اسپ" میں تضحیک روزگار" اتنے لچر اور مضحکہ خیز انداز میں پیش کی گئی ہے کہ اصل مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ گھوڑا، بہادری اور شجاعت کی علامت ہے۔ اس کی ذات سے کتنے جنگی کارنامے وابستہ ہیں۔ گھوڑے کی زبوں حالی فوج اور حکومت کی زبوں حالی ہے۔

سودا یہی بات کہنا چاہتا تھا۔ مرہٹہ فوج کے سامنے سے گھوڑے کا مالک اسے "بغل میں مار" بھگا لاتا ہے۔

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار
دھر دھکا داں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

یہ بات تاریخی حقیقت ہے کہ مرہٹوں نے دلّی پر کئی بار حملہ کیا، اسے لوٹا مگر شاہی فوج اس کا مقابلہ نہ کر سکی۔

سودا کے زمانے میں حکومت کی طرف سے گھوڑوں کی دیکھ بھال کا انتظام کیا جاتا تھا تاکہ بوقت ضرورت کام آئیں۔ لیکن حکومت کی کمزوری اور بدنظمی کے سبب گھوڑوں کے منتظم روپے خود کھا جاتے اور گھوڑوں کو حسب ضرورت دانہ گھاس وغیرہ کھانے کو نہیں دیتے۔ گھوڑے فاقہ سے نحیف ولاغر ہو جاتے اور بوقت جنگ ناکارہ ثابت ہوتے سودا "ہجو اسپ" کے ذریعہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دور میں حکومت ناپائیدار اور فوج ناکارہ تھی اور معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ مگر اصل مقصد غیر ضروری اور بے جا تکرار کی نذر ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلیم الدین احمد صاحب جیسا دیدہ ور نقاد بھی اس کی نشان دہی نہ کر سکا۔ وہ اپنے مضمون" اردو ادب میں طنز وظرافت" میں کہتے ہیں "یہاں موضوع اہم نہیں" جبکہ یہاں موضوع بہت اہم ہے۔ لیکن مضحک اندازِ بیاں نے اسے غیر اہم بنا دیا ہے۔

یہ ہجویں کہی جاتی تو زیادہ جاندار اور بااثر ہوتی ہے۔ سودا اپنے ہمسایہ سے گھوڑا مستعار لینے جاتا ہے۔ وہ سمجھتا

ہے کہ یہ گھوڑا نہایت طاقت ور اور عمدہ اور اچھی نسل کا ہے۔ کیونکہ اس کی پرورش سرکار کی طرف سے ہوتی ہے مگر اس کا ہمسایہ اس کے اندازے کے برعکس گھوڑے کی تصویر پیش کرتا ہے۔ فاقہ کشی کے سبب گھوڑا نہایت لاغر اور کمزور ہوگیا ہے۔ مرہٹوں کے ساتھ جنگ میں یہ بُری طرح ناکارہ ثابت ہوا ہے۔ اس طرح سودا کے ذہن کو شدید دھکا پہنچا ہے اور تب وتضحیک روزگار کے سلسلہ میں چند اشعار کہتا تو یہ نظم کامیاب اور موثر ثابت ہوتی۔ موجودہ صورت میں یہ اعلیٰ ہجویہ شاعری کا نمونہ نہیں۔

سودا خلقی اور فطری طور پر ظریف اور بذلہ سنج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنجیدہ موضوع پر کہی گئی ہجو میں بھی جذبات کی شدت کا احساس کم ہوتا ہے۔ "قصیدۂ شہر آشوب" اور "مخمس شہر آشوب" میں جذبات کی شدت اور سنجیدگی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ لیکن ان میں "ہجو اسپ" کا سا شاعرانہ حسن نہیں۔

میرا خیال ہے سودا کی ہجویات میں "شہیدی فولاد خاں کوتوال شاہجہاں آباد" کی ہجو موضوع اور فن ہر دو لحاظ سے بہتر ہے۔ اس ہجو میں سودا، پوپ کی طرح سنجیدہ نظر آتا ہے وہ سخت افسوس کرتا ہے کہ شہر کا کوتوال اور اتنا بڑا بدانتظام اور بے ایمان کہ چوروں کو پکڑنے کی بجائے ان سے رشوت لے، چوری میں ان کا ساتھ دے اور چوری کے مال میں خود حصہ دار بن جائے!!! وغیرہ، وغیرہ!!

اس ہجو میں سودا کردار کی تشکیل ڈرائیڈن کی نہج پر کرتا ہے۔ فولاد خاں کوتوال کا کردار رفتہ رفتہ مکمل ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

سودا، نہایت مختصر اور جامع انداز میں چوری اور رہزنی کا ذمہ دار شہر کے کوتوال فولاد خاں کو ٹھہراتا ہے۔ شہر کی خراب حالت کو بیان کرتے ہوئے شاعر کتنا صحیح کہتا ہے:

کس طرح شہر کا نہ ہو یہ حال
شہیدی فولاد اب جو ہے کتوال

صرف ایک شعر میں شاعر کتنی ساری باتیں کہہ جاتا ہے۔ شہیدی فولاد خاں کا کردار بالکل سامنے آجاتا ہے۔ شہر کی خراب حالت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شہیدی خود جیسا چور کتوال ہوگیا ہے۔ شہر کے چور اس مثل پر عمل کرتے ہیں

"سیاں بھئے کتوال اب ڈر کاہے کا"

توجیہات کے ساتھ محاوروں اور ضرب الامثال نے شاعرانہ کیف کو دوآتشہ کر دیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

چورکب اس کا زور مانے ہے	کالا بال اپنا اس کو جانے ہے
ان سے رشوت لیے یہ بیٹھا ہے	اس کے دل میں چور بیٹھا ہے
شام سے صبح تک یہی ہے شور	ڈور پوگھڑی لے چلا ہے چور
آنکھ تو کس بشر کی لاگے ہے	چور کے ڈر سے فتنہ جاگے ہے
آسماں پر بھی منعدم ہے خواب	کھلا رہتا ہے دیدۂ مہتاب

اور پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ کوتوال اپنی حرکتوں سے خود کو چوروں کے قبضہ میں محسوس کرتا ہے۔ آیئے اور کوتوال کی بے چارگی کا تماشہ دیکھئے:

خلق جب دیکھ کر یہ بیداد
کرتے ہیں کوتوال سے فریاد
بولے ہے وہ کہ میں بھی ہوں لاچار
گرم ہے چوٹٹوں کا اب بازار
مٹ سکے مجھ غریب سے یہ خلل
ہے امیروں کے گھر میں چور محل

اس سنجیدہ ہجو میں بھی سودا کا ظریفانہ رنگ ملاحظہ ہو:

دیکھئے گر بتاں کو بھی بخدا
ہاتھ میں ہے انھوں کے دُزد حنا
کس کو ماروں میں کس کو گالی دوں
چوری کرنے سے کون ہے خالی

بہرکیف، اس ہجو میں مقصد کی اہمیت شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور کردار کی آمیزش کلاسیکل طنز و ظرافت کی ہم آہنگی کی مدد سے بڑی چابک دستی اور شاعرانہ فن کاری کے ساتھ کی گئی ہے۔

○

○

(مراسلے)

◎ "اقبال کی شاعری میں طنز و مزاح" از سید محی الدین قادری ہادی پڑھا۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مضمون نگار نے مندرجہ ذیل شعر کے ساتھ،

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

یہ واقعہ تحریر کیا ہے:

"مضمون کے آخر میں وہ دو اشعار پیش کرتا ہوں جن میں اقبال نے اجمیر میں ڈھائی ہوئی مسجد بنانے والوں پر بھرپور طنز کرنے کے علاوہ اپنے آپ پر بھی ملامت کی ہے۔"

اس شعر کے سلسلے میں غلام رسول مہر "مطالب بانگِ درا" صفحہ ۲۳۵ پر واقعہ تحریر کرتے ہیں:

"یہ نظم اقبال نے اس موقع پر لکھی تھی جب لاہور کے مسلمانوں نے اچانک جمع ہو کر ایک رات میں شاہ عالمی دروازے کے باہر مسجد بنا کر کھڑی کر دی۔ اس مسجد کے لیے مدت سے درخواست دے رکھی تھی اور وہ درخواست منظور نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے چپکے چپکے سارا مسالہ فراہم کر لیا شام کے بعد بنانے لگے اور صبح سے پہلے پہلے مکمل کر دی، کچھ مدت بعد حکومت نے فوج کھڑی کر کے اس مسجد کو گرا دیا۔ پھر باقاعدہ منظوری حاصل کر کے یہ از سر نو تعمیر ہوئی اور وہ موجود ہے۔"

اور محمد عبداللہ قریشی اس مسجد کے سلسلے میں یہ تحریر کرتے ہیں۔

"مئی ۱۹۲۲ء میں لاہور کے شاہ عالمی دروازے کے باہر ایک مندر تعمیر ہوا۔ اس کے قریب ہی ایک چبوترے پر مسلمان نماز پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوؤں کی دیکھا دیکھی رات ہی رات میں وہاں ایک مسجد کھڑی کر دی جو آج بھی موجود ہے۔ اقبال نے اس موقع پر مسلمانوں کے مذہبی جوش پر حسب ذیل طنز کی۔"

(نقوش طنز و مزاح نمبر ص ۵۷۷)

ان دونوں تحریروں سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ واقعہ لاہور کا ہے اجمیر کا نہیں۔

عبدالقوی دسنوی بھوپال

◎ سالنامہ نظر نواز ہوا۔ حقیقتاً آپ کے سالنامے نے شگوفے کھلائے ہیں جن کو دیکھ کر اور پڑھ کر بے اختیار ہنسی کھل جاتی ہے۔ خداوند تعالیٰ شگوفہ کو عمر دوام عطا فرمائے۔

سالنامے کی اوراق گردانی کرتے ہوئے جب آخر کے صفحات پر گلی نلگنڈوی کے انتقال کی خبر پڑھی تو بے حد رنج ہوا۔ ابھی ابھی ۱۰ر نومبر ۷۹ء کے کل ہند مزاحیہ مشاعرے زندہ دلانِ حیدرآباد میں انھوں نے اور میں نے بھی شرکت کی تھی۔ کیا خبر تھی کہ ہزاروں انسانوں کو ہنسانے والی شخصیت ہم سے جدا ہونے والی ہے۔ خداوند تعالیٰ سے دعاگو ہوں کہ وہ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

کرگس سہسوانی

◎ "یونہی" کے خالق مسیح انجم نے تلنگانہ کے متوسط گھرانوں کا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

فیض الرحمن

رائچور

شعیب کے کارٹون

(طنز، مزاح، مشاہدہ اور بے ساختگی کا امتزاج)

بشیر انور

کہا جاتا ہے کہ بگڑا ہوا آرٹسٹ کارٹونسٹ بن جاتا ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ بات کہاں تک صحیح ہے یہ شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے ہم کارٹونسٹ کو اس طرح بری کرسکتے ہیں کہ اگر آرٹسٹ بگڑ جائے تو ممکن ہے کہ وہ اپنے قلم اور برش کا صحیح استعمال بھول جائے لیکن وہ قوتِ مشاہدہ، حالاتِ حاضرہ کی نباضی، مزاح کی حس، طنز کے نشتر اور اپنے کارٹونوں کے لیے بے ساختہ عنوانات کی صلاحیت کہاں سے لائے گا جو ایک کارٹونسٹ کے لیے لازمی صلاحیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ آرٹسٹ بننا اور آرٹسٹ بن کر بگڑ جانا نسبتاً بہت سہل ہے لیکن ایک اچھا کارٹونسٹ بننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں آرٹسٹوں کی تو بہتات ہوتی ہے لیکن اچھے کارٹونسٹ کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ گنتی کے یہ چند کارٹونسٹ بھی انگریزی صحافت کی اجارہ داری بن ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اردو صحافت یا ہندوستان کی دیگر زبانوں کے اخبار کا مطالعہ کرنے والوں میں، مزاح کی حس مفقود ہے لیکن یہاں ایک انار اور سو بیمار والا معاملہ ہوتا ہے۔ انگریزی اخبارات کی کثرتِ اشاعت اور وسیع وسائل فنکاروں کے لیے کشش رکھتے ہیں۔

حیدرآباد کے قدیم اور مشہور انگریزی اخبار 'دکن کرانیکل'

نے ایسے ہی ایک جواں سال کارٹونسٹ شعیب کو متعارف کرایا ہے جس نے مختصر ہی عرصے میں نہ صرف ایک معیاری کارٹونسٹ کی حیثیت سے اپنا مستقل مقام بنالیا ہے بلکہ دکن کرانیکل کے پڑھنے والوں کا ایک بڑا حلقہ ہر صبح اخبار کے صفحۂ اول پر شعیب کے کارٹونوں کا بے چینی سے منتظر رہتا ہے۔ اس جواں سال کارٹونسٹ کی مقبولیت کا ثبوت وہ تعریفی خطوط ہیں جو ہر روز ہی اخبار کے دفتر میں موصول ہوتے رہتے ہیں۔ اسی مقبولیت کے پیشِ نظر حیدرآباد کے کلاڈینا میں مارچ کے دوسرے ہفتہ میں شعیب کے ۵۰ چنندہ کارٹونوں کی نمائش کا انعقاد عمل میں آیا جسے سینکڑوں قدر دانوں نے دیکھا اور شعیب کے فن کو سراہا۔

۲۷ سالہ سید شعیب ربانی کا تعلق حیدرآباد کے ایک ذی علم اور دانشور گھرانے سے ہے۔ علم، دانش اور فن شعیب کو ورثے میں ملے ہیں۔ گو شعیب نے زراعت میں گریجویشن کیا ہے لیکن جودتِ طبع، مزاح کی حس، سیاسی، سماجی اور معاشرتی پہلوؤں کے گہرے مشاہدات، حالات کی نباضی اور صحافت سے والہانہ لگاؤ نے اس کے ذہنی اُپج اور قلمکاری کو مہمیز لگائی اور وہ بجائے اس کے کہ محکمۂ زراعت میں کوئی افسر بن جاتا ایک کارٹونسٹ بن جانے کو ترجیح دی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے ممتاز ریڈر جناب غلام جیلانی ربانی کے اس پوسٹ گریجویٹ صاحبزادے نے ۱۹۷۴ء میں جب پہلی مرتبہ کسی کارٹون کے لیے اپنا قلم چلایا تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ اس کا پہلا ہی کارٹون مشہور رسالے شنکرہ ویکلی کے صفحات کی زینت بن جائے گا۔ شعیب کے فن کی ہمت افزائی کرنے والوں میں آندھرا پردیش کی زرعی یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی شامل ہیں جن کے دور میں شعیب نے یونیورسٹی میگزین کے ادارتی فرائض انجام دیئے تھے۔

ہندوستان کے حالیہ سیاسی واقعات، سیاست دانوں کی قلا بازیوں اور حکومتوں کی تبدیلیوں وغیرہ نے بھی شعیب کے کارٹونوں کے لیے کافی مواد مہیا کیا ہے جیسا کہ کسی نے ریمارک کیا تھا کہ گو شعیب ابھی غیر شادی شدہ ہیں مگر پتہ نہیں چلتا کہ وہ اپنے کارٹونوں کے لیے مواد کہاں سے فراہم کرتے ہیں؟ دراصل یہ شعیب کی گہری نظر اور مزاح کی فطری حس ہی ہے جو روزمرہ کے عام واقعات سے اپنے مطلب کا مواد حاصل کر لیتے ہیں اور نوکِ قلم سے پھلجھڑیاں سی بکھیر دیتے ہیں۔ کم مدت میں بہت اونچا مقام حاصل کرنے والے اس نوجوان کارٹونسٹ کے دو کارٹون اس سال برلن میں منعقد ہونے والی کارٹونوں کی عالمی نمائش "کارٹون ۸۰ء" کے لیے منتخب کئے گئے ہیں اس کے علاوہ اس کے بعض فن پارے مانٹریال کناڈا میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی نمائش میں پیش کئے جانے والے ہیں۔ اُردو صحافت میں شعیب کو متعارف کروانے میں ماہنامہ "شگوفہ" نے خاص توجہ کی ہے جس میں شعیب کے چیدہ چیدہ کارٹون چھپتے رہتے ہیں۔ اس طرح شگوفہ پڑھنے والے شعیب سے ناواقف نہیں ہیں۔

●●

[شعیب کے کارٹونوں کی نمائش کے موقع پر چند منتخب کارٹون اس شمارے میں پیش کئے جا رہے ہیں ۔ ادارہ]
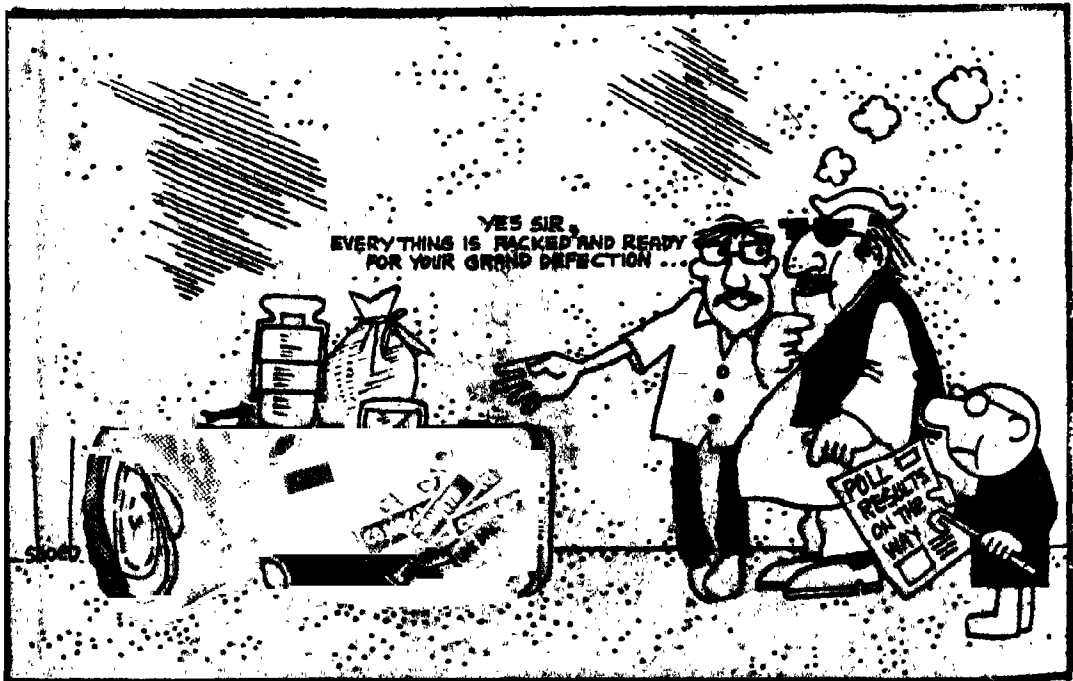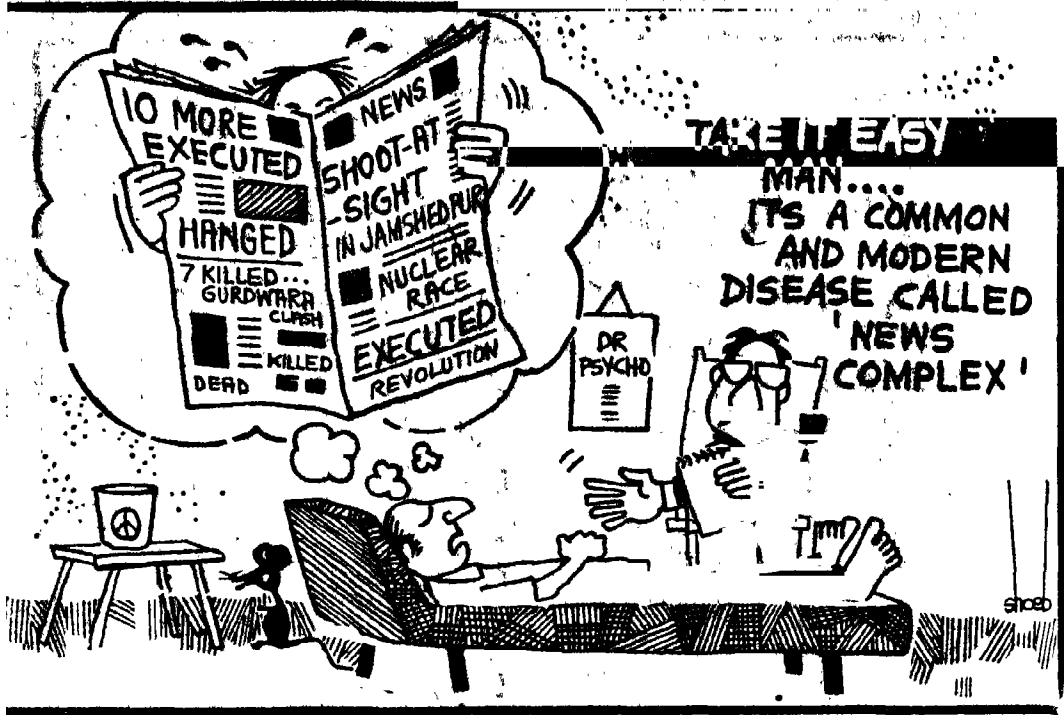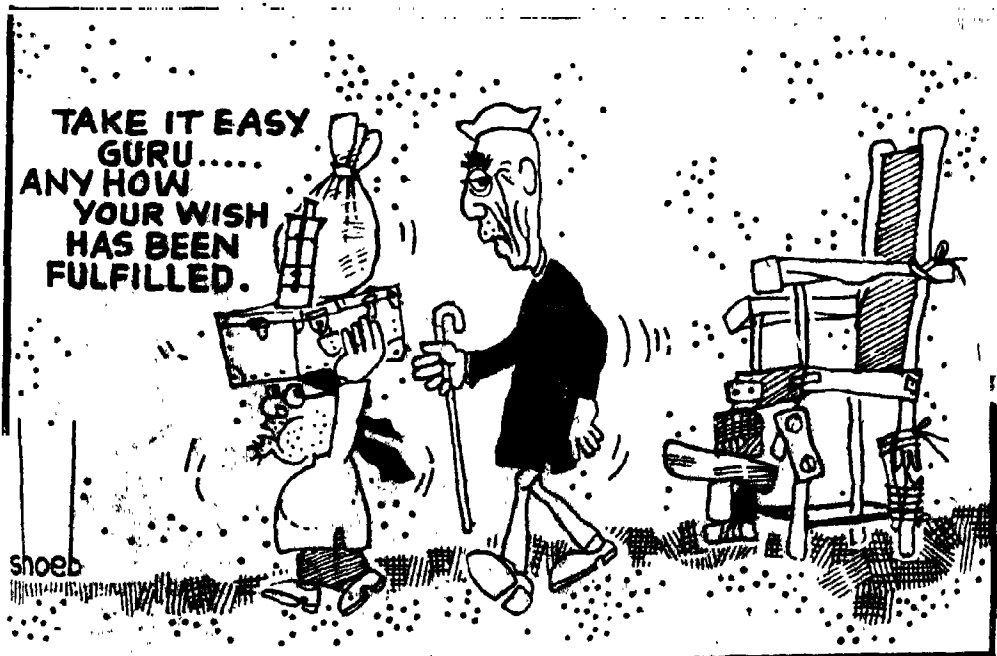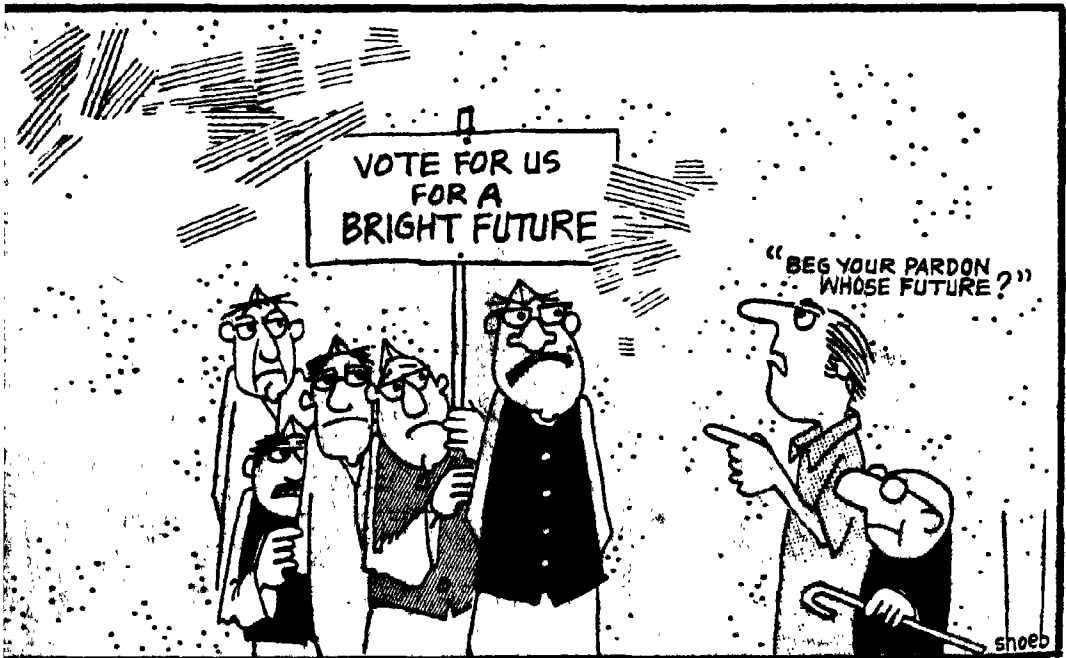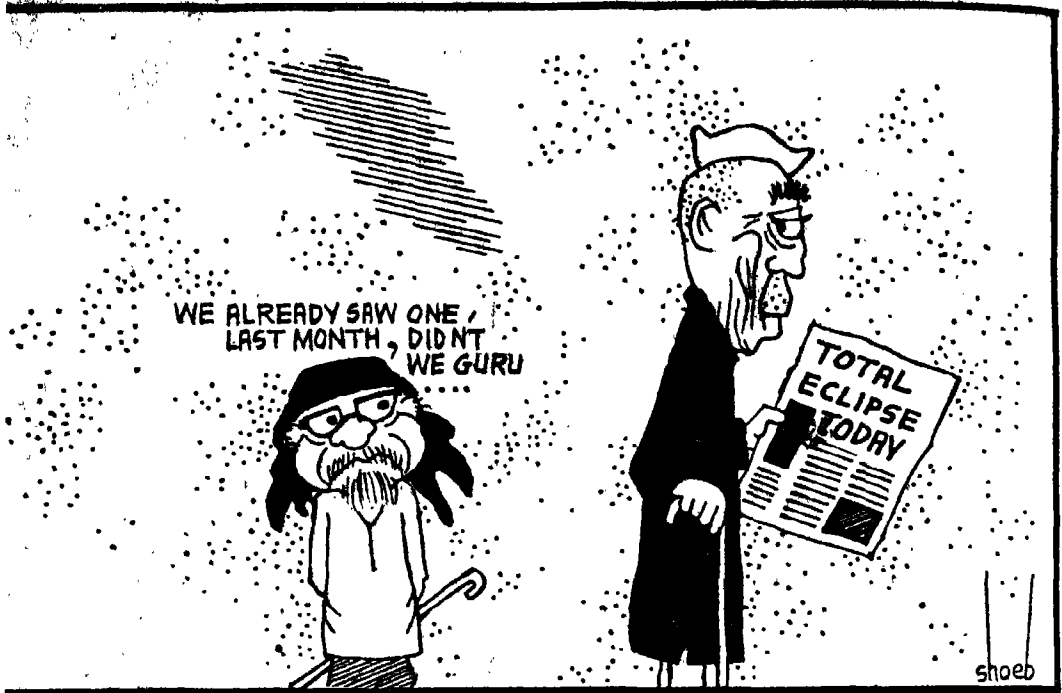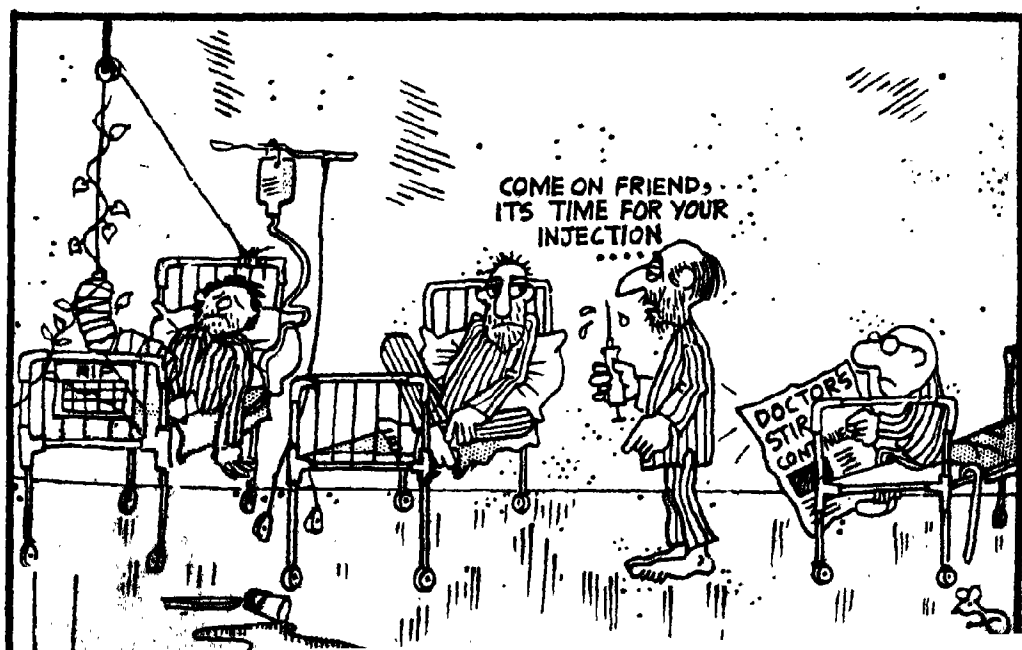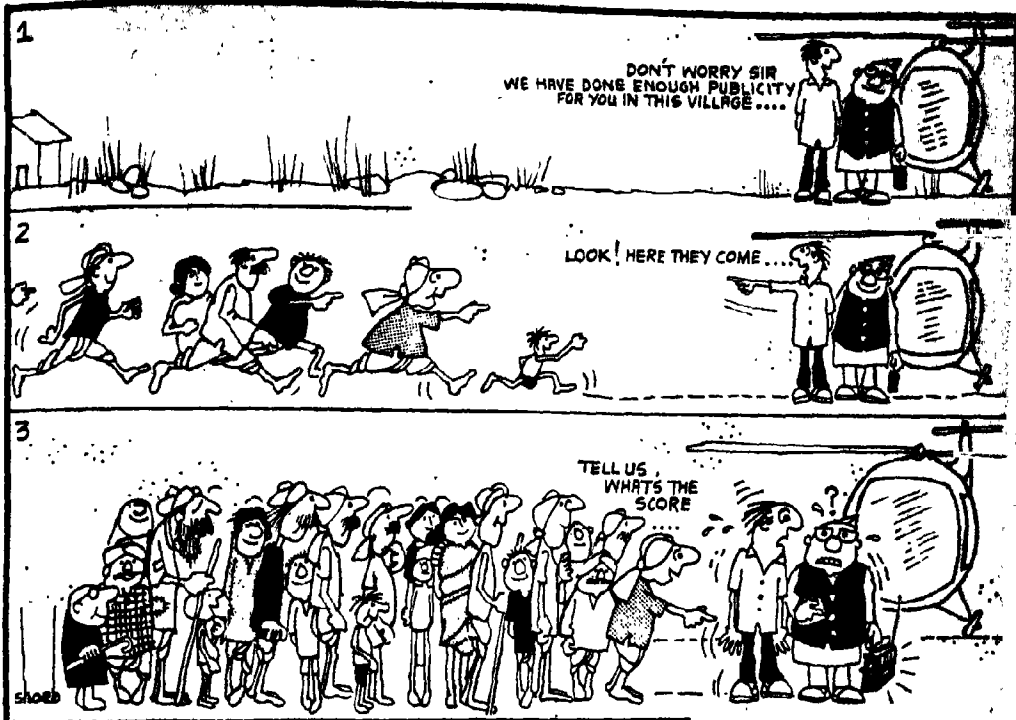
10 MORE EXECUTED
HANGED
7 KILLED... GURDWARA CLASH
KILLED
DEAD
NEWS
SHOOT-AT-SIGHT IN JAMSHEDPUR
NUCLEAR RACE
EXECUTED
REVOLUTION
DR PSYCHO
TAKE IT EASY MAN.... IT'S A COMMON AND MODERN DISEASE CALLED 'NEWS COMPLEX'
shoeb

YES SIR,
EVERYTHING IS PACKED AND READY FOR YOUR GRAND DEFECTION ...
POLL RESULTS ON THE WAY
shoeb

NO SIR, YOU ARE NOT COMING HERE FOR THE FIRST TIME, YOU WERE ELECTED FROM THIS SAME CONSTITUENCY LAST TIME ....

VOTE FOR

shoeb

TAKE IT EASY GURU..... ANY HOW YOUR WISH HAS BEEN FULFILLED.

shoeb

WE ALREADY SAW ONE, LAST MONTH, DIDN'T WE GURU

TOTAL ECLIPSE TODAY

shoeb

VOTE FOR US FOR A BRIGHT FUTURE

"BEG YOUR PARDON WHOSE FUTURE?"

shoeb

R. No. 15822/68

SHUGOOFA

Postal Regd. No. H. HD 6

Vol 13 Copy 3

31 Bachelors Quarters, M.J. Market Hyderabad-1.

March 1980 Phone: 57716

بھارت چند کھنہ
DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY
JAMIA NAGAR
NEW DELHI-110025

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

مجلسِ ادارت: منظور احمد ★ حمایت اللہ ★ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت: راجندر سنگھ بیدی، خواجہ عبدالغفور، نریندر لوتھر، بھارت چند کھنہ، مجتبیٰ حسین

ٹائٹل: طالب خوندمیری

مطبوعہ: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

بائنڈنگ: محمدیہ بک بائنڈنگ ورکس، رُوبرو دربارِ حسینی، پُرانی حویلی، حیدرآباد

ٹائٹل پرنٹنگ: اسٹینڈرڈ ڈاکومنٹ، شانتی نگر، حیدرآباد

منیجر: بشیر انور

جنرل منیجر: رشید عبدالسمیع جلیل

ترسیلِ زر اور خط و کتابت کا پتہ	شگوفہ ۳۱ / مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ ۔ فون: 57716

اس شمارہ کی قیمت: تین رُپے (RS. 3/=)

کتابت : محمود سلیم ٭ محمد غالب
سلام خوشنویس ۔ 'حناولا' روبرو زہرا ہاسپٹل، دارالشفاء۔ حیدرآباد ۲۴ ۵۰۰۰۰ (اے پی)

"جشنِ بھارت چند کھنّہ"

زیرِ اہتمام

زندہ دلانِ حیدرآباد ۱۱،۱۲ اپریل ۸۰ء بمقام نمائش میدان

مجلسِ استقبالیہ

صدر استقبالیہ: ایم۔ بالیا صدر نشین 'حدا'

نائب صدور استقبالیہ:

● منگل سنگھ سرنا ● ابراہیم خاں ● جگت رام آہوجہ

معتمد عمومی:

طالب خوندمیری

ارکان:

● ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ● بی۔ین۔ واگھرے آئی اے ایس
● ڈاکٹر رام پرشاد ● بلقیس علاء الدین
● عبدالمحمود ● غوث احمد خاں
● بی۔ بابو شنکر ● سریندر جی
● مدن لعل ● جی۔ ایم۔ جیلانی
● منوہر راج سکسینہ

کنوینر ساؤنیر: ـــــ محمد اعظم

کنوینر ادبی اجلاس: ـــ مسیح انجم

کنوینر شام لطیفہ: ـــ مرزا مصطفیٰ علی بیگ

کنوینر مشاعرہ: ـــــ سرپٹ حیدرآبادی

کنوینر بکنگ: ـــــ محمد حمایت اللہ

ارکان: ● محمد الطاف حسین ● جی۔ ایم۔ مرتضیٰ
● غلام محمد عثمانی

کنوینر انتظامی کمیٹی: ناظم مرزائی

ارکان: ● لیسین خاں ● یوسف شریف ● اطہر
● رام سندر پرشاد ● سجاد سلیم۔

کنوینر ڈائس: سعادت علی خاں

ارکان: ● سید علی ● سید یعقوب ● قمرالدین احمد خاں

کنوینر رابطہ کمیٹی: بوگس حیدرآبادی

ارکان ● ان پڑھ بھونگیری ● جیب علوی

کنوینر نشر و اشاعت: ولی تنویر

ارکان ● حفیظ خاں مذاق ● لئیق احمد

کنوینر طباعت: وہاب قیصر

رکن ● سید یحییٰ

کنوینر خواتین کمیٹی: طاہرہ نکہت

ارکان ● مس سروج ● بشیر جعفری

کنوینر بک اسٹال کمیٹی: مرزا نقی علی خاں بیگ

ارکان ● صابر ہاشمی ● حیات خاں

◎ زندہ دلانِ حیدرآباد ◎

صدر: بھارت چند کھنّہ آئی۔اے۔ایس (ریٹائرڈ)

نائب صدور:

● ہاشم علی اختر آئی اے ایس ● رشید قریشی ● محمد حمایت اللہ

معتمد عمومی: طالب خوندمیری

نائب معتمدین: مسیح انجم۔ بوگس حیدرآبادی

خازن: مرزا مصطفیٰ علی بیگ

ارکان:

● مصطفیٰ کمال ● ناظم مرزائی گرگٹیہ
● رشید سمیع جلیل ● قادر علی بیگ
● محمد سلیمان ● صبغتہ اللہ بمباٹ

جشن بھارت چند کھنہ

افتتاحی اجلاس

بھارت چند کھنہ فن اور شخصیت
۱۰۔ اپریل ــ ۶ بجے شام ــ نمائش گراؤنڈ
صدارت: جناب فکر تونسوی (دہلی)
مہمان خصوصی: منیر احمد شیخ (پاکستان)
افتتاح: شری بی رام دیو وزیر ایتھل ہسبنڈری
مقررین و مضمون نگار:
• ڈاکٹر زینت ساجدہ • ڈاکٹر راج بہادر گوڑ • ڈاکٹر رشید موسوی • رشید قریشی • مجتبیٰ حسین • پرویز یداللہ مہدی • مسیح انجم
معتمد عمومی: طالب خوندمیری

ادبی اجلاس

۱۱۔ اپریل ــ ۶ بجے شام ــ نمائش کلب

صدارت: منیر احمد شیخ (پاکستان)
مہمانِ خصوصی: نریندر ماتھر
مضمون نگار: • فکر تونسوی • بھارت چند کھنہ
• نریندر لوتھر • مجتبیٰ حسین • رشید قریشی
• ڈاکٹر حبیب ضیاء • پرویز یداللہ مہدی • برہان حسین
کنوینر: مسیح انجم

محفل لطیفہ

۱۲۔ اپریل ــ ۱۰ بجے دن ــ نمائش کلب
صدارت: جناب پی گنگا ریڈی
(وزیر سیول سپلائز)
مہمان خصوصی: خواجہ عبدالغفور، سکریٹری اُردو اکیڈمی مہاراشٹرا
لطیفہ گو:
★ منیر احمد شیخ (پاکستان) ★ نریندر لوتھر ★ فکر تونسوی
★ مجتبیٰ حسین ★ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ★ اظہر افسر ★ حمایت اللہ
★ رشید قریشی ★ احمد جلیس ★ شریف اسلم ★ ایس اے واسع
★ حفیظ خاں مذاق ★ شعیب ★ اسلم فرشوری ★ شاہدہ جلیل
★ خیرات ندیم ★ منظور احمد ★ دولت رام ★ منور علی
★ رائے موہن پرشاد ★ بوگس حیدرآبادی ★ طالب خوندمیری
کنوینر: مرزا مصطفیٰ علی بیگ

★ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ ★

۱۲۔ اپریل ــ ۸ بجے شب ــ نمائش گراؤنڈ
صدارت: جناب ایم باگا ریڈی
وزیر پنچایت راج
مہمان خصوصی: جناب ایم ایم ہاشم وزیر داخلہ
مہمان شعراء: نریندر لوتھر
ہلال سیوہاروی (دہلی) ★ شمس مینائی (لکھنؤ) مقرب حسین (بھوپال)
جوہر سیوانی (بہار) ناظم انصاری (ناگپور) خواہ مخواہ (بمبئی)
مشتاق پردیسی (لکھنؤ) عظمت بھلاواں (کرناٹک) ڈھکن (راچور)
پاگل عادل آبادی۔ بے دھڑک مدراسی۔ سراج نرملی
میزبان شعراء:
محمد حمایت اللہ۔ اسمٰعیل ظریف۔ گرگٹ حیدرآبادی۔
مصطفیٰ علی بیگ۔ طالب خوندمیری۔ قادر حیدرآبادی۔
اشرف خوندمیری۔ حفیظ خاں مذاق۔ گلیم سیدکی۔
رشید سمیع جلیل۔ محمود نشتر۔ ان پڑھ جھونگیری
صبغت اللہ بمباٹ۔ منور علی مختصر۔ بوگس حیدرآبادی
کنوینر مشاعرہ: سرپٹ حیدرآبادی

(اداریہ)

... پھر ملیں گے اگر خدا لایا

جناب بھارت چند کھنہ، زندہ دلان حیدرآباد کے روزِ اوّل ہی سے صدر ہیں۔ اس ادارہ کی تشکیل سے آج تک اس کے کارناموں اور سرگرمیوں کی نگرانی وہی کرتے رہے ہیں۔ اس ادارہ نے جو کچھ نام کمایا، اس میں بڑا حصہ کھنہ صاحب کا ہے۔ طنز و مزاح کے لیئے ان کی خدمات کے پیشِ نظر زندہ دلان حیدرآباد کی عاملہ نے طے کیا کہ 'جشن کھنہ' کا اہتمام ہو' چنانچہ ۱۰، ۱۱ اور ۱۲ اپریل کی تاریخیں طے ہوئیں۔ پاکستان سے بھی بعض ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن ڈاکٹر وزیر آغا کے مزاج کی ناسازی اور دوسری ناگزیر وجوہات کے باعث اس پروگرام پر عمل نہ ہوسکا۔ تاہم سہ روزہ تقاریب شاندار پیمانے پر منائی جارہی ہیں۔ اس خصوص میں حیدرآباد اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے صدرنشین جناب یم بالیا کی صدارت میں استقبالیہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ محترم بالیا صاحب گذشتہ سال زندہ دلان حیدرآباد کی تقاریب میں جس پُر مزاح اور پُر لطف انداز میں استقبالیہ پڑھا اور جس فراخدلی کے ساتھ زندہ دلوں کی مدد کرتے رہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ "جشن کھنہ" کے لیئے انھیں دوبارہ زحمت دی گئی اور موصوف ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ یہ تقاریب عظیم الشان اور کل ہند پیمانہ پر منعقد ہو رہی ہیں۔ ان تقاریب کے سلسلہ میں جناب ایم باگا ریڈی صاحب وزیر پنچایت راج اور صدر اردو اکیڈمی نے خصوصی دلچسپی لی اور ان تقاریب کی ہر طرح سے سرپرستی کی جس کے لیئے ہم باگا ریڈی صاحب کے ممنون ہیں ــــــ نامور مزاح نگار، جناب نریندر لوتھر، خواجہ عبدالغفور صاحب اور جناب مجتبیٰ حسین بھی ہمارے شکریہ کے خصوصی طور پر مستحق ہیں کہ ان حضرات نے دِلّی اور بمبئی میں بیٹھ کر بھی زندہ دلان حیدرآباد کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔

جشنِ کھنہ کے اس مبارک موقع پر 'شگوفہ' کا یہ سوونیر بڑی عجلت اور کم وقت میں شائع ہوا ہے تاہم ہمیں یقین ہے کہ یہ خصوصی شمارہ پسند کیا جائے گا۔ ▼▼

جناب ایم باگا ریڈی
عزت مآب وزیر پنچایت راج و صدر اردو اکیڈمی

جناب پی گنگا ریڈی
عزت مآب وزیر سیول سپلائز

جناب بی رام دیو
عزت مآب وزیر اینمل ہسبنڈری

جناب ایم بالیا صدر نشین استقبالیہ

بھارت چند کھنہ
صدر

جناب بھارت چند کھنہ

کہ ج ک ک ط طم
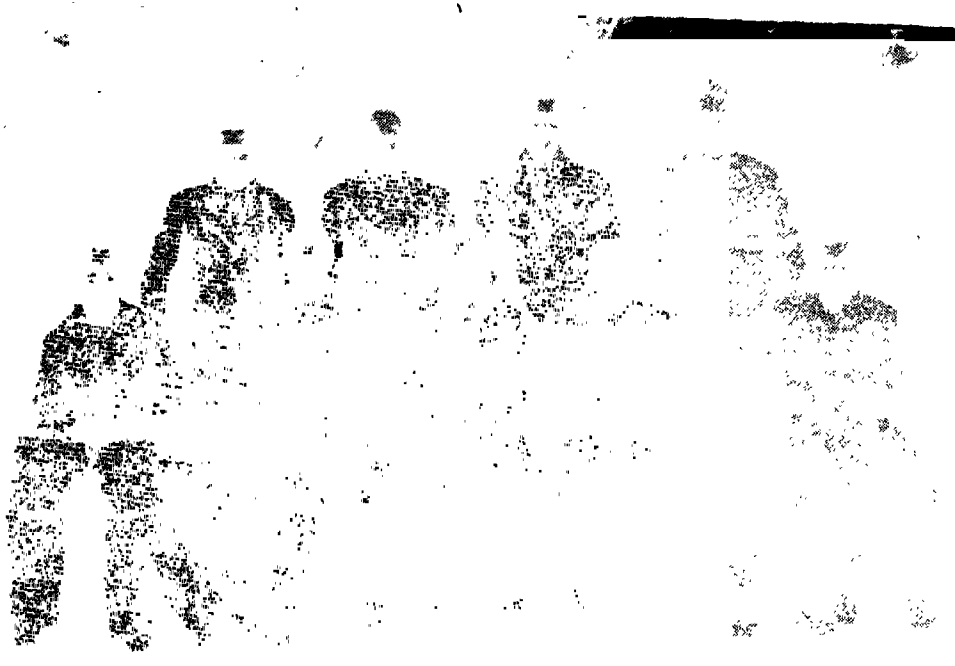
آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد اور آنجہانی بھیم سین سچر کے ساتھ

چیف منسٹر الیون و گورنر الیون کا کرکٹ مقابلہ
مسٹرین سنجیوا ریڈی بولنگ کر رہے ہیں۔ آنجہانی بھیم سین سچر اور امپائر بھارت چند کھنہ

مزاح نگاروں کی پہلی کل ہند کانفرنس۔ کرشن چندر (مائک پر) بھارت چند کھنہ
سلمیٰ صدیقی، مخدوم محی الدین، مجتبیٰ حسین، تخلص بھوپالی، یوسف ناظم وغیرہ

پہلا کُل ہند مزاحیہ مشاعرہ

صدر ہند ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم اور گورنر آندھرا پردیش کے ساتھ

نریندر لوتھر، یم پی مائی اور بن سندرسین کے ساتھ
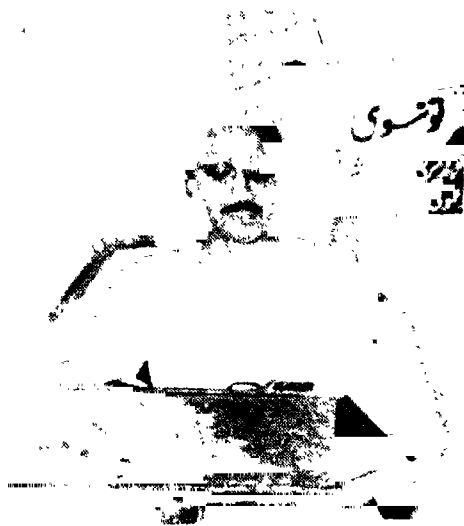
خواجہ عبدالغفور

نریندر لوتھر

پرویز یداللہ مہدی

مجتبیٰ حسین

مقرب حسین

ہلال سیوہاروی

خواہ مخواہ

ناظم انصاری
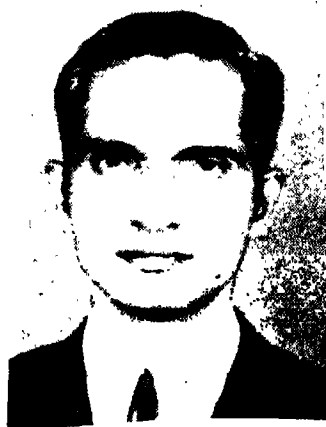
بھارت چند کھنّہ

خود نوشت ـــ سوانح

نام: بھارت چند کھنّہ (کھنّہ کو بھو کے "کھانا" خوش باش "کہنہ" اور خالص جنوبی خطّہ کے لوگ "کنّا" بولتے ہیں)

پیدائش: ۲۲ـ جون ۱۹۱۴ء

وطن: ہندوستان (تقسیم سے پہلے اور بعد)

سکونت: سکندر آباد ـ آندھرا پردیش میں (نہایت بے سکون)

تعلیم: (۱) ایم ـ اے (عثمانیہ) تاریخ

(۲) ٹرائی پوس (TRIPOS) کیمبرج

(الف) قانون اور
(ب) تاریخ } میں

(جو ملازمت حاصل کرنے میں بالکل بیکار ثابت ہوئی)

سروس: انڈین اڈمنسٹریشن سروس

(یہ البتہ کام کی چیز ہے ورنہ ہم سے آدمی کس کام کے)

پیشہ: فائلوں کی فیکٹریوں میں فیصلوں کو ایسے انوکھے فن اور فائن نوکِ قلم سے تحریر کرنا کہ فریادی کی فریاد فرد نہ ہو اور فائل فزی طریقہ پر رواں دواں اور کارروائی اور فیصلے کے درمیاں کے فاصلے برقرار رہیں ـ نیز یہ امر بطورِ خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ فیصلوں کی ذمہ داری اپنے عہدہ سے ایک درجہ نیچے یا ایک درجہ اونچے والوں کے سر پر رہے ـ اس فن کے کمال کا مظاہرہ تادمِ تحریر مندرجہ ذیل محکموں میں کرسکا ہوں :ـ

بحیثیت: (۱) سررشتہ دار محکمہ صدر ناظم مجالس

(۲) معتمد کمیٹی قیام امن

(۳) مددگار ناظم محکمۂ اطلاعات

(۴) انڈر سکریٹری محکمہ اصلاحات حکومتِ نظام (ایک قابلِ ذکر اصلاح جو یہ محکمہ کرسکا یہ تھی کہ حکومت نظام ختم ہوگئی)

(۵) مددگار معتمد پبلک سروس کمیشن

(۶) معتمد پبلک سروس کمیشن

(۷) نائب معتمد (سرویسز) محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن

(۸) " " (پولیٹیکل)

(۹) نائب معتمد (جنرل) محکمہ جنرل اڈمنسٹریشن
(۱۰) ٹرانسپورٹ کمشنر
(۱۱) زائد معتمد و چیف الیکٹورل آفیسر
(۱۲) لیبر کمشنر
(۱۳) معتمدِ گورنر آندھرا پردیش
(بہت سے خیر خواہ اکثر و بیشتر گفتگو میں یا مراسلت کے دوران ہمارا تنزل کرکے ہمیں پرسنل سکریٹری پرائیویٹ سکریٹری اور پرسنل اسسٹنٹ کی سطح پر لے آتے تھے۔ پھر بھی شکر ہے کہ ابھی تک پرسنل اٹنڈنٹ کے عہدہ سے ہم کو سرفراز نہیں کیا گیا)
(۱۴) سکریٹری ڈائرکٹر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش۔

زندگی: ازدواجی (جس میں ملک کے دستور کے تحت دی گئی سب آزادیاں صفر بن کر رہ گئی ہیں)

یافت: یافت ہرگز نہ بڑھے گو "بھتّے" بڑھے ہر سال
اس کا کارن یہ ہے پیارے ٹیکس بڑھیں ہر سال
اس لیئے پان بیڑی کے لیئے ایک دو روپے جیب میں ڈال دیئے جاتے ہیں تاکہ دماغی توازن برقرار رہے اور اس عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی فاترالعقل قرار دے کر وظیفہ پر جبراً علحٰدہ نہ کردیا جائے (تنخواہ لگان یا خراج کی طرح مہینہ کی پہلی تاریخ کو بیوی کے حوالے کردی جاتی ہے بیوی ہمارے اس فعل کو بھی ایک غیر ذمہ دارانہ حرکت قرار دیتی ہیں کیونکہ تنخواہ اس طرح دے دینے کے بعد گرانی کے مسائل سے نپٹنے کے ہم خود بری الذمہ کرلیتے ہیں۔

اولاد: دو لڑکیاں
پہلی یعنی بڑی، چھوٹی سی عمر میں خود دو "چاند کی ٹکڑیوں" کی ماں بن چکی ہے اور اپنے ماں باپ کو نانی نانا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بزرگی کے رتبہ پر پہنچا دیئے جانے پر ہم اور خصوصاً اوّل الذکر بڑی شرم محسوس کرتے ہیں
دوسری یعنی چھوٹی، کرکٹ کی اصطلاح میں بالکل "فلوک" سے عالمِ وجود میں آئی لیکن اس اوپر والے کی عنایت سے خاندان کی پہلی ڈاکٹر بن گئی ہے اور نہ صرف صحت قائم رکھنے بلکہ.. والدین کو اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کے متعلق بھی صحیح مشورے دیتی ہے۔
اولادِ نرینہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ پیشوایانِ مذاہب کا خیال ہے کہ اس کمی کی وجہ سے جنّت کے دروازے ہمارے لیئے ہمیشہ بند رہیں گے۔ لیکن اولادِ نرینہ کے چکّر میں پڑ کر اور آدھ درجن بچوں کے باپ بن کر ہم اپنی موجودہ زندگی کو دوزخ میں تبدیل کردینے کے لیئے تیار نہیں درحقیقت ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ لڑکوں سے لڑکیاں بھلی کہ لڑکے ہمیشہ اپنے ماں باپ کا ہاتھ اپنی پتلون کی طرح تنگ اور ان کی پریشانیوں کو اپنے بالوں کی طرح دراز کیئے رکھتے ہیں۔ باقی رہے پیشوایانِ مذاہب تو ان کو میرا جواب یہ ہے کہ
"ہم نہیں شیخ جی ان باتوں میں آنے والے"

مشغلے: (ا) کرکٹ
[پنجاب (تقسیم سے پہلے) اور عثمانیہ کی کرکٹ ٹیموں کی نمائندگی۔ کیمبرج "بلو" ریاست کی ٹیم کی نمائندگی اور کپتانی۔ بہرحال نمائندہ ٹیموں کے لیئے انتخاب نہ کیئے جانے کی نوبت آنے سے پہلے ہی فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنا ترک کیا۔ اب کرکٹ کامنٹری کرنے کی کوشش کرتے ہیں]
(ب) کتّے سے والہانہ محبت

(ج) متعدد ٹیکسوں کی ادائی قبل از وقت کر کے رسائد کھو دینا اور بعض اوقات دوبارہ ٹیکس ادا کرنا۔
(د) سرکاری طور پر دورہ کرنے کے ضمن میں آل انڈیا ریڈیو یا کسی رسالے کے بے وقوف مدیر سے مضمون لکھنے کے لئے جو معاوضے یا رقوم ملیں ان میں سے کچھ بیوی کے تصرف سے بچانے کی ناکام کوشش۔
(ہ) کچھ سنی دیکھی کو لکھنا نثر میں۔
(و) گھوڑ دوڑ کے میدان پر کامل طور پر اور سر سرتا پا چغد ہونے کا ثبوت دینا۔ اس کے باوجود چھٹتی نہیں یہ لت کہ ہے ایسی پڑی ہوئی

سب سے بڑی خوشی:

(۱) اگر نل کھولوں تو اس میں سے موت کی ہچکیوں کی سی آوازوں کی بجائے پانی نکلے۔
(۲) اگر بجلی کا سوئچ آن کروں تو کرنٹ کی سپلائی کو اسی یقین کے ساتھ حاصل کروں جس طرح آجکل کے امتحانوں میں پرچے حل کرنے کے لیے طلباء "فارن ایڈ" حاصل کرتے ہیں۔
(۳) ریل یا ہوائی جہاز میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ان اداروں کے بکنگ کلرکوں سے اگر یہ جواب ملے کہ سیٹ مل سکتی ہے۔
(۴) اگر کسی کو لینے یا چھوڑنے کے لئے ریلوے اسٹیشن یا ایروڈروم (بشرطیکہ موخر الذکر عجیب و غریب ادارے کے ملازمین اسٹرائیک پر نہ ہوں) جائیں تو ریل گاڑی یا ہوائی جہاز وقتِ مقررہ پر آئے یا جائے۔
(۵) اگر سینما میں فلم ختم ہونے پر اور قومی ترانہ بجنے کے دوران سینما بین مخلوق احترام کے ثبوت میں خاموشی سے بغیر ہلے جلے کھڑی رہے۔
(۶) اگر موٹر کا ہارن سن کر سڑک کے بیچوں بیچ چہل قدمی کرنے والے منچلے راستہ میں سے ہٹ جائیں
(۷) اگر دھوبن ہمارے کپڑوں سے پتھر توڑنے کی کوشش میں کپڑے پھاڑ کر یا قمیضوں وغیرہ کے بٹن توڑ کر نہ لائے۔
(۸) جب ڈاک خانے سے لفافے خرید وں تو بند کرنے کے لئے ان پر گوند لگی ہوئی ہو، یا پھر استعمال سے پہلے ہی اس طرح چپکے ہوئے نہ ہوں جس طرح الیکشن کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لیئے نیتا سے غرض مند۔

سب سے بڑا اشتعال

(۱) اگر کوئی شخص نل کے پانی کا استعمال کرنے کے بعد نل بند کرنا بھول جائے یا اس طرح بند کرے کہ پورا پانی بند نہ ہو اور یا پھر نل بند کرتے ہوئے اپنی حیوانی قوت کا اس شدت سے مظاہرہ کرے کہ نل بند کرنے کی ٹوٹی کے THREADS تباہ ہو جائیں۔
(۲) اگر دعوت میں کوئی شخص اپنے آلودہ ہاتھوں سے DISH کا چمچہ پکڑ کر چمچے کا ہینڈل گندہ کردے (یہ شاید اس مقصد سے کیا جاتا ہے کہ دوسرے اس ڈش کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔)
(۳) اگر چھری کانٹے سے کھانے کی کوشش میں کوئی شخص کانٹا اس طرح پکڑے جس طرح تھرما میٹر پکڑتے ہیں اور چھری اس طرح جس طرح قتل کا ارتکاب کرتے وقت قاتل چھرا پکڑتا ہے۔
(۴) اگر کوئی مہمان حلوہ یا ایسی ہی کوئی چیز ہاتھ سے کھاتے ہوئے اپنے آلودہ ہاتھوں کو ہمارے صوفہ کے کپڑے سے پونچھنے لگے۔
(۵) اگر کوئی شخص فلش استعمال کرنے کے بعد زنجیر کھینچ کر یا ہینڈل دبا کر پانی چھوڑنے اور اس گندہ

صاف کرنے کا کام آئندہ استعمال کرنے والے کے لئے چھوڑ دے۔

(۶) جب کوئی معزز مہمان آدھ پاؤ تیل سر میں ڈال کر تشریف لاتے ہیں، اپنے سر کو ہمارے گھر کی دیواروں سے رگڑتے ہیں اور جب ایسا کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں تو صوفہ پر دراز ہوجاتے ہیں تاکہ اپنی یادوں کے نشان مستقل طور پر چھوڑ جائیں۔

(۷) جب کوئی احمق معزز مہمان ہماری موٹر سے اترنے کے بعد ہندوستانی ساخت کے موٹر کے دروازے کو بند کرنے کے لیئے ایسی وحشیانہ قوت سے دے مارتا ہے کہ نہ صرف موٹر کے مالک بلکہ اس کے دروازے کا تمام اندرونی سسٹم درہم برہم ہوجاتا ہے اور موٹر کے دروازے کو مزید استعمال کرنے کے لیئے بیس پچیس روپے کے اخراجات کا بار الگ اٹھانا پڑتا ہے۔

ہماری سب سے بڑی شیخی

ہندوستان کی وہ واحد شخصیت ہونا جس کو کیمبرج کرکٹ "بلو" ہونے کے ساتھ ساتھ انڈین۔۔۔ اڈمنسٹریشن سروس کا رکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ہماری شہرت:

"کیا ہوا لوگ اگر ہم کو گدھا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں"

موجودہ صورت حال:

(صورت اور حال کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے) صورت کافی بدل چکی ہے اور ان لوگوں کے لیئے باعثِ سہولت بن گئی ہے جو دیکھ کر ملاقات کرنے سے کتراتے ہوئے منہ موڑ کر اور انجان بن کر پاس سے گذر جانا چاہتے ہیں میرے لیئے یہ بھی باعثِ طمانیت ہے کہ میں ایسے بے ہودہ اور بھر سوالات کا جواب دینے سے صاف بچ جاتا ہوں کہ آج کل کیا مصروفیت ہے یا خوب چین کی زندگی بسر ہورہی ہوگی۔ اب تو فرصت ہی فرصت ہے نا۔

باقی رہا حال

اس کی کیفیت یہ ہے کہ رفتہ رفتہ آٹے دال اور پٹرول کا بھاؤ معلوم ہوجانے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوگیا ہے کہ بجلی، پانی، گھر کا ٹیکس ریڈیو لائسنس اور موٹر ٹیکس کہاں دیئے جاتے ہیں۔ دھوبی کا گھر کہاں واقع ہے۔ کتے کو علاج کے لئے کہاں لے جانا چاہیئے۔ موٹر کے نقلی پرزے خریدنے سے بچنے کے لیئے کن دوکانوں پر ہرگز نہیں جانا چاہیئے اور یہ بھی کہ کسی ڈاکٹر کا اجازت نامہ حاصل کئے بغیر کسی ہسپتال کے اندر داخل ہونا ناممکن ہے۔

○

مضامین صاف، خوش خط اور صفحے کی ایک ہی جانب لکھئے۔ ناقابلِ اشاعت تخلیقات واپس نہیں کی جائیں گی

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ مرحوم

کھلنڈرے ادیب

بھارت چند کھنّہ صاحب کی کتاب ٹھنڈی بجلیاں کا پیش لفظ

بھارت چند کھنّہ اردو کے ایک
کھلنڈرے ادیب ہیں۔ میں ان کو عرصہ سے
کرکٹ کے ایک عمدہ کھلاڑی کی حیثیت سے جانتا تھا
کبھی کبھی ان کے مزاحیہ مضمون اور افسانے بھی ریڈیو پر سننے اور
رسالوں میں دیکھنے کا موقع ملتا تھا اور اس بات سے بڑی خوشی ہوتی تھی
کہ جامعہ عثمانیہ کا ایک سپوت اس رنگ میں بھی نمایاں ہے۔

کھنّہ کی طبیعت اور مضمون دونوں گنگا جمنی خصوصیات کے حامل ہیں۔ ان میں پنجابی ادیبوں
جیسی زندہ دلی اور جرأتِ رندانہ بھی ملتی ہے اور حیدرآبادیوں کی طرح شرمیلا پن اور ثقافتی رچاؤ بھی
نظر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے زمانے میں پنجاب سے حیدرآباد آئے جبکہ یہ عروس البلاد مشرقی تہذیب اور کلچر کے
عروجِ کمال پر پہنچ گیا تھا اور اس وقت ان کی عمر ایسی تھی جب کہ ذہن اور وجدان اثر پذیری کی اعلیٰ ترین اہلیت
سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بھارت چند کھنّہ کا مزاج پنجاب اور دکن کی نمائندہ خصوصیتوں کا ایک مجموعہ بن گیا ہے اور
ان ہی کے امتزاج سے وہ مخصوص ادیب پیدا ہوا ہے جس کو بھارت چند کھنّہ کہا جاتا ہے اور اسی
کا نتیجہ ہے کہ وہ آج اردو دنیا میں اتنا زیادہ روشناس نہ ہو سکا جتنا کہ اس پایہ کے
کسی ادیب کو معروف اور مشہور ہونا چاہیئے تھا۔

یوں بھی حیدرآباد کی سرزمین صدیوں سے اربابِ کمال کے لئے ایک
کانِ نمک ثابت ہوتی رہی ہے جس میں بڑے بڑے ادیب
اور شاعر بھی آخر کار نمک ہی بن کر رہ گئے۔ ان کی

انفرادیت اور عظمت و شہرت اس ماحول میں ایسی ملیا میٹ ہوگئی کہ پھر ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہ سکا۔ اور تاریخ ادب اُردو ان کے ذکر سے مزین نہ ہوسکی۔

شیخ حفیظ، شاہ نصیر، حافظ تاج الدین مشتاق، میر شمس الدین فیض، گردھاری پرشاد باقی، میر امداد علی علوی، سورج بھان میکش تھانوی، احمد حسین مائل، ستیل پرشاد خرم، بچولال تمکین، رضی الدین حسن کیفی، علی حیدر نظم طباطبائی، جمال الدین نوری، مُلا عبدالقیوم، ظہیر دہلوی، عظمت اللہ خاں، عبداللہ عمادی، صفی اورنگ آبادی اور احمد حسین امجد اور ایسے بیسیوں صاحبانِ فضل وکمال اسی سلسلۃ الذہب کی کڑی تھے جو سونا ہونے کے باوجود مٹی بن گئے۔ اگر یہی مشاہیرِ ادب حیدرآباد سے باہر اور خاص کر یوپی یا پنجاب میں قیام پذیر ہوتے تو ہیرا بن کر چمکتے۔

بھارت چند کھنہ کی جی بی اس کو بھی اسی شہر کی روایاتی فضا نے صحیح معنوں میں چمکنے سے محروم رکھا اور پھر ملازمت کی دفتریت اور عہدہ دارانہ حیثیت نے تو ان کی ادیبانہ شخصیت کو اور بھی دبا دیا۔ ان کی طبیعت کے جوہر اور نمایاں ہوتے اگر وہ اتنے بڑے عہدہ دار نہ ہوتے۔

افسوس ہے کہ اُردو ایک اور کرشن چندر سے اب تک محروم رہی۔ مجھے ان کی تحریروں میں کرشن چندر کے سے تیور نظر آتے ہیں۔ زندگی کے سیاہ وسفید اور رنگا رنگ پہلوؤں اور انسانی فطرت کی اتھاہ گہرائیوں تک وہ اسی طرح پہنچتے نظر آتے ہیں جس طرح کہ کرشن چندر پہنچ پائے ہیں۔ مگر میں اس جوہرِ قابل سے مایوس نہیں ہوسکا ہوں آخر عظمت اللہ خاں نے دورانِ ملازمت ہی میں اردو ادب کو اپنی نظم و نثر کے وہ جواہر پارے عطا کئے تھے جو آج بھی اپنی جدّت وجودت کے باعث قابلِ قدر دکھائی دیتے ہیں اور پھر کھنہ کے آگے تو ابھی طویل وعریض میدان موجود ہے جو روز بروز اور وسیع ہوتا جا رہا ہے۔

اس امر کا بھی مجھے یقین ہے کہ وہ طوقِ ملازمت گلے سے اتارنے کے بعد ادب کے میدان میں اسی طرح اُبھریں گے جس طرح کرکٹ کے میدان میں اُبھر چکے ہیں۔ کرکٹ کے میدان میں وہ اب پھر سے نہیں چمک سکتے لیکن وہ ایک فطری کھلاڑی ہیں اور کھیل ان سے چونکہ چھوٹ نہیں سکے گا۔ اس لیئے یہ کھیل اب ان کو میدانِ ادب میں کھیلنا ہوگا ان کے کرکٹ کے قدر داں یکے بعد دیگرے ختم ہوتے جائیں گے لیکن ان کے افسانوں اور مزاحیہ مضمونوں کے شیدائیوں میں روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا، بشرطیکہ وہ اسی لگن اور شوق کے ساتھ اس میدان میں اُتر پڑیں جیسا کہ کرکٹ فیلڈ میں اُترتے تھے۔ (سری نگر یکم اکتوبر ۱۹۶۱ء)

کرشن چندر

بھارت چند کھنہ

بھارت چند کھنہ کہنے کو تو پنجابی ہیں لیکن نازک مزاجی میں لکھنو والوں کو شرماتے ہیں۔ احساسِ ظرافت یوں پاک و صاف رکھتے ہیں کہ رکاکت و کثافت دونوں کوسوں دور رہتے ہیں۔ مبتذلیات سے پرہیز کرتے ہیں، چاہے وہ بیوی کا ذکر ہو یا محبوب کا۔ حالانکہ اس قسم کی ظرافت کا مبتذل ہو جانا بہت آسان ہے اور مقبول بھی۔ مگر بھارت چند کھنہ نے اِن دونوں کا ذکر کرتے ہوئے اس سے گریز کیا ہے اور طنز و ظرافت کا اعلیٰ معیار پیش کیا ہے۔

زندگی میں بھارت چند کھنہ کم گو اور کم آمیز ہیں۔ اس لیئے سوچا تھا کہ تحریر میں "بسیار گو" ثابت ہوں گے، کہ بالعموم قاعدہ یہی ہے کہ زندگی کے ایک باب میں کمی دوسرے باب میں زیادتی کا باعث بن جاتی ہے۔ مگر یہاں بھی بھارت جی نے انتہائی ضبط کا ثبوت دیا۔ اکثر ظرافت نگار اس قدر بسیار نویس اور باتونی ہوتے ہیں کہ ان کی تحریر کے دو تین صفحے پڑھنے کے بعد ہی کوئی ایک نادر اور شگفتہ جملہ گوہر مراد یا نامراد کی صورت میں ہاتھ آتا ہے مگر بھارت چند کھنہ اپنی تحریر کو حشو و زوائد سے پاک رکھتے ہیں۔ مضمون مختصر ہوتا ہے اور غیر متعلق نہیں ہونے پاتا۔ لب و لہجہ تازہ اور شگفتہ، اندازِ تحریر اچھوتا اور شاداب، چوٹ گہری اور کاری ..... ظرافت کی روانی میں ان کی طبیعت کی طنزیہ جولانی اپنا خاص رنگ دکھا جاتی ہے۔

اردو طنز نگاری کے باب میں بھارت چند کھنہ اپنا ایک خاص وقار اور مقام رکھتے ہیں جو بہت سے طنز نگاروں کے لیئے باعثِ رشک ہے۔ انھوں نے

~~اپنے طنزیہ اسلوب سے اس مجموعے کے~~ بہت سے مضامین میں موجودہ زندگی کے بہت سے مسائل کو سمیٹ لیا ہے اور موجودہ سماج کے بہت سے جرائم کی نقاب کشائی کی ہے ۔ جیسے گرانی ۔ بے کاری ، مکانوں کی قلت ، سامان خورد ونوش میں ملاوٹ ان کے علاوہ طبع انسانی کے مختلف اور مضحک حرکات کی بوقلمونی کو بھی اپنی ظرافت کے پھندے میں پھنسا کر نمایاں کیا ہے ۔ جیسے بیویوں کی ترش روی ، ہمسایوں کی بدگوئی ، شاعروں کی دلجوئی ۔۔۔ مگر بیان مختصر فقرے بچے تلے ، اور انداز تحریر دلچسپ اور دلنشیں ۔۔۔۔

مگر کہیں کہیں ان کی طنز نگاری میں اذیت ناکی اور اذیت کوشی کے دردناک عنصر بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں ۔ جب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس جملے پر ہنسا جائے یا رویا جائے ۔ جب صورت حال کے مضحک پہلو اور دردناک پہلو دونوں یوں یکجا ہو جاتے ہیں کہ ابتدا اور انجام مسرت اور مایوسی ، خوشی اور خواری ایک ہی سکے کے دو چہرے اور وہ بھی ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر انسانی احساس کو یوں چھوتے ہیں کہ اگر آنکھ نم ہے تو ہونٹوں پر مسرت ہے ۔ چہرہ خوشی سے کھلا جاتا ہے تو دل پر کچو کے سے لگتے ہیں ۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ظرافت نگاروں کے ہاں یہ انداز ۔۔۔ کمیاب ہے ۔ اور اس کی کامیاب ترین مثالوں میں صرف چارلی چپلن کی مزاحیہ فلمیں ہی پیش کی جا سکتی ہیں ۔۔۔ بھارت چند کھنہ نے اس عجیب و غریب ظرافت کو اپنے شستہ جوہر سے بکمال خوبی و رعنائی اس مجموعے میں پیش کیا ہے جس کے لیے انھیں جتنی بھی داد دی جائے کم ہے ۔

مجھے یقین ہے کہ اس برصغیر میں اردو اور اعلیٰ ظرافت کے چاہنے والے ان کے مجموعے کا دلی خیر مقدم کریں گے ۔ (مقدمہ : "تیر نیم کش")

ناظم انصاری

ہم آتے صبح و شام صنم تیرے شہر میں — ہوتا جو کوئی ایرڈ ڈرم تیرے شہر میں
ہے کتنا خوش نصیب وہ دیوانہ جانِ من — ہو جائے جس کا کریا کرم تیرے شہر میں
پیدا ہوا ہے کون یہ چینگیزیت لیے — ہر سمت جو مچی ہے اودھم تیرے شہر میں
کرنا پڑے گا مرغِ مسلّم کا اہتمام — آئے ہوئے ہیں شیخ حرم تیرے شہر میں
شامِ اودھ میں ہے نہ بنارس کی صبح میں — بیوٹی ہے جو خدا کی قسم تیرے شہر میں

ناظم کا کیا شمار ہے لے جانِ آرزو
بھرتے ہیں اچھے اچھے چلم تیرے شہر میں

اسمٰعیل ظریف

کمپنی کا مال لاکر رنگ جما لیتے ہیں لوگ — محفلوں میں یوں بھی اکثر داد پا لیتے ہیں لوگ
غافلوں کو گھیر کر الّو بنانے کے لیے — اپنے چہروں پہ نئے چہرے سجا لیتے ہیں لوگ
دوسروں کے جانور کو جان کر اپنی غذا — مرغ کیا ہے اب تو بکرے بھی پچا لیتے ہیں لوگ
بیویوں پر بس کسی کا بھی وہاں چلتا نہیں — اپنے سالوں کو جہاں گھر میں بسا لیتے ہیں لوگ
ہوتی ہے نغمہ سرائی مچھروں کی رات بھر — نیند میں بلبل ترنگ اکثر بجا لیتے ہیں لوگ
اتنے عرصہ میں تو ہم چھپر چھوا سکتے نہیں — کس طرح دو سال میں بلڈنگ بنا لیتے ہیں لوگ
اب کسی کی بھی قسم کا کس طرح ہو اعتبار — جھوٹی قسمیں اب عدالت میں بھی کھا لیتے ہیں لوگ
مارنا ہے ہاتھ تو تگڑی رقم پر ماریے — یوں بچانے کو تو چندے بھی بچا لیتے ہیں لوگ
دینے والا دے رہا ہے جن کو چھپر پھاڑ کر — توڑ کر چھپر نئے بنگلے بنا لیتے ہیں لوگ
یہ جنونِ شاعری ہے یا کہ حمامی ادب — اب غزل حمام میں بھی گنگنا لیتے ہیں لوگ
بن کے جب تیار ہو جاتی ہے کالونی کوئی — اپنے لوگوں کو وہاں لاکر بسا لیتے ہیں لوگ
یہ کہاوت ہے پرانی ڈھول لے کر بیٹھنا — ڈھول کیا ہے اب تو تاشا بھی بجا لیتے ہیں لوگ
بس سمجھ لیجے تباہی آنے والی ہے وہاں — چائے خانے میں جہاں محفل سجا لیتے ہیں لوگ
پھانس کر غافل پرندوں کو سنہرے جال میں — اپنا گلشن کس سلیقے سے سجا لیتے ہیں لوگ

گھر میں ہو کر بھی نہیں ہوتے ہیں وہ اکثر ظریف
قرضِ حسنہ کس سلیقے سے بچا لیتے ہیں لوگ

- جو بھی کرتے، اجی، ٹیچنگ سے تو اچھا کرتے
اور اوپر سے کماتے کوئی دھندا کرتے
- اس سے بہتر تھا کہ ہم تیل ہی بیچا کرتے
ان کا لٹکا ہوا چہرا تو نہ دیکھا کرتے
- کیا ضروری تھا کہ محبوب کا غم دل میں لئے
ہم انگیٹھی کی طرح ہجر میں سلگا کرتے
- ہم اگر کالی گھٹا ہوتے تو جاتے نہ کہیں
جم کے بس آپ کے آنگن ہی میں برسا کرتے
- شاعری چھوڑ دی کچھ سوچ سمجھ کر ہم نے
شاعری ہی میں لگے رہتے تو فاقا کرتے
- آپ بدنام ہوئے اپنی حماقت کے طفیل
ورنہ کیوں بزم سے لوگ آپ کو چلتا کرتے
- آپ ہم سے ہی غزل لے کے پڑھا کرتے تھے
"کیسے ممکن تھا کہ ہم آپ کو رسوا کرتے"
- آپ کا شعر کوئی وزن سے کیسے گرتا
شعر کو فن کی ترازو میں جو تولا کرتے
- آپ تو اپنی لنگوٹی لیئے بھاگے خود ہی
کیا ضرورت تھی کہ ہم آپ کا پیچھا کرتے
- آپ تو رنگ بدلتے رہے گرگٹ کی طرح
آپ کے وعدے پہ کیا لوگ بھروسا کرتے
- دل میں جب تھا ہی نہیں بغض وحسد مکر و فریب
ہم ترے جھوٹ کا کس چیز سے سودا کرتے

کیسے ممکن تھا کہ ہم آپ کو
رسوا کرتے

(دو غزلہ) جوہر سیوانی

ہم بھی سلے کاش ذرا دیش کی سیوا کرتے
یعنی کرتے ہیں جو لیڈر، وہی دھندا کرتے
منتری ہوتے تو ہم، کار میں گھوما کرتے
رات دن عیش کے جھولے ہی میں جھولا کرتے
قوم کے غم میں ڈنر ٹوٹ کے کھایا کرتے
اور یوں قوم کی خدمات کا دعوا کرتے
رُت الیکشن کی جب آتی تو مگرمچھ کی طرح
قوم کے حال پہ ہم اشک بہایا کرتے
ووٹ لینے کے لیئے پاؤں پکڑتے سب کے
جو نہ ہوتا کبھی پورا وہی وعدا کرتے
جیت جاتے جو الیکشن تو وزارت کے لیئے
اپنی خود داری کردار کا سودا کرتے
کبھی اس ڈال پہ ہوتے کبھی اس پات پہ ہم
دل بدلنے کا شب و روز ڈراما کرتے
چھوٹا موٹا بھی قلم دان اگر مل جاتا
بیٹھ کر چین کی بنسی تو بجایا کرتے
لوگ بھوکے تھے ضرورت تھی انہیں راشن کی
سن کے نیتاؤں کا بھاشن وہ بھلا کیا کرتے
لاٹری ملتی تو ہم کھول کے اک چینی مل
اپنی جنتا کا لہو جونک سا چوسا کرتے
ان کے جسموں پہ بلا سے نہ لنگوٹی رہتی
بینک بیلنس تو ہم اپنا بڑھایا کرتے
اور کچھ دن جو ڈِسائی کی حکومت رہتی
لوگ قارورہ کو امرت ہی تو سمجھا کرتے
محفلِ شعر میں لوگوں کو ہنسانے کی ادا
کاش ہم جوہرِ سیوان سے سیکھا کرتے

پرویز یداللہ مہدی

ے پوچھا تھا ــــ! "یار تمہارے طنز و مزاح کی فیلڈ میں آئی۔ اے۔ ایس حضرات کی بہتات کو دیکھتے ہوئے لگتا ہے۔ جیسے آئی۔ اے۔ ایس ب
نز و مزاح کی ڈگری ہو گئی ہے، آخر اس کی وجہ ــــ؟"

مَیں نے جواباً عرض کیا ــــ اس کی وجہ صرف اتنی سی ہے تم لوگوں نے برسوں سے طنز و مزاح کے بارے میں مشہور کر رکھا تھا کہ یہ دوسر
رجے کا ادب ہے۔ سو اللہ میاں کو تم لوگوں کی یہ بات کھل گئی اور انھوں نے آئی۔ اے۔ ایس حضرات کے دلوں میں اس دوسرے درجے کے ادب کا
رجہ بلند کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا۔ چنانچہ اب تم دیکھ رہے ہو سوائے طنز و مزاح کے ادب کی کسی صنف میں قسم کھانے کو بھی ایک آدھ آئی۔
ے۔ یس نظر نہیں آتا ــــ اسی لئے کہتے ہیں اللہ مہربان تو گدھا پہلوان۔ ان آئی۔ اے۔ ایس حضرات کی مہربانی سے کم از کم طنز و
زاح کی ظاہری "شد عی" تو ہو گئی ــــ"

ویسے یہ بات اپنی جگہ بالکل سچ ہے کہ طنز و مزاح کے قاتل کوچے میں ہر ایرا غیرا قدم نہیں رکھ سکتا، چاہے وہ آئی اے ایس ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ یہ وہ کوچہ ہرگز نہیں جس کے بارے میں برسوں پہلے کسی شاعر نے کہا تھا ؎

فیض بخشی کی ہے کیا شان تیرے کوچے میں
مور بن جائے سلیمان تیرے کوچے میں

بلکہ طنز و مزاح کے کوچے میں جگہ جگہ اُگی خاردار جھاڑیوں اور قدم قدم پر بچھی بارودی سُرنگوں کو دیکھ کر مرزا غالب نے سو برس پہلے ہی یہ وارننگ دی تھی ؏

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس کوچہ میں تو وہی سر پھرے قدم رکھتے ہیں جن کے دلوں میں جام شہادت نوش فرمانے کی تمنّا انگڑائیاں لیتی ہے بلکہ بعض فن کاروں کی لگن، جستجو اور تڑپ اس قدر بھرپور اور سچی ہوتی ہے کہ بھلے ہی وہ اپنی عمر کو آگے کی طرف بڑھنے سے روک نہیں سکتے لیکن ان کے دل میں پلنے بڑھنے والی یہ تمنّا ہمیشہ جوان رہتی ہے اور بھارت چند کھنّہ طنز و مزاح کے ان شہسواروں میں سے ہیں جن کی تمنا روز بروز نکھرتی سنورتی چلی جا رہی ہے۔ بلکہ فلمی انداز میں گنگناتے جا رہی ہے کہ ؎

اور بھی جوان ہو گئی ہوں گُل سے گُلستان ہو گئی ہوں

مرزا غالب نے غالباً اسی فن کارانہ تمنا کو اپنے لہو کی آنچ میں تپا کر ایک دن خالقِ کائنات سے گڑگڑا کر پوچھا تھا ؎

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یا رب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور اس کا جواب پورے سو برس بعد اللہ میاں نے بھارت چند کھنہ کے ذریعہ دلوایا کہ تمنا کا دوسرا قدم دراصل طنز و مزاح کے میدان میں ہے۔ گویا پورے سو برس بعد فن کار کی تمنا کے دوسرے قدم کی دریافت کر کے کھنہ صاحب نے خود کو طنزیہ و مزاحیہ ادب کا کولمبس ثابت کر دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جشنِ بھارت چند کھنّہ اسی تاریخی دریافت کا پُرخلوص اعتراف ہے۔

طنز و مزاح سے کھنّہ صاحب کا تعلق اب اتنا پُرانا ہو چکا ہے کہ اس پر بلا شبہ ازدواجی تعلق کی تہمت لگائی

جا سکتی ہے۔ کھنہ صاحب طنز و مزاح میں اور طنز و مزاح کھنہ صاحب میں اس قدر گھل مل گیا ہے کہ یہ پتہ لگانا مشکل ہے کہ طنز و مزاح میں کھنہ صاحب کہاں سے شروع ہوتے ہیں اور کھنہ صاحب میں طنز و مزاح کہاں پر ختم ہوتا ہے۔ جس طرح مشہور زمانہ پینٹنگ "مونا لیزا" کا تصور اس کی مسکراہٹ کے بغیر ادھورا ہے اسی طرح بھارت چند کھنہ کے بغیر اُردو کا طنزیہ و مزاحیہ ادب مکمل نہیں ہو سکتا۔

اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کے نام حفظانِ صحت کے مروّجہ اصولوں کی بے شمار خلاف ورزیاں برسوں سے منسوب ہیں لیکن آزادی کے بعد طنز و مزاح نگاروں کی ایسی کھیپ سامنے آئی جس نے اپنی خوش اخلاقی، خوش لباسی، خوش گفتاری، خوش مزاجی اور خوش مذاقی کا مظاہرہ کرکے لوگوں کو اس معتوب قوم کے تعلق سے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا۔ پابندیٔ وقت کے معاملے میں تو کوئی ان آئی اے ایس حضرات کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان حضرات نے اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو کیا دیا اس کا معیار کس قدر بلند کیا یہ بتلانا تو نقاد حضرات کا کام ہے لیکن اپنے اصولوں سے یہ حضرات ہم اُردو والوں کا اخلاقی معیار بلند کرنے کی کوشش میں ضرور لگے ہوئے ہیں۔ پابندیٔ وقت کے معاملے میں تو کبھی کبھی ان حضرات پر کسی اور ہی دنیا کی مخلوق کا گمان ہوتا ہے۔ ہماری اپنی دنیا کے "باسی" ہوتے ہوئے کسی اور دنیا کے "تازہ" ہونے کی سعادت صرف چند لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ اور ان چند لوگوں میں بھی بھارت چند کھنہ سرفہرست ہیں۔ بلکہ زندہ دلانِ حیدرآباد کی صدارت کے علاوہ یہ صدارت بھی مستقل انہی کے قبضے میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ اپنے اُردو ادیب ہونے کا ثبوت دینے کے لئے ہر نامور ادبی ہستی کو کبھی کبھی پروگرام میں لیٹ پہنچنا چاہیئے۔ لیکن کھنہ صاحب ہر پروگرام میں موت کے فرشتے کی طرح ٹھیک وقت پر پہنچ جاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یہ منتظمین جلسہ سے بھی پہلے جلسہ گاہ میں پہنچ جاتے ہیں اور پھر اس وقت تک خود اپنی بوکھلاہٹوں سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں جب تک کہ منتظمین جلسہ مقام واردات پر پہنچ کر انھیں دیکھتے ہی بوکھلانا نہیں شروع کر دیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے پہلے مجموعہ کی رسم اجرا کا موقع تھا۔ کھنہ صاحب اس پروگرام کی صدارت فرمانے والے تھے۔ پروگرام کا وقت ہو چکا تھا اور کھنہ صاحب کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ میرے ساتھی بہت بوکھلائے ہوئے تھے اور میں دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا محض اس خیال سے کہ میرے پہلے ہی مجموعہ کی رسم اجرا اس اعتبار سے تاریخی ہو جائے گی کہ اپنی بااصول زندگی میں پہلی بار کھنہ صاحب کسی ادبی پروگرام میں لیٹ پہنچ کر اپنا مستند ریکارڈ توڑنے جا رہے تھے اور اسی طرح پہلی بار طنز و مزاح نگاروں کا یہ "محمود" ہم "ایازوں" کی صف میں شامل ہونے جا رہا تھا۔ لیکن افسوس میری یہ خوشی لمحاتی ثابت ہوئی۔ کیونکہ میرے ایک ساتھی نے تھوڑی سی بھاگ دوڑ کے بعد یہ اطلاع بہم پہنچا کر میری خوشی پر پانی پھیر دیا، "کھنہ صاحب کو تو آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے، وہ لائبریری میں بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ مجھے کھنہ صاحب پر پہلی بار غصہ آیا۔ انھوں نے وقت پر پہنچنے کا اپنا معمولی سا ریکارڈ بچانے کے لئے میرا دل توڑ دیا تھا۔ پھر بھی میں لپک کر ان کے پاس پہنچا اور بناوٹی مسکراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے ان سے معافی مانگی۔ معاف کرنا کھنہ صاحب میں دوسرے بکھیڑوں میں ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ آپ کے آنے کا علم نہیں ہو سکا۔

کھنہ صاحب بولے "کوئی بات نہیں صاحب، یہ آپ کی پہلی پہلی اجرائی ہے، پہلا پہلا تجربہ، یہاں تو اتنی اجرائیاں عمل میں آچکی ہیں کہ لگتا ہے ساری عمر اسی دشت کی سیاحی میں کٹ گئی۔ خیر آپ کو اتنا زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہاں جلدی آکر مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ بلکہ فائدہ ہی ہوا۔

"فائدہ ــــ؟" میں حیرت سے کھنہ صاحب کا منہ تکنے لگا۔

"جی ہاں صاحب۔ اتنی دیر میں ایک مضمون ہوگیا۔ کتنے پابند وقت ہیں ہم لوگ ــــ" کھنہ صاحب نے اپنی مخصوص متانت و سنجیدگی سے کہا۔ تب پہلی بار مجھ پر یہ عقدہ کھلا کہ کھنہ صاحب دراصل ان لوگوں میں سے ہیں، خود وقت جن کی پابندئ وقت کا قائل ہے۔ کیونکہ کھنہ صاحب وقت پر یہ ثابت کرچکے ہیں کہ وہ بھی محمد تغلق کی طرح وقت سے بہت پہلے کی پیداوار ہیں۔

میں جب جب بھی کھنہ صاحب سے ملتا ہوں میرا یہ احساس اور قوی و مضبوط اور مستحکم ہوجاتا ہے کہ طنز و ظرافت، عالی ظرف انسانوں کی میراث ہے اور کھنہ صاحب عالی ظرفوں کے میر تقی میر ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے کھنہ صاحب کو "آخری شریف آدمی" کے ٹائیٹل سے نواز کر کتنی سچی بات کہی ہے بلکہ اس بہانے مجتبیٰ حسین نے پہلی بار بڑی معصومیت اور راست گوئی کے ساتھ اپنے سچے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اب آئندہ مجتبیٰ حسین کسی کے بارے میں زیب داستاں کے لئے بھی اگر جھوٹ کہیں گے تو سچ مانا جائے گا۔ (سچ ہے آدمی کبھی کبھی فرشتوں کے لکھے کے علاوہ اپنے سچ سے بھی پکڑا جاتا ہے)۔ شرافت کے معاملے میں کھنہ صاحب واقعی حرف آخر ہیں بلکہ مقطع کا شعر ہیں۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ کھنہ صاحب سے پوچھوں آپ اتنے زیادہ شریف آدمی کیسے بنے لیکن یہ بات ان سے کبھی پوچھنے کی ضرورت اس لئے نہیں پیش آئی کہ میں جانتا ہوں کھنہ صاحب جواب میں یقیناً یہی کہیں گے، صاحب اپنے آپ کو آخری شریف آدمی کہلوانے کے لئے میری طرح نسلاً پنجابی ہوتے ہوئے گنڈی پیٹ کا پانی وافر مقدار میں پینا چاہئے۔ کیونکہ پنجاب کی مٹی حیدرآباد کے پانی کی نمی پاکر ہی زرخیز ہوتی ہے۔ اور تب حیدرآباد کے پنجابی کی شرافت کی قسمیں کھائی جاتی ہیں۔ سچ جانئے کھنہ صاحب اگر من وعن ایسا جواب نہ بھی دیں تو اس سے ملتا جلتا جواب ضرور دیں گے۔ تب میں ان سے یہ سوال ضرور کروں گا ــ" فرض کیجئے کھنہ صاحب کوئی پنجاب میں پیدا ہی نہ ہوا ہو لیکن میری طرح حیدرآبادی ہوکر حلیئے، لبشرٹ اور حرکتوں سے پنجابی لگتا ہو تو کیا ایسا شخص بھی شرافت کے معاملے میں آپ کی طرح مستند سمجھا جاسکتا ہے ــــ؟" میں جانتا ہوں میرے اس احمقانہ سوال کے جواب میں بھی کھنہ صاحب ہاں ہی کہیں گے جو ان کے آخری شریف آدمی ہونے کی ایک اور ٹھوس دلیل ہوگا۔ ویسے بھی کھنہ صاحب کو 'نا' کہنا نہیں آتا۔ میں تو کہتا ہوں جس طرح نپولین کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کی ڈکشنری میں لفظ "ناممکن" نہیں ہے اسی طرح کھنہ صاحب کی لغت میں "نا" نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ اس کے استعمال سے ناواقف ہیں۔

کھنہ صاحب کی یہ ازلی شرافت ان کی تحریر، تقریر، کردار و گفتار ہر ہر بات سے جھلکتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی مخاطبت کا انداز ملاحظہ فرمائیے۔ حالانکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں ان کے منفرد لب ولہجہ اور پُرلطف طرزِ تخاطب کی نقل بھی نہیں کرسکتا۔ کھنہ صاحب کے لب ولہجہ میں نہ عام پنجابیوں کا سا مخصوص جھٹکا ہے نہ دکنی

زبان کا ٹھیٹ لٹکا بلکہ یوں سمجھئے ان کے لب ولہجہ میں لب قدرے کم کم اور لہجہ کسی قدر زیادہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ لب کشا ہوتے ہیں تو لگتا ہے جیسے پنجاب کے پانچوں دریاؤں کے ساتھ گنڈی پیٹ اور موسیٰ ندی بھی شانہ بہ شانہ بہہ نکلے ہوں ـــــ کھنہ صاحب اپنے ہر ملنے جلنے والوں کو "صاحب" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں ۔ چاہے ملنے والا کوئی بہت بڑا آفیسر ہو، چپراسی ہو یا مجھ جیسا چھٹ بھیا ادیب ـــــ یہ دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ سرکاری ملازمت کے دوران کھنہ صاحب اتنے بڑے صاحب رہے ہیں کہ "صاحبیت" کی بہتات سے گھبرا کر ہر کس وناکس کو صاحب کہہ کر اسے بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ورنہ میں نے تو ایسے بھی صاحب اقتدار صاحب دیکھے ہیں جو خدا کی بخشی ہوئی عزت کو بھی "کالے دھن" کی طرح سیف ڈپازٹ لوکر میں محفوظ کر کے بھی مطمئن نظر نہیں آتے البتہ آخری شریف آدمی کھنہ صاحب سے مجھے ایک شکایت ہے کہ کبھی کبھی ان کی یہ شرافت ان کی ظرافت پر حاوی ہو جاتی ہے ۔ (بخدا میری یہ شکایت کسی خصومت پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس شکایت کے پیچھے محبت ہے، صرف محبت) ۔

سُنا ہے شرافت اور وضع داری کا ساتھ چولی اور دامن کے قبیل کا ساتھ ہے ۔ اور کھنہ صاحب کو قدرت نے دونوں خصوصیتوں سے جی بھر کے سرفراز فرمایا ہے ۔ (واضح ہو کہ یہاں اشارہ اول الذکر خصوصیتوں کی طرف ہے موخرالذکر کی جانب ہرگز نہیں) مرزا غالبؔ نے فرمایا تھا ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

(واضح ہو کہ اس خاکے میں مرزا غالبؔ کے جتنے بھی شعر اور مصرعے استعمال کئے گئے ہیں وہ مرزا نے فرمائے تو کسی اور کے لئے تھے لیکن یہ کھنہ صاحب پر بھی پوری طرح فٹ ہو رہے ہیں) البتہ کھنہ صاحب ذرا سی ترمیم کے ساتھ مرزا غالبؔ کے مذکورہ بالا مصرعہ کی تفسیر بنے ہوئے ہیں ؎

وضع داری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے

کھنہ صاحب کی وضع داری کی ہلکی سی جھلک ملاحظہ فرمائیے ۔ کسی مقامی اخبار میں میرا نام حضرت کاتب کی مہربانی سے پرویز یداللہ مہدی کی بجائے پروفیسر یداللہ مہدی چھپ گیا اور پکی روشنائی میں چھپا ۔ یہ نام کھنہ صاحب کی نظر سے گزر گیا ۔ پھر کیا تھا اس تاریخ سے آج تک کھنہ صاحب مجھے نہ صرف پروفیسر سمجھتے ہیں بلکہ پروفیسر کہہ کر مخاطب بھی فرماتے ہیں ۔ حالانکہ اس دوران میں کئی بار میں نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی لیکن کھنہ صاحب کی وضع داری غالباً یہ گوارا نہیں کرتی کہ کسی کو ایک بار کوئی مرتبہ بخش کے واپس لیا جائے ۔ آپ نے بہت سارے راجوں مہاراجوں کو معزول ہوتے دیکھا یا سُنا ہوگا لیکن کسی گنگو تیلی کو راجہ بھوج بنتے نہیں دیکھا ہوگا ۔ مجھے دیکھئے اور کھنہ صاحب کی وضع داری کو دعائیں دیجئے ۔

وضع داری، بردباری، خاکساری، ملنساری اور پتہ نہیں کتنی ساری ساریوں کو کھنہ صاحب اپنے اندر اوصاف حمیدہ کی شکل میں سموئے ہوئے ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہی اوصاف حمیدہ نے کھنہ صاحب کو وقت سے بہت پہلے اس قدر خمیدہ کر دیا ہے کہ کمر خمیدہ، قبر رسیدہ قسم کے بزرگ بھی انھیں اپنا بزرگ سمجھنے لگتے ہیں ـــ لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا ۔ میں کھنہ صاحب کی عزت ضرور کرتا ہوں، بے حد حساب کرتا ہوں لیکن انھیں اپنا بزرگ نہیں مانتا ۔

حالانکہ کھنہ صاحب عمر میں مجھ سے بہت بڑے ہیں۔ ان کی ادبی عمر بھی مجھ سے کافی بڑی ہے۔ بلکہ میری ادبی و غیر ادبی دونوں عمریں مل کر بھی ان کی ادبی عمر کی برابری نہیں کرسکتیں۔ علم و ادب کے میدان میں بھی انھوں نے بے شمار جھنڈے گاڑے ہیں۔ جبکہ میں صرف جھنڈے اکھاڑ تا رہا ہوں۔ شہرت، کے میدان میں بھی ان کی حیثیت جیک پاٹ جیتنے والے گھوڑے کی سی ہے۔ انھیں سب جانتے ہیں اور مجھے ـــــ اوروں کی بات چھوڑ یئے خود میں بھی اپنے آپ کو نہیں جانتا۔ غرض کسی معاملے میں ان کا میرا کوئی جوڑ نہیں یہاں تک کہ میں یہ دعویٰ بھی نہیں کرسکتا کہ میں ان کا براہ راست فین (FAN) ہوں۔ اس معاملے میں بھی مجھے جنریشن گیپ (GENERATION GAP) کی کھائی نے کھنہ صاحب سے دور کردیا۔ میرے والد صاحب ان کے زبردست فین ہیں ـــــ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں کھنہ صاحب کو اپنا بزرگ نہیں مانتا ـــــ میری نظر میں ادب کے میدان میں " بزرگی " کے معنی ہیں ارتقا کی موت۔ فن کے سوتوں کا سوکھ جانا، لفظوں کے پیکر سے معنی کی روح کا پرواز کرجانا ـــــ جبکہ کھنہ صاحب کا فکری سفر بدستور ارتقا پذیر ہے۔ فن کے سوتوں میں لہو کی گرمی اب بھی جوش مارتی محسوس ہوتی ہے۔ لفظوں کے پیکر اب بھی نت نئے معنی کی حرارت سے زندہ و متحرک محسوس ہوتے ہیں ـــ کھنہ صاحب کو اپنے ہم عمروں ہم عصروں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے چلنا تو آتا ہے ہی، اپنے بعد والی نسلوں کے ساتھ بھی قدم سے قدم ملائے چلنا خوب جانتے ہیں۔ نہ کبھی ان کی سانس پھولی ہے نہ کبھی قدم لڑکھڑائے ہیں۔ ایسے زندہ متحرک، فعال فن کار کو بزرگ کہہ کر میں اُردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کو شکوہ کوتاہی داماں کرنے پر مجبور نہیں کروں گا۔

کیا ادب کا وہ مورخ جو ابھی تک پیدا نہیں ہوا اور نہ ہی جس کے پیدا ہونے کے امکانات ہیں کھنہ صاحب کے ادبی کنٹری بیوشن (CONTRIBUTION) سے سہو نظر کرسکتا ہے۔ مسکراتے آنسوؤں کی بوچھار میں ٹھنڈی بجلیوں کی یلغار کرکے کھنہ صاحب نے پہلے تو اپنے پڑھنے والوں کی رگِ ظرافت میں حرارت پیدا کی، پھر ٹھیک نشانے پر تیر نیم کش تان کر کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے بھولے پن سے سوال کیا۔ " کیا نام نہ ہوگا ـــ ؟ " جواب میں پڑھنے والوں کی جانب سے میں کھنہ صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کا نام تو ادب میں بہت ہی ادب سے لیا جاتا ہے۔ بلکہ آپ کی ہر کاوش پر داد و تحسین کی یوں بارش ہوتی ہے کہ ؎

اللہ کرے زورِ قلم، زورِ مزاح، زورِ طنز اور زیادہ

آخر میں اپنی کم مائیگی، کم علمی، اور کم قلمی کا دل سے اعتراف کرتے ہوئے اتنا ہی کہوں گا کہ آخری شریف آدمی کھنہ صاحب کی شرافت اور ظرافت کا سلسلہ اس قدر دراز ہے کہ اس کے دوسرے سرے تک مجھ جیسے غیر شریف آدمی کی کمزور نظر نہیں پہنچ سکتی۔ ان کی شرافت اور ظرافت یقیناً ثواب جاریہ کے قبیل کی کوئی چیز ہے جو انسان کے ختم ہونے کے بعد بھی چلتی رہتی ہے۔ لہٰذا اسے فل اسٹاپ لگانا میرے بس کی بات نہیں البتہ اس بات کے ساتھ اسے کاما لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں اس وقت سے اللہ میاں کی گائے کے بارے میں سنتا چلا آرہا ہوں جب مجھ میں گائے اور گدھے میں تمیز کرنے کا بھی شعور نہیں تھا۔ لیکن جب ڈاکٹر رشید موسوی کا کھنہ صاحب پر مضمون پڑھنے اور بار بار کھنہ صاحب سے ملنے کا انھیں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ اللہ میاں کی گائے کیسی ہوتی ہے ؎

جی ہاں اک ذرا گردن اُٹھائیے اور دیکھ لیجئے، کیسی ہوتی ہے ـــ !!

▲▲

بھارت چند کھنہ

محکمہ اوزان و پیمانہ جات کی ایک نئی شاخ شہر کے اس حصہ میں جو گذشتہ چند سالوں میں آبادی کے بے پناہ طور پر بڑھنے کی وجہ سے ایک بڑا کاروباری مرکز بن گیا تھا، قائم کی جارہی تھی۔ اس دفتر کے انعقاد کے مسعود موقع کے لیے صدر محکمہ نے ایک نہایت بزرگ و عمر رسیدہ نیتاجی کا انتخاب کیا، جو زندگی کی ابتدائی درمیانی اور آخری منزلوں کے اس آخری مقام پر پہنچ چکے تھے جس میں جسم میں نقاہت، ہاتھوں میں رعشہ، زبان میں لکنت، آنکھوں میں دھندلاہٹ، قدموں میں لڑکھڑاہٹ تو ہر دم موجود مگر جن کی قوتِ سماعت قریب قریب ان کو داغِ مفارقت دے چکی تھی ـــــ اور ان کے کانوں میں صرف ایسی آوازیں ہی پہنچ سکتی تھیں، جو شادی بیاہ کے موقعوں پر فلمی گیتوں کے گھسے پٹے ریکارڈ، لاؤڈ اسپیکروں کو پوری قوت سے چلانے پر نکلتی ہیں۔ موصوف عام طور پر موقعہ محل کے لحاظ سے کہنے والے کے مطلب کا اندازہ لگا لیتے تھے۔ موصوف کا انتخاب ان کی صحت کی نمائش کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے کیا گیا تھا کہ سواری کا معقول انتظام کئے جانے پر وہ تقریب میں بروقت ضرور پہنچ جاتے تھے۔

چنانچہ حسب وعدہ نیتاجی محکمہ اوزان و پیمانہ جات کی موٹر میں نئے دفتر لائے گئے جہاں مدعوئین کا ایک بڑا مجمع موجود تھا۔ سب سے پہلے موصوف نے اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے بڑی قینچی تھام کر بڑی کاوشوں کے بعد جیسے ہی چھوٹا فیتہ کاٹنے میں کامیابی حاصل کی، حاضرین نے بڑے زور زور سے تالیاں بجاکر ایسی مسرت کا اظہار کیا جیسی کسی اُلٹے بچے کے بالآخر صحیح سلامت پیدا ہوجانے پر لڑکی لڑکے کے والدین اور بیوقوف شوہر کیا کرتے ہیں۔

گو تالیوں کی گونج سے سارا ہال تھرا اٹھا تھا، مگر قینچی بردار نیتا کو یہ آواز نہایت مدھم سی محسوس ہوئی اور موصوف نے حاضرین سے درخواست کی کہ وہ ایک مرتبہ

پھر اپنی مسرت کا اظہار کریں۔ تعمیلِ حکم میں پھر سے تالیاں بجائی گئیں۔

تقریب کے ایجنڈا کے مطابق فیتہ کاٹنے کے فوراً بعد محکمہ کے افسرِ اعلیٰ کی تقریر تھی جس میں وہ محکمہ کی کارکردگی اور ضرورتیاتِ حاضرہ کے اعتبار سے اِس نئی شاخ سے پیدا ہونے والی سہولتوں کی وضاحت کرنا چاہتے تھے۔

مگر نیتاجی جو بمشکل تمام اپنی کرسی سے دو مضبوط انسانوں کی قوت کے بَل بوتے پر کھڑے کئے گئے تھے اور جنھوں نے اپنے دونوں پاؤں ویسی ہی احتیاط سے فرش پر جمالیے تھے جس طرح NEIL ARMSTRONG نے پہلے دو قدم چاند پر رکھے تھے، اپنے جملہ فرائض یکمشت پایۂ تکمیل کو پہنچا دینا چاہتے تھے تاکہ اس تقریب میں ان کے لیے کم سے کم اُٹھ بیٹھ ہو۔ چنانچہ انھوں نے فوراً اپنی لرزتی ہوئی آواز میں تقریر کا آغاز کر دیا ——

"پیارے سجّنو! اِس تقریب میں شریک ہوکر مجھے ایک گونہ بیخودی محسوس ہورہی ہے۔ اِس سیم و زر اور زیر و زبر کی دُنیا میں "عہد و پیمان" کے محکمہ کی موجودگی بجائے خود ایک معجزہ سے کم نہیں —— اور پھر اس کی ایک نئی شاخ کا قیام مجھے اُن ایّامِ رفتہ کی یاد تازہ کراتا ہے جس میں ادبِ عالیہ کے ان شہ پاروں کی تخلیق ہوئی تھی جن کو پڑھ کر اب بھی اہلِ ذوق سر دُھننے لگتے ہیں ——"

اِس نوبت پر جبکہ حاضرین، تقریر کے ابتدائی جملوں سے حیران ہوکر پہلے تو دم بخود و خاموش اور پھر فرطِ مسرت سے بیخود ہوکر مسلسل تالیاں بجانے لگے تھے، عہدہ دار متعلقہ نے سر دُھنتے ہوئے تقریب کی بِنا کو سراسر غرقاب ہونے سے بچانے کے لیے نیتاجی کے کانوں کے پاس اپنا مُنہ لے جاکر نہایت اونچی آواز میں التجا کی کہ صاحب اس ریاست میں "عہد و پیمان" نامی کوئی محکمہ نہیں۔ اس تقریب کا تعلق محکمہ اوزان و پیمانہ جات کی نئی شاخ کے قیام سے ہے جس کا مقصد صارفین کو دوکانداروں کے اس فریب سے محفوظ رکھنا ہے، جس کا استعمال وہ کھوٹے باٹوں سے تولنے اور ڈنڈی مارنے سے کیا کرتے ہیں۔ حکومت چاہتی ہے کہ خریدار کو کھرے دام دینے پر خریدی ہوئی چیز پوری پوری مقدار میں ملے ......

مگر نیتاجی کی قوتِ سماعت کا حال تو آپ کو بتلایا جاچکا ہے۔ نہ معلوم انھوں نے کیا سُنا، کہنے لگے ——

"برخوردار تم شاید نہیں جانتے کہ کسی مقرر کی تقریر میں اس طرح مخل ہونا آدابِ محفل کے کس قدر خلاف ہے۔ مجھے اُٹھنے بیٹھنے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ اب جو میں کھڑا ہوچکا ہوں تو جو کچھ مجھے کہنا ہے کہہ کر ہی بیٹھوں گا۔ اس کے بعد تم کو جو کچھ اور جس قدر کہنا ہو کہہ لینا!"

حاضرین جو اِس مکالمہ کو بخوبی سن سکے تھے، ظاہر ہے، ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے اور ایک مرتبہ پھر تالیاں بجا کر میزوں پر ہاتھ مار مار کر اپنی والہانہ مسرت کا اعلان کرنے لگے۔ نیتاجی بھی مطمئن ہوگئے کہ حاضرین ان کے فرمودات کو مستند سمجھ کر اپنی تائید کی سند میں تالیاں بجا رہے تھے۔ صدر محکمہ نے سَر پیٹ لیا اور پیٹ میں منڈی ڈال کر کسی مار کھائے ہوئے کتّے کی طرح دبک کر بیٹھ گیا!!

نیتاجی نے سلسلۂ تقریر جاری کرتے ہوئے فرمایا۔

"عزیز دوستو! عہد و پیمان کے زرّین دَور گزر چکے ہیں۔ رامائن کی کہانی سے کون واقف نہیں۔ راجہ دسرتھ نے اپنی بیٹی رانی کیکئی کو دیئے ہوئے قول پورا کرنے کے لیے اپنے بڑے بیٹے رام کو راج گدی سے

محروم کرکے چودہ برس کا بن باس دیدیا اور کیکئی کے بیٹے بھرت جنکو ایودھیا کا راج دلانے کے لیئے اس کی ماں نے یہ چال چلی تھی' .... اپنے بڑے سوتیلے بھائی رام کو ہی گدّی کا حقدار تسلیم کرتے ہوئے' چودہ برس تک رام کی غیر موجودگی میں تخت پر رام کی کھڑاویں رکھ کر راج کا انتظام کیا۔ عہد و پیماں کی اس سے اعلیٰ مثال شاید ہی کوئی اور ہو!

"پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا جب فردوسی نے ایران کے بادشاہِ وقت کے اس وعدہ پر کہ اس کو شاہنامہ کے ہر شعر کے لیئے ایک ایک سونے کی اشرفی دی جائے گی، شاہنامہ بڑی محنت سے مرتب کیا اور جب بادشاہ نے وعدہ خلافی کی اور سونے کی اشرفیوں کے بجائے چاندی کے سکّے دینے کی کوشش کی تو فردوسی نے ان کو ٹھکرا دیا اور بادشاہ کی ہجو میں ایسے اشعار لکھے جو روز حشر تک یاد رہیں گے۔ فردوسی کے ایک شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر بادشاہ کسی شاہ بانو کا بیٹا ہوتا تو مجھے میرے زانوں تک سونے چاندی سے بھر دیتا۔"

سامعین اس دوران واہ واہ کے نعرے لگا رہے تھے۔ روئے سخن کی داد دے رہے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ کیا تیر بہدف تقریر ہے۔ کوئی کہتا کہ لے مقرر' تیرا جواب نہیں۔

سامعین کے آواز سے نیتاجی کی سمجھ میں ان کی تعریف و توصیف کی آوازیں تھیں۔ وہ مسرور تھے اور سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمانے لگے۔

"آیئے اب ایک نظر اردو ادب پر بھی ڈالیں یہ بھی عہد و پیمان کا ہی دَور تھا۔ ہائے وہ کیا زمانہ تھا جس میں ادب عالیہ وجود میں آیا' جس میں زبان اور بیان کی بے مثال خوبیاں پیدا ہوئیں۔ وہ گل و بلبل کے فسانے، شمع پر جل جانے والے پروانے' لیلیٰ و مجنوں کی حکایتیں، شیریں و فرہاد کے قصّے، درد و سوز' آہ و فغاں، ساقی و مینا —— میرؔ، حالیؔ، محمد حسین آزادؔ' غالبؔ، ذوقؔ — کن کن کے نام لوں۔ سب اساتذہ تھے، بادشاہِ قلم، علم و دانش کے شہنشاہ' تہذیب و تمدن کے بانی —— صد حیف کہ یہ سب صورتیں خاک میں پنہاں ہوچکی ہیں!

"مگر نامناسب نہ ہوگا اگر اس موقعہ پر کچھ اشعار مُشتے از خروارے کے طور پر آپ کی نذر کردوں۔
سب سے پہلے غالبؔ کی خود داری اور اَنا ملاحظہ ہو' اپنی آبرو قائم رکھنے کے بارے میں فرماتے ہیں۔

درد مِنّت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

عشق کی بہترین اور مستند تعریف میں فرماتے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

اور پھر ——

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اس کے بعد اُستاد شاہ ذوقؔ کا صرف ایک شعر جس کو سُن کر غالبؔ بھی ذوقؔ کا لوہا مان گئے تھے۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یہ اشعار اس دَور دوراں کے شہ پارے ہیں جو لوحِ دل پہ نقش ہو چکے ہیں اور اب ایسا بھی زمانہ آچکا ہے جس میں شعرا نے کچھ علامتیں اپنی جھولی میں بھر رکھی ہیں جو آفات ناگہانی کی طرح وارد ہوتی ہیں۔ ان کے استعمال سے صرف معمے پیدا ہوتے ہیں۔ کوئی اپنی ایک آہ سے آفتاب کو خاکستر کرکے رکھ دیتا ہے تو کسی کی تشنگی ایسی ہے کہ ایک ہی گھونٹ میں سمندر پی کر بھی نہیں مٹتی۔

" دوستو میں آپ کا زیادہ وقت لینا نہیں چاہتا۔ عہد و پیمان" کے دفتر کی اس نئی شاخ کا قیام اس بات کا ضامن ہے کہ زمانہ شاید ایک اور کروٹ بدلنے والا ہے۔ ہر چیز جب اپنے انتہائی عروج یا انتہائی زوال پہ پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں تبدیلی ---- ضروری ہو جاتی ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ یہ محکمہ اپنی کوششوں سے نئے رجحان، نئی قدریں، نئے نصب العین، اور نئے زاویے پیش کر سکے گا جس سے ممکن ہے عہد و پیمان کا پُرانا زمانہ ایک بار پھر سے ایک حقیقت بن جائے"

اس طرح تالیوں اور قہقہوں کے طوفان میں نیتاجی کی تقریر ختم ہوئی جس کے بعد صدر محکمہ نے جن کو نیتاجی نے زندہ درگور کر رکھا تھا، صرف ایک جملہ میں حاضرین اور نیتاجی کا شکریہ ادا کیا اور موٹر میں بٹھا کر نیتاجی کو وداع کیا۔

اس کے بعد کی کیفیت کا تو مجھے علم نہیں البتہ یہ اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے کہ صدر محکمہ نے نیتاجی کو اس تقریب میں بُلانے کی بیوقوفی کرنے کے لیے اکیلے میں ہنستے ہوئے خود کو پانچ چھ چانٹے ضرور رسید کئے ہوں گے۔!

۲۲

ڈاکٹر یوسف کمال

بڑھے ہی شائستہ اور مہذّب فقروں سے لے کر نہایت گندے اور فحش لطیفوں کے درمیان مزاح کی ایک وسیع دنیا آباد ہے، جس میں کارٹون، ڈرامے، مضامین، خاکے، فلمیں، تبصرے، اشعار اور لطیفوں کا ایک انبار بھی موجود ہے۔ اگر ان سارے وسیع اور مختلف النوع ادبی اصناف اور غیر ادبی مظاہروں کو مزاح جیسی وسیع اصطلاح کے تحت رکھدیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مزاح کیا ہے؟ اور یہ کہ کیا مزاح کا تجزیہ ممکن ہے؟ انگریزی کے مشہور ادیب ای۔ بی۔ وائٹ نے ایک بار کہا تھا کہ مزاح کی جراحی تو بالکل اس طرح ممکن ہے جیسا کہ ایک سائنس داں مینڈک کو کاٹ کر اس کے ہر عضو کا امتحان کرتا ہے، مگر مشکل یہ ہے کہ اس مشق ستم میں بے چارے مینڈک کی جان نکل جاتی ہے۔ لیکن یہاں مزاح کے تجزیئے میں نہ تو کسی جان کے زیاں کا اندیشہ ہے اور نہ ہی روٹھے سخن کسی کی طرف سے اس لیئے آیئے غور کریں کہ آخر مزاح کیا ہے اور اس سے ہماری زندگی کا کیا تعلق ہے۔

انسانی زندگی کو اگر خوشی اور غم کے پیمانوں میں تقسیم کیا جائے تو پھر ہنسنا اور رونا دو ایسے عمل ہوں گے، جن سے انسانی زندگی عبارت ہوگی۔ سائنس کی حالیہ تحقیق کی روشنی میں رونا تو ایک حیاتیاتی

جبلت ہے جو جانوروں میں بھی پائی جاتی ہے جبکہ اقلیم حیاتیات میں انسان اپنی ہنسی سے ممتاز اور ممیز ہے۔ اس طرح ہنسنا خالصتاً ایک انسانی فعل ہے، اس لیئے اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ہنسنا انسان ہونے کی بھی ایک روشن علامت ہے اسی لیئے ارسطو نے بھی انسان کو "حیوان ظریف" کہا تھا۔ رونا اور ہنسنا گو کہ انسان کی سرشت میں ہے مگر بیشتر وہ رنج و غم سے کتراتا اور ہنسی اور خوشی کا متمنی رہتا ہے۔ اس لیئے جہاں رونا ایک حیاتیاتی جبلت ہے وہاں ہنسنا صرف اور صرف ایک انسانی جبلت ہے۔ خوش رہنے اور ہنسنے کی یہی ازلی خواہش ہے کہ جہاں کہیں ہنسی اور خوشی کے لمحے میسّر آئیں، انسان انہیں جھپٹ کر سمیٹ لیتا ہے۔

ماہرین انسانیات و نفسیات اور بیشتر ادبی نقادوں کے تفصیلی جائزوں کے نتیجے میں مزاح کے بارے میں تین اہم نظریئے سامنے آئے ہیں۔ پہلے نظریئے کے مطابق مزاح کی بنیاد احساس برتری پر ہے جبکہ دوسرے نظریئے کے مطابق مزاح دو غیر متعلق اُمور کو ایک دوسرے سے جوڑنے یا بالفاظ دیگر زندگی کے تضادات سے جنم لیتا ہے۔ تیسرے اور آخری نظریئے کے مطابق مزاح ناآسودہ خواہشوں کی وجہ سے پیدا ہونے والے اندرونی دباؤ یا تناؤ کے بالواسطہ اظہار کا دوسرا نام ہے۔

مزاح اور احساسِ برتری کا نظریہ ۱۷ ویں صدی کے ایک برطانوی فلسفی تھامس ہابس (HOBBES) کی دین ہے۔ ہابس نے کہا تھا کہ ہنسی، دوسرے افراد کو کمتر اور اپنے آپ کو بلند اور افضل سمجھنے کا ایک لازمی نتیجہ ہے یا جیسا کہ کنیڈا کے مشہور مزاح نگار اسٹیفن لیکاک کا خیال ہے کہ قہقہہ بنیادی طور پر فتح اور کامیابی کی ایک "وحشیانہ چیخ" ہے۔ احساس برتری کے نظریئے کی روشنی میں ہم ایسے سیاسی مزاح نگاروں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے شخصی یا نظریاتی زاویۂ نگاہ سے زندگی پر تبصرے کیئے۔ ایسا مزاح جہاں زیادہ سے زیادہ مقبولیت حاصل کرتا ہے وہیں اس بات کا ہمیشہ اندیشہ رہتا ہے فن کار کا اپنا احساسِ برتری کہیں مزاح کو طنز میں نہ بدل ڈالے چنانچہ بہت کم ایسا ہوا ہے کہ سیاسی مزاح نگاری طنز کی تلخی سے پاک رہی ہو۔ ایسی مزاح نگاری کی بہت خوبصورت اور شاہکار مثال خود مارک ٹوین ہیں جنھوں نے اپنی مزاح نگاری کے بارے میں کہا تھا کہ "میں مزاح یا لطیفے نہیں لکھتا بلکہ میں حکومت کی کارکردگی پر نظر رکھتا ہوں اور بلاکم و کاست اپنے مشاہدات کو قارئین تک پہونچاتا رہتا ہوں۔"

مزاح کو دو غیر متعلق اُمور سے جوڑنے کا نظریہ ۱۹ ویں صدی کے ایک جرمن فلسفی شوپنہار کی دین ہے جو مزاح کی نمو اور اپیل کا راز زندگی کے ایسے متضاد واقعات میں دیکھتا ہے جن میں کوئی منطقی تسلسل نہیں ہوتا ہے۔ بے ربطی حالات اور بے ہنگم کردار اور واقعات کس طرح ان گنت لطیفوں میں در آئے ہیں۔ یہ خود شوپنہار کے اس نظریئے کا کھلا ثبوت ہے کہ مزاح متضاد حالات اور واقعات میں غیر متوقع قول اور عمل کا ضامن ہے مثلاً یہ کہ ایک دواخانے میں تین مریض بسترِ مرگ پر لیٹے ہوئے ہیں اور ڈاکٹر ان تینوں مریضوں سے پوچھتا ہے کہ ان کی آخری خواہش کیا ہے؟ ایک مریض چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے اپنے پادری سے مل لے۔ دوسرے مریض کی خواہش ہے کہ وہ آخری بار اپنی فیملی کا دیدار کر لے جبکہ تیسرا یہودی مریض ڈوبتی ہوئی آواز میں کہتا ہے کہ میری آخری خواہش یہ ہے کہ "میں کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ کر لوں۔" اس لطیفے میں شوپنہار

کا نظریۂ مزاح تیسرے مریض کی غیر متوقع خواہش میں، مزاح کی چاشنی کا ذمہ دار ہے۔

جہاں تک مزاح کے بارے میں تیسرے اور آخری نظریئے یعنی اندرونی تناؤ کے بالواسطہ اظہار کا تعلق ہے، یہ نظریہ دراصل فرائیڈ کے خوابوں کے نظریئے کی ایک توسیع ہے۔ کوپن ہیگن کے ایک ماہر نفسیات IVAR SOE نے مزاح اور خوابوں میں وہی مماثلت دریافت کی ہے جو ناآسودہ خواہشوں کے لاشعور میں بلاجھجک اظہار سے عبارت ہے۔ چنانچہ مزاح کے عام جارحانہ اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے دوسرے ماہرین نفسیات بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مزاح جنسی آرزوؤں کے اظہار کا بھی ایک واسطہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے پامال لطیفوں میں جنسی لطافت بھی زیادہ سے زیادہ شامل نظر آتی ہے جو تہذیب اور شائستگی کی حدبندیوں میں تو قابلِ قبول ہے مگر یہ رجحان عدم توازن کی صورت میں لطیفوں کو ابتذال اور فحش گوئی کی سطح تک بھی گرادیتا ہے۔

احساس برتری کے نظریئے کی روشنی میں مزاح ایک ایسی خوشی اور مسرت کی خواہش کا متقاضی ہے جہاں دوسرے فرد یا افراد کی توہین اور ہتک کا احتمال رہتا ہے۔ اس قسم کا مزاح عام طور پر دانش وارانہ عناصر سے عاری ہوگا جبکہ منطقی عدم تسلسل کے نظریئے کے تحت متضاد حالات کے بطن سے جنم لینے والا مزاح فکری اور دانشورانہ شان کا حامل تو ہوگا مگر اس میں مزاح کا جذباتی پہلو ممکن ہے کہ مجروح ہوجائے۔ فرائیڈ کے تیسرے نظریئے یعنی اندرونی تناؤ یا کش مکش سے نجات پانے کی خواہش ایک ایسے شائستہ حسِ مزاح کی دین ہے جس میں سماجی، تہذیبی اور روایتی پابندیوں سے عاجز اور مجبور فرد اپنی خواہشوں کو تکمیل کے لیئے مزاح کے ذریعہ دنیا میں خوشی اور مسرت کا متلاشی ہے۔

مزاح کا مقصد بہ ظاہر خوشیوں اور مسرتوں کا حصول ہے مگر مزاح اپنی بے پناہ مقبولیت کی بناء پر معاشرے میں عملی طور پر اثرانداز ہونے کی بے پناہ اہلیت رکھتا ہے چنانچہ مزاح کو تہذیبی اقدار سے وابستہ کر کے اصلاح کا بھی موثر ذریعہ بنایا گیا ہے۔

معاشرے میں مزاح کی پذیرائی اور مقبولیت ہر تہذیبی معاشرے کا جز ہے۔ بہ قول چینی مفکر لن یوتانگ "بہت کم لوگوں کو اس بات کا شعور ہے کہ مزاح ہماری تہذیبی زندگی کی سطح، معیار اور کردار کو متعین کرنے میں کس قدر دخیل اور بااثر ہے"۔

اس بات کی معاشرے میں زبردست تہذیبی اہمیت ہے کہ افراد کب، کیوں اور کیسے ہنستے ہیں۔ کیونکہ مزاح کے اثرات "طبعی سے کہیں زیادہ کیمیائی تعاملات کے بھی حامل ہیں"۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مزاح انسانی تجربے اور اندازِ فکر پر اثرانداز ہونے کی زبردست قوت رکھتا ہے۔ ایک پریشان خیال انسان ہنسنا تو کجا مسکرا بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ ہنسنے یا مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لیئے واضح فکر اور صحت مند ذہن کی ضرورت ہے۔ ان معنوں میں مزاح کو محض ایک فرد کے نجی رویئے یا مزاح تک محدود کرنا، اس عظیم انسانی وصف کے ساتھ نہ صرف ناانصافی ہوگی بلکہ مزاح کی وسیع تر سماجی اور آفاقی اہمیت سے انکار کے مترادف ہوگا۔ علاوہ ازیں ماہرین انسانیات اور ماہرین نفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ مزاح ایک عام اور پختہ تر معاشرتی رویئے کا

غماز ہے، اسی لیے بھی شاید ادب کے دوسرے اصنافِ سخن کے مقابلے میں مزاح نمایاں طور پر سماجی ادب کی ایک بہترین مثال ہے۔ ادب کے دوسرے اصنافِ سخن یعنی شاعری، ڈرامہ اور افسانوں کی پذیرائی بڑی حد تک ایسے طبقوں تک محدود رہتی ہے جو ان اصناف میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہوں جبکہ مزاح ان ساری حد بندیوں کو کاٹ کر یکساں طور پر معاشرے کے ہر طبقے اور فرد سے ہم آہنگ ہوتا ہے اس طرح مزاح کی جڑیں واضح طور پر معاشرے میں پیوست ہیں جن کی پہچان، نشاندہی، آب یاری اور پھر ان کی فن کارانہ پیش کش کا تعلق مزاح نگار کی اپنی فنی کارانہ اہلیت پر منحصر ہے۔

روز افزوں پیچیدہ سے پیچیدہ ہونے والی اس دنیا میں ہر فرد دن بہ دن نئے مسائل سے دوچار ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مستقبل کی دنیا بھی ایسی ہی بلکہ اس سے کہیں کثیر النوع پیچیدگیوں سے عبارت ہوگی زندگی اور معاشرے کی ان پیچیدگیوں میں سادہ فکری، پُروقار فلسفہ طرازی اور عام فہمی کا ایک ایسا ماحول تشکیل کرنا ضروری ہوگا جس سے معاشرتی تہذیب اپنے سارے تضادات کے ساتھ جاری و ساری رہ سکے۔

زندگی اور معاشرے کے اس سیاسی اور صنعتی جبر کو خوشگوار یا گوارہ بنانے کے لیئے جس سادہ فکری پُروقار فلسفہ اور عام فہمی کی ضرورت ہے۔ حسنِ اتفاق سے یہی وہ عناصر ہیں جن میں مزاح بھی پھلتا پھولتا اور ترقی کرتا ہے۔ ان حالات میں مزاح انسانی تہذیب کے بنیادی اقدار کو صنعتی ماحول اور مصروف میکانکی زندگی میں زندہ اور باقی رکھنے میں ایک اہم اور موثر واسطہ ہوگا۔ ■■

اظہر افسر

ڈرامہ

لاؤ وہ تلوار

کردار

چچا ـــــــ (۵۵ سالہ ایک بوڑھا)
منّا ـــــــ ۲۲ سالہ نوجوان
چچی ـــــــ ۴۵ سالہ ایک خاتون

پردہ اٹھتا ہے، تو درمیان میں ایک تخت بچھا ہے جس پر اُجلا فرش ہے۔ چچا تخت پر بیٹھا کچھ لکھ رہا ہے، چاروں طرف کاغذ بکھرے ہوئے ہیں۔ تخت کے آس پاس رکھی کرسیوں میں سے ایک پر منّا بیٹھا چچا کو غور سے دیکھ رہا ہے۔

چچا : ہاں۔ وار۔ مار ـــ دلدار اور یار

منّا : جی چچا جان؟

چچا : میں تم سے نہیں کہہ رہا ہوں۔

منّا : مجھ سے نہیں؟

چچا : نہیں، دلشاد رہو، آباد رہو ـــ کچھ دیر ذرا خاموش رہو۔

منّا : یہ مجھ سے کہہ رہے ہیں آپ؟

چچا : ہاں صرف آخری جملہ ـ کچھ دیر ذرا خاموش رہو۔ میں لکھ رہا ہوں، ابھی دیتا ہوں۔

منّا : جی بہت اچھا، میں چُپ ہوں۔

چچا : (اپنے آپ) ہوں ہوں ہوں۔ ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے، یہی دُنیا کا کارخانہ ہے۔

منّا : چچا جان

چچا : ہوں، لو یہ کاغذ پورا ہو گیا۔ اسے سنبھالو۔

منّا ـ (چچا سے کاغذ لیتا ہے)

چچا : اب پڑھو، اس کاغذ کی ایک نقل میرے پاس بھی ہے۔ جیسے میں نے بتایا ہے، ویسے پڑھنا۔

(چچا اور منّا اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں)

منّا : نہ ملے گی مرضِ غم کی دوا میرے بعد
پائے گا ظلم و ستم کا تو مزا میرے بعد

چچا : ایسے نہیں منّا، ذرا ٹھیک سے پڑھو جیسے میں نے بتایا تھا۔

منّا : ٹھیک تو پڑھا ہے!

چچا: اس طرح بولو (خود بول کر دکھاتا ہے)
نہ ملے گی مرض غم کی دوا میرے بعد
پائے گا ظلم وستم کا تو مزا میرے بعد

منّا: (بالکل اسٹیج کے قدیم اداکاروں کی طرح پڑھتا ہے)
نہ ملے گی مرض غم کی دوا میرے بعد

چچا: ہاں: یاد آئے گی تجھے میری وفا میرے بعد
اب آگے پڑھو۔

منّا: (بائیں ہاتھ میں کاغذ ہے۔ اپنا ہاتھ بلند کرکے)
کیوں تباہی لا رہا ہے اپنے عزّ و جاہ پہ
گمرہی کو چھوڑ دے، آجا سیدھی راہ پہ

چچا: پرواہ نہیں آج زمانہ خلاف ہے
رستہ وہی چلوں گا جو ٹھیک اور صاف ہے
دُکھ اور سُکھ تو ہیچ ہیں میری نگاہ میں
میں جان بھی جو دوں گا تو نیکی کی راہ میں

منّا: نیکی۔ نیکی۔ تم کیا جانو، نیکی کیا ہے

چچا: اب یہ دوسرا کاغذ لو

منّا: اب یہ دوسرا کاغذ لو

چچا: اف فوہ۔ میرے ہاتھ سے اس کاغذ کو لے کر مکالمے ادا کرو۔ نیکی ایک نور، شرافت کا غرور ہے

منّا: تمہارا یلسر، سر پُر غرور ہے

چچا: او نمک حرام، ہمارے سامنے یہ گستاخانہ کلام

منّا: نہیں چچا جان۔ یہ جملہ اس میں سے نکال دیجئے یہ آپ نہیں بولیں گے۔

چچا: بھئی کیوں نہیں بولیں گے۔ ہم نے اپنے ڈرامے گنبد قبلہ گاہ میں اسی طرح لکھا ہے۔

منّا: غلط لکھا ہے۔

چچا: کیا۔ کیا کہا۔ ہم نے غلط لکھا ہے جس کی عمر کے چالیس سال ناٹک کمپنیوں میں گزر گئے۔ آنکھ کھولی تو قلعہ، ٹاور اور پٹاخوں میں۔ اسے تم کہتے ہو غلط لکھا ہے۔ کیا بکتے ہو۔

منّا: نہیں نہیں چچا جان — وہ

چچا: میاں ایسا ہی آزمانا ہے اور ہمارے دل کو جلانا ہے تو بلا لو دوسرے ناٹک والوں کو۔

منّا: اب کہاں رہے چچا جان وہ ناٹک والے اور پھر آپ جیسے، آپ کی بات، آپ کی ادا، کس میں کہاں سے آئے گی۔

چچا: (خوش ہوتے ہوئے) ٹھیک کہتے ہو، منّا ایسا ہے دیکھو بُرا مت مانو۔ یہ تو پردہ چوتھا سین تیرا کا ڈائیلاگ ہے نا، کسی طرح ہمیں ادا کرنا ہوگا۔

منّا: جی اچھی بات ہے، فرمایئے۔

چچا: (کھنکھارتا ہے) او نمک حرام، ہمارے سامنے یہ گستاخانہ کلام۔ ہاں اب تلوار سنبھال لو۔ وہ دیکھو تخت کے نیچے ہیں تلواریں (خود بھی ایک لکڑی کی تلوار اٹھالیتا ہے جو چمک رہی ہے)

منّا: (تلوار اٹھاکر) .....
سانس سے آگ جو برساؤں تو اژدر ہوں میں
ضد میں طوفان تو غصّے میں سمندر ہوں میں

چچا: (دانت پیس کر) پیس ڈالوں گا، مٹا دوں گا، فنا کر دوں گا۔

منّا: (تلوار ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے) چچا جان، ڈر لگ رہا ہے۔

چچا: بولو بولو یہی تو اصل سین ہے۔ اب ڈر رہے ہو تو اسٹیج پہ کیسے بولوگے۔

منّا: اسٹیج سے نہیں، آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔

چچا: بکواس مت کرو جی، اٹھاؤ تلوار (منّا تلوار اٹھاتا ہے۔)

منّا: پیس ڈالوں گا۔ مٹا دوں گا۔

چچا: ہوں ہوں، یہ میرا جملہ ہے۔

منّا : جی ہاں، جی ہاں۔
چچا : پیس ڈالوں گا، مٹا دوں گا، فنا کر دوں گا۔
منّا : دل کا جوش ایسے ڈراوے سے کہیں گھٹتا ہے۔
چچا : موم سے پنجۂ فولاد کہیں مڑتا ہے۔
(کھٹا کھٹ دونوں تلواریں چلاتے ہیں)
(داہنی جانب سے چچی ہاتھ میں ترکاری کا تھیلا لیئے آتی ہے)
چچی : ارے ارے منّا، یہ تیرے چچا جان ہیں۔
منّا : نہیں، مالک جور و جفا، مجسّم دغا ہیں۔
چچی : منّا، کیا بکتا ہے، اجی سنو تم ہی رُک جاؤ۔
چچا : ہٹ جاؤ درمیان سے۔
چچی : یہ منّا ہے، اپنا منّا ہے، ہم نے اسے نازوں سے پالا ہے۔
چچا : منّا نہیں یہ وہ دشمن ہے جسے ابھی ابھی ہم نے دریا سے نکالا ہے۔
چچی : دریا سے!
منّا : آگے بڑھ او انسان ــــ
چچا : ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ، ہمارا سر نہ کھاؤ۔
چچی : اب میں کیا کروں، منّا تو ہی رُک جا۔
منّا : نہیں نہیں یہ محال ہے۔
چچی : ہائے اب کیا ہوگا، پڑوسن سے پرساد بھائی کو بلاتی ہوں (داہنی جانب گھومتی ہے)
چچا : ٹھہرو۔ رُک جاؤ ــ کہاں جاتی ہو۔
چچی : وہ پرساد بھائی۔
چچا : رُک جاؤ۔ رُک جاؤ یہ ناٹک ہے بھائی۔
چچی : ناٹک ــــ!
منّا : ہاں چچی جان۔
چچا : کیا میں اپنے منّا پر تلوار اٹھاؤں گا۔ جی جان سے نہ گزر جاؤں گا۔

منّا : لکڑی کی تلواریں ہیں چچی جان، نقلی ہیں۔
چچا : مگر مانند اصلی ہیں۔
چچی : اوہ خدا میں سمجھی ۔۔۔۔ دونوں کی جان پر بنی ہے۔
منّا : چچا جان اور میں مل کر یعنی ہم دونوں ایک ڈرامہ اسٹیج کرنے والے ہیں، ناٹک۔
چچی : ناٹک ــــ ڈرامہ؟
منّا : ہاں ہاں یہ سب اسی ناٹک کے کاغذ ہیں۔
چچی : تو میں بھی ناٹک کروں گی۔
منّا : چچی جان آپ! ناٹک!!
چچی : تو چپ رہ، کیوں جی میں ناٹک نہیں کر سکتی؟
چچا : کرتی ہو، کرتی ہو، خوب کرتی ہو، زندگی بھر تم نے ۔۔۔۔
چچی : میں نے اپنی پڑھائی کے زمانے میں ڈراموں میں بہت کام کیا ہے۔
منّا : آپ نے اسٹیج ڈراموں میں کام کیا ہے چچی جان!
چچی : ہاں بہت، بن باسی، پیا کی پیاسی۔
چچا : باسی بتاسی!
چچی : اگنی ہوتری۔ ستی ساوتری۔
چچا : چاند کا ٹکڑا
چچی : گورا مکھڑا، سب میں میں نے ہیروئن کا رول کیا ہے۔
چچا : (گردن جھکا کر) ہماری تمہاری ملاقات "چاند کے ٹکڑے" میں ہوئی تھی نا ــــ
چچی : نہیں "گورے مکھڑے" میں یہ لنگوٹی ہے۔ لنگوٹی نہیں اس کپڑے میں انگوٹھی ہے جو میرے جوہر و گوہر یعنی پیارے شوہر کی نشانی ہے۔ یہ اسی کے ڈائیلاگ ہیں۔
چچا : 'گورے مکھڑے' کے؟
چچی : نہیں، "پیا کی پیاسی" کے۔ اور سناؤں منّا ــــ سُن ــــ

؎ سینے میں دل ہے دل میں خدا کا خیال ہے
ایذا دے میرے لال کو کس کی مجال ہے

چچا : بس بس بس۔ بس کرو خدا کے لیئے بس کرو
چچی : کیوں بس کروں۔ کون سا ناٹک ہو رہا ہے یہ منّا۔
منّا : اس گھر میں تو روز ہی ناٹک ہوتا ہے۔
چچی : منّا، میں کیا پوچھ رہی ہوں۔
منّا : چچا جان کے اُستاد نے لکھا ہے۔
چچی : کیا لکھا ہے؟
چچا : (روکتا ہے) منّا
منّا : گنبد قبلہ گاہ عرف تیر نگاہ
چچی : میں بھی اس ناٹک میں کام کروں گی.....
ابھی اندر جاتی ہوں۔ اور ترکاری کا تھیلا اندر رکھ کر آتی ہیں۔
(چچی تھیلا لے کر بائیں جانب چلی جاتی ہے)
چچا : گئیں ــــ!
منّا : (لمبا سانس لیتا ہے) جی ہاں گئیں اور لیجئے وہ آگئیں (چچی، بائیں جانب سے آتی ہے)
چچی : ہاں، اب بتاؤ منّا، کہاں ہے وہ ناٹک۔ اِدھر لاؤ کاغذ۔
چچا : اوہو، تم کیا کروگی۔
چچی : میں ہمیشہ ہیروئن کا رول کرتی رہی ہوں، اب بھی۔
منّا : ہیروئن بنوں گی۔
چچی : میرا منّا کتنا اچھا ہے۔
چچا : اب کیا کریں۔ منّا ذرا اِدھر آؤ (آگے بڑھتا ہے)
منّا : یہیں بتایئے کیا بات ہے، میں اُدھر نہیں آتا ــــ
چچا : ایسا ہے بھئی، تمہاری چچی جان کو۔
منّا : بنا دیجئے ہیروئن چچی جان کو، اتنی پرانی، تجربہ کار ہیروئن کہاں ملے گی آپ کو۔

چچی : جیتا رہ میرا منّا ــ لے سنو، تم مجھے ہیروئن بناتے ہو یا نہیں۔
چچا : بھئی وہ بات ایسی ہے۔
چچی : بات وات کچھ نہیں۔
چچا : منّا وفا وفا بنو۔ ہمارے ساتھ دغا نہ کرو۔
چچی : منّا۔
منّا : چچا جان وہ ــ اندر ــــ اور اندر۔
چچا : کیا! ہاں، ہاں، ہاں۔
چچی : کیا بات ہے جی۔
چچا : منّا تمہاری چچی جان کو، ہیروئن بنا دیں گے۔
منّا : ہیروئن بنا دیں گے۔ اپنے ڈرامے کی؟
چچا : ہاں گنبد قبلہ گاہ کی۔
چچی : کہو تیر نگاہ کی۔
چچا : ہاں ہاں وہی تو کہہ رہا ہوں۔ منّا تمہاری چچی جان، اب اس ڈرامہ کی ہیروئن ہوں گی، کوئی اور بالکل نہیں ہو سکتا۔
منّا : ہو سکتی، کہیئے۔
چچا : ہاں ہاں میرا مطلب ہے، کوئی اور قیامت تک نہیں ہو سکتا، میرا مطلب ہے ہو سکتی۔ مگر...
منّا : مگر
چچی : مگر
چچا : ایک شرط ہے۔
چچی : شرط؟
منّا : وہ کیا چچا جان۔
چچا : بھئی ایسا ہے ڈرامہ ہوگا تو کچھ خرچ بھی تو آئیگا۔ اسٹیج ہے، ہال ہے، ساز و سامان ہے، میک اپ ہے، کپڑے، ڈریسنگ وریسنگ ہاں وہ کہاں سے آئے گا۔
منّا : آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔

چچا : کیسے فکر نہ کریں، میری تو جان جا رہی ہے۔
منّا : اوہو۔ چچی جان فینانس کریں گی۔
چچی : کیا کریں گی۔؟
چچا : کہتا ہے، آپ فکر کیوں کرتے ہیں پیسہ تم لگاؤ گی۔ سرمایہ۔
چچی : سرمایہ میں لگاؤں گی؟
چچا : ہاں، ہاں سارا خرچ تم اٹھاؤ گی۔
چچی : کہاں ہے منّا۔ بول کیسے اٹھاؤں گی میں سارا خرچ — نہیں!
منّا : بہت آسان ہے، وہ صندوق آپ کے زیورں کا۔
چچی : (زور سے) منّا میں تجھے کھا جاؤں گی۔ اگر میرے اس صندوق کا نام لیا تو نے۔
(آگے بڑھتی ہے)
منّا : چچا جان بچائیے۔ خرچہ تو ہوگا ہی۔
چچی : میں تیرا خون پی جاؤں گی۔ لانا وہ تلوار (نیچے پڑی ہوئی ایک تلوار اٹھاتی ہے)
منّا : (زور سے) چچا جان۔ (منّا بائیں جانب بھاگتا ہے)۔ (چچی منّا کے پیچھے لپکتی ہے۔)
(پردہ گرتا ہے)

○

غزلیں

رشید عبدالسمیع جلیل

بیوی سے لڑ کے آج بہت آبدیدہ ہوں — میکے چلی گئی ہے تو برگِ چکیدہ ہوں

ق

آنکھوں سے اٹھ رہا ہے دھواں انتظار میں — اب کیا بتاؤں آپ کو کتنا تپیدہ ہوں
ملتا ہے زندگی کا مزہ رات بھر مجھے — پل پل کھجا رہا ہوں کہ کھٹمل گزیدہ ہوں
پھرتا ہوں سوٹ بوٹ میں سڑکوں پہ رات دن — گھر والی جانتی ہے کہ بہنیں دریدہ ہوں
دل میں ہے چاند، آنکھ میں تارے، لبوں پہ آہ — سہلا رہا ہوں گال کہ تھپڑ رسیدہ ہوں
رومانس چل رہا ہے کئی دن سے اک جگہ — احباب یہ نہ سوچیں کہ ان سے کشیدہ ہوں

پیشہ ہے اپنا پبلسٹی شہر میں جلیل
جھاڑو ہے عرفِ عام مقامی جریدہ ہوں

پاگل عادل آبادی

ناک والوں کو گھورتا کیا ہے — ابے نکٹے تجھے ہوا کیا ہے
نام "گل خاں" ہے پر نہیں معلوم — گُل ہے کیا چیز گلگلا کیا ہے
ہاتھ پر یوں تو ہے گھڑی "سی کو" — پر نہیں جانتے بجا کیا ہے
سر کے بل فاتحہ میں آؤں گا — پہلے فرمایئے پکا کیا ہے
بعد شادی کے جان جائیں گے — جھاڑو کیا چیز ہے گھڑا کیا ہے
وہ جو کرتے ہیں گڑ سے بھی پرہیز — پوچھئے ان سے گلگلا کیا ہے
ان کا گھر بھی ہے ایر کنڈیشنڈ — جو نہیں جانتے ہوا کیا ہے
ہو چکی جبکہ تیسری نس بندی — پھر یہ بچوں کا سلسلہ کیا ہے

جان دینی تھی دے دی پاگل نے
پنچنامے سے فائدہ کیا ہے

وجاہت علی سندیلوی

حسنِ اخلاق

آگرے کی قابل ذکر چیزیں دو ہیں۔ بیگم ظہیر کا حسنِ اخلاق اور تاج محل۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اصل چیز بیگم ظہیر کا حسنِ اخلاق ہے اور تاج محل اس کا محض سنگ مرمر میں تراشا ہوا ترجمہ لہٰذا اس کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے، اور بیگم ظہیر کے حسنِ اخلاق کی گرفت میں آجانے کے بعد تاج محل کی زیارت کرنے کا نہ حوصلہ باقی رہتا ہے اور نہ موقع! اسے میری کم بختی یا زندگی سے وابستگی کہئے کہ میرے اور اس حسنِ اخلاق کے درمیان ایک حلق میں دوا لگانے والی پھریری، ایک کھلی کھڑکی اور ایک بے تحاشا دوڑ حائل ہو چکی ہے ـــــ لیکن غالباً میں اب بھی بہت سرپٹ دوڑ رہا ہوں مجھے ذرا دم لے کر اپنی سرگزشت قاعدے سے سنانا چاہیئے۔

ظہیر میرا دوست تھا ـــــ ایسا دوست کہ جب کالج میں ہم دونوں پڑھتے اور ایک ساتھ رہتے تو بلا تکلف ایک دوسرے کی چیزیں چرایا اور چھپایا کرتے۔ اکثر مار پیٹ بھی کر لیا کرتے اور ایک دوسرے کے خلاف وارڈن سے اس قدر شکایتیں کیا کرتے کہ بالآخر تنگ آکر وارڈن نے ہم دونوں کو ایک ساتھ ہوسٹل سے نکال دیا تھا۔ میرے پریشان بالوں کی طرف لوگوں کو توجہ دلانے کے لیئے ظہیر نے میرا نام "جھبرو" رکھ چھوڑا تھا اور اس کی بے پناہ کھانے کی صلاحیتوں کو بدنام کرنے کی غرض سے میں اس کو "کھاؤ پیر" کہا کرتا۔ ظاہر ہے کہ غیر ذمّہ داری اور بے فکری کی باتیں اب پندرہ سال کے بعد جب کہ ہم دونوں زندگی کی ذمہ داریوں اور فکروں کے بوجھ سے نڈھال ہوئے جا رہے تھے کس قدر مسرت افزا اور محبت آگیں معلوم ہوتیں ـــ کہاں تو ہم دونوں ایک دوسرے کی

صورت سے بیزار اور کہاں اب ایک دوسرے سے ملنے کے لئے بڑی طرح بے چین تھے!

ظہیر آگرے میں کسی بیمہ کمپنی کا منیجر تھا اور میں سندیلے میں وکالت کرتا۔ آٹھ سال سے ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن سال میں دو چار خطوط ایک دوسرے کے پاس اس مضمون کے ضرور پہونچ جاتے کہ تم سے ملنے کے لئے بے حد بے چین ہوں۔ لیکن نہ سندیلے میں کوئی ایسا بیمہ کرانے والا مرتا جو وہ یہاں آتا اور نہ آگرہ میں کوئی ایسا قتل ہوتا جس میں وکیل ہو کر میں وہاں جاتا۔ نتیجہ یہ کہ میں سندیلے میں مچھر اور وہ آگرے میں مکھیاں مارتا اور ہم دونوں کے درمیان تین سو میل لمبی ریل کی پٹریاں مستقلاً حائل تھیں۔

سُنا ہے کہ گیدڑ کی جب شامت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف رُخ کرتا ہے۔ غالباً اسی طرح میرے دل میں نہیں معلوم کیوں ایک ہُوک سی اٹھی اور میں پارسال ہولی کی چھٹیوں میں آگرے کے لئے چل پڑا۔

ظہیر اور بیگم ظہیر کو میری آمد کی پہلے ہی سے اطلاع تھی لہٰذا قبل اس کے کہ میری ٹرین آگرہ اسٹیشن پر رُکے انھوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر اور منہ بنا بنا کر میرا استقبال شروع کر دیا۔ ٹرین اچھی طرح رُکنے بھی نہیں پائی تھی کہ ظہیر میرے ڈبے میں گھس آئے اور وفورِ محبت سے لپٹ گئے، دوسرے مسافروں نے بڑی مشکل سے ہم دونوں کو دھکے دے کر ڈبے سے باہر نکالا۔ پلیٹ فارم پر بیگم ظہیر پہلے ہی سے خیر مقدم اور حسنِ اخلاق کا مجسمہ بنی ہوئی کھڑی تھیں ہنستی ہوئی آگے بڑھیں "ہَو، ہَو۔ آپ آ گئے، ہَو، ہَو آپ آ گئے"۔ انتہائی نسوانی وقار اور نزاکت سے انھوں نے ہاتھ ملایا اور ہمدردانہ لہجے میں فرمانے لگیں "ہو، ہو، آپ چہرے سے بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہَو، شاید رات بھر نیند نہیں آئی۔ ہَو ہَو" پھر ایک دم سے وہ ظہیر کی طرف مڑ گئیں۔ "ظہیر تمہارے جھبڑو بھائی کی طبیعت سست ہے کیوں نہ ہم گھر چلتے ہوئے انھیں، ڈاکٹر کو بھی دکھا دیں۔

"بیشک، بیشک" ظہیر نے اپنی ایک ٹانگ ٹیڑھی کر کے اس پر اپنا بید مارتے ہوئے کہا۔

مجھے ظہیر پر بے حد غصہ آ رہا تھا کہ اس نے میرا طالب علمی کا غیر مہذب نام بیگم ظہیر جیسی مہذب خاتون کو بھی بتا دیا تھا، لیکن خیر شکایت کرنے کا یہ موقع کیا ہو سکتا، لہٰذا میں نے اپنے چہرے پر ایک تندرست مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا "نہیں، نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تھوڑا سا تکان ہے وہ جاتا رہے گا۔

"نہیں، ہَو، ہَو، آپ زرد ہو رہے ہیں۔ ہَو ہَو بے خوابی کا اگر فوراً تدارک نہ کیا گیا تو ـــ ہَو، ہَو۔ دیکھو ظہیر تم کو بھی تو ایک دفعہ ہو گئی تھی پھر کیسی کیسی زحمتیں اٹھانا پڑی تھیں۔ ہَو۔ ہَو۔

"بیشک۔ بیشک" ظہیر نے پاس ہی ایک کھمبے پر چائے کا ایک اشتہار پڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے احتجاج کیا "نہیں، مجھے بے خوابی کی شکایت نہیں ہے، میں تو خوب سوتا ہوں، بس یونہی ریل میں بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا گئی تھوڑا چلوں پھروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا۔

"تو ڈاکٹر کو دکھا لینے میں آپ کا کیا نقصان ہے۔ ہَو ہَو" بیگم ظہیر نے کچھ اس لہجے میں کہا جیسے انھیں اندیشہ ہو کہ میں دل ہی دل میں خودکشی کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔

"مجھے ڈاکٹر کے یہاں نہ لے جائیے" میں نے بچوں جیسی لجاجت سے کہا۔

ہَو، ہَو ۔ آپ تکلف کر رہے ہیں ۔ ڈاکٹر کا مطب تو راستے ہی میں پڑتا ہے ۔ آیئے ۔ آیئے
ہَو، ہَو "

میں نہیں بتاؤں گا کہ اس وقت میں کیا سوچ رہا تھا ۔ بہرکیف، بیگم ظہیر کی قیادت میں ظہیر کے ساتھ میں موٹر میں بیٹھ گیا اور ڈرائیور کو حکم دے دیا گیا " ڈاکٹر چترویدی، سرکٹ روڈ " ڈاکٹر کے مطب کا سائن بورڈ دیکھ کر دفعتاً مجھے اپنا بستر اور سوٹ کیس یاد آ گیا اور میں یک دم ظہیر اور بیگم ظہیر کے درمیان اچھل پڑا " میرا اسباب بستر اور سوٹ کیس ۔۔ ڈبے ہی میں رہ گیا ۔ ! "

بیگم ظہیر نے شاید سمجھا کہ میں ڈاکٹر کے سامنے نہ جانے کا کوئی بہانہ تراش رہا ہوں ۔

" ہَو ۔ ہَو ۔ آپ کا اسباب رہ گیا ! ڈبے میں، ریل کے ڈبے میں "

" جی ہاں میں صحیح عرض کر رہا ہوں "

" ہَو ۔ ہَو ۔ تو ریل شاید کھڑی ہوا بھی ۔ سامان مل جائے گا "

" تو بس گھموایئے جلدی سے موٹر ۔ جلدی کی ضرورت ہے " میں کافی پریشان اور وحشت زدہ تھا ۔

ہَو ۔ ہَو ۔ تو آیئے میں آپ کو ڈاکٹر کو دکھا دوں ۔ ظہیر جا کر آپ کا اسباب لے آئیں گے ۔

" خدا کے لیئے مجھے بھی جانے دیجئے ۔ مجھے بے خوابی بالکل نہیں ہے ۔ میں ڈاکٹر کو ہرگز نہیں دکھاؤں گا ۔ میرا بستر اور سوٹ کیس چلا جائے گا ! "

ہَو ۔ ہَو ۔ آپ بہت تھک گئے ہیں ۔ مسٹر جھبٹرو آپ کی یہ پریشانی بے خوابی کی وجہ سے ہے ۔ آیئے آپ ڈاکٹر کو دکھلایئے ۔ ظہیر آپ کا اسباب لے آئیں گے ۔ ہَو ۔ ہَو ۔

میں نے اس بحث کو طول دینا نہیں چاہا ۔ وقت کم تھا اور میرے سامان ہی میں میری عزت اور آبرو لپٹی ہوئی تھی ۔ چنانچہ خون کا گھونٹ پی کر رہ گیا ۔ میں غصہ سے کانپ رہا تھا لیکن نے خلاف توقع بہت ضبط کیا اور بیگم ظہیر کے ساتھ موٹر سے اُتر آیا لیکن ظہیر سے چیخ کر کہا :

" بس جلدی جاؤ، گاڑی چھوٹ چکی ہو تو تار دے دینا "

بے شک، بے شک " ظہیر موٹر پر اسٹیشن چلدیئے اور میں بیگم ظہیر کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر چترویدی کے حضور میں آداب بجا لایا ۔

ڈاکٹر چترویدی کو دنیا میں اگر کسی چیز سے تشبیہ دی جاسکتی تھی تو ایک موٹے سے اُلّو سے ۔ کافی فربہ اندام ہونے کے باوجود کرسی پر اکڑوں بیٹھے تھے ۔ ٹھڈّی دور تک اندر دھنسی ہوئی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بالکل ہی غائب تھی ۔ آنکھیں قریب قریب اور بالکل گول تھیں اور ان پر عینک چڑھی ہوئی تھی، ماتھا یا تو تھا ہی نہیں ۔ اور اگر تھا تو نظر نہیں آتا ۔ کیونکہ اس پر بال بکھرے ہوئے تھے ۔ مطب کا کمرہ گرد آلود تھا اور اس میں اِدھر اُدھر کرسیاں، کتابیں، اخبارات اور مریض بکھرے ہوئے تھے ۔ ہم لوگوں کو دیکھتے ہی ان ڈاکٹر صاحب نے پُر خلوص اخلاق " برتا ۔ " آیئے، آیئے بیگم ظہیر صاحب " بیگم ظہیر نے مجھے آگے کرتے ہوئے کہا " ذرا مریض کو دیکھ لیجئے " ڈاکٹر صاحب ۔ ہَو ۔ ہَو "

"اچھا - اچھا آئیے۔"

میں آگے بڑھ کر ان کے قریب کرسی پر بیٹھ گیا اور ڈاکٹر صاحب نے شاید یہ سمجھ کر کہ جب کوئی ہٹا کٹا مریض مطب میں آتا ہے تو لازماً کسی مہلک ہی مرض میں مبتلا ہوتا ہے۔ مجھ سے کچھ پوچھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر میری نبض ٹٹولنے لگے۔ بیگم ظہیر از راہِ حسنِ اخلاق میرے پاس ہی کھڑی تھیں۔ ممکن ہے کہ انھیں احتمال ہو کہ کہیں میں ڈاکٹر کے پنجوں سے اپنی کلائی چھڑا کر بھاگ نہ جاؤں "بے خوابی ہے ان کو"۔ انھوں نے فرمایا "منہ کھولو" ڈاکٹر نے اپنی صورت اور زیادہ وحشت ناک بناتے ہوئے کہا اور اب ان کے واقعی اُلّو ہونے میں مجھے کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ میں نے مُنہ کھول دیا۔

"آ - آ - کرو"

میں نے ہَوَ - ہَوَ کیا"

"حلق خراب ہے" ڈاکٹر نے منہ بنا کر کہا۔ بیگم ظہیر کھنکھاریں، گویا انھوں نے میرے خلاف پہلی باونڈری لگادی۔ ڈاکٹر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھورنے لگا پھر ایک دم سے بغیر کچھ اطلاع دیئے ہوئے اس نے اپنی دو انگلیاں میری دونوں آنکھوں کی طرف بڑھادیں۔ میں نے پہلے تو اپنی آنکھیں بند کرلیں، لیکن جب ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے پپوٹے کھینچے تو میں ... انھیں کھولنے پر مجبور ہوگیا۔ "خون کی کمی ہے۔" ڈاکٹر نے اپنا دوسرا فیصلہ صادر فرمایا۔ میں بیگم ظہیر کا چہرہ تو نہیں دیکھ رہا تھا لیکن میں انتہائی وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اس وقت منہ پر رومال رکھے ہنس رہی تھیں۔ یہ ان کی دوسری باونڈری تھی۔

"قبض ہے؟"

"بالکل نہیں۔"

"ہاضمہ کیسا ہے؟"

"انتہائی قابلِ رشک۔"

"جگر کی کوئی شکایت؟"

"مجھے آج تک اس کے وجود ہی کا علم نہیں ہوا"

"آنکھوں سے پانی نکلتا ہے؟"

"کبھی نہیں، ایک دم خشک رہتی ہیں۔"

"نیند نہیں آتی؟"

"خوب آتی ہے۔ گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں۔"

"کتنے گھنٹے سوتے ہیں؟"

"دس یا گیارہ گھنٹے، اور کبھی کبھی بارہ یا تیرہ گھنٹے۔" میں نے اپنی جان کے تحفظ کے لئے مبالغے سے کام لیا۔"

"اوہو، یہ تو ٹھیک نہیں۔"

"کل رات ان کو ریل میں بالکل نیند نہیں آئی۔" بیگم ظہیر بول اٹھیں۔

"خشکی ہے دماغ میں" ڈاکٹر نے اپنا تیسرا فیصلہ سنایا۔ اور اب مجھے بیگم ظہیر کی "ہو۔ ہو" بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ ان کی تیسری باونڈری تھی۔

میری قوتِ مدافعت جواب دے چکی تھی چنانچہ میں نے اپنے آپ کو بالکل ہی ڈاکٹر کی تشخیص اور بیگم ظہیر کے "حُسنِ اخلاق" پر چھوڑ دیا۔ انھوں نے اپنی منحوس پیشین گوئیوں اور خطرناک قیاس آرائیوں کے درمیان مجھے والی بال کی طرح اچھالنا شروع کر دیا اور میں ان کی باتیں اس بے تعلقی سے سن رہا تھا جیسے وہ کسی ایسے شخص کے متعلق ہوں جس سے مجھے دُور کا واسطہ نہ ہو۔ ڈاکٹر نے میرے دل پر آلہ لگا کر کہا "دھڑک رہا ہے"۔

میں نے کہا "شاید"

"کیا ہمیشہ ایسے ہی دھڑکتا ہے ؟"

"نہیں! عام طور سے تو بالکل ساکت رہتا ہے"۔

"اِس وقت کیا خاص بات ہے؟"

"میرا بستر اور سوٹ کیس کھو گیا ہے"۔

قصہ مختصر ڈاکٹر اور بیگم ظہیر کی مشترکہ کوششوں سے تجویز کیا گیا کہ میری حلق خراب ہے۔ جسم میں خون کی کمی ہے، دماغ میں خشکی اور دل میں دھڑکن ہے۔ اعصاب میں ہیجان ہے اور جنرل بریک ڈاؤن کا اندیشہ ہے ان حالات کے ماتحت مجھے گردن توڑ بخار اور بلڈ پریشر کی بیماری بہت آسانی سے ہو سکتی ہے۔ ٹائیفائیڈ میرے تعاقب میں اور ذیابطیس میرے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میرے متعلق ایک زبردست قسم کا نسخہ لکھا گیا ہے جس میں ایک دوا پینے کی اور ایک دوا کھانے کی اور ایک حلق میں لگانے کی تھی اور مجھے ہدایت کی گئی کہ صرف یخنی اور پھلوں کا عرق پیوں اور کم از کم چوبیس گھنٹے بستر پر خاموش لیٹا رہوں۔ میں ڈاکٹر کے یہاں سے چلا تو مری ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ بیگم ظہیر قریب ہی کی دوکان سے نسخہ بندھوانے چلی گئیں اور میں فٹ پاتھ پر کھڑا ہو کر اپنے اسباب کے ساتھ ہی ساتھ اپنی زندگی سے مایوس ہو کر مرزا غالبؔ کا یہ شعر گنگنانے لگا ؎

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نااُمیدی اس کی دیکھا چاہیئے

ظہیر واپس آئے تو صرف میرا سوٹ کیس لائے۔ بستر وہ پہچان نہیں پائے۔ اس وقت مجھے یہ بھی یاد آیا کہ بستر کے پاس ہی میرا لوٹا اور ناشتہ دان بھی رکھا تھا ...... لیکن خیر اس وقت جب کہ جان کے لالے پڑے تھے اِن باتوں کا کیا ذکر ؟

بیگم ظہیر دوائیں لے آئیں تو ہم لوگ گھر چلے۔ بیگم ظہیر جب ظہیر کو مری بیماریوں کی فہرست گنوا چکیں تو میں نے حسرت آمیز لہجے میں ظہیر سے کہا "بھائی میں گھر جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے جانبر ہونے کی امید نہیں ہے۔"

"بے شک، بے شک، لیکن اس حالت میں جاؤ گے کیسے ؟"

"میں یہاں مروں گا تو تاج محل میں تو دفن ہونے سے رہا۔ پھر اپنے وطن ہی میں کیوں نہ مروں؟"

"ہو۔ ہو۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ہم لوگ آخر کس لیئے ہیں۔ سب انتظام ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو ہو تاج محل"

مجھے اطمینان ہوگیا کہ اب میں تاج محل ہی میں دفن کیا جاؤں گا۔
میں چوبیس گھنٹے کیا چوبیس برس ایک کمرے میں بند اور بستر پر انتہائی اضطراب اور بے چینی سے لوٹنے پر مجبور رکھا گیا۔ مجھے ہر چند گھنٹوں کے بعد یخنی اور کھٹّے سنتروں کا عرق پلایا جاتا رہا اور جب یہ چیزیں معدے میں اتر کر ہضم کے قریب ہوتیں تو حلق میں دوا لگا کر قے کرادی جاتی۔ میری حالت انتہائی قابلِ رحم تھی اور میں نے یقین کرلیا کہ اب میں اپنے گھر کی شکل کبھی نہیں دیکھ پاؤں گا۔ انتہائی تلخ اور بدبودار دوائیں کھاتے کھاتے اور پیتے پیتے میرا دماغ بیکار اور میری حلق ایک خارزار ہو چکی تھی۔ چند دنوں کے شائستہ رقص بستر کے بعد میں نے بھی اپنے آپ کو بے حال چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند اور زبان منہ سے باہر نکال کر کے اپنے اوپر ہذیانی کیفیت طاری کرلی اور ہاتھ پیر پٹخ پٹخ کر "ہو۔ ہو" چیخنے لگا۔ بیگم ظہیر "ہو۔ ہو" کرتی پروانہ وار میرے پلنگ کا طواف کرتیں اور "بیشک۔ بیشک" کرتے، ظہیر ان کے پیچھے ہوتے اور بار بار میرے سر پر برف کی تھیلی ٹھیک کرتے رہتے۔ مجھے نہیں پتا میری یہ حالت کتنے دنوں رہی۔
ڈاکٹر چتر ویدی مجھے دیکھنے بلاناغہ صبح و شام آتے اور اپنے نسخوں میں جلد از جلد ترمیمات کر کے میری حالت بد سے بدتر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ ایک روز وہ مجھے تنہا مل گئے اور میں دانت کٹکٹا کر ان پر چیخا۔ "ارے او کمبخت ناشدنی تجھے کس گدھے نے ڈاکٹری کی ڈگری پکڑادی ہے۔ میں مرا جارہا ہوں بھوک سے، خدا کے واسطے مجھ پر رحم کر اور مجھے کچھ کھانے کو دے۔ جانتا ہے کہ میں کون ہوں، وکیل ہوں وکیل، مقدمہ چلادوں گا اقدامِ قتل کا۔"
ڈاکٹر نے سر ہلایا اور سامنے والی دیوار سے کہنے لگا "واقعی دماغ پر خشکی بہت ہے۔" میں نے سمجھ لیا کہ ایسے کام نہیں چلے گا۔ لہٰذا میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "خدا کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔
ڈاکٹر صاحب، میرے چھوٹے چھوٹے بچے اور موٹے موٹے موکل ہیں ان کا ہی کچھ خیال کیجئے۔ میں زندگی بھر آپ کا احسان مند رہوں گا۔ یہ حلق کی دوا بند کرائیے اور مجھے کچھ کھانے کو دلوائیے میں بالکل اچھا ہوں۔ صرف بھوک نے بُرا حال کر دیا ہے میں مرجاؤں تو میرا ذمّہ۔"
ڈاکٹر کا دل شاید کچھ پسیجنے ہی والا تھا کہ بیگم ظہیر آگئیں "ہو۔ ہو۔ ڈاکٹر صاحب مریض کیا کہہ رہا ہے۔"
"کچھ نہیں، کہتا ہے کہ بھوکا بہت ہے۔"
"ہو۔ ہو۔ بس یخنی تیار ہی ہوئی جارہی ہے اس وقت اسی کے پلانے کا وقت ہے۔"
"میرے مرنے کا وقت ہے۔" مجھے نہیں معلوم یہ الفاظ میرے منہ سے کیسے نکل گئے۔
"تیمار داری کی سخت ضرورت ہے۔" ڈاکٹر نے کہا اور فیس جیب میں ڈال کر چلتا بنا۔
"ہو۔ ہو۔ آپ بے فکر رہیں، تیمار داری میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہو۔ ہو۔ مہمان کی تیمار داری ہمارا اخلاقی فرض ہے ـــ اخلاق کا تقاضا ہے کہ ـــ ہو۔ ہو۔"
اخلاق کی اس بے پایاں فضا میں دفعتاً مجھے بداخلاقی کا ایک مجسمہ نظر آیا اور میں نے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سمجھ کر اسے اپنی آخری امید کا مرکز بنالیا۔ گھر کا ملازم پیر بخش نہایت بداخلاقی سے

جھاڑو لیئے میرے کمرے کی چیزیں صاف کر رہا تھا اور کافی گرد میری طرف اُڑا رہا تھا۔ میں ایک دم سے اُٹھ کر اس کے سامنے سائل بن کر سجدہ ریز ہوگیا۔ " پیر بخش اب تم ہی میرے پیر بنو اور مجھے بخشوالو یہ دس روپے کا نوٹ اور مجھے باورچی خانہ میں جو کچھ بھی رکھا ہو کھانے کو لادو۔ میں بھوک سے مرا جارہا تھا۔"

پیر بخش آدمی سمجھدار ثابت ہوا اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا اور نہایت احتیاط سے نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ چلتے وقت اس کے مُنہ سے صرف یہ الفاظ نکلے۔" رات کو نو بجے کے بعد"

"اس دن رات بڑی مشکل سے ہوئی، اور نو بجنے میں تو واقعی نو دہے لگ گئے خیر خدا خدا کرکے رات ہوئی، نو بجے اور گھر میں سناٹا چھاگیا ــــــ میرا انتظار مایوسی میں تحلیل ہونے لگا تھا کہ دفعتاً ؎

تاج زریں مہ تاباں سے سوا
خسرو آفاق کے مُنہ پر کھُلا

دروازہ کھُلا اور دبے پاؤں ایک کشتی کاندھے پر اُٹھائے پیر بخش طلوع ہوا۔ میں نے جلدی سے لپک کر اس کا پُرجوش استقبال کیا۔ بے اختیار جی چاہتا کہ لپٹ کر اس کی بلائیں لے لوں۔ لیکن فی الحال میں نے اس کے ہاتھوں سے کشتی ہی لے لینے پر اکتفا کی۔ دروازہ انتہائی احتیاط سے بند کر دیا گیا اور میں فرش ہی پر بیٹھ کر من وسلویٰ کو پلیٹوں سے اپنے قحط زدہ معدے میں منتقل کرنے لگا۔ اگر بیگم ظہیر کا حسن اخلاق ضرب المثل تھا تو پیر بخش کا حسن انتخاب بھی قابل رشک تھا۔ ایک کشتی کی چند پلیٹوں میں اس نے ساری خدائی کی نعمتوں کا نچوڑ لاکر رکھ دیا تھا۔ میں نے بھی پینترے بدل بدل کر خوب کھایا لیکن آخر میں یہ کیفیت ہوئی کہ

ع ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے

یعنی کھانا ختم ہوگیا۔ پیر بخش پلیٹیں اور کشتی لے کر چلا بھی گیا اور بھوک باقی رہ گئی تاہم کچھ غم نہیں تھا۔ معدے میں کافی چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی ہوچکی تھی ــــــ اور پھر دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی اور بیگم ظہیر نازل ہوگئیں۔

" ہو۔ ہو۔ آپ جاگ رہے ہیں ؟ بے خوابی! بڑا غضب ہوگیا میں آج شام کو آپ کے حلق میں دوا لگانا بھول گئی۔ میں نے کہا چلو اب لگا آؤں۔ ہو۔ ہو۔ معاف کیجئے گا۔"

مجھے وہ تمام چیزیں یاد آئیں جو ابھی ابھی میرے معدے میں پہونچی تھیں اور اب واپس آنے والی تھیں۔ میں نے عرصہ ہوا یہ اچھی طرح جان لیا تھا کہ کسی معاملے میں بیگم ظہیر سے انکار یا تکلف کرنا اپنے آپ کو ایک سعیٔ لاحاصل میں ہلکان اور پریشان کرنے کے مترادف ہے۔ وہ جو کچھ چاہتیں یا یوں کہنا چاہیئے کہ ان کے حسنِ اخلاق کا جو تقاضہ ہوتا وہ کرا ضرور لیتا۔ ہر "نہیں" کو وہ "ہاں" سمجھتیں۔

میں نے اپنی آواز کو انتہائی نحیف اور مایوس کن بناتے ہوئے کہا۔" اب اِس وقت ؟ جانے دیجئے۔ سویرے لگ جائے گی دوا"

" ہو۔ ہو۔ رات ہی کو تو یہ دوا فائیدہ کرتی ہے، ہو، ہو۔ مُنہ کھولیئے" بیگم ظہیر نے ایک

موٹی سی چھریری میری ناک کے سامنے نچاتے ہوئے کہا۔

میں نے سمجھ لیا کہ اب میرا آخری وقت سر ہی پہ آ پہونچا ہے۔ جان سے بھی جاؤں گا اور چوری بھی کھل جائیگی چھریری میرے ہونٹوں کے قریب پہونچ چکی تھی اور میرا منہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ دفعتاً میں نے بیگم ظہیر کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا۔ ذرا کلی کرنے کے لیئے پانی لے لیجئے گا"

مجھے اپنا حسن اخلاق دکھانے کا یہ پہلا اور آخری موقع تھا!

بیگم ظہیر گلاس میں پانی لے کر پلٹیں تو میں کمرے کی کھلی ہوئی کھڑکی سے باہر پھاند چکا تھا۔

"ہٹو۔ ہٹو۔ مسٹر جھبٹرو!" بیگم ظہیر چیخیں۔

میں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ رہا تھا ـــــ اور میرا یہ بھاگنا آج بھی جاری ہے۔ مجھے کسی شخص میں بھی "حسن اخلاق" کا شائبہ بھی نظر آتا ہے تو میں فوراً سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا ہوں۔ میرے انتقال کے بعد بھی آپ بیگم ظہیر کا نام بھی لے لیجئے گا تو دیکھئے گا ع

ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

■■

دل بدلو

مقرب حسین مقرب

پہلے کچھ نعرے لگے جئے جئے ہوئی بھاشن ہوا
ایک دل بدلو نے پھر اوروں کو دل بدلو کہا

اور تھوڑے فاصلے پر چر رہا تھا اک گدھا
دل بدل کا ذکر سن کر وہ بھی کچھ ہنسنے لگا

عرض کی میں نے کہ اے اہلِ خرد، عالی مقام
اس طرح تقریر پر نیتا کی کیا ہنسنے کا کام

میں نے دیکھا ہے کہ ایسا آپ تو کرتے نہیں
آپ تو سنجیدہ کافی ہیں کبھی ہنستے نہیں

سن کے کچھ تعریف اپنی وہ گدھا کہنے لگا
دل بدل کا ذکر تھا اس واسطے ہنسنے لگا

دل بدل پر نکتہ چینی، میں نہیں کرتا پسند
دل بدل کرتے ہیں جو اپنے ہی ہیں سب بھائی بند

دل بدل ہے وہ دوا، کڑوی بھی ہے میٹھی بھی ہے
ہے بری اس کے لئے اُس کے لئے اچھی بھی ہے

دل بدل گر ہو مخالف تو وہ ہوتا ہے بُرا
ہو اگر اپنے لئے تو آتما کی ہے صدا

دل بدل کو کوسنے والے یہ سوچیں تو ذرا
دل بدل ہی نے انھیں بھی کرسیاں کی تھیں عطا

دل بدل ہی نے فقیروں کو بنا ڈالا امیر
دل بدل نے کتنے چوروں کو بنایا تھا وزیر

دل بدل کے بعد بھی ہوتی ہے اکثر واہ واہ
دل بدل ہے ایسا صابن جس سے دھلتے ہیں گناہ

دل بدل کرنے سے کتنی دیش میں عزت ہوئی
ریلوے کے پل اڑانا دیش کی خدمت ہوئی

دل بدل نے دامنوں کو مال و زر سے بھر دیا
دل بدل نے کتنی تقدیروں کو روشن کر دیا

دل بدل کے اس لئے بڑھتے گئے ہیں قافلے
دل بدل سے کم کئے ہیں کرسیوں کے فاصلے

مجھ کو بھاتی ہی نہیں دل بدلوؤں کی یہ ادا
دوسرا گر دل بدل کر لے تو لگتا ہے برا

اس گھڑی سواگت ہوئے جب دوسرے آنے لگے
ہوش میں کب آئے جب سب چھوڑ کر جانے لگے

جوش میں جب آئے مرغے، مرغیاں جاتی رہیں
ہائے کب نیندیں اڑیں جب کرسیاں جاتی رہیں

آج تک مجھ کو نہ کوئی سورما ایسا دکھا
اپنے شاسن کال میں جو دل بدل کو روکتا

کیا مرے جینے کا یہ بھی ٹھیک سا پہلو نہیں
آج نیتا کون ایسا ہے جو دل بدلو نہیں

آنے جانے کا یونہی چلتا رہے گا سلسلہ
دل بدل کا رات دن بڑھتا رہے گا قافلہ

دل بدل ایسا نشہ ہے جس میں رہتا ہے سرور
دل بدل سے کچھ گدھوں کو چانس ملتا ہے ضرور

دل بدل کا پیڑ ایسے ہی سدا پھلتا رہے
اے گدھو کوشش کرو یہ دل بدل چلتا رہے

جتنے اندھے ہیں وہ سب دیدار کی باتیں کریں
اور لنگڑے شوخیِ رفتار کی باتیں کریں
گونگے عاشق تیزیِ گفتار کی باتیں کریں
مارے گنجے گیسوئے خمدار کی باتیں کریں
چار عیبی مل کے حسن یار کی باتیں کریں

چل پڑے اک بار تو رکتی نہیں ان کی زباں
ہم ہیں ایسے، ہم ہیں ویسے، ہم فلاں ابن فلاں
ڈال دیں چکر میں اس کو ہوں یہ جس پر مہرباں
پان کلے ہیں دبائے آج کل کے نوجواں
جیب میں دھیلہ نہیں کلدار کی باتیں کریں

رات بیتی جا رہی ہے وہ نہ آیا بام پر
سو گیا ہوگا کہیں وہ شوخ لمبی تان کر
سردیوں کی رات ہے ہمدم نہ جائیں ہم ٹھٹھر
پاس میں موزے ہیں اپنے اور نہ مفلر سوئیٹر
آؤ مل کے حسن شعلہ بار کی باتیں کریں

فیاض افسوس، اکولہ

گلی میں ان کی ڈیلی آپ یوں گر ٹاپ کھائیں گے
یقیناً ان کے بھیا سے کسی دن پٹ ہی جائیں گے
طبیعت کی یہ رنگینی کسی دن رنگ لائے گی
تمہارے یہ برے لچھن کسی دن گل کھلائیں گے
ہم، اہل بزم، اردو کو مقام اونچا دلائیں گے
ہمارے حوصلے اک دن ہمارے کام آئیں گے
اگر مسکا ذرا سا باس کو ماریں تو بیڑا پار
پرموشن چند دنوں میں ہی یقیناً آپ پائیں گے
یہ لمبے بال، ہپّی ٹائپ کے بھی کارآمد ہیں
سراج! اب ہم نقل کی چٹھیاں ان میں چھپائیں گے

سراج نرملی

گلیم میدکی

چلتی تھی زباں پہلے اب تو ہاتھ چلتا ہے
دیکھئے نتیجہ پھر آگے کیا نکلتا ہے
دشمنی ہے کیوں تم کو اس حقیر مچھر سے
جو غریب بیچارا بلدیہ میں پلتا ہے
کیا تمیز جنور کو اپنے اور پرائے کی
گھاس ہری کسی کی ہو دیکھ کر مچلتا ہے
ایک حسین کہتی تھی اپنے بوڑھے عاشق سے
جلد کیجئے شاپنگ آفتاب ڈھلتا ہے

خواہشوں کا نوشہ کی لے کے آسرا سمدھی
پیار کے سہارے میں عمدگی سے جھلتا ہے
قوم کٹ کے مرتی ہے ملک ادھاڑ ہوتا ہے
زہر فرقہ داری کا سانپ جب اوگلتا ہے
وہ نقاب چہرے سے اس طرح ہٹاتے ہیں
جیسے چاند بادل کو چیر کر نکلتا ہے
حق کی بات کہنا بھی جرم ہے زمانے میں
تو گلیم آنکھوں میں خار بن کے سلتا ہے

بُرہان حسین

اگر فردوس بر روئے زمین است

دلہن والے لاکھ سمجھا رہے تھے کہ جڑادی لپھا دینے کی بات نہیں ہوتی تھی لیکن بڑی خالہ اڑ گئیں "تو لپھا تو شادی" دونوں طرف کے لوگ حیران تھے کہ یہ بڑی بی کون ہیں۔ دولہن والوں کو راضی ہونا پڑا۔ تب کہیں بات کھلی کہ بڑی خالہ غلطی سے غلط شادی خانہ میں چلی گئی تھیں اور یہ کہ ان کے نواسے کی شادی پاز کے شادی خانہ میں تھی۔ خالہ بولیں۔ چلو اپنی غلطی سے ۱۵ کو جڑادی لپھا تو ملا یے چار بچے دعا ہی دیں گے۔

شادی میں پھندنی بیگم نے اپنی لڑکیوں زرینہ اور ریشماں کا تعارف بڑی خالہ سے کرادیا۔ بڑی خالہ کی تجربہ کار نظروں نے تاڑ لیا کہ زرینہ کی مالی حالت ٹھیک نہیں ہے انہوں نے پھندنی بیگم سے پوچھا کہ

" ان کے شوہر کیا کرتے ہیں۔ بچے کتنے ہیں۔؟"

پھندنی بیگم نے کہا۔" ریشماں کے شوہر عبدالواحد ہیں اور زرینہ کے عبدالودود' دونوں اکسائز انسپکٹر ہیں اور دونوں کو تین تین لڑکے ہیں۔

خالہ نے کہا۔" شاباش نام ایک جیسے عبدالواحد اور دوسرا آپ نے دودھو' تو یہ کیا نام لیا تھا۔

" جی عبدالودود"

" ہاں تو نام ایک جیسے' عہدے ایک ہی' بچے بھی برابر' پھر یہ ریشماں تو ریشم میں لدی ہے' زرینہ زر سے محروم کیوں ہے؟ کیا سندباد اور رہندباد والا قصہ ہے۔؟

پھندنی بیگم نے آہ بھر کر کہا۔ زرینہ کے دولہے ایماندار ہیں۔ خالہ وہ اوپر کی آمدنی کے قائل نہیں ہیں۔

خالہ نے تھوڑا مار کر کہا۔ ہائے ہائے تو کیا شادی سے پہلے کیریکٹر کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کرائی تھی؟ کیا چاند سی بچی کو برباد کردیا۔ ارے کسی بلدیہ کے سکشن افسر کو دیتے تو تم کو اس کو دونوں کو سونے میں تول دیتا تھا۔

پھندنی بیگم بولیں" قسمت خالہ قسمت۔ لوگ بولے اچھے کیریکٹر کے ہیں بس اسی میں ہم دھوکہ کھا گئے

خالہ نے چڑ کر کہا۔ تو پھر اس کو یہ تین تین پوتے کیوں ہونے دیئے؟

یہ لوگ بھی ایماندار نکلیں گے۔ دوسروں کی معصوم بچیوں کی زندگیوں کا ستیہ ناس ہوجائیگا

سب کی ہائے تجھے لگے گی بھنڈی تیری ایک غلطی
سے کتنے تمہارے زمانے سو کمی روٹیاں
چبائیں گے ۔
چھوٹی بیگم دیر سے یہ گفتگو سن رہی تھیں
تڑپ کر سامنے آگئیں پہلے اپنے پاؤ کلو کے
چندن ہار کو ہاتھوں میں پھرا کر خالہ دیکھ
سکیں پھر خالہ کو سلام کیا۔ خالہ نے جو اتنا سونا
دیکھا تو اسے سینہ سے لگا لیا اور بولیں ۔ واہ
وا ۔ جیتی رہو بیٹی خدا تیرے زیور کو انکم ٹیکس
والوں اور خیراتی فنڈ والوں سے محفوظ رکھے
تیرے میاں کیا کام کرتے ہیں ۔
چھوٹی بیگم نے کہا " خالہ! میرے میاں
کلکٹر آفس میں موت کا سرٹیفکیٹ جاری کرتے
ہیں ۔ وہ امیر بیواؤں سے روپیہ لیتے ہیں
غریب بیواؤں کو صرف چار کے پیسے لے کر
سرٹیفکیٹ دیدیتے ہیں ۔ لیکن اگر کسی دن کوئی
نہیں ملتا تو وہ دفتر کا پنسل ہی اٹھا لاتے ہیں
کہ خالی گھر جانے کی عادت نہ پڑنے پائے ۔ ؟
خالہ نے کہا ۔ پھر کیا بیٹے ۔ آدمی دفتر کھلتے
ہی تو جاتا ہے ۔ مفت کام کرنا حماقت ہے ۔ بیٹی
زرینہ! تم عبد دودھ .... توبہ کیسا
شکل نام دیکھ کے چنے کھئی .... زبان
پہ ہر چڑھتا ہی نہیں ..... "
" عبدالودود " زرینہ نے لقمہ دیا
" ہاں ہاں اس کو تم بولو ۔ حسد کرو ۔
غصہ کرو ۔ زبردستی کرو کہ وہ اپنی آمدنی بڑھائے
زرینہ بے بسی سے بولی " خالہ! وہ بولے
اگر رشوت لینے بولونگی تو مجھے طلاق دیدیں گے
خالہ سمجھیں " کیسا بزدل مرد وا ہے بھئی "

پھر کان میں بولیں " کچھ تعویز گنڈے کرنا تھا ۔
زرینہ بولی " خالہ! وہ تو وضو سے رہتے
ہیں ۔ شاہ صاحب بولے عمل نہیں ہوسکتا ۔
خالہ نے چیخ کر کہا لاحول ولا قوۃ مار دینے
کے قابل ہے کم بخت "
...... خیر ...... بیٹی اب میں سمجھ لوں گی
اسے ......
خالہ نے آہستہ آہستہ عبدالودود کا گھر
برتنوں، کپڑوں اور چیزوں سے صاف کر دیا ۔
اس کے سونے کے کمرہ میں ایک طغرہ لگا دیا گیا ۔
عبدالودود صبح اٹھ کر اس پر ہاتھ مار کر منہ پر
پھیرتا تھا ۔ ایک اتوار کو قریب سے دیکھا تو
یہ لکھا تھا ۔
" اگر رشوت اچھی نیت سے لی
جائے تو بری چیز نہیں "
عبدالودود نے لاحول پڑھی اور طغرہ کو
الٹا دیا اور خاموش ہو رہا ۔
شام کی ڈاک سے ایک لفافہ ملا اس میں
ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا ؎
اپنی تنخواہ کی ندی میں ہے پانی آدھ پاؤ
اور ہزاروں تن کی بھاری اپنی جیون کی ناؤ
عبدالودود نے دعا مانگی یا اللہ اھدنا
الصراط المستقیم ۔
تیسرے دن دفتر کی میز پر ایک کاغذ پر
لکھا تھا ؎
تعلیم بڑی چیز نہ حکمت ہے بڑی چیز
کہتے ہیں کہ اس دور میں رشوت ہے بڑی چیز
ان باتوں کا اثر عبدالودود پر خاطر خواہ
ہوا اور اس نے رشوت لینے کی ٹھان لی ۔ اب

مشکل یہ آن پڑی کہ لوگ اسے ایماندار سمجھتے تھے
وہ گھما پھرا کر رشوت مانگتا بھی تو لوگ جیب سے
دستی نکال کر سر پہ ڈال لیتے اور اسے نماز کو
چلنے کے لئے کہتے یہ حالات دیکھ کر عبدالودود نے
عبدالواحد سے کہا بڑے بھائی! اپنے اس ٹوٹ کے
محکمہ میں تو رشوت ہی نہیں ملتی۔

عبدالواحد نے کہا: خوب میاں! سنو ہمارے
محکمہ کے بارے میں ایک شعر

اگر فردوس بر روئے زمین است
ہمیں است وہمیں است وہمیں است

عبدالودود نے اپنے ساتھی و عبدالواحد اور
اس کے باپ عبدالعلی کا مشورہ قبول کرکے اپنا
تبادلہ حیدرآباد سے چالیس میل دور کے گاؤں
میں کروالیا۔

عبدالواحد، عبدالعلی اور زرینہ بڑے
خوش ہوئے اور دھن برسنے کا انتظار کرنے لگے کہ
ایک دن تار دیا عبدالودود پولیس کی حراست میں
ہے۔ عبدالواحد نے کہا "سر منڈاتے ہی اولے
برستے ہیں"

عبدالعلی نے کہا! نہیں بیٹے! اس نادان نے
معلوم ہوتا ہے تھانیدار کے سالے سے رشوت لے لی
نیا بھکاری ہے نا......!

"دو تین گاؤں پوچھتے تو حیران ہوئے کہ
عبدالودود جعلی نوٹوں کے کاروبار میں پکڑا گیا
تھا اور دراصل یہ جعلی نوٹ اسے رشوت میں
کسی نے دیئے تھے۔ عبدالودود ضمانت پر رہا
ہوا تو رونے لگا۔ عبدالعلی نے دلاسا دیا۔

ایسا ہوتا ہے بیٹے! تم تو اب سمجھ کر پانی پیاتے
ہو اور پینے والا ہی گر مر جاتا ہے۔ اب دیکھو ہمارے

ایک دوست کی ایک آنکھ ترچھی تھی مگر شوق تھا
کہ فوج میں بھرتی ہوں گے لاکھ منع کیا کہ میاں یہ آنکھ
آڑے آئے گی مگر وہ بھی گئے اور ناکام لوٹے
ہم سب دوست پرسا دینے گئے کہ یہ تو ہونا تھا
سو ہوا۔ اب کوئی اور کام کا ارادہ کرو۔

اس نے جھوم کر کہا۔ تم بے وقوف وہی پونگی
بجاتے جا رہے ہو۔ اے گدھو! ترچھی آنکھ کی تو ڈاکٹر
نے تعریف کی۔ کہ یہ خالص فوج کے کام کی چیز ہے
کہ تم ادھر دیکھتے ہو ادھر گولی نہیں چلاتے البتہ اس
میری سیدھی آنکھ پہ اعتراض کرکے REGECT
کیا۔

اس پر عبدالواحد نے کہا! برادر خورد! اپنی
اکسائز، بلدیہ، کسٹم، پولیس اور ریونیو کی نوکریاں
بھی دراصل ملٹری کی نوکریاں ہیں کہ جب تک جیو قوم
کی خدمت کرو۔ ایک بھی نشانہ چوکا کہ دشمن کی گولی
سے فوجی کی جان گئی یا اپنی نوکری گئی۔ لہذا نوکری
چلتے تک جلدی جلدی دو چار بنگلے بنا ڈالو۔

عبدالودود نے کہا " اور اگر پھنس گیا تو"
عبدالعلی نے کہا " تو بقول شاعر ؎

لے کے رشوت پھنس گیا ہے
دے کے رشوت چھوٹ جا

عبدالودود نے پھر کرکری کی۔ مگر چچا۔ یہ
حرام کے پیسے کی جائیداد کا کیا حشر ہوگا؟"

عبدالعلی نے کہا " واہ بھلا یہ بھی بتانے
کی بات ہے۔ ارے میاں! رشوت کھاؤ اور
تنخواہ جمع کرکے جائداد بناؤ۔ تب تو حلال کی
رہے گی۔

عبدالعلی نے بیان جاری رکھا " میاں دراصل
رشوت لینا بھی ایک فن ہے۔ خدا بخشے دادا مرحوم

کہ یہاں بلدیہ میں عیش کر رہے تھے اب فردوس میں عیش فرماتے
ہوں گے جہاں رہے اس قدر رشوت لی کہ لوگ اور
افسر تنگ آ گئے۔ یہ بات بادشاہ کو معلوم ہوئی تو
اس نے کمال فراست سے دادا مرحوم کو اپنے محل
میں وقت کے گھنٹے بجانے پر مقرر کر دیا۔ سب نے
بادشاہ کی عقل پر آفرین کہا کہ میاں اب اس میں
کیا رشوت لے گی کہ دس بجے تو دس گھنٹے مارو
بارہ بجے تو بارہ گھنٹے بجا دو۔

بادشاہ کا طریقہ تھا کہ وہ ہر بیوی کے پاس
رات کا ایک گھنٹہ گزارتے تھے۔ دادا مرحوم ایک
کھوسٹ، بدصورت بیگم کے پاس گئے اور اس سے
کہا کہ اگر وہ انھیں ایک اشرفی دے تو وہ آپکی
باری کا گھنٹہ دیر سے بجا سکتے ہیں اور اس طرح
بادشاہ دیر تک اس کے پاس رہے گا۔ اس نے
جھٹ ایک اشرفی دیدی۔ بس کام چل نکلا۔

چند دن کے بعد دشمنوں نے ان کی کارستانی
بادشاہ کو بتا دی۔ بادشاہ نے انھیں محل میں
طلب کیا۔ یہ رو رو کے سب سے رخصت ہو کر
گئے کہ جان کی خیر نہیں۔ بادشاہ نے اس شکایت
کی تصدیق چاہی۔ انھوں نے اعتراف کر لیا —
بادشاہ نے انھیں اشرفی دی اور کہا میاں میں
اپنی نئی بیوی کے پاس زیادہ دیر رہنا چاہتا ہوں
ان کی باری پر ذرا گھنٹہ دیر سے مارنا......

تو میاں یہ تھا کمال جو ہم کو ورثہ میں ملا ہے۔

عبدالودود بحال ہوا۔ گاؤں چلا گیا۔ سب نے
خدا کا شکر ادا کیا لیکن چند دن بعد وہ اچانک
سامان سمیت معطل ہو کر پھر آ گیا۔ زرینہ نے
سر پیٹ لیا۔ لوگوں نے برا بھلا کہا کہ میاں
ابھی تو بحال ہوئے تھے اتنی جلدی پھر رشوت
لینے کی کیا ضرورت تھی۔ عبدالودود نے قرآن شریف
پر ہاتھ رکھکر قسم کھائی کہ اس نے رشوت نہیں
لی تھی۔

عبدالعلی نے جو یہ دیکھا تو مسکرا کر عبدالواحد
سے کہا "قسم کھالی نا! بس اب اس شخص کو رہنمائی
کی ضرورت نہیں۔ یہ راستہ پر چل نکلا ہے
اور زرینہ کو مبارکباد دی تو وہ کچھ سمجھی نہیں۔

●●

غزل

مصطفیٰ علی بیگ

دشمنِ جاں ہیں جانِ جاں ٹیک اِٹ ایزی
کہاں چھپوں اے آسماں ٹیک اِٹ ایزی

اِنگلش میں ہو پیار کی گٹ پٹ
اُردو زباں میں گالیاں ٹیک اِٹ ایزی

لیڈر نو اِنٹری پہ چلے ہیں
ون وے پہ ہے کارواں ٹیک اِٹ ایزی

اب تک بھی شرمیلی سی ہیں
ارضِ دکن کی لڑکیاں ٹیک اِٹ ایزی

اولڈ* ایج میں یاد آئیں جب
رنگ برنگی تتلیاں ٹیک اِٹ ایزی

* OLD AGE

اِندرا امّاں

حفیظ خاں مذاق

اُجڑے چمن میں پھولاں کھلائی
دیس کے بجھتے دیئے جلائی
بن گئی سارے جگ کی مائی
دُکھی دلوں کی ہے یہ دہائی
اللہ تیرے کو اچھا رکھو اِندرا امّاں

چور بزاری ٹھنڈی پڑ گئی
رشوت خوروں کی سانس اکھڑ گئی
کالے قلعوں کی گچّی جھڑ گئی
اسمگلنگ کی لون بھی سڑ گئی
اللہ تیرے کو اچھا رکھو اندرا امّاں

رشوت خور کی منڈی موڑی
کالے دھن کی گردن توڑی
داداؤں میں پڑ گئی پھوڑی
جنتا بولی کر کو چھوڑی
اللہ تیرے کو اچھا رکھو اندرا امّاں

کالے دھن کے رستے کٹ گئے
اِنکم ٹیکس سے کپڑے پھٹ گئے
کرتی تو قد بھی گھٹ گئے
سارے بادل پاپ کے چھٹ گئے
اللہ تیرے کو اچھا رکھو اندرا امّاں

ڈاکہ چوری جڑ سے مٹادی
دیس سے غنڈہ گردی ہٹادی
ٹگنی کا سب کو ناچ نچادی
اپنا سکہ سب پو جمادی
اللہ تیرے کو اچھا رکھو اِندرا امّاں

پورب پچھم اتر دکھن
تیری دَیا سے بن گئے دَرپن
آج مذاق اپنا ہے سلوگن
ہم بھی بنیں گے پدما بھوشن
اللہ تیرے کو اچھا رکھو اندرا امّاں

میری بیوی

گرگٹ حیدرآبادی

بن کے دلہن وہ جب سے آئی ہے گویا جنت کو گھر میں لائی ہے
میری بیوی تو اچھی بیوی ہے نیک بیوی ہے سچی بیوی ہے
ایسی ویسی نہ ویسی ایسی ہے میری بیوی تو حور جیسی ہے
صبح اٹھ کر سلام کرتی ہے ہنستے ہنستے وہ کام کرتی ہے
بال کھولے تو شام ہو جائے مسکرائے تو پھول مسکائے
دیکھ کر اس کو گنگناتا ہوں میں غزل کو غزل سناتا ہوں
بات بگڑی بھی گر تو بنتی ہے ہم سے بیگم کی خوب چھنتی ہے
جب وہ کپڑے بدل کے آتی ہے تیر نظروں کا وہ چلاتی ہے
میں اسے اور بھی سجاتا ہوں گجرا جوڑے میں خود لگاتا ہوں
سارے گھر کا یہ کام کرتی ہے اور عبادت تمام کرتی ہے
ایسے کھانے یہ ہم کو کھلوائے شاہی باورچی اس سے شرمائے
سارے گھر کے یہ کپڑے دھوتی ہے بیج الفت کا دل میں بوتی ہے
ساس سسرے کا دل لبھاتی ہے پاؤں دونوں کے یہ دباتی ہے
ڈانٹوں اس کو تو وہ نہیں سنتی ایسے رہتی ہے جیسے ہے بہری
سب کی سنتی ہے کچھ نہیں کہتی ہنستی رہتی ہے جیسے ہے گونگی
میرے غصے پہ مسکراتی ہے ٹھنڈا پانی مجھے پلاتی ہے
جب بھی افسردہ گھر کو آتا ہے گھر کو جنت سے بڑھ کے پاتا ہوں
شکوہ کرنے کی وہ نہیں عادی یوں وہ رہتی ہے جیسے ہو دادی
چوٹی ڈالے گی ساس کی دیکھو یہ تو بندی ہے آس کی دیکھو
کیا بتاؤں کہ کتنی اچھی ہے اپنے سسرے کی خاص بیٹی ہے
دیوروں کی تو وہ دوائی ہے ایسے ملتی ہے جیسے نانی ہے
ناز نندوں کے یہ اٹھاتی ہے راز جینے کا یہ سکھاتی ہے
کپڑے سیتی ہے اپنے ہاتھوں سے کپڑے دھوتی ہے اپنے ہاتھوں سے
دبلی پتلی ہے شیر کا دل ہے میرے حق میں تو میری منزل ہے
اپنی تہذیب کی ہے یہ شہکار اس کا کردار مشرقی کردار
نیک سیرت ہے نیک فطرت ہے لاکھ دولت کی ایک دولت ہے
اس کی طاعت ہے خدمت شوہر اس کا ایماں ہے الفت شوہر
اے خدا ہے یہی دعا تجھ سے بیویاں سب کی ایسی ہی کردے

○

غزل

اَن پڑھ جھونگیری

ہوا جب میں پیدا تو جگ نے پکارا
اُئے جھاڑو تارا، اُئے جھاڑو تارا

نہ ہنگ اور پھٹکری نہ آلو بخارا
ہے انجکشنوں کا ہمیں اب سہارا

ہے دن رات کلچوں پہ اپنا گذارا
گرانی نے بے موت یوں مجھ کو مارا

وہ شوہر سے بولی کیلنڈر سنبھالو
ہے ففٹی ہمارا تو ففٹی تمہارا

ہوئی اس طرح سے غزل اپنی اَن پڑھ
ہے مطلع کسی کا تو مقطع ہمارا

○

پانڈے بیچن شرما "اُگر"
مترجم : کالیکا پرشاد

بڑھاپا

لڑکپن کے کھو جانے پر پاگل جوانی خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی اور اب بڑھاپے کے آنے پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے۔ لڑکپن کے کھونے میں دکھ نہیں سکھ تھا اور بڑھاپے کے پانے میں سکھ نہیں دکھ ہے۔ لڑکپن کا کھونا واہ! واہ! بڑھاپے کا پانا ہائے ہائے!!

لڑکپن اپنی معصومیت میں کہتا تھا ——— "ماں میں تو چاند کا کھلونا لوں گا۔"

جوانی عیش و مستی میں کہتی تھی ——— "دَور میں ساغر رہے گردش میں پیمانہ رہے" اور نحیف اور لاغر بڑھاپا کہتا ہے ——— "اے پروردگار میں اب بہت ناچ چکا۔"

کون کہتا ہے کہ زندگی کا مطلب عروج ہے سکھ ہے ہا ہا ہا ہے؟ یہ سب سفید جھوٹ ہے۔ خیالِ خام ہے، دھوکہ ہے، سراب ہے۔ مجھ سے پوچھو۔ میرے تین سو چھپن لمبے لمبے دنوں اور لمبی لمبی راتوں والے ایک دو دس بیس نہیں۔ ساٹھ سالوں سے پوچھو۔ وہ تمہیں، دنیا کے بچوں اور جوانوں کو بتائیں گے کہ جوانی کا مطلب واہ نہیں آہ ہے۔ ہنسی نہیں رونا ہے۔ جنت نہیں دوزخ ہے۔

لڑکپن کے پندرہ سالوں تک سخت ریاضت کر کے کیا پایا؟ جوانی کی شکل میں تباہی و بربادی۔ جوانی کے بیس سالوں تک کبھی دولت کے پیچھے، کبھی شہرت کے پیچھے۔ کبھی عزت اور توقیر کے پیچھے دوڑ لگا کر کیا حاصل کیا؟ بڑھاپے کے غاف میں تباہی اور زوال اور اب بڑھاپا، گھنٹوں خدا سے لو لگا کر، عبادت کر کے، بیٹوں کی بٹالین اور بیٹیوں کی بیڑی تیار کر کے کون ساقاروں کا خزانہ حاصل کر لے گا؟ وہی تباہی و بربادی اور زوال۔ مجھ سے پوچھو میں کہتا ہوں اور سینہ تان کر کہتا ہوں، زندگی کا مطلب ہے زوال۔

روز کی بات ہے۔ تم بھی دیکھتے ہو، میں بھی دیکھتا ہوں، دنیا بھی دیکھتی ہے۔ علی الصبح مشرق میں سورج کس قدر

خوشی اور ہنسی لکھی نظر آتا ہے۔ اپنی روشنی سے ساری دنیا کو منور کر دیتا ہے۔ وہ بھی زندگی کا مطلب خوشی اور شگوفہ سمجھتا ہے مگر . . .
یہ کوئی نئی بات نہیں روز ہی ہوتا رہتا ہے۔ تم بھی دیکھتے ہو۔ میں بھی دیکھتا ہوں، دنیا بھی دیکھتی ہے۔ شام کے وقت مغرب ہوتا ہوا سورج کس قدر بے رونق اور بے جان ہو جاتا ہے۔ وہ جوش و خروش وہ ہنسی خوشی اس کے چہرے سے یکسر غائب ہو جاتی ہے۔ سورج کو اپنی دن بھر کی محنت اور روشنی کی اشاعت کا کیا ثمر ملتا ہے؟ تباہی و زوال۔ مغرب میں اس کی چتا جلتی ہے اور آسمان میں تاریکی چھانے لگتی ہے۔ چاروں طرف غم کا ماحول طاری ہو جاتا ہے۔ اس وقت دیکھنے والے دیکھتے ہیں۔ عالموں اور دانش وروں کو احساس ہوتا ہے کہ زندگی کا مطلب کچھ نہیں صرف تباہی اور زوال ہے۔

زندگی کا مفہوم صرف تباہی و بربادی کہہ دینا آسان ہے۔ دو چار مثالیں دے کر تصدیق کرانا بڑی بات نہیں مگر بربادی اور تباہی کو پیش نظر رکھ کر زندگی کے سفر میں آگے بڑھنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ ناممکن بھی ——

اس دن گلی پار کر رہا تھا کہ کچھ شریر لڑکوں کی نظر مجھ پر پڑی۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔ "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ ہنومان گڑھی سے بھاگ کر یہ جانور راست شہر میں آیا ہے۔ کیا عجیب شکل پائی ہے! پورا کشکندھا کا باسی معلوم ہوتا ہے۔"

بس بات دل کو لگ گئی۔ بوڑھا ہو جانے سے ہی انسان بندر ہو جاتا ہے؟ اتنی بے حرمتی! بوڑھوں کی ایسی بے عزتی! جھکی ہوئی کمر کو لکڑی کے سہارے سیدھی کر کے میں نے ان لڑکوں سے کہا ——

"نالائقو! آج کمر جھک گئی ہے۔ آج آنکھیں کم دیکھنے اور کان کم سننے کے عادی ہو گئے ہیں۔ آج دنیا کی تصویریں بھولے ہوئے خواب کی طرح دھندلی دکھائی دے رہی ہیں۔ مگر ہمیشہ یہی حالت نہیں تھی۔"

"ابھی چھوکرے ہو، لونڈے ہو بچے ہو، الّو ہو۔ تم کیا جانو کہ یہ دنیا تغیر پذیر ہے۔ تم کیا جانو کہ ہر ایک لڑکا زندہ رہا تو جوان ہوتا ہے اور ہر ایک جوان اگر جلد ختم نہ ہو گیا تو ایک نہ ایک دن ہنومان گڑھی کا جانور ہوتا ہے۔ لڑکپن اور جوانی کے ذریعہ بڑھاپے پر جس قسم کے ظلم ڈھائے جاتے ہیں اگر ویسے ہی ظلم بڑھاپا بھی ان پر توڑنے لگے تو خدا کی یہ دنیا ختم ہو جائے، مٹ جائے۔ بچے پیدا ہوتے ہی مار ڈالے جائیں، لڑکے ہوش سنبھالتے ہی اپنا پیٹ پالنے کے لیے گھر سے باہر نکال دیئے جائیں تو دنیا سے دادا کے مال پر فاتحہ پڑھنے کا رواج ہی ختم ہو جائے۔"

اب بھی سو میں سے ننانوے دولت مند اپنے بوڑھے باپوں کی وجہ سے گل چھرّے اڑاتے ہیں۔ اب بھی ہزار میں سے نوسو ننانوے شوقین جوانوں کے بھڑکیلے کپڑوں کے دام کنگھی، شیشہ، صابن، پاوڈر پالش اور شراب کی بوتلوں کے پیسے بوڑھوں کی گاڑھی کمائی کی تھیلی سے نکلتے ہیں۔ اب بھی دنیا میں رحم، الفت اور کرم اور انسانیت کی کھیتی میں پانی دینے والا کمزور دل بڑھاپا ہی ہے۔ بے وقوف لڑکپن نہیں، متوالی جوانی نہیں، پھر بوڑھوں کی اتنی بے عزتی کیوں؟

مگر ان لڑکوں کے کانوں تک میری دہائی کی پہنچ نہ ہو سکی۔ سب نے ایک آواز سے تالی بجا بجا کر میری باتوں کی چڑیوں کو ہوا میں اڑا دیا۔

بھاگو، بھاگو! ہنومان جی "کھاؤں کھاؤں" کر رہے ہیں۔ ٹھہرو گے تو کٹکٹا کر ٹوٹ پڑیں گے۔ نوچ کھانے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ لڑکے ہو ہو ہا ہا کرتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ میں سحر زدہ ان کے الھڑ پن اور لاعلمی کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس وقت اچانک مجھے اس خوبصورت خواب کی یاد آئی جو میں نے کئی سال قبل لڑکپن اور جوانی کے ملاپ کے وقت دیکھا

تھا۔ کس قدر خوش آئند تھا وہ خواب!

ایک بار جوا کھیلنے کو جی چاہتا ہے۔ دنیا چاہے بھلا کہے یا برا اس کی پرواہ نہیں۔ دنیا میری حالت پر ہنسے یا چاہے جو کرے ـــــ کوئی فکر نہیں۔ کوئی کھلاڑی ہو تو سامنے آئے۔ میں جوا کھیلوں گا۔

ایک مرتبہ جوا کھیلنے کو جی چاہتا ہے ـــــ ایک طرف میرا ساٹھ سالہ تجربہ ہو، سفید بال ہوں، جھری دار چہرہ ہو، کانپتے ہاتھ ہوں، جھکی کمر ہو، مردہ دل ہو اور میری زندگی بھر کی کمائی ہو۔ ہر ایک سن کے ہزار ہزار روپے، لاکھ لاکھ گنیاں اور نوٹوں کی گڈیاں ایک جانب ہوں اور صرف "جوانی" دوسری جانب ہو۔ میں پانسہ پھینکنے کو تیار ہوں۔ سب کچھ دے کر جوانی لینے کو راضی ہوں۔ کوئی حکیم ہو سامنے آئے اسے نہال کر دوں گا۔ میں بڑھاپے کے روگ سے پریشان ہوں۔ جوانی کی دوا چاہتا ہوں۔ کوئی ڈاکٹر ہو تو آگے بڑھے منہ مانگا دام دوں گا۔

ہر سال موسم بہار آتا ہے۔ بوڑھے سے بوڑھا بھی اس موسم کا استقبال کرتا ہے۔ خوش بو کے لطیف جھونکے آتے ہیں۔ سارا ماحول خوش نما اور دل کش نظر آتا ہے۔ کوئل مست ہو کر "کو ہو کو ہو" کرنے لگتی ہے۔ محلے کے نوجوان خوشی اور مستی میں جھومتے ہیں کھلکھلاتے ہیں، دھما چوکڑی مچاتے ہیں، بوسے لیتے ہیں اور بوسے دیتے ہیں لپٹتے ہیں، لپٹاتے ہیں۔ دنیا کی تباہی اور بربادی کو خوشی اور مستی کا جامہ پہناتے ہیں اور میں منہ لٹکائے بے جان دل سے اس عمل کو ٹکر ٹکر دیکھتا ہوں۔ اس وقت احساس ہوتا ہے کہ بڑھاپا ہی دوزخ ہے۔

ہر سال متوالی برسات آتی ہے۔ ساری دنیا میں موج اور مستی چھا جاتی ہے۔ چاروں طرف خوشی کا دور دورہ ہوتا ہے اور شراب کی بوتلیں کھلتی ہیں۔ بچپن مارے خوشی کے گاتا ہے۔ "کالے میگھا پانی دے" جوانی مدہوش ہو کر گاتی ہے ـــــ "آئی ساری بدریا نا" اور میرا بڑھاپا! میرا بڑھاپا ایسے جنتی لطف سے محروم رہتا ہے۔ کبھی سردی کے جنگل میں پھنس کر کھانستا کھنکھارتا رہتا ہے، کبھی گرمی کے پھیر میں پڑ کر پنکھے توڑتا ہے۔ سامنے رکھے ہوئے کھانے کو بھی ہم اپنی بدبختی کے سبب نہیں کھا سکتے۔ تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ اف! اس وقت احساس ہوتا ہے کہ بڑھاپا ہی دوزخ ہے!

اس دوزخ سے کوئی مجھے نجات دلا دے، جوان بنا دے۔ میں تا حیات غلامی کرنے کو تیار ہوں۔ بڑھاپے کی بادشاہی سے جوانی کی غلامی کروڑ درجہ اچھی ہے۔ ہاں ہاں کروڑ درجہ اچھی ہے! مجھ سے پوچھیے۔ میں جانتا ہوں۔ ان تمام تکالیف کو جھیل چکا ہوں اور جھیل رہا ہوں۔

کوئی لقمان ہو تو سامنے آئے اور میری مدد کرے۔ میں مرنے سے قبل ایک بار پھر ان آنکھوں کو چاہتا ہوں جنہیں بات بات میں چار رہنے اور پھنسنے کا روگ ہوتا ہے۔ تمنا ہے کہ پھر ایک بار کسی کے زلف کا اسیر ہو کر رومانی غزلیں گاؤں۔ ایک بار کسی نازنین حسینہ کو دل دے کر پیار کا روگ لگا بیٹھوں۔

مگر نہیں بڑھاپا مرض لاعلاج ہے۔ یہ سر درد ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے پر درد نہ جائے۔

بچپن کا خوش حال دور دیکھ چکا۔ باغ جوانی میں دل بھر کر سیر کر چکا۔ اب بڑھاپے کے دوزخ میں داخل ہو کر یہاں کی تکالیف سے دوچار ہوں۔ اس دوزخ سے انسان تو کیا خدا بھی نجات نہیں دلا سکتا۔ بڑھاپا وہ زوال ہے جس کا عروج صرف ایک مرتبہ ہوتا ہے ـــــ دہکتی ہوئی چتا پر۔ ہمارے مرض کا بس ایک ہی علاج ہے۔ اور وہ ہے موت!

اے پروردگار اب دیر کس بات کی۔ زندگی کی ڈوری کاٹ ڈالو۔ رحم کرو۔ یسمن بھیجو۔ اب یہ دوزخ کی اذیتیں ناقابل برداشت ہو چکی ہیں۔ زندگی کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتے مارتے بے دم ہو گیا ہوں۔ میری زندگی کا چراغ بے نور ہے۔ اس زندگی کا فوری خاتمہ کر ڈالو۔

دوبارہ نئی تعمیر ہو، نیا بچپن ہو، نئی جوانی ہو، نئی زندگی ہو، ہنسی ہو، خوشی ہو، لطف ہو، جنون ہو، عشق و عاشقی ہو۔ نیا رنگ ہو نئی جوانی ہو، دنیا کے تمام غم بھول جائیں اور زمین پر جنت کا مزہ لوٹیں۔ اے پروردگار اس زندگی کا جلد خاتمہ کر ڈال! □□

بوگس حیدرآبادی

عشق رسوائی و ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
بے وقوفوں کی حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں

رات بھر نیند نہ آنا یہ شبِ فرقت میں
جسم میں خون کی قلت کے سوا کچھ بھی نہیں

چاندنی رات ہو یا صبحِ درخشاں ہو مگر
عاشقوں کے لئے ظلمت کے سوا کچھ بھی نہیں

نہ جوانی کی اُمنگیں نہ ترنگیں نہ بہار
رُخ پہ ادبار و نحوست کے سوا کچھ بھی نہیں

دل کا ارمان تصور میں نکل جاتا ہے
زندگی وصل کی حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں

چارہ سازوں نے جو بیمار کو دیکھا تو کہا
نبض میں دق کی حرارت کے سوا کچھ بھی نہیں

ہر گرفتارِ محبت کی زباں پہ بوگس
ہائے دل ہائے محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

رُباعی

بکواس کو راگنی میں گا لیتا ہوں
بوگس ہوں مگر رنگ جما لیتا ہوں
جمہور کو اللہ سلامت رکھے
جمہور کو دیوانہ بنا لیتا ہوں

کرنل محمد خان

(بسلسلہ گذشتہ)

لندن : تجدیدِ ملاقات

کیا خدا نے حسینوں کو ملازمت کے لئے پیدا کیا ہے؟

ہوٹل سے نکل کر لندن کی گلیوں سے گزرے۔ ٹیوب ٹرین سے سفر کے لئے زیرِ زمین گئے۔ اور بطنِ زمین سے —— تقریباً چندا ماموں کی طرح —— بجلی کی کرنوں کی سیڑھی لگا کر روئے زمین پر آئے اور آکسفورڈ سٹریٹ کی بھیڑ میں مدغم ہو کر برطانوی ادارے کے دفتر کو چلے۔ یہاں پہلی بار احساس ہوا کہ ہم لندن آ گئے ہیں اور وہ یوں کہ جونہی حواس پر اس شہر کے لمس و بُو اور رنگ و آہنگ کا عمل ہوا، دس سال پہلے کا لندن ہمارے لاشعور میں جاگ اُٹھا۔ یوں لگا جیسے اس کے در و بام نے ایک مختصر سی ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد اپنے مانوس چہروں سے نقاب اُلٹ دیئے ہیں۔ پھر بتدریج چند اور دُھندلی یادوں میں رنگ بھرنے لگا۔ وہ سامنے کا ریستوران جس میں نادر ٹوانہ[1] کی میز پر ہر شب ایک ہم اور نادر مرزخ شریکِ طعام ہوتی تھی۔ وہ بوٹس کی پکاڈلی والی دکان جس کے سامنے مجلوِ عشاقِ لندن، راجہ شیر محمد خان[2] انتظار کی کٹھن گھڑیاں گزارا کرتے تھے اور وہ گرین پارک کے نیم تاریک گوشے جو ایلین کی بوئے پیرہن سے شب بھر معطر رہتے تھے —— ہم ان گلرنگ و مشکبو یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ اچانک گولڈ ہال نے یہ کہہ کر ہمیں چونکا دیا:

"سر، یہ سامنے میزبان ادارے کا دفتر ہے۔"

ہم یادوں کی طرب گاہ سے نکل کر سرکاری عمارت میں داخل ہو گئے۔ اندر ہمیں ایک کھلے دیوان خانے میں بٹھایا گیا۔ جہاں

---

[1] ملک نادر خان ٹوانہ - ٹوبہ ٹیک سنگھ   [2] راجہ شیر محمد خان بار ایٹ لا - لائل پور

ہم جیسے کئی نو وارد غیر ملکی مہمان اپنی اپنی میزبانوں سے فرداً فرداً رُشد وہدایت حاصل کر رہے تھے۔ کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نگاہ دوڑائی تو رنگ رنگ کے مہمان اور رنگ رنگ کی میزبانیں نظر آئیں۔ مہمانوں کے رنگوں کی قوسِ قزح میں نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کا گلابی تھا۔ ہانگ کانگ اور ملایا کا ہلکا زرد، ہندوستان کا سانولا، پاکستان کا سلونا اور مختلف افریقی ممالک کا کا نیم سیاہ سے لے کر مطلق سیاہ تک، حتیٰ کہ آخری مہمان کے قرب وجوار میں تاریکی کا یہ عالم تھا کہ حکم کا یکّہ بھی لو دینے لگتا تھا۔ لیکن اس ظلمت میں ہر مہمان کے پہلو میں ایک ایک سُرخ و سپید میزبان میم آبِ حیات لیئے محوِ تواضع تھی۔ اور میزبان بھی ہر عمر کی۔ مرتعش کمر از کار رفتہ بڑھیوں سے لے کر شباب سے بے تاب دوشیزاؤں تک — اب دیکھنا یہ تھا کہ ہماری اپنی میزبان مس پارس جو ہماری آمد کی خبر سُن کر کسی لمحے لونج میں آنے والی تھی، سن وسال اور خد وخال کے پیمانے میں کہاں فٹ ہوتی ہے۔

آخر مس پارس آئی اور بے تابانہ آئی، مہربانانہ آئی مگر دلربایانہ نہ آئی کہ ہر چند کہ نوخیز تھی، بلاخیز نہ تھی یعنی شکل کی مقبول تو تھی مگر محبوب نہ تھی، اگرچہ ملازمت کے لئے اس سے موزوں تر شکل ممکن نہ تھی۔ کاروبار میں حُسن مداخلت کرنے لگے تو کاروبار روانی سے نہیں چلتا۔ حسینوں کو خدا نے ملازمت کرنے کے لئے نہیں، فقط پیار کرانے کے لئے پیدا کیا ہے۔

مس پارس نے مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے آواز میں گلو کوز گھول کر کہا:

"مجھے بہت افسوس ہے — آپ کو اتنی دیر انتظار کرنا پڑا۔"

یہ مس پارس کی تواضع کا مبالغے کا صیغہ تھا ورنہ ہمیں آئے ہوئے فقط ایک منٹ ہوا تھا۔ مس پارس حُسنِ تمام کی دعویدار نہ سہی، حسنِ کلام کی شہریار ضرور تھی۔ بولی: "اور مجھے کل کے خط کی بھی معذرت مانگنا ہے۔ ہائے میں نے کتنی حماقت کی! سکاٹ لینڈ کو بیس سال کا تخیل میں جا تھا — "میں سچ مچ نادم ہوں — پلیز مجھے معاف کر دو۔"

ہم نے دل کی اتنی اتھاہ گہرائی سے نکلی ہوئی معذرت پہلے نہیں سُنی تھی۔ اگر ہمارے پہلو میں بھی دل تھا — اور یقیناً تھا — تو جواب میں ہم دو ہی باتیں کر سکتے تھے۔ یا تو گھگیا کر کہتے کہ "خدارا، مس پارس ہمیں شرمندہ نہ کرو اور ہمیں کانٹوں پر مت گھسیٹو۔" اور یا بولے بغیر اُسے سینے سے لگا لیتے اور اُس کے لب و رُخسار سے عرقِ انفعال کے موتی چُن لیتے۔ لیکن اضطرار میں کانٹوں والے فقرے کی ہم سے انگریزی نہ بن سکی اور سینے سے لگانے کی ہمت نہ پڑی اور مُنہ سے نکلا تو یہ یتیم سا فقرہ جو کسی ممنون بیرے یا خانسامے کی زبان سے نکل سکتا تھا، "نو۔ نو۔ مس پارس۔ تھینک یُو۔"

ظاہر ہے کہ ان انگریزی الفاظ سے نہ ہمارے جذبات ٹپکتے تھے اور نہ کیمبرج یونیورسٹی برستی تھی۔ لیکن مس پارس نے تھوڑے لکھے کو بہت جانا اور سراپا تشکر ہو کر بولی:

"تو آپ نے میری خطا معاف کر دی؟ اوہ، آپ کتنے اچھے ہیں! آئیے اب آپ کا پروگرام بنائیں۔ بیٹھیں۔ اِدھر، اس صوفے پر، یہ آرام دہ تو ہے؟"

صوفہ تو بالکل مس پارس کی طرح ہی ملائم، گداز اور آرام بخش تھا۔ لیکن یہ مقام صوفے کی توصیف کا نہ تھا، بلکہ مس پارس کی تعریف کا۔ اتنے میں ہماری انگریزی بھی ذرا بحال ہو گئی۔ چنانچہ کہا:

"مس پارس مجھے ۔۔۔ نہ تھا کہ میری رہنمائی کے لئے حکومتِ برطانیہ نے لندن کی SWEETEST (سب سے پیاری) لڑکی

چُن رکھی ہے ۔"

مس پارس اس غیر متوقع تعریف کی تاب نہ لاسکی۔ جواب میں پہلی کوشش پر کچھ ہکلا سی گئی۔ پھر ذرا سنبھل گئی اور آخری کوشش پر ہماری طرح کچھ کہہ سکی تو وہی جو کوئی مسز بیرن یا خانساماں کہہ سکتی تھی :

" او، گاش ۔ تھینک یو ۔"

ویسے مس پارس کی شانِ کریمی سے بھی ظاہر تھا کہ اگر ہمارے چہرے پر کسی قسم کے موتی تھے تو فی الفور چُن لینا چاہتی تھی ۔ بہرحال فریقین کے لب و عارض کہ گوہر تو ناچیدہ ہی رہے لیکن پروگرام کی تشکیل نہایت مہر بھری فضا میں ہوئی ۔ جہاں ہم نے اصرار کیا، مس پارس سراپا لطف و کرم بن گئی اور جہاں مس پارس نے ضد کی، ہم سراپا تسلیم و رضا ہو گئے ۔ گو آخر میں پتہ چلا کہ ہم نے تو کسی بات پر اصرار کیا ہی نہ تھا۔ یعنی جو رضا مس پارس کی تھی، وہی ہمارے پروگرام کی تقدیر بن گئی۔ آخر اٹھے تو مس پارس نے کسی قدر تپاک سے دوبارہ مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا ۔ مس پارس کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں ہی تھا کہ ہم نے ازراہِ شوخی کہا :

" مس پارس، سونا تو ہم پہلے مصافحے ہی پر ہو گئے تھے ۔ اب جیرا بنانے کا ارادہ ہے کیا ؟"

حیران ہو کر بولی : " اگر SOMEBODY (کوئی) آپ کو چھو جائے تو آپ سونا بن جاتے ہیں ؟"

عرض کیا ۔ " سم باڈی، تو نہیں ۔ صرف پارس سے چھو جانے سے سونا بن جاتے ہیں ۔"

" یعنی میرے چھونے سے ؟"

" جی ہاں —— آپ پارس جو ٹھہریں ۔"

" آپ کسی قسم کا مذاق تو نہیں کر رہے ؟"

" بالکل نہیں ۔ ہماری کتابوں میں صاف لکھا ہے کہ پارس سے چھو کر تو لوہا بھی سونا بن جاتا ہے ۔"

" میں تو بیسیوں لوگوں سے ہاتھ ملاتی ہوں ۔ وہ کیوں نہیں سونا بن جاتے ؟"

" ہم نے تو آپ کے ملاقاتیوں میں سے صرف گولڈ پل ہی دیکھا ہے ۔ اور وہ سونا ہی نہیں، سونے کا پہاڑ ہے ۔"

مس پارس کا دھیان گائیڈ کے نام کی طرف نہیں گیا تھا اور اب جو گیا تو ہنس ہنس کر بے حال ہونے لگی —— بولی :

" آپ بڑے مزے کی باتیں کرتے ہیں ۔ یوں لگتا ہے جیسے آپ WOO[2] کر رہے ہوں ۔"

" نہیں محترمہ، میں فقط ہدیۂ تحسین پیش کر رہا ہوں ۔ جب ہم WOO کرتے ہیں، اس کے لئے تو ہم باقاعدہ قلعے تعمیر کرتے ہیں ۔"

" آہا قلعے ! سچ ؟"

" جی ہاں ! قلعے ۔ اور پھر انہیں آباد کرنے کے لئے اُسے لے بھاگتے ہیں ۔"

" اُوئی ۔ کس قدر رومانٹک بات ہے !"

---

[1] بیرا اور خانساماں کی یہ بالکل خانہ ساز مونثیں ہیں ۔ اگر آپ کو ان سے اتفاق نہیں تو مصنف کو آپ سے کوئی گلہ نہیں

[2] WOO اظہارِ عشق بغرضِ شادی یا بلا غرضِ شادی ۔

"جی ہاں ۔ اور آخر کار خانیوال جنکشن پر پکڑے جاتے ہیں ۔"

مس پارس نے خانیوال جنکشن کی تشریح چاہی تو ہم "باقی پھر" کہہ کر تشریح پی گئے کیونکہ ہم اتنا جلد یہ رومان پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے اور ساتھ ہی ایک مسرور مسرور مس پارس کا ہاتھ چھوڑ کر اپنا پروگرام اُٹھایا اور رخصت ہوئے ـــــ عورت کی اصلی کمزوری سونا، ریشم یا آئس کریم نہیں، تعریف ہے ۔ اگر یوں نہ ہوتا تو پرنس علی خان کے علاوہ کوئی عشق نہ کرسکتا ۔ وارث شاہ کی ہیر کا ہیرو کوئی سہگل یا آدم جی ہوتا اور ہمارے یار قیس کا نام کتابوں میں نہ ملتا ۔

پروگرام کی رُو سے ہمیں اسی شام اپنی مستقل قیام گاہ پارک کورٹ ہوٹل میں منتقل ہونا تھا اور دوسرے روز الثم پیلیس جانا تھا ۔

گمنامی بڑی نعمت ہے

ہمارا نیا گھر یعنی پارک کورٹ ہوٹل ہائیڈ پارک کے شمال میں واقع ہے اور عام اچھے ہوٹلوں میں سے ایک ہے لیکن ہمارے لیے خدا خاص ہو گیا کہ داخل ہوتے ہی منیجر سے علیک سلیک ہوئی تو شریف آدمی نے ہمیں پاکستانی پاکر سینے سے لگا لیا ۔ اس ناگہانی تپاک کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ تھوڑا ہی عرصہ ہوا موصوف ہماری راولپنڈی کے فلیش مین ہوٹل کی منیجری سے فارغ ہو کر لندن آئے ہیں ۔ ساتھ ہی انھیں یقین سا تھا کہ پنڈی میں ہمیں کہیں دیکھا تھا ۔ ادھر ہمیں عین الیقین تھا کہ انہیں کبھی دیکھا تھا نہ سُنا ۔ لیکن یہ تردید کا نہیں، تصدیق کا مقام تھا ۔ چنانچہ ہم نے بھی برابر کا زور لگا کر انہیں سینے سے بھینچا اور ان کی پنڈی کی چند یادیں جو ایسی کچھ نہ تھیں، اور تازہ کر دیں ۔ جب ہوٹل کے ملازمین نے اپنے باس کو اور ہمیں یوں یک جان دیکھا تو ان پر ایک واضح رقت طاری ہو گئی ۔ چنانچہ ریسپشن والی لڑکی نے وجد میں آکر ہمیں بلا ضرورت ڈبل کمرہ دے دیا ۔ جس کی کھڑکیاں پانچویں منزل سے ہائیڈ پارک پر کھلتی تھیں ۔ پورٹر نے موج میں آکر ہمارا سامان اُٹھایا اور تقریباً ہمیں بھی اُٹھا لیا کہ ہماری کمر پر مؤدبانہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہمیں لفٹ کے ذریعے کمرے کے دروازے تک پہنچا دیا جہاں روم میڈ نے کمرہ کھولا اور ہمیں اندر قدم رکھنے کو کہا ۔ پھر کمرے کے سامان کا باقاعدہ معائنہ کرایا اور دورانِ معائنہ ازراہ تواضع بستر کی ایک فرضی شکن کفِ دست سے ہموار کر دی ۔ غسل خانے میں ایک صابن کی ٹکیہ کو جو شمالاً جنوباً پڑی تھی، ازراہِ تکلف شرقاً غرباً رکھ دیا اور بار سے لٹکتے ہوئے تولیے کے سر پر ازراہِ شفقت ملائم سا ہاتھ پھیرا ـــــ بعد میں ہم نے منیجر کے سامنے اس ملازمہ کے سگھڑاپے کی ازراہِ مومنیت طویل داد دی ۔

رات ڈنر کے لیے ڈائننگ ہال میں گئے ۔ غالباً اُدھر ہی کا اشارہ تھا کہ ہمارے داخل ہوتے ہی چند بیروں کی خدمات ہم پر مرکوز ہونے لگیں ۔ لیکن ہم اس فالتو تواضع سے گھبرا گئے اور دامن بچا کر ہال کے کونے کی میز پر جا بیٹھے اور سٹیورڈ کے کان میں کہا :

"بڑے میاں، ہمیں معمولی سی توجہ اور تھوڑی سی روٹی کافی ہے ۔ ہمیں تماشا نہ بنائیں ۔ کچھ تماشا دیکھ لینے دیں ۔"

ہمارا تجربہ ہے کہ زندگی کا لطف تماشا بن کر نہیں، تماشائی بن کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے ۔ مرکزِ توجہ بننے کے لیے یا تو بہت بڑے کردار کی ضرورت ہے یا بہت بڑے مداری پن کی ۔ پہلی صورت میں بڑی ریاضت اور دوسری صورت میں بڑی ہاتھ کی صفائی درکار ہے ۔ ہم تحسین سخن کرنے کیلئے ایک وسیع ظرف [illegible]

یہ دونوں بڑے کٹھن کام ہیں۔ سو شہرت کی ہوس مردود ہے اور گمنامی کی تمنا محمود۔ شہرت سنگ گراں گھسیٹنے کا عمل ہے اور گمنامی مانندِ نسیم گزرنے کا نام —— چنانچہ ہم گمنامی کی نعمت سے مالا مال ہو کر گوشۂ فراغت میں بیٹھ گئے اور ہماری نگاہ ڈائننگ ہال کی رونق اور اس کے رونق آفرینوں کا بے محابا تماشا کرنے لگی۔

پینی نے آم کھایا

کھانا پکانے کے معاملے میں انگریزوں سے زیادہ بدمذاق قوم دنیا بھر میں نہیں —— ان بے ہنروں سے کام کے آلو پیاز بھی نہیں پک سکتے —— مگر کھانا کھانے کا اہتمام! اللہ اکبر! آلو پیاز کھانے کے لئے بھی پہلے تاج محل تعمیر کرتے ہیں۔ پھر اُسے سنہری پھولوں اور روپہلی ٹرافیوں سے سجاتے ہیں۔ پھر خود سفید قمیصوں، سیاہ سوٹوں اور سیاہ ٹائیوں میں سجتے ہیں۔ پھر ہال کے ایک کونے سے موسیقی کے معنبر چشمے اُبلتے ہیں اور جب کہیں آلو پیاز کا نوالہ اُن کے حلق سے دوسری جانب ڈھلتا ہے —— اور یہ سطور لکھتے ہوئے ہمیں وہ پرانا واقعہ بھی یاد آتا ہے جب راولپنڈی میں ہمارے انگریز پڑوسی کی پانچ سالہ بیٹی پینی ہمارے گھر آنکلی۔ ہم صحنِ چمن میں بیٹھے آم کھا رہے تھے۔ پینی کو بھی ایک آم پیش کیا تو اس نے شکریے کے ساتھ قبول کیا۔ مگر کھانے سے پہلے ہمارے نوکر کو حکم دینے لگی:

"بیرا، چوکی لاؤ" ———— بیرا کرسی لے آیا۔

"بیرا، ٹیبل لاؤ" ———— بیرا میز لے آیا۔

"بیرا، ٹیبل کلاتھ لگاؤ" ———— بیرے نے میز پوش بچھا دیا

"بیرا، پلیٹ لاؤ" ———— بیرے نے تھالی رکھ دی

"بیرا، نائف اینڈ سپون لاؤ" ———— بیرا چھری اور چمچ لے آیا

"بیرا، نیپکن لاؤ" ———— بیرا ہانپتا کانپتا نیپکن بھی لے آیا

اور جب کہیں پانچ سالہ پینی نے بیرے کے گلے سے چھری ہٹا کر آم کے شکم پر رکھی۔ اس کے مقابلے میں ہمارے آم کھانے کے جملہ اوزار دو ہاتھ تھے اور ایک منہ —— اور ہاں، ایک غسل خانہ بھی۔

(باقی آئندہ)

خرافات

(مراسلے)

* پہلے تو "شگوفہ" کے سالنامہ کی مبارکباد قبول فرمائیں پھر سالنامہ میں "سالِ نو" کی اشاعت کے لئے شکریہ۔

ع وقت آئیگا تو پوچھونگا کیسا ہے سالِ نو؟ ...

اس مصرعہ میں "کیسا" کی جگہ "کیا" چھپ گیا ہے جو کتابت کی غلطی ہے۔

پٹنہ میں چوتھا آل انڈیا جشنِ ظرافت ۲۴ر اور ۲۵ر فروری ۸۰ء کو سمینار، نثری نشست، بزمِ لطیفہ گوئی اور کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے منایا گیا۔ اس موقع پر سمینار میں تو بہار کے مقالہ نگاروں نے میدان مارا۔ بزمِ لطیفہ گوئی میں طالب خوندمیری، ڈاکٹر جے۔ سی۔ کندرا اور زندہ دلان حیدرآباد نے دل کھول کے ہنسایا۔ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ حمایت اللہ اور مصطفیٰ علی بیگ نے لوٹ لیا۔

شہزاد معصومی۔ پٹنہ

* اس بار انشائیے یوں تو سب ہی اچھے ہیں لیکن "آئینہ بالائے طاق" "تیرے وعدے پر جیے ہم"، "بونترا اور لذت لحاف" بہت ہی دلچسپ انشائیے ہیں۔ رضا نقوی واہی، جوہر سیوانی۔ شارق۔ نصر قریشی۔ نظر برنی حضرات کی شاعری پڑھ کر بہت محظوظ ہوا — ایسے شاندار نمبر کیلئے میری طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ **تمنا مظفرپوری**

* سالنامہ بیحد پسند آیا۔ خدا کرے اس کی شہرت عالم کے گوشے گوشے میں پہنچے اور یہ قیامت تک زندہ تابندہ رہے۔ آمین ثم آمین۔

عالم تاج پوری

* شگوفہ کا سالنامہ دیکھ کر ہارٹ گارڈن گارڈن ہوگیا خدا کے لئے اب تو مبارکباد قبول فرمائیے۔

انصاری اصغر جمیل۔ ناگپور

* یہ خبر سن کر بہت افسوس ہوا کہ ابرار ساغر کا پہلی فروری کو ایک حادثے میں انتقال ہوگیا۔ ایک لفظ کی تحریف کے ساتھ غالب کا یہ شعر دہرانا ہی پڑتا ہے ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی ساغر
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اردو کی مزاحیہ شاعری کو مرحوم سے بہت ساری توقعات وابستہ تھیں۔ ابتذال، پھکڑپن، صوفیانہ اور عامیانہ انداز سے الگ ہٹ کر ساغر کی شاعری بشر کو اپنے آپ پر ہنسنے کی بصیرت عطا کرتی ہے۔ صد حیف کہ واہی کا جانشین صرف ۲۷ برس کی عمر میں ہمیں داغِ مفارقت دے گیا۔ خدا اسے غریقِ رحمت کرے

عبید قمر۔ پٹنہ

* سالنامہ دیکھا۔ بہت خوب ہے۔ بڑی محنت کی ہے آپ نے۔

ہاشم عظیم آبادی

* اس علاقے (برار) میں شگوفہ متعدد جگہ آنے لگا ہے۔ اور پسند کیا جا رہا ہے۔ آپ کی کوششیں قابلِ تحسین ہیں۔

محمد اسعد اللہ
ورود۔ ضلع امراوتی۔ مہاراشٹرا

❊ ❊ ❊ ❊ ❊

کمزور طبقوں کو تحفظ اور امداد دیجئے

ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں پر حملے ہمارے سماج پر دھبہ ہیں۔ یہ ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

آئیے بھارتی روایات کا احترام کریں
ہم سب ایک ہیں

GRAM : HYMETDEV

Phone

HY URBAN DEVELOPMENT AUTHORI

Floor Sadana Buildings, Hyderguda,
HYDERABAD—500 029.

ABOUT HUDA

CONSTITUTION :

The Hyderabad Urban Development Authority was constituted on 2nd October, the provisions of the Andhra Pradesh Urban Areas (Development) Act, 1975 (Act I of 1975) and secure proper and orderly development of the Urban Development Area including Hyderabad and Secunderabad. Broadly, the functions of the Authority are (i) Planning lopment Control and (iii) Development of the entire Urban area.

JURISDICTION :

The Metropolitan city of Hyderabad covers an area of about 600 sq. miles with the area of 65.37 sq. miles forming its nucleus.

OBJECTIVES :

The main functions and objectives of the Authority are :

1] to promote and secure the development of areas situated in the development ding to the Master Plan and Zonal Development Plans.

2] to control the use of land for various purposes by acquisition, development and land.

3] to carry out development works such as roads, buildings, water supply, and other schemes within the development area, so as to provide the infrastructural fac extent of funds available with it and also by co-ordination and regulating the activiti agencies of the State and Central Governments and other local authorities.

ماہنامہ
MAY 1980
Rs. 2/-

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر: سید مصطفٰے کمال

مجلسِ ادارت
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبد الغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

جلد: ۱۳
شمارہ: ۵
مئی ۱۹۸۰ء

سالانہ (۲۲) روپے
بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ
فی پرچہ (۲) روپے

جنرل منیجر: سمیع جلیل
منیجر: بشیر انور

خط و کتابت کا پتہ:
شگوفہ ۳۱، مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۱
فون: 57716

طباعت:
نیشنل فائن پرنٹنگ پریس
چار کمان، حیدرآباد ۲

PURANDAS RANCHHODDAS & SONS
INDIA
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے

فہرست

ترقی اردو بیورو کی چند اہم علمی کتابیں

نمبر	کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
۱	ارضیات کے بنیادی تصورات	وی۔ اوبروچیف / ماجد حسین	۲۲/۰۰ روپے
۲	انسانی ارتقا	ایم۔ آر۔ ساہنی / احسان اللہ	۱۳/۷۵ "
۳	اجارہ	ای۔ اے۔ جی۔ رابنسن / ایم۔ اے۔ گیلانی	۱۷/۵۰ "
۴	تاریخ دستور انگلستان	سید علی محسن	۶/۰۰ "
۵	تعلیم میں نفسیات کی اہمیت	ہربرٹ سورینسن / سلامت اللہ	۴۱/۷۵ "
۶	توضیحی لسانیات	ایچ۔ اے گلیسن (　　) / منیق احمد صدیقی	۲۳/۰۰ "
۷	جدید الجبرا و مثلثات	الجیرج۔ پی۔ ونیس / ایس۔ اے۔ ایل شیروانی	۱۵/۰۰ "
۸	دکن کے بہمنی سلاطین	ہارون خاں شیروانی / رحیم علی الہاشمی	۱۵/۵۰ "
۹	سکونیات	محمد خواجہ محی الدین	۸/۲۵ "
۱۰	سماجیات کے اصول	فاطمہ شجاعت	۸/۰۰ "
۱۱	طبیعیات کے بنیادی تصورات	آرتھر بیزر / احمد وکیل جعفری	۲۵/۰۰ "
۱۲	عملی جغرافیہ	محمد انعام اللہ	۴/۵۰ "
۱۳	علم مثلث مستوی (حصہ اول)	اے۔ کے دیشمکھ اور مسز نور حلیم	۱۱/۶۰ "
	علم مثلث مستوی (حصہ دوم)	ایس۔ ایل۔ لونے / ابرار حسین	۸/۷۵ "
۱۴	فلسفہ کے بنیادی مسائل	ای۔ سی۔ ایوینگ / میر ولی الدین	۱۵/۷۵ "
۱۵	کاروباری تنظیم	مرزا صغیر احمد	۸/۲۵ "
۱۶	کھاتہ نویسی و کھاتہ داری	کے۔ ایچ۔ فاروقی	۱۲/۰۰ "
۱۷	مفتاح التقویم	حبیب الرحمن خان صابری	۲۸/۰۰ "
۱۸	مغل ہندوستان کا طریق زراعت	عرفان حبیب / جمال محمد صدیقی	۲۴/۵۰ "
۱۹	ہندوستان کا صنعتی ارتقاء	ڈی۔ آر۔ گیڈگل / ایم صدیقی	۱۳/۰۰ "
۲۰	ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ اول)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۱۸/۷۵ "
۲۱	ہندوستان کی معاشی تاریخ (حصہ دوم)	رمیش دت / غلام ربانی تاباں	۲۶/۰۰ "
۲۲	ہندوستانی معیشت	الک گھوش / محمد خلیق	۲۷/۲۵ "
۲۳	یونانی اد[illegible]	حکیم سید صفی الدین علی	۱۴/۵۰ "

یہ کتابیں عام اردو پڑھنے والوں، روزگار کے مختلف کاروبار میں مصروف افراد کے ساتھ ساتھ، اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء، اسکالرز، اساتذہ اور دیگر مصنفین کے لیے بھی مفید اور معلومات آفریں ہیں۔
یہ کتابیں اردو ذریعہ تعلیم کے فروغ میں بھی ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ اردو کے اس فروغ میں آپ بھی ہاتھ بٹائیں۔
اردو اداروں، لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں میں بھی ان کتابوں کا ہونا ضروری ہے۔ خریداری، مفصل فہرست اور دیگر معلومات کے لیے لکھیے۔

شعبۂ فروخت
بیورو فار پروموشن آف اردو
(وزارت تعلیم و ثقافت)
ویسٹ بلاک ۔ ۸
آر۔ کے۔ پورم

کمالاتِ سرجری

سرجن نے یوں دکھائے کمالاتِ سرجری
پھولی تھی دائیں آنکھ میں بائیں بھی پھوڑ دی
آنتوں میں ورم تھا تو شکم چیرنے کے بعد
قینچی دہانِ زخم کے اندر ہی چھوڑ دی

بیکار مباش

چھن جائے، بلا سے، تاج و کرسی
بیکار مباش، کچھ کیا کر
پسّی کی دکان کھول گھر میں
گاہک نہ ملے تو خود پیا کر

خاتمہ بالخیر

'پنجرنگ دل' پہ آشٹ گرہ ابتدا سے تھا
حال اُس کا دو ہی سال میں یوں غیر ہو گیا
اسکائی لیب لے مرا فاروره نوش کو
سورج گہن میں خاتمہ بالخیر ہو گیا

ہنومانِ سیاست

تخریب کے اوتار' ہنومانِ سیاست
وہ کر گئے، راون سے بھی جو کام نہ ہوگا
جنتا کا سنگھاسن، یہی کہتے ہوئے توڑا
'بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا!'

رضا نقوی واہی

رشید قریشی ایم اے

بر دکھاوا

سَقر سے شیخ ابن شیخ ابن شیخ
عروس البلاد حیدرآباد پہنچے تو چارمینار
کے اطراف موتیا کی کلیوں میں کھلبلی
مچ گئی "دلہا آیا! دلہا آیا!! دُلہا آیا!!!
شیخ اسی سال محرم میں ستر سال
کے ہوگئے تھے اور بیروت میں ایک
لبنانی حسینہ سے عقد کرکے حیدرآبادی
لڑکی کے ساتھ ہنی مون منانے آئے تھے

حیدرآبادی لڑکی حیدرآباد میں چاہے
دال برابر ہو بیرونی منڈیوں میں وہ
مُرغی ہی ٹھیرتی ہے: شیخ نے تو یہ بھی
سُنا تھا کہ:

اس کی چمکتی ملاحتوں میں سونے کے
وہ ذرے گھلے ہوتے ہیں جو موسیٰ ندی اپنی
گزرگاہ سے سمیٹ لاتی ہے۔

اس کے متناسب گداز جسم میں ان
سنگریزوں کی بندش ہوتی ہے جنھیں
فرہادوں کی تیشہ زنی ٹیلوں سے توڑ لاتی
ہے۔

اس کی دلربا اداؤں کو سندِ حکمرانی
محمد قلی قطب شاہ کے دل پر بھاگ متی
کی بادشاہت سے ملتی ہے۔

اسکی تخلیقی مٹی میں ریگزر کم اور ریت زیادہ
ہوتی ہے اور وہ اپنی مٹی ہی کی طرح
خاموش، خدمت گزار، ظلم بردار اور
وفا شعار ہوتی ہے۔

جھوٹ سچ کا وبال دلالوں کی
گردنوں پر شیخ تو حیدرآبادی لڑکی کے
آخری وصف پر ریجھے ہوئے تھے اور
لاڑ بازار میں جو بھی لڑکی نظر آتی انھیں
اس پر خاموش خدمت گزار، ظلم بردار
اور وفا شعار ہونے کا گمان ہوتا ــــ
ایک مرتبہ تو وہ ایک موٹی تازی سفید
بکری کو بھی حیدرآبادی لڑکی سمجھ بیٹھے
لیکن جب ایک لڑکے نے اس کی دم
پکڑلی اور وہ زور زور سے چیختی

بھاگنے لگی تو شیخ کا شبہ دور ہوگیا۔ حیدرآبادی لڑکی خاموش خدمت گزار ہوتی ہے۔ تکلیف پر بلبلا نے والی تو بکری ہوتی ہے! اصل سراغ اس وقت ملا جب شادیوں کا کاروبار کرنے والے مرغوب مرزا شیخ سے ملے۔ شیخ نے اپنے سوٹ کیس کے چور خانوں میں سے بارہ درجن سونے کے بسکٹ نکالے اور مرغوب مرزا کے سامنے پھیلا دیئے

مرغوب مرزا کی آنکھیں اس طرح پھٹ گئیں جیسے کوئی بندر ان کے اندر اچانک اچھلنے لگا۔

وہ نرم عاجزانہ لہجہ میں کہنے لگے: شیخ صاحب ویسے تو ہر لڑکی آپ کے لیئے حاضر ہے لیکن میں، خود اپنی لڑکی کو آپ کے لیئے موزوں ترین سمجھتا ہوں.. خوبصورت۔ سلیقہ مند ... اطاعت گزار ... اور جب سے وہ چودہ برس کی ہوگئی ہے ... میری راتوں کی نیند حرام ہوگئی ہے۔

شیخ نے تعجب سے پوچھا ... اس میں جاگتے رہنے کی کیا ضرورت ہے ... ہر آدمی اپنی زندگی میں ایک دن چودہ برس کا ہوتا ہے۔ مرغوب مرزا نے جواب دیا۔ آدمی کی بات اور ہے شیخ۔ لڑکی چودہ برس کی ہو جائے تو راتوں میں باپ کے سینے پر پتھر کی سلیں گرنے لگتی ہیں۔ شیخ نے پھر پوچھا۔ آپ کے حیدرآباد میں لڑکے نہیں ہوتے؟

مرغوب مرزا نے گہری سانس چھوڑی: لڑکے کیوں نہیں ہوتے۔ بازاروں میں، ہوٹلوں میں سینماؤں میں لڑکے ہی لڑکے ہیں لیکن شادی کے شامیانے سے سب ہی بدکتے ہیں۔

شیخ بے تابانہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلئے اسی وقت آپ کی لڑکی سے عقد کر لیتے ہیں۔

مرغوب مرزا نے انھیں بٹھا دیا۔ شیخ صاحب اتنی جلدی بھی نہیں ہے، پہلے بَر دکھاوا ہو جائے۔

شیخ نے پوچھا: یہ بر دکھاوا کیا ہوتا ہے؟ یہ عقد سے پہلے ہوتا ہے یا بعد میں۔؟

مرغوب مرزا نے سمجھایا: یہ عقد سے پہلے ہوتا ہے اور اس مقصد سے ہوتا ہے کہ مستورات بھی آپ کو دیکھ دیکھ لیں۔

شیخ نے اپنی انگلی سے انگوٹھی نکالی اور مرغوب مرزا کی طرف بڑھا دی۔ "اس انگوٹھی کو دکھا دیجئے ... سونا ہے .... صرف سونا اور کچھ نہیں۔ یہی میں ہوں.."

مرغوب مرزا مسکرا اٹھے ... وہ تو ٹھیک ہے ... لیکن ایک رسم ہے.. اور ہماری خوش عقیدہ مستورات کے لیئے تو آپ کو یا اونٹ کو دیکھ لینا بھی ثواب داخل ہے۔

شیخ نے جتا دیا .. اگر آپ کی مستورات مجھے دیکھنا چاہتی ہیں تو دیکھ لیں ... لیکن میں بھی اپنی ہونے والی بیوہ کو دیکھوں گا۔

مرغوب مرزا ایک منہدمہ دیوڑھی کے اصطبل میں رہتے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ ملبہ ہٹایا جائے تو اُن کے دادا کرسیٔ وزارت پر متمکن احکامات صادر کرتے برآمد ہوں گے۔ اب تو وہ سونے کے بسکٹوں کی بنیاد پر ایک تین منزلہ آر سی سی عمارت کا نقشہ بنا رہے تھے ... انھوں نے کمرہ کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ بیٹی دلہن تیار ہوچکی تھی اور سارے انتظامات کو مکمل کر کے بیوی نے جاء نماز پر سر رکھ دیا تھا۔

موٹر کے ہارن کی آواز آئی اور پورے گھر میں امید وبیم کی سنسنی دوڑ گئی۔

مرغوب مرزا تیز تیز گئے اور اہلم سہلم۔ ویلکم سوالگم شیخ کو اندر لے آئے۔ شیخ مخملی قالین اوڑھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے تو تعارفات شروع ہوئے۔

یہ میرا بڑا بیٹا ... حامد ... ورزش کا شوقین اور

یہ میرا چھوٹا بیٹا ... عیّار ... شعبدے سیکھ رہا ہے۔

شعبدے ؟ شیخ نے تعجب سے پوچھا

مرغوب مرزا نے وضاحت کی " جی ہاں شعبدے .. یعنی کوئی چیز غائب ... کوئی چیز حاضر

شیخ نے پوچھا : یہ کیا شعبدہ کرتا ہے ؟

مرغوب مرزا نے جواب دیا : یہ خالی ٹوپی بتاتا ہے اور اس کے اندر آم کا پودا اُگاتا ہے۔

شیخ نے کہا " ماشاءاللہ آپ کے دونوں بیٹے میرے کام کے ہیں"

مرغوب مرزا کی باچھیں کھل گئیں۔

"جی ہاں، سقر میں میرا ایک بہت بڑا ریگستان ہے اور مجھے ایک گراونڈ انجینئر اور ایک فارسٹ آفیسر کی ضرورت ہے۔ آپ کے دونوں بیٹوں کو میں ان عہدوں پر فائز کردوں گا اور ہر ایک کو ماہانہ دو ہزار تنخواہ دیا کروں گا"

مرغوب مرزا کے دونوں بیٹے ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر شانے اُچھالنے لگے۔

مرغوب مرزا نے ڈرتے ڈرتے کہا : لیکن شیخ ان کی تعلیم تو کچھ زیادہ نہیں۔

شیخ نے اطمینان دلایا کہ ان کی تعلیم بھی کچھ زیادہ نہیں۔

دونوں بیٹوں نے بہ یک آواز پوچھا " اور کام کیا کرنا ہوگا ؟"

شیخ نے بتایا " جو گراونڈ انجینئر ہے وہ تو گڑھے کھودے گا اور جو فارسٹ آفیسر ہے وہ ان گڑھوں میں تاڑ کے درخت اُگائے گا"

مرغوب مرزا نے اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دے دیا کہ وہ سقر جانے کے لئے سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔

شیخ نے دیکھا سامنے کے طاق میں روئی کا بنا ہوا ایک مرغ کھڑا ہے جس کی کلغی دار چونچ پھسلتے پھسلتے اس کے سینے پر آٹکی ہے۔

طاق کے پاس جاکر شیخ نے کلغی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اس جھٹکے نے ان سینکڑوں مچھروں کو چونکا دیا جو روئی کے شگافوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ایک لڑاکا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ شیخ کی ناک میں گھس گیا۔ شیخ اپنی کرسی پر آبیٹھے

"یہ کیا مخلوق ہے ؟" مرغوب مرزا نے کہا " یہ یہاں کی بلدیہ کا پالا ہوا مشہور درندہ ہے"

شیخ نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ " یہ ناک میں کیوں گھستا ہے ؟

مرغوب مرزا نے تبصرہ کیا " شر ہے۔ گدی ہی میں تو جائے گا"

مچھر کی ہلچل کی وجہ سے شیخ کو چھینکیں آنے لگیں اور اُدھر زنانہ کمرے سے ... سُرخ اوڑھنی سر پر ڈالے اپنی والدہ کا ہاتھ تھامے ایک گل اندام دوشیزہ شرماتی چاندی کی پٹیّاں جھنکارتی ... سامنے آگئی۔ شیخ نے پہلے دلہن کی والدہ کو دیکھا۔ آنکھیں چار ہوئیں تو ان آنکھوں میں کھڑی ایک عورت اپنے ہاتھ پھیلائے التجا کر رہی تھی "یا شیخ تم کو خدا اور رسول کا واسطہ ... میری بیٹی کو اپنے لیئے پسند کرلو۔ یا شیخ تمہاری اس محبت کے صدقہ میں جو تمہارے دل میں تمہاری بیٹیوں کے لیئے تڑپتی ہے۔ تم میری بیٹی کو اپنی بیوی بناکر ساتھ لے جاؤ۔ اس کا نام کنیز فاطمہ ہے لیکن تم اُسے اپنی کنیز بنالو۔ اُسے صرف کھانا دو۔ صرف کپڑا دو۔ لیکن خدارا طلاق نہ دو ... کیوں کہ طلاق کے بعد تمہارے بھائی بند اُسے بھنبوڑیں گے اور پھر حضرت عزرائیل کے لیئے سڑک پر ڈال دیں گے ....
یا شیخ ایسا مت ہونے دو .... میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں"

.... اور عین اسی وقت اس دباؤ کی چھینک دغی کہ شیخ کے مصنوعی دانت زمین پر آگرے۔ دلہن کی والدہ آگے آئیں اور شیخ کے مصنوعی دانت اٹھاکر .... ان کے سامنے جا کھڑی ہوگئیں۔ اس قربت نے شیخ کی ساری شیخی پگھلادی اور وہ دلہن کی والدہ کو اس بے بسی کے ساتھ دیکھنے لگے جیسے بکرا اپنے ذبح کرنے والے کو دیکھتا ہے۔

مرغوب مرزا نے صورتِ حال کو سنبھالا "یہ اپنے شیخ گوشت کے بہت شوقین ہیں۔ گوشت، انسانی گوشت ... کچا ... اور ہڈی سمیت ... اسی شوق میں ان کے دانت گئے" دلہن کی والدہ شیخ کے دانت ان کے ہاتھ میں پکڑا کر ایک اندازِ بے نیازی سے سر کا پلّو گراتی واپس چلی گئیں۔

مرغوب مرزا نے پُر اُمید لہجہ میں پوچھا۔ پسند یا شیخ؟

پسند۔ پسند!! شیخ نے مستحکم لہجہ میں جواب دیا۔

مرغوب مرزا نے پکارا ــــ بیٹی آؤ۔ پھولوں کا ہار لیتی آؤ ــــ آؤ ... اور اپنے شیخ کو پھولوں کا ہار پہناتی جاؤ ــــ دلہن سنبھلتی کھڑی ہوگئی اور یوں نظر آیا جیسے قتلِ عام کے ارادہ سے کھڑی ہوگئی ہے؛

شیخ نے بے چینی سے انگلی کا اشارہ کیا .... تم نہیں .. تم ... بڑی تم .. آنکھوں سے کیا فصیح اور سلیس گفتگو کرتی ہو تم ــــ تم کو ہم نے پسند کیا۔ نادر المستورات ہو تم۔ ہماری طرف تو جو عورت ہوتی ہے۔ اس کی زبان شتر مرغ کی گردن کے برابر لامبی ہوتی ہے ــــ لاحول ولا قوۃ۔

محفل پر صدمہ کا سکتہ چھاگیا۔ دھماکہ کا گلا گھونٹ دیا گیا جیسے۔

مرغوب مرزا نے سسکتے لہجہ میں کہا۔ وہ، وہ بدمزاج، لڑاکا، کھوسٹ عورت تو میری بیوی ہے شیخ!! شیخ نے مطمئن اور مسرور لہجے میں جواب دیا ــ واللہ، پھول ملے تو ہم کلی کو نہیں توڑتے۔ اب یہ پھول کسی کی بیوی ہے تو ہوا کرے۔ ہم تو اپنی پسند نہیں بدلتے۔

مرغوب مرزا دھائیں دھائیں رونے لگے ــ یااللہ میرا کوئی گناہ قابلِ سزا تھا تو تو ہی سزا دیتا ...
یہ شیخ کون آیا، میرا گھر تباہ کرنے والا؟

شیخ نے پوچھا: کتنے سال کا تمہارا ساتھ ہے ؟
مرغوب مرزا نے کہا "تیس سال کا ... شیخ ... تیس سال کا ۔
شیخ نے دھیمے لہجہ میں اپنا فیصلہ سنادیا : تیس سال تم نے ایک خوبصورت عورت کو یرغمال بنائے رکھا ۔ اب میں اُسے تمہاری قید سے چھڑالوں گا ۔
حامد چیتے کی طرح اُچھلا اور دونوں ہاتھوں سے شیخ کا گلا دبوچ بیٹھا ۔

. . . . . .

مرغوب مرزا نے دیکھا ان کی بیوی رو رہی ہے اور دلہن کے سر پر ہاتھ پھیرے جارہی ہے ۔ وہ اس کے قریب چلے گئے ۔ بیوی نے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا " آپ ہی دل بڑا کر لیجئے نا ۔ میں ہرماہ ایک ہزار روپے بھیج دیا کردوں گی ۔ بچے بھی اپنے کمانے لگیں گے .... اور اپنی بیٹی کا بیاہ بھی کسی نوجوان سے ہوجائے گا۔"
مرغوب مرزا چیخ اُٹھے ... بے وفا ، لالچی ، زر پرست عورت ۔ ساری کارستانی تیری ہے ۔ کتنا میں نے کہا ۔ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر کھڑی نہ رہ ۔ کتنا میں نے کہا کارگہ کا بلوز اور ہرے رنگ کی سورج کے پھولوں والی ساڑی نہ پہن ... لیکن تو نے میری ایک بات بھی نہ مانی .... نہ مانی .... اب جا سونے کی بھٹی میں جل جا ... ریگستان کی ریت میں دفن ہوجا ... جا ... !
ماں باپ کے مکالمہ کی بھنک حامد کے کانوں میں پڑی تو اس نے شیخ کا گلا چھوڑ دیا ۔ شیخ گلا سہلاتے کھنکارتے بیٹھے رہے ۔ کچھ سنبھلے تو انھوں نے مرغوب مرزا سے کہا : " بہت تکلیف دہ رسم ہے یہ پُر دکھاوا ــــ حیدرآبادی دلہوں ہی کا حق ہے جو وہ اس کی تاب لاتے ہیں ۔ اگر یہ رسم کچھ دیر اور جاری رہتی تو اِنّا للہ ہم حوروں کو پیارے ہوجاتے ۔"
مرغوب مرزا نے شیخ کو کوئی جواب نہ دیا ۔ اُدھر مڑ گئے جدھر انہیں کسی کی باجبروت موجودگی محسوس ہوئی ۔
" یا بصیر ! یا سمیع ! تو بے حساب دیتا ہے لیکن جلد حساب بھی لیتا ہے ۔ اس شیخ کے معاملے میں ڈھیل کیوں ؟ اِسے مت چھوڑ ... اس کے تیل کو پھر سے کھارا پانی بنادے ۔ میرے مالک میرے معبود ! اس نے میری بیوی کو تاکا ہے تو اس کے پورے حرم کو اُٹھالے ۔"
دلہن روتے روتے چیخ پڑی تو مرغوب مرزا اس کی طرف بڑھے اور سہارا دیتے اندر اٹھالے گئے ۔

اور اسی وقت برقی شٹ ڈاؤن کا نزول ہوا ۔ اور ایسا اندھیرا مسلط ہوگیا جو صرف سعودی تیل سے روشن ہوسکتا تھا .... !

خطبۂ صدارت

صدرِ مشاعرہ کی سونپی ہے مجھ کو خدمت
اسپانِ شاعری کی بس ہے یہی حقیقت
کیا کوئی اور مرغا ہاتھ آپ کے نہ آیا

کشکول شاعری ہے بے مائیگی پہ نادم
جنگل میں گھومتا ہے مقصد بغیر ہاتھی
اقدارِ علمیت کو ایسا لگا ہے دھچکا

ہوٹنگ اگر جو ہوگی اس محفلِ ادب میں
شہنائی شاعری کی گونجے گی اب فضا میں
ہیں گھاٹ کے نہ گھر کے ان کا نہیں ٹھکانا

اُٹھ جاؤ تم جوانو! کچھ کر دکھا کے دم لو
غیروں سے کیوں ہو شکوہ اپنوں سے ہے شکایت
گر نونہال اپنے کرتے رہیں گے غفلت

دیکھیں گے آپ آگے آئے گا اک زمانہ
بس بول چال ہی میں رائج رہے گی اُردو
پھول چوں سکا ہے مرتبہ تعلیم کا جو ذریعہ

پورا نہ ہوگا مقصد اُردو کی مجلسوں کا
اردو زباں کی خاطر تن من لگا دو ایسا
اپنا سمجھ کے کرنا جو کام بھی ہو ذمے

اے فیض اس جہاں کی ہے ریت ہی نرالی
مرغانِ شاعری نے دی بانگ نصف شب کو

ممنون ہوں میں بے حد دی آپ نے جو عزت
قینچی لگام و زیں کی ان کو نہیں ضرورت
اک مورِ ناتواں کو دی آپ نے صدارت

منظوم پیشِ خدمت ہے خطبۂ صدارت
مجھ کو بنا دیا ہے کیوں آپ نے مہاوت
بس ہے اسی کی عزت ہے جس کے پاس دولت

آ جائے گی گلے میں یہ مسند صدارت
بجنے لگے گی تب میں جب الوؤں کی نوبت
دھوبی سے پوچھنا ہے ان کی ہے کیا حقیقت

اب "ہاتھ" تم بٹاؤ اندرا کی ہے حکومت
اردو زباں سے نفرت انگلش زباں سے رغبت
اردو کتب رہیں گے الماریوں کی زینت

ہندوستاں سے ہوگی اُردو زباں رخصت
اُردو زباں کے حامی ڈھائیں گے یہ قیامت
حاصل کسی زباں میں ہوتی نہیں مہارت

پیشِ نظر اگر ہو نام و نمود و شہرت
آگے بڑھو جوانو! گر تم میں کچھ ہے ہمت
یہ بزرگوں کی اپنے سن لیجئے نصیحت

جو آج ہے رذالت کل ہے وہی شرافت
اُلّو بھی کہہ رہا ہے یہ ہے بڑی نحوست

ختمِ مشاعرہ کا اعلان کر رہا ہوں
پنہاں ہے بس اسی میں اہلِ ادب کی عزت

فیض الرحمٰن فیض

یوسف ناظم

شہ پارے

○ شاہی اور شہنشاہی وغیرہ سے متعلق اگر عوام کے خیالات آئندہ بھی اسی طرح کے رہے جیسے کہ اب ہیں تو وہ دن دور نہیں جب تاش کے پتوں کے بادشاہوں کو بھی راہِ فرار اختیار کرنی پڑے (بادشاہوں کے اس طرح رخصت ہونے میں کوئی حرج نہیں بس ضمانت اِس بات کی ہونی چاہیئے کہ ان کی خالی جگہیں جوکر نہ لے لیں۔

○ دو تلواریں ایک نیام میں نہیں سما سکتیں۔ ہمارا خیال ہے سما سکتی ہیں بشرطیکہ دونوں ناکارہ ہوں۔ نیام کا نمونہ بھی بدلا جاسکتا ہے۔ (بیل باٹم کیسی رہے گی ؟)

○ معذوروں کے اِس عالمی سال کے دوران سُنا گیا ہے کہ کئی سیاسی لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بھی ایک اسکیم بنائی جائے گی ــ (درخواستیں عنقریب طلب کی جانے والی ہیں)

○ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ دنیا بھر میں جنسی جرائم کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ تحقیق کرنی چاہیئے کہ کہیں انگور کے گھر بیٹا تو نہیں پیدا ہوگیا ــ ہمارے بزرگ دوست اکبر الٰہ آبادی اس بات پر شکر منایا کرتے تھے اور کہتے تھے خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا ــ لیکن وہ دن اور تھے۔ سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی ۔ کیا تعجب ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے جواب میں ٹینٹ ٹیوب !! بھی نمودار ہوچکا ہو۔

○ کہا گیا ہے غصّہ تھوک دینا چاہیئے۔ سمجھ دار لوگ اس نصیحت پر دل و جان سے فدا ہیں اور اس پر اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے انھیں ڈر ہو کہ اگر جگہ جگہ تھوکا نہ گیا تو ان کی جان کو خطرہ ہے ــ اس ڈر کے مارے ہم میں سے کوئی شخص بھی سڑک پر بغیر تھوکے نہیں چلا کرتا ــ بس میں سفر کرنے والے بھی اس کارِ خیر میں حصہ لینا نہیں بھولتے ــ بس کی اوپر کی منزل سے غصّہ تھوکا جائے تو طبیعت فوراً بحال ہوجاتی ہے۔ بعض لوگوں کا غصّہ سرخ ہوتا ہے لیکن یہ اشتراکیت کی وجہ سے نہیں ان کی اپنی انفرادیت کی بناء پر ہوتا ہے جس کی وہ قیمت بھی

اداکرتے ہیں۔ یہ غصّہ بنارسی بھی ہوسکتا ہے اور کبھی بھی
کلکتہ ۔١٢٠ بھی اور پونا سادہ بھی۔ چند لوگ ایسے بھی ہوتے
ہیں جن کا غصہ میٹھا ہوتا ہے ــــ یہ بھی تھوکا جاتا ہے ــــ
سڑکیں آخر بنی کاہے کے لیئے ہیں۔

○ فلموں میں بڑے بڑے اور نامور اداکاروں کے علاوہ
"نعمانڈ" بھی ہوا کرتے ہیں جنھیں اکسٹرا کہا جاتا ہے۔ اسی طرح
دنیا کے اسٹیج پر بھی بکثرت اکسٹرا ہوتے ہیں جو عرفِ عام میں
عوام کہلاتے ہیں۔ اکثر ملکوں میں عوام کی حالت بھی وہی
ہوتی ہے جو فلموں میں اکسٹرا کی ہوتی ہے لیکن ایسا ہونا کوئی
ضروری نہیں۔ عوام کی حالت اکسٹرا سے بھی گئی گذری ہوسکتی
ہے ــ اسی کام کے لیئے عوامی حکومتیں بنائی جاتی ہیں۔

○ مرن برت بڑے کام کی چیز ہے۔ مرن برت
کی خوبی یہ ہے کہ اس میں آدمی مرتا نہیں ہے۔ مرن برت
کے شوقین ایک ہزار آدمیوں میں سے ایک آدھ برت دار
مرجائے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کی موت برت کی وجہ
سے نہیں، بلکہ بدہضمی کی وجہ سے ہوئی ہے (ایسا ہوتا ہے)
مرن برت میں عام طور پر آدمی کا وزن دو چار کیلو بڑھ
ہی جاتا ہے ــــ اس زائد وزن کا خرچ عوام برداشت
کرتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کیا برداشت
نہیں کرتے ؟ ماڈرن آرٹ، جدید شاعری، سیاسی سرکس
اِن سب چیزوں کو آخر کون برداشت کرتا ہے۔ ؟

○ جس کی لاٹھی ــ اس کی بھینس ــــ
صرف بھینس ؟؟

○ چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی۔ یہ عمل بہت
آسان ہے۔ خاص طور پر اِن دنوں تو آدمی کو خود سے
چلنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ خود ہوا اتنی زور کی
چلتی ہے کہ آدمی بلا ارادہ ہوا کے ساتھ چل پڑتا ہے۔
(یاد رہے ـ ہوا مونث ہوتی ہے)

○ موسم موسم کی بات ہے۔ لوگوں کو اب دن میں
تارے نظر آنے لگے ہیں ــ یہ بھی غنیمت ہے ورنہ دن
تو ایسے بھی گزرے ہیں جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا
تھا ــــ یوں بھی اب شب و روز میں فرق کرتا کون
ہے۔ راتوں کو ہونے والے کام اب زیادہ تر دن ہی
میں ہونے لگے ہیں۔

○ اس سال جو سورج گہن ہوا تھا اس کے بارے
میں کہا جاتا ہے کہ ایسا سورج گہن ٨٠ سال میں ایک مرتبہ
آتا ہے۔ اس سورج گہن کو اپنی رفتار تیز کرنی چاہیئے
اس کے کئی فائدے ہیں اس دن سب کے سب گھروں
میں بند ہوکر بیٹھ گئے تھے کہیں بھی کوئی فساد نہیں ہوا۔
حد یہ ہوگئی کہ کسی پولیس تھانے پر بھی کوئی واقعہ
نہیں ہوا۔

٧٧

فرحت قمر
باٹلہ ہاؤز، نئی دہلی ۲۵۔۔۔۱

مقدمۂ شعر و شاعری (جدید)

(مولانا حالی کی روح سے معذرت کے ساتھ)

شاعری کی اہمیت:

زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں میں زندگی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے شاعری اتنی ہی اہم ہے جتنی ہندوستانی فلمی ہیرو کے لیے مکا بازی۔ اسی لیے قدرت نے شاعری کو انسانی فطرت میں ابتدائے حیات سے انتہائے حیات تک شامل کردیا ہے۔ بچہ پیدا ہوتا ہے، روتا ہے تو بھی سُر میں روتا ہے۔ ماں کی لوری بھی شاعری کی ایک صنف ہے۔ بچہ ذرا بڑا ہوتا ہے تو تختی تختی سوکھ جا۔ ریل کا ڈنڈا ٹوٹ جا "قسم کے شعر کہنے لگتا ہے اور جوانی کی سرحد میں قدم رکھنے کے بعد تو ہر لڑکا لڑکی کے چہرے کے مہاسوں کے ساتھ، شعر و شاعری کی طرف بہت زیادہ دھیان دینے لگتا ہے (آج کل ہندی میں اُردو غزلوں کے مجموعے اسی مقصد کے تحت شائع کیے جا رہے ہیں)، بوڑھا ہونے پر اللہ میاں کی قربت حاصل کرنے کے لیے حمد و نعت کے نغمات سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد مرثیہ کی صورت میں شاعری انسانی زندگی کی یادوں سے منسلک رہتی ہے۔ غرضیکہ مہد سے لحد تک شاعری زندگی سے وابستہ رہتی ہے۔

شاعری کے لوازم:

شعر کو پسند کرنے والے تو بہت ہو سکتے ہیں۔ شاعر ہر شخص نہیں ہو سکتا۔ شاعری کے لوازم وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ شاعر ہونے کے لیے شاید ہمیشہ سے ہی کنوارا اور جذباتی ہونا ضروری ہے۔ لیکن آج کل بال بڑھانا، کرتہ پاجامہ پہننا کرتے کا گلا گردن کی ایک جانب یا پشت کی طرف لگوانا، چشمہ پہننا (نظر کمزور نہ ہونے کی صورت میں سادہ شیشوں کا) ہاتھ میں ایک خوب صورت سی ڈائری رکھنا وغیرہ بھی شاعر ہونے کے لیے لازمی ہو گیا ہے۔ زیادہ کامیاب شاعر بننے کے لیے کسی انجمن کا ممبر یا کسی مدرسۂ فکر کا حامی [illegible] ہے۔ ایڈیٹروں کو خوش کرنے کا فن سیکھنا، مشاعروں کے کنوینروں سے دوستی پیدا کرنا، کسی دوسرے کے نام سے [illegible] شاعری کی تعریف میں خود ہی مضمون لکھ کر شائع کرانا، سیاسی اتار چڑھاؤ کے مطابق

اپنے ہی سابق نظریات کی تردید کرنا، کچھ مزید خصوصیات ہیں جو شاعر کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ آئے دن ہونے والے واقعات سے متاثر ہو کر نظمیں کہنا بھی بہت ضروری ہے اور سب سے زیادہ اہم اور لازمی امر ہے۔ اپنے اشعار میں وہ باتیں کہنا جو کسی کی سمجھ میں نہ آئیں۔

محرکاتِ شعر:

شاعری کا سب سے بڑا اور قدیم محرک عشق ہے۔ جو شخص عشق کرتا ہے وہ کسی نہ کسی طور پر شاعری ضرور کرتا ہے، عشقیہ خطوط میں نظم یا نثر میں شاعری کرتا ہے۔ شعر کی زبان میں سرد آہیں بھرتا ہے اور محبوب کی تصویر سے ہم کلام ہونے کے لیے شعر کا سہارا لیتا ہے۔ ہجر و فراق کی لمبی راتیں کاٹنے کے لیے بھی شعر گوئی مفید ہے۔ فی زمانہ محرکاتِ شعر، انٹرنیشنل قسم کی نوعیت اختیار کر گئے ہیں۔ مثلاً مریخ کے لیے راکٹ کا چھوڑا جانا، ایرانی طلبا کا امریکی سفارت خانہ کو گھیر لینا، مزدوروں کی ہڑتال ہونا، کوئی جلسہ جلوس یا فنکشن وغیرہ وغیرہ ـــــ اگر کوئی دوست قرض لے کر واپس نہ کرے، اگر آپ کی محبوبہ آپ کے خریدے ہوئے ٹکٹوں کو لے کر کسی اور کے ساتھ سینما دیکھنے چلی جائے، اگر کوئی ساتھی کسی اچھے ہوٹل میں کھا پی کر دو دو گیارہ ہو جائے اور شاعر کو اکیلا چھوڑ کر نے کے لیے چھوڑ جائے تو بھی شعر کے لیے ذہنی سطح ہموار ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اصل بات ہے دل پر چوٹ لگنا! فلموں میں تو کسی کی موت ہو جائے یا کسی سے تھپڑ کھانے کے بعد بھی گیت یا غزل کی کافی گنجائش رہتی ہے ـــــ دراصل "ادب برائے زندگی" اسی کا نام ہے۔

قواعدِ شاعری:

ردیف قافیہ کی پابندی نہ کرنا جدید ادب کے علمبرداروں کی نظر میں پہلے ہی پہلے متروک مانا جا چکا ہے۔ لیکن جدید تر رجحان کے مطابق وزن اور بحر بھی ضروری نہیں رہے۔ اور جدید ترین رجحان یہ ہے کہ ایک عبارت کاغذ پر لکھ کر اوپر سے نیچے کی طرف کئی لمبے ٹکڑوں میں پھاڑی جائے اور پھر انہیں ٹکڑوں پر موجود رہ جانے والے الفاظ کو مختلف مصرعوں کی صورت میں لکھ لیا جائے میرے خیال سے یہ رجحان وقت کے تقاضوں کا صحیح آئینہ دار ہے۔ کیونکہ زندگی کے ہر شعبہ میں جب آزادی کا ماحول پیدا ہو چکا ہے تو شعر ہی کیوں پابندیوں میں گھرا رہے۔

شعر کی زبان:

فصاحت اور بلاغت کی جدید اقدار کے تحت شعر کی زبان جتنی مبہم، پُر اسرار اور رمزیاتی ہوتی ہے اسی قدر اچھا مانا جاتا ہے۔ پہلے شاعر کو شکایت ہوتی تھی کہ اگر شاعر اپنا کہا خود ہی سمجھے تو ایسی زبان قابلِ تعریف نہیں لیکن آج کل کے معیار کے مطابق اگر شاعر اپنا کہا اپنے آپ بھی نہ سمجھ سکے تو یہ امر قابلِ تعریف مانا جاتا ہے۔

اچھے شاعر کی خصوصیات:

١۔ انگریزی زبان سے اتنا واقف ہو کہ انگریزی میں لکھے خیالات کو اپنی زبان میں سمو سکے۔
٢۔ قینچی اور بلیڈ سے کاغذ کاٹنے میں مہارت رکھتا ہو۔
٣۔ علم عروض سے اتنا ضرور واقف ہو کہ کسی دوسرے شاعر کے مصرعوں میں مناسب ردّ و بدل کر سکے۔

۴۔ کسی قوال سے کم از کم چھ ماہ شرف تلمذ حاصل کرچکا ہو۔

۵۔ موسیقی پر اتنا ضرور قادر ہو کہ بحر سے خارج کسی مصرع کو کھینچ تان کر سُر میں لاسکے۔

(شرائط نمبر ۴ و ۵ غزل گو شاعروں کے معاملہ میں بہت ضروری ہیں)

۶۔ کسی نشہ آور شے کا استعمال کرتا ہو (اس میں تیز چائے بھی شامل ہے)

۷۔ نظم یا شعر مشاعرہ کی اسٹیج پر پیش کرنے سے پہلے نظم یا شعر سے طویل تر تمہید باندھ سکتا ہو۔

۸۔ ٹوٹنا، بکھرنا، انا، شعور ذات، آگہی، لاشعور، دھوپ، ترسیل، فنا، وجود، ہستی، بوجھ بوجھل، گرانبار وغیرہ الفاظ کا بے تحاشہ استعمال کرتا ہو۔

۹۔ کسی اچھے مکھن کی ٹکیہ ہمیشہ جیب میں رکھتا ہو۔

۱۰۔ مشکل ہندی الفاظ اردو میں استعمال کرسکتا ہو۔

۵۵

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	"	۳/۵۰ "
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۴/۵۰ "
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	"	۶/-
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/-
فقط	یوسف ناظم	"	۶/-
در پردہ	مسیح انجم		۶/-
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-
چوڑی کے غلام	"	مضامین	۷/-
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	۸/-
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/-
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعہ کلام	۸/-
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/-
انڈین کاجو	عاتق شاہ	"	۸/-
شوشے	ارشد علی خاں	"	۱۰/-

ضرور گڑبڑ ہے

سیاہ آپ کا چہرہ ؟ ضرور گڑبڑ ہے
بنا یا ہے حلیا ضرور گڑبڑ ہے
ہر گھڑے میاں مجنوں ہیں اپنا سر پکڑے
ھر نڈھال ہے لیلیٰ ضرور گڑبڑ ہے
تمام ولبصد شوق آج میرے لیے
رہی ہیں وہ حلوہ ضرور گڑبڑ ہے
اب شیخ کے دروازے پہ لیے ڈنڈا
ڑا ہے کابلی والا ضرور گڑبڑ ہے
ہیں جو ڈھونڈ رہا ہے بصد جلال و غضب
ہمارے سالے کا سالا ضرور گڑبڑ ہے
اری اہلیہ بھر کھا رہی ہیں شام و سحر
ماتی، املی ، مکورا ضرور گڑبڑ ہے
ی کہا رہا ہے کسی کے لیے خریدے گا
رلکا سونے کا بالا ضرور گڑبڑ ہے
سنا ہے چار دنوں سے تمہاری کھوج میں ہے
ی وزیر کا چمچا ضرور گڑبڑ ہے
ب شیخ پہ طاری ہے آجکل جوہر
یں سا غرو مینا ، ضرور گڑبڑ ہے

ھر سیوانی

ہزل

ہل شہروں میں پالے جائیں گے اور گائے جھاڑی میں
کہ لیڈر ریل گاڑی میں ہے جتنا بیل گاڑی میں"

دیہاتی بیل ماتم میں عجوبہ بن کے نکلا ہے
نہیں ہے فرق، اب کوئی بھی شہری یا پہاڑی میں

خدا جانے کہاں لے جائیگا طوفان ارماں کا
محبت نے تو پھینکا ہے ہمیں آفت کی کھاڑی میں

جو تاڑی بیچتا ہے اس کی فطرت میں یہ داخل ہے
کہ کم ہوتی ہے تو پانی ملا دیتا ہے تاڑی میں

یہ میرا مشورہ ہے دل کی لکڑی چیرتی رہنا
نہیں تو زنگ لگ جائے گی نظروں کی کلہاڑی میں

یہ فیشن بھی بہت ہی جلد ہوگا عام اے بانکے
کہ بیوی سوٹ میں، شوہر نظر آئے گا ساڑی میں

ادریس بانکے (کٹک)

غزل

ہے میرا لین دین شری گھاسی رام سے
واقف نہیں ہوں میں کسی سید امام سے
میرے سپرد کر دیا اپنا بھی کام کچھ
خوش ہو گیا جو باس میرا میرے کام سے
میں ٹاپتا رہا دیر سے کھڑکی کے سامنے
گھر میں پڑے ہوئے ہیں وہ سردی زکام سے
منہ سے لگا کے شیشہ جو پیتے تھے کل تلک
پینے لگے ہیں آج گرٹمبہ وہ جام سے
کمرے میں بیٹھ کر کبھی بنگلے پہ چڑھ کے میں
"آواز دے رہا ہوں تجھے ہر مقام سے"
کہتا ہوں اس کو آپ وہ کہتا ہے تو مجھے
پالا پڑا ہے مجھ کو عجب بدکلام سے
چکر خدا کے واسطے بکواس روک دو
محفل ہوئی ہے بور تمہارے کلام سے

چکر نظام آبادی

رؤف خوشتر
(گلبرگہ)

آبِ حیات

یوں تو بچپن سے ہم اپنی دادی اور نانی سے ہوا اور پانی کی روزمرہ زندگی میں اہمیت و افادیت کے متعلق سنتے آئے تھے لیکن عمر عزیز کا تقریباً نصف حصہ گذارنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس گرانی میں ہم روپیہ پانی کی طرح نہیں بہا سکتے تو پھر کیوں نہ پانی، پانی کی طرح بہائیں۔ آپ نے فضول خرچی اور شاہ خرچی کی اصطلاحیں ضرور سنی ہوں گی۔ ہماری آب خرچی دیکھئے کیا رنگ لاتی ہے۔ شہر کا اکلوتا تالاب ہماری اس آب خرچی پر آہیں بھرتا ہوا بادلوں کی شکل میں اڑ کر خشک ہوگیا۔ بے اختیار غالبؔ یاد آئے۔

ع باد رآیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

کاش وہ ہوا ہونے کے بجائے ہماری بدآبی پر شرم سے پانی پانی ہوتا۔ خیر جب نل بند ہوگئے تو کئی راز کھل گئے۔ صبح صبح ہر شخص گھڑی چھوڑ ہاتھ میں گھڑا لیئے پانی کی تلاش میں ایسے نکل پڑا جیسے سکندر آبِ حیات کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ اس پانی کی قلت کے آگے اچھے اچھے پانی بھرتے نظر آئے۔

ہماری نصف بہتر نے اس موقعہ پر آنکھیں دکھا کر صاف صاف کہہ دیا کہ آفس سے رخصت لیجئے اور پانی لایئے ورنہ پیٹ کی آگ نہیں بجھ پائے گی۔ ہمیں پہلی بار ان کی خوبصورت آنکھوں سے خوف محسوس ہوا۔ یوں لگا جیسے ان کی آنکھوں کا پانی مرگیا ہو۔ ہمیں حضرتِ فیضؔ کی محبوبہ کی آنکھوں اور بیگم صاحبہ کی آنکھوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آیا۔ ہم نے کہا تیری باتوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔ سالی صاحبہ کی شادی کا بہانہ کرکے ایک ماہ رخصت لی (اگرچہ کہ تمام سالیاں شادی شدہ ہیں) صبح صبح سائیکل پر دو گھڑے باندھ کر پانی کی تلاش میں نکل پڑے اور گھر کا منہ شام کو ہی دیکھتے — گویا صبح کی شام ہوجاتی جوئے شیر کے لیئے۔

جب کبھی ہم خالی گھڑا لیئے گھر واپس ہوتے تو بیگم کی معلوماتی جھڑپ سے دوچار ہوتے "اجی ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ فرہاد نے اپنی شیریں کے لیئے دودھ کی نہر کھود دی تھی۔ ایک آپ ہیں جو ہمارے لیئے دو گھڑے پانی نہ لاسکے" سچ مانیئے یہ سن کر ایسے لگا جیسے گھڑوں پانی ہمارے سر پر گرا ہو۔ مگر شکر ہے ہم انشورنس ایجنٹ

کی طرح چکنے گھڑے ہیں۔ پہلی بار ہمیں تعلیم یافتہ بیوی خطرناک ثابت ہوئی اور یہ خیال ہوا کہ تعلیم نسواں کے خلاف تحریک چلائی جائے مگر کھانے پینے کے مسئلہ نے ہمارے منصوبہ پہ پانی پھیر دیا۔

ایک رات تین بجے ہم پانی کی تلاش کے بعد مکان واپس ہو رہے تھے۔ پولیس والا ملا۔ ہم نے کہا تقریر سننے جا رہے ہیں۔ وہ پوچھا اتنی رات گئے کہاں اور کس کی تقریر ہے؟ ہم نے کہا دارد غہ جی آپ ہمارے مکان چلئے۔ مکان میں داخل ہوتے ہی بیوی کی تقریر شروع ہوگئی۔" پولیس والا بھی شاید بیوی زدہ تھا اس لئے ہنس کر چھوڑ دیا۔

پانی کی قلت نے ہمیں اس دوست کی یاد دلائی جو خود کو بڑے غلام علی خاں سے ذرا چھوٹا سمجھتے ہیں۔ اور ہر وقت اپنے مختلف راگوں سے ہمیں بور کرتے رہتے ہیں۔ ہم نے انھیں پکڑا اور کہا" میاں اس وقت سارے شہر کو تمہاری ضرورت ہے۔ وہ بولے: کیسے؟

ہم نے کہا: تم اپنا میگھ راگ چھیڑ دو۔ میگھ راجہ کا دل پگھل کر پانی پانی ہو جائے گا۔ اور یوں سارے شہر کو پانی پلانے کا تمہارا ارمان پورا ہوگا۔" ہمارے گلوکار دوست کا چہرہ قابلِ دید تھا۔ گویا چلّو بھر پانی میں ڈوب مرنے کا مقام تھا ان کے لیئے اپنی خفّت مٹانے کے لیئے دوسرا ہی راگ الاپنے لگے۔

"برخوردار تم سے پہلے اربابِ بلدیہ و محکمۂ آب رسانی کے اعلیٰ حکام میرے آگے پانی بھر کر گئے ہیں۔ لیکن میں ان کے آگے گھاس تک نہیں ڈالا اس لیئے کہ ہمارے اُستاد دوسرے شہر میں مقیم ہیں۔ وہاں اُنھوں نے پہلے ہی میگھ راگ چھیڑا ہے۔ اگر میں بھی وہی راگ چھیڑوں تو بادلوں کو پریشانی و پشیمانی ہوگی کہ کہاں برسیں"۔ تم جانتے ہو کہ بادل کوئی سیاسی لیڈر تو نہیں جو پل پل اپنی وفاداری بدلیں۔ وہ میرے اُستاد کے شہر پہ ہی برسیں گے۔"

ہر مجلس بلدیہ کی جانب سے بذریعہ لاری پانی تقسیم ہوتا۔ لاری کی آمد پہ محلہ میں پانی پت کی لڑائی کا سماں ہوتا۔ اہلیانِ محلہ صبح سے ہی پانی کے برتن لاکر قطار سے رکھ دیتے ہیں۔ یہاں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوتا۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے سماور و گلاس" سچی مساوات اور غیر طبقاتی سماج کی جھلک ہمیں سڑک پر ملی۔ کاش ہندوستان کے ہر شہر میں پانی کی قلت پیدا کی جائے اور حقیقی سوشلزم لایا جائے۔

ہم نے اپنے دوسرے دوست کو اس حشر برپا کرنے والے حالات میں آرام سے سوتے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ وہ بولے "اماں یار! میں کثیر العیالی کا اسی لیئے قائل ہوں۔ اب دیکھو پانی کے لیئے دو فرزند، گیس تیل کے لیئے دو بچیاں، قرض لینے کے لیئے دو فرزند قطار میں ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ۔ اتنے بچے نہ ہوں تو غلہ، پانی، تیل اور روپیہ کہاں سے آئیں گے۔ اپنی زندگی تو اُدھار اور قطار سے عبارت ہے۔ اُدھار اور قطار ہمارے مہذب معاشرہ کی دو لعنتیں ہیں اور مرنے سے پہلے آدمی ان سے نجات پائے کیوں؟

ہم نے موقع کی نزاکت کا پورا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اپنے تمام رشتہ داروں کے نام خصوصی پیغامات روانہ کئے کہ آپ اپنا متوقع دَورہ منسوخ کیجئے۔ بیگم اپنے عزیزوں کو خطوط لکھنے تیار نہیں تھیں۔ اُن کا

کہنا تھا کہ پانی کے لیئے خون کا رشتہ توڑا نہیں جاتا۔ ہم بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیئے ہوئے تھے۔ انھیں بالآخر آمادہ کرلیا۔ خطوط لکھتے وقت اُن کی آنکھوں سے برابر پانی بہہ رہا تھا۔ خطوط کو سپرد ڈاک کر کے اطمینان کی سانس لی۔

لیکن یہ ہماری خوش خیالی ثابت ہوئی۔ ہمارے سالے صاحب سارے کام پس پشت ڈال کر چلے آئے جب ہم مکان پہنچے تو وہ نہا رہے تھے۔ پانی کو یوں ضائع ہوتے دیکھ ہم بے ہوش ہونے ہی والے تھے کہ باورچی خانہ سے بیگم کی آواز آئی کہ بے ہوش ہونا سردست ملتوی کیجئے اس لیئے کہ ہوش میں لانے کے لیئے پانی نہیں ہے۔ اگلے روز سالے صاحب نے یہ دیکھ کر کہ ہم کتنے پانی میں ہیں اپنے بھانجے اور ہمشیرہ کو لے کر چلے گئے اور ہم ایک ہاتھ میں گھڑی اور دوسرے ہاتھ میں جی ہاں گھڑا لیئے پانی۔ پانی کہہ رہے ہیں۔

۷۷

مشتاق پردیسی

انٹرویو

نام؟۔ کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ
خوب!۔ دولت کدہ؟ ضلع تھانہ

علم؟ بی۔اے سیاسیات میں ہوں
ویسے تاریخ بھی تھا اک مضموں

کام اب اتنا مہربان کریں!
یو۔این۔او کیا ہے؟ یہ بیان کریں

"جی بتاتا ہوں۔ قیل مالنکوف
ملک یو ملک کے صدر تھے موصوف

اک سوال اور کر رہا ہوں میں
آپ ٹونیکو سے تو واقف ہیں؟

یہ تو بستی بہت پرانی ہے
میکسیکو کی یہ راجدھانی ہے

آپ کی علمیت کو مان چلے
ماؤنٹ بیٹن کا کچھ بیان چلے

اس سے واقف نہ ہوگا کون بھلا
سب سے اونچا پہاڑ دنیا کا"

آپ تو علم کا خزانہ ہیں۔!
شریاتین سنگھ بھلا کیا ہیں

تین سنگھ کیا کوئی اناڑی ہیں
"دوڑ کے عالمی کھلاڑی ہیں

اب ذرا کچھ ادب کی دنیا سے
مرزا نوشہ بتایئے کیا تھے

"مرزا نوشہ خطاب تھا ان کا
نام تو تھا فقط بہادر خاں
ان سے ہر اہلِ ذوق واقف ہے
وہ تھے دلّی کے آخری سلطان"

"آپ سا جینئس نہیں کوئی
ہم سبھی کو ڈراپ کرتے ہیں
شرط یہ ہے الٹ کے پڑھیے گا
لسٹ میں آپ ٹاپ کرتے ہیں

بارات کا گھوڑا

ہوا کچی سڑک پر ختم آخر جب سفر بس کا
تو منزل پہ پہنچنے کو مسافر نے لیا تانگا
وہ تانگا میر امن کے زمانے کا کھٹارا تھا
تھا جس کا اسپ، اسپِ حضرتِ سودا کا پڑوتا
کبھی چلتا، کبھی رکتا، کبھی پیچھے سرکتا تھا
پریشاں تھا مسافر ماجرا ہی تھا وہ کچھ ایسا
ہزاروں گالیاں بھی دم بدم کھانے کو ملتی تھیں
مگر گھوڑا نہ اپنی وضعداری کو بدلتا تھا
اتر کر ناچتا گھوڑے کے آگے تانگے والا جب
تو تھوڑی دیر کو اڑتا ہوا کے دوش پر گھوڑا
مسافر پوچھتا تھا کیوں یہ حرکت ہے مداری سی
تو وہ کہتا کہ یا حضرت یہ ہے بارات کا گھوڑا
کرائے پر لیا کرتے تھے اس کو شادیوں والے
شریفوں کا یہ گھنٹوں ناچنا بھی دیکھتا رہتا
ابھی کچھ دن ہوئے جوتا ہے میں نے اسکو تانگے میں
پرانی عادتیں مجھ کو یقیں ہے بھول جائے گا
مسافر نے اسے یوں داد دی حاضر جوابی پر
سفر میں آج تک پایا نہیں ہشیار تم جیسا

○

مختار یوسفی
مالیگاؤں

رشید عارف (پٹنہ) ◎ ۱ ۲ ۳ پٹنہ کے سنیما

منائیں اپنی محبت کی یادگار کہاں
ہوئی تھیں پہلے پہل تم سے آنکھیں چار کہاں
اشوک[۱]، الپسرا[۲]، ونیا[۳] کرا ایلفنسٹن میں
کروں تمہارا میں سنڈے کو انتظار کہاں
بیٹے ہیں کوچۂ جاناں میں یا کہ بھٹی میں
ہوا ہے شیخ جی دامن یہ تار تار کہاں
جو چاہتے ہو فراغت کرا لو نس بندی
ضرورتوں کا مگر دوستو شمار کہاں
مزاج ترشی پہ مائل ہے ان دنوں ان کا
بس ایک فکر ہے نمکی کہاں اچار کہاں

نصیب ہی میں پپیتا لکھا ہے جب عارف
تو آپ کھائیں گے انگور یا انار کہاں

◎

مجیب الرحمٰن بزمی

سوئے جذبات کو ہنس ہنس کے جگاتی کیوں ہو
شک و شبہات کی دیوار اٹھاتی کیوں ہو
عہدِ پیری میں بھی "ہیما" سے حسیں لگتی ہو
اپنی نو عمری کی تصویر دکھاتی کیوں ہو
تم نے تو عہدِ وفا یاد رکھا تھا مجھ سے
پھر پڑوسی سے مرے آنکھ لڑاتی کیوں ہو
احتیاط اتنا کہ میک اپ نہ بگڑنے پائے
چوریچے سے چوریچے اچھی پھر یہ لڑاتی کیوں ہے
رقص کرنے میں تو دیتی ہو کمر کو جنبش
ہاتھ کے ساتھ مگر آنکھ نچاتی کیوں ہو
جاگ جائیں گے سبھی اپنے محلے والے
اس قدر زور سے بزمی کو بلاتی کیوں ہو

○

ایس ایس۔ علی
(بالاپور)

خیالوں میں

خدا کے دیئے سے گھر میں دو، دو چراغ ہیں۔ چراغ سے ہماری مراد سچ کے چراغ نہیں ہمارا مطلب بچوں سے ہے۔ ویسے روشنی کے لیے گھر میں ٹیوب لائٹ موجود ہے جس کی پوزیشن ہر تہوار کے موقع پر بدلتی رہتی ہے۔ اللہ رکھے بیگم صاحبہ بھی گنوار قسم کی سہی مگر جاہل نہیں۔ پڑھی لکھی ہیں یعنی چوتھی فیل! اسی لیے اکثر کہانیوں کی کتابیں بجائے چراغوں کو پڑھانے کے خود پڑھا کرتی ہیں۔ اور رات کو جب ہم تھکے ہارے قسمت کے مارے، کرانے کی دوکان بند کر کے اس کے قفل کی تین چار بار جانچ کر کے گھر لوٹتے ہیں تو بیگم صاحبہ چٹخارے لے لے کر وہ کہانیاں ہمیں سناتی ہیں اور ہمیں اس بات کی کوفت ہوتی ہے کہ ہم ان کہانیوں میں سے کسی ایک میں بھی فٹ نہیں ہوتے۔ کسی کہانی کے ہیرو کی خصوصیات ہم میں نہیں۔ یہاں تک کہ اگر کسی کہانی کا ہیرو ہماری طرح بیوپار کرتا ہے تو وہ شام کو خوش خوش چاندی کے روپیوں کی گٹھری سر پر لیے گھر لوٹتا ہے اور ہم ہیں کہ بُری صورت بنائے چہرے پہ بارہ (بلکہ تیرہ) بجائے جیب میں نوٹوں کا چھوٹا سا بنڈل لیے گھر لوٹتے ہیں۔ کبھی کبھی ہمیں خود پر بہت غصہ آتا ہے کہ ہم کرانہ مرچنٹ کیوں ہیں "سوداگر" کیوں نہیں ہیں۔ ایسے موقع پر دل سے آہوں کے ساتھ ساتھ دو چار گالیاں بھی نکل جاتی ہیں لیکن جب ہم ان کا سمت کا تعین کرنے بیٹھتے ہیں تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ ان کی بوچھار کس کی جانب ہے۔ کہانی کے ہیرو کی جانب جو ہمارے لیے رقیب کا کردار ادا کر رہا ہے یا اس زمانے کی جانب جس نے چاندی کے بھاری بھرکم سکوں کو کاغذ کی ہلکی پھلکی نوٹوں میں تبدیل کر دیا ہے یا بیگم کی جانب جن کی وجہ سے ہمارا خون سوکھ رہا ہے یا پھر کہانی کے مصنف کی جانب جو صحیح معنوں میں اس کا ذمہ دار ہے؟ یا پھر خود اپنی جانب؟ (آخری امکان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے) اور جب ہم اس کشش و پنج میں لائٹ کے سامنے لٹکی ہوئی بیگم کی بھونڈی سی تصویر کو گھورتے ہوتے ہیں تو گویا اچانک فلم کٹ جاتی ہے اور ہال میں روشنی ہو جاتی ہے یعنی بیگم گرجتی ہیں۔ "کیا سوچ رہے ہو، کھانا کھاؤ"۔

دو چار منٹ بعد جب ہم اپنے ہوش و حواس میں آتے ہیں تو اپنے آپ کو کھانا کھاتے ہوئے پاتے ہیں۔ اور اپنی حالت دیکھ کر آنکھوں میں کسی پرانی فلم کا سین گھوم جاتا ہے۔ پرانی فلم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ یہ فلم ہم نے بچپن میں دیکھی تھی۔ جوان ہوتے ہی غالب کی طرح شادی ہو گئی اور شادی کے بعد سے فلم دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ فلم کا سین کچھ اس طرح ہے کہ ایک پردیسی کس

شہزادی کی سرحد میں "گھسا چلا آتا ہے" (جان بوجھ کر کیونکہ وہ ہیرو ہوتا ہے) اور شہزادی اسے اپنا غلام بنا لیتی ہے) اسے ہمیشہ اپنی کڑی نگرانی میں رکھنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہیرو خوب رو نوجوان ہے اور ساتھ ہی ساتھ دل چسپ بھی۔ اب ظاہر ہے کہ ہیرو اور بیگم کو شہزادی تصور کرنے لگتے ہیں۔ یقین مانئے اس کیفیت سے ہمیں انتہائی ذہنی سکون نصیب ہوتا ہے۔ ہم اس ذہنی سکون کے پرسکون دریا میں بہتے چلے جاتے ہیں کہ بیک گراونڈ میں کھٹ کھٹ کی آواز آتی ہے۔ ہم سوچنے لگتے ہیں کہ یہ آواز کیسی؟ ذہن کو جھٹکنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا ہاتھ بار بار خالی پلیٹ سے ٹکراؤ کی آواز پیدا کر رہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک کرخت آواز کانوں میں گونجتی ہے۔

"کیا کھانے کے بعد اب پلیٹ بھی کھا جاؤ گے؟ آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے؟ کہیں بھنگ تو نہیں پی گئے؟!!"

اُس وقت ہماری کیا حالت ہوتی ہوگی۔ اس کا اندازہ آپ خود ہی کر لیجئے۔

فرید سحر

صرف بالغوں کے لئے

اخباروں اور فلمی اشتہاروں میں آپ نے یہ عبارت ضرور پڑھی ہوگی۔ "صرف بالغوں کے لئے" ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج کل فلمی صنعت "بالغوں" پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر فلمیں" صرف بالغوں کے لیئے" ہی بنائی جا رہی ہیں' یہ اور بات ہے کہ سینما ہال میں بے چارے بالغوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی ہوتی ہے۔

ایک دن ہم نے اخبار میں فلمی صفحہ کا بطور خاص مطالعہ کیا' کئی فلموں کے نام کے ساتھ یہ عبارت بھی نمایاں طور پر درج تھی ۔۔۔ "صرف بالغوں کے لئے"۔ اس کے علاوہ انگریزی حرف "A" بھی واضح طور پر درج تھا۔ ہمیں بھی شوق چرایا کہ چلو دیکھیں کہ آخر بالغوں کے لیئے بنی فلم میں کیا تماشہ ہوتا ہے؟ لیکن افسوس اس بات پر ہوا کہ ایسی تمام فلمیں انگریزی زبان میں تیار کی جاتی ہیں جبکہ ہم انگریزی میں ابتداء ہی سے کمزور رہے ہیں پھر ہم نے سوچا کہ اگر انگریزی سمجھ میں نہ آئے تو کیا ہوا؟ اداکاروں کے حرکات و سکنات دیکھ کر فلم کی کہانی سمجھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ فلم دیکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

وقت مقررہ پر ہم تھیٹر پہنچ گئے۔ وہاں کا نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ مختلف سمتوں میں ٹکٹ کے لیئے لوگ قطاریں بنائے کھڑے تھے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ وہاں اکثریت "بچوں" کی تھی ۔۔۔ کمسن اور کم عمر بچے! پہلے تو ہمیں شک ہوا کہ کہیں ہم غلط تھیٹر کو تو نہیں پہنچ گئے؟ لیکن جب فلم کا نام دیکھا تو ہمارا شک جاتا رہا۔ بچے ہمیں گھور گھور کر اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم نابالغ ہوں اور غلطی سے وہاں پہنچ گئے ہوں۔ خیر ۔۔۔ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر ہم نے بھی ایک قطار میں اپنی جگہ سنبھال لی۔ ٹکٹ گھر کھلنے تک

ہمارے چند قدیم ساتھی بھی وہاں جمع ہو گئے۔ سب نے ہمیں وہاں دیکھ کر تعجب اور خوشی کا اظہار کیا۔ تعجب اس بات پر کہ ہم پہلی بار ایسی منحوس جگہ پائے گئے اور خوش اس لیئے ہوئے کہ ہم بھی ان کی سوسائٹی کے رکن بن گئے ہیں۔ اس وقت ہمیں اس قدر ملال ہوا کہ پوچھئے نہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم بغیر لباس بازار میں پہنچ گئے ہوں لیکن چونکہ ایک غلطی تو ہو ہی چکی تھی اس لیئے اس ایک غلطی کو نبھانے کے لیئے مزید غلطیوں سے سمجھوتہ ضروری تھا۔

ہم خاموشی سے ٹکٹ کے لیئے اپنی باری کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران فلم کے بارے میں یار لوگوں کی گفتگو اور تبصرے نہایت آسان، سہل اور گندی زبان میں جاری تھے۔ خیر ــ جوں توں کر کے ہمیں ٹکٹ مل گیا اور تھیٹر کے اندر ہم نے اپنی نشست سنبھال لی۔ وہاں کا ماحول بھی بڑا عجیب تھا۔ لوگ بے چینی سے فلم کے شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں روشنی بند کر دی گئی اور ہال میں اندھیرا چھا گیا۔ ابتدا میں حسب روایت "نیوز ریل" دکھائی گئی۔ پھر فلم شروع ہوئی۔ ہمیں بہت تعجب ہوا کیونکہ ہندی فلموں کی طرح شور شرابہ کچھ نہیں۔ البتہ نیم عریاں لباس میں کچھ کردار پردے پر اپنا کام انجام دے رہے تھے۔ درمیان میں کچھ مسخرے بھی آدھمکتے اور جلد ہی غائب بھی ہو جاتے۔ انگریزی میں اس قدر تیز گفتگو کہ ایک لفظ بھی پلے نہ پڑتا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ وہاں نوّے فیصد لوگ انگریزی سے نابلد تھے کیونکہ ہال میں مکمل سکوت طاری تھا۔ پھر "انٹرول" ہو گیا۔ انٹرول تک ایک بھی منظر ایسا نہیں تھا کہ جس کا ذکر کیا جا سکے۔ اوروں کی طرح ہم بھی باہر چلے آئے۔ دل میں خیال آیا کہ واپس چلیں لیکن پھر وہی فطری تجسس نے واپسی سے باز رکھا کہ شاید انٹرول کے بعد کوئی منظر کام کا نکل آئے!

انٹرول کے بعد فلم شروع ہوئی۔ لوگ پہلے سے زیادہ منہمک ہو گئے۔ ماحول پُراسرار بن گیا۔ ہم نے اطراف کا جائزہ لیا تو مارے حیرت کے ہماری آنکھیں باہر کو نکل پڑیں۔ سارے تھیٹر میں لوگ مچل رہے تھے۔ ہمیں پہلے تو شک گذرا کہ کہیں ہم خواب تو نہیں دیکھ رہے ہیں لیکن جب اپنے جسم کو چھوا تو پتہ چلا کہ ہم با ہوش و حواس اپنی سیٹ پر براجمان ہیں۔ اطراف دیکھ کر خود پہ نظر دوڑائی تو ایک نئی بات آشکار ہوئی کہ ایک ہم ہی "بدھو" بنے بیٹھے ہیں۔ ہم سے رہا نہ گیا۔ ہم ابھی یہ سوچ ہی رہے تھے کہ باہر نکلیں لیکن اتنے میں پیچھے سے ایک نرم و نازک ہاتھ ہمارے کاندھے پر پڑا۔ مارے خوف کے ہمارے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل پڑی۔ ایک نسوانی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ "پلیز خاموش رہیئے ــ!!" ہم نے اٹھنا چاہا، لیکن اس ہاتھ نے دبائے رکھا۔

بڑی مشکل سے ہم نے التجا کی "دیکھئے بہن۔ اس طرح ستائیے نہیں، ہمیں ایک ضروری کام سے جانا ہے!" آواز آئی "معاف کیجئے میرا نام ملکہ ہے!" پھر اس کے بعد ہاتھ خود بخود ہٹ گیا۔ شاید "بہن" کے لفظ نے ملکۂ ترنم کو اپنا ہاتھ ہٹا لینے پر مجبور کر دیا۔

ابھی ملکہ سے چھٹکارا نصیب ہوا ہی تھا کہ [illegible]

لیکن جیسے ہی ہماری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے فوری "سوری دوست" کہہ کر ہمیں آزاد کردیا۔ بُرا ہو جدید فیشن کا کہ ہم بھی نہ بچ سکے۔ نتیجہ میں اس مسخرہ کو ہم میں ایک دوشیزہ کا پیکر دکھائی دیا۔ وہ تو خیر ہوئی کہ بروقت ہماری "مردانہ آواز" نکل پڑی۔ ایک ایک پل ہمیں گراں گذر رہا تھا۔ جوں توں کر کے فلم ختم ہوئی۔ پلٹ کر دیکھا تو کسی "ملکہ" کا کوئی وجود نہیں تھا۔ ہم نے فوری باہر کا راستہ اپنایا۔ وہاں بھی "ملکہ" ندارد۔

حیرت اس بات پر کہ "ستم گر" کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ اتنے میں ایک آٹو قریب سے گذرا پھر وہی نسوانی آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی ــ "بدھو کہیں کا ــ!!" اور پھر یہ جا وہ جا ــ!

یقین مانیئے اس فلم میں بالغوں کے لیئے کچھ بھی نہ تھا۔ صرف "عنوان" کا سہارا لیکر عام انسانوں کو اُلو بنایا گیا۔ بہتر ہوتا اگر ہم کوئی ہندی فلم دیکھ لیتے۔ کیونکہ ہندی فلموں میں آج کل کچھ "زیادہ" ہی دکھایا جارہا ہے۔ بُرا ہو ہمارے شوق کا کہ "ہم بھی دیکھنے گئے تھے پہ تماشہ نہ ہُوا ــ! بلکہ اُلٹا غضب یہ ہوا کہ "بدھو" کے لقب سے سرفراز کئے گئے۔ ہم اب بھی اس سوچ میں گم ہیں کہ ہم "بدھو" کیوں ہیں؟ اس حادثہ کے بعد سے جب بھی بازار میں فلمی اشتہاروں پر "A" بڑے حرف کی شکل میں دکھائی دیتا ہے تو یقین مانیئے جسم پہ رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دن اور آج کا دن۔ ہم نے فلمی صفحہ یا اشتہارات دیکھنا ترک کردیا ہے۔

کاش "صرف بالغوں کے لیئے" بنائی گئی فلم ہم نہ دیکھتے ــ!!

▼▼

نیا آدمی نامہ

نظر برنی (دہلی)

شورش مچا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
سازش رچا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
رشوت چٹا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ایماں لٹا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

دفتر میں افسروں کو پٹاؤ مزے کرو
جنتا سے کھاؤ اور کھلاؤ مزے کرو
بابو پہ اپنا رعب جماؤ مزے کرو
جمہوریت کا شور مچاؤ مزے کرو

مرغے اڑا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے چبا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رشوت کھلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
"مسکہ" لگا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

وہ ملائیں مالیں فش ہوا دعوئ لیڈری
جنتا کے آگے ایک نہ اپنی بھی چل سکی
اپنا وہ زعم اور اکڑ رہ گئی دھری
سب برگ و بار اڑ گئے ایسی ہوا چلی
جو جیل جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
جو جیل جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
چکی چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

چندہ کرو عوام سے مونچھوں پہ تاؤ دو
کھاؤ کھلاؤ خوب، نہ تم پھر ڈکار لو
بکتا رہے سماج، نہ تم اس کا غم کرو
جس راہ میں ہو فائدہ، اس راہ پر چلو
پیسے منا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
پیسے بہا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اپنا گنوا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

غصہ میں رات ہو گئی اک زور دار جنگ
بیگم نے استعمال کیے تیر اور تفنگ
پل بھر میں اڑ گیا مرے چہرے کا لال رنگ
وہ کہتی ہیں اس طرح کہ مرا قافیہ ہے تنگ

اب تک ہے بھید بھاؤ امیر و غریب کا
کھاتا ہے کوئی ڈھونگ کا کوئی نصیب کا
پرسان حال کوئی نہیں ہے ادیب کا
فاقہ کشی بنی ہے مقدر ادیب کا

ان کو ستا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
آنکھیں بچھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

عزت بچا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
کوٹھے لگا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

تشہیر تلخیوں کی ہوتی ہے
محبتوں کو کوئی خبر نہیں مانتا

"جشنِ بھارت چند کھنہ" کی سہ روزہ شاندار تقاریب

جناب منیر احمد شیخ کی تقریر

جناب محمد منیر احمد شیخ پریس کونسل حکومت پاکستان متعینہ دہلی نے زندہ دلانِ حیدرآباد کے ادبی اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ "میں زندہ دلان حیدرآباد کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انھوں نے مجھے یہاں اس محفل میں حاضر ہونے کا موقع دیا۔ یہ امر میرے لیئے باعثِ افتخار ہے کہ بزم نے مجھے حیدرآباد بلاکر نہ صرف یہاں کے ادباء سے ملنے کا موقع عطا کیا بلکہ اہل حیدرآباد کی محبتوں اور خلوص سے ایک پردیسی کا دامن بھی مالا مال کر دیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں جب بھی اپنے وطن کو لوٹوں گا تو تہی داماں نہیں لوٹوں گا۔ میری جھولی یہاں کی محبتوں اور خلوص سے بھری ہوگی اور اس کی خبر میں اہل وطن کو دوں گا۔ کیا وقت آن لگا ہے کہ اب محبتوں کی اطلاع دینی پڑتی ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ہماری تلخیاں تو اخبارات کی شہ سرخیاں بن جاتی ہیں مگر باہمی محبت کی خبر اخبار میں نہیں چھپتی۔ یہاں آکر میرے اس یقین کو بھی تقویت پہونچی ہے کہ انسان سرحد کے دونوں جانب بستے ہیں۔

جہاں تک اردو زبان و ادب کا تعلق ہے تو اس سے کس کو انکار ہے کہ حیدرآباد نے اس زبان کے شعر و ادب میں گرانقدر اضافہ کیا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بے پایاں مسرت ہوتی ہے کہ اہل حیدرآباد نے اپنی روایات کو ذرا کمزور نہیں پڑنے دیا اور یہاں کے لکھنے والوں میں شگفتگی و تازگی بھی ہے اور تخلیقی قوت کا وہ خوبصورت اظہار بھی جو کسی تحریر کو ادب کا درجہ دیتی ہے۔ پاکستان سے آنے والا ہر ادیب و شاعر جب ہندوستان آتا ہے تو حیدرآباد آنے کی آرزو بھی اپنے سینے میں لیئے آتا ہے۔

اردو زبان و ادب کو آپ نے جس طور پر سرسبز رکھا ہے۔ اس کی کشش ہے جو ہم سب کو آپ کے درمیان اپنا چہرہ پہچاننے میں مدد دیتی ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ حیدرآباد ہمیشہ اسی طرح اپنے تخلیقی لمحوں کو زندہ رکھے تاکہ یہاں کے رہنے والوں کے دلوں کی دھڑکنوں کو دنیا والے برابر سنتے رہیں۔

◎

[یہ مضمون سہ روزہ جشن کھنہ کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا]　　بھارت چند کھنہ

واہ رے میں!

عزت مآب جناب رام دیو صاحب، عالی جناب منیر احمد شیخ صاحب، جناب صدر اور معزز حاضرین!
انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے کہ سب سے پہلے کی جانے والی بات سب سے پہلے ہی کرنی چاہیئے۔ اس موقع پر کہنے کی بات یہ ہے کہ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ان پھولوں کے ہاروں میں سے کسی ہار کی قیمت کا بار برداشت نہیں کیا۔

کسی شخص کا جشن منایا جانا جس میں وہ خود بھی شریک ہو کچھ عجیب سا لگتا ہے، خصوصاً ایسے شخص کو جو جس زاویۂ نگاہ سے بھی اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھتا ہے خود کو جشن منائے جانے والی شئے نہیں پاتا۔ سوچتا ہوں کہ اس جشن کے بارے میں کئی دانشور ہوں گے جو ضرور یہ سوچتے ہوں گے کہ آخر اس خبیث ہی کا جشن کیوں منایا جارہا ہے جبکہ شہر اتنے سارے عالموں اور فاضلوں سے بھرا پڑا ہے —!

اس بارے میں اسی بات کو لیجئے کہ غالب جیسی عظیم ہستی کا جشن منایا گیا تو اس کے مرنے کے ایک سو سال بعد —— اور وہ بھی بعض صورتوں میں اس لیئے کہ جشن منانے میں اردو اور گالب کا نہیں بلکہ جشن کے منتظمین کا سراسر بھلا ہونے والا تھا۔ کچھ جشن سیاسی پہلو لیئے ہوتے ہیں جن کی آڑ میں کیسہ ہائے زر بھی ہوتے ہیں، مگر اپنی حالت کچھ ایسی ہے کہ گرانی نے ہمارے جلسوں کی آمدنی اور اخراجات میں ڈیڈ ہیٹ ہوجانے کی صلاحیت پیدا کردی ہے اور اس طرح کیسہ زر کی بات تو کجا کاسۂ سر بھی سلامت رہ جائے تو غنیمت ہے۔

البتہ یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ سنہ ۱۹۶۶ء سے، جب کہ ادارہ زندہ دلان حیدرآباد کو باضابطہ تشکیل دی گئی، خاکسار اس ادارہ کا صدر رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ مالی اعتبار سے، رسوخ کے زاویۂ نگاہ سے یا کسی بھی اور پہلو سے — اور اس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے شرم سی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے زندہ دلان کے کاموں میں کسی قسم کا کوئی کارآمد کام آج تک انجام نہیں دیا۔ ہوسکتا ہے کہ کسی دستوری صدر کی طرح میں نے اس ادارہ کی کارکردگی میں کسی قسم کا رخنہ نہ ڈالا ہو، اور جس طرح دستوری صدر اس مقام پر جو ان کی دستخط کے لیئے مخصوص کر دی گئی ہو، اپنے دستخط بٹھا دیتے ہیں، اس طرح خاکسار بھی زندہ دلان کی مرضی اور ان کے ارادوں کی

تو سونگھ کر اُن کے حسبِ منشا' اپنے مشورے پیش کرتا رہا ہے جس سے مجموعی طور پر یہ ایسا ظاہر ہوتا رہا ہے کہ میری بات مان لی گئی ___ اس طریقۂ عمل سے نہ تو زندہ دلوں کی زندہ دلی میں کوئی فرق آتا ہے اور نہ ہی میری حیثیت اور رتبہ میں کسی قسم کی کمی واقع ہوتی ہے اس طرح اگر یہ جشن نکیل کی سیدھ چلنے کے صلے میں منایا جارہا ہے تو اس اعتبار سے غالباً میں اس کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہوں ویسے میری غیر افادیت کچھ ایسی ہمہ گیر قسم کی ہے کہ بیوی بچے صاف صاف اور بار بار آگاہی بخش چکی ہیں کہ خاکسار ان کی زندگی میں ایک ایسا شخص ثابت ہوا ہے جس نے گھر کے کام کاج میں آج تک ایک تنکہ توڑنے کی بھی کبھی کوشش یا زحمت گوارا نہیں کی۔!

اگر میرا دستوری قسم کا صدر ہونا بھی اس جشن کے منانے کی وجہ نہ ہو تو پھر ایک وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ زندہ دلان سے میری چودہ سال لمبی وابستگی رہی ہے۔ اس بارے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جب میں امریکہ سے واپس ہوا اور زندہ دلوں سے ملاقات ہوئی تو ان میں سے کچھ حضرات میری طرف گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ پھر الگ ہو کر آپس میں کچھ "کھسر پھسر" کرنے لگے۔ ان کی باتوں کی بھنک میرے کان میں بھی پڑی۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ اب زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں۔ دوسرے صاحب نے کہا ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اس پر پہلے نے کہا۔ دیکھتے نہیں گالاں چپک کر گویاں کھیلنے کے گیتیاں بن گئے ہیں۔ گردن کی رگیں ریل کی پٹری کا نقشہ بنا رہی ہیں۔ آنکھوں کے لئے عینک سے بڑھ کر دوربین کی ضرورت پڑ رہی ہے اب کیا موت کے فرشتہ کا صداقت نامہ کی ضرورت ہے چنانچہ طنز و مزاح کی یہ اشرف مخلوق سوچ رہی تھی کہ بیشتر اس کے کہ دستوری صدر صاحب بغیر نوٹس دیئے اس کیفیت میں پہنچ جائیں جس میں لوگ آخری رسومات انجام دیتے وقت یہ کہتے ہیں کہ :

خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والے میں

ان کو فوراً کچھ کرنا چاہیئے ___ اور اس کے بعد انھوں نے مجھے بتلائے بغیر میرا جشن منانے کا فیصلہ کرکے ہی مجھے مطلع کیا۔

خیر وجہ خواہ کچھ ہی ہو یہ جشن تو اب ایک حقیقت بن چکا ہے اور میں زندہ دلانِ حیدرآباد کے جملہ عہدہ داران اور اراکین صاحبان کا بے حد ممنون ہوں کہ انھوں نے اس بے مقصد سے ذرہ کو نوازا ہے اور جب اس نوازش کے بارے میں سوچتا ہوں تو اس خیال سے بدن میں جھرجھری سی پیدا ہونے لگتی ہے کہ اس جشن کے خلاف کوئی آزاد ہندوستانی مرن برت نہ شروع کر دے یا کوئی اردو کا مجاہد اس بات کا مطالبہ نہ کر بیٹھے کہ جب تک حکومت کسی وظیفہ یاب جج کا ایک کمیشن مقرر کرکے اس جشن کے اندرونی حالات کی جانچ نہیں کراتی وہ فلاں سڑک کے بیچوں بیچ دھرنا دے بیٹھا رہے گا۔

ادارہ زندہ دلانِ حیدرآباد کے تعلق سے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ جب سے یہ قائم ہوا ہے اس کی یہ کوشش رہی ہے کہ اردو ادب میں طنز و مزاح نگاری اور شاعری کو وہ مقام حاصل ہو جائے جس کی یہ صنف ادب مستحق ہے۔ یہ صنفِ ادب دوسرے اصناف سے مشکل ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً اس صنف کے

لکھنے والوں کی تعداد ہر دَور اَدب میں اس قدر کم نہ ہوتی۔ لیکن اردو ادب کے کسی زمانہ میں بھی اس کو اس کا جائز مقام حاصل نہیں ہوا۔ اپنے نصب العین کے حصول کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ اس صنفِ ادب کے لکھنے والوں میں اضافہ ہو اور ادب جو پیدا ہو، وہ معیاری ہو تاکہ اس کی ساکھ اور مرتبہ بڑھے۔ اس کام میں جن لوگوں نے ہاتھ بٹایا ہے ان میں سرفہرست جناب مصطفےٰ کمال صاحب کا نام ہے۔ موصوف اردو ماہانہ رسالہ شگوفہ کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ رسالہ پچھلے بارہ برسوں سے پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ اور اس کی نمایاں خصوصیت اور خوبی یہ ہے کہ اس کا معیار کبھی کم نہیں ہوا۔ مزاحیہ رسالوں میں شگوفہ کا پابندی سے اپنا معیار قائم رکھتے ہوئے شائع ہونا بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندوستان میں اردو کا اس وقت کوئی اور ماہانہ مزاحیہ رسالہ شائع نہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنے اور ان کو گوشۂ گمنامی سے نکال کر پڑھنے والوں تک پہنچانے میں مدیر شگوفہ قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ شگوفہ ہمیشہ جاری و ساری رہے گا۔ اور اس کی مقبولیت اور ترقی ـــــ جو طنز و مزاح کی مقبولیت کے مترادف ہے ـــــ میں اَور بھی اضافہ ہوگا۔

میں مشکور ہوں ڈاکٹر زینت ساجدہ صاحبہ، ڈاکٹر راج بہادر گوڑ صاحب، جناب مجتبیٰ حسین صاحب، ڈاکٹر رشید موسوی صاحبہ، جناب رشید قریشی صاحب، جناب پروینہ یداللہ مہدی اور جناب مسیح انجم صاحب کا جنھوں نے یہ ثابت کرنے کی بے سود کوشش کی ہے کہ مجھ جیسے معمولی قسم کے آدمی کا بھی جشن منایا جاسکتا ہے۔ میں مشکور ہوں عزت مآب بی رام دیو صاحب، جناب منیر احمد شیخ صاحب اور جناب فکر تونسوی صاحب کا جن کی موجودگی سے ہمارے اس اجلاس کی عزت اور آبرو میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔

بالآخر میں اپنے سب کرم فرماؤں کی نیک تمناؤں کو اپنے دل میں سماتے ہوئے دست بدعا ہوں کہ خدا مجھے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

اشفاق انجم
(مالیگاؤں)

بھیجئے!

(دلاور فگار کی نذر—)

حضرت! نشاطِ رُوح کا سامان بھیجئے
کیسا ادب چڑھا وہاں پروان، بھیجئے

"چٹنی" پہ کر رہے ہیں گزر اشتہا میں بھی
لِلّٰہ! کچھ لذیذ سے پکوان، بھیجئے

کچھ لیڈروں کو اب بھی شکایت ہے قبض کی
ڈی۔ پی سے ہی سہی یہ سرنجان، بھیجئے

میدانِ شاعری یہاں اکھاڑہ بن گیا
ناسخ سا ہو جو کوئی پہلوان، بھیجئے

ہر اک مشاعرے میں گویّوں کی بھیڑ ہے
کچھ "حلق کنٹرول" کے سامان، بھیجئے

گر ہو مشاعرہ کوئی لاہور میں فِگار
ساحر، فراق و تاباں کا چالان، بھیجئے

میں بھیجتا ہوں آپ کو مجروح کی "غزل"
میرے لیئے قتیل کا دیوان، بھیجئے

تخلیق تو حضور کی زوروں پہ ہوگی! کیوں؟
کچھ تو اِدھر بھی "معنوی سنتان" بھیجئے

سرکار کے شکنجے میں اُردو کا ہے گلا
کوٹلے کا ہو کہ بجلی کا شمشان بھیجئے

"غالب خلاسک" بکتے ہیں بازار میں یہاں
واں ہوں جو اس قبیل کے فنجان بھیجئے

ہمت نہیں کہ راہ میں آنکھیں اُٹھا سکیں
شرعی ڈوپٹے اور گریبان بھیجئے

کچھ آپ کے بقول یہاں "مرغیاں" بھی ہیں
ڈربے کچھ ان کی شان کے شایان بھیجئے

شعراء یہاں کے بنتِ عنب کے اسیر ہیں
جالندھری سا کوئی مسلمان بھیجئے

ترسا لیا بہت، مگر اب راہ صاف ہے
نظمیں، غمِ فراق کا تاوان بھیجئے

انجم کے واسطے بھی یہ زحمت کریں حضور
تحفے میں شاعرات کے دیوان بھیجئے

غزل

رؤف رحیم

شام ہوتے ہی دل دھڑکنے لگتا ہے
خواب میں مرے جب بھی آپ آنیوالے ہیں

احترام سالوں کا اس لیئے بھی کرتا ہوں
دنیا ایک ہو جائے سالے پھر بھی سالے ہیں

حسنِ یار کی یارو کیا کروں میں تعریفیں
رنگ میں سیاہی ہے زلف پر اُجالے ہیں

پکچروں کو وہ جائیں بے حجابیاں لے کر
اور ہم نے چھ بچے گود میں سنبھالے ہیں

چھوڑ کر تیرے در کو جاؤں گا کہاں اب میں
آپ کی بدولت ہی میرے گھر پہ تالے ہیں

جو بھی گھر جنوائی ہے سوچ لے رحیم اتنا
مال تو نہیں کچھ بھی جان کے بھی لالے ہیں

مسیح انجم

[یہ خاکہ "جشن بھارت چند کھنہ" کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا]

زندہ دلانِ حیدرآباد کے

پیر و مرشد

مرزا عصمت اللہ بیگ نے اپنے ایک مضمون میں پیر کی تین قسمیں گنائی ہیں "پتّا پیر ـــ پتھر پیر ـــ لکڑ پیر ـــ "پتّا پیر وہ، جو خود تو سطح آب پر تیرتا رہے لیکن مرید کو تہہ آب دکھا دے"۔ ـــ پتھر پیر وہ، جو خود بھی ڈوبے اور اپنے ساتھ مرید کو بھی لے ڈوبے"۔ لکڑ پیر وہ، جو خود بھی تیرتا رہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے مرید کو بھی ساحلِ مراد تک کھینچ لائے"۔

بھارت چند کھنہ صاحب کو زندہ دلان کے پیر کہنے کے بعد میں بڑی دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آخر کھنہ صاحب کو پیر کے کس زمرے میں شامل کروں۔ پتّا پیر کہوں یا پتھر پیر یا پھر لکڑ پیر۔ میں اسی شش و پنج میں تھا کہ خدا نے میری مدد فرمائی اور میری نظر رسالہ "شگوفہ" میں چھپی ہوئی کھنہ صاحب کی ایک تصویر پر پڑی۔ یہ اُس زمانے کی ایک یادگار تصویر ہے جبکہ کھنہ صاحب کا آتش جوان تھا۔ اس تصویر میں موصوف لنگوٹ لگائے، منہ میں سگریٹ دبائے کچھ اس انداز سے کھڑے ہیں جیسے وہ کوئی ماہر غوطہ خور ہیں۔ اور اس بات کے منتظر ہیں کہ جیسے ہی کوئی حسینہ ڈوبتی نظر آئے گی، فوراً سگریٹ پھینک کر چھلانگ لگائیں گے اور اس ڈوبنے والی کو بچا لائیں گے۔ ڈوبنے والی حسینہ ہی کیوں، غمِ روزگار کا ستایا ہوا شخص بھی ہو سکتا ہے۔ یوں بھی ڈوبتے کو بچانا، ہر کس و ناکس کی مدد کرنا، ہر آیرے غیرے نتھو خیرے کی خیر خیریت دریافت کرنا، کھنہ صاحب کی فطرت میں داخل ہے۔ میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ کھنہ صاحب "غوطہ پیر" کی تعریف میں آتے ہیں۔ اپنی ابتدائی ملازمت سے لے کر معتمدی اور کمشنری جیسے

اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیتے ہوئے وظیفۂ حسنِ خدمت پر علٰحدہ ہونے تک کھنہؔ صاحب نے کتنے غوطے لگائے، کتنی بار ڈوبتے ڈوبتے بچے، کتنوں کو ڈوبنے سے بچایا اور کتنوں کو ساحل مراد تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے، یہ ساری تفصیلات اور اعداد و شمار ان کا کانفیڈنشیل ریکارڈ (CONFIDENCIAL RECORD) ہی بتا سکتا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ ساری تفصیلات راز کی رپورٹ میں موجود نہ ہوں گی۔ کیونکہ وہ اس انداز سے احسان کر جاتے ہیں کہ اور تو اور خود ان کے فرشتوں کو تک اس کا اندراج لینے کی مہلت نہیں ملتی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ ان عہدیداروں میں شامل نہیں تھے جو تھوڑا سا احسان کرنے کے بعد اس کا ٹیپ ریکارڈر بجاتے پھرتے ہیں۔

کھنہؔ صاحب کو موٹی توند والے پسند نہیں۔ پیر اگر موٹا تازہ ہو تو اس کی "پیری، مریدی" کے بارے میں عجیب و غریب قیاس آرائیاں ہونے لگتی ہیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر یا طبیب نحیف و ناتواں ہو تو اس سے علاج کروانا گویا جان کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ جو شخص اپنا علاج نہ کر سکا وہ دوسروں کا علاج کیا کر سکے گا۔ پیر کے تعلق سے فرمائے ہوئے بزرگوں کے اس قول کی روشنی میں کھنہؔ صاحب کے جثہ کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ صحت کے اعتبار سے زندہ دلان کے پیر و مرشد بالکل پنکھا ہیں پنکھا! پیٹھ کچھ خمیدہ۔ پیٹ، پیٹھ کی طرف مائل پرواز۔ سر میں چاندنی کا کھیت لہلہاتا ہوا۔ پھر اس پہ طرفہ تماشہ یہ کہ ٹیڑھی مانگ کے ساتھ ساتھ سر پہ بالوں کا چھوٹا سا پھگا۔ یہ "پھگا" کسی زمانے میں کالا اور بڑا تھا لیکن جوں جوں جوانی کی ہوا نکلتی گئی۔ یہ پھگا بھی اسی مناسبت سے سائز میں چھوٹا اور رنگ میں سفید ہوتا گیا۔ مگر اب بھی اس پھگے میں تھوڑی بہت ہوا باقی ہے۔ دیکھئے کہ کب تک یہ پھگا برقرار رہتا ہے۔ چہرہ پر ستم ہائے روزگار کی پرچھائیاں اور جھریاں۔ ناک پر لیڈی کٹ عینک۔ آنکھوں میں شرافت کی جھلک۔ بات بات پر "ہاں صاحب!" "کیا کریں صاحب!" "جانے دیجئے صاحب!" کہنا اور میٹنگوں کو بڑی خوش دلی کے ساتھ اختتام تک پہنچانا۔

گذشتہ دنوں میں کھنہؔ صاحب، چند ماہ کے لیئے امریکہ گئے تھے۔ سوچا کہ جب وہ وہاں سے واپس ہونگے تو خوب موٹے تازے ہو کر آئیں گے۔ جب وہ امریکہ سے لوٹے تو انھیں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ اور بھی دھان پان قسم کے ہو گئے تھے۔ دریافت کرنے پر پیر و مرشد نے فرمایا "کیا کریں صاحب!" امریکہ میں ہر چیز اصلی ملتی ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے!" لوگ بیرونِ ملک جا کر کچھ اس طرح موٹے ہو کر آتے ہیں جیسے ان کے جسموں پر سرتاپا سوجن چڑھ گئی ہو یا "ہوکا" کا مرض ان میں سرائیت کر گیا ہو لیکن کھنہؔ صاحب کی فطرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ اپنے ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت کی رسوائی ہو۔

ملازمت کے زمانے میں کھنہؔ صاحب سے صرف ایک بار نیاز حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ وہ ان دنوں معتمد گورنر آندھرا پردیش کے عہدہ پر فائز تھے۔ زندہ دلان کی سالانہ تقاریب کے سلسلہ میں ان سے کچھ مشورے حاصل کرنے تھے۔ میرے دوست مصطفیٰ کمال مجھے اپنے ساتھ کھنہؔ صاحب کے آفس کو لے گئے۔ گرما کے دن تھے۔ سورج سوا نیزے پر تھا۔ ہمارے آنے کی اطلاع پاتے ہی کھنہؔ صاحب نے فوراً ہم لوگوں کو اپنے آفس میں بلا لیا۔ کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مصافحہ کے لیئے ہاتھ بڑھایا۔ پھر اپنے تھرماس سے

پیالیوں میں چائے انڈیلی اور پھر پیالیوں کو ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجئے صاحب! شوق فرمایئے!"
زندگی میں پہلی بار ایک آئی۔ اے۔ ایس آفیسر کو اس طرح دوستانہ انداز میں پیش آتے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ بات چیت کے اختتام کے بعد جب ہم باہر نکلے تو میں نے کمال صاحب سے پوچھا "کمال صاحب! وہ چائے تھی یا گرم گرم کسالہ پانی!" کمال صاحب نے میری بد ذوقی پر ماتم کرتے ہوئے کہا "اصلی چائے ایسی ہی ہوتی ہے! ہم ہوٹلوں میں جسے چائے سمجھ کر پیتے ہیں وہ دراصل شکر یا شکرین ملا ہوا گرم پانی ہوتا ہے۔"
میں نے اپنی بد ذوقی پر لعنت بھیجتے ہوئے ایک اور سوال داغا۔ "ایرکنڈیشنڈ آفس میں بیٹھے رہنے کے باوجود کھنہ صاحب کے چہرہ پر کرب کے آثار کیوں نمایاں تھے؟"
کمال صاحب بولے "نیک بندوں کی پہچان یہی ہے کہ وہ آرام کو تکلیف جانتے ہیں اور تکلیف کو آرام!"
اس کے بعد مزید کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی!
کھنہ صاحب کی تحریر کو دیکھنے سے پہلے تک میں اپنے آپ کو بڑا خوش نویس و خوش خط تصور کرتا تھا لیکن پہلی بار جب میں نے کھنہ صاحب کی تحریر دیکھی تو دنگ رہ گیا۔ لکھتے وقت کھنہ صاحب نفاست اور نزاکت کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ شرافت تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ مجتبیٰ حسین نے "آخری شریف آدمی" کہا ہے تو غلط نہیں کہا ہے۔ نفاست، نزاکت اور شرافت کے ملنے پر جو مرکب بنتا ہے اس کا دوسرا نام ــــ "اردو تہذیب" ہے اور کھنہ صاحب اسی تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ خوبصورت اور واضح تحریر کے بارے میں کہیں پڑھا ہے کہ جس شخص کی تحریر جتنی خوبصورت اور واضح ہوگی وہ شخص اتنا ہی کھلے اور واضح ذہن کا ہوگا۔ چھوٹی اور گنجلک تحریر کے حامل افراد پیچیدہ ذہن کے مالک اور کینہ پرور ہوتے ہیں۔ خوبصورت تحریر کے بارے میں لکھنے والے نے کوئی مثال نہیں دی تھی۔ وہ اگر کھنہ صاحب کو دیکھ لیتا تو مثال بھی پیش کرتا ــــ کھنہ صاحب اگر قلم، دوات اور مسطر لے کر بیٹھ جائیں تو یومیہ دس، پندرہ روپے بڑی آسانی سے کما سکیں گے۔ میں کسی کونے سے بزرگ نہیں ہوں کہ ہمارے پیر و مرشد کو یہ مشورہ دوں۔ البتہ اتنی گزارش ضرور کروں گا کہ وہ اپنے مضامین کا اگلا مجموعہ اپنی ہی ہینڈ رائیٹنگ (HAND WRITING) میں دیں تاکہ اُردو کی نئی نسل اور آنے والی نسل ان کی تحریر کو دیکھ کر عبرت حاصل کر سکے۔ اور لوگوں کو پتہ چلے کہ اگلے زمانے میں ایک کھنہ بھی تھا جو اتنی خوبصورت تحریر لکھتا تھا مگر مجھے یقین ہے کہ کھنہ صاحب کی شرافت ان سے یہ بھی نہ کروا سکے گی۔

بعض کوتاہ نظر لوگ کھنہ صاحب کو بالکل بھولا اور معصوم قسم کا آدمی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ غلط ہے بلی اگر آنکھ بند کر کے دودھ پی رہی ہو تو یہ سمجھنا کہ وہ دنیا سے بالکل بے خبر ہے۔ غلط ہے۔ میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے پیر و مرشد اندر سے بڑے ہوشیار ہیں۔ یہ میں اس بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ جو شخص اندر سے ہوشیار نہ ہو، وہ طنز و مزاح ہرگز لکھ نہیں سکتا۔ چونکہ کھنہ صاحب بنیادی طور پر طنز و مزاح نگار ہیں، اس لیے مروت سے کام لیتے ہیں تاکہ آبگینوں کو ٹھیس نہ لگ جائے

لوگ اس عمل کا کچھ اور ہی مطلب لیتے ہیں۔

ہمارے پیرو مرشد جمالی قسم کے ہیں۔ جلال تو آتا ہی نہیں۔ بہت ہوا ہوا تو صرف کڑھ کر رہ جاتے ہیں۔ کڑھتے کڑھتے ان کا حال بھی کچھ ایسا ہوگیا ہے کہ ہمیشہ حزن و ملال کے بادل چہرہ پر چھائے رہتے ہیں۔ عمر کی اس منزل پر پہنچنے کے باوجود، وہ ہر چھوٹے بڑے اور ایرے غیرے سے اس طرح جھک کر ملتے ہیں جیسے یہ درس دے رہے ہوں ؎

جھک کے ملنا بڑی کرامت ہے
اس سے دنیا مرید ہوتی ہے

اینگلو انڈین

کرگس سہسوانی

برہنہ لوگ ہوئے ہیں کہ یہ بھی فیشن ہے
جناب شیخ کو اس پر بھی اوبجکشن ہے

مریضِ عشق کی دیکھی جو نبض تو بولے
کہ اس کی سانس کا موقوف سرکولیشن ہے

ہے نائیلون کے برقعے سے بھی انہیں پرہیز
بتاتی ہیں مجھے بیگم یہ اولڈ فیشن ہے

لگا رہا ہے جو چکر عدو ترے گھر کے
ضرور تیرا ابھی اس سے کوئی کنکشن ہے

عدو کے واسطے سگریٹ اور مجھے بیڑی
تمہاری بزم میں یہ کیسا سرکولیشن ہے

جگر میں درد، کلیجے میں ٹیس، دل میں کسک
یہ ابتدائے محبت کا انٹی میشن ہے

بجائے ہنسنے کے رونا پڑا محبت میں
تمہارے عشق کا الٹا ہی امپریشن ہے

ہمیں نہیں ہیں فقط ایک چاہنے والے
رقیب کا بھی محبت میں نومی نیشن ہے

مریں گے ہم ہی اکیلے نہ دستِ قاتل سے
رقیب تجھ کو بھی مقتل میں انوٹیشن ہے

چلو حسینو! تم عریاں کرو بدن اپنے
حسین چہروں کا لندن میں اگیٹیشن ہے

چپک کے رہ گیا جو اس کی بزم میں پہنچا
کہ جیسے بزم نہیں وہ کوئی سلوشن ہے

خدا کرے وہ بدل دیں خیال آنے کا
یہاں تو گول کئی دن سے گھر میں راشن ہے

جو ایک دن کی ہو گنتی تو صبر بھی کر لوں
جسے بھی دیکھو وہاں اس کا ایڈمیشن ہے

نہ فیل ہوتے ہیں کرگس نہ پاس ہوتے ہیں
بہت عجیب محبت کا کمپیٹیشن ہے

اشکِ ندامت

روشن پٹیالوی

ڈھونگ کیا کیا نہ رچے ان کی محبت کیلئے
پھر بھی ترسا کیے ہم چشمِ عنایت کیلئے

ان دنوں حسن ہوا جاتا ہے خود عشق طلب
مدرسے کھل گئے تعلیم محبت کیلئے

کیا قصور اس میں کسی کا یہ ہے اپنی کرنی
ذمہ دار آپ ہیں اولاد کی کثرت کیلئے

کپڑے کھدر کے ہوں اور سر پہ ہو گاندھی ٹوپی
سوانگ بھر لیجئے یہ قوم کی خدمت کیلئے

مغربی حسن نے فیشن کو ادھر بھیجا ہے
مشرقی حسن کی چوکھٹ پہ عبادت کیلئے

جھک گیا سر در میخانہ پہ تعظیم کے ساتھ
آستانہ یہ ملا خوب عبادت کیلئے

جا کے یورپ میں ملیں حوروں سے بڑھ کر ہمیں
یعنی دوزخ میں مزے شیخ نے جنت کیلئے

ہاتھ کھل جائے گا ہو جائیں گے وارے نیارے
نوکری کر لی ہے سرکار کی برکت کیلئے

ہائے فیشن نے ہے کی جیب ہماری خالی
بار بر آتا ہے ہر روز حجامت کیلئے

ہے مقدر کے نوشتے ہی غلامی تحریر
ہم تو دنیا میں فقط آئے ہیں خدمت کیلئے

پوری یکسوئی سے ہم بیٹھتے ہیں ٹاکی میں
یہ جگہ خوب ملی ہم کو عبادت کیلئے

جھوٹ بولا کبھی ہم نے کبھی رشوت لے لی
کام کیا کیا نہ کئے دہر میں دولت کیلئے

مجھ کو میخانے کا ماحول پسند آیا ہے
یہ جگہ اچھی ہے اے دوست عبادت کیلئے

عشق کا کھیل چھپا رہ نہ سکے گا ہرگز
کیوں کہ موجود ہیں اخبار اشاعت کیلئے

روشن! عینک سے ہوئیں شرم کی راہیں مسدود
اب نہیں راہ کوئی اشکِ ندامت کیلئے

غزل

سرپٹ حیدرآبادی

کاندھوں پر سر رہا نہ تو دھڑ ہی مکر رہی
دنیا میرے وجود کی زیر و زبر رہی

جب تک بھی بادہ نوشی میری معتبر رہی
زیر قدم فلک زمیں بالائے سر رہی

اولاد و آل میں جو بٹی منتشر رہی
ہستی وہ مجتمع رہی جو بیچلر ، رہی

چھپ چھپ کے روز ملتے رہے دونوں عمر بھر
ان کی خبر مجھے ، میری ان کو خبر رہی

اک کام بھی پسند نہ آیا انہیں میرا
کھٹ پٹ میری اور ان کی تو ہر بات پر رہی

محکم رہا مقام جفا مستقل ، رہا
لیکن وفا ادھر نہ ادھر بیچ ادھر رہی

منزل کی دوری بڑھتی گئی گام گام پر
منحوس ذات کوئی اگر ہمسفر رہی

بعد غروب آئے وہ ہر روز میرے گھر
میرے مکاں میں تو ہمیشہ سحر رہی

ہر صنف شعر میں نظر آیا رواں دواں
سرپٹ کی دوڑ دھوپ تو ہر راہ پر رہی

وقار خلیل — آنکھوں دیکھا حال

زندہ دِلوں کی محفلِ لطیفہ

۱۲ اپریل کی صبح زندہ دلان حیدر آباد کی سہ روزہ سالانہ تقاریب جشن بھارت چند کھنہ کے سلسلہ میں ایک ایسی ہی محفل لطیفہ ترتیب دی گئی تھی اس محفل لطیفہ نے ضابطہ حیات سے بچ کر نکلنے والوں سے انتقام کا پروگرام آراستہ کیا تھا۔ پلا ۔ ۱ بجے محفل لطیفہ کے جینیس محفل ظرافت کے ماہر بیربل کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اسٹیج پر رونق افروز ہوئے۔ کرسیٔ صدارت پر عارضی طور پر بزم زندہ دلان حیدر آباد کے سنجیدہ اور بزرگ صدر جناب بھارت چند کھنہ تشریف فرما تھے۔ مصطفیٰ نے اوپن جوک مین کی حیثیت سے مشہور طنز و مزاح لکھنے والے بزرگ ادیب رشید قریشی کو آواز دی۔ اس بار رشید قریشی صاحب نے چلتے چلتے دو لطیفے سنائے لیکن کوئی اثر محفل پر مرتب نہ ہو سکا۔ توازن کے لئے مصطفیٰ نے ایک پھلجھڑی روشن کی اور کلب کی فضا میں جگنو سے چمکتے نظر آئے پہلی بار محفل لطیفہ کے اسٹیج پر سنجیدہ ادیب اور مورخ نما صلاحیت رکھنے والے رائے موہن پرشاد نے مائیک سنبھالا۔ دو ایک کے لکھے ہوئے لطائف نذر کئے۔ ایک لطیفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ چند حیدر آبادیوں نے اللہ میاں سے جنت دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اور جب یہ لوگ جنت کی سیر کر چکے تو بے چینی سے کہنے لگے ٹھیک ہے ہم تو واپس حیدر آباد جا کر رہنا چاہتے ہیں وہاں کی بات ہی کچھ اور ہے۔ محفل لطیفہ میں حیدر آبادیت کے اس جذبہ کے لطیفہ نما اظہار سے بہت سوں کے ہونٹوں پر سنجیدہ مسکراہٹ پھیل گئی اور تالیاں بھی بجیں۔ پھر لطیفوں کی دولت سے مالا مال ایک معروف اسٹیج آرٹسٹ دولت رام نے تابڑ توڑ چند نئے پرانے لطیفے کچھ اس انداز سے سنائے کہ محفل میں قہقہوں کا سیلاب آگیا۔ دولت رام کا یہ لطیفہ بہت پسند کیا گیا — "بار میں ایک شاعر صاحب اپنے دوستوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ اگر میں سات اشعار پر مشتمل اپنی تازہ غزل سناؤں تو اس بار کو گرمیٔ سخن سے آگ لگ سکتی ہے۔ یہ سن کر شرابی صاحب نے ایک دوسرے سے کہا کہ آج اس نے بہت پی لی ہے۔ ایک شرابی صاحب نے شاعر سے خواہش کی کہ 'بھائی فی الوقت ایک شعر تو سنا دو۔ شاعر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "کیوں! پوری غزل کیوں نہیں؟" — اس پر شرابی نے کہا اس وقت مجھے صرف ایک سگریٹ سلگانی ہے۔ دولت رام کا ایک اور لطیفہ سنئے۔ ایک فقیر نے گھروں پر آواز لگائی کہ دو روز سے بھوکا ہوں، کچھ دلائیے۔ ہر گھر سے معاف کرو کی آوازیں۔ فقیر نے ایک مندر کے پجاری کے آگے دست سوال دراز کیا تو پجاری نے بھی اسے ٹرخا دیا۔ مسجد کے قریب رمضان کے دنوں میں افطاری کے وقت بھی اسے مسلمانوں نے کچھ نہ دیا۔ آخر کار بیچارہ شراب خانے کی طرف چل نکلا، ایک شرابی سے رجوع ہوا اور اپنی بھوک کا تذکرہ کیا اور روٹی کی خواہش کی۔ شرابی نے اس کی حالت پر ترس کھاتے ہوئے بہت سی چیزیں منگوا کر اسے کھانے کے لئے کہا۔ فقیر ان چیزوں کو پاکر رونے لگا اور کہنے لگا اللہ میاں یہاں رہتے ہیں اور اپنا پتہ مندر اور مسجد کا بتاتے ہیں۔

مقبول شاعر جناب خیرات ندیم نے محفل لطیفہ کو اخلاقی اور دیہاتی لطیفہ سنا کر دعوتِ قہقہہ دی۔ ندیم صاحب کا یہ لطیفہ خوش ذائقہ دار ثابت ہوا۔

وہ کہہ رہے تھے کہ، جب ہم پڑھتے تھے حیدرآباد کے مدارس میں دینیات اور اخلاقیات کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ مسلمان لڑکے دینیات پڑھتے تھے اور ہندو لڑکے اخلاقیات۔ دینیات کی کلاس میں ایک باریش مولوی صاحب "محرم" اور "نامحرم" کا مطلب سمجھا رہے تھے۔ اور پردہ کی اہمیت کا ذکر کر رہے تھے۔ اور وضاحت کر رہے تھے کہ کسی نامحرم پر ایک بار نظر ڈالی جائے تو وہ گناہ نہیں ہوتا۔ اس پر ایک شریر لڑکے نے سوال داغا کہ حضرت، اگر دوسری بار نظر ڈال کر ہٹالیں تو ۔۔۔۔ اس پر مولوی صاحب نے کہا کہ تم دینیات پڑھنے کے اہل نہیں ہو، جاؤ، اخلاقیات کی کلاس میں بیٹھو۔

محفل لطیفہ کی سنجیدہ دریافت پر بہت سے لوگ مسکرا اُٹھے۔ جناب محمد منظور احمد صاحب (دہلی اُردو مجلس والے) مائیک پر تشریف لائے اور رامپوری لباس میں سراپا سنجیدہ کھڑے چند ادبی لطائف سنا رہے تھے۔ اُنہوں نے چراغ حسن حسرت، شبلی، سرسید اور برنارڈ شاہ سے متعلق کتابی لطائف سنائے اور پھر توازن کی فضا بنانے کے لئے مصطفےٰ علی بیگ کو خاکِ وطن کو چوم لینے والا مشہور حب الوطنی کا لطیفہ خاص ڈھنگ سے سنانا اور محفل کو زعفران زار بنانا پڑا۔ آل انڈیا ریڈیو کے باصلاحیت اور باشعور آرٹسٹ اور اسٹیج فنکار اسلم فرشوری نے عجلت میں چند اچھے لطیفے سنا کر داد لی۔ ایک لطیفہ جو مولانا محمد علی جوہر سے منسوب ہے اور جسے "لطیفہ شریف" کا نام دیا جاسکتا ہے۔ اسلم نے سنایا۔ آپ بھی پڑھ لیجئے۔ مولانا محمد علی جوہر ایک پارٹی میں شریفے (سیتا پھل) کھا رہے تھے اور اس کے بیج بے ترتیبی سے اِدھر اُدھر پھینک رہے تھے۔ صاحب خانہ نے اس عمل پر انہیں ٹوکا تو وہ کہنے لگے حضرت یہاں شریفوں کی کمی ہے میں بیج بو رہا ہوں۔ اور محفل میں مسکراہٹ کھنک اُٹھی۔ مصطفےٰ علی بیگ نے اس فضا سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک لطیفہ محفل کی طرف اُچھال دیا کہ ایک میاں کو اپنی بیوی کی روز روز کی کھانسی سے چڑ سی ہوگئی تھی۔ ایک دن ان صاحب نے بیوی سے کہا کہ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کھانسی بڑھاپے کی علامت ہے۔ پھر کیا تھا ان کی بیوی کی کھانسی اس دن سے رک گئی۔ مہمان طنز و مزاح کے شاعر جو لکھنؤ کے روزنامہ "قومی آواز" کے کالم نویس بھی ہیں، میرا مطلب مشتاق پردیسی صاحب سے ہے، محفل میں اپنے وہ ایک لطیفہ بھی سنا گئے۔ ایک برجستہ لطیفہ جو لکھنؤ کی تہذیب کا چٹخارہ تھا، مشتاق نے سنایا کہ لکھنؤ کے لوگ بہت ہی کم کھانے میں شہرت رکھتے ہیں۔ جنوبی ہند کے ایک صاحب ان کے مہمان ہوئے۔ لکھنوی میزبان نے اپنی خوراک کے حساب سے دسترخوان چن دیا۔ جو چند لقموں کے برابر تھا۔ بیچارہ مہمان ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کے مصداق دیکھتا رہ گیا۔ میزبان اصرار سے کہنے لگا، بھیا! یہ سب تمہارے لئے ہی ہے۔ سوچتے کیا ہو سب ہی تم ہی کو کھانا ہے۔ محفل لطیفہ ایک بار پھر جگمگا اُٹھی۔ تالیاں بجیں اور مائک پر ملک کے نامور طنز و مزاح نویس ادیب جناب مجتبیٰ حسین اپنی روایتی سنجیدگی کے ساتھ کھڑے نظر آئے۔ مجتبیٰ نے اس بار شاعروں کی نوک جھوک کے پس منظر لطائف سنائے اور بہت سے شعراء ایک دوسرے کا منہ دیکھتے نظر آئے۔ سامعین نے تابڑ توڑ تالیاں بجائیں اور قہقہے لگائے۔ مجتبیٰ نے اس محفل میں حیدرآباد کے شعراء کو اپنا موضوع بنایا۔ شعراء کے نام نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ گرد وایک لطائف آپ بھی پڑھ لیجئے۔ مجتبیٰ نے اب سے چند سال پہلے کے مشہور زمانہ اورینٹ ہوٹل کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہاں، ادیبوں، شاعروں اور سماجی و سیاسی فکر و نظر رکھنے والے منتخب افراد کا روز آنا جانا اور تبادلۂ خیال کرنا معمول سا بن گیا تھا۔ ایک دن ایک مشہور شاعر اورینٹ میں داخل ہوئے جو ہاتھ میں پان کی تھیلی اور ایک ٹکٹ تھامے ہوئے تھے، میز پر احباب کے درمیان بیٹھ گئے۔ بیرے کو آواز دی اور کہا ٹھنڈا پانی لے آؤ۔ بیرے نے میز پر گلاس رکھنا چاہا تو ان صاحب نے ٹوکا کہ متوسوالی ذرا احتیاط سے، یہ پلین کا ٹکٹ ہے کہیں ۔۔۔۔ پھر چائے آئی تو ان صاحب نے بیرے کو اس ٹکٹ کا واسطہ دیتے ہوئے ٹوکا۔ دوستوں نے مضمون تاڑ لیا کہ وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں بذریعۂ طیارہ کشمیر جانے والے ہیں۔ اور اس انداز سے ٹکٹ کی نمائش کر رہے ہیں۔ مجتبیٰ نے ذرا دور کی میز پر بلند ہوتے ہوئے قہقہوں کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے اُدھر بیٹھے ہوئے چند اصحاب سے کہا کہ جاؤ تو ذرا احتیاط سے قہقہہ لگائیے، یہاں ہمارے شاعر کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ رکھا ہوا ہے کہیں یہ اُڑ نہ جائے اور شاعر بھی ۔۔۔۔۔۔

مجتبیٰ نے دوسرا لطیفہ سنایا۔ ایک بہت مشہور شاعر تھے جو مجرد تھے، اور پابندی سے اورینٹ ہوٹل آیا کرتے تھے۔ دوستوں نے ان سے پہلے

اور اسے سنجیدگی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اور پھر اس نے نظر بچا کر اس کاغذ پر پہلے سے لکھے گئے چند شاعروں کے ناموں میں اپنے چار دوستوں کا بھی اضافہ کر دیا۔ اور اس کاغذ کو وہیں پھینک دیا . . . . فلمی دنیا اور اسٹیج کے مشہور اور زندہ دل آرٹسٹ کلیم صدیقی نے بھی اچھے لطیفے سنائے۔ لطیفے اتنے اچھے تھے کہ لکھے نہ جا سکے۔ ان کے بعد جواں فکر شاعر اور بذلہ سنج دوست مسعود عابد جو حلقۂ احباب میں اپنی شگفتہ مزاجی کے سبب چاہے جاتے ہیں۔ محفل لطیفہ میں پہلی بار چند لطیفے سنائے۔ جو عمومی اور ہلکے پھلکے تھے۔ حفیظ خاں جو کبھی سپاٹ تھے۔ اب مذاق، سراپا مذاق بن گئے ہیں۔ دو تین بہت اچھے لطیفے سنائے اور محفل کو خوشگوار موڑ دیا۔ حفیظ کے لطیفے بنانے اور سنانے کا انداز خالص حیدرآبادی بول چال کا ہے۔ محفل لطیفہ کی صدارت جناب پی گنگا ریڈی وزیر سیول سپلائی نے کی اور اپنی روایتی زندہ دلی اور خوش طبعی کا ثبوت دیا۔ موصوف نے تاخیر سے اس محفل میں شرکت کرنے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ایرپورٹ پر مجھے ایک بیرونی سفیر کا خیر مقدم کرنا تھا۔ طیارہ دیر سے آیا۔ مگر اس سے جو صاحب آنے والے تھے وہ نہ آ سکے اور مہمان کو ریاستی حکومت کی جانب سے پہنایا جانے والا ہار میرے ہاتھوں میں ایک لطیفہ کی طرح دھرا رہ گیا۔ اس پر صدر زندہ دلان جناب بھارت چند کھنہ نے ریڈی صاحب کی گردن میں پھول مالا پہنائی۔ اور محفل لطیفہ اچھے موڈ پر اختتام پذیر ہوئی۔

غزل

یوں منہ کی کھائی جرأتِ عرضِ وصال سے — بولے وہ چڑھ کے مجھ سے میاں کھاؤ دال سے
نسبت ہی کیا ہے ان کو حرام و حلال سے — کھنچتے ہیں شیخ جی کی علیش میں پکٹ کے مال سے
رکھتا ہوں اس کو جان سے زیادہ عزیز تر — پوچھی تھی اس نے ناک کبھی جس رومال سے
حاکم سے رابطہ تو ضروری نہیں جناب — ملنا مگر ہے لازمی اس کے دلال سے

اس پیڑ کے پھلوں سے ہوں محروم میں ہنوز
پانی پلا رہا ہوں جسے سات سال سے

عشرت
اندوری

علی عباس امید

بیاں اپنا!.........

بیشتر لوگ بغیر کسی ذاتی تجربہ کے قدرت کی ستم ظریفی کے قائل ہو جاتے ہیں لیکن اس معاملہ میں بھی میرا معاملہ تمام معاملوں کی طرح یکسر مختلف ہے میرے اس دعوے کی صداقت پر آپ میرے اور ابراہیم یوسف صاحب کے موجودہ مراسم کے ماضی اور حال کے پس منظر میں ایمان لاسکتے ہیں۔

آج یہ تو یاد نہیں کہ ان دنوں میں کہاں تھا، علی گڑھ، دہلی یا پھر بمبئی میں۔ بہرحال عنفوان شباب تھا اور میں نے ایک ڈرامہ لکھا تھا "پروانے کی خاک" نیا دور (لکھنؤ) نے اسے شائع کیا تھا اور متعدد پڑھے لکھے لوگوں نے اس کی اشاعت پر رسالے کے علاوہ براہ راست مجھے بھی پسندیدگی اور مبارک باد کے خطوط بھیجے تھے۔ حافظہ اگر ساتھ دیتا تو میں بتا سکتا تھا کہ کتنے عرصہ بعد اس ڈرامہ کو "شاعر" (بمبئی) نے اپنی اشاعت میں شامل کر لیا تھا اسکی اشاعت کے بعد ابراہیم یوسف نے شاعر میں لکھا کہ علی عباس امید کا ڈرامہ "پروانے کی خاک" پہلے نیا دور لکھنؤ میں بھی شائع ہو چکا ہے" وہ خط پڑھ کر مجھے ان پر بے حد غصہ آیا۔ یوں کہ جب سے پڑھنا سیکھا اس شخص کے ڈرامے اتنے خضوع و خشوع سے پڑھتا رہا ہوں جیسے وہ اپنے ہی تحریر کردہ ہوں۔ بھلا بتایئے صالح قاری کے قحط الرجال میں کیا میرا یہ احسان ان پر کچھ کم تھا۔ ویسے اس وقت جتنی ان کی ادبی عمر تھی اتنی خاکساری کی مجموعی۔ ایک اچھی تخلیق اگر دوبارہ شائع ہو گئی تو ایسی کون سی قیامت آگئی سوا اس کے کہ وہ اور زیادہ لوگوں تک پہنچ گئی۔ تمام تر جھنجھلاہٹ کے بعد میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ چونکہ ملک ڈرامہ پر موصوف کئی دنوں سے حکمراں ہیں لہذا اس کی شہر پناہ کے پاس بھی کسی کا سایہ انھیں گوارا نہیں ہے۔

ان کی علمیت سے مرعوب ہو کر فصیح احمد صدیقی نے لکھا تھا کہ 'ابراہیم یوسف پر جنات کا سایہ ہے، سایہ اگر پری کا ہوتا میں ان سے [illegible] لیکن معاملہ چونکہ بالکل ہی مختلف تھا اس لیے اس زمانے میں میں ان سے صرف خفا تھا اور کسی حد تک ان کی ڈرامہ نگاری سے بدظن بھی۔

جیسا کہ دنیا کا چلن ہے اور انسانی فطرت کا تقاضہ بھی کہ بڑے بڑے خونی انقلابات تاریخ کے صفحات میں گم ہو جاتے ہیں

اور امن کی جگہ امن و آشتی کی نئی گل کاریاں آنکھوں کو خیرہ کرنے لگتی ہیں ـــــ میرے اور ابراہیم یوسف صاحب کے سرد اور یکطرفہ مناقشہ کے باب میں بھی وہی کچھ ہوا۔ میری دشت نوردی جون پور، غازی پور، علی گڑھ، دہلی، بمبئی اور حیدرآباد گھماتی ہوئی مجھے بھوپال لائی۔ ادب دوستی نے ابراہیم یوسف صاحب سے براہ راست متعارف کرادیا۔ ابتدائی ملاقاتیں ویسی ہی رہیں جیسی کہ عام طور پر ہر شخص کی ہوتی ہیں ـــــ نہ تو کوئی مسرت محسوس ہوئی، نہ ہی کسی خاص اپنائیت کا احساس جگا۔ بس وہی واجبی واجبی تکلفاتی ماحول رہتا۔ وہ پوچھتے "کہیے مزاج تو بخیر ہیں؟" میں انھیں مطلع کرتا "حضرت۔ ماحول اور موسم کے مطابق ہیں۔" ان کا سوال ہوتا "لکھنے پڑھنے کا کیا عالم ہے؟" میں جواب دیتا۔ "جیسا کسی اور کا نہیں ہے۔" بہت ممکن بلکہ یقینی ہے کہ یہ سلسلہ اس سے آگے نہ بڑھتا لیکن انجم سلمانی صاحب، کی ایور گرین دوکان کا فیض ہے کہ سلسلہ نہ صرف آگے بڑھا بلکہ معمول بن گیا اور جملہ سہل و دشوار مراحل سے گزر کر سدا بہار دوستی کے روپ میں کھل گیا۔

شروع سے میرا ایمان رہا ہے کہ پُربہار دوستی نعمت غیر مترقبہ سے بھی کچھ سوا ہے۔ لیکن جب سے ابراہیم یوسف صاحب میرے دوستوں کی صف میں داخل ہوئے ہیں میرا ایمان متزلزل ہونے لگا ہے۔ آپ شاید خیال فرمائیں گے کہ اس کا سبب میری دماغی کمزوری ہوگی لیکن چونکہ بندہ خود پیر ملک کا پیر واقع ہوا ہے لہٰذا اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے آپ ایک واقعہ سُن لیجیے۔ گزشتہ برس کافی عرصہ بعد میری اکلوتی بیوی ممتاز بیگم ازراہ ترحم مجھ سے ملنے بھوپال آئیں۔ میں شاہ جہاں تو نہیں ہوں پھر بھی اپنی ممتاز کو تاریخی ممتاز سے کہیں زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ چنانچہ ان دنوں بھی اپنی سیلانی زندگی کے خلا کو ازدواج کی لذت سے پُر کرنے میں مصروف ہو گیا اور لگ بھگ ڈیڑھ ماہ کے عرصہ میں صرف دو یا تین بار ابراہیم یوسف صاحب سے مل سکا۔ ہر ملاقات میں انھوں نے شکوہ کیا اور میں نے بیوی کی موجودگی کو ڈھال بنایا۔ ابھی مجھ پر یک گونہ بے خودی طاری ہی تھی کہ اچانک بیوی نے ایک روز گھر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں اس وار سے سنبھلنا ہی چاہتا تھا کہ خواہش ضد بن گئی اور دوسرا ہفتہ ختم ہونے سے پہلے ہی ان کے بھائی صاحب آ پہنچے اور مجھے ان دونوں کو مع اپنی ایک عدد بچی تزئین زہرا کے ٹرین میں بٹھا دینا پڑا۔ اس شام جب افسردہ چہرے اور رنجور دل کے ساتھ میں ایور گرین شاپ پر پہنچا تو ابراہیم یوسف صاحب نے پوچھا "کہاں سے آرہے ہیں؟" میں نے بتایا کہ "اسٹیشن سے۔" اتنا سنتے ہی انھوں نے دونوں پاؤں کرسی کے اوپر رکھ لیے اور بے حد جوش میں دریافت کیا "کیا بھابھی گئیں؟" میں نے مایوسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اچھل پڑے۔ "دیکھا انجم بھائی میری ترکیب!" ادھر انجم بھائی کا قہقہہ گونجا۔ دونوں قہقہوں کے درمیان میری خاموشی سینڈوچ ہو گئی [illegible] بے بس آنکھیں دونوں چہروں پر جائے پناہ تلاش کرنے لگیں۔ اور مغموم دل ایسی دوستی پر مسلسل لعنت بھیجتا رہا جو دو [illegible] قہقہے [illegible] ان کی آنکھوں میں پانی بن گئے تو وہ خالص بھوپالی لہجہ میں گویا ہوئے [illegible] کیا اب بھی ہو جائیں" وہ دونوں کھاتے رہے [illegible] تکتا رہا۔ پھر انھوں نے آسودگی کی ڈکار لی اور [illegible] انکشاف کیا "میں نے بھابی کو خط [illegible] دیا تھا کہ جب سے آپ آئی ہیں ہماری محفل سونی ہو گئی ہے لہٰذا اب آپ چلی جائیں تاکہ ہمارا دوست آزاد ہو سکے۔" اس حادثہ کے بعد سے آج تک بیوی سے میرے تعلقات بحال نہیں ہو سکے ہیں، وہ اپنی سسرال سے میری سسرال تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں اور میں اس پر [illegible] جھیلتے ہوئے [illegible] گھوم رہا ہوں۔ یہ مجھ سید کی سعادت مندی ہے کہ [illegible] ہونے کے بعد بھی دوستی کی [illegible] ان کا دوست ہوں لہٰذا ان کے یقین کو ٹھیس پہنچانا مناسب نہیں سمجھتا۔ ان کی دوستی کے بعد ہی مجھے یقین آگیا تھا کہ اب آسماں میرا دشمن نہیں رہا ـــــ کیا یہ دنیا کم ہے!

کتابوں اور رسائل سے لے کر ہوٹلوں کے بل تک ہر معاملہ میں ان کی دوستی مجھ پر وہی ظلم روا رکھتی ہے جو عام طور پر
، اقلیت کے ساتھ۔ حالانکہ میں انھیں مسلسل احساس دلاتا رہتا ہوں کہ "حقیر دیا اقلیت ہے اور آپ کا رویہ ایک دم ناحق"۔
ا فرماد کے بعد بھی وہ خصوصی رعایت تو کجا عمومی سہولت بھی دینے کو تیار نہیں ہوتے۔ چنانچہ ہر کس و ناکس سے میری آمدنی
منظر میں میری دریا دلی کا ذکر اس وسیع القلبی سے کرتے ہیں کہ تو اضع کے تمام بل میرے کھاتہ میں رقم ہو جاتے ہیں۔ اب
ت ہے کہ اکثر و بیشتر سید برادران کی روح کی خوشنودی اور ان کی فطانت کی ترویج کے خیال سے اس کھاتہ کی نصف

الٹ جاتی ہے یعنی رقم بدستور اور نام ابراہیم یوسف۔

میں مزاجاً انھیں حریص مانتا ہوں بے حد حریص۔ لگ بھگ دو سو ڈراموں اور درجن بھر کتابوں کی ولدیت کے خانہ
نام دیکھ کر بھی ان کی نیت سیر نہیں ہوتی اور اولاد حقیقی کی طرح معنوی ذریت کی تعداد میں بھی مستقل مزاجی سے اضافہ
رہتے ہیں۔ میں اکثر انھیں مشورہ دیتا ہوں کہ "حضرت۔ اب تو اسپ قلم کو لگام دیجیے تاکہ اس میدان میں کوئی اور
ہی نہ سہی دُلکی چلنے کی ہی جرأت کر سکے"۔ ان کا ایک ہی جواب ہوتا ہے "حضرت یہ میدان تو بے حد وسیع ہے
یں تو صرف اپنے ٹریک میں دوڑ رہا ہوں"۔ اب انھیں کون سمجھائے کہ اپنے ٹریک میں بھی وہ اتنی تیزی سے دوڑ رہے
تنی دور پہنچ چکے ہیں کہ انہیں دیکھنے کے لیے دوربین نظروں کی ضرورت ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے کورس میں اردو نہیں
ورنہ اب تک ان پر مقالہ لکھ کر ایک عدد پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تو ہاتھ لگ ہی جاتی۔

پڑھنے لکھنے کے علاوہ ابراہیم یوسف صاحب کو اگر کسی چیز سے دیوانگی کی حد تک انس ہے تو وہ ہے غیبت۔
اس انکشاف پر متعجب ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمام لوگ جو ان سے ملتے رہتے ہیں اس حقیقت سے نہ صرف
ہیں بلکہ اس بدعت حسنہ میں ان کے برابر کے شریک بھی ہیں۔ انھوں نے نشہ کی طرح سب کو اس کا چسکہ لگا دیا ہے اور
عالم ہے کہ وہاں پہنچنے کے بعد کوئی بھی شدت کے باوجود اس خوف سے چھوٹی حاجت کے لیے بھی نہیں ہٹتا کہ کہیں وہی
ع بن جائے۔ دوستوں کی اس مشکل کو حل کرنے کے خیال سے میں نے باجماعت استنجہ کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ احباب
سلہ بے حد مقبول ہوا ہے، تقریباً سب ہی اس اختراع کے لیے تہہ دل سے میرے ممنون ہیں۔ میں بھی مسرور ہوں کہ داد
تھ ہی خود حفاظتی کا نسخہ بھی ہاتھ لگ گیا، قومی یک جہتی اور مساوات کی ایسی نادر مثال اگر نایاب نہیں تو کم یاب تو ہے ہی
ہ کہ ایورگرین شاپ کی جگہ غیبت کدہ لکھا جانے والا ہے۔

ابراہیم یوسف صاحب عمر میں مجھ سے لگ بھگ پاؤ صدی بڑے ہیں۔ اس حساب سے وہ میرے چچا بھی ہو سکتے تھے
، بھائی بھی۔ لیکن بے حد خوشی اس بات کی ہے کہ یہ بہر دو باب بند رہے اور چونکہ اردو کے رشتہ سے میرے خاندان
ل ہوئے اس لیے دوست بن گئے۔ چونکہ میں شناسا اور دوست میں حد درجہ امتیاز کا قائل ہوں۔ لہٰذا یہ ان کی خوش قسمتی
ہے نے ان کو اپنے شناساؤں کی طویل ترین فہرست کے بجائے دوستوں کی مختصر ترین لسٹ میں جگہ دی ہے اور وہ بھی بہت
۔ آپسی گفتگو میں ہم دونوں ایک دوسرے کو "حضرت" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں بغیر اس تحقیق کے کہ کون بڑا ہے اور کون
ویسے ہمارے مشترکہ شناسا اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ ابراہیم یوسف بڑے حضرت ہیں اور حقیر پر تقصیر قد کے علاوہ
سے چھوٹا۔

کرنل محمد خاں

(بسلسلۂ گذشتہ)

لندن ۔۔ تجدید ملاقات

ٹرین رستہ بھول سکتی ہے

دوسرے روز گولڈہل ہمارا الٹم کا ٹکٹ لئے ہوٹل میں پہنچا اور شتابی سے ہمارا سامان اُٹھائے ہمیں چمکارتے، پچکارتے اور ذرا ادب سے دھکیلتے باہر ٹیکسی تک لے گیا کہ گاڑی چھوٹ جانے کا اندیشہ تھا۔ گولڈہل بڑا ایبا آدمی تھا۔ ہمارے میزبان ادارے کے گائیڈ اور بھی تھے لیکن گولڈہل کا انداز رہنمائی بالکل نرالا تھا۔ جب کوئی مہمان گولڈہل کے سپرد کیا جاتا تو وہ یوں سمجھتا جیسے کسی یک سالہ بچے کو بچہ گاڑی میں بٹھا کر اُس کے حوالے کردیا گیا ہے۔ چنانچہ ہم ٹیکسی میں بیٹھے تو دیر تک ہمیں گولڈہل سے اس سوال کی توقع رہی کہ کیا دودھ کی بوتل، نپل اور خشک لنگوٹ بھی ساتھ رکھ لیا ہے یا نہیں۔ گولڈہل سے ملاقات کے پہلے چند لمحوں ہی میں بے تکلف ہوجانے کو جی چاہتا تھا ــــ چیرنگ کراس اسٹیشن پر گاڑی میں بیٹھے اور گولڈہل کو الوداع کہنا چاہا تو رخصت ہونے کی بجائے آرام سے ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا ــــ پوچھا ــــ:

"آپ کہاں جا رہے ہیں ؟"

"آپ کے ساتھ ۔"

"ہماری سرپرستی کے لئے ؟"

"آپ کی رہنمائی کے لیے ۔"

"مگر ہم ایک مدت سے بالغ ہیں ۔"

"ایک اجنبی بالغ بھی رستہ بھول سکتا ہے۔"

"چلو یوں ہی سہی، مگر ایک ٹرین کیسے رستہ بھول سکتی ہے؟"

"اگر آپ صحیح اسٹیشن سے آگے یا پیچھے اُتر گئے تو؟"

"تو یوں سمجھو کہ ہماری بلوغت فضول اور انگریزی مجہول ہے!"

"بلوغت اور انگریزی کے باوجود یہ حادثہ ہمارے ایک پاکستانی مہمان کے ساتھ ہو چکا ہے۔ بلکہ وہ آپ سے عمر میں دس سال اور علم میں دس جماعت آگے تھے۔ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی تھے۔"

"وہ فلاسفر ہوں گے۔ میں سیاحی ہوں۔ فلاسفر فقط سوچتا ہے، سیاحی دیکھتا بھی ہے۔"

"اور گائیڈ سوچتا، دیکھتا اور کچھ کرتا بھی ہے۔"

ہم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ تھوڑی دیر بعد گاڑی التم پیلیس اسٹیشن پر پہنچی۔ جہاں انسٹی ٹیوٹ کے ایک افسر میجر جکنن کار لے کر آئے ہوئے تھے۔ گولڈہل نے ہمیں بازو سے تھام کر باقاعدہ اُن کے حوالے کیا ——— شائد رسید بھی لی ہو ——— اور جب تک ہم گائیڈ کی گود سے میجر کی گاڑی میں منتقل نہ ہو چکے، گولڈہل بے چارا، جیسے ماں کا مارا، کھڑا دیکھتا رہا اور جب ہماری کار چل پڑی تو ہاتھ ہلانا شروع کیا جو خدا جانے کب تک ہلتا رہا۔ آخر ہم موڑ کاٹ کر اوجھل ہو گئے اور کرنل فورڈ کے دفتر کو روانہ ہوئے۔

کار میں جاتے ہوئے میجر جکنن کو ذرا غور سے دیکھا تو خاصا بوڑھا نظر آیا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ آپ دوسری جنگِ عظیم کے بعد یعنی آج سے کوئی پچیس برس قبل میجر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے اور مختلف پاپڑ بیلنے کے بعد اب کچھ عرصے سے غیر رسمی حیثیت میں انسٹی ٹیوٹ میں آخری پاپڑ بیل رہے تھے۔ متفرق کام انجام دیتے تھے: مثلاً مہمانوں کا استقبال وغیرہ۔ بوڑھے تھے مگر زندہ دلی کا یہ عالم تھا کہ جاتے جاتے کوئی حسین چہرہ دیکھ لیتے تو بلند آواز سے ہائے وائے کرتے۔ پھر کسی کو ہاتھ ہلاتے کسی کو آنکھ مارتے لیکن ان کی عمر سے زیادہ ان کی شکل کی بناوٹ ایسی تھی کہ خواتین بُرا ماننے کی بجائے مسکرا کر رہ جاتیں۔ ایک جگہ ایک نوجوان لڑکی کے قریب گاڑی ٹھہرالی اور اسے کہا: "لفٹ چاہیئے؟"

خدا جانے یہ لڑکی میجر جکنن کو پہلے سے جانتی تھی یا کیا، بولی:

"اگر آپ تھوڑی دیر ٹھہر جائیں تو میں اپنی نانی کو بھیج دیتی ہوں۔ وہ آپ کے لیے بہتر کمپنی ثابت ہوں گی۔"

میجر بولا: "بہت اچھا۔ بشرطیکہ تمہاری نانی ساٹھ سال سے اُوپر نہ ہو۔"

اس پر لڑکی اور میجر نے مل کر قہقہہ لگایا اور ظاہر ہے کہ ہمیں اس قہقہے میں شریک ہونا پڑا۔

وہ ذرا قبض کے ساتھ مسکراتے ہیں

آخر پیلیس کے بیرونی دروازے پر پہنچے۔ کرنل فورڈ کا دفتر شاہی محل کے سینکڑوں ایکڑ باغات کے ایک کونے میں تھا ——— محل باغات کے مرکز میں تھا اور صرف آفیسر ریزیڈنس کے طور پر استعمال ہوتا تھا ——— کار سے اُتر کر دفتر کی طرف بڑھے تو کرنل فورڈ چند قدم پیشتر ہمارے خیر مقدم کو آئے ——— دیکھا تو اُن کے چہرے پر شوقِ ملاقات کی ایک خوشخط تحریر نظر آئی، یوں جیسے ہمارا انتظار کرتے کرتے ہی کرنیل بن گئے ہوں اور ہائے اس شخص کی وہ خودرو استقبالیہ مسکراہٹ غالباً بس ایک مسکراہٹ کے عوض، یعنی مفت میں ہمارا دل جیت لیا۔ کہاں آج تک سمجھ میں نہیں آیا کہ بعض لوگ ملاقات پر خندہ پیشانی

کی بجائے کج رُخی سے کیوں پیش آتے ہیں حالانکہ کج رُخی کے لئے بڑے تردّد کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی پہلے منہ بگاڑنا پڑتا ہے پھر نتھنے پھلانے پڑتے ہیں اور آخر میں پنجے جھاڑنے پڑتے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر اچھی خاصی درندگی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ بخلاف اس کے خوش خلقی کے لئے چیر پھاڑ کی ضرورت نہیں۔ فقط ایک خانہ ساز مسکراہٹ بس ہے۔ وہ لوگ جنھیں عصر رواں سے اور مسکراہٹ قبض کے ساتھ آتی ہے، دراصل بڑے روگی ہوتے ہیں۔ یہ روگ عام طور پر باسوں اور ساسوں کو لگتا ہے اور اس کا ایک ہی علاج ہے کہ متاثرہ ماتحت اور بہویں اپنے اپنے مریضوں کو لال پھندنے والی اونچی مخروطی ٹوپی پہن کر ان کے سامنے ڈگڈگی بجائیں اور بجاتی رہیں تا آنکہ یا تو باس اور ساس منہ پھاڑ کر قہقہے مارنے لگیں اور غصے سے چیخ کر اپنا سر پھوڑ لیں۔

ارے ملکہ ہی تو ہے نا

ذکر کرنل فورڈ کی خوش مزاجی کا تھا۔ مصافحے کے بعد کرنل صاحب کے دفتر میں خاصے اَدق علمی موضوعات پر بحث ہونے لگی لیکن شاید یہ کرنل صاحب کی خوش کلامی کی تاثیر تھی کہ ہر عقدہ خود بخود واہوتا محسوس ہوا ــــــ معاً ہمارے ذہن میں خیال آیا کہ اگر اسکولوں اور کالجوں سے تمام سڑیل اُستادوں کو پنشن یا دھکے دے کر چلتا کیا جائے اور ان کی جگہ خوش مزاج اُستاد اور خوش ذائقہ اُستانیاں بھرتی کر لی جائیں تو حساب اور الجبرا جیسے خشک مضامین میں بھی نم پیدا ہو جائے ــــــ کرنل صاحب سے باتیں کرتے کرتے پانچ بج گئے اور دفتر بند ہونے کا وقت ہو گیا۔ کرنل صاحب ازراہ مروّت ہمارے ساتھ پیلیس تک چلتے گئے جہاں ہمارا سامان پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ محل کے وسیع باغات میں ایک چھوٹی سی پتلی سی پگڈنڈی پر جا رہے تھے کہ کرنل فورڈ یکایک بولے۔

"کرنل خان۔ اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ اگلے ہفتہ ہر میجسٹی، دی کوئین الزبتھ پیلیس تشریف لا رہی ہیں تو کیا تم حیران نہیں ہو گے؟"

اگر اس کے جواب میں ہم صرف یہ کہتے کہ "جی ہاں حیرت تو ہو گی" تو کرنل فورڈ کا دل ٹوٹ جاتا۔ کرنل فورڈ کی خواہش یہ تھی کہ یہ پاکستانی ملکہ کی آمد کی خبر سن کر حیران ہونے کے علاوہ پھڑک اُٹھے اور رائل ایجوکیشن کو رکی خوبیٔ قسمت پر رشک کر کر کے بے حال ہو جائے۔ چنانچہ ہم نے کپڑے تو نہ پھاڑے اور نہ ہی بال نوچے لیکن حسب توفیق پھڑکے اور کہا۔

"صرف حیرت؟ مجھے یقین ہے آپ خواب کی باتیں کر رہے ہیں۔"

کرنل فورڈ ہماری بے یقینی سے بہت خوش ہوئے اور بالکل بچوں کی طرح بولے:

"مجھے معلوم تھا تم نہیں مانو گے مگر ہے یہ سچ! اور ہاں تمہیں ایک بات اور بتاؤں مگر سُن کر چونک نہ اُٹھنا۔"

"ارشاد۔"

"ملکہ جمعہ کے روز پچھلے پہر چہل قدمی بھی کریں گی۔ معلوم ہے کہاں؟"

"نہیں ــــ کہاں۔"

"بالکل اسی پگڈنڈی پر جس پر ہم تم چل رہے ہیں!"

یہ کہہ کر کرنل فورڈ علامت تعجب کی طرح سیدھا اکڑ کر بے حرکت کھڑا ہو گیا۔ ہمیں انگریزی کا سِن ایچی طرح چونکنے کا طریقہ تو نہیں آتا تھا لیکن کرنل فورڈ کی نقل اُتارتے ہوئے ہم بھی ایک لحظہ رُکے، آنکھیں تا بحد امکان کھولیں، دیدوں کو چکرایا اور کہا۔

"نو، نو۔"

فورڈ بولے۔ "او، یس۔ اور میں کہتا ہوں ذرا سوچو تو کہ تمہارے پاؤں کے نیچے وہی پگڈنڈی ہے جو کل ملکہ کے پاؤں تلے ہو گی۔"

ہم نے دل میں کہا "ارے مکر ہی تو ہے نا۔ کوئی شہناز تو نہیں۔" لیکن کرنل فورڈ کی دلجوئی کی خاطر سینہ اُبھارا اور ذرا جھوم کر اپنی فرضی خوش بختی پر ناز کیا جس سے کرنل صاحب کی بظاہر تشفی ہو گئی اور آگے چل پڑے ——— انگریز ناقابلِ فہم جانور ہے۔ بادشاہ، ملکہ اور اُن کے بیٹے بیٹیوں کی خواب گاہوں اور غسل خانوں میں جھانک کر اپنے اخباروں میں بڑے مزے سے سکینڈل گھڑتا ہے لیکن ان کے قرب پر ناز بھی کرتا ہے۔ لیکن انگریز کی زندگی میں یہ واحد تضاد نہیں بلکہ ہیں۔ مثلاً ایک طرف تو یہ نت نئی ایجادیں کرتا ہے اور دوسری طرف بے وقوفی کی حد تک قدامت پرست ہے۔ اِدھر ساتویں آسمان کی خبر لاتا ہے اور اُدھر اپنی قسمت پوچھنے کے لئے ہر پاکستانی کے آگے ہاتھ پھیلا دیتا ہے کیونکہ وہ ہر پاکستانی کو پامسٹ سمجھتا ہے ——— آپ لندن میں کسی میم کا ہاتھ تھام کر کہیں کہ "مس۔ تیری تقدیر میں شہزادہ لکھا ہے" تو ممنون ہو کر آپ کا منہ چوم لے گی اور کہے گی۔ "اک بار پھر کہو ذرا ——— نیز اور کیا لکھا ہے؟"

ضروری انتباہ : اس مقام پر بعض نوارد پاکستانی پامسٹ دوسری چمی کے لالچ میں کہہ دیتے ہیں کہ پہلے شہزادے کے علاوہ ایک اور شہزادہ بھی لکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ میمیں بے وقوف تو ہیں لیکن اتنی بے وقوف نہیں کہ یکے بعد دیگرے دو شہزادوں کا یقین کر لیں۔ چنانچہ ہونٹ بھینچ کر ہاتھ کھینچ لیتی ہیں۔ سو ایک وقت میں ایک شہزادے ہی کی بشارت دینا چاہیئے۔

انگریزی ہیر کو بھی کھیڑے لے گئے

پیلیس میں گئے تو کرنل فورڈ نے کہا: "آؤ، تمہیں تمہارا کمرہ دکھائیں۔"

اور یہ کہہ کر ہمیں دوسری منزل پر لے چلے جہاں کمرہ نمبرا ہمارے لئے ریزرو تھا۔ کمرے میں داخل ہوئے تو اُس کے شاہانہ طول و عرض اور ساز و سامان سے ذرا مرعوب ہوئے۔ اس پر کرنل نے موقع پا کر مزید ضرب لگائی۔

"کرنل خان۔ یہ ہے تمہارا بیڈ روم جو کبھی این بولین[1] کا بیڈ روم تھا۔"

اور ساتھ ہی ہمیں آنکھ ماری۔ انگریز کے دل میں اب ایک شاہی اسکینڈل کروٹ لے رہا تھا۔ ہم نے کہا:

"کرنل فورڈ۔ ہمیں این بولین کے ہم کمرہ ہونے پر بھی کافی فخر ہے۔ کیا یہ بستر بھی جس پر خاکسار شب بسر کرے گا، وہی تو نہیں جس پر موصوفہ سوتی تھیں۔؟"

بولے: "میرے خیال میں تو نہیں لیکن اگر آپ ایسا سوچنے میں راحت محسوس کرتے ہیں تو آپ کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس ملک میں سوچنے کے خلاف کوئی قانون نہیں۔"

یہ کہہ کر کرنل فورڈ نے قہقہہ لگایا اور پھر بڑھ کر ہمارے کان میں سرگوشی کی:

"مگر این بولین تھی بہت ہی تماشا پاتی۔ کوئی شخص ہنری پر الزام نہیں دھر سکتا۔"

یہ کہہ کر فورڈ نے آنکھیں بند کیں، اپنے لبوں کو ایک ہوائی بوسے کی شکل میں بھینچا اور کھولا۔ اور ہم سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ ہم نے اس مرصّع خواب گاہ اور مخترہ بستر کا جائزہ لیا۔ بیشک یہ این بولین کا بستر نہ تھا لیکن این بولین کے قابل ضرور تھا اور ایک طرح سے این بولین سے بھی نسبت تھی ——— یہ خیال آیا اور خدا جانے کیا سوجھی کہ ایک لمحے کے لئے ہم کپڑوں سمیت اس پر دراز ہو گئے۔

---

[1] ہنری ہشتم کی چھ بیویوں میں سے دوسری۔

لیٹے لیٹے اپنے آپ سے سوال کیا کہ یہ حرکت کیوں کر رہے ہو تو اندر سے جواب ملا کہ میاں، تم رانجھے کے ہم وطن ہو ۔ خالی سیج پر سو جانا اہلِ دل کی پرانی ریت ہے ۔ چنانچہ چند لمحے اور لیٹے رہے کیونکہ ہمیں یہ ڈر نہ تھا کہ ہیر کی طرح این بولین بھی اپنی سہیلیوں کو لے کر گستاخ اجنبی کی مرمت کو آ نکلے گی ۔ بلکہ ہماری انگریزی ہیر کو چار سو سال پہلے ہی ہنری کیدو ڈالے جا چکا تھا۔

شام پیلس کے باہر ایک غیر شاہی مکان میں کھانا تھا۔ کھانے کا وقت ساڑھے آٹھ بجے شام تھا۔ ہم سوا آٹھ بجے پیلس سے باہر نکلے تو سورج اور اس کی روشنی کا یہ عالم تھا گویا ہم رات کے کھانے پر نہیں ظہر کی نماز پڑھنے جا رہے ہیں۔ پھر کوئی ساڑھے دس بجے کھا کھا کر باہر نکلے تو دیکھا کہ مغرب میں سرخ و کبود شفق پھول رہی ہے۔ سورج اور گھڑیوں میں یہ نا اتفاقی ہم نے پاکستان میں نہ دیکھی تھی ــــ آخر محل کو لوٹے۔ لیکن اگر محل کے باہر ہمیں اوقاتِ انگلستان سے مقابلہ تھا تو محل کے اندر ہمیں تاریخ انگلستان کا سامنا تھا سوئے تو خواب میں پہلے این بولین سے معاملہ رہا پھر ہنری ہشتم سے مصافحہ ہوا اور جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا۔ صبح بستر سے نکلے تو جہاں قدم رکھتے، معلوم ہوتا کہ پاؤں شاہی خاندان پر ہی پڑ رہا ہے۔ غسل خانے کا کواڑ کھولا تو خیال آیا، ہنری نے اسی کونے سے جھانکا ہوگا۔ غسل کے ٹب میں لیٹتے ہوئے دیوار کا سہارا لیا تو سوچا، این بولین نے بھی یہیں ٹیک لگائی ہوگی، یہاں لیٹی ہوگی، یہاں پھسلی ہوگی، یہاں ...... ہمارا سر چکرا گیا تھا لیکن این بولین نے زندگی میں ہنری کو وہ چکر نہ دیے ہوں گے جو مر کر ہمیں دیئے۔ لیکن شاہی خواب گاہ میں سونے کا کچھ خراج تو ادا کرنا پڑتا ہے۔

ناشتے سے فارغ ہو کر پیلس سے باہر نکلے تو میجر جیکسن اپنی کار سمیت ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ تقریب یہ تھی کہ اور چیزوں کے علاوہ ہمیں برطانوی فوج کی مرکزی لائبریری دکھائی جائے ــــــ آپ کو یاد ہوگا کہ ہماری ولایت یاترا کا برطانوی فائلوں میں یہی بہانہ لکھا تھا کہ ہمیں برطانوی نظامِ کتب خانہ کا مطالعہ کرایا جائے گا۔ سو ابتدا اس فوجی کتب خانے سے ہوئی۔ شاید اس لئے کہ ہم بھی فوجی تھے۔

فوجی کتب خانے میں گئے تو باہر سے گودام نظر آیا۔ میجر جیکسن کو سوالیہ نظروں سے دیکھا تو جواب ملا۔

"فکر نہ کریں۔ یہ اندر سے بھی گودام ہی ہے، کتابوں کا گودام!"

اندر گئے تو گودام کی وسعت کے باوجود اس کی ترتیب میں سلیقہ نظر آیا اور ذرا حیرت ہوئی۔ کیا میجر جیکسن نے شرارتاً اسے گودام کہہ دیا تھا؟ ہماری نگاہوں میں دوسرا سوال اُبھرتے دیکھا تو کہنے لگا :

"یہ سلیقہ خود رو نہیں بلکہ لائبریرین کے حسنِ مذاق کا نتیجہ ہے۔ آئیے آپ کو لائبریرین سے ملائیں

(باقی آئندہ)

فکر تونسوی

مسخرہ چلا گیا۔۔

اور آخر طنز نگار کنہیا لال کپور بھی ہماری دنیا سے چلا گیا۔!

اس خبر پر یقین نہیں آیا۔ جیسا کہ عام طور پر ایسی منحوس خبروں پر یقین نہیں آتا۔ لیکن یقین آئے یا نہ آئے جیسی دنیا خدا نے بنائی ہے اس میں موت اٹل ہے۔ موت کا خوف اس دنیا کی مستقل اور پائیدار بنیاد ہے اور اگر کنہیا لال کپور کی موت پر بھی میرے منہ سے جو بے اختیار یہ شعر نکل گیا کہ ـــ

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آب بقائے دوام لا ساقی

تو کوئی فائدہ نہیں ہمارے قبضے میں آب بقائے دوام نہیں ہے۔ ہمارے حصے میں تو یہی شعر آئے ہیں۔ ہم شعر اوڑھتے ہیں بچھاتے ہیں اور یا کوئی فکر تونسوی اس مسخرے پر ایک کالم لکھ کر اپنی بے بسی کا اظہار کر دیتا ہے کہ ایک مسخرہ جو چالیس برس تک ہمیں ہنساتا رہا بالآخر ہمیں رلا کر چلا گیا۔

●

میرا یہ لکھنا بھی اب شاید سودا جی لگے کہ کنہیا لال کپور ہمارے وقت کا ایک عظیم دانشور تھا۔

اور شوخ و شنگ طنز نگار اردو کا وہ واحد فن کار تھا جس نے اردو مزاح سے نکال کر تیر و نشتر قسم کے طنزیہ ادب سے متعارف کرایا اور پھر اسے دنیا کے عظیم طنزیہ ادب کے ہم پلہ بنا دیا۔ گذشتہ سال جب اسے غالب ایوارڈ عطا کرنے کے سلسلے میں دہلی مدعو کیا گیا تو میری جانگھ پر زور سے تھاپ اور زور سے قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔

اوے جی فکر صاحب! جانتے ہو کہ یہ لوگ مجھے ایوارڈ کیوں دے رہے ہیں۔؟

میں نے تھاپ کی ٹیس سہلانے کے بجائے اس اعزاز کے اہل سمجھے گئے ہوں گے۔

یوں نہیں بادشاہو! یہ لوگ دراصل مجھ پر ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ لے کپور تمہارا اب رام بیس برس راہ ہے"

میں کیا جانتا تھا کہ وہ ایوارڈ کا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ سچ سچ اس کے قہقہے میں زندگی کے ٹوٹتے ہوئے تار لرز رہے ہیں اور نہ مجھے اس وقت شبہ ہوا جب وہ دہلی ریلوے اسٹیشن سے سیدھا میرے غریب خانے

پر آگیا تو اس کے ساتھ ایک شکیل اور سڈول پنجابی نوجوان بھی تھا۔ مجھ سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگا۔ یہ میرا باڈی گارڈ ہے، جیسے راشٹرپتی کے ساتھ ہمیشہ لگا رہتا ہے۔

"کیا مطلب؟"

مطلب یہ کہ راشٹرپتی کو ہر وقت چل بسنے کا خدشہ لگا رہتا ہے نا؟

نہیں، مجھے جب بھی شبہ نہیں ہوا کیونکہ کپور تو ہمیشہ موت کا مذاق اڑاتا رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا کو تسلیم کر ہی لینا چاہیئے کیونکہ بیک وقت اتنی خوبصورتی اور اتنی بدصورتی پیدا کرنے کا کام کسی برتر وجود کا ہی نام ہو سکتا ہے اس وجود کو خدا کہہ دو۔

میں نے کہا تھا۔ مگر کپور صاحب! میں اور آپ دونوں بدصورت ہیں حتیٰ کہ برنارڈ شا تک خوبصورت نہیں تھا۔ اس لیئے مجھے تو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔"

مگر کپور کا خیال تھا کہ خدا نے ہمیں حُسن عطا نہیں کیا مگر طنز نگاری ودیعت کر دی اس لیئے میں تو مایوس نہیں ہوں۔ اس جنم میں جتنی چیزیں مجھے ودیعت نہیں کی گیئں وہ اگلے جنم میں مل جائیں گی۔ اس سے بھی اگلے جنم میں مل جائیں گی۔ انسان کو ابھی چوراسی لاکھ جنم لینے ہیں چنانچہ میں بھی اُسے ویسے کسی نہ کسی جنم میں ہر ایک سے انتقام لوں گا۔ حضرت یوسف سے، مدھوبالا سے محمد علی کلے سے بھی

نہیں نہیں، قدرت نے اس جنم میں بھی اُسے ہر شئے ودیعت کی تھی۔ یہ کبھی ذہانت شرافت نفس جو آج کل نایاب ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اپنی ہر خوبی کا مذاق اڑاتا تھا۔ ایک مرتبہ اسے پروفیسری کی بجائے پرنسپل بنانے کی پیشکش ہوئی۔ اسے انٹرویو پر بلایا گیا۔ سوال پوچھے گئے :-

کیوں جناب! کیا آپ اسپورٹس میں دلچسپی رکھتے ہیں؟

"قطعی نہیں"

کالج میں کلچرل فنکشن کروا سکتے ہیں؟

"ہرگز نہیں"

کالج میں کوئی نئی بہبودیاں اور بہتریاں لا سکتے ہیں؟

"بالکل نہیں"

اور پھر کپور نے مجھے بتایا کہ وہ یہ سن کر بے حد مسرور ہوا کہ انٹرویو بورڈ نے اُسے نا اہل قرار دیا ہے اور مجھے پرنسپل بننے کا چانس نہیں دیا جائے گا۔ لیکن بعد میں جب وہ اپنے آپ میں نہ رہا تو اسے پرنسپل بنا دیا گیا۔ لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے وہ ہر لذت میں بڑی تسکین پاتا تھا۔ اس کا فارمولا تھا کہ جب تک آدمی جیتا ہے اسے گھر میں زیادہ سے زیادہ ایک آدھ گھنٹہ ہی رہنا چاہیئے اور باقی وقت گھر سے باہر گزارنا چاہیئے۔ چنانچہ اگر اس کا بچہ بیمار ہوتا تو وہ اُسے اس ڈر سے ڈاکٹر کے پاس نہ لے جاتا کہ کہیں ڈاکٹر یہ نہ کہہ دے کہ بچے کا بچنا محال ہے۔ اُسے کپڑا خریدنے کے لیئے بھیج دو۔ زیادہ سے زیادہ بے ایمان بزاز آٹھ دس روپے اس سے زیادہ لوٹ لے گا تو کیا ہو۔ لُوٹنا تو اٹل ہے پھر فرار کی لذت کو کیوں آٹھ دس روپے کی خاطر قربان کیا جائے

ہاں وہ اس ان ڈائرکٹ طریقے سے معاشرے پر، انسان پر، احباب پر طنز کرتا تھا۔ لاہور سے کافی ہاؤز کا ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے ایک انتہائی گھٹیا شاعر تھا اور بدصورت بھی تھا یعنی دو آتشہ تھا۔ کپور صاحب کو اپنا کلام سنانے لگا۔ سبھوں نے اس کی غزلوں پر منہ بنایا مگر کپور صاحب نے اس کی تعریف کے پُل باندھ دیئے جس پر شاعر دیشِ خطی ہو گیا۔ بولا۔ کپور صاحب آپ گریٹ ہیں مجھے کوئی خدمت بتایئے میں اُسے سر کے بل انجام دوں گا۔

کپور صاحب نے کہا۔ تو پھر میرا ایک کام کیجئے ذرا میرے غریب خانے تک تشریف لے چلئے۔

شاعر بولا: وہاں کون سی خدمت مجھے بجا لانی ہوگی؟

کچھ نہیں بس میں آپ کو اپنی بیوی کے سامنے پیش کروں گا اور کہوں گا محترمہ! دیکھو اسے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔ تم مجھ پر خواہ مخواہ کڑھتی ہو، ورنہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ بھونڈے انسان موجود ہیں جسمانی اور ذہنی دونوں طور پر۔

★

کہاں تک لکھتا چلا جاؤں۔ کپور تو ایک وسیع بھنڈار تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آتا۔ میں اسے اپنا گرو مانتا تھا۔

گرو چلا گیا۔ چیلا اس پر کالم لکھنے کے لیے زندہ ہے ورنہ میں بھی مرحوم کی طرف اپنے متعلق انشاء اللہ خاں انشاؔ کا ایک شعر ارسال کر سکتا ہوں۔ کپور صاحب کو ہزاروں اشعار یاد تھے ؎

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

○

رفیق شاکر (کھام گانوی)

چھپا

چاندنی سے چٹک گئے چھپا
بس کے پیچھے لٹک گئے چھپا

لوگ لائے ہیں ان کو مسجد میں
یا کہ خود ہی بھٹک گئے چھپا

سارے پرچوں میں پاس تھے لیکن
ہسٹری میں اٹک گئے چھپا

چھوٹی بی اے بھی ہو گئیں بیگم
پانچویں میں لٹک گئے چھپا

سمجھو دیوانہ ہو گیا اس کا
گھر میں جس کے بھٹک گئے چھپا

دام دینے کے وقت اے شاکر
خالی بٹوہ جھٹک گئے چھپا

●

پیروڈیاں ــ کنہیا لال کپور

تنہائی ـــــ فیض احمد فیض

پھر کوئی آیا دلِ زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئیں ـــ راستہ تک تک کے ہراک راہ گزر
اجنبی خواب نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھادو مئے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کرلو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

لگائی ـــــ کنہیا لال کپور

فون پھر آیا دلِ زار نہیں خون نہیں
سائکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اُترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلّا کے ہر چوکیدار
گُل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ چراغ
یاد آتا ہے مجھے سُرمۂ دمبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

مجازؔ کے دو بند

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دَمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کر اس اِندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پیروڈی

جی میں آتا ہے کہ اُٹھ کر آج ساغر توڑ دوں
مار کر پتھر یہ خنجر اپنا خنجر توڑ دوں
اپنا سر چھوڑوں نہ چھوڑوں غیر کا سر توڑ دوں
وائے حسرت کیا کروں اُف ہائے حسرت کیا کروں
جی میں آتا ہے اُٹھ کر آشیاں کو پھونک دوں
پھونک دوں یہ چاند ستارے پھونک دوں
پھونک کشتی کو اپنے بادباں کو پھونک دوں
مہرباں کو پھونک دوں نامہرباں کو پھونک دوں
وائے حسرت کیا کروں اُف ہائے حسرت کیا کروں

خرافات

(مراسلے)

● مکرمی و محترمی : سلام نیاز

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ حیدرآباد کے مختصر قیام
، دوران آپ نے جس خلوص و محبت سے مہمان نوازی فرمائی ہے
ں کا لفظوں میں شکریہ ادا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ
، حسنِ سلوک اور اخلاق و محبت کے گہرے نقوش میرے
سینے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ افسوس کہ وقت کی کمی کے باعث
پ کی صحبت سے زیادہ استفادہ نہ اٹھا سکا۔ مشکور ہوں کہ
پ نے ان چند لمحوں کو خوبصورت بنا دیا جو حیدرآباد کی سرزمین
ں پہ گزارے۔ والسلام۔ ناچیز

منیر احمد شیخ (پریس کونسلر)
ایمبسی آف پاکستان۔ نئی دہلی

● "جشنِ بھارت چند کھنہ"

جشن کھنہ ہے
در اصل
اردو کا جشن
جشنِ افسانہ و جشنِ طنز و مزاح
جشنِ دانشوراں
جشن صاحبدلاں
جشن زندہ دلاں

جشن یونہی ہمیشہ مناتے رہیں
حوصلے زندگی کے بڑھاتے رہیں

بشیر انور حیدرآباد

● تازہ شگوفہ نظر نواز ہوا۔ بزم زندہ دلان مردہ دلوں
، اقبال کے کلام میں طنز و مزاح اور کرنل محمد خاں کا مالِ مفت
بے حد پسند آیا۔ واہی اور جوہر کی نظمیں بھی خوب رہیں۔ خاکسار کا
مضمون 'رخِ محبوب کا جغرافیہ' مدت بعد سہی مگر شائع تو ہوا۔
یہاں شگوفہ بے حد پسند کیا جا رہا ہے۔ ٹائیٹل کے دلچسپ کارٹون
ATTRACT کرتے ہیں۔ آل انڈیا مزاحیہ مشاعرہ پٹنہ میں آپ
صاحبانِ زندہ دلان حیدرآباد کی شرکت پر مبارکباد۔ کاش کسی مجلس
میں آپ لوگوں کی نمکینیوں سے محظوظ ہونے کی سعادت رکھتا۔

خلوص کیش مختار یونس (مالیگاؤں)

● مکرمی تسلیم : اپریل کا شگوفہ نظر نواز ہوا 'سووینیر بھارت چند
کھنہ کارنر' جملہ چٹکلوں بٹنوں سمیت پسند آیا اور قابلِ مبارکباد
ہے۔ شگوفہ کا ایک آدھ شمارہ ناقابلِ مبارکباد بھی نکالیئے۔ مارچ
کے شمارے میں صفدر کا مضمون "بس اسٹینڈ" بطورِ خاص پسند
آیا۔ ان سے مزید لکھوائیے۔ محمد حنیف کا مضمون "گدھا کانفرنس"
بھی خوب ہے۔ تازہ شمارے کی جھولی میں مالِ مفت خاصا
لذیذ رہا۔ اس بار آپ نے کرنل محمد خاں کو اتنی دور کیوں بٹھا دیا
عموماً یہ ہوتا ہے کہ جب شعراء تخلیقی اعتبار سے کنگال ہو جاتے
ہیں تو پٹے پٹائے مضامین کی لکیر پیٹنے لگتے ہیں یعنی خود کو
دہرانے لگتے ہیں مگر یہ کیا کہ آپ بعض 'ارشاد شدہ' شعراء کو
"مکرر ارشاد ہو" کہہ کر دوبارہ اور سہ بارہ چھاپ رہے ہیں
لگتا ہے سننے والوں کی کمی نہیں البتہ ہزل گو شعراء کا کال
پڑا ہے۔ اتنا بہترین رسالہ شائع کرنے پر پھر ایک بار مبارکباد
قبول فرمائیے۔ ناچیز

عبداللہ خاں (امراوتی)

● محبی تسلیم : سالنامہ مل گیا۔ سارا پرچہ خالص شہد
کے چھتے کی طرح ہے۔ اس بار تو فکر صاحب پھر اپنا برتری
جتا گئے۔ ان کے بعد وجاہت علی سندیلوی پسند آئے۔ مسیح انجم اپنے
جونتہ سمیت سب پر چھا گئے۔ جونتہ کے توسط جس طرح طبقاتی
سماج کی پیوندکاری کی گئی ہے وہ مسیح انجم کا ہی حصہ ہے اتنے شاندار
انشائیہ پر انہیں مبارکباد۔ رؤف خوشتر (گلبرگہ)

اداریہ

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

نامور طنز نگار کنہیا لال کپور ۵۔ مئی کو پونا میں انتقال کر گئے۔ دو دن بعد دلّی کے بعض اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی۔ تاہم کئی دنوں تک اُردو دنیا اس سانحہ اور اس کی تفصیلات سے بے خبر رہی۔ کپور صاحب وظیفہ پر علٰحدہ ہونے کے بعد موگا (پنجاب) میں مقیم تھے لیکن ڈھائی تین سال قبل اپنے بچوں کے ساتھ پونا چلے آئے تھے اور گوشہ نشینوں کی سی زندگی گزار رہے تھے۔ صدر مہاراشٹرا اردو اکیڈمی جناب خواجہ عبدالغفور کو پونا میں ان کے قیام کا علم ہوا تو انھوں نے کپور صاحب کو بمبئی میں وسط اپریل میں منعقدہ ایک ادبی جلسہ میں مدعو کر لیا۔ کپور صاحب عام طور پر جلسوں میں شرکت سے احتراز کرنے لگے تھے چنانچہ زندہ دلان حیدرآباد کے سالانہ جلسوں میں شرکت کی دعوت پر معذرت کر لیا کرتے تھے۔ اصرار کرنا یوں بھی مناسب نہ تھا کہ پنجاب سے حیدرآباد کا سفر بڑا طویل تھا۔ عجیب اتفاق یہ کہ انتقال سے ایک دن قبل محترم خواجہ عبدالغفور صاحب سے گفتگو کے بعد یہ طے کیا گیا کہ بمبئی اور حیدرآباد میں ایک ساتھ ۲۷۔ جون کو کپور صاحب کی ۷۰ ویں سالگرہ کی تقاریب اہتمام کے ساتھ منائی جائیں۔ محترم غفور صاحب کپور صاحب سے توثیق حاصل کر کے مطلع کرنے والے تھے لیکن قدرت کو شاید یہ منظور نہ تھا۔ سالگرہ تقاریب کے پروگرام کی تفصیت کے بجائے ان کے انتقال کی منحوس خبر ملی۔

کنہیا لال کپور طنز و مزاح کے بے تاج بادشاہ تھے جسمانی قد و قامت کے ساتھ ساتھ مزاحیہ ادب میں بھی ان کا قد سب سے اونچا تھا۔ طنز و مزاح کی صنف کو ادب میں مستحقہ مقام دلانے میں بھی ان کی کوششوں اور معیاری تحریروں کو بڑا دخل ہے پیروڈی نگار کی حیثیت سے انھوں نے جو کام انجام دیا وہ کسی بھی بڑے تنقید نگار سے ممکن نہ تھا۔ اس معاملہ میں دوستی و یاری کا بھی لحاظ نہیں رکھتے تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کے وہ گہرے دوست تھے۔ لیکن ادب اور پروپگنڈہ کو الگ خانوں میں تقسیم کرتے تھے۔ کرشن چندر کو وہ سب سے زیادہ چاہتے اور پسند کرتے تھے لیکن اُن کا خاکہ اُڑانے سے بھی وہ باز نہ آئے —— ایسے بے باک، اعلیٰ ادبی صلاحیتوں کے حامل منفرد مزاح نگار کی موت سے طنز و مزاح کا بڑا نقصان ہوا ہے۔ ہم کپور صاحب کے پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ ان کی روح کو شانتی نصیب ہو۔

کنہیا لال کپور کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے "شگوفہ" کا خصوصی نمبر ستمبر ۸۰ء میں شائع کیا جائے گا قلمی معاونین سے تعاون کی درخواست ہے۔

R. No. 15822/68
SHUGOOFA
Postal Regd. No. H.HD 6
Vol 13 Copy 5
31 Bachelor Quarters, M.J. Market Hyderabad-1
May 1980
Phone : 57716
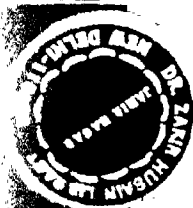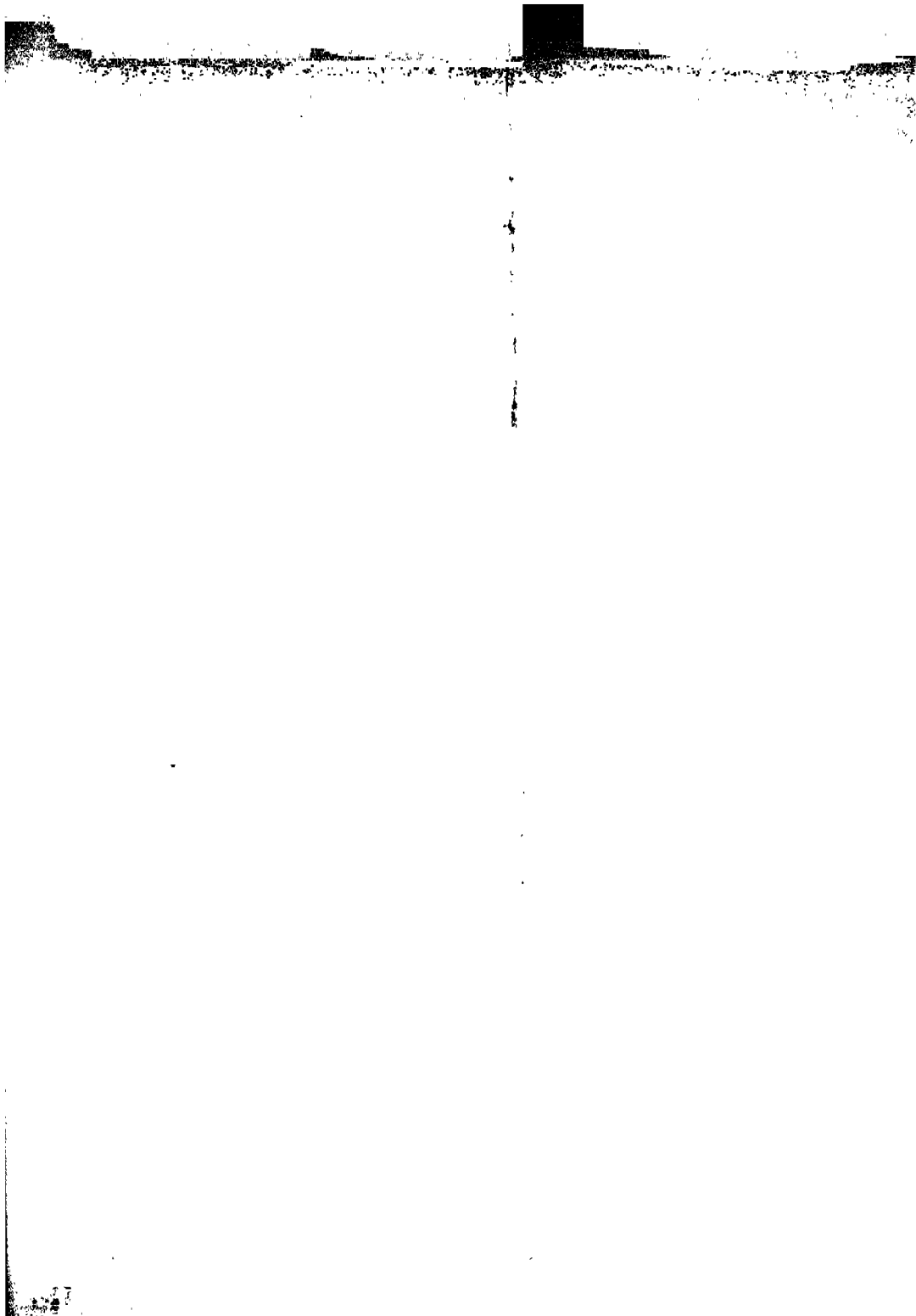
ایڈیٹر:
سید مصطفیٰ کمال

مجلس مشاورت:
حمایت اللہ
منظور احمد
مسیح انجم

مجلسِ مشاورت:
راجندر سنگھ بیدی
بھارت چند کھنہ
خواجہ عبدالغفور
نریندر لوتھر
مجتبیٰ حسین

جنرل منیجر:
سمیع جلیل

منیجر:
بشیر انور

ٹائٹل:
طالب خوندمیری

سالانہ (۲۲) روپے، لائبریریوں سے (۲۵) روپے
بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ
فی پرچہ: (۲) روپے

طباعت:
اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

خط وکتابت کا پتہ: ۳۱- مجرد گاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد فون: 57716

ماہنامہ شگوفہ کا

نامور طنز و مزاح نگار کنھیا لال کپور کو خراجِ عقیدت

کنھیّا لال کپور نمبر

ستمبر ۸۰ء میں شائع ہوگا۔

کنھیا لال کپور کی شخصیت، فن کا مکمل جائزہ
کپور کے مضامین کا انتخاب اور دیگر تفصیلات کا منعاقب اعلان کیا جائے گا۔

اِس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

کرنل محمد خاں

(بسلسلۂ گذشتہ)

لندن ـ تجدید ملاقات

مس کاٹن کھلے فرنیٹر کی قائل ہیں

میجر جنکن نے ایک کیبن پر دستک دی ۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک وسیع چمکدار میز کے پیچھے ایک کشادہ کرسی پر ایک بھرے بدن کی خوش شکل خاتون بیٹھی ہے ۔ ہم نے پہلے تو شتابی سے اپنے تصور کی اصلاح کی جس کی رُو سے ہم نے اس کرسی پر ایک گنجا سا عینکو مرد لائبریرین بٹھا رکھا تھا جیسا کہ ہم پیچھے اکثر پاکستانی لائبریریوں میں دیکھ آئے تھے ۔ میجر جنکن نے تعارف کرایا ۔

"مس لُوسی کاٹن ۔ برطانیہ کی سب سے حسین، سب سے ذہین اور سب سے سڈول لائبریرین اور ہمارے پاکستانی مہمان کرنل خان ۔"

مس کاٹن نے بوڑھے جنکن کی شرارت کو ایک مسکراہٹ کے ساتھ نظر انداز کرتے ہوئے ہم سے مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا ۔ جب ہم نے تصور سے نکل کر حقیقت کو قریب سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ لباس بجا نہ میں سمائے نہیں سماتی ۔ مس کاٹن کا سینہ مس کاٹن سے دو قدم بڑھ کر خیریت مزاج پوچھتا تھا ۔ پھر موصوفہ کے ساتھ لائبریری کا چکر لگایا تو محسوس ہوا کہ اُن کے ساتھ چلتے ہوئے اور خصوصاً بالمشافہ کلام کرتے وقت، بے حد جسمانی احتیاط کی ضرورت ہے، خصوصاً اس لیئے کہ محترمہ خود اس ضمن میں خاصی بے احتیاط واقع ہوئی تھیں ۔ خدا جانے کسی سے چھُو جانے کے معاملے میں اُنہوں نے کوئی حد مقرر کر رکھی تھی یا اسے کھلا فرنیٹر سمجھتی تھیں ۔ بہر حال یہ مس کاٹن کا داخلی معاملہ تھا ۔ سرحد کے اِس پار کا ردِ عمل کچھ ایسا ناگوار نہ تھا اور ہمارا خیال نہیں کہ کسی نے مس کاٹن کو حد پار کرنے پر احتجاجی نوٹ بھیجا ہو ۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ مس کاٹن کی لائبریری بھی تکنیکی لحاظ سے مس کاٹن ہی کی طرح بے عیب تھی اور جس طرح ـــــ بقول مشتاق احمد یوسفی ـــــ موصوفہ کی ذاتی فہرست مضامین کا آسانی سے مطالعہ کیا جا سکتا تھا، اسی طرح لائبریری کی ہزارہا کتابوں کو اس خوبصورتی سے مضمون وار ترتیب دیا گیا تھا کہ پہلی کوشش ہی پر مطلوبہ مقام پر انگلی رکھی جا سکتی تھی ۔ چنانچہ ہم نے لائبریری کے حسنِ انتظام کی دل کھول کر داد دی ۔ اس پر مس کاٹن جامے میں پھولے نہ سمائی ۔ ثبوت یہ کہ ہمیں جامے کے کسی نامعلوم مقام پر بخیہ اُدھڑنے کی آواز آئی ۔ پھر مزید تعریف کے لئے موصوفہ

نے ایک۔ اور لیڈنگ سوال کر دیا۔

"تو، لائبریری پسند آئی؟"

"جی ہاں، بہت، لیکن لائبریرین سے زیادہ نہیں۔"

"حسنِ انتظام، حسنِ کلام، حسنِ ...."

"بس بس بس! آپ مذاق کر رہے ہیں۔ کیا معلوم پاکستان میں آپ کی لائبریرین کوئی پُر اسرار مشرقی حسینہ ہو۔"

"محترمہ، وہ مشرقی تو ہے اور شاید اسرار سے بھی خالی نہیں لیکن سات بچوں کا باپ ہے۔ گنجا ہے۔ بائی فوکل چشمہ پہنتا ہے اور ناک کی چونچ بھی رکھتا ہے۔ آگے آپ خود اس کے حسن کرشمہ ساز کی پیمائش کر لیں۔

"تو مرد ہے؟ کیا عورتیں وہاں لائبریرین نہیں ہوتیں؟"

"جہاں تک میرا علم ہے ہماری حسیناؤں نے ابھی تک لائبریری کا رُخ نہیں کیا۔"

"تو آپ کی حسیناؤں کا رُخ کس طرف ہے؟"

"ہماری اصلی حسینائیں تو صاحبوں اور سیٹھوں کے حرم میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر کھا کھا کر اشوک کا سٹوپا بن جاتی ہیں۔ ایک محدود سی تعداد سینما یا ایئر لائن میں کھپ جاتی ہے یہ کھاتی بھی ہیں اور کام بھی کرتی ہیں۔ لہٰذا سدا بہار رہتی ہیں۔

"تو آپ کے یہاں بیگمیں، ایئر ہوسٹس اور ایکٹریس ہی ہوتی ہیں، گھریلو بیویاں نہیں ہوتیں؟"

"کیوں نہیں؟ باقی ننانوے فیصد کا یہی تو شغل ہے اور ان ہی کے دَم سے ہمارے چولہے آباد ہیں۔ میں سمجھا آپ صرف حسینوں کا استعمال پوچھ رہی تھیں۔"

"لیکن وہ لائبریرین کیوں نہیں بنتیں؟ میرے خیال میں تو لڑکیوں کے لئے یہ بہترین کام ہے۔ مجھے دیکھیں۔"

"آپ کے سوا کچھ دیکھ ہی نہیں رہا اور دیکھنے کے بعد گزارش ہے کہ اگر آپ پاکستان میں ہوتیں تو لائبریری کی بجائے گلبرگ کے کسی بنگلے میں ہوتیں۔"

پیشتر اس کے کہ لوسی ہم سے گلبرگ کے معنی پوچھتی، جیکسن ہماری گفتگو میں مخل ہوا:

"لوسی، تم پاکستان کی تیاری کرو۔ اتنے میں ہم ذرا لنچ کھا لیں۔ دیر ہو رہی ہے۔"

لوسی سے رخصت لی۔ ریستوراں قریب تھا۔ داخل ہوئے اور جیکسن نے بیرے کو صرف آنکھ مار کر آرڈر دے دیا۔ تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے دو دو سینڈوچ اور ایک ایک گلاس بیئر کا رکھا ہے۔ میجر جیکسن نے تو سینڈوچ کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ہر روز کرتا تھا اور پھر غٹ غٹ بیئر پینے لگا لیکن ہم نہ بیئر کو ہاتھ لگا سکتے تھے کہ بظاہر حرام تھی اور نہ سینڈوچ کو کہ بباطن مشکوک تھی۔ عام انگریزوں کے لنچ کا ہمارا پہلا تجربہ تھا۔ پتہ چلا کہ کمپنیوں کے بالتو ڈائرکٹروں کو چھوڑ کر برطانوی عوام سینڈوچ[1] یا فش[2] اینڈ چپس ہی پر جیتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ ان کم بختوں نے فش اینڈ چپس کھا کھا کر ہی کبھی ایمپائر بنائی تھی اور آج بھی اسی خوراک پر پانچ بڑوں میں شمار ہوتے ہیں۔ شاید تھوڑا اور سادہ کھانے ہی میں کوئی راز ہو۔ لیکن یہ فلسفے کا معاملہ تھا اور فلسفہ ہمارا کمزور پوائنٹ ہے۔ بہرحال ہمارا فوری پرابلم کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہ تھا بلکہ پیٹ بھرنا تھا اور اب وہ کھانا جو ہمارے

---

[1] SANDWITCH [2] FISH AND CHIPS مچھلی اور آلو کے ٹکڑے۔

سامنے رکھا تھا، ناکافی ہی نہ تھا، غیر اسلامی بھی تھا۔ سو ہم نے اِس بے لذت گناہ سے ہاتھ کھینچ کر اپنا حصہ بھی جنکن کے آگے ڈال دیا ـــــ ایسا کرتے ہوئے مسز جنکن کا چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک ممنون انگریز کی شکل کیسی ہوتی ہے ـــ اور خود ایک بے وقت کی راگنی گا کر دعوتِ کام و دہن کا فیصلہ کیا یعنی ایک بھرپور ناشتے کا آرڈر دے دیا۔ انگریزی کھانوں میں بہترین کھانا یا تاش کی اصطلاح میں ٹرمپ کھانا ناشتہ ہی ہے اور تاش ہی کا اصول ہے کہ جہاں شک ہو، وہاں ٹرمپ کا پتا چلو۔

این بولین کی خواب گاہ میں دوسری آخری اور تاریخی رات گزارنے کے بعد اگلے روز الٹم کو الوداع کہی اور صبح کی ٹرین سے لندن کے چیرنگ کراس اسٹیشن پر پہنچے۔ آگے گونڈل کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھ کر ایک تسلی آمیز ہنسی ہنسا۔ تسلی غالباً اس بات پر کہ ہم راہ میں گم یا اغواء نہیں ہو گئے تھے۔ ہم سے بے ضرورت مصافحہ کیا شاید یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ ہم گوشت پوست کے ساتھ لوٹے تھے، محض ہیولے کر نہیں آگئے تھے۔ پھر یکایک ہمارا سوٹ کیس اٹھا کر ٹیکسی کی طرف بھاگ پڑا اور ہمیں بھی ساتھ بھاگنے کا مشورہ دیا۔

ہم نے کہا: "بھاگیں کیوں؟"

بولا: "آپ کی اگلی گاڑی چھوٹنے والی ہے، کہیں رہ نہ جائیں۔"

"کہاں کی گاڑی؟"

"مانچسٹر کی۔"

"ابھی الٹم سے لوٹے نہیں اور مانچسٹر کی گاڑی تیار ہے؟ کیا تکلیف ہے مانچسٹر کو؟"

"تکلیف مانچسٹر کو نہیں، مس پارس کو ہے۔ کہتی ہے پروگرام طے ہو چکا ہے۔"

ٹھہریئے ملک الموت صاحب۔ مجھے ٹائی لگا لینے دیجئے

یہ کہہ کر گونڈل نے ہمیں مس پارس کا مانوس یا دامی لفافے والا محبت نامہ دیا جس میں سو معذرت کے بعد ایک حکم تھا کہ سیدھے مانچسٹر جایئے۔ وہاں سے چیسٹر جایئے اور چیسٹر کی چھاؤنی میں ایک فوجی لائبریری دیکھیے کہ وہاں کے فوجیوں کو آج اور کل کا دن ہی موافق ہے ـــــــ

[illegible] مس پارس کو یہ احساس [illegible] ایک تہذیبانہ وقفہ لیے بغیر ایک کے بعد دوسری لائبریری دیکھنا۔ آخر لائبریری ہی تھی نا کوئی بیوٹی شو تو نہ تھا۔ بلکہ حیرت ہوئی کہ ان باہمی تعلقات کے پیشِ نظر جو [illegible] پہلے قائم ہوئے تھے، مس پارس نے خود ہی ہمارے آرام کا خیال کیوں نہ رکھا۔ بے شک پالا اُسے فوج سے پڑا تھا تاہم کوئی مارشل لا تو نہیں لگ رہا تھا۔ کہ بمت بدستور ملکہ الزبتھ کے ہاتھ میں تھا لیکن مس پارس کا بھی قصور نہ تھا۔ خرابی یہ ہے کہ انگریزی زندگی بجائے خود مارشل لا ہے۔ ہر کام کرنے کا ایک مقرر وقت اور مسلّم دستور ہے۔ ان کے ہاں دو کاموں کے درمیان تصورِ جاناں کے لئے وہ بلیے وقفے نہیں جن کے ہم عادی ہیں، نہ اوقاتِ کار WORKING HOURS کے دوران ہی ذکرِ جاناں کا دستور ہے جو ہمارا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ بڑے سنگ دل اور بے مروت لوگ ہیں۔ یہ خود تو پابندیِ وقت و دستور کی بیڑیاں پہن کر ہوئے ہیں کم بخت اپنے مہمانوں کو بھی پہنا دیتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ معزز مہمان کس آزاد ملک اور کس کھلی فضا میں پروان چڑھنے کے بعد گھر سے نکلا ہے۔ جہاں وقت اوّل تو ناپا ہی نہیں جاتا اور ناپا بھی جائے تو منٹوں اور سکنڈوں کے پیمانے سے نہیں بلکہ گھڑیوں اور پہروں کے حساب سے اور جہاں کا دستور وہی ہے جو مزاجِ یار میں آئے۔ اگر غالب انگلستان کا چکر لگا آتے تو کبھی کسی کو یہ طعنہ نہ دیتے کہ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا۔ بے چارہ فرہاد

تو فقط تیشے بغیر نہ مر سکا تھا، انگریز تیشہ کھانے کے بعد بھی اُس وقت تک نہیں مرتا جب تک ٹائی نہ لگالے اور ملک الموت کے نام تعارفی کارڈ نہ حاصل کرلے۔ قصہ کوتاہ، وقت و دستور کی انگریزی پابندیوں نے ہماری بھاگی سے گلیر خارج کردیا۔ ویسے ہمیں اپنے میزبانوں سے ایسی خوش فہمی بھی نہ تھی۔ ہم نے تو مس پارس سے بریت لگاتے ہی اپنے دل سے کہہ دیا تھا کہ:

ڈرپیا لگ لیاں بے پرواہ نال اسے

چنانچہ ہم خاموشی سے گولڈہل کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ کر یوسٹن اسٹیشن کو روانہ ہوئے جہاں مانچسٹر کی گاڑی ہمارے لیئے چلا آ رہی تھی۔ جوں ہی ہم نے ڈبے میں قدم رکھا، مزید تیجیس ضبط کرکے اسٹیشن سے چل نکلی اور اس تیزی سے کہ ہم گولڈہل کی آخری نصیحت بھی نہ سُن سکے۔

خیر نال کِتھوں آئے او

ہمارے ڈبے میں تین اور مسافر بھی تھے۔ دو مرد اور ایک عورت۔ تینوں انگریز، تینوں خوش شکل اور تینوں خوش لباس لیکن خدا کی مرضی تینوں گونگے! بڑا رحم آیا اگرچہ یہ دیکھ کر قدرے خوشی ہوئی کہ اخبار پڑھ سکتے تھے اور پڑھ رہے تھے۔ کوئی گھنٹہ بھر غریب اخبار پڑھتے رہے اور پھر اُن میں سے ایک کسی کام کے لئے اُٹھا لیکن اتفاقاً دوسرے کے پاؤں سے ٹکرا کر لڑکھڑایا اور تیسری کی نشست پر گرتے گرتے سنبھلا۔ اس پر فی الفور تینوں اشاروں کی بجائے زبان سے گڑگڑا کر ایک دوسرے سے بامحاورہ معذرت کرنے لگے۔ ہم نے دل میں کہا: ارے یہ تو منہ میں زبان رکھتے ہیں لیکن اس کے استعمال کے لیئے تعارف یا کسی حادثے کے محتاج ہیں اور وہ تو اچھا ہوا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہی حادثہ ہوگیا ورنہ مسلسل خیریت کی صورت میں یہ زندگی بھر ایک دوسرے کا مقاطعہ کیئے بیٹھے رہتے۔ سوچا، نہ ہوا وہ پاکستانی ریل کا ڈبہ اور کوئی پنجاب کا اسٹیشن کہ اجنبی داخل ہوتے ہی بالجہر السلام علیکم کہتا اور جملہ حاضرین باجماعت وعلیکم السّلام سے جواب دیتے۔ پھر ایک کہتا۔

"جی آیاں نوں۔"

دوسرا پوچھتا۔ "خیر نال کِتھوں آئے او؟"

تیسرا کہتا: "چکوال توں؟ فیر تے آپنے وطنی او۔ کی حال اے چکوال دا، تے کی حال اے خان سرفراز دا؟"[1]

پھر جب تک سفر ختم نہ ہوتا، سوال اور جواب بھی ختم نہ ہوتے۔ بات بات پہ ڈبہ قہقہوں سے گونج اُٹھتا اور پتہ چلتا کہ کوئی زندہ دل اور صاف باطن لوگ سفر کر رہے ہیں۔ انگریزی گاڑیوں اور خصوصاً اس کے فرسٹ کلاس ڈبوں کے مسافر تو کسی ایسے مُردے کے سوگوار لگتے ہیں جس کا تابوت بریک میں جا رہا ہو۔ یہی تابوت یہ لوگ سینما میں بھی لے جاتے ہیں۔ مثلاً ہماری لندن کی وہ پہلی شب کہ گولڈہل ہمیں کرزن سینما میں فلم SECRET CER-EMONY دکھانے لے گیا۔ جو ایک ایکس فلم تھی۔ یعنی نابالغوں کے لیے ذرا قبل از وقت سمجھی جاتی تھی لیکن بالغوں کے لیئے بروقت اور سبق آموز تھی۔ اس فلم کے جُز مناظر اور مکالمے بیڈ روم اور غسل خانے کے متعلق اور متصل ہی فلمائے گئے تھے اور کئی ایک مقامات پر فوٹوگرافر صاحب نے وہاں جا جھانکا تھا جہاں جھانکنے کی خواہش تو برحق ہے مگر اسے دبانے کی کوشش بھی حتی المقدور لازم ہے۔ مضمون کے لحاظ سے اس فلم میں ایسی واردات کی کمی نہ تھی جن کو دیکھتے ہی ایک دردمند دل سے "ہائے مر گیا" کی فلک شگاف ہوکیں اُٹھتیں، لیکن حرام ہے جو ہزاروں تماشائیوں میں سے کسی ایک کے منہ سے ہائے کی آہ بھی نکلی ہو۔ سب کچھ ہوتا دیکھتے رہے اور سب کچھ پی گئے۔ بس ذرا زور سے دانت بھینچ لیے اور کرسی کے بازو مضبوطی سے پکڑ

---

[1] : راجہ محمد سرفراز خاں۔ چکوال کے ہردل عزیز، خوش اوقات اور معزز رئیس۔ چکوال کا تصور اُن کے بغیر نامکمل ہے۔ افسوس کہ چند سال ہوئے، اُن کا انتقال ہوگیا۔

لیئے۔ کہاں ہوتا اپنا جہاں گیٹ کا سنیما کہ اِدھر ہیروئین کو ہیرو نے نگاہِ شوق سے دیکھا اور اُدھر سیٹیوں کا آرکسٹرا گونج اُٹھتا۔ اور پھر ہال کے کونے کونے سے جہاں سوز آہوں کا دھواں بلند ہوتا اور گریبان چاک ہونے لگتے۔ انگریزی زندگی ایسے ہنگاموں سے محروم ہے۔ وہ جو فلمی شاعر نے زندگی کے ساز کے متعلق کہا کہ بج رہا ہے اور بے آواز ہے، دراصل انگلستان کی زندگی سے متعلق ہے ورنہ وطن میں تو زندگی کا ساز شکستہ ہونے پر بھی کھڑکتا رہتا ہے۔

خدا خدا کر کے آخر مانچسٹر کا اسٹیشن آیا اور ہم گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر اس انتظار میں کھڑے ہو گئے کہ اگر کوئی استقبال کرنے آیا ہے تو کرلے۔

باضمہ جو سنہری تمغے کا مستحق نکلا

اور استقبال کرنے خود قیامت آئی۔ اگرچہ تعارف پر پتہ چلا کہ باربرا پارکنسن ہے۔ ظالم مہ لقا ہی نہ تھی شیریں ادا بھی تھی، سروقامت ہی نہ تھی، محشر خرام بھی تھی۔ اس فتنۂ رُخ و رفتار کو دیکھ کر جلد مسافروں میں وہ ہلچل پیدا ہوئی جیسے صبح و عرصۂ محشر میں ہوں لیکن اوروں سے زیادہ ہم اس کی زد میں تھے کہ یہ فتنۂ دوراں خطِ مستقیم میں ہماری جانب بڑھ رہا تھا۔ پھر ہمارے قریب تھم کر گویا ہوا۔

"مجھے یقین ہے آپ ہی کرنل خان ہیں۔ میں مس پارکنسن ہوں، باربرا پارکنسن۔"

ساتھ ہی باربرا نے اپنا بے آستین بازو لمبا کر کے ہمیں دعوت مصافحہ دی۔ ہم نے اپنا ہاتھ باربرا کے ہاتھ میں دیا تو اس کی گرفت ہمیں ہاتھ کی بجائے اپنے سینے کے شمال مغربی کونے میں محسوس ہوئی۔ یہ ہمارا استقبال نہ تھا۔ استحصال تھا۔ ہم نے اپنے میزبانوں کو اپنے نمائندوں کے حسنِ انتخاب پر ایک دو موقعوں پر پہلے بھی فل نمبر دیئے تھے لیکن باربرا پارکنسن دیکھی تو سونے کا تمغہ دینے کو جی چاہا۔ آخر وہ تو سونے سے بھی زیادہ قیمتی جنس پر ہاتھ ڈال چکی تھی۔ ہم نے اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

"میرا نام ہی خان ہے۔ اور کیسے مزاج ہیں آپ کے مس پارکنسن؟"

"فائن ـــــ اُمید ہے آپ کا سفر خوشگوار گزرا ہوگا۔"

"سفر بھی گوارا تھا لیکن منزل زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔"

"سچ؟ مانچسٹر اتنا پسند ہے آپ کو؟"

"جی ہاں، لیکن منزل میں مانچسٹر کے علاوہ بھی کچھ شامل ہے۔"

باربرا پارکنسن ہماری بات کا کنایہ پاکر مسکرائی اور بولی:

"مہمان کو ایسے شگفتہ موڈ میں پانا کس قدر لطف کی بات ہے!"

"یہ تو مہمان ہی جانیں۔"

یہ الفاظ اور ہنسی باربرا کے منہ سے ایک ساتھ نکلے۔ پھر اس پہلو سے مطمئن ہو کر کہ اجنبی سے خراج وصول کر لیا ہے، مضمون بدل کر بولی:

"چلیں آپ کو کھانا کھلائیں۔ ڈیڑھ بج رہا ہے، لیکن ہاں، پہلے سامان ہوٹل میں رکھ آئیں۔"

اسٹیشن سے نکل کر گرینڈ ہوٹل پہنچے جہاں ہمارے لیے ایک کمرہ ریزرو تھا۔ سامان رکھا اور کھانے کے لئے کسی موزوں ریستوراں کی تلاش

میں نکلے۔ باربرا بولی:

"مجھے یقین ہے آپ ہندوستانی کھانا پسند کریں گے۔"

کہا: "مجھے یقین ہے کہ میں پاکستانی کھانا پسند کروں گا۔"

بولی: "سوری بھئی۔ میں معافی چاہتی ہوں۔"

ہم نے ہنس کر کہا: "معاف کر دیا۔ صرف آئندہ ذرا احتیاط۔"

تھوڑی دور جا کر کار ایک ریستوران کے سامنے رکی جس کی پیشانی پر لکھا تھا: "نور محل: لذیذ ہندوستانی کھانوں کا مرکز۔" لیکن اندر سے خالص پاکستانی تھا۔ مالک جسیم الدین، باورچی تلمیذ الرحمٰن، بیرا غوث الحسن اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے طغرے اُن پر مستزاد! گویا جو کچھ نطشے کے متعلق کہا گیا تھا، نور محل کے متعلق بھی کہا جا سکتا تھا: قلب اُو مومن دماغش کافر است۔

کھانے کیلئے آرڈر دینے کا وقت آیا تو ہم نے قیادت سنبھالنا چاہی۔ آخر پاکستانی کھانوں کا ہم سے بڑا رمز شناس کون ہو سکتا تھا۔ چنانچہ مینو ہاتھ میں لیئے ہم باربرا کو مختلف پکوانوں کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنے لگے، لیکن دیکھا کہ باربرا ہماری تقریر سے کچھ محظوظ نہیں ہو رہی۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگی: "میں آپ کو مایوس تو کرنا نہیں چاہتی لیکن پاکستانی کھانوں کے متعلق آپ کا علم ذرا مبتدیانہ سا لگتا ہے" اور پھر اس انگریز لونڈیا نے ان ہی موضوعات کو، جن پر ہم مدھم سی روشنی ڈال چکے تھے، پوری فلڈ لائٹ میں نہلا دیا۔ معلوم ہوا باربرا گزشتہ تین برس سے نور محل کی سرپرستی کر رہی ہے اور اگر اب تک نور محل کے کسی راز سے ناآشنا ہے تو وہ راز آشنائی کے قابل ہی نہیں۔ شاید یہی وجہ تھی کہ باربرا نے داخل ہوتے ہی بیرے کو نام لے کر پکارا تھا۔ اور جواب میں وہ بھی محرمانہ کورنش بجا لایا تھا اور ہمیں کونے کی اس میز تک لے گیا تھا جو بظاہر باربرا کی پسندیدہ نشست تھی اور جس پر ایک روپہلی شمعدان میں موم بتی جل رہی تھی —— ہم یوں بھی باربرا کے مہمان تھے۔ باربرا کے طعام شناس پس منظر سے مرعوب ہو کر خاموش ہو گئے۔ پھر اس کے اشارے پر بیرے حرکت میں آ گئے اور میز گراں تا گراں بھرنے لگی۔ ہم اچھے کھانے کے قدرداں ہیں لیکن پُرخوری ہمارا شیوہ نہیں اور اس میز کو تو پُرخوری کی نیت کے باوجود خالی کرنا ہمارے شکم و دہن کے بس میں نہ تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد جب ہم نے کھانے سے ہاتھ کھینچا تو میز کا چہرہ بدستور پُر رونق تھا۔ لیکن باربرا اپنے جملہ اوزاروں کے ساتھ ہنوز سرگرم عمل تھی اور بڑی چابک دستی سے مختلف پلیٹوں کو مسمار کر رہی تھی۔ ہم چند منٹ کے لئے ہاتھ دھونے کے لئے چلے گئے لیکن واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز کی بساط سرتاسر اُلٹ چکی ہے اور بس ایک تمغہ رہ گئی ہے سو وہ بھی خاموش ہے۔ ہمیں آج معلوم ہوا کہ تین سال کی مسلسل پریکٹس خواہ کھیلنے کی ہو یا کھانے کی، کیا رنگ لاتی ہے۔ ہم نے زندگی میں بہت سے دیکھے ہیں اور بے شمار پیٹو بھی لیکن حسین الگ اور پیٹو الگ۔ اس قدر کھاؤ پیٹو حسینہ آج تک نہ دیکھی تھی۔

(باقی آئندہ)

خواجہ عبدالغفور
آئی۔ اے۔ ایس

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دانشوروں اور خرد مندوں نے کہا ہے کہ جو بات کی جائے وہ سوچ سمجھ کر کی جائے اور وہی کہا جائے کہ جو کہنا مقصود ہو اور جو بھی مطلب کی بات ہو وہی کہنا چاہیئے تاکہ بعد میں سبکی یا شرمساری کا موقعہ نہ آئے۔ غصہ یا ناراضگی ہو تو اس کے اظہار سے قبل ایک دو تین.... دس تک دل ہی دل میں گنتی کی جائے اور اس کے بعد اطمینانِ خاطر اور سکونِ دل سے اظہار کیا جائے۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ ایسے کتنے ہیں جو اس طرح کی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہیں؟ بہت سارے لوگ تو کچھ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں کہ سننے والے ان کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کئی ایک تو محض بور کرنے میں ماہر ہوتے ہیں اور بعض تو ایسی چپ سادھ لیتے ہیں کہ سامنے والوں کا دم گھٹ جاتا ہے۔ ان سے چھیڑ کر بات بھی کی جائے تو محض ہوں ہاں صحیح؟ واللہ باللہ کہہ کر سکوت و جمود طاری کر لیتے ہیں اور گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ دراصل مشکل تو ان لوگوں سے ہے جو وقت بے وقت، موقع بے موقع اپنی قوتِ گویائی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے حیوانِ ناطق اور اپنے اشرف المخلوقات ہونے کا بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں اور مسلسل کئے جاتے ہیں ان کو اکثر و بیشتر ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ان کی کہی ہوئی باتیں بے محل۔ کبھی کبھی بے جا۔ ناروا اور نامناسب ہو جاتی ہیں اور خود انہیں شرمساری کی وجہ سے منہ کی کھانی پڑتی ہے ایسے میں انہیں موڈ اور ماحول کو سدھارنے کی فکر لاحق ہوتی ہے اور یہ ایسی ویسی باتیں شروع کر دیتے ہیں اور ان سے صاف پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اپنی ندامت اور خجالت چھپانا چاہتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ کھسیانی بلی کھمبا نوچ

رہی ہے۔ ہم نے ایسے مواقع بہت دیکھے ہیں لیکن کسی بلی کو کھسیاتے ہوئے دیکھا نہ کھمبا نوچتے دیکھا البتہ بلی کو فرش اور قالین پر اپنے پنجے جھاڑتے اور اس کے پرخچے اڑاتے ہوئے ضرور دیکھا ہے۔

حضرت انسان چونکہ اشرف المخلوقات واقع ہوئے ہیں۔ وہ اپنے کھسیانے پن کو مٹانے کے لئے تاسف کا اظہار اس طرح کرتے ہیں کہ بات بنتی نہیں بلکہ اور بگڑ جاتی ہے۔

موسیقی اور نغمہ کی محفل میں ایک صاحب بور ہو رہے تھے اور انہیں گانا بالکل پسند نہیں آرہا تھا اپنے برابر بیٹھے ہوئے ان جانے ساتھی سے کہنے لگے۔ کیا بُرا گا رہی ہے یہ عورت نہ تال ہے نہ سُر۔ جانے کون ہے؟ اور کہاں سے آئی ہے۔؟ ساتھی نے کہا "یہ میری بیوی رنجنا ہے" مذمت کرنے والے صاحب نے اپنی ندامت چھپانے کے لئے بات بنانے کی کوشش کی۔ "جی۔جی وہ ٹھیک ٹھیک گا رہی ہیں لیکن نہ معلوم کس نکمے شاعر کا کلام ہے کہ جو ردیف قافیہ سے باہر ہے اور اسی لیئے تال اور سُر میں نہیں بیٹھ رہا ہے۔" اپنی دانست میں تو انھوں نے اپنی کہی ہوئی بات کی بڑی عمدگی سے صفائی کر لی لیکن انھیں مزید دھکا پہونچا جب صاحب موصوف نے جھلا کر کہا "وہ جو گا رہی ہیں وہ کلام میرا ہی ہے، آپ نے میرا نام تو سُنا ہوگا نرنجن شرما۔" لیجئے اس کے بعد اس قدر بگڑی ہوئی بات کا سدھار کہاں تک ممکن ہو سکتا ہے۔

کہتے ہیں۔ عذرِ گناہ بدتر از گناہ۔ اور سب گناہ تو رہنے دیجئے ایک طرف۔ زبان سے نکلی ہوئی بات اگر کسی کو تیر نیم کش کی طرح لگے تو اس کا مداوا شاید ہی کبھی ممکن ہو۔ حکایت ہے کہ کسی بادشاہ نے اس عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مقولہ کو فضول بے معنی اور لغو قرار دیتے ہوئے اپنے دربار میں اعلان کیا کہ جو کوئی اس کو صحیح ثابت کر دکھائے اس کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔ اس چیلنج کو قبول کرنا بظاہر ناممکن لگتا تھا لیکن ایک ہوشمند مصاحب نے اس کو قبول کیا اور دل ہی دل میں ایک منصوبہ کے تحت موقع کی تاک میں رہا۔ محل میں اندھیرے کے وقت بادشاہ سلامت کو اکیلا پاکر اس نے لپٹ کر پیار کر لیا۔ اُجالے میں جب پتہ چلا کہ مصاحب نے یہ بدتمیزی کی ہے تو غیض و غضب کے مارے بادشاہ نے حکم صادر کیا کہ اس مصاحب کو قید بامشقت کی سزا دی جائے۔ جب بات کچھ ٹھنڈی پڑی اور بادشاہ کا موڈ درست ہوا تو مصاحب نے اپنی جان کی امان مانگ کر دست بستہ عرض کیا۔ جہاں پناہ میرا قصور معاف کیجئے۔ مجھ سے جو گناہ سرزد ہوا ہے وہ دراصل غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اندھیرے میں آپ کو ملکہ سمجھ کر پیار کر لیا۔ اس طرح کی عذر داری اور صفائی نے بادشاہ کے غصّہ کو اتنا تیز کیا کہ انھوں نے مصاحب کا سر قلم کرنے کا حکم صادر کر دیا کہ بادشاہ تو بادشاہ کوئی معمولی آدمی بھی اس بات کو کس طرح گوارا کرتا کہ کوئی اس کی بیگم یا بیوی کو پیار کرنے کی جراءت کرے اور پھر اس کا اعلان بھی کرے۔ جب یہ قطعی حکم صادر ہو چکا تو مصاحب نے قدم بوس ہوکر عرض کیا وہ تو خواب و خیال اور تصور کی دنیا میں بھی ملکہ کو پیار کرنے کی بات نہیں سوچ سکتا اور نہ یہ بات ممکن ہے اس کے بعد اس نے وضاحت کی کہ محض اس کہاوت کو سچ بات کرنے کے لیئے کہ عذرِ گناہ بد از گناہ۔ اس نے پہلے خود بادشاہ سلامت کو پیار کرنے کی جراءت کی اور پھر اس کی عذر داری اس توضیح کے ساتھ کی کہ بادشاہ کو بیگم سمجھا۔ اس طرح ہر پیش

کی ہوئی صفائی کا خاطر خواہ نتیجہ برآمد ہوا۔
یہ ایک ایسی مثال ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بوکھلاہٹ میں بعض وقت آدمی ایک سے بڑی دوسری غلطی کر بیٹھتا ہے اور اظہارِ تاسف کے لیئے جھوٹ موٹ پشیمانی کا اظہار کرتا ہے۔ اس طرح کی الجھنیں قدم قدم پر سامنے آتی ہیں حاضر دماغی اور حاضر جوابی سے بے شک کبھی کبھی کام بن جاتا ہے۔
بیوی نے ناراض ہوکر شوہر سے کہا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں ایسے کم عقل اور نادان سے شادی کر رہی ہوں۔ اگر ایسا گمان بھی ہوتا تو میں صریحی طور پر انکار کر دیتی۔ شوہر نے ہاں میں ہاں ملا کر کہا۔ بے شک تم سچ ہی تو کہتی ہو، میں کم عقل اور خرد مندی سے بے بہرہ نہ ہوتا تو تم سے شادی ہی کیوں کرتا۔ لیجئے اظہارِ تاسف بھی ہوگیا اور پشیمانی کے ساتھ عرض مدعا بھی بڑی خوش اسلوبی سے ہوگیا۔ بات بھی بڑھنے نہ پائی۔ اس کے برخلاف ہمیں نرنجن اور شانتی کا وہ جھگڑا بھی یاد ہے کہ جب نرنجن نے بگڑ کر کہا۔ مجھے تمہارے یہ سارے عیبوں کا پتہ ہوتا تو میں تم سے ہرگز شادی نہ کرتا۔ اس پر شانتی نے بڑی بردباری اور متانت سے جواب دیا" سچ ہی تو ہے اگر مجھ میں یہ برائیاں نہ ہوتیں تو تم جیسے نکمے اور نکھٹو سے میری شادی کیوں ہوتی" یہ اپنی اپنی خجالت اور شرمساری کے منہ توڑ جواب ہیں ــــ
یہ تو ہوئیں بوکھلاہٹ اور خجالت کی شرمساریاں اور ان کا اظہارِ تاسف لیکن بعض وقت سوچے سمجھے طریقہ پر دوسروں کو تختۂ مشق بنانے کے لیئے جھوٹ موٹ کی باتیں کرنا اور ندامت کا اظہار کرنا پڑتا ہے جو خود طنز واستہزا سے بھرا ہوتا ہے۔ انگلستان کی پارلیمنٹ میں ایک بار یہ کہا گیا کہ اس ہاؤز کے اراکین میں آدھے سے زیادہ نالائق ہیں۔ اس پر بڑا شور غوغا مچا۔ معزز اراکین نے ظاہر ہے کہ بہت برا مانا اور ان کے پرزور احتجاج پر اسپیکر نے حکم دیا کہ اظہار افسوس کے ساتھ الفاظ واپس لیئے جائیں چنانچہ اس قسم کا بیان دینے والے پارلیمنٹ کے رکن نے کھڑے ہوکر کہا۔ میں اپنے بیان پر اظہارِ تاسف کرتا ہوں اور اپنا بیان واپس لیتے ہوئے یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ اس ہاوز کے نصف اراکین نالائق نہیں ہیں۔
طنزاً کہے ہوئے زہرخند کی ایک اور دلچسپ مثال ہے کہ جب دو دوست آپس میں لڑ پڑے تو ایک نے دوسرے سے کہا" میں تو اب تک یہی سمجھا ہوا تھا کہ آپ بڑے مخلص اور اچھے دوست ہیں مگر مجھے آپ کے متعلق اپنی رائے بدلنا پڑ رہا ہے" دوسرے دوست نے جواب دیا" میں آپ کی پہلی رائے کی قدر کرتا ہوں"
اسی طرح کا ایک اور واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک راہ گذر پر چھوٹا سا پل تھا جس پر وقت واحد میں صرف ایک موٹر کار گذر سکتی تھی۔ اتفاق کی بات کہ اس پل پر مخالف سمتوں سے آئی ہوئی دو موٹروں کا آمنا سامنا ہوگیا۔ اب ایسی کوئی صورت نہ تھی کہ یہ پل پر سے گذر سکیں جب تک کہ ان میں سے کوئی ایک پیچھے کی طرف نہ لوٹ جائے۔ دونوں بھی موٹر کار والوں نے خوب خوب ہارن بجائے اور ایک دوسرے پر یہ ظاہر کرنا چاہا کہ وہ راستہ چھوڑ کر پلٹ جائے تاکہ دوسرے کو پل پار کرنے کا موقعہ مل جائے۔ آپس میں کچھ چپقلش بھی ہوئی ایک دوسرے پر غصہ کا اظہار بھی کیا گیا حتیٰ کہ ایک صاحب نے بہت زیادہ برہم ہوکر کہا" دیکھئے میں تو کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کے لیئے اپنی کار

پلٹانے والا نہیں" چونکہ یہ چشمک بہت دیر سے چل رہی تھی لوگ بھی خاصی تعداد میں جمع ہو چکے تھے راستہ رکا پڑا تھا دوسرے صاحب نے اپنے ہوش و حواس سنبھال کر بڑی خاطر جمعی سے دوسرے صاحب کے اس بیان پر کہ وہ کس فالتو آدمی کے لیئے اپنی کار نہیں واپس لیتے۔ یہ کہا "جی ہیں ایسے لوگوں کے لیئے تو یہی کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ گاڑی پلٹا لوں" اور اس طنز کے بعد ریورس کر لیا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی اور اپنی زبان کو خراب نہ کرتے ہوئے بھی انھوں نے سب کچھ کہا اور موقعہ کی نزاکت سے فائدہ اٹھایا۔

ندامت اور پشیمانی کے مواقع سے ہر شخص کو کبھی نہ کبھی سامنا کرنا ہی پڑتا ہے چاہیے وہ کسی ایسی حرکت کی وجہ سے ہو کہ جو دانستہ یا نادانستہ سرزد ہوئی ہو یا زبان سے ان جانے میں ایسی بات نکل گئی ہو کہ جو کہنا مقصود ہو اور نہ اس کا مطلب ایسا ہو کہ جس سے کسی کے دل کو ٹھیس لگے یا احساسات بُری طرح متاثر ہوں۔ کمال تو یہی ہے کہ ایسے مواقع پر حاضر دماغی سے کام لیا جائے تو بات بگڑتے بگڑتے بھی بنتی جاتی ہے مگر کبھی کبھی شئے لطیف کی کمی کی وجہ سے بات اور نیت الٹ جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست اس قسم کی پیچ در پیچ باتیں کرنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں اور اس خصوص میں ان کی شہرت ہمہ گیر ہے۔ ان کے کسی دوست کی والدہ کا انتقال ہوا تو یہ تجہیز و تکفین کے موقعہ پر حاضر نہ رہ سکے لیکن دوستی کا حق ادا کرنے کے لیئے انھوں نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا کہ تم چلے جاؤ میری طرف سے معافی بھی چاہ لینا اور تعزیت کا پیغام بھی پہونچا دینا۔

بات گئی گذری ہو گئی۔ کئی دن بعد اتفاقاً ان کی ملاقات اسی دوست سے ہوئی کہ جس کی ماں کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے فوراً مخلصانہ انداز میں معذرت چاہی۔ رنج و غم کا اظہار کیا اور پرسہ دیا۔ ان کے دوست کچھ جلے بھنے تھے ان سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ ان کے بھائی صاحب کچھ اوُل جلول سے ہیں موقع محل سمجھتے نہیں جس دن تجہیز و تکفین ہو رہی تھی انھوں نے غم و اندوہ کی محفل میں بجائے تسلی دلاسا یا اظہار افسوس کے سارا وقت فلموں کی، ان کے مشہور گانوں اور آرٹسٹوں کی باتیں کرتے رہے جس کا سب نے بُرا مانا۔ اس معیوب حرکت کی انھوں نے شکایت کی تو ہمارے اس دوست نے اپنے بھائی کی اس نازیبا حرکت کی مذمت کی اور اس کو بُرا بھلا کہتے ہوئے نامعقول قرار دیا اور کہا کہ آپ بے فکر رہیئے، آئندہ ایسا کوئی سانحہ ہوگا تو اس بے وقوف کو نہیں بھیجوں گا بلکہ میں خود ہی آؤں گا۔

دیکھئے اظہار تاسف کرتے ہوئے کس بُری طرح انھوں نے اپنے دوست کے تاثرات کو دھکا دیا۔

صورت واقعہ کبھی کچھ ایسی ہوتی ہے کہ ہم سمجھتے کچھ ہیں اور اسی لحاظ سے کوئی ریمارک پاس کرتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلتا ہے کہ بات کچھ اور ہی ہے اور جب اپنی پشیمانی کا اظہار کرتے ہیں۔ مزید الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک محفل میں بھانت بھانت کے لوگ جمع تھے جو ایک دوسرے کے لیئے نئے بھی تھے اور نئے نئے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس۔ ہم نے یوں ہی وقت گذاری اور بوریت دور کرنے کے لیئے ایک نوجوان کی طرف دیکھ کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔

"آج کل کے فیشن تو دیکھئے یہ سامنے والے نوجوان کے متعلق کہا نہیں جا سکتا کہ یہ لڑکا ہے یا لڑکی۔

ساتھی نے کچھ اظہار ناراضگی کے ساتھ کہا "وہ۔ وہ ۔ وہ تو میری لڑکی ہے"
ہم کو کچھ شرمندگی سی ہوئی کہ ایسا ریمارک ہم نے کیوں پاس کیا۔ کھسیانے پن سے بطور معذرت کہا
" ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ اس کے والد محترم ہیں ۔ گفتگو کی معراج ملاحظہ فرمائیے کہ انھوں نے جواباً کہا
جی ہیں اس کا باپ نہیں بلکہ اس کی ماں ہوں ۔
اس کے بعد تو ہم پر سکتہ چھا گیا۔ لڑکی کو لڑکا سمجھا اور پھر اس کی ماں کو اس کا باپ قرار دیا۔ روزمرہ کی زندگی کے یہ کچھ ایسے حقائق ہیں کہ جن سے قطعی کوئی مفر نہیں۔ ہم جتنا ان الجھنوں سے راہِ فرار اختیار کرنا چاہیں؛ اتنا ہی ان کی باریکیوں میں پھنستے جاتے ہیں۔ بنا سوچے سمجھے کوئی بات کرتے ہیں اور وہ غلط ہو جاتی ہے تو اس کو نباہنے کے لیئے بہت زیادہ باتیں بنانی پڑتی ہیں۔ اب تو یہ محاورہ صادق آتا ہے کہ ایک سچ کو نباہنے کے لیئے بہت سارے جھوٹ گھڑنے پڑتے ہیں۔

رشید الدین (حیدرآباد دکن)

جی ہاں - ہمارا بھی ایک گھر ہے - اگر آپ اسے گھر کہہ سکیں اور کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے کیونکہ ہندوستان کے بیشتر گھر ایسے ہی ہوتے ہیں - اور ان ہی گھروں کے حصول کے لیے یہاں کے لوگ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں جس میں مرد کی ایڑی گھس جاتی ہے بلکہ بعض صورتوں میں پاؤں سے الگ بھی ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں عورت کی چوٹی ہاتھ آتی ہے اور جب کئی بچے پیدا کرنے اور مسلسل گھر کا کام کاج کرتے رہنے سے عورت کی یہ چوٹی بھی چلی جاتی ہے تو وہ بازار سے ایک وگ لا کر اس کمی کو پورا کر دیتی ہے اور اس طرح ہندوستانی سماج کی گاڑی چلتی رہتی ہے - یہ گاڑی اس طرح کب تک چلتی رہے گی اس کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ عقلمند ہندوستانی یہ کہتے ہیں کہ ان کی جیون کی گاڑی اس طرح بھی چلتی رہے تو بہت غنیمت ہے کیونکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستانی سماج اس سے بھی بدتر حالت سے دوچار ہو جائے اس لیے تھوڑے ہی کو بہت جاننے میں عافیت ہے -

تو میں آپ کو اپنے گھر کا حال سنانے والا تھا وہی گھر جس میں گزشتہ ۲۰ سال سے مقیم ہوں - یہ گھر بھی بیشتر ہندوستانیوں کی طرح کرائے کا ہے جس کی بہتری کی آج تک کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی لیکن کرائے میں پانچ گنا اضافہ ہو چکا ہے - اگر آج بھی میں اسے خالی کر دوں تو کوئی سے دس گنا کرایہ پر بھی حاصل کر سکتا ہے - اس لیے میں اسے خالی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا

آپ نے دن میں تارے نظر آنے کا محاورہ تو سنا ہوگا - ظاہر ہے یہ ایک مجازی محاورہ ہے جس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہو سکتا - لیکن میرے مکان میں آپ لیٹے لیٹے واقعی دن کو بھی تارے دیکھ سکتے ہیں کیونکہ اس کے کویلو جگہ جگہ سے ہٹ گئے ہیں - جب بارش کا موسم شروع ہوتا ہے تو تارے نظر آنا بند ہو جاتے ہیں اور ان سوراخوں کے ذریعہ بے دریغ پانی مکان میں چلا آتا ہے - ایک بار بیوی کے شدید اصرار پر جب میں نے مالک مکان کو لا کر اپنے اس گھر کا

ال زار دکھایا تو وہ کمال سنجیدگی سے بولے "آپ ایک کام کیجئے" ہم یہ سن کر ہمہ تن گوش ہوگئے کہ پتہ نہیں یہ کیا کام کی بات
انے والے ہیں۔ اس پر انہوں نے ذرا رک کر اور پان کا پیک نگلتے ہوئے کہا کہ "آپ بطیں پال لیجئے۔ گرانی کے زمانے میں
ھ زائد آمدنی ہو جائے گی۔" میں نے ان سے کہا کہ دیکھئے میں اس وقت مذاق کے موڈ میں قطعی نہیں ہوں۔ میری جان پر بن
ی ہے اور آپ کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس پر انہوں نے واقعی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا کہ "دیکھئے صاحب میں نے
ے کو یہ مکان جیسا ہے جیسا کی بنیاد پر دیا ہے۔ آپ کو پسند ہے تو رہیے ورنہ خدا حافظ۔ آپ کو بھی دس مکانات ہیں اور
ے بھی دس کرایہ دار ہیں۔ ان کے آخری جملے کا صرف دوسرا حصہ صحیح تھا کہ انہیں دس کرایہ دار ہیں پہلا حصہ بالکل غلط
اکہ مجھے دس مکانات ہیں کیونکہ مجھے دس تو کیا ایک مکان بھی نہیں مل سکتا تھا۔ بلکہ اب سنجیدگی بلکہ خاموشی اختیار کرنے کی
ری باری تھی۔ وہ دن اور آج کا دن۔ پھر میں نے مکان کے تعلق سے مالک مکان سے کوئی شکایت نہیں کی۔

حیدرآباد فرخندہ بنیاد کے بارے میں سنتا ہے کہ اس کے بانی محمد قلی قطب شاہ نے یہ دعا کی تھی کہ خدا اس
ہر کو انسانوں سے اس طرح آباد کر دے جس طرح دریا میں مچھلیاں ہوتی ہیں۔ شاید وہ عین قبولِ دعا کا وقت تھا کیونکہ آج قلی
شہر انسانوں سے اس قدر لبالب بھر گیا ہے کہ جدھر نظر اٹھائیے انسان نظر آتے ہیں اور نظر جھکانے کا تو سوال ہی پیدا
یں ہوتا کیونکہ ادھر آپ نے نظر جھکائی اور ادھر ٹریفک اکسیڈنٹ سے آپ راہی ملک عدم ہوئے۔ اس شہر کے بارے
ں پہلے زمانے کے لوگوں سے جو کچھ سنتے ہیں اس پر افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ پیدا ہونے میں دیر کر دی۔ اگر ہم پچاس
اٹھ سال قبل پیدا ہو جاتے تو ہمارے نام بھی آرائش بلدہ سے ایک خط آجاتا کہ آپ کے نام محلہ ۔۔۔ میں ایک عدد مکان
لس آرائش بلدہ الاٹ کرتی ہے۔ اس کا قبضہ آپ کو لینا ہوگا ورنہ مکان میں اندھیرا رہے گا۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری آپ پر ہوگی۔
ں کے بعد بھی سنتا ہے کہ لوگ ان مکانوں کا قبضہ نہیں لیتے تھے کہ سرکاری مکانوں رہنا اس زمانے میں کسر شان سمجھا جاتا تھا۔
۔ اس محلہ کا یہ عالم ہے کہ آپ اگر وہاں کرایہ پر مکان لینے جائیں تو لوگ آپ کو اوپر نیچے دیکھتے ہیں۔ آپ کے حسب و نسب کی
دریافت ہوتی ہے اور آپ سے کہا جاتا ہے کہ انکم ٹیکس کی ادائی کا سرٹیفکیٹ آپ کے پاس ہے۔ یہ سب تو صرف کرایہ پر لینے
ے لیے ہوتا ہے۔ اگر خدانخواستہ آپ اس محلے میں مکان خریدنا چاہتے ہیں تو پھر بنک کی پاس بک ساتھ لانی ہوتی ہے کہ
یکھیں آپ کی بنک میں کتنی رقم جمع ہے۔ پہلے زمانے کے لوگ کم سنی میں پیسے رکھتے تھے۔ لیکن آج کے لوگ بنکوں میں رکھتے
ں۔ اسلیے مکان خریدتے وقت کم سنی کے آنے کا محاورہ اب پامال ہو چکا ہے بلکہ اسے یوں ہونا چاہیے کہ پاس بک جیب میں لائیے۔

تو ذکر ہمارے مکان کا چل رہا تھا جس میں ہم پچھلے ۲۰ سال سے بفضل تعالیٰ فروکش ہیں لیکن آپ یہ مت سمجھیے کہ یہ ۲۰
ال سے ہم نے اگر ... بلکہ ہر وقت ہمیں احساس دلایا گیا کہ جناب یہ بھی کوئی مکان ہے جس میں آپ رہتے ہیں۔ دفتر والوں
ے رحم کھا کر ہمیں ۲۵ ہزار روپیہ قرض بھی دیئے کہ ہم کوئی اچھا سا مکان خرید لیں۔ لیکن آج کل صاحب مکانوں کی قیمتیں اتنی
بڑھ چکی ہیں کہ اتنی رقم میں اچھا تو کیا برا بھی مکان نہیں آتا۔ اسلیے ہم نے بھی اس رقم کو بنک میں جمع کر کے خاموشی اختیار کی کہ ذاتی مکان
ا زکم ۔۔ کرایہ کے مکان سے تو اچھا ہو۔ ہماری بیوی کا خیال ہے کہ ہم آج کل جو اتراتے پھر رہے ہیں اس کی وجہ بھی ۲۵ ہزار روپئے
ں۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ ہم کو ان ۲۵ ہزار روپیوں میں کبھی کوئی فخر نہیں ہوا بلکہ ہر مہینہ ایک خطیر رقم جب تنخواہ سے کٹ جاتی

ہے تو ہمارے دل سے یہ آہ نکلتی ہے کہ کاش ہمیں مکان کا قرضہ نہ ملا ہوتا۔

مکان کا ذکر بہت ہو چکا اب کچھ مکینوں کا بھی ہو جائے۔ کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ مکان کی رونق مکینوں سے ہے، غالب نے کہا تھا۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق

ہمارے گھر کی رونق بھی ایک بیوی، پانچ بچوں، تین مرغیوں، دو کبوتروں، اور ایک بلی پر مشتمل ہے۔ چوہے اس لیے نہیں ہیں کہ بلی موجود ہے اور کتا اس لیے نہیں پالا کہ وہ بلی کا دشمن ہوتا ہے۔ رہا طوطا تو ایک بار پالا تھا جو ایک دن پنجرہ کا دروازہ کھلا دیکھ کر اڑ گیا۔ ہماری بیوی کا آج تک ہم پر یہ الزام ہے کہ محض ہم نے پنجرہ کا دروازہ کھول کر طوطے کو اڑا دیا۔ حالانکہ جس وقت طوطا اڑا اس وقت ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ رہے تھے یعنی ہم اپنی میز پر بیٹھے بڑے ہی ادق موضوع پر ایک مضمون لکھ رہے تھے۔

ہمارے گھر میں ہر بات کی تان ہماری ذات پر آکر ٹوٹتی ہے۔ مثلاً پرسوں بلی نے کبوتر کو زخمی کر دیا اور یہ سب ہماری میز کے قریب ہوا۔ لیکن ہم لکھنے میں اتنے محو تھے کہ نہ بلی کی شہ زوری کا احساس ہوا اور نہ کبوتر کی بے چارگی کا۔ البتہ ہمیں ہوش اس وقت آیا جبکہ نہ صرف ہمارا سارا گھر بلکہ پاس پڑوس کی عورتیں اور بچے بھی ہماری میز کے قریب جمع ہو گئے اور کبوتر کو پانی پلایا جانے لگا۔ اور ہماری مضمون نگاری کو صلواتیں سنائی جانے لگیں۔ کچھ دن قبل کوئی مرغی چور ہماری مرغی چرا لے گیا۔ باتیں ہم کو سننی پڑیں کہ آپ تو اپنے کمرہ سے باہر نکلتے ہی نہیں۔ نہ بچوں کی فکر ہے نہ جانوروں کی۔ بھلا اکیلی عورت کیا کیا دیکھے گی۔ ایک دن کچھ لوگ آکر دیوار پر بیٹھی ہوئی بلی کو پھندا ڈال کر پکڑ لے گئے۔ گو اس معاملہ میں ہم راست ملوث نہیں تھے۔ کیونکہ جس وقت یہ حادثات پیش آئے ہم دفتر میں تھے۔ لیکن گھر کی مغموم فضا دیکھ کر ہمیں ایک دوست کے گھر جا کر ایک بلی کا بچہ لانا پڑا جو اب بفضل تعالیٰ ایک بڑی بلی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم پر یہ الزام ہے کہ ہم گھریلو معاملوں میں دلچسپی نہیں لیتے۔

ویسے یہ بات صحیح ہے کہ جس طرح اور لوگ گھریلو معاملوں میں دلچسپی لیتے ہیں ہم نہیں لیتے اور نہ لینا چاہتے ہیں۔ اکثر لوگوں کو ہم نے دیکھا کہ دفتر یا کام سے واپس آنے کے بعد گھر کو غور سے دیکھتے ہیں۔ دیواروں کو ٹھوک ٹھوک کر اطمینان کر لیتے ہیں کہ کہیں پلاسٹر کمزور تو نہیں ہو رہا ہے۔ تمام بچوں کو بلا کر گن لیتے ہیں۔ بچوں کو ایک دوسرے کے بازو کھڑے کر کے ان کے قد ناپتے ہیں اور بیوی سے محلے بھر کی روئیداد پوچھتے ہیں۔ اگر یہ سب گھریلو معاملات کی تعریف میں آتا ہے تو ایسے گھر اور اسکے معاملات کو ہمارا دور ہی سے سلام۔

ٹی وی اور بیوی کا فرق ایک دانشور نے یہ بتایا ہے کہ ٹی وی کو جب چاہے بند کیا جا سکتا ہے لیکن بیوی کو نہیں۔ پھر ٹی وی کوئی فرمائش نہیں کرتی جبکہ بیوی کے بارے میں یہ گیارنٹی نہیں دی جا سکتی۔ ہماری بیوی بھی کچھ عام بیویوں سے مختلف ہے اس لیے ہم رات دن کمانے میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ کہیں شریک حیات کو شکایت نہ لگ جائے۔ یہ تو ہوئی بیوی کی بات لیکن بچوں کا معاملہ بھی اس سے جدا نہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی مسئلہ کسی نہ کسی بچے کا رہتا ہی ہے۔ کوئی کتابیں گنوا کر آتا ہے تو کوئی کھیل کے میدان پر جوتا چھوڑ دیتا ہے اور تو اور پچھلے مہینے ہمارے بڑے صاحبزادے قاضی پیٹھ کے عرس کو گئے تو اپنے پیر کا انگوٹھا وہیں چھوڑ آئے۔ بس کے فٹ بورڈ پر کھڑے ہو کر سفر کے دوران ان کے انگوٹھے کا اگلا حصہ باقی جسم سے الگ ہو گیا۔ ہماری بیوی کا خیال ہے کہ ان تمام چیزوں کی ذمہ داری ہمارے سر ہے جبکہ یہ بات آج تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ بے چارہ مرد کسی طرح دن بھر باہر رہ کر گھر کی ہر بات کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ ٥٥

معین اعجاز

قصّہ ایک فری اسٹائل سمینار کا

پھر یوں ہوا کہ راجدھانی میں ایک روح پرور اور مہتم بالشان قسم کا سمینار منعقد ہوا جس کا موضوع تھا "ادیبوں کی پانچ نسلوں کی فہرست سازی" اس سمینار کی تاریخی حیثیت یہ تھی کہ ملک کی جغرافیائی اور ریاستی حد بندیوں کو توڑتے ہوئے ہر صوبے اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں سے نقّاد اور دانشور منگوائے گئے۔ قریبی اضلاع اور ریاستوں سے تو کچھ لوگوں کو سڑک پر لاد کر لایا گیا لیکن جن کا تعلق دور افتادہ علاقوں سے تھا ان کے لیئے ٹرین میں اسپیشل بوگیاں لگائی گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر نقادوں اور دانشوروں سے بھر گیا۔

لے گریڈ کے نقّاد صاف ستھرے ہوٹلوں میں ٹھہرائے گئے لیکن جو کمتر درجے کے تھے ان کے لیئے کیمپ لگائے گئے۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے عزیزوں اور دوستوں کے یہاں پناہ گزیں ہوئے۔

اس سمینار کے طفیل ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا ہم اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ہماری زبان میں شاعروں کی آبادی زیادہ ہے لیکن اب ہمیں پتہ چلا کہ نقادوں کی تعداد تشویشناک حد تک بڑھ چکی ہے اور اگر اسکی روک تھام نہ کی گئی تو تخلیق کاروں کی نسل شدید قسم کے بحران سے دو چار ہو جائے گی۔

پہلے شاعری کے دو اسکول ہوا کرتے تھے لکھنؤ اور دلّی لیکن اب تنقید کے بے شمار اسکول قائم ہو چکے ہیں۔ ان اسکولوں کا الحاق مختلف یونیورسٹیوں سے ہے جن میں بعض یونیورسٹیاں غیر تسلیم شدہ بھی ہیں۔

بہر حال اس فری اسٹائل سمینار کا افتتاح ایک مرکزی وزیر با تدبیر کی تقریر سے ہوا۔ اردو کی شیرینی اور جنگِ آزادی میں اس کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے ان کی آواز رُندھ گئی۔ یہ دیکھ کر ہال میں بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ کچھ لوگ تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور جب وزیر صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو غم رسیدہ سامعین اپنے آنسو پونچھ کر تالیاں بجانے میں مصروف ہو گئے۔ جب تالیوں کا دور ختم ہوا تو سمینار کی مجلسِ صدارت کے اراکین کے ناموں کا اعلان ہوا۔ یہ اراکین پانچ مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے تھے بلکہ اپنی اپنی نسل کی نمائندگی کر رہے تھے۔

سب سے پہلے جس نقّاد کو پرچہ پڑھنے کے لیئے بلوایا گیا وہ بہت دور سے آئے تھے اور اپنے ساتھ احتیاطاً ادیبوں کی ایک فوج بھی لائے تھے تاکہ پردیس میں اگر اچانک کسی ادبی گروہ کی طرف سے حملہ ہو جائے تو انھیں بچایا جا سکے۔ پرچہ پڑھنے سے پہلے انھوں نے سامعین سے مخاطب ہو کر کہا "حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ وقت بالکل نہیں تھا جلدی جلدی میں یہ مقالہ تیار کیا ہے۔ میں اس کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کروں گا۔" سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ جلدی جلدی میں تیار کیا

ہوا یہ پرچہ فل اسکیپ سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔ اس کا خلاصہ بیان کرنے میں نقاد صاحب نے تین گھنٹے لیئے۔ اس دوران سامعین اپنے دوسرے کاموں سے بھی فارغ ہو چکے تھے مثلاً کچھ لوگ اپنے آفس کی پالیسی اور ٹینشن پر گفتگو کر کے تھک گئے تھے۔ کچھ لوگ بازار سے ضروری سامان خرید کر اپنے گھر دے آئے تھے۔ بعض خواتین اپنی بیٹی کے رشتے اور مالکِ مکان کی زیادتیوں کا ذکر کر کے خاموش ہو چکی تھیں۔ کچھ باذوق حضرات کسی دوسری تقریب میں شرکت کر کے واپس آ گئے تھے۔ جو لوگ ہال سے کہیں نہیں گئے تھے۔ ان کی نیندیں پوری ہو چکی تھیں اور جو لوگ جاگ رہے تھے ان میں سے بیشتر ایسے ادیب تھے جو پرچہ میں بین السطور اپنا نام تلاش کر رہے تھے۔ اس اکلوتے پرچے کے ساتھ ہی ساتھ سمینار کا پہلا اجلاس بھی ختم ہونے والا تھا۔ لہٰذا فیصلہ یہی ہوا کہ اس مقالہ پر لگے ہاتھوں بحث بھی ختم کر لی جائے۔

اب سمینار کا اسٹیج اچھا خاصا اکھاڑہ بن گیا تھا۔ حملوں اور جوابی حملوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سامعین کے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے لیکن یہ دلچسپ منظر چھوڑ کر کوئی نہیں جانا چاہتا تھا۔ ایک ادیب نے کھڑے ہو کر نقاد کو چیلنج کرتے ہوئے کہا کہ "آپ نے عصری ادب کا مطالعہ کئے بغیر ہی پرچہ لکھ گیا ہے۔ لہٰذا آپ کا نقاد ہونا مشکوک ہے۔ تخلیق کاروں کی جو فہرست آپ نے پیش کی ہے وہ نامکمل اور ناقص ہے۔ اس سے عصبیت کی بو آتی ہے کیمپ کے لوگ گھس آئے ہیں۔ یہ لوگ سازش کر کے ہماری کوششوں کو ناکام بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن ہم دشمنوں کی چال سے واقف ہو چکے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیئے تیار ہیں۔ مرنے اور مارنے کی ہمت جس میں ہو وہ آ جائے میدان میں۔ یہیں فیصلہ ہو جائے گا۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہے؟ دراصل اس قسم کی شرارتوں کے پیچھے کسی غیر ملکی ایجنسی کا ہاتھ ہے اور یہ لوگ کسی سامراجی طاقت کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ دوسرا گروپ بھی بھڑ اٹھا۔ ایک شخص نے اسٹیج پر آکر کہا کہ دراصل تم لوگ غیر ملکیوں کے ایجنٹ ہو اور ہندوستان کو تباہ کرنا چاہتے ہو۔ تم لوگوں کو جلسے اور سمینار کرنے کے لیئے باہر سے پیسے ملتے ہیں تاکہ ملک میں خلفشار اور توڑ پھوڑ کروا سکو ہم اسے بالکل نہیں برداشت کر سکتے۔ ہم ایسے ملک دشمن اور فتنہ پرور گروہ کو بے نقاب کر کے رہیں گے۔ تم تیار ہو تو ہم بھی تیار ہیں۔ ہم بھی پیچھے ہٹنے والوں میں نہیں ہیں۔ ہاں ہم نے بھی اپنی ماں کا دودھ پیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

شور اور ہنگامے میں اس شخص کی آواز دب گئی اور اب اسٹیج پر باقاعدہ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ ایک نقاد سی۔ آئی۔ آئے اور کے جی بی کا ذکر بار بار آ رہا تھا۔ ایک نقاد کی قمیض تار تار ہو گئی۔ اس پر کسی ستم ظریف نے میر کا یہ شعر پڑھا۔

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

ایک صاحب اسٹیج سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کا کالر پکڑ کر ایک صاحب نے زور دار گھونسہ رسید کیا۔ وہ بیچارے زمین پر گر پڑے۔ ہال کے دروازے بند تھے۔ صرف ایک دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لوگ جان بچا کر اسی راستے سے بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ لوگ ایک دوسرے پر کرسیاں پھینک رہے تھے۔ کوئی دیوار سے ٹکرا رہا تھا ایک جوشیلے نوجوان نے مائک اٹھا کر سامنے پھینکا۔ اتفاق سے میرا سر اس کی زد میں آ گیا میرے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی اور میری آنکھ کھل گئی۔ کچھ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ دراصل لنچ کے بعد ہم سمینار کے دوسرے اجلاس میں بیٹھے ہوئے ایک پرچہ سن رہے تھے۔ اسی دوران نیند آ گئی تھی۔ آنکھ کھلی تو ابھی وہی پرچہ پڑھا جا رہا تھا۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے ایک دوست نے پوچھا "کیا ہوا۔ تم اس طرح چیخ کیوں رہے تھے؟" میں نے جواب دیا ـــــ

" خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا
جو سنا افسانہ تھا"

■■

لئیق صلاح

نازِ والے نیاز ......!

ناز اور نیاز تو دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ ناز کس کس کے اُٹھائیں۔ عاشق بے چارے کو صرف محبوب کے ناز اُٹھانے تھے تو وہ حال کا بے حال ہوگیا۔ ہمیشہ تیوری پر نظر رکھنی پڑتی تھی۔ ؎

تیوری چڑھی ہوئی ہے اندر نقاب کے

نا جانے اس کے لئے اُسے کتنے نہ پاپڑ بیلنے پڑے۔ کبھی اُس نے محبوب کی اداؤں کے فرق کو سمجھنے میں پوری زندگی گزار دی تاکہ

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

عہد و پیماں بھی محبوب نے کئے اور توڑ دیئے تو اُس سے کوئی باز پُرس نہیں ہوئی۔ اس لئے کہ وہ اس قدر حسین و نازک ہے کہ عہد کا بوجھ بھی سنبھالا نہیں جاتا۔ بقول غالب ؏

تیری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد کا بودا

اُس ایک شخص کے ناز اُسے کو کس کس طرح سے اُٹھانے پڑے۔ اب ہماری ہستی پر غور کیجئے جس کو پتہ نہیں کن کن کے ناز اٹھانے ہیں ——— سب سے پہلے کتب خانے کا حال سُنیے۔ جن سے آئے دن سابقہ رہتا ہے۔ عام قارئین کو شاید کچھ شکایت نہ رہتی ہوگی۔ اس لئے کہ کتب خانوں میں ایسے قارئین کی بھی اکثریت ہوا کرتی ہے۔ جو پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ خواب شیریں کے مزے لوٹنے کے لئے آتے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر دوسروں کو بھی رشک سا آنے لگتا ہے کہ کاش! یہ نیند ہمیں بھی میسر آتی۔ یہاں تو "بخت خفتہ" سے ایک خواب خوش گوار کی آرزو ہی رہ گئی اور ان خوش نصیبوں کے پاس تو اتنا کہ ان اس قدر خواب ہیں کہ وہ بطورِ قرضِ حسنہ "بخت خفتہ" کو کچھ خواب دے سکتے ہیں۔

(۱) ایک سرکاری کتب خانہ ہے، جس کا وجود جب سے مطبوعات کے کتب خانے سے علیٰحدہ ہوا، نئی نئی مشکلات کا شکار ہوگیا۔ پہلے دونوں شعبے یکجا تھے تو پڑھنے والوں کو اتنی دقتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا جو اب اس کی وحدانیت کے سبب ہے۔ کوئی ایرے غیرے تو قدم رنجہ فرما ہی نہیں سکتے سوائے ریسرچ اسکالرس کے۔ جاتے ہی آفس والوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ فوری ایک فارم پیش کرتے ہیں کہ اس کی خانہ پُری کی جائے۔ پہلے پہل ہم یہ سمجھے کہ خانہ پُری ہوتے ہی ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تب دوسری شرط یہ بتلائی کہ نگرانِ کار کا صداقت نامہ لائیں۔ ایک دو دن میں وہ لکر

حاضر ہوئے۔ سمجھے کہ اب کام بن گیا۔ اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں، تو صاحب موصوف نے فرمایا، نگران کار کے صداقت نامے کے ساتھ صدر شعبہ کا بھی صداقت نامہ ہونا ضروری ہے۔ چلئے یہی صحیح سوچ کر ہم نے وہ صداقت نامہ بھی حاصل کر لیا۔ جب یہ لے کر حاضر خدمت ہوئے تو انہوں نے فرمایا کہ فارم پر بھی تصدیق ہونی چاہیئے کہ یہ دستخط ہمارے ہی ہیں خیر گزری جو اللہ میاں کے پاس سے کوئی سرٹیفکٹ لانے کی شرط عائد نہ کی۔ اب تیسرے مرحلے سے گزر کر جب فارم داخل ہوا تو پتہ چلا کہ فارم تو لے لئے ہیں لیکن جب تک نام رجسٹرڈ نہ ہو، کتابیں دیکھنے کا شرف نہیں حاصل نہیں ہوگا اور جتنے مخطوطات ہیں اُن کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اس فہرست کے داخل ہونے کے بعد جب نامہ و پیام آئیں گے تب آنا۔

(۲) ایک نیم سرکاری کتب خانہ ہے۔ جہاں پہلے والے لائبریرین جو ابتدا ہی سے وظیفہ خوار تھے۔ مزید وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، لیکن جانشینی کے لئے موزوں شخصیت عدم دستیاب ہے۔ اس لئے " زلف کے سر ہونے تک " کے انتظار میں زندگی کے دن گذار رہے ہیں۔ دو ایک جانشین بڑی تگ و دو کے بعد ملے مگر کس قسم کے خدا اُن کا حال سُنیئے جو دلچسپی سے خالی نہیں ہے — نمبر ۱ تو معلوم ہوتا تھا کہ ملٹری سے ابھی ابھی وظیفہ حاصل کئے ہیں۔ اس لئے کہ وہ دم خم اب بھی باقی ہے۔ [illegible] میں آنے کے لئے کچھ عرصہ درکار ہے۔ نرمی اور آہستگی تو گویا اُن سے کوسوں دور۔ کتابیں مانگتے ہوئے ڈر لگا کرتا تھا۔ بالآخر انہیں بھی چلتا کیا۔ نمبر ۲ تو بس اُن کے برعکس۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ دشمن کی جیل سے ابھی رہا ہوئے ہیں۔ صورت پر یتیمی کے آثار۔ سوچا کہ ان سے کام تو اچھا نکل جائے گا۔ ڈر خوف ہم کو اُن سے نہیں بلکہ اُن کو ہم سے رہے گا۔ مگر وہ تو بس ...... کے بخار در نکلے۔ جس کتاب کے ہم طلب گار ہوتے وہ انھیں ملتی ہی نہیں۔ زیادہ اصرار کیا جاتا تو صورت اور رونی بنا لیتے کہ کیا کروں وہ نظر ہی نہیں آتی۔ چار و ناچار ہم اپنا ارادہ بدل لیتے تاکہ وہ " بتیرِ طوفان " کی منزل پر نہ پہنچ جائیں۔ اتفاقاً کبھی کتاب مل جاتی اور ہم دیر تک بیٹھ کر کام کرنے کا عزم کرتے تو وہ پھر مزاحم ہوتے بار بار گھڑی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرتے۔ جتنا اصرار اُن کی طرف سے ہوتا جاتا، ہمارا جی یہ چاہتا کہ اور بھی بے اعتنائی سے اپنے کام میں جُٹے رہیں۔ ہماری اس بے حسی کی تاب نہ لاکر وہ کچھ بے چین سے ہو جاتے بالآخر ہمیں ہار ماننی پڑتی اور وہ بہ حیثیت فاتح خوشی خوشی گھر روانہ ہوتے۔ ایک دفعہ تو بڑا لطف آیا۔ کتب خانے میں قدم رکھتے ہی اُن کے کمی کرم فرمانے صاحب موصوف کی مزاج پرسی کی۔ کچھ زود رنجی، اُس کے عواقب اور نتائج سے متاثر نظر آ رہے تھے۔ ہم نے عافیت اسی میں کبھی کہ تجاہل عارفانہ برتیں۔ چنانچہ حسب عادت اپنی فرمائشات کی بھرمار کردی۔ وقت جوں جوں قریب آتا جا رہا تھا وہ جانِ ناتوان " ہماری " جان کھانے " میں کوئی کسر باقی نہیں رکھ رہی تھی اور ہم بے حسی کا انداز اپنائے ہوئے اُن سے یہی کہتے کہ ابھی وقت نہیں ہوا۔ آپ ہمیشہ اسی طرح عجلت کرتے ہیں تو ہماری ہٹ دھرمیوں سے مجبور ہوکر، نہایت نحیف آواز میں گویا ہوئے۔ آپ نے سُنا نہیں کل میرا کس قدر بُرا حال تھا۔ آج بڑی مشکل سے آیا ہوں۔ بے اختیار ہنسی آئی اور پھر اُن کی نازکی کا لحاظ کرتے ہوئے اُٹھتے ہی بنی۔

(۳) ایک اور کتب خانے میں کارکنان سرکاری دفاتر کے اوقات پر عمل پیرا ہیں۔ وہاں جس وقت ہم پہنچتے ہیں آفیسرز کا لنچ شروع ہو جاتا ہے۔ (ساڑھے دس بجے)۔ ماتحتین کہتے ہیں کہ صاحب لنچ پر ہیں۔ لہٰذا مطلوبہ کتابیں بعد میں دی جائیں گی۔ صاحب کے لنچ ختم کرنے کا انتظار ہی رہتا ہے کہ ماتحتین کا لنچ شروع ہو جاتا۔ اور یہ لنچ کھانے کر

دوسرے دن سے پہلے ختم نہیں ہوتا۔ سارا وقت وہاں گزارنے کے بعد یہ طمانیت دی جاتی ہے کہ اب دفتر کا وقت ختم ہوگیا ہے۔ مناسب یہ ہے کہ کل تشریف لائیں۔ اور آنے والا کل پھر دوسرے دن کی خوش خبری سناتا۔ بہرحال! عمر

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے

اتفاقاً روز کی صحرا نوردی سے کسی دن موقع مل ہی جاتا ہے تو متعلقہ صاحب اپنے آپ کو اتنا مصروف ظاہر کرتے ہیں ہماری کتابوں کی تلاش ناممکن۔ اگر کچھ ترش روئی سے کام لیں تو پتہ ہاتھ کو آجاتا —— بس یہی ایک کارگر نسخہ ہے کہ ناز اُٹھاتے جائیں۔

شگوفے

مرسلہ: شمع زیدی

معروف اُردو شاعر جناب بیکلؔ اُتساہی بستی کے ایک مشاعرہ میں اپنی مشہور نظم "میری شہناز تخیل، مری ناہید غزل" بہت لہک کر پڑھ رہے تھے۔ اسٹیج پر نوجوان شاعر طارق منظورؔ اور اشوک کمار پانڈے بھی بیٹھے تھے طارق صاحب کو شرارت سوجھی اور اُنہوں نے ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر پانڈے جی کو تھما دیا۔ اُنہوں نے وہ کاغذ اناؤنسر کو دے دیا اناؤنسر نے فرمائش سمجھ کر اسے بیکلؔ صاحب کو دے دیا۔

بیکلؔ صاحب نے اسے پڑھا اور جھلّا کر بیٹھ گئے اور ان کی جھلاہٹ کا سبب لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکا۔ اس کاغذ پر لکھا تھا۔

اے شہنشاہ ترنم، یہ ترنم کیسا خوب لوگ آواز کے جھٹکے ہی سے ہل جائیں گے
یہ دُعا مانگ سلامت رہے تیری آواز رہ گئے شعر، وہ مانگے سے بھی مل جائیں گے

(بشکریہ "حصوم یگ" ہفتہ وار)

بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ جناب مقبول فدا حسین کی تصویروں کی نمائش تھی اور وہیں پہلی بار وہ اپنا کلام سنانے والے تھے۔ جناب علی عباس اُمید وہاں کچھ دیر سے پہنچے، حسینؔ صاحب کلام پیش کرچکے تھے۔ تصاویر دیکھتے ہوئے اُمید صاحب نے حسینؔ صاحب سے کہا۔ "حضرت تصویریں تو میری سمجھ میں بہت آتی ہیں۔ آپ کی شاعری سننا چاہتا تھا اس سے محروم رہا۔"

حسینؔ صاحب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے میری شاعری کیا، میں نے ادھر ہی کچھ لکھا ہے۔ آپ تو پہلے سے ہی شاعر ہیں۔"

اُمید صاحب نے فوراً وضاحت کی "جی ہاں! بندہ تو پیدائشی شاعر ہے۔ پھر بھی درمیانی لوگوں کو گُن لیا کرتا ہے۔"

اور آرٹ گیلری قہقہوں سے گونج اُٹھی۔

(بشکریہ "دی سنڈے" ہفتہ وار)

دوست زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی کی زندگی بنانے یا بگاڑنے میں دوست اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ دوست فائدہ مند بھی ہوتے ہیں اور نقصان رساں بھی۔ دوست ہم خیال بھی ہوتے ہیں اور مختلف الخیال بھی۔ خلوص و محبت کبھی دوستی کی بنیاد ہوتی ہے تو کبھی مجبوری۔ دوستی کی ایک قسم "کمرشیل فرینڈ شپ" بھی ہے جو تاجر اور گاہک کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ سب عرفِ عام میں دوست ہی کہلاتے ہیں۔ آئیے ... ! اپنے وسیع حلقۂ احباب میں سے چند مخصوص دوستوں کا تعارف آپ سے بھی کرا دوں۔

آپ سے ملئے ...... آپ ہیں مسٹر الف خاں۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ آپ کا تعلق ایسے خاندان سے ہے جو علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ یوں سمجھئے کہ پیدائشی عالم فاضل ہیں۔ ہر ایک کی خوشی و غم میں ہمیشہ شریک رہتے ہیں۔ ان کا حلیہ دیکھ کر ہی آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اپنے اہل و عیال کے سوا ساری دنیا کا درد ان کے جگر میں ہے۔ خدمت خلق کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہے بلکہ یوں کہئے کہ جسم میں خون کم جذبہ زیادہ ہے۔ شعلہ بیان مقرر ہیں اور ہر کم خون، شعلہ بیان ضرور ہوتا ہے۔ ہر وہ تنظیم، ادارہ یا بزم جس میں یہ شریک نہیں بے مقصد و بے حرکت ہوتی ہے۔ یہ میرا خیال نہیں بلکہ ان کا اپنا خیال ہے۔ مگر خیال رہے صرف رکن یا کارکن کی حیثیت سے آپ ان کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ خلافِ شان ہے بلکہ کوئی اہم عہدہ دے کر ہی آپ ان سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ ان کا وجود اور خدمات عوام کیلئے ایک ناگزیر حقیقت ہیں اس لئے ان کی سرگرمیوں سے عوام کو باخبر رکھنے کے لئے اخبارات سے کام لیجئے کیونکہ عوامی خدمت گار کیلئے شہرت و عزت نفسیاتی غذا ہوتی ہے۔ نام کے بغیر کام کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ہاں ! ایک اور بات بتلانا بھول گیا۔ کسی بھی معاملہ میں آپ خود انہیں مشورہ دینے یا ان کے مشورہ کو نظر انداز کرنے کی جسارت نہ کیجئے۔ اگر ان سے کچھ کام لینا ہے تو ہاں میں ہاں ملائیے بلکہ آنکھ بند کر کے تقلید کیجئے۔ بادلِ ناخواستہ ہی سہی ان کی بات ضرور مان لیجئے۔ اگر اختلاف کرینگے تو آپ کے کردار کا بھیانک قتل ہوتا رہے گا۔ اور آپ اس عاشقِ نامراد کی طرح زندہ رہیں گے جو اپنے معشوق پر بار بار مر کر بھی زندہ رہتا ہے۔ چلئے .... ہاتھ ملائیے —— اور اچھی طرح یاد رکھ لیجئے کہ اس تعارف کے بعد ان کی دوستی سے چھٹکارا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے —— !

آئیے —— : آپ سے ملئے — آپ ہیں مسٹر ہیم ہیدر —— قد اور جسامت سے ہی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کس پایہ کے دوست ہیں۔ ملک کے ممتاز سیاست دانوں میں اپنا شمار کرتے ہیں اور وہ ساری خوبیاں آپ میں موجود ہیں جو ایک خالص ہندوستانی سیاست داں میں ہونی چاہیئے۔ خدمت خلق کے خواہشمند ہیں۔ لیکن ساتھ ہی خدمت حلق بھی ضروری ہے۔ آپ کی قابلِ رشک صحت اس بات کی علامت ہے کہ لوگوں کے بہت زیادہ غم خوار ہیں۔ خصوصاً احباب کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہتے ہیں کہ اس کے گھر میں جملہ افراد خاندان کتنے ہیں۔ ان میں کمانے والے کتنے ہیں ؟ کمانے کے ذرائع کیا ہیں ؟ جملہ آمدنی کتنی ہے ؟ ماہانہ بجٹ کتنی ہے؟ جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کتنی ہے ؟ آیا یہ جائیداد ورثہ میں ملی ہے یا سسرال سے ؟ یا آپ نے خود خریدی ہے ؟ اگر خریدی ہے تو دولت کہاں سے آئی ؟ اس سے قبل آپ کی مالی حالت کیا تھی ؟ آپ کی ترقی کا راز کیا ہے ؟ غرض اپنے احباب کے بارے میں ہمیشہ فکرمند رہتے ہیں۔ لیکن اپنی مالی حالت اور پوشیدہ ذرائع آمدنی کا انکشاف نہیں کرتے۔ قابلِ تعریف صفت تو یہ ہے کہ کسی دوست کی ترقی پر اپنے رشک و حسد کا اظہار بلا جھجک کرتے ہیں اور کفِ افسوس ملتے ہیں کہ " ہم چھابو کے چھابو رہ گئے "۔ موصوف ایک شعلہ بیان مقرر بھی ہیں۔ ذخیرہ الفاظ کی کمی ہے لیکن اس کی تلافی وہ ذخیرۂ آواز سے کر لیتے ہیں۔ اگر محلہ کے کسی جلسہ میں آپ کو مدعو نہ کیا جائے تو احساس ناقدری کی وجہ سے بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ مزاج بگڑ جاتا ہے۔ لہٰذا ایک دوست کے ناطے آپ ان کا خیال رکھئے۔ اور اگر آپ کے کارناموں کا سہرا وہ اپنے سر باندھ لیتے ہیں تو بھی آپ سرِ تسلیم خم کیجئے۔ جس طرح سپاہیوں کی بہادری کا تمغہ کمانڈر کے سینہ پر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ افسروں کی جد و جہد کا سہرا انگوٹھا چھاپ سیاست دانوں کے سر باندھا جاتا ہے اسی طرح موصوف بھی اپنے رفقاء کی جد و جہد کے بعد کامیابی کا سہرا اپنے سر باندھ لیتے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک باضابطہ طور پر صرف ایک بار ہی دھوم دھام سے ان کے سر سہرا باندھا گیا تھا۔ خیر — آپ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا کچھ خیال نہ کیجئے۔ بلکہ اتنا کیجئے کہ ہر موقع پر ان کے نام سے اخبار میں بیان ضرور چھپوائیے۔ محلہ میں گندگی ہے، سڑکوں پر گڑھے پڑ گئے ہیں۔ حکومت نے ٹیکس میں اضافہ کر دیا ہے۔ شہر میں فساد ہو گیا ہے مارکیٹ لائٹ بند ہیں وغیرہ۔ غرض موقع کی مناسبت سے اخبار میں بیان ضرور شائع کروائیے۔ یہ ان کی بیماریوں کا بہترین علاج ہے۔

آپ سے ملئے —— مولوی نشتر دہلوی۔ نہایت خلیق آدمی ہیں۔ صرف مولوی ہی نہیں بلکہ مسٹر بھی ہیں یعنی دینی و دنیاوی دونوں قسم کی جامعات کے فارغ التحصیل ہیں۔ علم و عقل کے معاملہ میں نہ آپ کا کوئی ثانی ہے اور نہ پیدا ہوگا۔ آپ کے کئی شاگرد اس وقت آپ سے زیادہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ بیک وقت دو قسم کی باتیں کرنا اور کسی سے کام نکالنا کوئی آپ سے سیکھے۔ اس فن میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ ایک مولوی ہونے کے ناطے آپ کے لئے بارہ خون معاف ہیں۔ البتہ ساری امت کی اصلاح کے خواہشمند ہیں۔ لباس قلندرانہ ہے لیکن مزاج کسلمندرانہ پایا ہے۔ آپ کے خیال میں سارا جہاں مومن کا وطن ہے۔ اس لئے اپنی ولادت کو کسی خاص وطنِ مخصوص سے منسوب کرنے کے قائل نہیں۔ البتہ لوگوں کا خیال ہے کہ ولادت شمالی ہند اور تعلیم و تربیت شمال

مشرقی ہند کی ہے جبکہ زوجیت اور ملازمت جنوبی ہند میں پائی ہے۔ اس لحاظ سے موصوف بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہندوستان کی علاقہ واریت آپ کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہ بن سکی ۔

اچھا آپ بیٹھے بیٹھے ـــ مرہٹی نوسنس تر ہیں ۔ آپ کا تعلق بیجاپور سے ہے جو اردو کا مرکز رہا ہے اور کنڑی تو ریاستی زبان ہے ۔ لیکن آپ کی وزیر داخلہ کا تعلق مہاراشٹرا سے ہے اس طرح یہ لسانی فارمولے پر پوری طرح عمل پیرا ہیں ۔ علاوہ ازیں انگریزی اور پنجابی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں ۔ اس پیکرہ پرکر مزاح نگار ہیں ۔ لطائف کا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا ہیں اس لئے ہر محفل میں اپنا سکہ جما دیتے ہیں ۔ صرف ایک جگہ ایسی ہے جہاں ان کا سکہ نہیں چلتا اور وہ ہے دفتر وزارت داخلہ ۔ موصوف کو اپنے شوہر ہونے کا بہت زیادہ احساس ہے ۔ چنانچہ سورج ڈھلتے ہی آپ میں کرب و بے چینی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں اور چاہے کیسی ہی اہم گفتگو یا دلچسپ محفل ہو سب چھوڑ چھاڑ کر کوچۂ جاناں کی طرف دوڑتے ہیں ـــ صد کینے کی کوشش کی تو کہتے ہیں کہ " میں دوست کے ساتھ ساتھ شوہر بھی ہوں ۔" آج کل آپ پتی سے "لکھ پتی" بننے کی فکر میں ہیں ۔ اس لئے کرناٹک اسٹیٹ لاٹریز کی ہر سیریز کے ٹکٹ بلاناغہ خریدتے ہیں ۔ پھر بھی آج تک صرف پتی ہی ہیں ۔ خدا کرے یہ جلد از جلد پتی سے لکھ پتی " بن جائیں ۔

فکر تونسوی

خطبۂ صدارت

افتتاحی اجلاس جشن بھارت چند کھنہ

۱۰۔اپریل ۱۹۸۰ء

مزاح نگاروں کو عام طور پر شرفا میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس محفل میں موجود بھی مزاح نگار حضرات اس بات کی تصدیق کریں گے۔ تصدیق کرتے ہوئے ڈریں گے نہیں، یہ بڑے صاف گو لوگ ہوتے ہیں۔

لیکن بھارت چند کھنہ اگر تصدیق نہ کریں تو مجھے خوشی ہوگی، اگرچہ افسوس بھی ہوگا کہ بیچارے کس دوہری مصیبت میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ تحریر میں شاداب، گفتگو میں آداب ہی آداب۔ ایک مرتبہ میں نے اپنے متعلق لکھا تھا کہ لوگ میری تحریریں پڑھ کر مجھے دیکھنا چاہتے ہیں، دیکھنے کے بعد میری تحریریں پڑھنا چھوڑ دیتے ہیں۔ میں جب پہلی مرتبہ کھنہ صاحب سے ملا تو گزارش کی "لگتا ہے وہ فقرہ میں نے آپ کے متعلق لکھا تھا۔

وہ سنجیدگی سے بولے "کوئی بات نہیں، توارد ہو ہی جاتا ہے اور توارد عیب نہیں مانا جاتا۔" لیکن حضرات! عیب تو عیب اور وہ موجود ہے۔ وہ اتنے متین ہیں کہ اقبال حسین تک اتنا متین نہیں۔ اور اس کے باوجود مزاح کی شگفتگی۔ میں تو اسے عیب سمجھتا ہوں کہ ایک شخص کی روح میں کرب ہے اور خدا حکم دیتا ہے کہ اس کرب کو ہنس ہنس کر باہر لے آؤ، مگر کچھ یوں ہنساؤ کہ تمہاری متانت قائم رہے یہ تو بالکل ایسے ہے جیسے زہر کا پیالہ دیں اور اس پر یہ جبر کہ پینا ہوگا۔

اور کھنہ صاحب گذشتہ چالیس برس سے یہ زہر پی رہے ہیں، بڑی متانت

بلکہ ذمہ داری سے ۔ اور لوگ ہنس رہے ہیں ۔ میں نے کھتہ صاحب کو خود کبھی ہنستے نہیں دیکھا ۔ میں نے ایک مرتبہ ان سے پوچھا "کھتہ صاحب! آپ ہنستے کیوں نہیں"

وہ بولے "یہ تہذیب کا تقاضا نہیں ہے"

میں نے کہا " لیکن لوگ جو آپ کی تحریر پر ہنستے ہیں ۔ کیا وہ بھی تہذیب یافتہ نہیں ہیں"

کہنے لگے "نہیں ، مہذب لوگ ہمیشہ اپنی تہذیب کی مضحکہ خیزی پر ہنستے ہیں "

دیکھا ، آپ نے ! جو آدمی اپنے قارئین کو بھی مہذب سمجھے ۔ اس کی عالی ظرفی پر رشک آتا ہے ، اس عالی ظرفی کی ٹریجڈی یہ ہے کہ آپ کھتہ صاحب کو جس سچویشن میں فکس FIX ہونے کے لیئے کہہ دیں ۔ وہ بڑی معقولیت اور سنجیدگی سے اُسے قبول کرلیں گے ۔ ادبا کی کرسیٔ صدارت پر بٹھادیں ، گلپوشی تک کر ڈالیں ۔ کہیں چیف گیسٹ ڈیکلیر کر دیں ، کہیں شامیانہ لگانے کی ڈیوٹی سونپ دیں ۔ ڈنر کا انچارج بنادیں — حتیٰ کہ بھینسوں کو عقل کی ٹریننگ پر مامور کردیں ۔ وہ اُسے یوں نبھائیں گے کہ خود بھینسیں تک کہہ اٹھیں گی ۔

اے بہر خدا جانے نہ دیجو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

بلکہ ایک بار تو میرے ساتھ فوٹو کھنچوانے پر تیار ہو گئے ۔ جب فوٹو سامنے آئی تو ہم ایک دو منصوبے کا چربہ معلوم ہو رہے تھے ۔ میں نقش میں اور شرافت نفس میں وہ میرے رقیب ہیں اور میں رقیب روسیاہ! کیونکہ میرے چہرے کی سیاہی میرا ایک اضافہ ہے ۔

■■

رشید سمیع جلیل

زندہ دلانِ حیدرآباد کے تیرھویں سالانہ کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کی کانوں سنی رپورٹ

۱۱ اپریل ۸۰ء کی شام زندہ دلانِ ارضِ دکن کے لیے ایک خوش گوار اور یادگار شام تھی جبکہ نمائش میدان حیدرآباد پر رات کے ۱۰ بجے عزت مآب ایم۔ باگا ریڈی، وزیر پنچایت راج حکومت آندھرا پردیش کی صدارت میں جشن بھارت چند کھنہ تقاریب کی آخری محفل یعنی کل ہند مزاحیہ مشاعرہ کا انعقاد عمل میں آیا۔ ہر سال کی طرح مہمانوں اور سامعین کی کثیر تعداد نے اس میں شرکت کی اور شعرا کے مزاحیہ کلام کی سماعت سے اپنے ذوقِ قہقہہ پروری کا ثبوت دیا۔ اب کی بار بھی کئی بیرونی شعرا کو دعوتِ کلام دی گئی تھی جنہوں نے اپنے رنگین کلام سے سامعین کو بے حد محظوظ کیا، میزبان شعرا بھی ہمیشہ کی طرح کافی پسند کیے گئے۔

مشاعرے تو ملک کے طول و عرض میں بہت ہوتے ہیں لیکن حیدرآباد کے مزاحیہ مشاعروں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دکنی زبان میں شاعری کا جو لطف یہاں میسر آتا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتا۔ سارے شہر حیدرآباد میں ایک ہماہمی سی رہتی ہے اور ہر شخص مشاعرہ گاہ کی طرف رواں دواں نظر آتا ہے۔ اس مشاعرہ کے سامعین نہ صرف مقامی ہوتے ہیں بلکہ اطراف و اکناف کے اضلاع سے بھی بھاری تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں۔

رات گئے یہ قہقہہ پرور محفل طنز و مزاح کی بے شمار پھلجھڑیاں فضا میں بکھیرتے ہوئے اختتام کو پہنچی لیکن یہ احساس ہمیشہ رہے گا کہ سلیمان خطیب اور گلی نلگنڈوی کی آوازیں ہمیں اب نہ سنائی دیں گی۔

باوجود کوشش کے کچھ شعرا کا کلام دستیاب نہ ہوسکا جس کا ہمیں افسوس ہے۔

بوگس حیدرآبادی

میرے بوسوں کا اثر اُس پہ ذرا بھی نہ ہوا
وہ ہی نقشِ وفا دعوۂ تسلی نہ ہوا
کہیں سسرے کی یہ جھپیٹ نہ بیوہ ہو جائے
وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
قیس و فرہاد سبھی عشق میں ناکام مرے
ہے یہ وہ لفظ جو شرمندۂ معنی نہ ہوا
غرق سے پہلے پولس نے ہمیں آکر پکڑا
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مسکراہٹ سے تری ہو گیا زندہ بوگس
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

محمود نشتر

ایسا تھا رعب حسن کہ ہم کولڈ ہو گئے
لیکن نگاہِ شوخ سے کچھ بولڈ ہو گئے
شادی کے بعد ختم ہمارا ہوا مقام
کہتی ہیں مجھ سے وہ بھی کہ تم اولڈ ہو گئے

غزل

مرا کام فرقت میں رونا نہیں ہے
مرا دل ہے غم کا کھلونا نہیں ہے
پکاؤں میں کیسے محبت کی کھچڑی
مرے گھر میں ہانڈی بگونا نہیں ہے
نہ چھیڑیں کسی کو وہ سڑکوں پہ ہرگز
جسے اپنی لٹیا ڈبونا نہیں ہے
بہت ہے کوئی مجھ کو مسٹر جو کہہ دے
منسٹر تو قسمت میں ہونا نہیں ہے

ملی جب سے صحبت مجھے شاعروں کی
مقدر میں راتوں کا سونا نہیں ہے
بہا دوں گا دنیا کو اشکوں میں نشتر
مجھے ان سے دامن بھگونا نہیں ہے

سرپٹ حیدرآبادی

مجبور دل ہوں اوروں کے میں دسترس میں ہوں
نوخیز، نوجوان، حسینوں کے بس میں ہوں
گر عمر بڑھ گئی ہے تو کوئی الم نہیں
دل تو جوان ہے گو میں پچھتر برس میں ہوں

منور علی مختصر

حسیں ہو تم بہت پر عاشقی مجھ سے نہیں ہوگی
نکاح کر لوں گا لیکن شاعری مجھ سے نہیں ہوگی
یہ شامِ وصل ہے گھونگھٹ تم اپنا خود ہی اٹھاؤ
شریف انسان ہوں دادا گری مجھ سے نہیں ہوگی

مشاعرہ ہے تو پھر دیر کیا ہے کچھ بھی سنا
تو یہ نہ دیکھ کہ اُردو کا حال کیا ہوگا

غزل

دونوں کے درمیان ہوا نامہ بر مفید
مجھ کو ادھر مفید ہے ان کو ادھر مفید
رغبت ہے مجھ کو دال سے ان کو جگر مفید
یہ بھی ادھر مفید ہے وہ بھی اُدھر مفید
سڑکوں پہ راستوں پہ ہو دیدار دو بدو
محفل میں لیک ہوتی ہے ترچھی نظر مفید

پوچھی سہیلی بیوی سے کیسے ہیں تیرے وہ
شرمائے سر جھکا کے کہا مختصر مفید

بے دھڑک مدراسی

مہرباں ہوکے اب آئے ہو میری لاش لے جانے
میرے پیچھے رہنے دو مری فاقوں کی شہرت کو
نہیں میرا نشاں تو قبر کا کیوں ہو نشان باقی
پڑی رہنے دو مردہ خانے میں اردو کی میت کو

—

ہوں میں ادیب ادب کا بھرتہ بنا کے کھاروں
شعروں کے شیر دے میں مصرعے ڈبا کو کھاروں
سرکار سے ملا ہے رتبہ پدم شری کا
بھوکا ہوں شوق سے میں اس کو چبا کو کھاروں

—

صندلیں ڈبہ بنا دیتا ہوں صندوق کو میں
صورتِ توپ بدل دیتا ہوں بندوق کو میں
شاعری میں ہے مری آج بھی تاثیر اتنی
ایک مصرعہ میں پٹا لیتا ہوں معشوق کو میں

—

عاشقی مہنگائی میں مہنگی پڑی
غم کے چھکے پہ سدا لٹکا گئی
خیریت کیا پوچھتے ہو بے دھڑک
خیریت کی ماں کو خیرن کھا گئی

—

کمر توڑتی مہنگائی ہے پھر بھی جی لیتوں دیکھو
زہر بھی دنیا دیتی ہے تو پھر بھی پی لیتوں دیکھو
مہنگے کپڑے نئیں لے سکتا ننگے تن بھی نئیں رہ سکتا
کتنی بھی پھٹ جائے اپنی پھر بھی سی لیتوں دیکھو

—

عجیب بیوی ہو کیا کیا دکھائی دیتی ہو
کبھی قمر کبھی قمرن دکھائی دیتی ہو
تھی جیب گرم تو ریکھا دکھائی دیتی تھی
ہے جیب خالی تو ٹن ٹن دکھائی دیتی ہو

—

دھندا بڑھائیے، آپ کا سرکاری ڈاکٹر
راس آ گئی مریض کو آغوشِ قبر کی
کتنے ہی زہر کھائے مگر موت نہ ملی
سرکار کی دوا سے تمنا نکل گئی

بیوی کے پہلے شوہر کی قبر پر دوسرے شوہر کی فریاد

نکو تیری بیوی نکو یہ بوم بیٹارا
اللہ نکالے تجھے مٹی سے دوبارا
مجھ پہ ہے برا وقت مٹی جھاڑ کو آجا
باوا تو اللہ کر کو کفن پھاڑ کو آجا
کر دوں گا حوالے تری بیوی کو دوبارا
نکو نا نکو نا یہ بھا بوم بیٹارا
کڑوی ہے یہ کڑکتی سو سپاری منجے نکو
جورو ہے مری جیب پو بھاری منجے نکو
آئی جب سے آئیں گھر کے بجٹ میں خسارا
نکو نا نکو نا یہ بھا بوم بیٹارا
ہے ساس مری کھجلی بھری کانچ کھری رے
ہور بیٹی گلا کاٹنے کو میٹھی چھری رے
گرنے کو ہے باقی مری ہیبت کا منارا
نکو نا نکو نا یہ بھا بوم بیٹارا
پنج وقتہ میں مرنے کی دعا کر روں رے باوا
[illegible] بار مرا تو، میں سدا مر روں رے باوا

تو موت کا مارا ہے میں حور کا ہوں ہلارا
نکوتا نکوتا یہ بوم پیٹارا

مہنگائی میں یہ گائی بہت بھاری پڑی رے
ان جاتے پلا کو مجھے دیتی ہے ہری رے
اس بیل نما گائی سے مشکل ہے گذارا
نکوتا نکوتا یہ بوم پیٹارا

مٹی میں ملے ہیں ترے اوصاف حمیدہ
کیڑوں کے لیے مل گیا کیا خوب ملیدہ
بچوں کو پسند آیا ہے ترے جہلم کا بگھارا
نکوتا نکوتا یہ بوم پیٹارا

برتن میں ترے چھید سلیقے سے ملیں کیا اؤں
برسی تری تیر پنج وظیفے سے میں کراؤں
مرکو بھی چھٹا نہیں تری تنخواہ کا سہارا
نکوتا، نکوتا یہ بوم پیٹارا

جنت کے تو حوراں میں مزے بہت اڑا رہا
حوروں سے جدا ہونے کی خوشیوں میں تو گا رہا
کیوں پیٹتا ہے یوں مری چھاتی پو مسالہ
نکوتا، نکوتا یہ بوم پیٹارا

قرضے سے جو ساڑھی تو لیا قبر پہ بچھا رہوں
میں پھول کی چادر کی جگہ ساڑی اڑا رہوں
فاتحہ میں ترے لایا ہوں شادی کا چھوارا
نکوتا، نکوتا یہ بوم پیٹارا

لنگی ترے ماتم کے لیے بیگ بنی ہے
چھتری تری جھنڈے کی طرح گھر پو تنی ہے
باقی ہے ابھی تک تری یادوں کا خسارا
نکوتا، نکوتا یہ بوم پیٹارا

بنگلہ نہ ملا جہیز میں نہ ٹی۔وی ہی آئی
حصے میں مرے قا نوبلی بیوی ہی آئی
بدلے میں ولیمہ کے حلیمہ نے پدھارا
نکوتا، نکوتا، یہ بوم پیٹارا

بکھر کو انہیں جارہے میں کھانا پکا رہوں
اُن دن کو کہے رات بھی تو منٹیاں ہلا رہوں
گھراد مجھے کر یہ غلاظی ہے جدا بالا
نکوتا نکوتا، یہ بوم پیٹارا

کتا بھی کروں میں انیں گن گاتی ہے تیری
کیا خوب کلیجے میں دھتورا انیں بیری
کھاکو مرا تیرا پچ بجاتی ہے پیارا
نکوتا نکوتا، یہ بوم پیٹارا

معلوم تجھے کتوں کا سرپنچ تھا میں بھی
دارا کا بھی رستم کا بھی سرپنچ تھا میں بھی
لیکن یہ مرے پہلوان بھی جورو کنے ہارا
نکوتا نکوتا یہ بوم پیٹارا

مقطعے میں ترے میرا تخلص میں لگا رہوں
یے دھڑکے مرے شل سے ترا ٹارچ جلا رہوں
اس ٹارچ سے کراؤں میں اجالے میں ہندھارا
نکوتا، نکوتا، یہ بوم پیٹارا

پاگل عادل آبادی

یاد آتا ہے ان کو اپنا بچپن آدھی رات کے بعد
جا تنے لگتے ہیں وہ جھوٹے برتن آدھی رات کے بعد
ہو جاتی ہے جب بھی ان میں ان بن آدھی رات کے بعد
لے لیتے ہیں ہاتھوں میں اپنے بیلن آدھی رات کے بعد
قوم کے غم میں قوم کے لیڈر دن رات یہ کھاتے رہتے ہیں
مرغ مسلم شام سے پہلے چورن آدھی رات کے بعد
راز کی باتیں منھ سے فٹا فٹ ان کے نکلنے لگ جاتی ہیں
نیند میں منھ کا کھل جاتا ہے ڈھکن آدھی رات کے بعد

مولانا کے خواب میں آکر دیتی ہیں دو نوں گھیلا
ٹن ٹن آدھی رات سے پہلے ہیلن آدھی رات کے بعد
مڑ جاتی ہیں جھک جاتی ہے داداؤں کی ناناؤں کی
مونچھیں آدھی رات سے پہلے گردن آدھی رات کے بعد
جب رات کو اُلّو گاتے ہیں تب شعر تولد ہوتے ہیں
سورج کا ہو جاتا ہے چالو انجن آدھی رات کے بعد
آلو، اروی، بھینڈی، ٹماٹے چھوڑ کے سرکاری ترکاری
جانے انھیں کیوں یاد آتے ہیں بیگن آدھی رات کے بعد
سُن کے ترنم آپ کا پاگل جولوں کو یہ محسوس ہوا
جیسے اناڑی کوئی بجائے ہارن آدھی رات کے بعد

صبغۃ اللہ بمباٹ

آج کا طالب علم

لکھنے پڑھنے پہ کچھ نہیں موقوف
کامیابی کے ڈھنگ نرالے ہیں
صبح اُٹھو ہزار ڈنڈ پیلو
بوتلیں چار دودھ کی پی لو
کرتے جاؤ ریاض جوڈو کا
جیب میں بھی رکھا کرو چاقو
رعب استاد پر رہے یارو
اپنا چاقو کھلا رکھو پیارو
ممتحن جو بھی پاس آجائے
گھور کر دیکھو اور نقل مارو
کُل سلیبس اٹھاؤ اور لکھو
حل شدہ پرچہ لاؤ اور لکھو
تم کو جو بے وقوف پرچہ دے
اس سے خود حل کراؤ اور لکھو
فرق گُم ہے سفید و کالے کا
پرچہ ہے امتحان جیالے کا
شیخ نتھو نے لکھا یا لا آخر
رول نمبر تک اگلے والے کا
بیبیوں کو وہ کیا ستائے گا
ممتحن جو بھی پاس آئے گا
کہہ دو پکچر ہمیں بلاتے ہو
دم دبا کر وہ بھاگ جائے گا
نکتہ رس نکتہ داں ہیں یہ سارے
عالم بے اماں ہیں یہ سارے
لیڈری کے سوا کریں گے کیا
کل کے ہندوستاں ہیں یہ سارے

اَن پڑھ بھونگیری

بے اعتدالیوں کے زمانے گزر گئے
رشتے کی سالیوں کے زمانے گزر گئے
گھر کی ہی شاخ گل پہ بسیرا ہے آج کل
پھولوں کی ڈالیوں کے زمانے گزر گئے

غزل

فرمائشوں سے بیوی کی بحران ہو گیا
ہرّاج گھر کا سب مرے سامان ہو گیا
آجاؤ کام کاج مری جان ہو گیا
حیلے بہانے مت کرو پکوان ہو گیا
اکل حلال کھاتا تھا مریل تھا سربسر
مال حرام کھا کے پہلوان ہو گیا
تربت سہی ممیری بہن غم نہیں مجھے
ماموں مرا وزیر قلمدان ہو گیا

کھائی تھی ان کی آنکھوں کی میں نے کبھی قسم
سارے حکیم کہتے ہیں یرقان ہوگیا
جب تک میں تھا کنوارا تو ان پڑھ مزے میں تھا
شادی جو ہوگئی تو پریشان ہوگیا

گلیم میدکی

پاؤں میں پنجابی چپل، سر پہ طرہ، مونچھیاں سنوار رہے
گوراگومٹا، آڑا چوڑا دیکھنے میں آدمی کلدار ہے
جمبیا کمر میں، لٹ بغل میں، ہاتھ میں تلوار ہے
سب ہے لیکن خان صاحب ریشمی شلوار ہے

o

دن کو دن بولا ہوں میں رات کو بولا ہوں رات
نئیں سنا میں دوستو آج تک عورت کی بات
آج ہی میں اتفاقاً دیر سے آیا تو گھر
چپ مذاقاً ہنستے ہنستے ڈالی تھی چپل پہ لات

o

اتفاقاً میں کسی مہینے میں گر کنم لاؤں پے
رات بھر ٹھیرائے رکھتی ہے مجھے اک پاؤں پے
کم نہیں ہوں میں بھی یاد رکھیے اپنا انتقام
جم کے جوتے مارتا ہوں چھپ کے اس کی چھاؤں پے

o

ندامت ملنیے اس میں اگر کچھ بد کلامی ہے
جہیز میں گھر کا گھر منگتا ہے سمدھی کیا حرامی ہے
ہزاروں دے کے جب داماد آئیں تو ڈر کس کا
ابھی خدمت دیا کے لو غلام اپنا دوامی ہے

o

غزل

ہوا آرزو کی چلے سر کا ئیں ہے
محبت کے پھولاں کھلے سر کا ئیں ہے
غم حال دل تو سنایا ہوں پن کی
گلابوں سے شبنم ڈھلے سر کا ئیں ہے
چمٹ کو ہے اماں سدا ساتھ اُن کی
اکیلے میں تنہا ملے سر کا نئیں ہے
مرے گھر پو کنٹرول سسرال کا ہے
بغیر ان کے کاڑی ہلے سر کا ئیں ہے
زبردستی دعوت دیوں دوستوں کو
مگر دال گھر میں گلے سر کا نیں ہے
بہت ہو ہی ہے گلیم ان کے منہ پو
بھلا کو بھی ان کو بھلے سر کا نئیں ہے

عظمت بھلاواں

تمہاری عقل پر کچرا پڑا ہے
مرے گا کیسے ہیلا ایر گن سے
کئی شو فلم شولے دیکھ کر بھی
یہ مردہ جھانکتا ہے پھر کفن سے

پیروڈی

(سکندر علی وجد سے معذرت کے ساتھ)

ڈر کر پلٹ کے آئے ہیں گنگ وجمن سے ہم
تل پر نہار ہے ہیں بہت بانکپن سے ہم
چہرے کی سلوٹوں کو تو ہموار کر چکے
الجھے ہوئے ہیں زلف شکن در شکن سے ہم
احباب ورشتہ دار و مکاں کچھ نہیں ہے یاد
بچپن ہی میں فرار ہوئے تھے وطن سے ہم

اغیار دیگچی لیے پلنگ کو چل دیے
ٹکرا رہے ہیں گھر میں پرانی دلہن سے ہم
کانٹوں نے بے لباس کیا چیر پھاڑ کر
خود کو چھپا رہے ہیں ہر اک گلبدن سے ہم

جوہر سیوانی

محبت میری قسمت میں خسارے کی دکاں نکلی
بھلا کیا نفع کی سوچوں مری پونجی کہاں نکلی
وہ پہلا عشق میرا آخری ثابت ہوا جوہر
کنواری جس کو سمجھا تھا وہ دس بچوں کی ماں نکلی

نظم

[illegible]ک صاحب جن کے گھر بچوں کی تھی اک پوری ٹیم
[illegible]ہ جو نکلے شام کو بازار سے لانے افیم
[illegible]استے میں ایک بچی رو رہی تھی زار زار
[illegible]ہ یہ سمجھے ہے بے چاری کوئی لاوارث یتیم
[illegible]ود میں اس کو اٹھا کر گھر کی جانب چل پڑے
[illegible]حن میں بیٹھی ہوئی تھی ان کی بیگم بی نسیم
[illegible]ود میں بیگم کے بچی کو انھوں نے ڈال کر
[illegible]ہ کہا وہ گھر میں لے آیا ہوں اک در یتیم
[illegible]یکھ کر بچی کو بیگم نے مسرت سے کہا
[illegible]ذرا یہ تو اپنی بیٹی ہے خدا رکھے شمیم
کثرت اولاد نے کیا تم کو اندھا کر دیا
[illegible]اپنی بیٹی کو یتیم اور مجھ کو بیوہ کر دیا

غزل

[illegible] بتائیں آپ کو کیا ہم تلاش کرتے ہیں
جنازہ جیتا ہے ہم تلاش کرتے ہیں
حضور آپ ہی کو ہم تلاش کرتے ہیں
بغیر دال سما یو دم تلاش کرتے ہیں
جو لکھ کے ان کو غزل دے اُسی سخنور کو
ہمارے شاعرِ اعظم تلاش کرتے ہیں
بیاں جو کرتے ہیں طبریہ عظمت فاقہ
وہ خود ہی مرغ مسلم تلاش کرتے ہیں
خود اپنے گھر کے لیے عقد بیوگاں کے وکیل
چراغ خانۂ مریم تلاش کرتے ہیں
نہ دیکھا بیل بیٹھم ان کے باپ نے بھی مگر
بہ وقت عقد عزیزم تلاش کرتے ہیں
دکھائی دیتے ہیں خود ہی جو بندروں کی طرح
وہ کیسے حسن مجسم تلاش کرتے ہیں
ہوئی ہے شہرت جوہر سے جو انہیں کا رشتہ
بے چارے داد کا مرہم تلاش کرتے ہیں

حفیظ خاں مذاق

جوگی اکتارے پر یہ کتھا سنا یا سجنا
اللہ اللہ کر کو ختم ہوی دو برسوں کی کتھا
مارچی دولھے بن کو آئے سو واپس ہوی برات
جو گھوڑے پہ بیٹھ کو آئے ان بھی کالات
ان کا بیٹا جینز کو بھی نیں بھایا سجنا
جگ کا جیون بننے آیا اک ڈنلپ کا ٹیر
اک بہیئے کی گاڑی چلاتا تھا جیئر دل بغیر
ریل چلانے کی لالچ میں سب سے کر کو بیر
گاڑی پٹڑیوں پو چلا کو لڑھکایا سجنا
نارائن کا راج تھا جیسے سادھو کا اوتار
جو ڈاڑھی کے بل بوتے پو لڑتا تھا ہر بار
جب ڈاڑھی نے ہاتھ دیا تو کپڑے ڈالا اتار
لنگا سڑکوں پو وہ کھیلا تا تھیا سجنا

ڈاکٹروں کا پیشہ اونچا کاماں ہیں ہر ماپ
تنخواہ اور عہدے کو لڑکو سب کو بتارئیں بھاپ
اندھی آنکھ کو نکالنے جا کو اچھی دیے ریں ڈھاپ
بلنا کی آبرو کو مٹی میں ملایا سجنا
پیار سکا پیاسا ملنے گیا میں جب سجنا کے پاس
پہلے جیبیاں میرے کھنگالیں ہونے والی ساس
پھر بیٹے سے بول کو میری ایسی بجھائیں پیاس
وہ پانی بڈی ہڈی کو میری پلایا سجنا
دولھا باہر شادیاں ہو یہ کیسا ہے گھور
ایک حرکت کرے دیوانی ولیمہ کرا بیٹھے ہور
غیبانے کا نکاح پڑھا رئیں یہ بھی آیا دور
سسرا بہو کا ہاتھ پکڑ کو گھر کو لایا سجنا
ماں کی محبت جھوٹی پڑ گئی بیوی کا پیار ہے سچا
زچگی تو بیوی کی ہوئی پن شوہر بن گئی زچہ
تھالی بجا کو ایسا مٹک رئیں گود میں لے کو بچہ
جیسے مردوں میں زنانہ آیا سجنا
جوگی اکتارے پو یہ کتھا سنایا سجنا

اسمٰعیل ظریف

غالب وزیر فوج تھے بابر کے دور میں
ہندوستان آئے تھے وہ ویتنام سے

•

چھوٹا سالا نیم پاگل دوسرا خبط الحواس
تیسرا سب سے بڑا سالا بھی ہے نکلا ہوا
کیا مقدر کا سکندر ہے خدا بیٹا جھونند
ساس بھی سر کی ہوئی سسرا بھی ہے سرکا ہوا

•

پھرتے تھے ٹاپتے ہوئے کل تک جو روڈ پر
وہ ذاتی کار رکھتے ہیں اب پھٹ پھٹی نہیں
ویسے چمک رہا ہے کلر دور سے مگر
ماڈل بتا رہا ہے کہ گاڑی نئی نہیں

•

نہیں ہے جال بچھانے کا تجربہ جس کو
شکار میں وہی چیخ و پکار کرتا ہے
جو کہنہ مشق شکاری ہے ماہر ماہی
وہ چھوٹی مچھلی کا اکثر شکار کرتا ہے

خواہ مخواہ

دیکھ کو پکے پھل محنت کے کرتیں کی کیا نئیں کی
گھوساں، نیولے باغ میں گھس گئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
کتا کتا، لڑایا میں شادی نئیں کرتوں کر کو
سہرا بن کو ڈھول بجا رئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
سرکاری آرڈر ہے بچے تین سے بڑھ کو نئیں ہونا
گھٹنا کھا کو الٹیاں کر رئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
بھٹے پر کے چڑیاں اڑ گئیں کھانے کو اک اک دانہ
اب خالی سٹا رکھ لے کو کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
فلمی گانا گاتے تو دھوبی رسی لے کو آیا تھا
شاستریہ سنگیت سنا رئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
بچے بھوت ہیں نام سے نئیں نمبر سے پکارو بولوں مگر
دس کے آگے گن سکتے نئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
پاؤں بھاری تھا جھولی میں آنے لے جانے دلہن لیکن
دونوں پاواں بھاری دکھ رئیں کیا کرتیں کی کیا نئیں کی
حشر کے دن جو ہوگا میرا حشر وہ دیکھا جائے گا
قبر میں پہلے آ کو فرشتے کیا کرتیں کی کیا نئیں کی

تنگ کرتا رہے کمک ہمیں نئی سو کا ماں کروالے کو خوش تھے
اب طاقت جاتی رہی میری کیا کریں کی کیا نیں کی
پوری تنخواہ ملا کو دیتوں پھر بھی روز کی کھٹ کھٹ ہے
پنشن لینے کے دن آئیں کیا کریں کی کیا نیں کی
عزت اور ناموس کے دشمن خون میں ہاتھاں رنگ لیکے
امن وامان کے پامال کر رہیں کیا کریں کی کیا نیں کی
پہلے بھی اردو کے حق میں تقریراں کر کو بھول گئے
اب پھر اُردو کے گن گا رئیں کیا کریں کی کیا نیں کی
جن کا دعویٰ تھا کہ قوم کا بیڑا پار لگائیں گے
خود ان کی کشتی ہے بھنور میں کیا کریں کی کیا نیں کی
گر پڑ کو دو لیڈراں اپنے ارماں پورے کر ہی لیے
وہ جن کے ارمان نیں نکلے کیا کریں کی کیا نیں کی
ہاتھ میں لکڑی آنکھوں پہ ہے آخری نمبر کا چشمہ
نقلی دانت بھی ہل رئیں ان کے کیا کریں کی کیا نیں کی
آخر جو رستے پو پھٹ گئی ان کی ساجھے کی ہنڈی
ساجھے دارنداں ٹیلی کو مریئیں کیا کریں کی کیا نیں کی
ایک عورت کے ہاتھ سے ٹکرلے کو ہونڈے منہ گر کو
پھر خم ٹھونک کو آرئیں کیا کریں کی کیا نیں کی
دیش کے لیڈر کپڑے بدلے جیسا دل بدلی کر کو
عہدہ پانے کی لالچ میں کیا کریں کی کیا نیں کی
تھوڑی سی تعریف کرے تو بنین تنگ ہو جاتی ہے
تعریفوں کے پل باندھے تو کیا کریں کی کیا نیں کی
ہو جاتا ہے آسانی سے مطلع خواہ مخواہ لیکن
آکو اٹک جاتیں مقطعے میں کیا کریں کی کیا نیں کی

مصطفیٰ علی بیگ

بیوی قبل، نرم، ملائم ہو تو مخمل کہیے
خون چوسے اگر وہ آپ کا کھٹمل کہیے
آپ کے عشق نے فٹ پاتھ دکھایا ہے ہمیں
اسٹوپڈ کہیے بڑے شوق سے پاگل کہیے
منہ چڑایا، نہ تو جھڑکا، نہ تو گالی دی ہے
بنا برسے کے گذر جائے وہ بادل کہیے
اور بھری بزم میں معشوق کہے جب انکل
جھینپ کو اپنی مٹانے اسے چنچل کہیے

طالب خوندمیری

نروس ڈلو تھر

یہ جو اسمارٹ سے سخنور ہیں
اور کوئی نہیں ہیں لوتھر ہیں
یہ تو ہیرو سمان لگتے ہیں
ضعف میں بھی جوان لگتے ہیں
نثری نظمیں یہ خوب کہتے ہیں
خشک ندیوں میں تیز بہتے ہیں

رُباعی

منت نہ خوشامد نہ ادب سے مانگو
انداز بدل کر نئے ڈھب سے مانگو
یہ بھیک نہیں ووٹ ہیں لیڈر صاحب
وعدوں سے فسادوں سے غضب سے مانگو

قطعہ

ہر اک بھاشن میں یہ کہتے ہیں نیتا
انھیں اُردو زبان پیاری بہت ہے
مگر انداز سے لگتا ہے ایسا
حقیقت کم اداکاری بہت ہے

کرشمۂ روشنی

ہمارے شہر میں اب ہر سڑک پر
کچھ ایسا انتظام روشنی ہے
میاں سورج بھی شرمانے لگے ہیں
مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر
جو دن میں بھی نظر آتے نہیں تھے
گڑھے وہ بھی نظر آنے لگے ہیں

فٹ پاتھ واسی

کسی فٹ پاتھ پر اک نوجواں کو
صفائی کے کسی افسر نے ڈانٹا
یہاں تم کس لیے سوتے ہو احمق
اٹھو جاؤ تمہارا گھر نہیں کیا
پلٹ کر نوجواں غصے سے بولا
ارے پاگل تجھے بھی کچھ خبر ہے
یہاں سوتا نہیں میں ہی اکیلا
یہی فٹ پاتھ تو لاکھوں کا گھر ہے

مشتاق پردیسی

پھول سے چہروں کی تھی بھرمار عابد روڈ پر
چبھ رہے تھے دل میں لاکھوں خار عابد روڈ پر
ہم تھے اصلی مال کے طالب مگر گوگس ملے
کھا گئے دھوکا سر بازار عابد روڈ پر
"شی" کو ہم نے "ہی" سمجھ کر اس سے ماچس مانگ لی
بچ گئے ہم کھاتے کھاتے مار عابد روڈ پر

●

غم سدا لا دوا نہیں ہوتا
ہر حسیں بے وفا نہیں ہوتا

اک مری لاٹری نہیں آئی
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

جو کام کر گئے اسلاف تم کرو تو سہی
ایاغ عمر ہے خالی اسے بھرو تو سہی
یہ اہل علم و ادب ہیں بڑے ہی مخلص ہیں
تمہارا جشن منائیں گے تم مرو تو سہی

بجلی کے کرشمے

آنا اگر ہوا تو دبے پاؤں آئے ہے
جانے پہ اڑ گئی تو قسم کھا کے جائے ہے
بجلی ہے لکھنؤ کی بڑی شوخ دوستو
اک پل جو مسکرائے تو پہروں رلائے ہے
کوچے پڑے ہیں قلب سیہ کار کی طرح
کھمبے کھڑے ہوئے ہیں گنہ گار کی طرح
اچھی طرح سے یاد ہے اب تک مجھے وہ شام
جب دی تھی میرے دوست نے اک دعوت طعام
اس نے کیا تھا ہم کو کھلانے کے واسطے
زردہ، پلاؤ اور کبابوں کا اہتمام
بیگم کے ساتھ میں بھی وہاں پر پہنچ گیا
چولھا ہمارے گھر کا ہمیں گھورتا رہا
کھانے سے قبل ہال میں احباب جمع تھے
فلمی دھنوں کے بیچ تھے سب محو گفتگو
اتنے میں اتفاق سے بجلی چلی گئی
تاریکیوں میں ڈوب گیا فرق ما و تو
یہ بلکہ سب اپنی جیب سے ہوشیار ہو گئی
شام اودھ کی زلف شب تار ہو گئی
موقع تھا میں نے دوڑ کے بیگم کو جا لیا
ہاتھوں میں ان کے ہاتھ کو لے کر دبا دیا

دھیرے سے مجھ کو کہا کہ بڑی بج رہی ہو آج
شاید انھوں نے ایسا لگا مسکرا دیا

بجلی جب آئی سین بڑا واہیات تھا
ششدر غرور عظمت کردار رہ گیا
میں بزم گل میں مثل سر خار رہ گیا
سب گھورتے تھے مجھ کو نکیلی نگاہ سے
غالب کا ایک بھی نہ طرفدار رہ گیا
پانی گھڑوں حیا سے مرے سر پہ پڑ گیا
اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
بجلی ہی تو ہے آئی ادھر اور ادھر گئی
کھانا ہوا شروع تو بار دگر گئی
انجینیر جو بزم میں بیٹھے تھے چیخ اٹھے
لو آبروئے شیوۂ اہل ہنر گئی
بجلی کے ماہروں کی غرض بات بھی گئی
بجلی کے ساتھ عزت سادات بھی گئی
گذرا جو نصف گھنٹہ اندھیرے کی گود میں
چمکی چمک کے پھر وہ سبک گام آگئی
وہ ہم جلیس نور وہ رقاصۂ شرار
اچھلی اچھل کے پھر سے سر بام آگئی
جب روشنی ہوئی تو عجب ماجرا ہوا
زردہ میں تھے کباب تو کہتے یہ راز تھا
بیٹھے تھے میرے پاس ہی محترم بزرگ
غصہ بھری نظر سے مجھے گھورنے لگے
پہلے تو میں نہ سمجھا مگر غور جب کیا
واللہ میرے ہاتھ کے طوطے ہی اڑ گئے
حرکت مری اصول کے سچ مچ خلاف تھی
پلیٹ اپنا بھر چکا تھا پلیٹ ان کی صاف تھی

قادر حیدر آبادی

میرے لئے خزاں ہوئی فصل بہار آج
محفل میں میرے سر رہا عزّ و وقار آج
جس کا قطعہ چرایا تھا وہ آ نہیں سکے
عزت یوں رہ گئی مرے پروردگار آج

●

اس طرز یادہ گوئی کا گر کوئی غم نہیں
جو چاہو لکھو کوئی حدود رقم نہیں
بن ہی گئے ہو جب شتر بے مہار تم
یہ بھی کہو کہ اونٹ کی گردن میں خم نہیں

●

لگا ہوں کا سہارا بھی سہارا ہو نہیں سکتا
اشارہ کرنا بھی چاہیں اشارہ ہو نہیں سکتا
کہاں آکر ہوا پورا ہماری دید کا ارماں
کہ اب عینک بغیر ان کا نظارا ہو نہیں سکتا

●

اتری جو دوا حلق سے گفتار ندارد
حالت کا اشاروں سے بھی اظہار ندارد
دو روز دوا لائے تھے اس کا یہ اثر ہے
اب صرف پلنگ رکھا ہے بیمار ندارد

●

ملتی رہی پھکٹ کی تو للچا کے پی گیا
پیسوں کی بات آئی تو بل کھا کے پی گیا
پولیس کی دین جیسے مرٹی سہتے میکدہ
جو کچھ بچی ہوئی تھی وہ گھبرا کے پی گیا

●

ناظم انصاری

دکھائی دیتا ہوں دنیا کو ایڈیٹر لیکن
حضور آپ کو کیسا دکھائی دیتا ہوں

مجھ کو مقروض پہ مقروض بنانے والا ہے
کون ہے تیرے سوا چونا لگانے والا
آج وہ بن گیا سنگیت سکھانے والا
کل تلک تھا جو فقط ڈھول بجانے والا

میں حیران ہے کل وغیرہ وغیرہ
وہ شوخ اور تخیل وغیرہ وغیرہ
شب ہجر اکثر مرے کام آئے
یہ تحریر یہ کشمل وغیرہ وغیرہ
خدا جانے کیا ہم کو سمجھے ہوئے ہیں
ترے باپ انکل وغیرہ وغیرہ
وہ ہاتھی ہیں، بھینسہ نہیں اور جانے کیا کیا
میں کمزور مریل وغیرہ وغیرہ

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	-/۱۵	روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	"	۳/۵۰	"
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰	"
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	-/۶	"
فقط	یوسف ناظم	"	-/۶	"
در پردہ	مسیح انجم	"	-/۶	"
توتو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	-/۱۰	"
چوڑی کے غلام	"	مضامین	-/۷	"
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	-/۸	"
سخن زار	خواجہ عبدالغفور	"	-/۸	"
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	-/۸	"
گھوکرو کے کانٹے	علی صاحب میاں	"	-/۶	"
انڈین کاجو	عاتق شاہ	انشائیے	-/۸	"
شوشے	ارشد علی خاں	مضامین	-/۱۰	"

فرحت زیدی

جشنِ ظرافت کٹک

ایک رپورتاژ

شعر تو یوں ہے ؎

آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

لیکن ہمارے ذہن میں یہ شعر اس طرح گونج رہا تھا ؎

آج ہم حضرت جاہل کو کٹک اسٹیشن — لینے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

جاہل صاحب کو جاہل نہ کہہ کر کیا کہا جائے یہی پرابلم تھی۔ صرف جاہل سلطان پوری ہی نہیں بلکہ اور کئی حضرات بھی تشریف لا رہے تھے۔ دہلی سے جناب مجتبیٰ حسین، پٹنہ سے جناب شفیع مشہدی اور جناب اسرار جامعی، سیوان سے جناب جوہر سیوانی، لکھنؤ سے جناب مسٹر لکھنوی، ناگپور سے جناب ناظم انصاری اور حیدرآباد سے جناب بوگس حیدرآبادی، جناب گرگٹ حیدرآبادی اور جناب پاگل عادل آبادی تشریف لا رہے تھے۔ ہمارے شہر کے سرگرم ظریف شاعر جناب اسمٰعیل آذر نے ان سبھی حضرات کو بزمِ سخن اڑیسہ کٹک کے زیرِ اہتمام منعقدہ جشنِ ظرافت کے لئے مدعو کر رکھا تھا جو ۱۰ رمئی سنہ۸۰ء کی شام کو کٹک میں ہونا تھا۔ آذر ان سبھی حضرات کو پہچانتے تھے سوائے جاہل سلطان پوری کے۔ ایسے مواقع پر والنٹیئر بیج کام کرتا ہے لیکن جن صاحب کی تحویل میں بیج تھا وہ الماری میں بند کر کے جا چکے تھے۔ لہٰذا ہم کو تلاش کرنا تھا جاہل صاحب کو لیکن بغیر بیج کے۔ ہوڑہ پوری ایکسپریس صبح پانچ بجے آتی تھی۔ خیر اتنے سویرے اسٹیشن پر پہنچنا کوئی پرابلم نہیں تھا۔ پرابلم تو اس کے لئے ہوتا جو رات کو سوتا، ہم تو رات بھر جاگتے رہے تھے۔ جناب مجتبیٰ حسین صاحب جو نیلاچل ایکسپریس سے ۹ رمئی کو دوپہر کو آنے والے تھے۔ ٹرین کے کینسل ہو جانے کی وجہ سے امید تھی کہ کلنگا ایکسپریس سے آئیں گے جو شام کو ۵ بجے آتی تھی۔ احتیاطاً ٹیلیفون کیا تو معلوم ہوا کلنگا ڈھائی گھنٹے لیٹ ہے۔ رات کو ۱۰ بجے روانہ ہوئے۔ اسٹیشن پہنچے تو معلوم ہوا اب ٹرین چار گھنٹے لیٹ ہے۔ چلئے ساڑھے بارہ بجے تک سہی۔ ساڑھے بارہ بجے معلوم ہوا کہ ٹرین ڈیڑھ بجے آئے گی۔

لیکن ٹرین بصد ناز و غمزہ ۲ بجے شب میں کٹک وارد ہوئی اور جناب مجتبیٰ حسین صاحب کا تھکا ہوا لیکن مسکراتا چہرہ ہم لوگوں کی ساری بوریت کی تلافی ثابت ہوا۔ موصوف کو لے کر قیام گاہ پہنچے۔ تھوڑی دیر گفتگو رہی۔ معلوم ہوا نیلاچل ایکسپریس کے کینسل ہونے کے بعد بصد ہزار دقت موصوف کو کلنگا میں فرسٹ کلاس میں ایک برتھ ملی وہ بھی کنڈکٹر صاحب کے دل میں جگہ بنانے کے بعد بعوض پچاس روپے سکۂ رائج الوقت۔ اور وہ ایکسپریس ٹیلی گرام جو موصوف نے ۸ رمئی کو ٹرین کی تبدیلی کی اطلاع کا بھجوایا تھا وہ ہمیں آج تک موصول نہ ہوا کیونکہ تار تو بھیجنے والے کے دل کی تسلی کے لئے ہوتے ہیں اُسے منزل تک پہنچانا محکمۂ ڈاک و تار کی ذمہ داری میں شامل نہیں ہے۔

مجتبیٰ صاحب کو تو ہم نے بقیہ رات کے لئے شب بخیر کہا اور تین بجے شب میں پھر اسٹیشن کے لئے روانہ ہوگئے۔ اور اسی وقت راستے میں یہ خیال آیا تھا کہ جاہل صاحب کو ہم ریسیو کیسے کریں گے۔ مروجہ قاعدے کے مطابق اگر ہم نام لے کر پکارتے ہیں تو لوگ ہنسیں گے کہ یہ کون عالم فاضل حضرات آگئے جو کسی بے چارے کو "جاہل صاحب جاہل صاحب" کہہ کر پکار رہے ہیں۔ کٹک میں اڑلیہ کی زبان اڑیہ ضرور بولی جاتی ہے لیکن ہندی/اُردو بھی بخوبی بولی اور سمجھی جاتی ہے ممکن ہے اس طرح پکارے جانے پر جاہل صاحب سُن کر بھی انجان بن جائیں۔ مشاعرہ کی بات اور ہے لیکن اسٹیشن پہ بر سرِ عام کون اپنے کو جاہل پکارا جانا پسند کرے گا۔ ہاں یہ کسی بڑے دل گُردے والے کا کام ہوسکتا ہے۔ لیکن ابھی تو ہم کو مسلم جاہل سلطان پوری کا ہی سائز معلوم نہیں تھا تو ان کے دل گردے کے سائز کا کیا اندازہ ہوتا۔ پھر سوچا، چلو "سلطان پوری صاحب سلطان پوری صاحب" پکارا جائے۔ لیکن تبھی ہمیں ایک تحریر یاد آئی جو سند بننے کے لئے تو شاید نہیں لکھی گئی تھی لیکن وقتِ ضرورت کام آئی کہ حیدرآباد میں جب ایک بار مرحوم تخلص بھوپالی کو ریسیو کرنے کچھ لوگ گئے جو مرحوم کو پہچانتے نہ تھے تو "تخلص بھوپالی تخلص بھوپالی" کی آواز لگانے پر کسی مسافر نے ایک پلیٹ تخلص بھوپالی کی فرمائش کردی تھی۔ "سلطان پوری صاحب" پکارے جانے پر کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ یہ پوری کی کوئی نئی قسم ہے جیسے شاہی ٹکڑے، شاہی قورمہ، نرگسی کوفتہ، سلطانی پراٹھا، سلطانی زردہ وغیرہ۔ اور اگر اس "سلطان پوری" کا کسی مسافر نے مطالبہ کر لیا تو ہم کیا کریں گے۔ بالآخر طے ہوا کہ ٹرین آنے پر ایک طرف سے میں پکاروں گا "آذر صاحب" اور ایک طرف سے خود آذر کہیں گے "آذر صاحب" اور پھر زیرِ لب کہیں گے "خود ستائی معاف"۔ جاہل صاحب آذر کا نام سنیں گے تو مکبر کے پاس خود ہی پہنچ جائیں گے کہ صدا دینے والے کے قریب ہی کہیں آذر مراد ہوگا۔ چنانچہ ریسپشن کے اس انوکھے حربے سے مسلح ہو کر (چونکہ اس حربے پہ کوئی لائسنس نہیں ہے اس لئے اسے ہر وہ شخص استعمال کرسکتا ہے جو والنیٹر بیج نہ لگا سکا ہو۔ اور جسے کم از کم مشاعرے کے کنوینر کا نام معلوم ہو) جب ہم اسٹیشن پہنچے تو جگن ناتھ ایکسپریس آچکی تھی۔ ہم جب پلیٹ فارم پر پہنچے تو دیکھا کہ جناب جوہر سیوانی صاحب موجود ہیں۔

جوہر صاحب نے لکھا تھا کہ موصوف کسی بھی ٹرین سے پہنچ جائیں گے۔ خیر جوہر صاحب کو ریسیو کرنے کے لئے ہم [illegible] سے کسی لڑکی بیج کی ضرورت نہ تھی کہ ہم بھی انھیں پہچانتے تھے (اس لئے اگر ہم کو آپ جوہر شناس کہنا چاہیں [illegible] کہہ لیں۔) اور ہم کتنا ہی مونچھوں پر تاؤ دیتے جوہر صاحب ہمیں نظر انداز کر کے آگے نہ بڑھتے کیونکہ موصوف [illegible] تھے۔ معلوم ہوا جوہر صاحب صبح ہونے کے منتظر تھے کہ ۳ بجے شب میں کوئی شریف آدمی کسی کے گھر نہیں [illegible] ۱۰ رمئی کی صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تو ہم نے پھر انکوائری آفس کا رُخ کیا۔ معلوم ہوا ہوڑہ پوری [illegible] اور [illegible] ایکسپریس جو حیدرآباد کی طرف سے صبح ۷ بجے آتی ہے وہ بھی لیٹ ہے

کہ بالکل لیٹی ہوئی ہے۔ کیونکہ کتنا لیٹ ہے یہ بھی پتہ نہیں۔ لہٰذا ہم صرف جوہر صاحب کو لے کر قیام گاہ پر آ گئے۔ جوہر
صاحب سے ہی ہمیں معلوم ہوا کہ اسرار جامعی صاحب چند مجبوریوں کی وجہ سے نہیں آ سکے۔ اور شفیع مشہدی صاحب نے
گیا اسٹیشن سے نیلاچل اکسپریس سے روانگی کے انتظامات کئے تھے لیکن چونکہ نیلاچل اکسپریس کینسل ہو چکی تھی اس
لئے موصوف کے آنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ ان دو کے علاوہ ہمارے تیسرے متوقع مہمان جناب مسٹر لکھنوی بھی تشریف
نہیں لائے، ممکن ہے آپ بھی نیلاچل کے نہ چلنے کا شکار ہوئے ہوں۔

بہر حال جاہل شناسی کے لئے جوہر صاحب نے امداد کا دعوہ کیا کہ موصوف کافی مردم شناس ہیں۔ پھر میں
اپنے گھر چلا آیا کیونکہ رات بھر بغیر اطلاع کے گھر سے غائب رہنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا اور میری اکلوتی بیگم نے
میری تلاش میں صبح ہونے سے پہلے ہی ہرکارے روانہ کر دئیے تھے۔ اور انہی میں سے ایک میرے عزیز دوست
مظہر عزیز نے مجھے شعراء کی قیام گاہ کے قریب جا لیا تھا اور سیدھے گھر کی طرف ہانک دیا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ
جناب جاہل سلطانپوری کی ٹیلی پیتھی نے کام کیا، آپ کی ٹرین ذرا جلدی آ گئی اور اس سے پہلے کہ آذر اور جوہر صاحب
ادھر ہو کر دوبارہ اسٹیشن جاتے موصوف خود ہی آذر کے دولت کدے پر پہنچ گئے اور ہمیں شرمندہ ہونا پڑا۔

ایسٹ کوسٹ اکسپریس جو صبح ۷ بجے آتی ہے اطلاع ملی کہ ۲ بجے دن میں آ رہی ہے۔ چنانچہ آذر اسٹیشن
گئے اور ریلوے والوں کے انتہائی ممنون ہوئے کہ صبح ۷ بجے آنے والی ٹرین بالآخر اسی روز ۴ بجے شام کو ہمارے
مہمانوں جناب لوگس حیدر آبادی، جناب گڑبڑ حیدر آبادی اور جناب پاگل عادل آبادی کو لے کر آ گئی۔ اگر یہ ٹرین
دوسرے دن بھی آتی تو ہم کیا کر لیتے۔ ہاں ہمارا مشاعرہ البتہ ان تین گراں قدر شاعروں سے محروم ہو جاتا۔ اب ہمارے مہمانوں
یا ٹرین کے ہزاروں مسافروں کو ٹرین کے ۹ گھنٹے لیٹ ہونے کی وجہ سے کتنی تکلیف ہوئی اس سے ریلوے والوں کو
کوئی سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ یہ تو جمہوریت کا زمانہ ہے۔

۵ بجے شام کے قریب جناب ناظم انصاری بھی ناگپور سے تشریف ... چونکہ ... خود ہی علم نہیں
کہ کس راستے سے اور کن کن سواریوں سے کٹک پہنچنا ہے اس لئے نہیں کیا ... لیکن یہ مجاہدانِ ادب،
یہ سخن کے پروانے تو بس پہنچ جاتے ہیں چاہے ٹرین کینسل ہو اور کنڈکٹر ... بتانی پڑے یا ٹرینیں بدلنی
پڑیں اور صبح کے بھولے شام کو پہنچیں۔ چنانچہ موصوف بھی کہیں ٹرین ... بس سے پھر رکشہ سے شام تک
کٹک پہنچ گئے۔ اور اب ہم لوگوں کو یقین ہو گیا کہ جشنِ ظرافت منعقد ہو کر رہے گا۔ اور ہم اہلِ کٹک
اتفاق کا نشانہ نہ بنیں گے۔

بزمِ سخن اڑیسہ، کٹک کے چند سرپھرے اراکین جو ایسے مشاعروں وغیرہ کو آرگنائز کرتے ہیں ...
بن تھا کہ بزم کے انتہائی اہم عہدہ داران کی جانب سے حسبِ معمول کوئی تعاون نہ مل سکے گا۔ چنانچہ ...
سلسلے ایک جشنِ ظرافت کمیٹی کی تشکیل کی گئی تھی۔ اور خدا کا شکر ہے کہ کمیٹی کے صدر نشین جناب محمد ... صاحب
وکیٹشدلے حتی الامکان ہمیں کافی تعاون دیا۔ کمیٹی کے خازن جناب رشمی کانت پاریکھ راہی صاحب اپنی چند مجبوریوں
کی وجہ سے اس سرگرمی سے حصہ نہ لے سکے جس کی ان سے امید تھی۔ لیکن موصوف نے اپنے فرائض کو بہر حال نبھایا۔ یہ
بھی بد قسمتی تھی کہ ہمارے سرپرستوں میں سے زیادہ تر یا تو کٹک سے باہر تھے یا کٹک میں ہی انھیں اتنی مصروفیت دیا۔
مصروفیت تھی کہ وہ مشاعرہ میں بھی شریک نہ ہو سکے۔ جناب واجد حبیب ستار اور جناب ڈاکٹر مشتاق علی کا

مکمل تعاون ہمیں حاصل رہا۔ اور جناب کھٹا سندر داس، جناب ڈاکٹر سیف اللہ اور جناب محمد عبدالرزاق کا بھی جزوی تعاون مل سکا کیونکہ یہ حضرات مصروفیت کے باوجود جشن ظرافت کمیٹی کی کارکردگی میں دلچسپی لیتے رہے۔ کارکنان میں بزم سخن کے سکریٹری جناب خالد رحیم نے سب سے زیادہ تعاون دیا۔ خود تو خود اپنے والد صاحب اور چھوٹے بھائی کو بھی مسلسل زحمت دیتے رہے۔ جناب محمد عبدالخالق صاحب ادریس بانکے اور مسلم یوتھس کلچرل ایسوسی ایشن (MYCA) کٹک کی جانب سے بھی ہمیں بہت کچھ تعاون ملا۔ جناب اسحاق خاں صاحب بھی اپنی مجبوریوں کے سبب ہمیں زیادہ وقت نہ دے سکے۔ لیکن اس کے باوجود جو وقت دیا اس کے لئے موصوف شکریہ کے مستحق ہیں۔ جناب حفیظ اللہ نیولپوری صاحب صدر شعبہ اردو بھدرک کالج، بھدرک سے ۱۰۰ کلومیٹر کی مسافت طے کرکے اپنے اسکوٹر پر ۹ مئی کی شب میں ہی آگئے تھے۔ اور ہر طرح کے تعاون کے لئے ہمہ وقت کمربستہ رہے۔ ان حضرات کے علاوہ .... رہے نام اللہ کا!۔

(پابندیٔ وقت کے لحاظ سے)

ہندوستانی وقت سے ۷ بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ جی ہاں پٹنہ اور حیدرآباد والوں کی طرح ہم نے اس اکیلے مشاعرہ کا نام ضرور جشن ظرافت رکھا تھا لیکن نہ کوئی سمینار ہوا نہ بزم لطیفہ اور نہ نثری نشست۔ (اگر ایک آدمی پر مشتمل انکوائری بورڈ یا انکوائری کمیشن بن سکتا ہے تو صرف مشاعرہ پر مشتمل جشن ظرافت کیوں نہیں ہوسکتا) مشاعرہ کی صدارت جناب مجتبیٰ حسین صاحب نے کی۔ مشاعروں میں مہمان خصوصی اور اعزازی مہمان کا رواج اور کہیں ہو یا نہ ہو کٹک میں ہے۔ چنانچہ ہمارے مہمان خصوصی تھے جناب سردار سنتوکھ سنگھ صاحب جو کسی مجبوری کے تحت تشریف نہ لاسکے لیکن خوش قسمتی سے ہمیں نعم البدل مل گیا اور جناب سردار گیان سنگھ صاحب نے مہمان خصوصی کی مسند سنبھال کر محفل کو زینت بخشی۔ ہمارے اعزازی مہمان تھے درویش صورت درویش سیرت اڑیا زبان کے مشہور طنز و مزاح نگار جناب فتورا نند صاحب۔ اور اس جشن ظرافت کی نظامت کر رہے تھے جناب حفیظ اللہ نیولپوری صاحب۔

پہلے حفیظ اللہ نیولپوری صاحب نے مہمانوں کا مختصر تعارف پیش کیا۔ اس کے بعد جناب صدر جناب مجتبیٰ حسین صاحب نے صدارتی خطبہ پڑھا۔ صدارتی خطبہ کیا تھا دہلی سے کٹک تک کا مختصر سا سفرنامہ تھا:

گرمی کا موسم، یہ طویل سفر (اردو میں بھی، انگریزی میں بھی[۱]) ریلوے اور اس کے حکام کی ستم ظریفیاں ——
جی ہاں دوسروں کے لئے ستم گری ہمیں تو ستم ظریفی ہی لگی۔ کیونکہ ؎

ذکر ایسی جرنی[۲] کا اور پھر بیاں ان کا

بہرحال سفر کی صعوبتوں کے قائل تو ہم پہلے بھی تھے اور مجتبیٰ صاحب کے خلوص کے بھی۔ لیکن خطبۂ صدارت سن کر جناب صدر کے خلوص کے سبھی قائل ہوگئے۔

اس کے بعد ہمارے اعزازی مہمان جناب فتورا نند صاحب نے اپنی مختصر سی تقریر میں ایسے اجتماعات کو سراہا اور اردو و اڑیا کے باہمی تعاون اور ایک زبان سے دوسری زبان میں تراجم کئے جانے کے سلسلے پر زور دیا۔

مشاعرہ کا آغاز سب سے کم عمر مہمان شاعر جناب جاہل سلطانپوری کے کلام سے ہوا۔ اور اس کے بعد مقامی د

۱۔ SUFFER　　۲۔ JOURNEY

مہمان شعراء کا یہ گنگا جمنی رنگا رنگ مشاعرہ چلتا رہا۔ لوگ محظوظ ہوتے رہے۔ جناب ناظم انصاری نے جب اپنی نظم "ٹانگ اٹھایا مت کر" شروع کی تو کٹک کے کچھ نوجوانوں کو خیال ہوا کہ موصوف نے یہ نظم بے سبب کیوں شروع کر دی۔ چنانچہ ٹیپ (TAPE) کرنے کے سلسلے سے تھوڑا ہنگامہ ہوا اور ناظم صاحب نے اپنے مخصوص ترنم میں " ٹانگ اٹھایا مت کر" کی تکرار شروع کر دی۔ اور لوگوں نے اپنی اپنی ٹانگیں واپس گھسیٹ لیں۔ مشاعرہ رات کے ساڑھے گیارہ بجے تک کامیابی سے چلتا رہا اور اکثر شعراء کو خصوصاً مہمان شعراء کو دوبارہ سہ بارہ سنا گیا۔ پھر بھی سامعین سے ایک اور ایک اور کی آواز آتی رہی۔ مقامی شعراء میں جناب ادریس بانکے، فرحت زیدی، خالد رحیم، اسماعیل آذر اور بزرگ شعراء جناب میر اعظم علی جوکر اور قادر شریف قادر صاحبان نے مزاحیہ کلام پیش کیا۔ مشاعرہ کے آخری دور میں سامعین کے اصرار پر جناب مجتبیٰ حسین صاحب نے اپنا مضمون " ریلوے منسٹر مسافر بن گئے " سنایا۔ مشاعرہ میں مضمون سننے کا کٹک والوں کے لئے یہ پہلا اتفاق تھا لیکن مضمون سنتے وقت سامعین یہ بھول گئے تھے کہ وہ مشاعرہ میں بیٹھے ہیں یا شام افسانہ میں۔ مجتبیٰ صاحب مضمون پڑھتے رہے اور سامعین محظوظ ہوتے رہے۔ مجتبیٰ صاحب اگر یہ مضمون نہ سناتے تو شاید مشاعرہ کی یہ محفل کچھ پھیکی رہ جاتی۔

۱۱ مئی کی شام کو ۷ بجے اُڑیا ادب کی طنز و مزاح کی انجمن سرس ساہتیہ سمیتی کٹک کی جانب سے جناب مجتبیٰ حسین صاحب کو ایک اعزازیہ دیا گیا۔ جس میں موصوف کو " سرس رتن " کا خطاب پیش کیا گیا۔ اس تقریب کی صدارت ڈاکٹر شری رام داس نے کی اور مجتبیٰ صاحب کے ۲۱ مضامین کے اُڑیا ترجمہ پر مشتمل کتاب کا اجرا کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ " ہندوستان کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں شری مجتبیٰ حسین ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں"۔ انھوں نے مزید کہا کہ " اگرچہ آپ اُردو زبان کے ادیب ہیں لیکن اُڑیا زبان میں آپ کے مضامین کے تراجم کی اشاعت کے بعد ہم آپ کو اُڑیا زبان کا ادیب سمجھنے لگے ہیں"۔ جناب مجتبیٰ حسین صاحب کے مضامین کا یہ اُڑیا ترجمہ جناب اسماعیل آذر اور جناب فتورا نند صاحب کی مشترکہ مساعی جمیلہ کا نتیجہ ہے۔ اپنی جوابی تقریر میں جناب مجتبیٰ صاحب نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ " اُردو کے مزاح نگار کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اعزاز انھیں نہیں اُردو کو بخشا گیا ہے"۔ سامعین کے اصرار پر مجتبیٰ حسین صاحب نے اپنے مضمون " مہمان " کا ایک پیراگراف سنایا اور اس کے بعد اسی مضمون کا اُڑیا ترجمہ پیش کیا گیا۔ آخر میں " مہمان " کا ڈرامائی روپ جو جناب فتورا نند صاحب کی کاوش قلم کا نتیجہ تھا اُڑیا زبان میں پیش کیا گیا اور محفل اختتام پذیر ہوئی۔

اگرچہ ہم کٹک والے حیدرآباد اور پٹنہ کے معیار کا جشن ظرافت منانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے، پھر بھی ہمیں شرمندگی ہے کہ ہم اپنے مہمانوں کی تواضع چند مجبوریوں کے باعث اپنی خواہش کے مطابق نہ کر سکے۔ اور پہلی بار اس روایت شکنی کے لئے ہمیں افسوس بھی ہوا اور شرمندگی بھی لیکن یہ شامیں اہل کٹک کے لئے یادگار شامیں ثابت ہوئیں اور امید ہے کہ ایسی شاموں (یا شبوں) کا انعقاد ہم پھر کریں گے اور کرتے رہیں گے۔

قلمی معاونین سے درخواست ہے کہ مضامین صاف و خوش خط اور صفحے کے ایک جانب لکھیں۔

ترجمہ ۔ کالیکا پرشاد بی۔اے، بی ایڈ

بے ڈھب بنارسی

گنگا جانے کی سمجھ میں بہت نہ تھی حالاں کہ ایک پنڈت نے مجھ سے کہا تھا کہ پریاگ میں تروینی سنگم پر اشنان کرنے سے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں اور جنت میں جگہ ملتی ہے ۔ لوگوں اور گھر والوں نے بھی کہا ـــــــ "پریاگ نہ سہی ، کاشی میں ہی اشنان کر لو۔" اُس دن میں صبح کے وقت ایک ناول کا مطالعہ کر رہا تھا ۔ ہیرو کی محبوبہ نے صاف طور سے محبت کی درخواست ٹھکرا دی تھی۔ اب دیکھنا چاہتا تھا کہ ہیرو پہاڑ سے کود تا ہے ، ریل کی پٹری پر بیٹھتا ہے یا اس "سائنس کے دور" میں "پوٹاسیم سائنائیڈ" کا سہارا لیتا ہے ۔ اُسی وقت اعلان ہوا "گنگا جی چلنا ہے ۔"

ہیرو کو اُس کے حال پر چھوڑ کر میں نے جھولا سنبھالا ۔ اُس میں تولیہ اور دھوتی کس کر رکھی اور تمام لوگ گنگا جی چلے ۔ گنگا جی پیدل چلنا ہی اچھا لگتا ہے ۔ چلنے کے بعد جسم میں گرمی آجاتی ہے تب پانی میں ڈبکی لگانے میں بہت لطف آتا ہے ۔ تراوٹ کا بھی مزہ آتا ہے ۔ میں تھا ، میری بیوی تھی اور بچے تھے ۔ آج ہمارے دیش میں عورت مرد کی مساوات کا دعویٰ کیا جا رہا ہے ۔ حالاں کہ ہندو سماج نے بہت پہلے ہی بیوی اور شوہر کو مساوی مانا تھا ۔ سبھی مذہبی کام میاں بیوی مل کر انجام دیتے تھے ورنہ ثواب نہ ملتا تھا ۔

حصولِ ثواب کی خاطر ہم بھی چل پڑے ۔ بھیڑ بہت تھی ۔ جیسے جیسے بڑھتے جاتے تھے رفتار دھیمی ہوتی گئی جیسے کسی لنگڑے گھوڑے کی ہو ۔ کسی طرح اُس گھاٹ پر پہنچے ۔ جہاں ہم لوگ سدا نہاتے تھے ۔ کافی بھیڑ تھی ۔ گھاٹ کا نگران کار واقف کار تھا ۔ اس لئے وقت کچھ کم ہوئی ۔ پہلے بیوی اور بچوں نے اشنان کیا ۔ اُن لوگوں کو بٹھا کر میں اُونی صدری اتاری ، کُرتا اتارا اور سیڑھیوں سے اُترنے لگا ۔ پانی میں پہنچ گیا تب پھر کیا تھا ۔ اشنان کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا ۔ اُس سے بھی کم وقت جسم پونچھنے میں لگا ۔ کسی طرح جلدی جلدی دھوتی وغیرہ لئے اُوپر آئے ۔ بھیڑ اور بڑھ گئی تھی ۔ کپڑے سب ہاتھ میں اُٹھا لئے کہ باہر سڑک پر پہن لوں گا اور سب لوگ چل پڑے ۔

جب بھیڑ سے باہر نکلا تو رکشا کیا اور گھر روانہ ہوئے ۔ رکشے پر ہی جب کُرتا پہننے لگا تب ایسا معلوم ہوا کہ کُرتا میرا نہیں ہے

رنگ وہی ہے لیکن کسی دوسرے کپڑے کا بنا ہے۔ صدری بھی اسی رنگ کی ہے لیکن پرانی۔ اس وقت تک رکشا نئی سڑک تک پہنچ گیا۔ سوچا، ان لوگوں کو گھر پہنچا کر لوٹوں اور دیکھوں۔ شائد میرا کپڑا پڑا ہو اور اسے گھاٹ کے نگران کار کو دیدوں گا۔ اس کا مالک مل جائے تو وہ لوٹا دے گا۔

گھر پر بغور جب میں نے دیکھا تو پتہ چلا کہ کرتے میں سونے کے بٹن لگے ہیں۔ بٹن میں بڑے بڑے اُجلے نگینے بھی ہیں۔ شیشہ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ہیرا ہو۔ تب تو بیچارہ ضرور کھوجتا ہوگا۔ فوراً اُن کو لے جا کر لوٹانا چاہیئے۔ پھر دل میں آیا۔ اگر نہ لوٹایا جائے تو کیا قباحت ہے؟ ہاں ایمانداری تو نہ ہوگی۔ مگر میں نے جان بوجھ کر چوری تو نہیں کی۔ خدا ہی جانے کس کو کس طرح مدد کرتا ہے۔ شائد اللہ تعالیٰ نے اسی طرح سے مجھے دولت سے مالامال کرنے کا ڈھنگ نکالا ہو۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا کیا کرنا چاہیئے؟ ضرور اس میں بھگوان کی لیلا ہے۔ مجھے کسی طرح یہ ملنا تھا۔ اب جا کر لوٹانا مناسب ہے یا نہیں؟ دوسرا خیال بھی آیا۔ اگر یہ بٹن ہیرے کے ہیں تو کسی غریب کے نہیں ہو سکتے۔ اُسے ایسے قیمتی بٹن پہننے کا کیا حق ہے؟ جب دیش میں لاکھوں کروڑوں ننگے ہیں، بھوکے مر رہے ہیں۔ لوگ سونے اور ہیرے کے بٹن پہنتے ہیں۔ دیش، سماج اور انسانیت کے تئیں یہ غداری ہے، دھوکہ ہے اور نا انصافی ہے۔ کبھی نہیں لوٹانا چاہیئے۔

انہیں خیالات میں غرق میں کرسی سے اُٹھا اور ٹہلنے لگا۔ اِسے رکھ لینا کوئی گناہ نہ ہوگا۔

دل میں دوسرے خیالات بھی آئے۔ ابھی تو انجانے میں اُٹھا لایا۔ جان کر لاتا تو چوری ہوتی! میں نے فوراً منوسمرتی نکالی اور دیکھنے لگا چوری ہے کیا؟ یہ تو پتہ چلا کہ چوری نہیں کرنی چاہیئے لیکن چوری ہے کیا۔ اس کا پتہ نہیں لگا۔ اتنے میں کھانے کے لئے پکار ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد گھاٹ پر جانے کا ارادہ کیا۔ کھانے کے بعد سوچا اخبار پڑھ لوں تب چلوں۔ اخبار پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ چار بجے آنکھ کھلی۔

سڑک پر اخبار والا چلا رہا تھا —— " دشاشومیگھ گھاٹ پر پانچ ہزار کی چوری "

میں دوڑ کر اخبار لے آیا۔ پڑھا کہ —" دشاشومیگھ گھاٹ پر ایک اُچکا سیٹھ گھنڈو داس کا پانچ ہزار کے ہیرے کے بٹن لے بھاگا۔ جو کوئی اس کا پتہ دے گا اور بٹن دلا دے گا اُسے ایک ہزار روپے انعام "

اُچکا! بٹن تو میرے پاس ہیں۔ میں چور ہوں! مضامین لکھتا ہوں، کہانیاں لکھتا ہوں، نظمیں لکھتا ہوں۔ سرسوتی کا مجاور، چور! کسی طرح اسے لوٹانا چاہیئے۔ تھانے میں بھی لوٹایا جا سکتا ہے۔ کل نام چھپے گا کہ فلاں آدمی نے بھول سے بٹن لے لیا تھا لوٹا دیا۔ عنوان ہوگا —— " ایمانداری کی شاندار مثال: آج بھی ست یگ ہے۔" وغیرہ

کپڑے لے کر میں تھانے کی طرف چلا۔ سچائی اور نیکی کے جذبات سے دل بھرا تھا جیسے کریلے کی کلونجی میں مسالہ بھرا رہتا ہے۔ ایمانداری کی سند اور ایک ہزار روپے انعام! اس طرح خدا نیک چال چلن کا انعام دیتا ہے۔ گھر بیٹھے بغیر محنت! کون کہتا ہے خدا کا صرف تخیل ہے؟ وہ ضرور ہمارے اعمال کو دیکھتا ہے۔

تھانے میں پہنچا۔ تھانیدار سے کہلایا کہ آج جو چوری ہوئی ہے اس کے متعلق میں ملنا چاہتا ہوں۔ اندر بلوایا گیا۔ تھانیدار صاحب کے ساتھ ایک صاحب اور بیٹھے تھے۔ چار من کا جسم، پکے امرود کا رنگ، کھچڑی بال، چمکتی آنکھیں۔ میں نے کہا۔ " داروغہ جی، اُس بٹن کا پتہ مجھے مل گیا۔ " داروغہ صاحب اُچھل پڑے! چلائے۔ " مل گیا! کیسے؟ کہاں ہے؟ "

پھر کچھ سستا کر بولے ۔ " دیکھئے سیٹھ گھنشیام داس آپ ہی ہیں ۔"

میں نے اوپر انہیں سلام کیا اور سارا واقعہ اُن کے گوش گذار کر دیا۔ سیٹھ جی کرسی سے اُٹھ گئے اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے دونوں ہاتھوں سے ایسا دبایا کہ پیٹ کا کھانا منہ تک آتے بال بال بچ گیا۔ بولے ۔!

" چلئے بس ہمارے ساتھ ! واہ واہ ! آپ جیسے شریف آنریبل انسان کی بدولت یہ دنیا قائم ہے ۔"

تھانیدار صاحب نے کہا ۔ " رپورٹ لکھنی ہوگی ۔ قاعدہ کے مطابق سب کارروائی کرنی ہوگی۔ کچھ اور شک وشبہ بھی ہوسکتا ہے؟"
سیٹھ جی بولے ۔ " ارے داروغہ صاحب آپ بھی کیا کہتے ہیں ؟ اس میں شک کی کیا بات ہے ؟ ایسے آدمی پر شک ؟ اُس سند یافتہ انسان پر ؟ کہاں ہے وہ بٹن ؟ چلئے میرے ساتھ ۔ داروغہ جی آپ لکھ لیجئے گا جو مناسب ہو۔"

وہ مجھے باہر لائے ۔ ایک رکشا پر آپ بیٹھے۔ دوسرے پر میں بیٹھا۔ جس دھرم شالا میں وہ ٹھہرے تھے وہاں مجھے لے گئے۔ نوکر سے دو پیڑے منگواے۔ بولے ۔ " لیجئے ضرور کھائیے ۔"

پیڑے کھا لینے کے بعد میں نے کُرتا اُن کے حوالے کیا۔ انعام کے متعلق کچھ مجھ سے کہتے نہیں بنتا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد خود بولے۔
" آپ کو ایک ہزار دینے ہیں ! یہاں تو میرے روپے خرچ ہو گئے ہیں ۔ آپ اپنا پتہ لکھ دیجئے ۔ ہاں یہ بتائیے۔چیک بھیج دوں یا ڈرافٹ یا منی آرڈر ؟ "

میں نے پتہ لکھ دیا۔ بولا ۔ " جیسی آپ کو سہولت ہو۔" پھر میں چلا آیا ۔
لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پتہ سیٹھ جی کی " غیر معمولی احتیاط " کے باعث کھو گیا ۔

مولانا محمد علی کا ظریفانہ مزاج

نظر برنی

مولانا محمد علی نہ صرف ایک عظیم قومی رہنما، صاحب طرز صحافی، شعلہ بیان خطیب اور دردمند شاعر ہی تھے بلکہ ان کے مزاج میں بلا کی ظرافت بھی تھی۔ وہ مناسب بات کو وقت پر کہنے میں تامل نہیں کرتے تھے۔ ان کی ظرافت میں خلوص اور دیانت تھی۔ ان کی باتیں بعض اوقات محفل کو زعفران زار بناتی تھیں اور کبھی بعض احباب کے دلوں میں انقباض پیدا کر دیتی تھیں۔ ان کے طنز و ظرافت میں توازن اور شائستگی ہوتی تھی اور اپنے فقروں کے معیار کو گرنے نہیں دیتے تھے۔ چونکہ طنز کی چوٹ برداشت کرنے کے لئے حوصلہ اور وسعت درکار ہے اس لئے بعض لوگ مولانا سے خفا ہو جاتے تھے۔ ان میں ان کے قریبی احباب بھی شامل تھے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی آپ بیتی میں کہیں لکھا ہے کہ مولانا محمد علی کے نکاہی اور طنزی جنون نے بہت سے دوستوں کو دشمن بنا لیا۔

اس مضمون میں مولانا محمد علی کے بعض لطائف و ظرائف کے نمونے پیش کئے گئے ہیں جو ان کی بعض تقاریر اور تحریروں سے ماخوذ ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوگا کہ مولانا کے طنز و ظرافت کے نمونوں میں رعایت لفظی بھی ہے اور اصلاحی طنز کی چاشنی بھی فقروں کی برجستگی بھی موجود ہے اور حقائق کی آمیزش بھی۔

"اچھے ہو؟"

مولانا محمد علی جون ۱۹۲۸ء میں معالجے کی غرض سے ولایت جا رہے تھے۔ بحری جہاز کا سفر کرنے سے پیشتر طبی معائنہ ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو بھی ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ جب وہ جہاز کے مقررہ ڈاکٹر کے پاس پہونچے تو اس نے مولانا سے پوچھا: "اچھے ہو؟" محمد علی نے کہا "اگر اچھا ہوتا تو ولایت کیوں جاتا، بار دولی نہ گیا ہوتا۔!"

"داخل خارج"

نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد مولانا محمد علی کو بے حد مایوسی ہوئی۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ کانگریس مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کرنا چاہتی تو انھوں نے یہ شعر پڑھا۔

یاں قافلہ لٹتا ہے بس اب یاں سے چل اے دل
تو آپ ہی کہہ دے گا کہ منزل تو نہیں یہ

اور انھوں نے کانگریس سے علاحدگی اختیار کرلی۔ کے بعض دوستوں نے اصرار کیا کہ وہ پھر کانگریس میں آجائیں لیکن وہ ٹالتے رہے اور وہ ہمیشہ اس بات کا جواب دینے سے کتراتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ملا کر جواب دیا:

"یہ بار بار کا داخل خارج مجھے پسند نہیں"۔

جالی کے پھندے

مصر میں پردہ کے نام پر جو مذاق کیا جاتا ہے وہ وہاں کی عورتوں کے نام نہاد نقاب کے مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسے مولانا کی زبان سے ملاحظہ فرمائیے۔

"جو عورتیں اب تک برقعہ پوشس ہیں، ان کی نقاب بھی اتنی باریک ہے کہ سارا چہرہ نظر آتا ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حسن کو دوبالا کر دیتا ہے۔ جالی کے پھندے، عشاق کو گرفتار کرنے میں اچھی طرح کام دے سکتے ہیں"۔

زنانی مجلس

مولانا محمد علی کبھی کبھار خالص عربی لباس پہنا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ اسی لباس میں یعنی عبا اور عقال کے ساتھ اسمبلی ہال تشریف لے گئے۔ اتفاق سے پنڈت مدن موہن مالویہ سے ملاقات ہوگئی۔ انھوں نے فرمایا: "اخاہ، آپ ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ بیگم صاحبہ بھوپال تشریف لا رہی ہیں"۔

محمد علی نے فوراً جواب دیا "بیگم صاحبہ بھوپال ایسی شیر دل خاتون ہیں کہ اس زنانی مجلس (اسمبلی) میں آنا پسند نہیں کرتیں"۔

خر بوزہ

مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم ایک لطیفہ بیان کرتے ہیں:
حکیم اجمل خاں مرحوم نے ایک بار خلافت کمیٹی کی مجلس رکنی کے جلسے کے موقع پر رہنمایانِ خلافت کو اپنے ہاں مدعو فرمایا، محمد علی بھی تھے۔ دوسرے رہنمایان خلافت بھی اور بعض احرار پنجاب بھی۔ حکیم صاحب نے مہمانوں کی تربوز سے تواضع فرمائی۔ تمام حاضرین نے اس دعوت شیراز سے لطف اٹھایا۔ لوگ تربوز کی تعریف کرنے لگے اور اسے مزے لے لے کر کھانے لگے۔ ایک صاحب نے فرمایا۔

"دہلی کے تربوز بہت اچھے ہوتے ہیں"

محمد علی نے اپنے ایک پنجابی دوست اور لیڈر کی طرف اشارہ کرکے فرمایا: لیکن پنجاب کے "خر" بوزے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں"۔ اس پر ایک زناٹے دار قہقہہ پڑا۔

"موجوں کا ناچ"

مولانا محمد علی ۶ر جون ۱۹۲۸ء کو ایک مکتوب میں مولانا دریابادی مرحوم کو جہاز اور سمندر کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں"

"آج شب کے ساڑھے آٹھ بجے سے جب سے یہ خط شروع کیا گیا ہے۔ جہاز پر مردوں اور عورتوں کا ناچ ہو رہا ہے۔ حالانکہ کل شب کو ان میں سے اکثر خاموش پڑے تھے اور ناچ ہو رہا تھا تو سمندر کی موجوں کا"۔

سچ ناک

۱۹۲۵ء میں ملک کے بعض اخبارات میں گنبدِ خضرا پر بمباری کی جھوٹی خبر شائع ہوئی۔ لاہور کے ایک اخبار "سیاست" نے جس کے ایڈیٹر سید حبیب مرحوم تھے، اس خبر کا ذکر کیا اور اس گولہ باری کو کہیں "ہولناک" بتایا کہیں "خوف ناک" کہیں "درد ناک" اور کہیں "الم ناک" قرار دیا۔

محمد علی نے "سیاست" کی اس "افسوس ناک" روش پر اپنے اخبار "ہمدرد" میں مورخہ ۲ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو تبصرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا:

"افسوس ان خبروں میں سے "سچ ناک" ایک بھی نہ نکلی اور جتنی نکلیں "جھوٹ ناک" نکلیں "لغو ناک" نکلیں "افترا ناک" نکلیں۔

شوہر ایک محفل میں یہ بحث گرم تھی کہ تینوں بھائی جو ود شاعر ہیں۔ ذوالفقار علی گوہرؔ، محمد علی جوہرؔ اور شوکت علی ؟

محمد علی نے برجستہ جواب دیا " ان کے لیے ـــــ (شوکت علی) بہترین ہم قافیہ تخلص "شوہر" ہی ہو سکتا ہے یہ سن کر حاضرینِ محفل پہ ایک کیفیت طاری ہوگئی اور قہقہہ پھوٹ پڑا۔

دوستی کی ریاضی میر محفوظ علی بدایونی، مولانا محمد علی کے خاص دوستوں میں تھے۔ مولانا نے دوستی کی ریاضی بیان کرتے ہوئے ایک مکتوب میں تحریر فرمایا :

" دوستی کی ریاضی بھی عجیب ہے خوشی کو دوگنا اور رنج کو آدھا کر دیتی ہے "

پُرلطف مشورہ لندن میں محمد علی نے علاج شروع کر دیا۔ ذیابیطس کا بہترین علاج فاقہ سے ہوتا ہے۔ محمد علی کو بھی فاقہ کرایا گیا، فائدہ ہوا ـــ اپنے عزیز ترین دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کو ایک خط میں لندن سے لکھتے ہیں ۔

" میں شوکت صاحب کو بھی لکھنے والا ہوں ۔ وہ بھی اب پھلوں پہ گذارا کیا کریں اور جس طرح میں ورزشوں میں لمبی لمبی سانسیں لیا کرتا ہوں، وہ بھی لیا کریں ۔

میرا وزن سات سیر گھٹ چکا ہے ۔ کمر چار انچ کم ہوگئی ہے۔ ان کا (شوکت کا) وزن تو یقیناً ۲۰ ـ ۲۵ سیر گھٹ جائے گا۔ اور وہ تھوڑے ہی عرصہ میں . .

کمر پتلی اور صراحی دار گردن

کے مصداق ہو جائیں گے ! کمر پتلی اور صراحی دار گردن کے ساتھ مولانا شوکت علی کے بھاری بھرکم جسم کا تصور کیجئے ۔ عجیب جنت نگاہ منظر آنکھوں کے سامنے آجائیگا۔

شریفے علی گڑھ سے مولانا محمد علی کو والہانہ شیفتگی تھی۔ وہ اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے ایک دوست کے مکان پر قیام کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علی گڑھ کی برسرِ اقتدار پارٹی صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، ڈاکٹر ضیاءالدین احمد اور شیخ عبداللہ وغیرہ سے ان کے بڑے معرکے کے مقابلے ہو رہے تھے ۔

شریفوں کا محمد علی کو بڑا شوق تھا۔ اتفاق سے اسی وقت صاحب خانہ کے ہاں شریفے آئے ۔ انھوں نے مولانا کو اس کی پیشکش کی۔ انھوں نے یہ پیشکش قبول کی اور باہر صحن میں جہاں اور احباب بھی بیٹھے ہوئے تھے بڑی بے تکلفی سے شریفے کھانے لگے۔ وہ شریفے کھاتے جاتے تھے اور بیج وہیں زمین پر پھینکتے جاتے تھے ـــ

ایک صاحب نے (جو مخالف پارٹی سے تعلق رکھتے تھے) فرمایا : " تم شریفے کھا کھا کر بیج یہیں پھینک رہے ہو، یہ کیا حرکت ہے ؟"

محمد علی نے کہا ، " اس لیئے کہ شاید یہ اُگ آئیں ، علی گڑھ میں "شریفوں" کی بڑی کمی ہے "

وہ صاحب تو دم بخود ہو گئے اور حاضرین کا یہ حال کہ ہنسی کے مارے بے حال ہونے لگے ۔

خرافات

(مراسلے)

مکرمی! آداب

"شگوفہ" شمارہ مئی ۱۹۸۰ء میں کنہیا لال کپور پر نمبر نکالنے کی خبر پڑھ کر طبیعت پھڑک اٹھی۔ اللہ برکت دے۔

رام لعل' نابھوی

محترم مصطفےٰ بھائی! سلام مسنون

کنہیا لال کپور نمبر کی اطلاع خوش کن ہے۔ ابھی دوسرے رسائل والوں نے پہل نہیں کی ہے۔ وہ رسائل بھی نہیں' جن کے یہاں کپور مستقل لکھتے رہے۔ بہر حال کپور نمبر کی کامیابی کے لیئے دعا گو ہوں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

● تازہ شمارہ میں "بزدکھاوا" بے حد پسند آیا۔ ہر ماہ شگوفہ کے ذریعہ اتنی ساری شگفتگی اور دلچسپیاں مہیا کرنے پر مبارکباد قبول ہو۔ اگر دوسری زبانوں کے تراجم بھی شامل کئے جائیں تو بہتر ہوگا۔

شوکت حسین' سکندرآباد

● ابھی ابھی "شگوفہ" میرے ہاتھ لگا ہے۔ اور اسی شگوفے کے آخری صفحہ میں ملک کے نامور مزاح نگار کنہیا لال کپور کی افسوسناک خبر سن کر دل کو جھٹکا سا لگا۔ ایک نامور مزاح نگار سے ہم سب محروم ہوگئے۔۔۔۔

ہندوستان میں یہ رسالہ ایسا ہے جو ہر مہینے برابر پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ شگوفہ کی طباعت اور کتابت بھی بہت عمدہ طریقے سے کی جاتی ہے۔ یہ سب آپ لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اسی طرح ترقی عطا فرمائیں (آمین)

محمود انصاری' ناگپور

● ایک ماہ اپنے وطن بیجاپور میں رہ کر واپس آگیا ہوں اس دوران بھارت چند کھنہ شکسٹ بک (سوونیر) اور کل بھارت چند کھنہ آسان گائیڈ (شگوفہ، مئی) مل گئے۔ واقعتاً ابھرتے اور گمنام مزاح نگاروں کو منظر عام پر لانے کا سہرا آپ کے سر جاتا ہے جس کا اعتراف بھارت چند کھنہ نے بروقت کیا۔ میری طرف سے آپ کو مبارکباد اور نیک خواہشات۔ سوونیر اور مئی کے شمارہ میں کھنہ صاحب پر صاحبان بارلیش و بے تنکہ (پرویز یداللہ مہدی، مسیح انجم) کے برجستہ اور جاندار خاکے لائق ستائش ہیں، خدا کرے مزاح نگاری کا قافلہ یوں ہی رواں دواں رہے آمین

رؤف خوشتر' گلبرگہ

● شگوفہ کے سارے مضامین بہترین طنز و مزاح کا رنگ لیئے ہوئے تھے اس کے لیئے آپ کو مبارکباد۔ اس دور میں تفریحی ادب جو ذہنی تفکرات کو مٹادے' اہمیت رکھتا ہے۔

طاہر صدیقی' حیدرآباد

مکرمی جناب ایڈیٹر شگوفہ تسلیم، مقامی اردو لائبریری سے "شگوفہ" کا ایک شمارہ نظر نواز ہوا۔ اول تو یہ اندازہ ہوا کہ شاید بچوں کے لیئے یہ صحیفہ کا اجراء ہوا ہے مگر جب زیر مطالعہ رہا تو معلوم ہوا کہ شگوفہ میں آپ نے کئی گل کھلائے جس سے نہ صرف طبیعت باغ باغ ہوئی بلکہ دل کے گوشہ سے دعا نکلی کہ اللہ تعالیٰ شگوفہ کی عمر دراز کرے اور آپ کے قلم و دماغ کو طاقت دے کہ شگوفہ کی خوشبو سے دور دور تک فضا معطر ہو اور سب کو اس سے سکون و مسرت حاصل ہو۔ حضرت مرحوم سلیمان خطیب صاحب کی وفات سے دنیا میں بیشک جو خلاء پیدا ہوا وہ مشکل سے پر ہوسکے گا۔

نزاکت فیضی ملکاپور ضلع بلڈانہ (مہاراشٹرا)

15822/
SHUGOOFA
13 Copy 6 31 Bachelor Quarters, M.J. Market, Hyderabad 1 June 1980 Phone 57716

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

فون: 37716

خط و کتابت کا پتہ: 31 - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

جلد: ۱۳

شمارہ: ۷

جولائی ۱۹۸۰ء

سالانہ: ۲۲ روپے

لائبریریوں سے: ۲۵ روپے

بیرون ہند: (۳۵) شلنگ

قیمت (۲) روپے

طباعت:

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

چار کمان، حیدرآباد - ۲

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چورن

(نظمیں)

ماہنامہ **شگوفہ** کا

نامور طنز و مزاح نگار کنہیا لال کپور کو

خراج عقیدت

کنہیا لال کپور نمبر

مہمان مدیر : جناب خواجہ عبدالغفور

★ کپور کے مزاحیہ کالم ، مضامین ، باغ و بہار خطوط ، پیروڈیاں اور دوسری تحریروں کا دلچسپ انتخاب

★ کپور کی شخصیت اور فن پر پُرمغز مضامین ★ چند یادگار تصاویر

تفصیلات کا آئندہ شمارہ میں اعلان ہوگا

وجاہت علی سندیلوی

چچا گھوم پھر

مرزا بودم بیگ سارے محلے میں "چچا گھوم پھر" کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کا یہ لقب ان کی
ں خصوصیت کی طرف اشارہ تھا کہ وہ ہر بات کو اتنا گھما پھرا کر کہتے کہ سننے والوں کا سر چکرا جاتا۔ وہ زیادہ سے
ادہ الفاظ میں کم سے کم مطلب بیان کرتے بلکہ اکثر بیان ہی نہ کرتے اور ان کا مخاطب ان کی صورت سے بیزار ہونے
ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس سے بھی مایوس ہو جاتا۔

آدمی خلیق تھے۔ بات تو سیدھے منہ کرتے لیکن کبھی سیدھی بات نہ کرتے۔ مثلاً اگر کسی شامت کے مارے نے پوچھ دیا "آج کون سا دن ہے؟" تو وہ یوں جواب دیتے "دیکھئے پرسوں اتوار تھا، اب پرسوں سے سات دن بعد پھر اتوار آئے گا۔ اس حساب سے دو دن بعد جمعرات ہوگی۔ کل پیر تھا اور کل جو آنے والا ہے بدھ ہوگا۔ اس وجہ سے آج قاعدے سے تو منگل ہونا چاہیئے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ کوئی جنتری دیکھ لیں۔" اس کے بعد اگر سوال پوچھنے والا بھاگ کھڑا نہ ہوتا یا چکرا کر گر نہ پڑتا تو وہ یہ بھی بڑی تفصیل سے بتا دیتے کہ جنتری کہاں مل سکتی ہے؟ کون سی جنتری مستند سمجھی جاتی ہیں؟ وہ کہاں چھپتی ہیں؟ چھاپا خانہ کس نے ایجاد کیا تھا؟ کس قسم کے چھاپے خانوں میں کس قسم کے کاغذ استعمال ہوتے ہیں؟ ان کا بازار میں کیا بھاؤ ہے؟ جعلی نوٹ کس طرح چھاپے جاتے ہیں؟ اس جرم میں سب سے پہلا مقدمہ کس پر چلا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔

چچا گھوم پھر کی گفتگو کے وقت کچھ ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ اپنے الفاظ کی لاٹھی بے تحاشہ چلاتے ہوئے اپنے مطلب کا پیچھا کر رہے ہوں اور وہ کسی

ناشدنی دولتی مارنے والے گدھے کی طرح اِدھر اُدھر بھاگ رہا ہو۔ اتفاق سے کبھی تو وہ ان کی لاٹھی کی زد میں آجاتا اور کبھی اس کی دولتی سے وہ خود چاروں خانے چت ہوجاتے۔

ایک دفعہ ایک راہ گیر ان سے لالہ بھولومل کے مکان کا پتا پوچھ بیٹھا تھا۔ انھوں نے بڑی شفقت سے فوراً جواب دیا " دیکھئے آپ اپنی ناک کی سیدھ پر بہت سے مکانات دیکھ رہے ہیں انھیں میں سے آٹھ دس مکانات کے بعد ایک مکان لال حویلی ہے۔ اس کے پاس سے پچھم جوگلی ہیبت خاں کے پچھواڑے سے ہوتی ہوئی گندے نالے کے برابر سے گئی ہے اس پر کوئی دو تین سو قدم جاکر دکھن کی جانب مڑجایئے گا۔ آگے بڑھ کر آپ کو بھوندو حلوائی کی دوکان ملے گی۔ اس کے کتے سے ہوشیار رہیئے گا مگر وہ بھونکتا ہے کاٹتا نہیں۔ اس نسل کے سب کتوں کا یہی حال ہے۔ جی ہاں تو آپ کہاں تھے؟ بھوندو حلوائی کی دکان کے پاس! لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ اس سے چالیس پچاس قدم پیچھے ہٹ آیئے۔ یہاں آپ کو کئی گلیاں ملیں گی۔ دوسری یا تیسری گلی پہ آتر کر طرف گھوم جایئے گا۔ پھر آنکھ بند کر کے بھی چلتے چلتے آپ سبزی منڈی پہونچ جایئے گا۔ وہاں کوئی نہ کوئی جان پہچان کا آپ کو ضرور مل جائے گا وہ فوراً بتا دے گا کہ بھولومل کا مکان لال حویلی کے پورب میں ہے یا پچھم میں"

اس تقریر کے سننے کے بعد راہ گیر نے پاس ہی لگے نل کے نیچے کچھ دیر اپنے سر پہ پانی تریڑا اور پھر آگے بڑھنے کے بجائے اُلٹے پیروں گیا اور پھر کبھی اس کی صورت محلے میں کسی نے نہیں دیکھی۔

لوگ "چچا گھوم پھر" سے بات کرتے گھبراتے بلکہ کنائی کاٹتے۔ آخر میں تو یہ نوبت آگئی تھی کہ دور سے ان کی صورت دیکھتے ہی وہ لاحول پڑھتے اِدھر اُدھر ہوجاتے یا اپنے گھروں میں گھس کر دروازے بند کر لیتے اور چچا گھوم پھر سنسان سڑک پر کسی مرکھنے بیل کی طرح جھومتے ہوئے تن تنہا گذر جاتے اور کوئی شکار ان کے ہاتھ نہ آتا۔

اکثر وہ خود کسی کے گھر پہ پہونچ جاتے اور ہانک لگاتے " اجی شمبھو دیال جی آپ انسان میرا مطلب ہے کہ دو پاؤں پر کھڑے ہوتے والے جانور نہیں بلکہ بجلی کا کھبا ہیں یعنی پنشاخاں معلوم ہوتے ہیں۔ جی ہاں میرے بچپن میں بجلی کے کھمبے نہیں بلکہ پنشاخے ہوا کرتے۔ ایک دفعہ ایک بارات کے جلوس میں رمضانی باورچی کی دکان کے سامنے میرا ہاتھ بلکہ ہاتھ کی پانچ انگلیوں میں بیچ کی انگلی جو دوسری سب انگلیوں میں بڑی ہوتی ہے ایک پنشاخے سے جل گئی تھی۔ جی ہاں تو آپ پنشاخا اس وجہ سے دکھائی پڑتے ہیں کہ اس وقت نو بجنے میں اٹھارہ منٹ باقی ہیں۔ میں نے آج ہی ٹوما ٹائم سے جو ریڈیو پہ بجتا ہے اپنی جیبی گھڑی ملائی تھی اور وہ اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور آپ ابھی تک اپنے بستر یعنی لحاف اور گدے کے درمیان سے نہیں نکل پائے ہیں مطلب یہ ہے کہ غافل ہوکر بالکل ہی سو رہے ہیں۔"

شمبھو دیال جی فوراً ہی تیار ہو کر چچا گھوم پھر کے سامنے سے یہ کہتے ہوئے تیر کی طرح نکل جاتے ہیں — " آداب عرض ہے مرزا صاحب! معاف کیجئے گا آج اتوار کے روز دفتر میں سپرنٹنڈنٹ صاحب نے آٹھ ہی بجے بلایا تھا مجھے بڑی دیر ہوگئی ہے لہذا رُک نہیں سکتا" چچا ان کو قہر آلود نگاہوں سے ایسے تکتے رہ جاتے ہیں جیسے

ہاتھ میں آیا ہوا شکار چھوٹ جائے اور شمبھو دیال جی یہ جا وہ جا ۔ تو دو گیارہ ہوجاتے اور تھوڑی دیر کے بعد جب یقین ہوجاتا کہ وہ بلائے ناگہانی ٹل گئی ہوگی ، پچھلی گلی سے دبے پیروں آکر خود اپنے گھر میں کسی چور کی طرح پھر گھس جاتے۔

ایک دفعہ چچا گھوم پھر ایک انجان نائی کی دکان پر جا پہونچے تھے ۔ وہاں انھوں نے اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھائے تو نتیجہ بہت ناخوشگوار نکلا ۔ وہ بے چارا نہیں معلوم ان کی بے سروپا باتوں سے کیا کا کیا سمجھا اور ان کی چنگیز خانی چڑھی ہوئی مونچھوں پر ہاتھ صاف کر دیا ۔ چچا بہت اچھلے کودے لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا ۔ مجبوراً چودہ پندرہ دن کے لئے گھر میں گوشہ نشین ہوگئے ۔ محلے والوں نے کوشش کر کے نائی کا پتہ دریافت کیا اور اس کو جاکر بڑی شاباشی دی بلکہ بعضوں نے تو اس کے کارنامے کی بنا پر اس کی مستقل سرپرستی کا بیڑا اٹھالیا ۔ سنتے ہیں کہ اسی طرح اپنی اوٹ پٹانگ باتوں کی بدولت بہت دن ہوئے ایک دفعہ وہ ایک دندان ساز کے یہاں سے اپنی دُکھتی ہوئی دائیں داڑھ کے بجائے اچھی بھلی بائیں داڑھ نکلوا آئے تھے ۔

ایک دفعہ محلّے کے ایک زندہ دل بزرگ نے چچا گھوم پھر کو بہت دلچسپ سبق دیا ۔ چچا اپنے گھر کے قریب ایک دوکان کے سامنے کھڑے اپنے مخصوص انداز میں دکاندار کو کچھ اُلٹی سیدھی نصیحتیں کر رہے تھے ۔ اسی اثنا میں وہی بزرگ لپکتے جھپکتے آئے اور یوں گویا ہوئے " جناب مرزا لودم بیگ صاحب ! بعد ادائے آداب کے "گزارش یہ ہے کہ یہاں یہاں سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں ۔ ابھی ابھی یعنی گیارہ بج کر ساڑھے چالیس منٹ پر یعنی بارہ بجنے میں ساڑھے انیس منٹ کم پر جب میں آپ کے دولت کدے کے سامنے سے کہ وہ عین سڑک کے سامنے ہے گذر رہا تھا ، کیونکہ یہ میرا معمول ہے کہ میں اس سڑک پر اکثر گذرتا رہتا ہوں تو میں نے اپنی آنکھوں سے خود دیکھا ، واضح رہے کہ چالیس سال کا ہو جانے پر بھی میری بینائی میں آپ کی دعا سے ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا ہے کہ ایک عدد موٹے سیاہ کتّے نے کہ جس کی عمر تین سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی آپ کے باورچی خانے کے دروازے کو دھکّا دیا اور اس کے ایک پٹ بند رہ جانے کے باوجود دوسرا پٹ کھول کر اور غالباً آپ کی اجازت بغیر اس میں داخل ہوچکا ہے ۔"

چچا گھوم پھر نے شاید زندگی بھر پہلی سیدھی بات کی ۔ وہ بے اختیار ہو کر چیخے " اجی یہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا ؟ میرے شاہی ٹکڑے اور بالائی ! " چچا سر پہ پیر رکھ کر اپنے مکان کی طرف دوڑے لیکن کتّا گھوم پھر کر باتیں کرنے کا عادی نہیں تھا ۔ وہ اپنا کام پورا کر کے غائب ہوچکا تھا ۔

چچا آج کل ایک نوزائیدہ سیاسی پارٹی کے مقرر خاص بنے ہوئے سارے صوبے کا دورہ کر رہے ہیں اور واقعی "گھوم پھر" بن گئے ہیں ، اور ہمیں پارٹی سے زیادہ ان کے سامعین سے ہمدردی ہے ۔ اب سڑے ٹماٹر اور گندے انڈے بھی تو سستے نہیں ملتے ۔

■■

وہ زمانہ طفلی کا یاد کر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
میں کبھی تھا تیرا بھی ماسٹر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہ چرا کے مرغی پڑوس کی وہ اڑانا دعوتیں ٹھاٹ کی
مجھے یاد ہے مرے پارٹنر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مرا عشق اوٹ پٹانگ تھا ترا حسن تھا بڑا معتبر
ہوا جھگڑا بس اسی بات پر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
جسے اپنی خلوتِ خاص میں بے لطف پڑھتا تھا تو کبھی
وہ مری حکایتِ مختصر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
مرے دل پہ عشق کا دورہ جب کبھی جھکے پڑتا تھا ہمنشیں
تو ہی بن کے آتا تھا ڈاکٹر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو
تری بزم ناز میں بجتا تھا کبھی ڈنکا جس کے کمال کا
یہ وہی ہے ناظمِ باہنر تجھے یاد ہو کہ نہ یاد ہو

ناظم انصاری (ناگپور)

مزاحیہ سہرا

مبارک لے دولہا تجھ کو نکاحِ خوانی مبارک ہو
تیرے اُولیٰ کو اب یہ مصرعۂ ثانی مبارک ہو
تجھے دیوانۂ الفت یہ دیوانی مبارک ہو
مبارک زندگی بھر کی پریشانی مبارک ہو
ہمیشہ بس یونہی بیٹھا ہوا رہ تو اسی در پر
تجھے اپنے خسر کے گھر کی دربانی مبارک ہو
اگر دلہن کو تو نے واقعی دیکھا نہیں اب تک
تو پھر اے عقل کے دشمن یہ نادانی مبارک ہو
اگر جی بھر کے دیکھا ہے ہمیشہ ہر گھڑی تو نے
تو پھر تجھ کو یہ دلہن جانی پہچانی مبارک ہو
اگر بچپن میں دیکھا اور رشتہ کر لیا تو نے
تو پھر اب وقت جلوہ تجھ کو حیرانی مبارک ہو
بھتیجوں کو برابر کی یہ چھوٹی ماں مبارک ہو
نواسوں کو ترے، یہ نوجواں نانی مبارک ہو

غنی اعجاز (اکولہ)

قطعات

(۱)

دوکان نہیں ہوتی سامان نہیں ہوتا
اور مال بھی سڑنے کا امکان نہیں ہوتا
بازار الیکشن کا بیوپار ہے گیارنٹی
دھندے میں سیاست کے نقصان نہیں ہوتا

(۲)

یوں تو نہیں ہے آدمی کوڑی کے کام کا
بجتا ہے ڈنکا ہر جگہ اس کے ہی نام کا
آتا ہے گھر میں گوشت ہی بس اک حلال کا
باقی سمیٹ لاتا ہے سب کچھ حرام کا

امام رائچوری

شکیل اعجاز، اکولہ

میرا پیر ہی اس کے اوپر آیا تھا یا کیلے کا چھلکا خود میرے پیر کے نیچے آیا تھا یہ تو پتہ نہیں البتہ زوردار جھٹکا لگا اور بش شرٹ اور پینٹ دونوں سیڑھیوں سے لڑھکتے ہوئے نیچے چلے گئے تھے۔ پینٹ اور بش شرٹ کے اندر میں بھی موجود تھا۔ اس لیے میری ناک اور ٹھوڑی پر زبردست جھٹکا لگا جس کا اثر دماغ تک گیا اور میری آنکھیں بند ہوگئیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے ملے جلے قہقہوں سے چونک کر آنکھیں کھولیں تو معلوم ہوا کہ کیمسٹری کے کمرہ سے جتنا سامان چرا کر لے جارہا تھا وہ عین کیمسٹری پروفیسر کے قدموں میں گر پڑا ہے۔ دھیرے دھیرے پروفیسر صاحب کے جوتے میری طرف بڑھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا جیسے طوفان سے پہلے ہوتا ہے، انھوں نے بڑی شفقت سے بازوؤں سے اٹھایا، میرے کپڑے جھٹکے اور ایک زوردار طمانچہ میرے گال پر رسید کردیا کہ نہ جانے کیا کیا کہتے رہے۔ آس پاس قہقہے بلند ہوئے۔ میں ٹکٹکی باندھے پروفیسر فہیم کو دیکھتا رہا میرا دماغ ماؤف ہوچکا تھا، کان سُن ہوچکے تھے، اس لیے صرف ان کا منہ چلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا آواز نہیں آرہی تھی جیسے فلم میں اچانک آواز گم ہوگئی ہو اور اسکرین پر صرف ریل چل رہی ہو۔ میں پتہ نہیں کب تک اُلّو کی دُم فاختہ بے دال کے بودم کی طرح وہاں کھڑا رہا وہ پتہ نہیں کب چلے گئے۔ جب دماغ واپس ہوا تو میں کالج کے گارڈن میں ایک بنچ پر بیٹھا جاریہ واردات کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ جو کچھ ہوا اس کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔ نہ امتحانی نلیاں، ٹرشہ وغیرہ چراتا نہ سب کے سامنے طمانچہ رسید ہوتا۔ لیکن جانور اور انسان میں شاید یہی فرق ہے کہ جانور اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا بھی خود بھگت لیتا ہے اور انسان خود کردہ گناہوں کی سزا بھی دوسروں کو دینا چاہتا ہے۔ اس کی زندہ مثال ہوسٹل کے پاس رہنے والا گھرانہ ہے۔ وہاں ایک صاحب ہیں جن کی گلگلوں کی ہوٹل ہے۔ کسی دن گلگلوں میں مرچ پڑجاتی ہے یا زیادہ پانی سے وہ ہریلا بن جاتے ہیں، یا پھر کسی گاہک سے کھٹا پٹی ہوجاتی ہے تو وہ گھر آکر کسی نہ کسی بہانے اپنے بڑے لڑکے کو پیٹتے ہیں۔ وہ کچھ نہیں کہتا ہے کہ "حکمران ہمیشہ محکوموں کو پیٹیں گے اور محکوم ہونا گناہ ہے۔" پھر وہ اپنے چھوٹے بھائی کو دو تین تھپڑ رسید کرکے اپنا غصہ ٹھنڈا کرتا ہے۔ اس طرح یہ غصہ

منتقل ہو کر سب سے چھوٹے بھائی کے پاس آتا ہے۔ پہلے تو وہ خوب روتا ہے، دیواروں اور دروازوں پر سر ٹیکتا ہے پھر اچانک اسے خیال آتا ہے کہ یہ نیا زمانہ ہے، ترقی یافتہ دور ہے اس میں جب کسی پر ظلم ہوتا ہے تو وہ اسے اپنے سے کمزور پر منتقل کر دیتا ہے اس لیے وہ فوراً ہاتھ میں چھڑی لے کر پڑوسی دھوبی کے گدھے پر برسانا شروع کر دیتا ہے اور اس طرح گدھے پر یہ جھگڑا ختم ہو جاتا ہے۔ میں سوچتا ہوں جھگڑے ختم کرنے کے لیے گدھے کا دم غنیمت ہے ورنہ یہ ظلم نائٹروجن کے چکر کی طرح جاری رہتا ہے۔

میں انسانی روایت برقرار رکھتے ہوئے اس چانٹے کا ذمہ دار خود کو نہیں بلکہ چھلکا پھینکنے والے کو ٹھیراتا ہوں لیکن اس آدمی کا پتہ چلانا ممکن نہیں ہے۔ دل سرگوشی کرتا ہے۔ "کالج میں موجود تمام لوگ تمہارے مجرم ہیں تم ان سب سے انتقام لینے کا حق رکھتے ہو ــــ اٹھو ــــ اور کالج کے چپے چپے میں کیلے کے چھلکے پھیلا دو" میں چھلکے خریدنے جانے لگا تو خیال آیا کہ چھلکوں کی دوکان نہیں ہوتی۔ ارے واہ یہ بھی کوئی بات ہے؟ ترقی یافتہ دور میں ہر ناکارہ چیز کو کام میں لایا جا رہا ہے۔ مونگ پھلی سے تیل نکالنے کے بعد اس کے چھلکے کام میں آتے ہیں لکڑی کاٹنے کے بعد اس کا برادہ ایک الگ بزنس بن جاتا ہے۔ باربر کے ہاں کٹے ہوئے ناکارہ بال، جب وگ بن کر آتے ہیں تو گنجے عاشقوں کی سب سے بڑی ضرورت بن جاتے ہیں۔ پھر کیلے کے چھلکوں کو کیوں نظر انداز کیا گیا؟ انتقامی جذبہ نے اس مسئلہ کو کسی اور وقت کے لیے رکھ دیا۔ اور میں چھلکوں کی تلاش میں کالج کینٹین پہنچا۔ کاونٹر پر موجود شخص ہکلاتا تھا۔ اور بات کرتے کرتے بالکل رک جاتا تھا۔ اس کا تجربہ پہلی بار اس کی شادی میں ہوا تھا۔ قاضی صاحب اس سے قبلوا رہے تھے "مظلوم بی بنت ظالم خاں کو بعوض مہر مؤجل سکہ خارج الوقت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے قبول کیا؟" ایک منٹ ہوا۔ دوسرا منٹ بھی ختم ہونے کو آیا تو حاضرین کو تشویش ہوئی، کہیں دولھا ناراض تو نہیں؟ بولتا کیوں نہیں؟ نظریں اٹھائیں تو معلوم ہوا کہ دولھا کی گردن آسمان کی طرف ہے، آنکھیں بند ہیں، اور منہ کھلا ہوا ہے جیسے کیمرہ چلتے چلتے ایک دم رک گیا ہو۔ پیچھے سے کسی نے پیٹھ پر زوردار ہاتھ مارا تو انھوں نے جلدی سے کہہ "قبولیا" (قبول کیا) قاضی صاحب نے ایک بار اور پوچھا پھر یہی بات ہوئی۔ تیسری مرتبہ قاضی صاحب کے پوچھنے پر دولھا برہم ہو گیا۔

"آپ کم آلوم ہے کہ میں ہکل آتا ہوں" (آپ کو معلوم ہے کہ میں ہکلاتا ہوں) "پھر بیت این این آر اُدھ رے" (پھر بھی تین تین بار پوچھ رہے)

میں جس وقت کینٹین پہونچا اس سے مرزا صاحب پوچھ رہے تھے۔

"کیلے کیا درجن ہیں؟"

"ایک روپیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

مرزا صاحب نے جلدی سے ایک روپیہ رکھا اور خود ہی کیلے اٹھا کر چلتے بنے۔

پھر میں نے پوچھا "کیلے کیا درجن ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"

وہ جلدی سے بولا "ڈیڑھ روپیہ"

میں نے کہا "مرزا صاحب کو ایک روپیہ کے حساب سے کیوں دیا؟"
" آنو نیپ اڈا اونے کاں دیا؟" (انھوں نے پورا بولنے کہاں دیا؟)
"میں تو ایک روپیہ پچاس ایسے اولنے والا تھا"
(میں تو ایک روپیہ پچاس پیسے بولنے والا تھا)
میں نے کہا "اچھا جانے دو" چھلکے کیا حساب سے دو گے؟"
اس نے شاید اپنی دوکان کی توہین محسوس کی اس لیے برہم ہو کر بولا ——
"تم کچھ الٹے کدا کان اک ری کیا؟" (تم کو چھلکے کی دکان دکھ ری کیا؟)
میں جانتا تھا کہ یہ ضدی شخص اب کسی قیمت پر چھلکے نہ دے گا اس لیے میں نے جاتے جاتے اسے چڑایا
"ہماری گ آڑی لیٹ کیوں اتی؟" (تمہاری گاڑی لیٹ کیوں چلتی؟) وہ لکڑی لے کر پیچھے دوڑا لیکن میں تیزی سے کینٹین کے باہر بھاگ چکا تھا۔
چھلکے صرف مرزا صاحب کے پاس مل سکتے تھے۔ میں ان کی طرف جانے لگا تو ایک واقعہ یاد آنے لگا ——
میں کالج سے باہر نکلا تو مرزا صاحب دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔
"آپ نے نوٹس پڑھا؟"
"نہیں —— کیوں؟"
"آج شام وظیفہ کے ڈیڑھ سو روپے ملنے والے ہیں"
"یہ تو ہر ماہ ملتے ہیں —— کوئی نئی بات نہیں ہے۔
"نئی بات یہ ہے کہ یہ سردیوں کا موسم ہے"
"سردیوں کا موسم بھی ہر سال میں ایک دفعہ ضرور آتا ہے"
"آپ سمجھے نہیں! دراصل سردیوں کا موسم خدا کی طرف سے عنایت کردہ موقع ہے کہ آدمی اپنی صحت بنا کے اور دیگر ۸ ماہ کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لے"
"صحت کی فکر آپ جیسے بوڑھوں کو ہونی چاہیے مرزا صاحب! ہم نوجوانوں کو ...."
"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں بوڑھا نہیں ہوں، دوسری یہ کہ نوجوانوں کو بھی صحت سے غفلت نہیں برتنی چاہیے۔
—— اگر آپ مسلسل غفلت برتتے رہے تو یہ جو معصومیت اور شادابی ہے جاتی رہے گی ——
آج آپ کتنے معصوم نظر آ رہے ہیں"
میں سمجھ گیا کہ مرزا صاحب کو مجھ سے کوئی ضروری کام ہے میں نے کہا ——
"اچھا چلیے! یہ مان لیتا ہوں کہ یہ سردیوں کا موسم بھی ہے اور ڈیڑھ سو روپیے بھی ملنے والے ہیں —— پھر؟"
میرا خیال ہے کہ مرغوں کی پارٹی کی جائے چونکہ ہوسٹل میں کھانا ممنوع ہے، ہوٹلوں کے مرغے میں پسند نہیں کرتا اس لیے چار لڑکوں کے تعاون سے ہم روم ہی میں مرغے بنائیں گے ——

میں نے حساب لگالیا ہے چار مرغوں پر ۸۰ روپے خرچ ہوں گے فی لڑکا ۲۰ روپے . . . میں نے رحمن صاحب اور ساجد بھائی کو بھی تیار کرلیا۔ ہم لوگ وظیفہ لینے کے بعد ہاتھوں میں تھیلیاں لیے مرغوں کی تلاش میں نکل پڑے۔ مرغا بازار کی پہلی دوکان پر تقریباً ۱۵، ۲۰ مرغے، ادھر نیچے سے آگے پیچھے سے دیکھ ڈالے لیکن ان کے چہرے پر اطمینان نظر نہ آیا۔ پھر انھوں نے دوکان کے آخری سرے پر رکھے ہوئے دو تین مرغے بڑی تکلیف سے نکلوائے انھیں غور سے دیکھا۔ لیکن پھر رجیکٹ (reject) کردیا۔ مرغا فروش غصہ میں آکر مرغے واپس رکھنے لگا تو ایک مرغا ہاتھ سے چھوٹ کر بھاگ نکلا۔

آگے آگے مرغا اور پیچھے مرغا والا ——— اُس طرف!

آگے آگے مرزا اور پیچھے مرزا والے ——— اِس طرف!

ایک دوکان پر مرزا کو مرغے پسند آہی گئے۔

(پہلی دکان والا مرغے کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اچانک بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گیا تھا)

مرغوں کو چھلا کر ہم نے گوشت تھیلیوں میں ڈلوایا۔

(پہلی دکان والے نے ایک جگہ مرغے پر جست لگائی لیکن مرغا بھاگ نکلا اور وہ وہاں بیٹھے ہوئے بکرے کے سینگ میں اٹک گیا۔ بڑی مشکل سے بکرے نے قمیص کے دامن کے عوض، مرغا فروش کو چھوڑا)

ہم لوگ واپس ہونے لگے تو وہ سڑک کے ایک کنارے ہانپتا بیٹھا تھا (بلکہ لیٹا تھا) اور دوسری طرف مرغا اسے تک رہا تھا۔

ہم وہاں سے گذرے تو اس نے غصیلی نظروں سے مرزا صاحب کو دیکھا؟ پھر مرغے کو دیکھا جیسے دونوں میں کوئی فرق ہی نہیں! ——— گھامڑ کہیں کا!)

ہمارا کالج ہوسٹل شہر کی سب سے خوب صورت پہاڑی پر ہے۔ تین طرف گھنا جنگل اور چوتھی طرف خوب صورت جھیل۔ گرمیوں میں تو یہ جھیل کشمیر سے کم نہیں ہوتی لیکن سرما میں راہ فرار مشکل سے ملتی ہے ہر طرف سردی کا راج، ٹھنڈی اور آزاد ہوائیں اور ان کے بیچ آزاد لڑکوں کا آزاد ہوسٹل۔ ہوسٹل میں لڑکیاں نہیں اس لیے تھوڑی سی بے کیفی ضرور رہتی ہے۔ لیکن اس کا تدارک دیواروں پر میگزین کی الٹی سیدھی تصویریں لگا کر کیا جاتا ہے۔ جن کے کمروں کی دیواریں ان تصاویر سے آلودہ نہیں ہوتیں اور وہ بظاہر بہت شریف نظر آتے ہیں، ان کی الماری کے خفیہ خانے ایک حسینہ کا پاسپورٹ سائز فوٹو ضرور ہوتا ہے جیسے وہ سونے سے قبل اکیلے میں دیکھتے ہیں۔ ہوسٹل میں ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو کھلم کھلا گوشت نہیں کھاتے اسلیئے یہاں مرغے وغیرہ پکانا ممنوع ہے۔ ہم لوگ ہوسٹل کے قریب پہنچے تو وہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دور سے کھڑکیوں کے شیشے چمک رہے تھے جیسے کوئی جہاز سمندر پر کھڑا ہے۔

مرزا صاحب چلتے چلتے بولے ———

"ہم جلدی بستر میں چھپ جائیں گے، پھر رات کے ۱۲ بجے کام شروع کریں گے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔" میں بستر میں لیٹا نیند لگ گئی۔ رات کے ایک بجے ایسا لگا جیسے کسی نے برف کے پہاڑ میں پھینک دیا ہو۔ معلوم ہوا کہ مرزا صاحب نے جسم سے لحاف کھینچ لیا ہے۔ اسٹو سلگایا گیا مرزا صاحب اسٹول پر بیٹھ گئے، ساجد

بھائی سے کہا آپ برتن صاف کر لیجیے۔ رحمٰن صاحب کو حکم ہوا گوشت دھو ڈالیے۔ مجھ سے پوچھا "آپ کو کیا کام آتا ہے؟"
میں نے کہا "مجھے صرف کھانا آتا ہے اور تھوڑی اٹھا پٹخ آتی ہے۔"

"اچھا تو آپ یہ مصالحے پیس ڈالیے۔"

میں باہر سے پتھر ڈھونڈ لایا اور فرش پر رکھ کر مصالحے پیسنے لگا۔ رات کا سناٹا سیمنٹ سے بنا ہوسٹل جہاں قلم گرنے کی آواز بھی گونجتی ہے یہ تو پھر پتھر کی آواز تھی۔ دونوں نے مجھے ٹوکا میں نے کان نہ دیا تو مرزا صاحب سے شکایت کی وہ بہت اونچا سنتے تھے۔ میرے پاس آئے اور بولے ـــــ

"ذرا دھیرے دھیرے کرو نا؟"

"دھیرے دھیرے ـــــ؟"

"مصالحہ پیسنے کا کام"

"آپ کو آواز آرہی ہے؟"

"نہیں۔"

"بس پھر۔"

میں جانتا تھا مرزا صاحب کو پتھر کی آواز نہیں آرہی ہوگی۔ اکثر ہم ان کے خلاف سازشیں انہی کے سامنے بیٹھ کر بناتے اور سمجھتے ہم ان کی تعریف کر رہے ہیں سازش ہوتی رہتی، وہ شرما شرما کر مسکراتے رہتے۔ مرغے تیار ہو گئے ہم کھانے کے واسطے تیار ہو گئے لیکن دل کی دھڑکن کم نہ ہوئی۔ خدشہ لگا تھا کہ کہیں کسی کو خبر نہ ہو جائے کہ ہم نے ہوسٹل کا قانون توڑا ہے۔ کبھی کبھی خود کے قدموں کی آواز سے ہم چونک جاتے۔ لتا منگیشکر کا یہ گانا جو ہمیشہ کانوں میں رس گھولتا ہے، آج جیسے مرچ کا پانی گھول رہا تھا کہ ـــــ ع

ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو دل سوچتا ہے ـــــ کہیں یہ وہ تو نہیں۔

ہم دھڑکتے دلوں کے ساتھ دسترخوان کے آس پاس بیٹھے اور پہلا لقمہ لینے ہی والے تھے کہ دروازے پر مکوں کی بارش شروع ہو گئی۔ آواز سنتے ہی میں اور ساجد بھائی پلنگ کے نیچے گھس گئے اور رحمٰن صاحب دوسرے پلنگ کے نیچے!

(ہمیشہ کی طرح بعد میں بے وقوفی کا احساس ہوا کہ دروازہ اندر سے بند ہے تو چھپنے کی کیا ضرورت ہے؟)

مرزا صاحب کو آواز سنائی نہ دی تھی وہ حیران، کہ یہ تینوں چوہوں کی طرح بلوں میں کیوں گھستے ہیں۔ میں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور بتایا کہ یہ اماں اللہ کی آواز ہے جسے ہم نے اس لیے شریک نہیں کیا کہ یہ اکیلا ہی چاروں مرغے کھا جاتا اور ہمارے حصے میں ہڈیاں یا کلغیاں ہی آتیں۔ دروازہ مسلسل پیٹا جا رہا تھا۔ وہ چلانے لگا "دروازہ کھولو مجھ کو ضروری کتابیں لینا ہے۔" رحمٰن صاحب دراز قد آدمی تھے، غصے کے مارے پلنگ کے نیچے سے نکلے اور دروازہ کھول کر اس طرح کھڑے ہو گئے کہ صرف گردن باہر اور سارا جسم دروازہ کے اندر، جیسے چوزہ پہلی مرتبہ انڈے سے باہر سر نکالتا ہے مقصد یہ تھا کہ اماں کمرے کے اندر نہ دیکھ سکے وہ بھی ضدی آدمی، خوب زور لگایا لیکن قطب مینار کہاں ہلنے والا تھا

رحمٰن صاحب نے کہا "کتابوں کے لیے ۲ بجے رات ہی کا وقت ملا تھا؟ صبح لے جانا۔"

"نہیں مجھے ابھی اندر آنے دو۔"

"ابھی تم اندر نہیں آسکتے ——— میرے سر میں درد ہے۔"

"مجھے مرزا صاحب سے کام ہے۔"

"تو ان کے کمرے میں دیکھو ——— وہ یہاں کہاں؟"

"میں نے ابھی ان کی لنگی اور پوپلا منہ دیکھا ہے۔ ان کے روم کو تالا لگا ہے۔ وہ سارے ہوسٹل میں کہیں نہیں۔ دروازہ کھول دو ورنہ میں وارڈن سے کہہ دوں گا کہ ہوسٹل میں جاسوس جمع ہوگئے ہیں، دو بجے رات کو تالا لگا کر جانے کہاں چلے جاتے ہیں۔"

رحمٰن صاحب ڈٹے رہے "جو کرنا ہے کرلو، اس وقت دروازہ نہ کھلے گا۔"

انھوں نے اندر سے دروازہ بند کر دیا۔ اماں تھوڑی دیر تک ڈانٹتا رہا پھر بولا

"میں باہر سے تالا لگا دوں گا۔"

ہم لوگ اپنے بلوں سے نکلے تو وہ جا چکا تھا۔ ہم دھیرے دھیرے مسکراتے رہے اور اپنی فتح پر خوش ہوتے رہے مرغے ہونٹوں کے دروازوں سے پیٹ کے محلوں میں منتقل ہو چکے تھے۔ ایک مرغا باقی بچا تھا کہ اچانک ہوسٹل کے وارڈن کی گرجدار آواز گونجی اور آس پاس کے کمرے کھلنے کی آوازیں بھی آئیں۔ اب کوئی چارہ نہ تھا۔ ہم رنگے ہاتھوں پکڑے لیے گئے۔ وارڈن نے پرنسپال کو رپورٹ کی۔ پرنسپال نے ہوسٹل چھوڑنے کا نوٹس دے دیا۔ دو، تین دن ہم بہت پریشان رہے چوتھے دن مرزا صاحب شگفتہ رو میرے پاس آئے اور بولے۔

"معاملہ رفع دفع ہوگیا۔"

"میں نے کہا مرغے کھانے والا معاملہ تو بہت پیچیدہ ہوگیا تھا یہ رفع دفع۔ کیا ہوا؟"

انھوں نے چپکے سے کہا "میں نے کل رات وارڈن صاحب کو دو مرغے پکا کر کھلا دیئے۔"

بہر حال مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ مرزا صاحب بہت پیٹو آدمی ہیں۔ اور اس وقت بھی وہ پورے بارہ کیلے ہضم کر لینے کے موڈ میں تھے۔ مجھے دیکھا تو فوراً بیگ کو چھپا لیا اور ہونٹوں کو دونوں طرف سے یوں پھیلایا کہ آنکھیں گالوں میں چھپ گئیں۔ میں نے کہا ———

"مرزا صاحب آپ کے پاس کیلے کے چھلکے ...."

"انھوں نے بڑی جلدی جواب دیا "وہ تو میں نے سب کھا لئے۔"

"چھلکے کھانا کب سے شروع کر دیا آپ نے؟"

وہ شرمائے تو میری نظر ان کے پیچھے دیوار پر لگے ایک پوسٹر پر پڑی۔

"چلو اور چلنے دو۔"

پیارے طلباء و طالبات آج سے اس کالج میں کیلے کھانا ممنوع قرار دیا جاتا ہے کیونکہ.......

- کالج کے موٹے تازے لڑکے اور لڑکیوں کے گرنے کی کئی واردا تیں ہوئی ہیں۔
- ایسے طالب علم اور پروفیسر جو ہر طرح سے پروقار بنتے ہیں، بلکہ چال میں بھی ایک خاص اسٹائل ملحوظ رکھتے ہیں، اکثر پھسلے ہوئے پائے گئے ہیں۔
- کالج کے گنجوں کے سروں پر شدید ضربیں آئی ہیں جن میں حساب کے پروفیسر شامل ہیں۔
- چاندنی کی طرح اُجلے کپڑے والے اسٹوڈنٹس، کئی دفعہ گندے پانی کے گڑھوں میں گر گئے ہیں۔
- چھلکوں کی خوشبو سے کئی بکریاں اور گدھے باقاعدگی سے کالج میں حاضری دے رہے ہیں۔ اکثر یہ گدھے کلاس روم میں گھس کر پروفیسر سے زیادہ بلند آواز میں لیکچر دے کر طالب علموں کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ اس سے پروفیسرس کا مارکٹ، ڈاؤن ہوتا جا رہا ہے۔
- آج سے اس کالج میں کیلے کی وہی حیثیت ہو گی جو جنت میں گندم کی تھی۔
- حضرت آدمؑ کو جنت میں ممنوعہ پھل کھانے پر اکسانے پر ایک شیطان موجود تھا، یہاں بے شمار شیطان ہیں آپ ان کے ورغلانے میں نہ آئیں۔

صدر
چھلکے ہٹاؤ، طلبا و بچاؤ کمیٹی

مرزا صاحب کو اس پوسٹر کے نیچے بیٹھا دیکھ کر میں نے کہا۔
مرزا صاحب آپ تو گنجے کے سامنے بال سنوارتے ہیں، ہرن کے سامنے عطر لگاتے ہیں، گدھے کے سامنے فلسفیانہ باتیں کرتے ہیں۔ بندر کے سامنے اچھلتے ہیں —— یعنی عین اس پوسٹر کے سامنے کیلے کھاتے ہیں؟
انھوں نے کہا" دراصل میں اس پوسٹر سے اتفاق نہیں کرتا۔ کیونکہ کیلے کھانا بھی انسان کا پیدائشی حق ہے"
" لیکن اس سے دوسروں کو جو تکالیف پہونچ رہی ہیں، طلبا میں جو بے اطمینانی پھیل رہی ہے —— اس کا آپ کے پاس کیا —— حل —— ہے" میں نے انٹرویو لینے کے انداز میں پوچھا۔
آنکھوں کو بند کر کے، دونوں ہاتھوں کو گھسیلا اٹھانے کے انداز میں بنا کر، ہونٹوں کو گالیاں دینے کے انداز میں سکوڑ کر، یعنی کسی کامیاب اداکار اور عظیم رہنما کی ایکٹنگ کرتے ہوئے رک رک کر کہنے لگے ——
" میرے خیال میں اس قسم کے پوسٹر چسپاں کرنے سے کالج کے طلباء کے مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ اگر لوگ واقعی کیلے کھانا چھوڑ دیں تو وٹامن کی کمی سے ہماری اگلی نسل کمزور ہو سکتی ہے —— کیلے کا استعمال بند کرنے سے کاشتکار پر برا اثر پڑے گا۔ لاکھوں لوگ بے روزگار ہو جائیں گے اور ہمارے ملک کے معاشی و اقتصادی حالات خراب ہو جائیں گے —— میرے خیال میں اس کا —— حل —— یہ ہو سکتا ہے کہ ہم آپس میں مل کر بیٹھیں۔ جو لوگ چھلکوں سے پھسلے ہیں ان سے بھی مشورہ کریں اور اتفاق رائے سے یہ فیصلہ اور عزم اپنے اندر پیدا کریں کہ چھلکے پھینکنے والے شرپسند عناصر کو روک ٹوک کرنے کی بجائے ہم خود سنبھل کر چلنا سیکھیں۔ کیونکہ اولے تو برستے ہی رہیں گے گنجوں کو چاہیے کہ وہ سر بچا کر چلیں ——

ـــــ بلکہ میرے خیال میں تو ترقی پذیر قوم کو جان بوجھ کر چھلکوں کے درمیان چلنے کی عادت ڈالنی چاہیے اس طرح وہ پھونک پھونک کر قدم رکھنا سیکھتی ہے اور ہمارے اکثر نوجوانوں کی طرح دن میں بھی سوتے رہنے کی بجائے زمانے کو کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی عادی ہو سکتی ہے ـــــ اتنا کہہ کر میں رخصت چاہتا ہوں "۔

مرزا صاحب واقعی اٹھ کر جانے لگے تو میں نے شیروانی پکڑ کر کھینچی۔

" کیلے کے چھلکوں کا کیا ہوا ؟ "

انھوں نے کتابیں رکھنے کا بیگ نکالا اور پورے بارہ چھلکے مجھے دے دیئے۔ میں نے بیگ میں جھانکا تو سوائے کھانے کی چیزوں کے کوئی کتاب یا قلم نظر نہ آئی۔

پروفیسر صاحب کا رسید کردہ طمانچہ اب بھی گال تمتما رہا تھا۔ میں چھلکے لے کر شکاروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ سب سے پہلا شکار ایک موٹی لڑکی تھی جو گزشتہ شب دیکھی ہوئی کسی فلم کے کامیڈین بین اچھل اچھل کر سنا رہی تھی "۔

دوسرا شکار کالج کا ایک دادا ٹائپ لڑکا تھا۔

تیسری مرتبہ ایک لیڈر طالب علم بری طرح پھسل گئے (اچھا ہوا۔ ہر وقت کسی نہ کسی بہانے چندہ مانگتے رہتے ہیں) چار ...... پانچ ...... چھ ...... سات ...... آٹھ ...... نو ...... دس ...... گیارھویں چھلکے پر پوسٹ مین گرا جو ہمیشہ میرے خطوط کسی اور کو سونپ دیا کرتا تھا۔

شام ہو چکی تھی۔ سورج نے ہر طرف سنگتری رنگ پھیلا دیا تھا۔ کالج کے در و دیوار خاموش اور کلاسیں دھیرے دھیرے سنسان ہوتی جا رہی تھیں۔ میں اب مطمئن تھا۔ انتقامی جذبہ سرد پڑ چکا تھا۔ میں نے بے دلی سے بارھواں چھلکا ایک جگہ پھینک دیا۔ اور ہوسٹل کی طرف جانے کے لیے مڑا۔ ابھی ۱۵، ۲۰ قدم ہی چلا ہوں گا کہ مرزا صاحب کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ پلٹ کر دیکھا تو مرزا صاحب فرش پر پھسلتے جا رہے تھے۔ وہ پھسلتے پھسلتے سامنے کھڑی ایک لڑکی کے قدموں میں آ کر رک گئے۔ حاضرین نے پہلے تو ان کا قہقہوں سے استقبال کیا۔ پھر سہارا دے کر اٹھایا۔ مرزا صاحب نے میرے گلے میں اپنا بوجھ ڈالا۔ اور تقریباً رونے کے انداز میں کہنے لگے۔

" ایک زمانہ میں یہ کالج تہذیب و شرافت کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب نامعقولوں نے اسے بدمعاشی کا اڈہ بنا دیا ہے ـــــ کمبختوں نے چلنا پھرنا مشکل کر دیا ہے۔ ارے کالج لکھنے پڑھنے اور سیکھنے سکھانے کی جگہ ہے یا کیلے کھانے اور چھلکے پھینکنے کی ؟

میں نے لقمہ دیا : " حالانکہ کالج نے ہر طرف پوسٹر لگا رکھے ہیں پھر بھی لوگ اس پر عمل ...... "

" ارے لوگوں میں سمجھ بوجھ، تب اس پر عمل کریں نا ؟ ـــــ قوم تو سو رہی ہے ـــــ غفلت میں ہے ـــــ پوسٹر تو ان کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے بھینس کے لیے بین، بندر کے لیے ادرک، گدھے کے لیے عقل ...."

لیکن آپ خود بھی تو تھوڑی دیر قبل کیلے کھانے کے فیور (Favour) میں بول رہے تھے ؟

مجھے کیا معلوم تھا کہ میں بھی لپیٹے میں آ جاؤں گا "

" لیکن آپ کی باتیں صرف بولنے کی حد تک ہوتی ہیں۔ عمل کرنے کے لیے نہیں ؟ "

"بس بس اب آپ بھی خاموش رہیئے ـــــ آپ کی میٹھی میٹھی اور معصوم باتوں کے پیچھے چھپے ہوئے زہر کو میں خوب سمجھتا ہوں ـــــ میٹھی چھری کہیں کے ـــــ مرزا صاحب نے ایک جھٹکے سے خود کو میرے ہاتھوں سے چھڑایا اور لنگڑاتے ہوئے ہوسٹل کی طرف جانے لگے ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

"جانے کہاں کہاں سے اسی کالج میں آکر جمع ہو جاتے ہیں . . . . "

میں نے اپنے گال پر ہاتھ پھیرا تو مجھے کافی حد تک سکون محسوس ہوا۔

٥٥

کانا دجّال ہندوستان میں

شوکت حسین

مذہبی کتابوں میں لکھا ہے کہ آخری زمانہ میں دجّال کا ظہور ہوگا، وہ ایک فتنہ ساز ہوگا۔ اس کی شناخت کے لیے بتایا گیا ہے کہ اس کی ایک ہی آنکھ ہوگی۔

کچھ دنوں پہلے ہمارے پڑوسی نے یہ دل دہلا دینے والی خبر سنائی کہ کانا دجال ہندوستان آیا تھا۔ میں یہ خبر سن کر حیران رہ گیا اور میرے رونگٹے واقعی کھڑے ہونے لگے میں نے تفصیلات پوچھیں تو کہا "وہی کانا دجال، اسرائیل کا موشے دایان آیا تھا۔ آپ نے اخبار نہیں پڑھا! یہ سنتے ہی میری جان میں جان آئی، کیونکہ ہندوستان پر آج کل نت نئے مسائل کا نزول ہو رہا ہے۔ ایسے نازک وقت میں واقعی یہ بلائے ناگہانی آجاتی تو پھر کیا ہوتا۔

ہمارے ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو موشے دایان کو یک چشم ہونے کی بنا پر کانا دجال سمجھتا ہے ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل کے موشے دایان بین الاقوامی منظر پر کسی ہیبت ناک دم دار ستارے کی طرح نمودار ہوئے۔

اب جبکہ یک چشم موشے دایان ہندوستان کا سیاسی سفر کر چکے اور بڑی خاموشی اور چوری سے مرارجی دیسائی سے یوں ملاقات کر گئے جیسے کوئی نڈر عاشق زمانے کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے معشوق سے مل کر چلا جائے۔ یہ بات اب پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ کانا دجال اور موشے دایان دو الگ الگ شخصیتوں کے نام ہیں کیونکہ کانا دجال کی ہندوستان میں آمد و سیاسی لیڈروں سے گفت و شنید اور راز و نیاز کا ذکر کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔

موشے دایان کی بھارت یاترا کی طرح پاکستان یاترا کیسنجر بھی کر چکے ہیں۔ اسے یاترا تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یاترا یا زیارت خفیہ طریقے سے نہیں کی جاتی۔ اب تک تو صرف ایک موشے دایان کی رازدارانہ آمد کا پتہ چلا ہے نہ جانے سیاست کے کوٹھے پر ایسے کتنے کالک اندھیرے میں منہ چھپائے آئے اور منہ اندھیرے فارغ ہو کر چلے گئے دراصل یہ اس زرین اصول پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔ اس اصول پر عمل کرتے ہوئے ایٹم بم بنائے جاتے ہیں مگر دنیا کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب دھماکہ پیدا ہوتا ہے۔ حکومتوں کی تبدیلی کی سازشیں بنتی ہیں مگر خبر تختہ الٹنے کے بعد ملتی ہے۔ اس بے پردگی کے دور میں ہر بڑا کام پردہ راز میں کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ عوامی مسائل کی باتیں سیاست داں بند کمروں میں کرتے ہیں۔ صرف انڈر پینٹ کرو اور انڈر گراونڈ کام کرو۔ یہ وبا مغرب سے یہاں آئی ہے جو ہاف پینٹ والوں کی شکل میں زیر زمین کارروائیوں میں مصروف ہے۔

فصلِ اشعار کی

مفلس قازونی
(محبوب راہی)

پیٹ کی آگ کسی طرح بجھالی جائے
باسی روٹی جو چنگیری میں ہے کھالی جائے

ہو غزل جیسی بھی سُر تال میں گالی جائے
داد ہر شعر پہ جی کھول کے پالی جائے

جاتے جاتے کوئی مہمان نہ خالی جائے
لوٹا جائے مرے گھر سے کبھی تھالی جائے

ساقیٔ وقت کا فرمان ہے مئے کے بدلے
تشنگی موت کے پیالوں سے بجھالی جائے

حاکم وقت کا ہر حکم تو ٹل سکتا ہے
بات بیگم کی مگر ہم سے نہ ٹالی جائے

جب بھی تنخواہ کا بیگم کو دیا جائے حساب
نوٹ اک پانچ کی چپکے سے چھپالی جائے

دے سکے کام جو ٹائی کا بھی گاہے گاہے
مونچھ چہرے پہ کچھ اس طرح بڑھالی جائے

جس کی فطرت میں حلیمی بھی ہے ایثار بھی ہے
کیوں نہ بیوی کی جگہ بھینس ہی پالی جائے

اب یہ طے ہے کہ نہ ڈالوں گا کسی پر بھی نظر
گوری جائے مرے آگے سے کہ کالی جائے

آنے والے ہیں وہ سسرال سے خط آیا ہے
خیر اب جیب و گریباں کی منالی جائے

جو کہ بن جائے گدھوں کے لیے موضوع سخن
بات ایسی کوئی منہ سے نہ نکالی جائے

آؤ گنگا میں سیاست کی لگا کر غوطہ
اپنی بگڑی ہوئی تقدیر بنالی جائے

اوڑھ کر نام و نمائش کا بھڑک دار لباس
اصلیت جھوٹ کے چہرے کی چھپالی جائے

کہہ کے بقراط زماں ایک گدھے کو یارو
بات پھر اس سے جو بنتی ہو بنالی جائے

صرف مغرب کے ادیبوں کے حوالے دے کر
دھاک تنقید کی دنیا پہ جمالی جائے

دے کے بس اک نگہ لطف کی خیرات ہمیں
ہم محبت کے فقیروں کی دُعا لی جائے

بے ایمانی سے، خیانت سے، دغابازی سے
جتنی دولت بھی کمانی ہو کمالی جائے

نوکری، دوستی، گھربار یہ رشتے ناطے
ایک جھنجھٹ ہو اگر کوئی تو پالی جائے

چنڈو خانہ ہو، کلب ہو کہ کوئی ہوٹل ہو
اب طبیعت تو کہیں بھی نہ سنبھالی جائے

سامنے اپنے بٹھا کر تجھے گھوروں پہروں
اس طرح حسرت دیرینہ نکالی جائے

ذہن کے کھیت پہ برسا کے تخیل کی گھٹا
فصل اشعار کی ہے راہیؔ اُگالی جائے

غوث محی الدین خواہ مخواہ
(بمبئی)

لیڈر بننے کا آسان نسخہ

تعجب کی بات نہیں تو اور کیا ہے کہ لوگ بس اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کی دُھن میں شب و روز ایک کئے دیتے ہیں جب کہ اس سے کہیں زیادہ فائدہ انھیں لیڈر بن جانے کے بعد مل سکتا ہے اور یہ اس لئے بے حد آسان بھی ہے کہ لیڈر بننے کے لئے جسمانی صحت، تعلیمی قابلیت، عمر کی قید، سابقہ تجربے اور کسی امتحان یا انٹرویو کی ضرورت نہیں رہتی۔

آپ چاہیں تو ملک کے اعلیٰ ترین عہدوں کے بیک وقت اُمیدوار بن سکتے ہیں یا پھر میونسپل کونسلر، پنچایت کمیٹی کے رکن یا چیرمین منتخب ہو سکتے ہیں۔ اگر قسمت نے بڑھاپے تک ساتھ دیا تو ضعیف العمری میں کسی نہ کسی صوبے کی گورنری تو پکی سمجھئے۔

مگر پتہ نہیں لوگ کیوں اس جانب توجہ نہیں دیتے۔ میرے خیال میں حکومت کو بھی لیڈر تیار کرنے کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا چاہئے۔ ہم جب چھوٹے بچوں سے لے کر بڑی عمر کے لڑکوں کو پڑھا لکھا کر کسی قابل بنا سکتے ہیں تو کیا مستحق اور با صلاحیت افراد کو لیڈر نہیں بنایا جا سکتا؟ لیڈر فلم والوں سے گئے گزرے تو نہیں کہ جن کا اپنا ایک علحدہ انسٹی ٹیوٹ ہے۔ جس طرح ایک پیدائشی ایکٹر کے اوصاف کو نکھارنے کے لئے کسی ادارے کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح لیڈر کو بھی (جو یقیناً پیدائشی ہوتے ہیں) سُدھارنے کے لئے تربیت گاہ کی ضرورت ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ حکومت کی اس لاپرواہی سے آنے والی نسل اچھے اور تربیت یافتہ لیڈروں سے کہیں محروم نہ ہو جائے۔

ملک کے موجودہ لیڈر تو اس وقت جاگیں گے جب انھیں اپنی نسل کے خاتمے کا احساس ہوگا لیکن فی الوقت خاکسار چند آسان اور بنیادی اصولوں سے عوام کو روشناس کرانا چاہتا ہے جن کی مدد سے وہ پبلک

چھپکتے ہی لیڈربن کر اپنا، حکومت کا اور عوام کا بیڑہ پار لگا سکتے ہیں ۔ میں اپنی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں اس کا اندازہ آنے والے لیڈروں کی نسل ہی لگا سکے گی ۔ لیکن میں یہ یقین دلانا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان اصولوں پر سنجیدگی سے عمل کرنے سے کبھی نقصان نہ ہوگا بلکہ عمل کرنے والا یقیناً کسی نہ کسی سیاسی پارٹی کا تاحیات صدر منتخب ہو جائے گا (موت کے بعد صدر منتخب رہنا تقریباً ناممکن ہے) ۔

ہاں ایسے حضرات جن کا ضمیر زندہ ہے، جو اصولی اور جذباتی زندگی بسر کرنے کے عادی ہیں، ان ترکیبوں پر عمل نہ کریں تو انھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا ۔ اس اسکیم پر وہی حضرات عمل پیرا ہوں جو زندگی کے ہر شعبے میں مستقل ناکامی اور پریشانی کا سامنا کرتے رہے ہوں ، ایسے لوگ سمجھ لیں کہ کامیابی ان کا انتظار کر رہی ہے ۔ اس منصوبے پر عمل کرنے سے پہلے آپ اپنے اندر جھانک کر دیکھ لیں کہ کہیں خودداری، شرم و حیا اور وفاداری کے جراثیم تو موجود نہیں ہیں ۔ اگر ہیں تو فوراً ان سے گلو خلاصی حاصل کر لینی چاہئے ۔ تبھی آپ ذاتی حملوں، الیکشن میں ناکامی کے غم، انڈوں اور ٹماٹوں کی بوچھاڑ کو سہہ پائیں گے ۔ اب آپ لیڈر بننے کے لئے تیار ہیں ۔

ذرا ٹھہرئیے! اس وقت آپ ایک سہ راہے پر کھڑے ہیں ۔ اس لئے یہ طے کر لیجئے کہ آپ کو کونسا لیڈر بننا ہے ۔ اسٹوڈنٹ لیڈر، مزدور لیڈر یا کسی سیاسی پارٹی کا لیڈر ۔

طالب علموں کا لیڈر بن جانا قدرے آسان ہے ۔ ان کی کسی معمولی یا نام نہاد مشکل کو لے کر نعرے لگائیے اور ان کا جمہوری حق دلانے کے لئے جان کی بازی لگا دینے کی دھمکی (صرف دھمکی) دے دیجئے ۔ آپ کے مطالبات کچھ یوں ہوں :

(۱) بغیر امتحان کے ڈگری ملنی چاہئے ۔
(۲) کالج میں حاضری دینے یا چھٹی منانے کی آزادی دی جائے ۔
(۳) غیر حاضر ہونے پر جرمانہ عاید نہ ہو ۔
(۴) اگر کسی وجہ سے امتحان ٹلے نہیں جا سکتے تو بوقتِ امتحان نگران کار موجود نہ ہوں ۔
(۵) نقل کرنے کی شخصی آزادی حاصل ہو ۔
(۶) طلبار کے لئے سینما کے ٹکٹ رعایتی داموں پر ملیں وغیرہ وغیرہ ۔

یہ مانگیں ہر طالب علم کا پیدائشی اور جمہوری حق ہے ۔ پھر کون ایسا نالائق اسٹوڈنٹ ہوگا جو ان جائز مطالبات کے منوانے والے کو اپنا لیڈر تسلیم نہ کرے گا ۔ واضح رہے کہ آپ کا دائرہ عمل کسی ایک کالج یا درس گاہ تک محدود نہ رہے بلکہ کوشش کیجئے کہ ملک کے سارے تعلیمی ادارے آپ کے نصب العین کو اپنائیں ۔

مزدوروں کا لیڈر بننا بھی زیادہ مشکل نہیں ہے ۔ فیکٹری یا مل کے مالکوں کی جی کھول کر برائیاں کیجئے ۔ ان کی کمزوریوں کو منظرِ عام پر لائیے اور ان کی مخالف مزدور پالیسی کی مذمت کیجئے ۔ مزدوروں کے جائز اور ناجائز مطالبات کو نعرہ بازی کے ذریعہ مالکین تک پہنچائیے ۔ اگر ایک مطالبہ منظور ہو جائے تو فوراً دوسرا ایسا مطالبہ پیش کر دیجئے جو نسبتاً قابلِ قبول نہ ہو ۔ پھر اڑ جائیے کہ نہیں صاحب! یہ تو مزدوروں کا پیدائشی حق ہے ۔ ہم مر تے جائیں گے لیکن اس حق سے دستبردار نہ ہوں گے چونکہ مزدوروں کا طبقہ ویسے بھی کم پڑھا لکھا ہوتا ہے اس لئے آپ کی لیڈری مہینوں اور برسوں تک چلتی رہے گی ۔ اس اصول کو ہمیشہ یاد رکھئے کہ جس دن مزدور اپنی مانگیں منوانا چھوڑ دیں گے وہ دن لیڈروں کا آخری دن ہوگا ۔

سیاسی لیڈر بننے کے لئے آپ کو چڑھتے سورج کی پوجا کرنی ہوگی۔ پہلے کسی بڑے سیاسی لیڈر کا چمچہ بننا ہوگا۔ اس سے آپ کو لیڈری کے راستے پر چل نکلنے میں آسانی ہوگی۔ جب بھی ملک میں نئی مصیبتیں آتی ہیں نئے لیڈروں کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ گویا مصیبتوں اور لیڈروں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اس لئے سیاسی لیڈر کے لئے ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ خود ایسے حالات پیدا کرے جس سے ملک کے عوام پریشان رہیں اور اندرونی یا بیرونی مسائل میں الجھے رہیں۔ جب اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوجائے تو پھر سمجھ لیجئے کہ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو احتجاجی جلوس اور مورچہ نکالنے سے نہیں روک سکتی۔ عوام کو اکسائیے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے بھی احتجاج کرنا سیکھیں۔ جلسے کریں، جلوس نکالیں۔ آخر کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی وجہ نکل ہی آئے گی۔ اس وقت کے لئے عوام کو تیار کرنا آپ کا فرض ہے۔ تقریروں میں شعلہ بیانی سے کام لیجئے۔ عوام کو ورغلائیے کہ حکومت ان کی ہے۔ اس لئے وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے کے حق دار ہیں۔ عوام کو مشتعل ہونے پر اور پولیس کو لاٹھی چارج کرنے، آنسو گیس چھوڑنے بلکہ گولی چلانے پر مجبور کر دیجئے۔

یہاں ایک نکتہ نہ بھولئے کہ جب ایسا کوئی ہنگامہ ہوجائے تو غائب ہونے والوں میں پہلے آپ ہوں گے تاکہ دوبارہ مناسب وقت پر نمودار ہوکر عوام کی نمائندگی کرسکیں۔ یہ سوچ لیجئے کہ اگر آپ زخمی ہوکر اسپتال چلے جائیں تو عوام کی رہنمائی کون کرے گا۔ کیا آپ نے کبھی سنا ہے کہ اب تک کسی مشتعل مجمع یا جلوس کا لیڈر زخمی ہوا ہے۔ زخمی تو عوام ہوں گے۔ انہی کا خون تو ایک نہ ایک دن رنگ لائے گا۔ رنگ لانے کے لئے کیا آپ ہی کا خون رہ گیا ہے؟

معمولی سے لاٹھی چارج کی بھی سختی سے مذمت کرتے ہوئے اس حلقہ کے پولیس انسپکٹر، ڈپٹی کمشنر اور اگر بس چلے تو پولیس کمشنر کی برطرفی کا مطالبہ کیجئے۔ حکومت کی بے شرمی سے عوام کو مطلع کیجئے کہ وہ اس لاٹھی چارج کے بعد بھی مستعفی ہونے کو تیار نہیں ہے۔ گورنر سے مطالبہ کیجئے کہ چیف منسٹر کو برخواست کریں اور صدر جمہوریہ سے اپیل کیجئے کہ گورنر اور چیف منسٹر دونوں کو معزول کر دیں۔

اگر خوش قسمتی سے آپ برسر اقتدار پارٹی کے لیڈر ہیں تو سارے الزامات حزب مخالف کے سر تھوپ دیجئے کہ حکومت کے اصلاحی اور بہبودی کے کاموں کو بآسانی پورا ہوتے دیکھ کر مخالف لیڈر حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ بغیر کسی ثبوت یا دلیل کے ان کی اس شرارت کے پس پشت امریکہ یا روس کی خفیہ ایجنسیوں کا ہاتھ ہونے کا الزام دھر دیجئے۔ عوام کے جائز مطالبات پر اپنی تمامتر ہمدردیوں کا اظہار کیجئے۔ وعدہ بھی کیجئے کہ یہ مطالبات مستقبل قریب میں ضرور پورے کئے جائیں گے ـــــ مگر حل! اس میں عجلت مت دکھائیے۔ ہوسکے تو مالی مشکلات، قدرتی مصائب جیسے سیلاب، سوکھا، قحط اور زلزلوں کا بہانہ کرکے ٹال دیجئے۔

اگر کسی مخالف نے رشوت خوری کا الزام لگایا تو اسے قطعی بے بنیاد بتا کر اس ہتھکنڈے کو اپنے خلاف سیاسی حربے کا لیبل لگا دیجئے بلکہ رشوت خوری کے انسداد کے لئے ایک کمیشن مقرر کر دیجئے۔ اور جوڑ توڑ کرکے اس کمیشن کے خود ہی صدر بن جائیے۔

اپنی لیڈری برقرار رکھنے کے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ آپ بڑے بڑے صنعتی اداروں سے اپنی سیاسی پارٹی کے لئے زیادہ سے زیادہ رقم جمع کریں۔

اگر آپ کے نمائندے کو یا خود آپ کو الیکشن میں شکست ہو تو اس کی وجہ یہ مت بتلائیے کہ عوام کو آپ کی پارٹی پر بھروسہ نہیں رہا بلکہ اس کی وجہ یہ بتائیے کہ پارٹی کے کارکنوں کے تساہل ان کی حد سے زیادہ خود اعتمادی اور پارٹی کی

اندرونی پھوٹ کی وجہ سے ناکامی ہوئی ہے۔

اگر آپ حزب مخالف لیڈر کی حیثیت سے جیت جائیں تو حکومت سے مستعفی ہوجانے کا مطالبہ کیجئے چاہے آپ اکیلے ہی کیوں نہ جیتے ہوں۔ اگر اپوزیشن پارٹی کا لیڈر جیت جائے تو حکومت کو اخلاقاً اس شرمناک شکست پر استعفیٰ دے دینا چاہئے۔

عوام کی بہتر سے بہتر خدمت کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ اپنی پارٹی بدلتے رہیں۔ پارٹی بدلنا آپ کا پیدائشی حق ہے۔ اس لئے کہ پتہ نہیں کونسی پارٹی کب عوام کی خدمت کرنے کے جذبہ سے محروم ہوجائے بُستا ہے کہ حکومت لیڈروں کے اس بنیادی حق پر قانوناً پابندی عاید کرنا چاہتی ہے۔ یہ ایک سنہری موقعہ ہے۔ جب عوام کے مذہب بدلنے پر کوئی پابندی نہیں تو پارٹی بدلنے سے روکنا سراسر ناانصافی ہے۔

برسراقتدار پارٹی کے کچھ لیڈر اگر پارٹی بدلنے کا ارادہ رکھتے ہوں تو چیف منسٹر کو چاہئے کہ اپنی کابینہ میں فوری توسیع کرے اور ایسے عناصر کو وزارت میں شامل کرلے۔

یہ صحیح ہے کہ جمہوری حکومت میں زمین، جائیداد اور آمدنی پر پابندی ہونی چاہئے مگر جو لوگ اس قانون کی آڑ میں تحریر اور تقریر پر پابندی عاید کرنا چاہتے ہیں وہ یقیناً کسی غیر ملک کے ایجنٹ ہیں۔

سیاسی وعدے الیکشن جیتنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ وہ وعدے ہی کیا جو پورے ہوں۔ آپ عوام کو جتنا زیادہ سبز باغ اور ہتھیلی میں جنت دکھائیں گے آپ کی کامیابی اتنی ہی یقینی ہے۔ ویسے بھی عوام کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور اگر انھیں یاد بھی رہ جائے تو قحط، سیلاب اور دوسرے قدرتی مصائب آپ کے لئے بہترین عذرِ لنگ ثابت ہوسکتے ہیں۔ عوام کو ہمیشہ صبر کرنے اور مستقبل پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرتے رہئے۔

ہندوستانی عوام اس قدر سادہ دل اور بھولے ہوتے ہیں کہ وہ کسی بھی لیڈر پر انگشت نمائی کرنے سے پہلے یہی سوچتے ہیں کہ اگر ایک انگلی لیڈر کی طرف ہوگئی تو باقی چار انگلیاں اپنی طرف بھی ہوں گی۔ وہ آنکھ بند کرکے لیڈر کو خدائی اوتار سمجھ لیتے ہیں اور اس کے ہر عیب کی پردہ پوشی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

سچا لیڈر تو وہی مانا جاتا ہے جو ہوا کی رفتار اور وقت کی نبض کو پہچانے۔ آج کا بہترین دوست کل کا بدترین مخالف ہوسکتا ہے۔ اس لئے لیڈر کو ہمیشہ اپنے دل و دماغ کی (اگر ہوں تو) کھڑکیاں کھلی رکھنی چاہئے۔

بعض لیڈروں کے لئے اخباری نمائندوں کے لئے انٹرویو دینا ایک مشکل مسئلہ دکھائی دیتا ہے۔ تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوا ہے کہ اخباری نمائندے گھما پھرا کر چند مخصوص سوالات کرتے ہیں جن کا جواب بھی اگر گھما پھرا کر دیا جائے تو یہ مشکل بڑی حد تک آسان ہوجاتی ہے۔ اگر آپ کی کسی سیاسی تقریر سے عوام ناراض ہوجائیں تو بے دریغ اس بیان سے انکار کر دیجئے۔ جو اخبار آپ کی مصروفیت، تقاریر اور خیالات کی نمائندگی نہیں کرتا اسے بیرونی سازشی کاروں کا آلۂ کار ثابت کر دیجئے۔

حزب مخالف کے لیڈر کی حیثیت سے ایسے اخبار پر الزام لگائیے کہ محض چند سرکاری اشتہاروں کی خاطر یہ اخبار صحافت کے بنیادی اصولوں سے پھر گیا ہے اور حکومت کی چاپلوسی کرتا ہے۔ کوشش یہی کیجئے کہ کسی بلڈنگ کا سنگِ بنیاد نصب ہو یا کسی زچہ خانہ، لائبریری یا بیت الخلا کا افتتاح ہو تو وہ آپ ہی کے دستِ مبارک سے ہو۔ اس طرح آپ عوام سے زیادہ قریب نظر آئیں گے۔ ان سیاسی گروں کو آزمانے کے بعد یقین کیجئے آپ ملک کے مقبول ترین لیڈر بن جائیں گے تو آپ کے لئے صرف تین کام رہ جاتے ہیں (۱) بھوجن (۲) بھاشن اور (۳) ادگھاٹن۔ ▲▲

ہو نہ سکا

کسی کے وعدے کا جب اعتبار ہو نہ سکا　　گدھے پہ عشق کے کرگس سوار ہو نہ سکا

کسی کے وصل پہ یوں اختیار ہو نہ سکا　　کہ دام نقد نہ تھے اور ادھار ہو نہ سکا

کبھی جو بام پہ وہ آ گئے بصد انداز　　گلی میں اُن کی گدھوں کا شمار ہو نہ سکا

وہ آ تو جاتے مگر کیا بتائیں مجبوری　　ہمارے نالوں سے "ارجنٹ تار" ہو نہ سکا

گزارا موسمِ گل اُونگھ اُونگھ کر میں نے　　"بہار میں بھی شریک بہار ہو نہ سکا"

زمانے بھر کے طبیبوں کو آزما دیکھا　　کسی سے کم مرے دل کا بخار ہو نہ سکا

تمہارے تیروں کی کوتاہیاں ارے توبہ　　عدو کو مار دیا میں شکار ہو نہ سکا

خدا ہی جانے یہ کیسی طرح تھی اے کرگس
کہ جس میں شعر کوئی زوردار ہو نہ سکا

[illegible] سہسوانی

اِٹھلایا بہت

نوشِ جاں "قارورہ" فرمایا بہت　　مل گئی کرسی تو اِترایا بہت

پان اور چھالی نہ جب لایا بہت　　رات بھر بیوی نے ٹرایا بہت

میکشی کی آپ نے تضحیک کی　　ڈھول قارورہ کا بجوایا بہت

پھنس گیا تھا میں بھی "نائٹ شو" میں کل　　دیکھ کر ٹن ٹن کو للچایا بہت

پہلے میرا خط پڑھا پھر جانے کیوں　　اس نے نامہ بر کو جوتیایا بہت

نوکری پھر بھی نہ ہاتھ آئی مرے　　بارھویں تک پڑھ کے پچھتایا بہت

نجد میں یہ قیس کو کہتے سُنا　　ہائے لیلیٰ تو نے دوڑایا بہت

دے کے رشوت غیر اندر گھس گیا　　پاسباں نے مجھ کو دھمکایا بہت

خود ہی پوچھا مدعائے دل مگر　　حرفِ مطلب سُن کے شرمایا بہت

وہ کسی صورت نہ میری بن سکیں　　گو کہ بی کلّو کو اپنایا بہت

کل مجھے ان کی گلی میں دیکھ کر　　اک پولس والے نے پٹوایا بہت

کیا خبر تھی وقت آخر آئیں گے　　سنکھیا کھا کر میں پچھتایا بہت

کیوں نہ ہو جشنِ ظرافت کامیاب　　حضرت واہی کا ہے سایا بہت

حالِ دل تو اس نے کرگس سن لیا
لیکن اس کے بعد ٹھہرایا بہت

غزل

فیاض افسوس
(اکولہ)

نت نئے سینکڑوں اشعار کہاں سے لائیں — وقت اتنا بھلا بےکار کہاں سے لائیں
سوچے سمجھے ہی بنا داد جو دیتے جائیں — ایسے با ذوق سمجھ دار کہاں سے لائیں
جس کے سایہ کے تلے میر نے آرام کیا — دشتِ ہستی میں وہ دیوار کہاں سے لائیں
حشر قربانی کے بکروں کا بہت دیکھ چکے — لوگ اب جذبۂ ایثار کہاں سے لائیں
ٹمٹماتے سے دیئے کو ہی غنیمت جانو — روشنی کا کوئی مینار کہاں سے لائیں
حکیم بیگم کا ہے کچھ اپنے بزرگوں کا نہیں — حوصلہ ہم پئے انکار کہاں سے لائیں
مانا بے تاب زلیخائیں بہت ہیں لیکن — ہند میں مصر کا بازار کہاں سے لائیں
سر ہمیں اپنے رقیبوں کا قلم کرنا ہے — دور ایٹم کا ہے تلوار کہاں سے لائیں
آپ کہیئے کہ لنگوٹی کے بھی لالے ہوں جہاں — تھان کے تھان کی شلوار کہاں سے لائیں
کام دنیا کے کھٹائی میں پڑے ہیں سارے — لوگ شیرینیٔ گفتار کہاں سے لائیں

آج تو سارے سخن فہم جمع ہیں افسوس
ہم کہ غالب کے طرفدار کہاں سے لائیں

عقیدت کے چند پھول

بسلسلۂ جشنِ
شہنشاہِ طنز و مزاح
شری بھارت چند کھنہ

جوہر سیوانی

۱

غفور و ناظم و فکر و مسیح و مجتبیٰ، لو تھر
یہی حضرات آتے ہیں نظر بامِ ظرافت پر
یہ ہے زندہ دلوں کا قافلہ رہبر ہیں بھارت چند
انھیں کے دم سے قائم ہے ادب کی پھلجھڑی جوہر

۲

ملیں گے یوں تو لاکھوں ایسے کھنہ اپنے بھارت میں
جو ہوں گے رستم و گاما سے بھی بڑھ کر جسامت میں
مگر یہ منحنی قد، اپنے بھارت چند کھنہ جی
ہیں شیرِ نر سے بھی شہ زور میدانِ ظرافت میں

۳

بندھا ہے آج بزرگی کا ان کے سَر سہرا
یہ سارے زندہ دلان ہیں انھیں کے متوالے
مگر ہیں سامنے موجود جو مسز کھنہ
تو سہمے سہمے سے ہیں "ترنیم کشن" والے

۴

نگارِ "زندہ دلانِ دکن" ہیں بھارت چند
خود اپنی ذات میں اک انجمن ہیں بھارت چند
مگر کچھ ایسے سرِ بزم ہیں لجائے ہوئے
کہ جیسے آج کی بیاہی دلہن ہیں بھارت چند

۵

ادب کے خوابِ احساسات کی تعبیر ہیں کھنہ
چراغِ فکر و فن کی دلنشیں تنویر ہیں کھنہ
کوئی ان کو نگاہِ جوہر سیوانی سے تو دیکھے
مزاح و طنز کی منہ بولتی تصویر ہیں کھنہ

انصاف نگر
اصغر جمیل
(ناگپور)

اور شاعروں پر آسمان ٹوٹ پڑا

رات کے تقریباً ڈیڑھ بجے تھے اور ہم اپنی ٹوٹی ہوئی پلنگ پر بچھے گداز بستر میں دھنسے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے کہ دفعتاً ہماری آنکھ کھل گئی ہمارے مکان سے باہر کافی شور ہو رہا تھا۔ ہم نے سوچا کہ شاید کوئی بدمعاش ہے جو دو آنے کی دیسی لگا کر سولہ آنے کا دھینگا کر رہا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھیں موندلیں اور اسی ادھورے خواب کو پکانے لگے۔ لیکن اسے نہ تو لوٹ کر آنا تھا۔ اور نہ ہی آیا لہٰذا ہم آنکھیں موندے مکان کے سامنے ہو رہے شور کی جانب اپنا دھیان زبردستی لگا دیا۔ اس شور میں اچانک ہمیں کچھ مانوس آوازیں سنائی دیں۔ ہم نے فوراً اپنی آنکھوں پر ہاتھوں کا رولر پھیرا اور کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو مکان کے سامنے لگے ٹیوب لائٹ کے نیچے شہر کے چھٹے ہوئے شعراء کا جمگھٹ نظر آیا۔ شعراء کا نظر آنا تھا کہ نیند ہماری آنکھوں سے دشمنی کر بیٹھی اور ہم غور سے ان کی باتیں سننے لگے۔ پہلے تو ہمیں خیال ہوا کہ شہر میں کہیں کوئی مشاعرہ یا نشست ہے اور ان شعراء کو منتظمین مشاعرہ نے مدعو نہیں کیا ہے اس لیے ان کی گول اسٹینڈنگ کانفرنس ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہمارے شہر کے ایک مخصوص طبقہ کے شعرا کا یہ اصول ہے کہ اگر نہیں کسی مشاعرہ یا نشست میں مدعو نہیں کیا جاتا تو وہ سر بازار ہونے والے اس مشاعرہ پر بے جا تنقیدیں کرتے ہیں اور جب تک مشاعرہ ہو نہیں جاتا وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے اور یہی نہیں بلکہ منتظمین مشاعرہ کی سات پشتوں کو نان و یجیٹیرین کلمات سے نوازتے رہتے ہیں۔

لیکن اس رات معاملہ کچھ اور تھا۔ اس کانفرنس میں بار بار ہمارے انڈرویئر فرینڈ (لنگوٹیا یار) پرواز فاخری کا نام بار بار دہرایا جا رہا تھا اور انہیں حسب مقدور نان ویج کلمات سے نوازا جا رہا تھا۔ پرواز صاحب کا نام سننا تھا کہ محترمہ نیند صاحبہ ہماری آنکھوں سے بغاوت کر بیٹھیں اور ہمارا سارا دھیان اس کانفرنس کی جانب لگ گیا۔ واقعہ دراصل یوں ہے کہ ایک دن بیٹھے بٹھائے پرواز صاحب کے دماغ میں نہ جانے کون سا کیڑا کلبلایا کہ انھوں نے شہر کے شعراء کا امتحان لینے کی خاطر شعراء کے لیے ایک دعوت نامہ نکالا کہ ہفتہ کی شب ان کی بزم کی جانب سے

"شعراء چوک" پر ایک فی البدیہہ مشاعرہ منعقد کیا جارہا ہے۔ انہوں نے شہر کے تقریباً تمام ہی شعراء سے التماس کی کہ وہ محفل مشاعرہ میں شریک ہو کر اپنی شعری و ذہنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کریں۔

اس اعلان کا نکلنا تھا کہ شہر کے خود ساختہ شعراء پر مانو آسمان ٹوٹ پڑا۔ ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ان سے زیادہ فکر ان کے خود ساختہ اساتذہ کو لاحق ہو گئی کہ ان کے شاگردوں کا کیا بنے گا۔ ویسے فی البدیہہ مشاعرہ کے اعلان سے کہنہ مشق شعراء بہت خوش تھے کیوں کہ چند خود ساختہ اساتذہ اور شعراء نے مشاعروں کے ساتھ ہی ساتھ اردو شاعری کو بھی بدنام کر دیا ہے۔ بہت کم شعراء ایسے ہیں جو مشاعروں میں اپنے کہے ہوئے اشعار پیش کرتے ہیں۔ بیشتر شعراء ایسے ہیں جو اپنے اساتذہ سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ آج کل ایسے ایسے شعراء پیدا ہو گئے ہیں جنہیں "س" اور "ش" کا فرق نہیں معلوم۔ جو "ج" کی جگہ "ز" اور "ظ" کی جگہ "ج" کا استعمال کیا کرتے ہیں لیکن مشاعروں میں اپنے معیار سے بھی اچھے اشعار سنا کر بے تحاشہ داد وصول کرتے ہیں اور سامعین سمجھتے ہیں کہ خدا نے انہیں صرف اشعار کہنے کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔

غرض کہ خود ساختہ شعراء کو موقع مل چکا تھا۔ پرواز صاحب کی سات پشتوں کو نان ویج کلمات سے نواز کر اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا۔ پرواز صاحب کے اس اعلان نے شہر کی اردو ادب کی دنیا میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ اساتذہ محلے سے منہ چھپائے پھرتے رہے اور اٹھتے، بیٹھتے، سوتے پرواز صاحب کو یاد فرماتے رہے۔ انھوں نے اپنے چیلے چانٹوں کو یہ ہدایت دے رکھی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو پرواز صاحب کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ لہٰذا اپنے "باس" کے اشاروں پر ان شعراء کا صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ اس مشاعرہ پر بے جا تنقیدیں کی جائیں لیکن اس طرح ان شعراء نے پرواز صاحب کے اس مشاعرہ کی اچھی خاصی پبلسٹی کر دی۔ عوام بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگے۔

اس مخصوص طبقہ کے ایک شاعر صاحب جو کہ ہمارے محلے سے کئی میل کی دوری پر رہتے ہیں اور جو ہمارے ہی محلہ کے ایک "استاد" سے فیضیاب ہوتے ہیں انہیں جب پرواز صاحب کے اس مشاعرہ کا علم ہوا تو انھوں نے ہمارے محلہ میں آنا ہی چھوڑ دیا۔ یہی نہیں بلکہ علی الصبح گھر سے نکل پڑتے اور رات گئی رات کو واپس لوٹتے تاکہ کار پرداز ان مشاعرہ دعوت نامہ لے کر ان کے مکان پر نہ جا دھمکیں ان کے متواتر ایک ہفتہ ہمارے محلہ غیر حاضر رہنے سے کسی اور کا کچھ بگڑا ہو یا نہ ہو لیکن ان کے استاد کا کافی نقصان ہوا۔ کہتے ہیں کہ استاد کے گھر خرچ کی ساری ذمہ داری ان شاعر صاحب پر تھی چونکہ پرواز صاحب ہمارے انڈر ویر فرینڈ ہیں اس لیے ان استاد صاحب نے ہمیں اپنی گلی میں گھیر لیا اور دھمکی دی کہ پرواز صاحب کو سمجھا دیں وہ اپنے ارادے سے باز رہیں یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہا کہ پرواز صاحب کیوں میرے پیٹ پر لات مار رہے ہیں۔ میرا سارا خرچ فلاں شاعر پورا کرتا ہے۔ اب میں کیا کروں۔ اس دوران پرواز صاحب کو کئی دھمکی آمیز خطوط بھی ملے۔

خدا خدا کر کے مشاعرہ کا دن آ ہی پہنچا۔ شام ہی سے سامعین بے چینی سے مشاعرہ کا انتظار کرنے لگے شعر

شعراء چوک" پہ اچھا خاصہ میلہ لگ رہا تھا۔ اہل ادب کا جم غفیر تھا۔ اساتذہ اپنے چیلوں کو پس پردہ ہدایتیں دے رہے تھے۔ لیکن خدا کا شکر رہا کہ جتنی زیادہ اس مشاعرہ کی مخالفت ہوئی اتنا ہی کامیاب مشاعرہ ہوا یہ بات اور ہے کہ اس میں صرف ۲۰ فیصدی شعراء نے ہی حصہ لیا اور وہ بھی اُن میں زیادہ تر نومشق تھے جو اپنے بل بوتے پہ اشعار کہتے ہیں

وہ دن ہے اور آج کا دن ان مشاعروں اور ان کے اساتذہ کا بس نہیں چل رہا ہے کہ پرواز صاحب کا کیا کام کر ڈالیں اور پرواز صاحب کا یہ عالم ہے کہ جیسے انہوں نے اردو ادب پہ بہت ہی بڑا کرم کیا ہے۔ کیونکہ یہ متشاعر اور ان کے اساتذہ اب مشاعرہ میں شعر پڑھنے سے کتراتے لگے ہیں۔

ادارۂ شگوفہ
کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعہ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	" "	۳/۵۰ "
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۴/۵۰ "
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/- "
فقط	" "	"	۶/- "
در پردہ	مسیح انجم	"	۶/- "
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/- "
چوڑی کے غلام	" "	مضامین	۴/- "
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	۸/- "
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/- "
دھر گھسیٹ	سر پٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/- "
گھوکرو کے کانٹے	علی صاحب میاں	" "	۶/- "
انڈین کا جو	عاتق شاہ	انشائیے	۸/- "
شوشے	ارشد علی خاں	مضامین	۱۰/- "
چوں چوں کا مربہ	پاگل عادل آبادی	"	۶/- "

ناوک حمزہ پوری

مہمان نوازی

فضیلتِ میہماں نوازی پہ کر کے تقریر پیرجی نے
سوال اپنے مرید نو عمر سے کیا یہ کہ بولو بیٹے!
جو کوئی مہمان آپ کے گھر میں آئے تو آپ کیا کریں گے؟
مرید بولا کہ جلد رخصت ہو وہ، خدا سے دعا کریں گے

واحد محسن (بمبئی)

یہ کہہ دو سیٹھ سے جاکر تیرا طبلہ بجا دیں گے
اگر بونس نہیں دے گا تو ہم ہلّڑ مچا دیں گے
عجب تھی شرط انٹرویو کی گھر پہ رات کو آؤ
خبر کیا تھی کہ صاحب مجھ کو "لو" کرنا سکھا دیں گے
نکمّا اور آوارہ تھا لڑکا اس کے پاپا نے
کہا بیٹے تمہاری ساتویں ماں کو بھی لا دیں گے
نہ گھبرا باپ سے اس کے اگر عاشق تو سچّا ہے
مقدر تیرا تھانیدار کے ڈنڈے جگا دیں گے
سہارے ہاتھ اک نسخہ لگا بھرپور ٹانک کا
پہلوانوں سے کہہ دو اُن کی ہم ارتھی اٹھا دیں گے
گرانی کا زمانہ ہے جہیز اب مانگ مت پیارے
دلہن والے تو خود محتاج ہیں وہ تجھ کو کیا دیں گے

عظمت بھلاواں (ناندیڑ)

(حضرت سکندر علی وجد سے معذرت کے ساتھ)

ڈر کر پلٹ کے آئے ہیں گنگ و جمن سے ہم
نل پر نہا رہے ہیں بہت بانکپن سے ہم
چہرے کی سلوٹوں کو تو ہم ہموار کر چکے
اُلجھے ہوئے ہیں زلفِ شکن در شکن سے ہم
احباب و رشتہ دار و مکان کچھ نہیں ہے یاد
بچپن ہی میں فرار ہوئے تھے وطن سے ہم
کانٹوں نے بے لباس کیا چیر پھاڑ کر
خود کو چھپا رہے ہیں ہر اک گل بدن سے ہم
دوڑایا اس قدر سگِ معشوق نے ہمیں
چھ سات روز ہانپ رہے تھے تھکن سے ہم

غزلیں

مانا منسٹری کے ہیں ڈوبے خمار میں
رکھا ہی کیا ہے آپ کے جھوٹے وقار میں
ملتی نہ تھی جنھیں کبھی تاڑی بھی دیکھئے
پیتے ہیں اب شراب وہی بیٹھے بار میں
پھر جا رہے ہیں آج اُسی بے وفا کے گھر
اک روز پٹ گئے تھے وہ جس کے دیار میں
جو جوتیاں گھسیٹتے پھرتے تھے اب وہی
اللہ رے انقلاب کہ پھرتے ہیں کار میں

سید قطب عالم طلعت سہرامی
(بلاسپور)

ایس ایس علی (بالاپور)

پبلسٹی

پبلسٹی ایک ایسا لفظ ہے جو کسی پبلسٹی کا محتاج نہیں لیکن ہر دور میں انسان اس کا محتاج رہا ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں دو سہیلیاں تھیں گجری جا کر ایک جوار بیچتی تھی اور دوسری موتی فروخت کرتی تھی۔ جوار والی کافی چرب زبان بھی ہمارے لیڈروں کی طرح اور دوسری بڑی کم سخن تھی بالکل پہلی رات کی دلہن کی طرح۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جوار والی ساری جوار فروخت کر کے ہنستے گاتے اپنے موتیوں سے دانت چمکاتے گھر لوٹتی اور موتی والی جوار کے بھٹے کی طرح منہ سکھائے واپس آتی ——— اب یہاں یہ منطق لڑانے کی ضرورت نہیں کہ پہلے بھی لوگوں کے پیٹ ہوا کرتا تھا اور اسے بھرنا بھی ضروری تھا۔ لوگ بھلا موتی خرید کر کیا ہنسوں کا فارم کھولتے؟ کہانی سنانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ پبلسٹی کی ضرورت کل بھی تھی اور آج بھی ہے یقیناً کل بھی رہے گی۔ البتہ ہر دور میں اس کے طریقے بدلتے جاتے ہیں۔

ڈارون کہتا ہے (یہ ہر معاملے میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتا ہے) کہ انسان اپنے ماحول کا اثر قبول کرتا ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوتا ہے۔ یہ بات افلاطون کو پہلے سے معلوم تھی۔ اسی لیے اس نے اپنے خیالی سماج میں شاعروں کو کوئی جگہ نہ دی۔ اسے ڈر تھا کہ بائیں بازو کے (باغی) افراد نے اگر اپنی پبلسٹی کے لیے شاعروں کی خدمات حاصل کر لیں تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ ہمارے ملک کی آزادی میں بھی شاعروں کا پبلسٹی ڈپارٹمنٹ کافی اہم رول ادا کر چکا ہے۔

پبلسٹی کے لیے اگر شاعری کو استعمال کیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ اس میں یاروں (شاعروں) کا ہی فائدہ ہے لیکن اکثر شاعری کے لیے پبلسٹی کی جاتی ہے۔ ماضی کے بڑے بڑے شعراء بلکہ سید الشعراء کا نام لے کر کون اپنی عاقبت خراب کرلے؟ حال کے پہلوانانِ شعر و سخن کی مثال بھی وہی دے جو اپنی زندگی سے بیزار ہو چکا ہو یا جسے اپنے سر کا SHAPE اور چہرے کے نقوش تبدیل کروانے کا شوق ہو۔ بہتر یہ ہے کہ فلاں ابن فلاں ابن فلاں صاحب کو سامنے رکھ کر بات آگے بڑھائی جائے یہ صاحب شاعر ابن شاعر ابن شاعر ہیں۔ لیکن ان فلاں صاحب کا ذکر کرتے وقت ان کا کچھ نہ کچھ تو نام فرض کرنا ہی ہوگا۔ فرض کرتے ہیں کہ ان کا نام کلیم ہے اور تخلص شاہی، کلیم صاحب اکثر و بیشتر ایسے مضطرب نظر آتے ہیں جیسے مرغی انڈا دینے سے پہلے بے چین نظر آتی ہے۔ مرغی کی بے چینی تو انڈا دینے کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن غزل ہوتے ہی شاہی صاحب کا اضطراب اور بڑھ جاتا ہے۔ حیران اور پریشان گھر سے نکل پڑتے ہیں۔ آپ

اگر آپ کی قسمت خراب ہے تو آپ کی مڈبھیڑ ان سے ہو جائے گی۔ آپ کو چاہے کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو، چاہے آپ تھکے ہوں یا غصہ میں ہوں یا آپ کا موڈ کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو وہ آپ کو پکڑ کر ہوٹل لے جائیں گے۔ ایک پیالی چائے آپ خود اپنے حلق میں انڈیلیں گے اور ایک غزل وہ آپ کے کانوں میں انڈیل دیں گے۔ اگر آپ کے سر میں درد ہو جائے تو اس کی ذمہ داری ان پر نہ ہوگی۔ دوسری چائے خود آپ کو منگوا کر پینی ہوگی۔ اگر آپ ان کے کسی شعر پر غلطی سے داد دے بیٹھے ہیں تو وہ شعر آپ کو پندرہ، بیس مرتبہ سنا ہوگا اگر آپ بے تعلقی ظاہر کریں تو وہ آپ کا شانہ جھنجھوڑ کر آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا اسپیکر آپ کے ریسیور کے قریب کر دیں گے۔ اگر آپ بے نیازی ظاہر کریں تو وہ ہر ہر شعر کی اور ہر شعر کے ہر ہر لفظ کی تشریح شروع کر دیں گے تاکہ آپ ان کے اشعار کو اچھی طرح سمجھ سکیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ بعد جب آپ دونوں حضرات ہوٹل سے نکل رہے ہوں گے تو آپ کے انجر پنجر ڈھیلے ہو چکے ہوں گے لیکن موصوف کا چہرہ خوشی سے تمتمایا ہوا نظر آئے گا۔ مکمل اطمینان و سکون کے ساتھ وہ آپ کے ساتھ چلتے نظر آئیں گے۔ دیکھنے والے آپ کو مقروض اور ان کو قرض خواہ سمجھیں گے اور یہ کہ ابھی ابھی انھوں نے آپ سے اپنا قرض مع سود کے وصول کر لیا ہے۔

اسی دن وہ غزل تین چار اخبارات و رسائل کو روانہ کر دیں گے کہ کسی ایک میں تو چھپے گی۔ جس اخبار یا رسالہ میں ان کی غزل شائع ہوئی ہو اس کے ایڈیٹر کے نام چند فرضی ناموں سے خطوط لکھیں گے ان خطوط میں خود اپنی غزل کی تعریف کریں گے۔ دوسرا حربہ پبلسٹی کا "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا سا ہے انھوں نے مختلف مقامات کے چند اپنے ہی جیسے گلے باز اور مجمع باز شعرا کا ایک پینل بنا رکھا ہے۔ ان کی غزل شائع ہوتی ہے تو یہ تعریفی خطوط شائع کرواتے ہیں اور ان کی غزل چھپے تو وہ ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔

اپنی پبلسٹی کے سلسلے میں موصوف مشاعرے بھی کرواتے رہتے ہیں۔ منتظمین سب کمائے کے ہوتے ہیں۔ اشتہارات کچھ اس طرح چھپائیں گے کہ اندھا بھی پہلی نظر میں ان کا نام دیکھ لے (گو کہ مسلّم ہے کہ اندھا دیکھ نہیں سکتا) مہینہ بھر پہلے ہی سے اخبارات میں مشاعرہ کا اعلان کروا دیں گے۔ دعوت نامے میں آپ کو صرف ایک ہی چیز نمایاں نظر آئے گی ان کا نام۔ جب مشاعرہ شروع ہوگا تو کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سب کچھ نظر آئیں گے۔ اناؤنسر ان کا پٹھو ہوگا جو کسی نہ کسی بہانے ان کا نام لیتا رہے گا۔ فوٹوگرافر ان کا سدھایا ہوا ہوگا۔ وہ کچھ ایسے زاویوں سے SNAPS لے گا کہ ہر فوٹو میں وہ نمایاں نظر آئیں گے۔ کرائے کے ٹٹو غزل پڑھنے کے دوران ان کو ہار پہناتے رہیں گے۔ دوسرا کرائے کا گروپ بے سوچے سمجھے ان کو داد دے گا جوش و خروش میں اگر ہوٹنگ کا رنگ بھی پیدا ہو جائے تو کوئی بات نہیں۔ تیسرا گروپ بار باران کو پڑھانے کی فرمائش کرتا رہے گا چوتھا گروپ یہ کوشش کرتا رہے گا کہ کسی دوسرے شاعر کا رنگ جمنے نہ پائے۔

آج کل خود اپنی کتاب چھپانا ایک دانش مندانہ اقدام سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ پبلشرز کو تو اب اس کام کی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ اب کتاب کو کھپانے کے لیے پبلسٹی ضروری ہے۔ اس کے لیے رسم اجرا مع اس کے ساتھ مشاعرہ بہت ہی موزوں ہے۔ کلیم صاحب نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ اپنا ایک مجموعۂ کلام چھپا لیا اور رسم اجرا بھی منعقد کروالی۔ ان کے ایک آرٹسٹ دوست نے بینر تیار کیا۔ جدید آرٹ کے نام پر رسم اجرا، کتاب کا نام اور کلیم بھائی کا نام کچھ اس طرح لکھا گویا پہلی جماعت کے بچے نے لکھا ہو۔ رسم اجرا میں کسی نہ کسی سے مقالہ پڑھوانا ضروری ہے اس لیے

انہیں کسی ایسے نقاد کی تلاش ہوئی جو ان کی کتاب یعنی ان کی شاعری یعنی خود ان پر ایک اچھا سا مقالہ نہ صرف لکھ دے بلکہ پڑھ کر بھی سنائے اگر مقالہ نگار شاعر بھی ہے تو سونے پر سہاگہ....

چند ہی دنوں میں انھیں ایک ایسا ہی مقالہ نگار مل گیا۔ مقالہ نگار نے اپنا طویل طویل مقالہ نحیف آواز اور لکھنوی انداز میں ٹھہر ٹھہر کر اور پانی پی پی کر پڑھنا شروع کیا کبھی کبھی تو دو جملوں کے درمیان وقفہ اتنا طویل ہو جاتا کہ ایسا محسوس ہوتا گویا مقالہ ختم ہو چکا ہے یا پھر وہ پڑھتے پڑھتے سو چکے ہیں۔ کچھ دیر تک تو لوگ سکون و اطمینان سے سنتے رہے۔ پھر بھنبھناہٹ شروع ہوئی، پھر لوگوں میں ہنسی مذاق شروع ہو گیا لیکن مقالہ برابر پڑھا جا رہا ہے۔ پھر باقاعدہ "بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ" کی آوازیں آنے لگیں۔ مقالہ نگار سامعین کے حکم کی تعمیل میں فوراً بیٹھ گئے اور مقالہ پڑھنا جاری رکھا۔ مقالہ نگار کا یہ بھولا پن لوگوں کو نہ لبھا سکا۔ وہ دھیرے دھیرے چائے پان اسموکنگ اور رفع حاجت کے بہانے کھسکنے لگے۔ اب کلیم صاحب بڑے پریشان ہوئے انھوں نے اناونسر سے مجمع کو تتر بتر ہونے سے بچانے کی استدعا کی جس کی تکمیل میں اناونسر فوراً دوسرے مائک پر ڈٹ گئے اور [illegible] کا تیل بیچنے والوں کے انداز میں مجمع کو للکار للکار کر روکنے کی کوشش کرنے لگے ادھر مقالہ بھی شروع تھا ایسا لگتا تھا گویا کسی بگڑے ہوئے ریڈیو پر بیک وقت دو اسٹیشن لگ گئے ہوں۔ غرض کہ جس پروگرام کی ابتدا ہی ایسی ہو اس کی انتہا معلوم.....

آج کل موصوف نے پبلسٹی کا ایک نیا طریقہ اپنایا ہے۔ یار دوستوں کی محفل میں کہتے پھرتے ہیں "کل میرے گھر فلاں مقتدر (ادبی یا سیاسی) ہستی کی تشریف آوری ہوئی تھی۔ انھوں نے آتے ہی مجھے گلے لگا لیا۔ میں محو حیرت تھا کہ آخر بات کیا ہے کہ ان کے سکریٹری نے بڑے بڑے تازہ گلابوں کا ہار میرے گلے میں ڈال دیا۔ دوسرے سکریٹری نے ایک عطر بیز پیکٹ میرے حوالے کیا جس میں سو سو کے دس کڑکڑاتے نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے میری کتاب کی بہت تعریف کی اور وعدہ کیا کہ میں تمہیں اردو اکیڈیمی، محکمۂ ثقافت اور ریڈیو اسٹیشن سے بھی مدد دلوانے کی کوشش کروں گا۔" ہر محفل میں ایک الگ ہستی کا نام لیتے ہیں۔ اب آپ کی رسائی ان مقتدر ہستیوں تک تو ہے نہیں کہ آپ ان کے بیان کی تصدیق کر سکیں۔ ناچار ایک دن آپ بھی ہماری طرح موصوف یعنی فلاں، ابن فلاں، ابن فلاں صاحب کو شاعر ابن شاعر سمجھنے پر مجبور ہوں گے۔

ابا کو خط

ایک دن
میں نے اپنے ابا کو
ایک خط لکھا
جس میں کہا
قبلۂ بزرگوار
خط نہ لکھنے کا قصوروار ہوں
وجہ یہ کہ بہت دنوں سے بیمار ہوں
حکیم صاحب گھر آئے تھے
بہت سی دوائیں دے گئے ہیں
اور دواؤں کے ساتھ
سرکا کھانے کہہ گئے ہیں
بہت ڈھونڈا
سرکا نہ ملا
بہتوں سے کہا
کچھ نہ ہوا
اس لئے مہربانی کیجیے
پارسل سے سرکا بھجوا دیجیے
کچھ دنوں کے بعد
ایک پارسل ملا۔
جیسے ہی کھلا
اس میں سے نکلا
ایک خط اور ایک جوتا
خط میں لکھا تھا
برخوردار
سرکا ختم ہو گیا ہے
اس لئے پیسہ کا بھیج رہا ہوں
جتنا جی چاہے کھاؤ
اور اپنی ہیلتھ بناؤ۔"

شاعر کا بھوت

ایک بار
آدھی رات کو
اچانک نیند کھلی
دیکھا بڑا شور ہو رہا تھا
میرا چھوٹا بچہ رو رہا تھا
بیوی نے اسے للکارا
خاموش
ورنہ مارتے مارتے
کردوں گی بے ہوش
لیکن اس کا کچھ اثر نہ ہوا
بچہ چپ نہ ہوا
بیوی نے تلخ لہجہ میں کہا
چپ ہوتا ہے
یا تیرے ابا کو بلاؤں
اور دو چار نظمیں سنواؤں
اتنا سنتے ہی
وہ نادان بچہ
ایک دم چپ ہو گیا
اور ماں کی گود میں
دبک کر سو گیا۔

اعجاز احمد (دھنوری) ۱۲ سال

پربھو نرائن ودیارتھی
(سیمان)

حاکم چیمبر میں ہیں ! وہ اجازت لیکر داخل ہونا اپنی بے عزتی سمجھتے ہیں۔ اپنے ساتھ ایک مزدور اپنی رکھتے
ں اس کا نام منگرو ہے۔ پہلے منگرو کو چیمبر میں داخل کراتے، منگرو داخل ہو کر پوچھتا "مائی باپ !
بابو سمپ پلاس سنگھ جی باہر ہیں آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اجازت ہو تو آئیں۔"
بھلا ان جیسے با اثر شخص کو کون نہیں جانتا جو ہر اسمبلی اور پارلیامنٹ الیکشن میں کاغذات نامزدگی داخل
تے ہیں اور الیکشن بھر کنویسنگ کرتے ہیں وہ کامیابی پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنا فرض محنت
ر کوشش ہے ان کے جیوتشی نے کہدیا ہے کہ ان کی جنم پتری میں غیر ملکی "سفیر، وزیر، گورنر اور عالمی شخصیت ہونا
لکھا ہے۔ ایسی مشہور شخصیت کا تعارف تو عہدہ سنبھالنے کے فوری بعد ہی لوگ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔
داخلے کی اجازت درشن کی خوش قسمتی سے ہوئی۔ "آئیے آئیے تشریف رکھیے۔"
"ہیلو آپ کی بڑی بڑائی سن رکھی ہے۔" ہاتھ بڑھاتے ہوئے صاحب کی کرسی کی بغل میں بیٹھ جاتے ہیں۔
"آپ تو ہمیں پہچانتے ہیں۔"
"جی پورا تعارف تو ہوا نہیں، خیر آپ کے درشن ہو گئے۔ آج تو تعارف ہو ہی جائے گا۔"
آرام کرسی کی طرح کرسی پر بیٹھ اپنے جسم کو ہلاتے ہوئے پوری اداکاری کے ساتھ انھوں نے اپنا تعارف
رانا شروع کر دیا۔
"...... مجھے لوگ بابو بمپلاس سنگھ کہتے ہیں۔ آپ شاید جانتے نہیں ہوں گا مدراجی نے مجھے سوئیٹزر لینڈ
سفیر بنانے کا فیصلہ فرما دیا تھا......" صاحب نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ تو ہم سبھوں کے لیے فخر کی بات
تی کہ ہمارے قریبی آدمی کو سوئیٹزر لینڈ کا سفیر بنایا جاتا۔"
یہ سن کر انھوں نے ناک بھوں سکوڑتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔ ؟ سوئیٹزر لینڈ جانے کے
ہے تو صرف ہوائی راستہ ہے۔ میری ماں بوڑھی ہے دل کی مریضہ ہے۔ اگر ہوائی جہاز سے جاتا تو میری والدہ کا کہنا

مشکل تھا۔ اس لیے اندراجی نے صاف کہہ دیا کہ اپنی سفارت اپنے پاس رکھو۔

"اور وہ جگ جیون بھی کم تنگ نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ گورنرشپ لے لو۔!

ترشے صاحب نے کہا" اس میں تو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے تھا۔

" بابو بمبلاس سنگھ نے جواب دیا کہ نا مینٹڈ پوسٹ لے لوں!؟"

ان کی حاضر جوابی کا کوئی بھی شخص قائل ہو جائے گا۔ انھوں نے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے کہا" ہم بلاس بابو! آپ کو برابر ونود یا بو کے یہاں دیکھا کرتے تھے۔" یہ سن کر وہ اتنا غصہ ہوئے کہ اگر میں نہیں ہوتا تو مار بیٹھ ہو جاتی انھوں نے کہا ونود!! ونود! ہم سے جونیر تھا میں کبھی اس کے پاس نہیں گیا۔

پھر بولے" مہیش کے یہاں تو کبھی جاتا ہی نہیں تھا۔ ہاں اس کی بیٹی کی شادی میں اس کے گھر گیا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد اس پر مالا چڑھانے گیا تھا۔" ان کے کہنے کے انداز کی بلندی کوئی وزیر اعظم یا صدر جمہوریہ ہی پرکھ سکتا تھا۔ کہتے ہیں ریاستی دارالحکومت میں جب صدر جمہوریہ آئے تھے تو ان کا بھی راج بھون سے بلاوا آیا تھا لیکن وہ وہاں نہیں گئے تھے اور عزت مآب صدر جمہوریہ کو ہی ان کے دولت خانہ پر آنا پڑا تھا۔!

ان کے دل میں گاندھی جی کی بڑی عقیدت ہے۔ انھوں نے کہا کہ" میں ٹرین پر جا رہا تھا کہ ایک شخص جو انھیں تخریب کار لگا وہ گاندھی جی پر تنقید کرنے لگا، گاندھی جی سچائی کو سچ کہتے تھے لیکن جھوٹ کو جھوٹ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی" اس پر میں نے اسے دھوبی پٹک کر مارا اور اپنے چاقو سے اپنے ہاتھ کو چیر کر خون نکالا جس سے اس کی چھاتی پر "گاندھی ازم زندہ باد کا نعرہ لکھ دیا۔ . . . . ." کہتے ہیں کہ وہ سب کو ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں۔

انھوں نے اپنی پہلی بیوی کو آگ لگا کر زندہ جلا دیا تھا۔ مرحومہ بڑی خوب صورت تھیں۔ ان کے دو تین بچے بھی ہوئے تھے۔ اسی سال وہ دوسری بیوی بھی لے آئے اور اسے تین سال تک ساتھ رکھنے کے بعد اس پر بدکاری کا الزام لگا کر طلاق دے دی۔ چوتھی اور آخری بیوی لائے جو گانٹھ کی پوری نکلی۔ اس کے کئی مردوں کے ساتھ خفیہ تعلقات رہنے کے جرم ثابت ہیں۔ لیکن اس کے پاس بہت سے مکان ہیں۔ اسے زندگی کی سب سہولتیں حاصل ہیں اس کا ایک لڑکا بھی ہوا۔ وہ بھی خدا کے فضل سے محمد فاضل ہی ہے، بیبیوں اور محبوباؤں کے کفن دفن کے معاملے میں باپ پر پڑا ہے۔ اسے بھی والد صاحب کی طرح لڑکیوں کا چسکا ہے وہ اس پر چلنے والے مقدمات میں بار بار پیروی کر کے اسے چھڑا بھی چکے ہیں اسی سیوت پر جب جائیداد کے لیے انہوں نے مقدمہ بھی دائر کر دیا تو کلکٹر اور ایس پی کو درخواست دی کہ" میرے لڑکے کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ کیونکہ وہ نکسلی ہو گیا ہے۔"

ایک بار کچھ عرصے کے بعد جب وہ حاکم سے ملے تو اس نے بے رخی سے پوچھا" آج آپ بہت دنوں بعد دکھائی پڑے!" انھوں نے بلا سوچے جواب دیا" میں اپنی لڑکی کے لیے بر ڈھونڈنے یوپی گیا ہوا تھا۔ ایک لڑکا آئی اے ایس مل گیا ہے۔ پھر وہ شادی کے اخراجات کے سلسلے میں خود ہی کہنے لگے" اندراجی نے سفارش کی کہ" چاچا جی، بہن کی شادی کا سارا خرچ میں دوں گی۔"

ان کی باتوں کی اڑان کا اندازہ تو کوئی بھی لگا لے گا۔ دراصل وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ دو مہرو

پر کیا اثر ہوگا اس کا بلا خیال کیے بول اٹھتے ہیں۔ عام انتخابات میں تو انھیں برابر کاغذات نامزدگی داخل کرنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایک بار ان کی خواہش الیکشن میں کھڑے ہونے کی نہ تھی تو اخبار میں انھوں نے اس خبر کو چھپوا کر عوام کو آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھا۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ "اس سال مینڈکوں کی طرح انتخابی امیدواروں کی باڑھ آگئی ہے اس لیے انھوں نے الیکشن نہ لڑنے کا عہد کیا ہے جس کا وہ اعلان کرتے ہیں۔

ایک بار جب وہ حسب معمول ایم۔ایل۔اے کے امیدوار تھے اور موٹر پر اپنی کینولیسنگ کر رہے تھے تو چوک میں بچوں نے نعرے لگائے ..... بم بلاس بابو زندہ باد! ہمارا نیتا بم بلاس! انھوں نے فوراً موٹر سے اتر کر بچوں میں مٹھائی بانٹی اور مائک پر اعلان کیا۔ ان بچوں کو دیکھیے ان کے باپ میری مخالفت کرتے ہیں، لیکن ان بچوں کو سچائی معلوم ہے اس لیے یہ میری حمایت کرتے ہیں۔" وہیں پر کسی نے کہا آپ کے مخالف امیدوار تو اپنی مسز کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں جس کا خواتین ووٹروں پر بہت اچھا اثر ہوتا ہے۔ دوسرے ہی دن سے انھوں نے اپنی بیوی کو اپنے ساتھ موٹر پر گھمانا شروع کر دیا اور پبلسٹی کا کام چالو ہوگیا۔

وہ پیروی بھی خوب کرتے ہیں۔ اپنے دولت خانہ پر ٹیلی فون لگائے ہوئے ہیں۔ ان کی پیروی اور قسم کی ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کی پیروی میں اس طرح کہتے کہ "بھولو!" (بھولا پاسبان ساستری) کام نہیں کرے گا؟ اسے پکڑ کر کام کرا دیں گے۔ جس کی پیروی نہیں کرنا چاہتے اس کے لیے فون کی گھنٹی دبا کر فون کرتے ہیں۔ دوسرا سمجھتا ہے کہ فون پر پیروی کر رہے ہیں۔ لیکن آواز وہاں تک کیسے پہنچے؟

وہ جب بھی دیکھے گئے تو سفید دھوتی اور جبے پر کاش کرتے میں ہمیشہ ٹنو پال کرتا دبا دیکھا گیا۔ وہ ہمیشہ دو سیٹ دھوتی کرتے کے تیار رکھنے کو کہتے ہیں۔

اپنے ساتھ کئی دوسرے لیڈروں کی تصویریں رکھتے ہیں۔ ان کی ہابی نیتاؤں کے آگے پیچھے چلنے یا بیٹھے ہوئے فوٹو کھنچوانے کی ہے۔ ایک مرتبہ کانگریسی اجلاس میں کامراج مہیش پرساد سنگھ اور مسز اندرا گاندھی کی صف میں پیچھے اس طرح بیٹھے تھے کہ دیکھنے والوں کو دھوکہ ہو جاتا۔ قدرتی بات تھی کہ ان سبھوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تو رہی تھے ایک بار انھوں نے پٹنہ سے لوٹنے کے بعد اعلان کیا کہ "اس بار پٹنہ گھومتے جا رہے تھے کہ یکایک ایک کار ان کے پاس آکر رکی دیکھا تو اس میں لال بہادر شاستری کی والدہ بیٹھی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بولیں "بھولا چل ڈیرا پر کچھ کھا لے!" لیکن وہ چندہ وصول لینے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے جرم میں مزدوروں کے ذریعہ خواہ مخواہ بے دھڑک بے بھاؤ کی پٹنہ ہنا میں ایک لطف محسوس کرتے ہیں۔

ان کی زندگی کے بارے میں لکھا جاتا ہے کہ "وہ کسی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، کسی ریاست کے گورنر، ملک کے صدر جمہوریہ غیر ملکوں میں ہندوستان کے فرائض سلیقہ سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مگر دل بدلی گروہ بندی اور ذات پات کی وجہ سے ان سبھی عہدوں سے محروم ہیں جن سے سماج، ملک اور دنیا کا نہ پورا ہونے والا نقصان ہو رہا ہے۔ اس میں وہ سارا قصور وزیر اعظم اور یہاں کے عوام کا مانتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد ہی ان کی بڑائی اور قابلیت سمجھی جا سکے گی ان میں عالمی بھلائی کا خیال کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور وہ مہاتما گاندھی، پنڈت نہرو دونوں سے زیادہ قابل ہیں خدا انھیں سب سے اونچی کرسی اور اونچے عہدے سے نوازے ...!!

جدید فامولا ——— فرحت قادری

اِک "جدیدی" دوسرے سے یوں سخن گستر ہوا
یار! تو بھی سیکھ میری طرح ڈینگیں مارنا

پھاوڑا ہاتھوں میں لے کر رنگ محلوں کو گرا
ایک بھی ماڈل نہ رہنے پائے پچھلے دور کا

"کاغذی ہو پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"
رنگ ہو خود ساختہ آذر کے بیٹوں سے جدا

حضرتِ اکبر بہت عرصہ ہوا، فرما گئے
"کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا"

اب کلرکی تو پڑھے لکھوں کو بھی ملتی نہیں
اس لئے میری طرح شب خونیوں کا بن پچھا

ڈارون صاحب کے پرکھوں کی زباں میں شعر کہہ
ہو اشاروں اور کنایوں میں عمل اظہار کا

کیونکہ اردو، فارسی تو نذرِ آزادی ہوئی
اور گونگی نسل کو ان کی ضرورت بھی ہے کیا؟

اُلٹی سیدھی شاعری کر، جس کا مطلب کچھ نہ ہو
چند بے فکرے، جوانوں کو بنا لے ہم نوا

روشنی کا نام جو لے، اس کی گردن کو دبوچ
بیل گاڑی فکر کی، اندھی دشاؤں میں چلا

کل کی باتیں سب کی سب فرسودہ و متروک ہیں
آج کا انساں، اب وجد کو بھی القط کر چکا

لوگ رستے سے اٹھا لائے تھے اک لمبی سی ناک
اُس کو میں نے اپنے چہرے پر بہ مشکل فٹ کیا

"من ترا حاجی بگویم، تو مرا حاجی بگو"
خیر سے اب تو قلم مجھ کو پکڑنا آ گیا

فن مجھے جانے نہ جانے، میں مگر فن کار ہوں
مستند ہوتا ہے فرحتؔ! میرا فرمایا ہوا

غزل ——— نٹ کھٹ (عظیم آبادی)

ہم نے جب ان سے کہا کہ تو ہمارا میٹ ہے
سن کے وہ بولے کہ جاؤ مجھ کو تم سے ہیٹ ہے

میں نے موجودہ مسائل پر اٹھایا ہے قلم
بات جو بھی کہہ رہا ہوں یار وہ اپ ٹو ڈیٹ ہے

جب پڑی ترچھی نظر کتنے ہی گھائل ہو گئے
حسن والوں کا نشانہ کتنا ایکوریٹ ہے

کر لو شادی جلد ہی پھر ٹل نہ جائے یہ گھڑی
پنڈتوں نے بھی کہا ہے یہ مناسب ڈیٹ ہے

کھا کے رشوت کی کمائی ان پہ چربی چڑھ گئی
ہر منسٹر کا تو ساڑھے تین من اب ویٹ ہے

توند کی ناپی ہے ان کی کتنی اونچی دیکھیے
ایسا لگتا ہے کہ یہ تو گول گھر کا گیٹ ہے

کس طرح نٹ کھٹ بلائے ان کو بزمِ شعر میں
شاعروں کا آج کل اونچے سے اونچا ریٹ ہے

نعیم انصاری (مرحوم)

یہ دنیا بھی عجیب ہے اور اس پر بسنے والے بھی عجیب ہیں۔ کثرتِ اولاد رکھنے والوں کے گھرانوں اور جڑواں بچوں کے تعلق سے عجیب و غریب خبریں آئے دن آتی رہتی ہیں اور سننے والوں کو بحرِ تحیر میں غرقاب کرتی رہتی ہیں۔ منشی منقا اوائلِ عمری میں ایسی ویسی خبریں سن سن کر خاص طور سے پریشان ہو جایا کرتے تھے۔

کوئی نصف صدی پہلے کی بات ہے کہ منور حسین عرف منشی منقا خاندانی زمین دار اور ماں باپ کی گیارھویں اولاد تھے۔ کم سنی میں باپ جاں بحق تسلیم ہوئے تو انھیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔ شب و روز کے مراقبے کے بعد انھوں نے طے یہ کیا کہ ایسی ہوش رُبا خبروں کا گوش شگاف جواب دیا چاہیے۔ نابالغی میں بالغ اور پٹھا جوان ہو جانا ان کی قدرت سے بعید نہ تھا۔ کیونکہ جوان ہونے کا جالینوسی نسخہ ان کی جیب میں تھا جو انھیں اپنی وراثت میں ملا تھا۔

چنانچہ وہ اپنے سسرال کے کھیت میں لوہے کے چنے بونے اور سونے کے منقے اگانے لگے۔ اور معمول یہ بنایا کہ چنا بمع منقے شب میں بھگو کر علی الصبح چبانے لگے اور اس کا پانی اصلی شہد میں گھول کر پینے لگے اور اوپر سے جسمانی مالش بھی کروانے لگے۔ اب دیکھنا کیا تھا۔ پندرہ برس کا بچہ آناً فاناً ۳۰ برس کا پٹھا نظر آنے لگا۔

جوانی نے جو جوش مارا تو سسرال کی طرف بھاگتے اور رستم کی طرح سہراب کی ماں کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے بیل منڈھے چڑھتی نظر نہ آئی تو عملِ رمل کی جانب رجوع کیا۔ پھر ایسا ہوا کہ جس دلہن کی جستجو تھی ایک دن مل ہی گئی جو خیر سے اپنے والدین کی بارھویں اولاد تھی۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ انھوں نے دلہن پر کچھ ایسا جادو کیا کہ مسحور ہو کر ان کی باہوں میں جھولنے لگی۔ احتیاطاً انھوں نے اس کا ڈاکٹری معائنہ کروایا تو معلوم ہوا کہ بڑی زرخیز ہے پس دیر کس بات کی تھی۔ جھٹ منگنی پٹ بیاہ۔

حصولِ آزادی سے سال بیاہ کا ہوتا تھا کہ لوہے کے چنے اور سونے کے منقے اپنا اپنا زور دکھانے لگے۔

ویں مہینے میں ہی ان کے گھر پہلی ولادت ہوئی اور اب جو تانتا بندھا تو مت پوچھئے کہ کتنی اولاد ہوئی۔ ان دنوں نس بندی کا نام ونشان نہ تھا۔ کثرتِ اولاد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ پھر تو ہر سال نیا کیلنڈر چھپنے لگا۔ زیادہ بچے بھی کاج نجال ہوتے ہیں۔ منشی منقا اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ اس لئے نصف درجن تو نام ونمود کے لئے اپنے پاس رکھ چھوڑے بقیہ فالتو پیداوار کو مختلف شہروں میں بسے اعزہ واقربا کے ہاں سال بہ سال تحفہ بھیج دیا اور مرسلہ بچوں کو قصہ پارینہ سمجھ کر فراموش کر گئے۔

جب ایک درجن بچے پیدا ہو چکے تو انھیں خیال گزرا کہ مردم شماری کے موقعہ پر ایک عدد فخریہ اعلان شائع کر دینا چاہئے۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ۱۹۷۶ء میں نس بندی کا چکر چل گیا۔ مرغیاں تو بدستور چگتی رہیں لیکن مرغے پکڑ پکڑ کر ناخروس بنائے جانے لگے۔ کثیر الاولاد مردوں پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ بھلا منشی منقا کب زد پر آنے والے تھے۔ انھوں نے ایسا کیا کہ صرف ایک شیر خوار کو روک کر مزید فالتو گوشت خوروں و سبزی خوروں کو دوسرے عزیزوں کے ہاں گفٹ پارسل کر دیا۔

اس طرح دوران نس بندی منشی منقا ہمیشہ مطمئن رہے اور دکھانے کے لئے نس بندی اسکیم کی حمایت بھی کرتے رہے۔ دوستوں میں پروپگنڈا کرتے پھرتے کہ میری تو ایک ہی اولاد ہے۔ اللہ رکھے۔ باقی تو سب اللہ کو پیارے ہوگئے۔ کوئی جنگِ آزادی میں مارا گیا، کوئی تقسیم وطن میں بے وطن ہوا، کوئی محاذِ جنگ پر کام آیا، کوئی ہنگامے میں گم ہوا، کوئی بلوے میں قتل ہوا، کوئی نعرے بازی میں خاموش ہوا، کوئی دامِ سیاست میں گرفتار ہوا کوئی غریبی کا شکار ہوا اور کوئی مہنگائی میں مبتلا ہوا۔ علیٰ ہٰذا القیاس۔

اور اب سنہ ۱۹۸۰ء کے ساتھ منشی منقا کی ۲۳ ویں اولاد پیدا ہو چکی ہے دیکھئے یہ کیا رنگ لاتی ہے۔

ہمارے ایک دوست جو خیر سے ایک عدد شاعر بھی ہیں۔ اکثر اپنی بات محاورے میں کہتے ہیں ان کی کوئی بات محاورے سے خالی نہیں ہوتی، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر وقت وہ محاوروں کے سمندر میں ڈبکیاں لگاتے رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے نام کے ساتھ لفظ "محاورہ" بطور تخلص فرماتے ہیں۔

ایک دن ہمارے استفسار پر وہ کسی فلاسفر کی طرح اپنی نیم بند آنکھوں کو مزید بند کرتے ہوئے گویا ہوئے۔ جناب شاید آپ نہیں جانتے ہوں گے کہ جو بات محاورے میں کہی جائے، وہ اثر رکھتی ہے جیسے گھر کی مرغی دال برابر، اکثر عورتیں اس محاورے کی ٹانگ تندوری مرغ اور مرغ مسلم کی ٹانگ کی طرح ادھیڑتی رہتی ہیں۔ کیونکہ بے چاری عورتوں کو یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ چاہے لاکھ اپنے مردوں کی خدمت کیوں نہ کرتی ہوں۔ اکثر مردوں پر اسکا رتی برابر بھی اثر نہیں ہوتا اور وہ اپنی بیوی کو کچھ نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس پڑوس کی عورت کتنی ہی بھدی بدصورت اور جھگڑالو کیوں نہ ہو ایسے مرد اس پڑوسن کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ پرائے گھر کی مرغی برابر ہوتی ہے
جب کوئی کسی کے آگے، یہ محاورہ "گھر کی مرغی" دہراتا ہے تو سننے والے میں پانی بھر آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی دل میں دھواں، آنکھوں میں دکھ کے آنسو اور ہونٹوں پر حسرت و یاس کی پرچھائیں رینگنے لگتی ہیں اور وہ بے طرح مرغ پکارنے لگتا ہے۔ کیونکہ آج کل تندوری مرغ اور مرغ مسلم تو کجا۔ پھیکی دال بھی نصیب نہیں ہوتی۔ کیونکہ دال کی قیمت تو آسمان سے باتیں کرنے لگی ہے۔ یہاں یہ بات خارج از بحث ہے کہ آخر یہ ادنی سی دال آسمان سے کیوں آنکھیں ملا رہی ہے۔ زمین سے آسمان سے یا پھر غریب انسانوں سے کیوں نہیں آنکھ ملا رہی ہے۔ یہ تو وہی بتا سکتا ہے جو آسمان سے باتیں کرنا" والا محاورہ بنایا ہے۔

جب کبھی ہم اپنی بیگم صاحبہ کو محض دودھ کی طرح گرم کرنے کے لیے کوئی الٹی سیدھی بات سنا دیتے تو وہ کھٹ سے

کہدیتی تھیں "گھر کی مرغی دال برابر" تو ہمارے مونہہ میں پانی کے ساتھ جگر میں طوفان دل میں آندھی اور آنکھوں میں خون شبنم بن کر بہنے لگتا تھا اور ہم گرم آہیں بھرنے لگتے تھے کیونکہ شادی کے بعد تو کئی ماہ تک ہمارے گھر کسی مرغی کو بکنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ آپ یقین رکھیے۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہ تھا۔ اس معاملے میں ہم ہزار فیصد بے گناہ تھے۔ اور اپنے سچے دل سے اس بات کے کوشاں رہتے تھے کہ ہمارے گھر اپنی دلہن کے مہندی بھرے ہاتھوں سے کوئی مرغی ضرور مرے مگر ہونی اور انہونی کو کون ٹال سکتا ہے۔ ہم جب بھی کہیں کسی آنگن گلی و کوچہ سے کوئی موٹی اور انڈے دینے والی مرغی پکڑ و جکڑ کر لے آتے تو اسے بڑے پیار و دلار سے چاول اور گیہوں کی بجائے قیمتی دال کھلاتے تاکہ بکرو دوکد مرغی حلال ہو جائے اور ہم اسے گھر کی دال سمجھ کر چٹ کر جائیں۔ مگر نصیب دشمنان (شاید یہ محاورہ ایسے ہی کسی موقعے پر کہا گیا ہوگا) اڑائی ہوئی مرغی مزے و آرام سے دنیا بھر کی دال کھا کر شام سے پہلے اپنے اصل مرغے کے پاس نو دو گیارہ بلکہ اٹھارہ ہو جاتی تھی اور ہم اپنا سر پکڑ کر اپنی دال کا حساب کرتے رہ جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ہم ہمیشہ اپنے سسرال پر دھاوا بولنے کے لیے اپنے پر پھڑپھڑاتے رہتے تھے!! اور کوئی موقع ہاتھ سے پھسلنے نہیں دیتے تھے کیونکہ مرغی کہیں ملے نہ ملے، سسرال میں تو ضرور مل جاتی ہے۔ کیونکہ سسرال بذات خود کسی انڈے والی مرغی سے کم نہیں ہوتی اور پھر آپ تو جانتے ہی ہوں گے کہ یہ انڈے والی مرغی کتنی مزے دار ہوتی ہے اور اس مرغی کا چھڑا تو، کیا کہنے، ویسے اگر آپ یہ بات جانتے نہیں ہیں تو جانے دیجیے اور سسرال کی مرغی کے شوق میں شادی مت کیجیے۔ ورنہ شادی کے بعد مرغی کھانے کی بات تو درکنار ہی۔ مرغی دیکھنا بھی نصیب نہ ہوگا ہماری طرح بچا.....
کیونکہ ادھر آپ نے شادی کی۔ اُدھر آپ کی مرغی انڈے پر انڈا دیتی چلی جائے گی اور آپ کو اتنا ہوش نہ رہے گا کہ مرغی مزے دار ہوتی ہے یا مرغی کا چھڑا......!!

اگر دو چار ماہ تک سسرال جانے کا کوئی موقعہ نہیں ملتا اور ہمیں مرغی کی یاد بُری طرح ستانے لگتی تھی تو ہمارا یہ معمول تھا کہ ہم اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے اپنی بیگم صاحبہ کو الو بنانے کی کوشش کرتے اور ان سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے ان کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتے تھے یعنی ان کے میکے پر کوئی الزام لگا دیتے تھے، اس تشخیص کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ بیگم صاحبہ ہم سے اچھی طرح روٹھ کر بلکہ پوری طرح پھوٹ کر اپنے میکے چلی جایا کرتی تھیں اور ہم محض اپنا اکڑپن دکھانے کے لیے دو تین دنوں تک بھوکے پیٹ خدا سے یہ دعا کرتے رہتے تھے کہ اے رازق الرحیم سسر صاحب کو نہ سہی کم از کم کسی سالے صاحب کو ہی بھجوا دے تاکہ ہمارے پیٹ کے چوہوں کا علاج ہو سکے تیسرے دن جب دعا قبول ہو جاتی تو سالے صاحب ہمیں منا کر اپنے گھر لے جایا کرتے تھے۔ اور ہم خوب ڈٹ کر مرغیاں اڑایا کرتے تھے..!!

حسب معمول گذشتہ بار بھی ہم نے ایسا ہی کھیل کھیلا تھا۔ اور بیگم صاحبہ کے جانے کے بعد تین دنوں تک خدا سے دعا کرتے رہے تھے کہ اب کی بار بڑے سالے صاحب کو نہ سہی کم از کم منجھلے سالے کو ہی بھجوا دے تاکہ ہماری انتڑیوں کا شور بہ نہ نکل جائے اور ہم بے موت نہ مر جائیں۔ مگر تیسرے دن بھی ہماری دعا قبول نہ ہوئی تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم اپنی سابقہ پالیسی کو بدل کر خود ہی سسرال ہو آئیں "ہمیشہ کا اکڑپن تو ویسے بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔" اس خیال کے

آتے ہی ہم نے فوراً سے بیشتر سسرال کی طرف مارچ کرنے کا قصد کیا اور ریس کے گھوڑے کی طرح سر پر پیر رکھکر دوڑنے لگے جب ہم سسرال کی دیوڑھی پر پہنچے تو ہماری سانسیں بری طرح　　ہمپ رہی تھیں اور ہم شام تک دیوڑھی پر کھڑے ہانپتے اور کانپتے رہے تھے۔ کیونکہ کسی نے ہمیں اندر آنے کو نہیں کہا تھا۔ ویسے گھر کے سبھی افراد بشمول بیگم صاحبہ کے گھر سے باہر آجا رہے تھے۔ خیر ہم　یہاں بھی اپنی شکست مان کر خود ہی اندر گئے اور بچوں سے کھیلنے لگے اور وقت اس امید پر گزرنے لگا کہ شام کے کھانے میں مرغی کے کباب تو ضرور ہوں گے! مگر وہ شام تو ہمیں ہر شام یاد آتی ہے کیونکہ صبح سے شام اور شام سے رات تک بھی کسی نے ہم سے کھانے کو نہیں پوچھا تھا اور شدید بھوک سے ہمارا جان عزیز کبوتر ہوی جا رہی تھی۔ "مرتا کیا نہ کرتا" کے مصداق ہم نے یہاں بھی مزید اپنی ہار مان کر بیگم صاحبہ سے جو اپنے مونہہ میں پان کی گلوری دبائے مسہری پر شانِ بے نیازی سے لیٹی ہوی تھیں کھانے کے لیے پوچھا تو بیگم نے پان کی پیک کو اگالدان میں تھوکتے ہوئے بولیں اے جی۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ رات کے گیارہ بجنے والے ہیں اور آپ کھانے کو پوچھ رہے ہیں۔ غضب خدا کا۔ کچھ تو اپنی عزت کا خیال کیجئے میں تو اس وقت طعام خانے میں جانے سے رہی! اور ماما تو پتہ نہیں کس آسمان پر اڑ رہی ہوگی جو اسے جگایا جاسکے۔ بس اب تو خدا کا نام لے کر سو جائیے۔ صبح کچھ نہ کچھ انتظام ہو جائے گا۔ اس طرح دوسرے دن صبح دس بجے تک ہمیں بھوک کی اذیتیں برداشت کرنی پڑی تھیں۔

صبح جب ہم دسترخوان پر پہنچے تو دسترخوان پر سوکھی روٹیوں کے ساتھ جلی ہوی دال دیکھ کر ہماری روح فنا ہوگئی تھی۔ اور دل نے اتنی بے عزتی گوارا نہ کیا تو ہم بغیر ناشتہ کے گھر چلے آئے اور پھر کبھی سسرال نہ جانے کی قسم کھالی۔ کیونکہ سسرال والوں کے لیے اب ہم گھر کی مرغی دال برابر ہوگئے تھے۔!

○○

امواجِ تبسم

رہنے کو جب کہیں بھی کوئی جگہ نہ پائی
دنیا سے رکھ کے سر پہ میں اپنی کھاٹ نکلا
دوزخ کو جاکے دیکھا آخر تو وہ مکاں بھی
شیطان روسیہ کے حق میں الاٹ نکلا

(۲)

میری تنخواہ تو اتنی بھی نہیں اے شہباز
ساگ بھی مجھ کو میسر ہو جو جولائی کا
پھر بھی ہر روز اڑاتا ہوں جو میں دودھ دہی
ہے یہ سب فیض مری آمد بالائی کا

۳

مفلس کا جو ہمدرد ہو مزدور کا غم خوار
ایسا کوئی برلا کوئی ٹاٹا نہیں ملتا
جوتے تو بہت ملتے ہیں ہر رنگ کے شہباز
باٹا کی دکاں پر مگر آٹا نہیں ملتا

شہباز امروہوی

غزل

عبدالکریم تاہر
(حیدرآبادی)

بچوں نے کہا شوز دلا کیوں نہیں دیتے
میں نے کہا مسجد سے اڑا کیوں نہیں دیتے
میں وارث مجنوں ہوں جنوں میرا مسلّم
صحرا میری میراث دلا کیوں نہیں دیتے
فرہاد کے آثار پہ ریسرچ کروں گا
ایران کو جانے کا ویزا کیوں نہیں دیتے
شیشے سے گڑ بے کے کوئی کام چلے گا؟
میں کہتا ہوں سیندھی کا گھڑا کیوں نہیں دیتے
یہ کس نے کہا داد گلا پھاڑ کے دیجے
تاشا ہو کہ ڈھیڑا ہو بجا کیوں نہیں دیتے
رکیو میں ہیں کئی قافئے سب کا ہے تقاضا
ماہر ہمیں شعروں میں کھپا کیوں نہیں دیتے

○

مشترکہ غزل

اسداللہ خاں غالب
+
محمد ضمیرالدین صابر
(بہاری)

اس کا انداز لیڈرانہ ہوا
گالیاں کھا کے بے مزہ نہ ہوا
تک چڑھی تک چڑھے میں پٹ نہ سکی
میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا
سی۔بی۔آئی کے لوگ آئے ہیں
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
لے کے رشوت پھنسا تھا دیکے چھٹا
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
مجھ سے بگڑیں لڑیں پڑوسن سے
اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا
بزم میں صابر اب تم ہی تم ہو
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

کرنل محمد خاں

بسلسلہ گزشتہ

لندن : تجدید ملاقات

باربرا سے تب تھوڑی سی بے تکلفی ہو گئی تھی، کہا،
"باربرا، کچھ دیر پہلے میرا خیال تھا تمہیں ایک سونے کا تمغہ دوں۔ اب جی چاہتا ہے دو سونے کے تمغے پیش کروں۔"
"اکٹھے دو تمغے؟ کس تقریب میں؟"
"ایک تو تمہارے حسن کے لئے۔"
"اوہ دوں ..... اچھا ٹھیک ہے اور دوسرا؟"
"تمہارے ہاضمے کے لئے۔"
"مجھے دوسرے پر زیادہ فخر ہوگا۔ لاؤ ٹانکو میرے سینے پر۔"
اور یہ کہہ کر چھاتی اُبھار کر ہمارے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ہم نے باربرا کو تمغے کے انتظار میں کھڑے دیکھا تو بے بسی کے عالم میں ـــــ یعنی بے تمغی کے عالم میں ـــــ اپنی قسمت کو رو لیا! کاش ہمارے پاس اور کچھ نہ ہوتا، ایک تمغہ ہی ہوتا۔ صرف ایک تمغہ! اور ہم اُسے اس کے صحیح مقام پر پہنچا کر سرخرو ہو جاتے لیکن آج ہی گھر میں یوں یا تو ہوا اور خدا جانے غالب نے اُس دن کیا کیا ہوگا، ہمیں کچھ نہ سُوجھا تو اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال اور اندر سے بند مٹھی نکال کر باربرا کے سینے پر لے جا کر کھول دی اور کہا:
"فی الحال یہ لیجئے، دل! بعد میں تمغہ سے کر بدل لیں گے۔"
باربرا ہماری اس حرکت پر جھوم اُٹھی اور بالکل مسحور ہو کر بولی:

"THIS IS CHARMING, IT SOUNDS LIKE OMAR KHAYAM."

ہم نے دل میں کہا : امی تو ایک عمر خیام کی بات کرتی ہے، ہمارے ہاں ہزاروں شاعر دل پھینکنے کے نسخے لکھ رہے ہیں اور ہم نے تو ایک بالکل سادہ اور معمولی سا نسخہ آزمایا ہے ورنہ ہماری شاعری میں تو بڑے بڑے پُر تکلف مرکبات موجود ہیں۔ ایک نمونہ ذہن میں آیا بھی کہ

اک ذرا آپ کو زحمت تو ہوگی آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے

لیکن یہ ہم نے کسی RAINY DAY (مشکل وقت) کے لئے رکھ دیا اور باربرا کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا :

"باربرا معلوم ہوتا ہے تمہیں عمر خیام پسند ہے۔"

"پسند ؟ مجھے اس سے عشق ہے !"

پھر لہر میں آکر خیام کی ایک رباعی کا انگریزی ترجمہ الاپنے لگی۔ ترجمے میں خیام کم تھا اور ترجمان یعنی فٹس جیرالڈ زیادہ لیکن اس انگریزی ترجمے کا سوز و گداز بھی ناقابل انکار تھا۔ باربرا رباعی مکمل کر چکی تو ہم کہ لاہور کے مشاعروں کے تربیت یافتہ تھے، جھوم جھوم کر داد دینے لگے۔ "مکرر" "پھر عطا ہو" بلکہ "سبحان اللہ" کا بھی استعمال بھی کیا۔ باربرا ہمارے انداز تحسین سے اس قدر ڈیکی کہ ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر رباعی دہرانے لگی۔ ہمارا دل تو خیر ہمارے پہلو میں تھا، لیکن باربرا کا دل بھی اپنی سیٹ پر نہ تھا۔

اتنے میں بیرا بل لایا۔ باربرا نے اپنے سرور کی روانی میں اُسے وافر ٹپ دی — بل بالآخر سرکار نے ادا کرنا تھا۔ اور کمل خیر سگالی کے موڈ میں غوث الحسن اور جمیل الدین کو ٹاٹا کرتی ہوئی ریستوران سے باہر نکلی۔ کار میں بیٹھتے ہی گھڑی دیکھ کر بولی :

"اب تین بج رہے ہیں۔ اگلا پروگرام پانچ بجے ہے۔ میں آپ کو دو گھنٹے آرام کرنے کو دیتی ہوں۔ پانچ بجے تیار رہیئے گا۔"

"کس مہم کے لئے ؟"

"ٹے ٹو TATOO کے لئے۔"[1]

"فقط ٹے ٹو کے لئے ؟"[2]

"ٹیٹو تو بہانہ ہے۔ ڈیوک آف ایڈنبرا آرہے ہیں۔"

"ہم نے کہا۔" SO WHAT ?"[2]

ہمارے استغنا سے باربرا سراپا حیرت نظر آئی۔ بولی :

---

[1] فوجی اپنے کرتبوں کی نمائش اور تماشوں کو ٹے ٹو TATOO کہتے ہیں۔

[2] پھر کیا ہوا ؟ بھرپور لاپروائی کے اظہار کے لئے انگریزی ترکیب

"آپ سمجھے نہیں۔ میں کہہ رہی ہوں، پرنس فلپس آرہے ہیں۔ آج ہم انہیں قریب سے دیکھ سکیں گے۔"

"اسی لیے عرض کیا تھا کہ پھر کیا ہوا؟"

"تو آپ نہیں جائیں گے کیا؟"

"ضرور جائیں گے لیکن باربرا کی خاطر نہ کہ پرنس فلپس کے لیے۔"

باربرا اس کھلی خوشامد پر نازاں تو بہت ہوئی لیکن بدستور حیران بھی تھی کہ ڈیوک کی آمد کی خبر سن کر ہم پھڑک کیوں نہیں اٹھے تھے۔

ہم تو رفتی رفتی پر راضی تھے مگر ....

پچھلے پہر شہر سے باہر اسٹیڈیم میں گئے جہاں آدھا مانچسٹر اُمڈ آیا تھا۔ ہمارے لئے ممتاز مہمانوں کی صف میں جگہ مخصوص تھی شہ نشین کے بالکل قریب۔ ہماری وجہ سے باربرا کو بھی اسی صف میں بلکہ ہمارے پہلو میں جگہ ملی۔ پورے سوا پانچ بجے پرنس فلپس کی کار شہ نشین کے سامنے آکر رُکی۔ شہزادے کا کار سے نکل کر حاضرین کی طرف دیکھنا تھا کہ جملہ خواتین کے منہ سے ٹھنڈی گہری اور لمبی آہوں کا کورس نکلا۔ اس کورس میں باربرا کی آہ الگ اور واضح تھی کہ ہمارے پہلو سے اٹھی تھی۔ معلوم ہوا کہ باربرا ڈیوک کو محض رعایا کی آنکھ سے دیکھنے نہیں آئی بلکہ اس کی وجہ کچھ زیادہ بنیادی اور غیر سیاسی قسم کی ہے لیکن فقط باربرا ہی شاہی کشش کی اسیر نہ تھی۔ جملہ میریاں اور مارگریٹیں اسی دھاگے سے کھنچی چلی آئی تھیں۔ چنانچہ پرنس فلپس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے مرد کی دال گلنا ــــ یعنی اگر وہ دال گلانے کے ارادے سے آیا تھا ــــ محال تھی۔ بہر حال یکے بعد دیگرے فوجی ٹیمیں کرتب دکھانے لگیں لیکن سچی بات ہے ہمارے لئے ان کرتبوں کی نسبت ان میموں کی بے تابیاں زیادہ باعث کشش تھیں۔ چنانچہ ہم میمیں دیکھتے رہے، میمیں ڈیوک دیکھتی رہیں اور ڈیوک تماشہ دیکھتے رہے یعنی اس مثلث میں فقط ہمیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ اوروں کی بے توجہی تو خیر، لیکن باربرا سے ہمیں ملائم سا شکوہ ضرور تھا۔ یہ نہیں کہ ہمیں باربرا سے [illegible] کے مکمل مقاطعہ پر اصرار تھا۔ جی نہیں ــــ ہم تو باربرا سے صرف اتنا چاہتے تھے جتنا غالبؔ نے کبھی اپنی باربرا سے چاہا تھا۔

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

ــــ یعنی ہم تو رفتی رفتی پر راضی تھے لیکن جب تک پرنس فلپس موجود تھا، کوئی میم بشمول باربرا ایک فیصدی پر بھی راضی نہ تھی۔

آخر خدا خدا کر کے وہ وقت آیا جب اعلان ہوا کہ اب ٹیٹو کا آخری اور سرپرائز آئٹم SURPRISE ITEM پیش کیا جاتا ہے اور پھر اناؤنسر نے انتہائی ڈرامائی انداز میں کہا:

"خواتین و حضرات۔ دُنیائے موسیقی کی محبوبہ: ویرالن۔"

ویرالن کا نام سنتے ہی تمام ہجوم نے جھوم جھوم کر تالیاں بجانا شروع کیں۔ خود ہم پر بھی اس نام نے ہلکا سا وجد طاری کر دیا کہ دفعتاً ہماری لفٹنی کے زمانے کی یادیں بیدار ہو گئیں جب ہم صحرائے لیبیا میں بی بی سی کے فورسز پروگرام میں ویرا کے گانے سنتے اور سر دھنتے تھے اور ایک چاندنی رات خصوصاً یاد آئی جب قاہرہ کے ایک کیمپ میں ویرا نے بنفس نفیس ہمارے ساتھیوں کے سامنے گایا تھا اور کلیجہ چیر کر رکھ دیا تھا۔ اُن دنوں ویرا اتنی ہی حسین تھی جتنی باربرا آج کل۔ ہم بے تابی سے انتظار کرنے لگے کہ دیکھیں ویرا کے ساتھ گذشتہ پچیس سالوں نے کیا سلوک کیا ہے اور جب آخر کہیں پردۂ غیب سے نمودار ہو کر خراماں خراماں شہ نشین کے بالکل سامنے آکھڑی ہوئی تو پتہ چلا کہ پچیس سالوں نے ویرا کو چھوئے بغیر، ریشم میں لپیٹے رکھا ہے۔ ویرا پہلے سے بھی چند سال کم عمر لگتی تھی۔ اگر ہمیں وطن میں ملکۂ ترنم نورجہاں کے حسن اور عمر کے تناسب کا علم نہ ہوتا تو یقین نہ آتا کہ حسن اُس قدر پائیدار بھی ہو سکتا ہے۔ ویرا کو ارگندل کی طرح ہلکی پھلکی ہی نہ تھی۔ گلاب کی کلی کی طرح بالکل تازہ اور شگفتہ بھی تھی۔ ہم نے ویرالن سے ذاتی تعلقات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سب سے الگ اور خصوصی تالی بھی بجائی۔ اس پر باربرا نے ہم پر سوالیہ بلکہ اعتراضیہ انداز میں دیکھا۔

"واہ، واہ، کس قدر حسین لڑکی ہے یہ ویرالن!"

باربرا بولی۔ "لڑکی نہیں، بڑھیا کہو۔"

"بات عمر کی نہیں، حسن کی ہے اور ویرا کا حسن عمر کا محتاج نہیں۔"

"صرف پلاسٹک سرجری کا محتاج ہے۔"

"اگر یہ سرجری ہے تو اس سرجری پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔"

"ارے تمہیں اِس عورت سے پیار تو نہیں ہو رہا؟"

"فقط پیار۔؟ عشق کہو، عشق!"

عشق تو خیر ہمیں کیا ہونا تھا، اس مکالمے کو طول دے کر ہم اپنے اصلی منصوبے میں کامیاب ہو رہے تھے یعنی باربرا کے دماغ سے پرنس فلپس کو خارج کر رہے تھے۔ پھر دفعتاً ویرا نے گانے کی ابتداء کی اور گیت بھی وہ چھیڑا جو جنگ کے دنوں میں محاذ پر سپاہیوں اور وطن میں محبوباؤں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔

"I DON'T KNOW WHEN,[1]

I DON'T KNOW WHERE,

BUT WE'LL MEET AGAIN,

ویرا کی آواز میں وہی دیرینہ جادو تھا۔ جب اس نے گیت کا یہ حصہ دُہرانا شروع کیا تو کوئی ایک لاکھ کا مجمع مع ہمارے مگر سوائے باربرا کے، ویرا کے ساتھ گانے لگا۔ اور باربرا پرنس فلپس کی بجائے ہمارا گاتا ہوا منہ تکنے لگی۔ گویا ہم نے باربرا

---

[1] ۔ معلوم نہیں کب، معلوم نہیں کہاں، لیکن ایک بار ملیں گے ضرور۔

ماغ کے علاوہ اس کی نگاہ سے بھی بزاراٹل ہائی نس کو خارج کر دیا تھا۔

باربرا رات کے کھانے تک ڈیرک تو بھول چکی تھی لیکن ہمارا ویرالین والا قصور نہیں بھولی تھی بس میٹھے میٹھے گلے
رہی اور ہم عرصے سے سنتے رہے۔ باربراؤں سے بگڑ کرانے میں بھی مزہ آتا ہے۔ غالب نے غالباً اسی لئے نصیحت کی ہے
سے چھیڑ چلی جائے اسد ——— لیکن غالب نے یہ کبھی نہیں کہا کہ چوبیس گھنٹے ہی چلی جائے اسد اور بیچ میں کوئی صلح
بد وقفہ ہی نہ ہو۔ چنانچہ ہم نے غالب کا اندرونی منشا سمجھتے ہوئے ابتدائی چھیڑ کے بعد بتدریج ویرالین کی بے شمار
ں کا اعتراف شروع کیا۔ اور بتدریج باربرا کے گلے ڈھلنے لگے۔ آخر جب مانچسٹر کلب کی لمبی شام تمام ہوئی تو
نہ صرف اپنی رنجشیں بھول چکی تھی بلکہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی، سانسوں میں خوشبو اور زبان پر نغمے!

سڑک کے موڑوں میں حکمت ہے

انگلستان میں شرفا کا دو تین بجے شب سے پہلے سو جانا اور نو دس بجے صبح سے پہلے جاگ اُٹھنا مشکل ہی نہیں،
بھی ہے۔ لہٰذا دوسری صبح نو بجے کے قریب ہمارے کانوں میں ٹیلی فون کی گھنٹی گونجی تو ہم نے بمشکل ایک آنکھ کھولی اور ایک
سے احتجاج کا مضمون سوچتے ہوئے ریسیور اُٹھایا۔ لیکن اُدھر سے باربرا کی مانوس آواز آئی جو گویا ہم سے بھی کمتر وقت
تھی۔ لہٰذا احتجاج کو نگلتے ہوئے اور اپنی اُونگھ میں مٹھاس لاتے ہوئے گڈ مارننگ سے ملتی جلتی آواز نکالی۔ لیکن باربرا کی
ملامت سے ہماری دوسری آنکھ بھی کھل گئی ——— باربرا نیچے ہوٹل کے دروازے پر موٹر کھڑی کر کے لونج میں ہمارا انتظار کر رہی
رہ ہیں سے بول رہی تھی ——— آخر ہماری معذرت کو نیم قبول کرتے ہوئے اس نیم آمرہ نے ہمیں پندرہ منٹ میں حاضر خدمت
کا حکم دیا۔ عام حالات میں اتنے قلیل وقت میں تو ایک مفصل جماہی بھی نہیں لی جا سکتی تھی لیکن یہ خاص حالات تھے۔ دفعتاً
اندر ایک خفیہ کمپیوٹر کام کرنے لگا اور باربرا کی گھڑی پر پندرھواں منٹ ٹِک کرنے والا ہی تھا کہ ہم گریبان کے بٹن بند
حاضر خدمت ہو گئے۔ اس کارکردگی کے عوض باربرا سے سرِ بازار ایک پیار بھری شاباش حاصل کی اور دن کا ایک
بڑی مسافت کا آغاز کیا۔ چیسٹرٹن کا کہنا ہے کہ بَل کھاتے ہوئے انگریز شرابیوں نے بل کھاتی ہوئی انگریزی سڑکیں بنائی ہیں
چیسٹرٹن نے تو یہ شکوہ کیا ہو لیکن باربرا ہمنشیں ہو، کار تیز رفتار ہو، اور قدم قدم پر بَل کھاتے موڑ ہوں تو یہ مقام شکوے کا
شکر کا ہوتا ہے کہ ہر موڑ پر ہم نشیں ہم آغوشی کو جا چھوتی ہے۔ سیدھی ہموار سڑک میں عافیت تو بہت ہے مگر وہ مان
رہے اور زندگی فقط خیر خیریت کا نام نہیں۔

(باقی آئندہ)

THE ROLLING ENGLISH DRUNKARD MADE THE ROLLING ENGLISH
ROAD G. K. CHESTERTON.

کیا ہوگیا ہے باشا

(دکنی)

(۱)

مفلس کے نیچے لنگے!
خالی ہے ان کے پیٹاں
توندان بڑھاریں اپنے
کھا کھا کو موٹے سیٹھاں
آنگاں پو ان کے ڑلن
پاولاں میں ان کے لوٹالا
لنگی کا مفلساں کی
نکلیا ہے ریشہ ریشہ
ہندوستاں کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

(۲)

چُلّے میں نئیں سو لکڑیاں
پاواں جلانا پڑ رائے
لکڑیاں کو ایک کنٹرول
بستر لگانا پڑ رائے
مردے جلانے والے
مردے گڑھانا پڑ رائے
پردے پو زندگی کے
نچھلے کا ہے تماشا
ہندوستاں کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

(۳)

گوڈاؤں میں چھپا تیں
اسٹاک نئیں کا بورڈ
پھڑکاں پو اک ٹنگا تیں
چیزاں کی سوب قیمت
اسمان پو چڑھا تیں
مفلس کی زندگی کا
بجنے لگیا ہے تاشا
ہندوستاں کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

(۴)

ہڑتال گھر کے باہر
ہڑتال گھر کے اندر
پیچھے پڑی ہمارے
کاں کی وِھلس ولندر
ہر اک پکڑ کو جھنڈا
ناچے ہے بن ... بندر
سدھریں گے اپنے لوگاں
ایسی نہیں ہے آشا
ہندوستاں کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

(۵)

صُبح کو لوک دل میں
دوفر کو بنتیں جنتا
سورج ڈبیا تو کانگریس
نوٹاں کی سب کو چنتا
ووٹر کے تیئں کسی کو
ہوتیچ نئیں ہے ممتا
تولہ ہے کوئی پل میں
پل میں ہے کوئی ماشا
ہندوستان کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

(۶)

دنگے مچاتے چُپکا
نیتا ہمارے پھرتیں
بچو کو سیتا سر کی
گھر گھس کو خوار کرتیں
مرنے کو ہیں سو بڈھے
لھو اپنا پی کو مرتیں
نہرو کی اِسں چمن پو
نچے کا پڑتا ئے لاشہ
ہندوستاں کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

(۷)

بہتی ہے یاں پہ گنگا
پیدا ہوئے یاں گاندھی
لوگاں ہیں یاں کے پاون
دھرتی ہے سُنا چاندی
سمجھانے کیکو چلتی
ظلماں کی یاں پہ آندھی
کی ہوگیا ہے میلا
سبکے دلاں کا شیشہ
ہندوستاں کو میرے
کیا ہوگیا ہے باشا؟

کاجل ندیمی
(دھارواڑ)

مناظر عاشق ہرگانوی

مسکراتی باتیں

ہمشیر زادہ:

مناظر عاشق ہرگانوی، علی منیر اور جمیل اختر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ لکھنؤ اور بنارس کے بھانڈوں سے ہوتی ہوئی گفتگو جب طوائفوں تک پہنچی تو جمیل اختر نے بتایا کہ "طوائفیں بھی بڑی حاضر جواب ہوتی ہیں۔ میں ایک شادی میں شرکت کے لیے ایک گاؤں گیا۔ وہاں مشتری نام کی طوائف نے جب ناچنا گانا شروع کیا تو لوگوں نے محسوس کیا کہ وہ حاملہ ہے۔ ایک تک بند شاعر نے چلا کر کہا ؎

حمل نو مہینے کا ہے مشتری کو
کوئی دم میں لڑکا ہوا چاہتا ہے

مشتری نے برجستہ جواب دیا ؎

خوشی آپ کو کیوں نہ ہو اے برادر
کہ ہمشیر زادہ ہوا چاہتا ہے

اس کے بعد متشاعر قسم کے حضرت محفل میں دیکھے نہیں گئے۔"

گلشن کا کاروبار

مظہر امام، مجیب امام، فیاض رفعت اور مناظر عاشق ہرگانوی خوش گپیاں کر رہے تھے کہ فیاض رفعت نے سنایا "فیض احمد فیض اپنی دو غزلیں سنا چکے تو ان سے "گلوں میں رنگ بھرے" کی فرمائش کی گئی۔ فیض نے غزل شروع کی ؎

گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے

سامعین نے ہانک لگائی "یہ گلشن کہاں کاروبار کرتی ہے؟ پتہ بتلا دیجیے۔"

تردید

خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ ہم بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے فرمایا "کسی کالج کے مشاعرہ میں جس کی صدارت پنڈت امرناتھ ساحر کر رہے تھے، طلبا نے ایک شاعر کو ہوٹ کرنا شروع کیا تو ساحر نے اپنی گرج دار آواز میں فرمایا "حضرات خاموش بیٹھیے یہ بزم ادب ہے۔"
"جی نہیں یہ کالج ہے۔" کسی طرف سے آواز آئی۔

ناسمجھ

مناظر عاشق ہرگانوی، علی منیر، اسرائیل راہی، موسیٰ کاظم اور کئی حضرات بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ موسیٰ کاظم نے بتایا "سید شمیم احمد مدنی سنا رہے تھے کہ ایک بار مسجد میں ایک بیل گھس آیا۔

لوگ اس کے مالک کے پاس گئے۔ مالک نے لوگوں کی برہمی دیکھ کر بڑی عاجزی سے کہا۔ "جناب، بیل بے زبان جانور ہے۔ اگر سمجھدار ہوتا تو مسجد نہیں جاتا۔ مجھے دیکھیے میں آج تک نہیں گیا ہوں۔"

صحیح شعر

اسی محفل میں موسیٰ کاظم نے سنایا "ایک مشاعرے میں ایک شاعر نے پڑھنا شروع کیا تو مکرر مکرر کی آواز گونجنے لگی۔ یہ فرمائش اسٹیج پر ہی بیٹھے ہوئے ایک استاد شاعر کر رہے تھے۔ جب شاعر

صاحب پہلے ہی شعر کو چھ سات بار دُہرا چکے تو بولے "اب دوسرا شعر سنئے، لیکن بار بار مت پڑھائیے گا۔"
استاد نے کہا "اس وقت تک پڑھاؤں گا، جب تک کہ آپ درست شعر نہیں پڑھیں گے۔

جواب

سری نگر میں مظہر امام کے یہاں خلیل الرحمٰن اعظمی مناظر عاشق ہرگانوی اور کئی حضرات بیٹھے ہوئے تھے باتیں فحش نگاری پر ہو رہی تھیں خلیل الرحمٰن اعظمی نے دورانِ گفتگو کہا "جب فحش نگاری کے سلسلہ میں لاہور کی عدالت میں عصمت اور منٹو پر مقدمہ چلا تو ان کو اس سلسلے میں دو مرتبہ لاہور جانا پڑا۔ یہ حضرات دونوں مرتبہ وہاں سے سینڈلیں خرید کر لائے۔ ایک صاحب نے بمبئی میں عصمت سے پوچھا۔
"کیا آپ لوگ لاہور مقدمہ کے سلسلے میں گئے تھے"
"جی نہیں جوتے خریدنے گئے تھے" عصمت نے جواب دیا۔

۵۵

تبصرہ
حمید آرموری

علامہ حیرت بدایونی ــــ حیات اور ادبی خدمات

مصنف :- رشید الدین

رشید الدین گزشتہ بیس پچیس سال سے لکھ رہے ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں اس لئے ان کا نام اُردو والوں کے لئے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ نثر کی ہر صنف میں لکھتے ہیں۔ اہل شگوفہ کے لئے بھی ان کا نام نیا نہیں ہے۔ کیونکہ اکثر و بیشتر ان کے مزاحیہ مضامین اس میں چھپتے رہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں رشید الدین نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ ہر صنف میں ایک کتاب بہ آسانی تیار ہو سکتی ہے۔ فی الحال ان کی پہلی تصنیف "علامہ حیرت بدایونی۔ حیات اور ادبی خدمات" میرے پیش نظر ہے جو آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کی اعانت سے منظر عام پر آئی ہے۔ یہ ان کا ایم' اے کا مقالہ ہے جو انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے لئے ۱۹۷۶ء میں لکھا تھا۔

یہ مقالہ ڈاکٹر یوسف سرمست کے زیر نگرانی لکھا گیا ہے۔ عموماً ایسے تعلیمی مقالوں کی نوعیت سرسری اور حوالیاتی ہوتی ہے لیکن رشید الدین کا یہ مقالہ اس ذیل میں نہیں آئے گا۔ اس کی وجہ شاید مصنف کا وہ ادبی کیریئر ہے جو انھیں طالب علموں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ مقالہ بھی امتحانی ضرورت کے تحت ہی لکھا گیا ہے مگر مقالہ نگار کی ادبی صلاحیتوں اور کاوشوں نے اس مقالہ کو ایک مستقل تصنیف بنا دیا ہے۔ اس سے زیادہ رشید الدین کی انفرادیت کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔

جہاں تک علامہ حیرت بدایونی مرحوم کا تعلق ہے اردو ادب میں ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اچھے نثر نگار بھی تھے اور نثر میں ان کی مستقل تصانیف نہیں۔ علامہ حیرت بدایونی کی شخصیت بڑی باغ و بہار تھی جس سے حیدرآباد کی علمی اور ادبی مجلسوں میں جان پڑ جایا کرتی تھی۔ ان کا مزاح کا ذوق بہت بلند تھا اور انھوں نے برسوں حیدرآباد کے مختلف اخبارات میں مزاحیہ کالم لکھے اور مسرتوں کی دولت لٹائی۔

علامہ حیرت بدایونی کی ادبی سرگرمیوں کا کینوس خاصا پھیلا ہوا ہے۔ ادب، صحافت اور شاعری میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں کے بے پناہ جوہر دکھائے ہیں۔ اور شعر و شاعری میں یادگار نقوش چھوڑے ہیں۔ ان سب کا احاطہ کرنا اور انہیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھنا قدرے مشکل کام تھا جو ایک طالب علم کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس لحاظ سے رشید الدین قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنی محنت اور لگن اور کاوش سے حتی المقدور مواد یکجا کر دیا ہے جس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔

کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ علامہ کے حالات زندگی پر مشتمل ہے اور دوسرے حصہ میں ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اس میں علامہ کی نثر نگاری، صحافت اور شاعری تینوں شامل ہیں جنھیں ایک نقاد کی نظر سے دیکھا گیا ہے اور ان کا جائزہ لیا ہے۔ یہاں رشید الدین نے علامہ سے اپنی ساری عقیدت کو بالائے طاق رکھ کر ایک بے رحم سرجن کی طرح نشتر زنی کی ہے۔

ہمیں اس کتاب میں دو شخصیتوں یعنی محترمہ جیلانی بانو (علامہ کی منجھلی صاحبزادی) اور پروفیسر ہادی القادری بدایونی کے بیانات علامہ کی خود نوشت سوانح حیات کے اندراجات نمایاں طور پر ملتے ہیں جس کو نقل کر کے مصنف نے کتاب کے پہلے حصہ کو کافی وقیع بنا دیا ہے جس سے علامہ حیرت بدایونی کی شخصیت اور گھریلو زندگی کے سارے گوشے سمٹ کر نظروں کے سامنے آگئے ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے میں علامہ کی شاعری کے بارے میں شاذ تمکنت کی رائے اور اقوال جگہ جگہ درج کر کے مصنف نے کمال ہوشیاری سے اپنی بات بنائی ہے۔ ڈسٹ کور کے اندرونی فولڈ پر پروفیسر گیان چند جین پروفیسر اردو جامعہ حیدرآباد کی رائے بھی ملتی ہے جس میں انھوں نے رشید الدین کے اس جملہ کو غیر جانبداری کا غماز کہا ہے۔ "علامہ نے جس قسم کی شاعری کی ہے اس سے اساتذہ کے دیوان بھرے پڑے ہیں" اس کے علاوہ کتاب میں ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ کی رائے اور ڈاکٹر مغنی تبسم ریڈر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ رشید الدین نے جو ادب، صحافت اور ترجمہ نگاری کے میدان میں یکساں رفتار سے سرگرم عمل ہیں۔ اپنے اس تعلیمی مقالے کو کتابی صورت میں شائع کر کے ایک طرف علامہ موصوف کے اعزہ اور احباب اور ان کے چاہنے والوں کو ممنون کیا ہے تو دوسری طرف اپنی ادبی عاقبت بھی سنوار لی ہے۔

کتاب کا گٹ اَپ اچھا ہے۔ کتابت اور طباعت گوارہ ہے البتہ ۱۰ روپے قیمت عام قاری کے لئے کچھ زیادہ ہی معلوم ہوتے ہیں۔ زیر نظر کتاب شہناز رشید، مکان نمبر ۱۱۱-۲-۱۲ مراد نگر حیدرآباد ۲۸ کے پتے سے راست منگوائی جا سکتی ہے۔ ■■

○ قارئین شگوفہ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ نامور طنز و مزاح نگار اور شگوفہ کے رکن مشاورت جناب خواجہ عبدالغفور نے ہماری درخواست پر کنہیا لال کپور نمبر کا مہمان مدیر بننا قبول کر لیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ محترم غفور صاحب کی دلچسپی سے یہ نمبر ایک یادگار حیثیت حاصل کرے گا۔ اس خصوصی اشاعت کے تعلق سے تفصیلات کا آئندہ شمارہ میں اعلان ہوگا۔

(مدیر)

SHUGOOFA

Vol 13 Copy 7 — 31 Bachelors Quarters, M.J. Market Hyderabad-1. — July 1980 — Phone : 57

AUGUST 1980
RUPEES TWO
Boss

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۱۳
شمارہ : ۸
اگست ۱۹۸۰ء

سالانہ (۲۲) روپے
لائبریریوں سے (۲۵) روپے
بیرون ہند سے (۳۵) شلنگ
فی پرچہ : (۲) روپے

جنرل منیجر : سمیع جلیل
منیجر : بشیر انور
ٹائیٹل :

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲-

خط و کتابت کا پتہ : ۱۳۱ - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ ، حیدرآباد فون : 57716

سالگرہ کیک اور ویڈنگ کیک کے اسپیشلسٹ
کراچی بیکری

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مفت (انشائیے)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

دخل در نامعقولات (ڈرامہ)

چورن

پرویز یداللہ مہدی

جس طرح رمضان کی عید کے تعلق سے عوام الناس کے ایک بڑے طبقے کا قول ہے کہ عید میں عید رمضان کی عید۔ اسی طرح چاند کے تعلق سے ہمارا یہ قول ہے کہ چاند میں چاند عید کا چاند۔ تاہم رمضان کی ۲۹ ویں شب کو چاند کی جو اہمیت اور قدر و منزلت ہوتی ہے، اتنی تیسویں شب کو نہیں ہوتی بلکہ تیسویں شب کو اس غریب کی حیثیت کم و بیش، گھر کی مرغی دال برابر یا گھر میں شوہر بال برابر سی ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک شناسا ہیں اتفاق سے موصوف کا شمار ملک کے چند گنے چنے غالب شناسوں میں ہوتا ہے چنانچہ غالب شناسی کی روشنی میں عید اور چاند کے آپسی تعلق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جو تعلق مرزا غالب کی شاعری اور ان کے ازار بند عرف ناڑے میں پایا جاتا ہے، وہی تعلق عید اور چاند میں پایا جاتا ہے۔

عید اور چاند کے اس 'ازدواجی' قسم کے تعلق کے ہم بھی قائل ہیں البتہ جو چاند ہماری نظر میں "ہنی مون" کا درجہ رکھتا ہے وہ بقرعید کا چاند ہے۔ نظام شمسی کے دیگر ممبران کو اگر باراتی تصور کیا جائے تو عید کا چاند یقیناً نوشہ قرار پائے گا۔ بقرعید کے چاند کے معاملہ میں ہم ذرا زیادہ ہی جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ دراصل مختلف قمری مہینوں کے تعلق سے مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ مثلاً رمضان کے تعلق سے مشہور ہے کہ اس مبارک مہینہ کا چاند دیکھ کر تلوار دیکھنی چاہیئے چنانچہ ہمارے بچپن میں بڑے خان صاحب رسالدار کی ڈیوڑھی پر، جو ہمارے پڑوسی بھی تھے اور محلے کے واحد اہلِ سیف بھی، لوگوں کا ایک ہجوم رمضان کا چاند دیکھ کر ٹوٹا پڑتا تھا۔ محض خان صاحب کی تلوار کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اس ہجوم میں اکثریت عمر رسیدہ اصحاب کی ہوا کرتی تھی، لیکن اس سے زیادہ ہجوم ذی الحجہ کے چاند کے طلوع ہوتے ہی بقرعید

کی ڈیڑھ ٹانگ پر تماشہ مارتا نظر آتا تھا اور اس ہجوم میں اکثریت نوجوانوں کی ہوا کرتی تھی جسے منتشر کرنے کے لیے خان صاحب کو اپنی خاندانی تلوار دکھانی بلکہ گھمانی پڑتی تھی، لیکن شمشیر بازی کے بہتیرے پینترے آزمانے کے باوجود اکثر ہجوم ٹس سے مس ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ بچپن میں یہ ماجرا کبھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ تلوار بھی ویسی ہی خم دار اور چاند بھی ویسا ہی کمانی دار، لیکن نوجوانوں کا یہ جم غفیر "شرف شمشیر یابی" حاصل کرنے کے باوجود منتشر ہونے کو آمادہ کیوں نہیں ہوتا جبکہ رمضان کا ہجوم تلوار کی ایک جھلک ہی دیکھ کر کائی کی طرح چھٹ جاتا تھا۔ ہم پر اس راز کی 'عقدہ کشائی' اس وقت ہوئی جب ہم خود عقد کے قابل ہوئے یعنی جب ہمیں "صرف بالغوں کے لئے" دکھائی جانے والی ہر فلم میں بلا روک ٹوک داخلہ ملنے لگا تب کہیں جاکر نوجوانوں کے اس مجمع میں ہمیں بھی بخوشی شامل کیا گیا اور جب اس مہم میں خود بہ نفس نفیس شریک ہونے کی سعادت حاصل ہوئی تو یہ راز کھلا کہ نوجوانوں کا یہ گروہ دراصل ذی الحجہ کے چاند کے تعلق سے مشہور اس روایت کو پورا کرنے پر تلا ہوا ہے کہ اس مخصوص چاند کو دیکھ کر کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھنا چاہیئے اور بڑے خانصاحب رسالدار کی اکلوتی لڑکی اُن دنوں محلے کی بیوٹی کوئن (BEAUTY QUEEN) کہلاتی تھی۔ یہ تو خیر اس وقت کی بات ہے جب حُسن سات پردوں میں محفوظ ہوا کرتا تھا لیکن آج حُسن کے بے شمار چاند گھر کی چار دیواری سے نکل کر شہر کی شاہراہوں کے گرد آلود مطلع پر نمودار ہونے کے عادی ہو چکے ہیں، بس لیئے ذی الحجہ کا چاند دیکھ کر کسی خوبصورت قیامت کے دیدار سے شرف یاب ہونا اتنا ہی آسان ہو گیا ہے، جتنا کہ کسی فٹ پاتھ پر گنّے کا شربت نوش فرمانا۔

ایک زمانہ تھا جب عید کے چاند کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا مستحسن تصور کیا جاتا تھا اور اس کے لئے خاص اہتمام ہوتا تھا بڑی تیاریاں کی جاتی تھیں۔ ایک نواب صاحب کے بارے میں تو سُنا ہے کہ عید سے کہیں زیادہ چاند دیکھنے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ دنوں پہلے سے اپنی آنکھوں کی صاف صفائی شروع کر دیتے تھے۔ دن میں کئی بار گلاب کا عرق آنکھوں میں ٹپکاتے۔ بہترین سُرمے کی نفیس سلائیاں آنکھوں میں پھیرتے۔ اس کے علاوہ مصاحبین کی فوج کے ساتھ روزانہ بہ پابندی صبح و شام دو وقت باغ عامہ کی سیر کو جاتے، محض اس لئے کہ بزرگوں سے سُن رکھا تھا ہری ہری گھاس کی تراوٹ بینائی میں اضافہ کرتی ہے جس دن نواب صاحب کسی وجہ سے باغ عامہ نہیں جاسکتے اس دن سبزی منڈی سے ڈھیر ساری سبزیاں منگوائی جاتیں اور پھر انھیں بیٹھک میں اس طرح چُن دیا جاتا کہ دیکھنے والے کو چاہے ساون کا اندھا ہو یا نہ ہو، ہر طرف ہرا ہی ہرا نظر آتا۔ ان ساری 'کارچوبی' تیاریوں کے بعد جس دن چاند متوقع ہوتا صبح ہی سے معہ مصاحبین کے اپنی فصیل نما ڈیوڑھی کے اس مخصوص بُرج پر ڈیرا ڈال دیتے جسے نواب صاحب کے اجداد نے محض اسی "دور مارک" غرض کے لئے تعمیر کروایا تھا یعنی اس "بُرج" پر چڑھ کر یا تو چاند پر کمندیں ڈالی جاتی تھیں یا پھر عشق میں ناکام ہونے کے بعد اختر شماری کی جاتی تھی۔ "چاند نمائی" کی شام نواب صاحب ایسے مصاحبین کو اپنی قربت کا شرف بخشتے جن کی 'نظر بازی' کی شہرت زمانے سے زیادہ زمانہ میں دھوم ہوتی لیکن افسوس اب تو ایسے "نظر باز" ہیں نہ ایسے دُھن کے پکے وضعدار لوگ اور نہ ہی ویسی فرصتیں کہ "بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے"

آج لوگ 'آنکھوں دیکھی' سے زیادہ سُنی سنائی کے قائل ہوگئے ہیں چنانچہ آج کے 'دین دار' لوگ چاند کے مسئلہ کو "رویت ہلال کمیٹی" کے سپرد کر کے خاصے مطمئن نظر آتے ہیں جبکہ دنیا دار لوگ ریڈیو و دیگر وسائل کی بہم کردہ خبروں کو بلا چوں و چرا مستند مانتے ہیں۔

تاہم دنیا کی تمام تر ترقی کے باوجود عید کے چاند کی اب یہ خصوصیت آج بھی برقرار ہے کہ یہ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو نظر نہیں آتا۔ اس کے دیدار سے مشرف ہونے کے لئے دیدۂ بینا چاہیئے اور دیدۂ بینا کے تعلق سے یہ غلط فہمی عام ہے کہ عینک لگانے سے شرطیہ 'دیدۂ بینا' حاصل ہوتی ہے ـــــ یہ در اصل "عینک بردار" حضرات کی پھیلائی ہوئی افواہ ہے۔ اگر عینک لگانے سے واقعی 'دیدۂ بینا' حاصل ہو سکتی تو پھر عینک لگانے کے باوجود بعض حضرات لڑکے اور لڑکی میں اس وقت تک تمیز کیوں نہیں کر پاتے جب تک کہ اچھی طرح چھو کے بلکہ ٹٹول کر نہیں دیکھ لیتے۔ خصوصاً اس فریق کو جس پر لڑکا ہونے کا گمان زیادہ ہو۔

البتہ "دیدۂ بینا" سے محروم حضرات "چاند نمائی" کی اس مہم کو کامیابی سے سر کرنے کے لئے 'سطح مرتفع' سے کچھ قدر بلندی پر پہنچ جاتے ہیں اور خوش قسمتی سے شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد اپنے دامن میں چند ایسے مقامات بھی رکھتا ہے جو سطح مرتفع سے خاصی بلندی پر واقع ہیں مثلاً قلعہ گولکنڈہ، نوبت پہاڑ، چار مینار اور چھپل گوڑا۔ کسی زمانے میں سنا ہے نوبت پہاڑ کو اس سلسلے میں خاص مقبولیت حاصل تھی۔ چاند نمائی کے روز صبح ہی سے ضعیف اور نحیف حضرات چڑھائی کی مہم شروع کر دیتے اور جب کافی مصائب جھیلنے کے بعد اوپر پہونچتے تو وہ منچلے نوجوان جو پہلے ہی اوپر پہونچ چکے ہوتے' ان ستم رسیدہ حضرات پر نوبت پہاڑ کی مناسبت سے یوں طنز کرتے۔ 'نوبت بہ ایں جا رسید' اور پھر متلاشیانِ چاند کے اس ہجوم میں سے جو بھی کامیاب و کامران قافلہ پہلے پیچھے پہونچتا اس کی پیشوائی کو آیا ہوا جم غفیر اسے ہاتھوں ہاتھ لے کر اہلیانِ قافلہ کے مضبوط بازوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کورس میں کہتا کہ "ایں سعادت بزور بازو نیست" لیکن جو معمر حضرات اوپر پہنچ کر بھی اس سعادت سے محروم رہتے جل بھن کر اس توصیفی کلمہ کے جواب میں یوں فرماتے یہ سعادت بزور بازو نہیں حاصل کی گئی ہے بلکہ یوں کہئے "ایں سعادت بزور پاؤں نیست"

ویسے شہر حیدرآباد کی آبادی کا بڑا حصہ آج بھی اپنی تمام تر زائد مصروفیات کے باوجود کچھ دیر کے لئے عید کے چاند کو دیکھنے بلکہ ڈھونڈھنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ البتہ ایسے حضرات جنہیں چاند پہ کمندیں ڈالنے کا محبوب مشغلہ مرغوب ہوتا ہے' وہ عموماً اونچی چھتوں کا انتخاب کرتے ہیں۔

ہلالِ عید پر چونکہ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کا گمان ہوتا ہے اس لیئے محلے کی سب سے اونچی چھت پر سبھی کی نگاہ جاتی ہے۔ لیکن صرف نگاہ کے چھت تک پہنچنے سے بات نہیں بنتی۔ جسم کے دیگر "اجزائے ترکیبی" کا بھی چھت پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے اور اس کے لیئے کوئی نہ کوئی ترکیب لڑا کر صاحبِ چھت سے صاحب سلامت' پیدا کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر صاحبِ چھت کا حلقۂ احباب پہلے ہی وسیع ہو تو پھر چھت چاہے کتنی ہی وسیع و عریض کیوں نہ ہو بیشتر اہلیانِ محلہ "شکوۂ کوتاہیٔ چھت" کر کے رہ جاتے ہیں۔

چھتوں پر چڑھ کر عید کے چاند کی تلاش کرنے والوں کی اکثریت کے بارے میں عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ چاند دیکھنا تو صرف ایک بہانہ ہے ورنہ اصلی غرض و غایت تو کچھ اور ہی ہوتی ہے۔ ایسے نظر بازوں کی نظریں بھول کر بھی آسمان کی طرف نہیں اٹھتیں کیونکہ قرب و جوار کی چھتوں پر طلوع ہونے والے بے شمار زمینی چاند انہیں اپنی طرف الجھائے رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسے ہی موقع پر دو نوجوان چھت پر کھڑے چاند ماری میں مصروف تھے کہ

ایک نوجوان نے خوشی سے چلا کر کہا "وہ دیکھو چاند! مجھے نظر آگیا، ابر کے اُس ٹکڑے کے پاس . . . ."

جواب میں دوسرے نوجوان نے جھلا کر کہا "آہستہ بولو۔ تمہارا یہ شور شرابہ سُن کر کہیں میرا چاند بادلوں کے پیچھے نہ چھپ جائے۔ یہ سُن کر پہلے دوست نے دوسرے دوست کے اِشارے پر دل تھام کر سامنے والی چھت کی طرف دیکھا جہاں واقعی ایک عدد چودھویں کا چاند اپنی ضیاء پاشیوں سے اطراف کی تمام چھتوں پر موجود دِل پھینک (پاشوؤں) نوجوانوں کے خیالات کو منوّر بلکہ مکدر کر رہا تھا۔ اتنے میں چودھویں کے چاند کے پہلو میں ایک عدد 'جھاڑو تارا' نمودار ہوا یعنی ایک عدد کرخت صورت بڑی بی پتہ نہیں کہاں سے ٹپک پڑیں۔ جھاڑو تارے کو دیکھتے ہی نوجوانوں میں بھگدڑ مچ گئی کیونکہ جھاڑو تارے کے تعلق سے یہ بات مشہور ہے کہ عاشقوں کے حق میں اس قدر منحوس ہوتا ہے کہ اس کا سایہ جس عاشق پر پڑ جائے پھر اس کی تواضع ہمیشہ ہر جگہ جھاڑو سے کی جاتی ہے۔ نتیجہ میں دن کے اوقات میں بھی بے چارے کی آنکھوں میں تارے ٹوٹنے لگے۔

ہمارے ایک دوست ہیں جناب شیخ چاند حیا بے حیا (اس دہرے تخلص کی وجہ تسمیہ بس اتنی ہے کہ موصوف سنجیدہ و مزاحیہ دونوں رنگ میں بھنگ ڈالتے ہیں) ابھی پچھلی عید کا ذکر ہے موصوف کندھے سے جھولا لٹکائے ہمارے ہاں پہنچے۔ ہم چاند دیکھنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ علیک سلیک کے بعد جھولے میں سے کچھ زنگ آلود اور عجیب الخلقت "اجزائے پریشاں" نکالتے ہوئے بولے "آج صبح جب پُرانا کاٹھ کباڑ صاف کر رہا تھا تو دادا جان مرحوم کے زمانے کی انگلش دُوربین کے یہ کل پُرزے ہاتھ لگے ہیں۔ آؤ انہیں جوڑ کر اصلی حالت میں لے آتے ہیں پھر دیکھتے ہیں چاند کیسے نظر نہیں آتا؟

اب ہم دونوں ان اجزائے پریشاں کو جوڑنے کی کوشش میں سر جوڑ کر جُت گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان "اجزائے پریشاں" کی پریشانی نے ہمارے "اجزائے ترکیبی" کی فطری ترتیب کو درہم برہم کر دیا۔ تب کہیں جا کر یہ کل پُرزے کسی ترتیب میں آسکے، لیکن اس کے باوجود اس نادر الوجود شئے پر دور بین سے زیادہ "سپیرے کی بین" کا گمان ہو رہا تھا۔ بہرحال اس "بین نما" دور بین کو جیسے ہی آنکھوں سے لگایا۔ یوں لگا جیسے اچانک آسمان نے قلا بازی کھائی اور سیدھے ہماری آنکھوں سے آ لگا۔ گھبرا کے جس کی بلا اس کے حوالے کی۔ اور آس پاس کی بلاؤں کی آنکھوں سے بلائیں لینے لگے۔ کچھ توقف کے بعد حضرت شیخ چاند حیا بے حیا نے زوردار ہانک لگائی "نظر آگیا۔ نظر آگیا وہ دیکھو — وہ رہا — اس دل خوش کن اطلاع کے ساتھ دور بین دوبارہ ہمارے حوالے کر دی، ہم نے جھٹ دور بین آنکھوں سے لگائی اور اس سمت کی طرف دیکھنے لگے۔ جدھر موصوف نے اشارہ کیا تھا، دور بین کے شیشوں سے اچانک — ایک چاند ٹکرایا، چکنا، چمکدار اور مکمل۔ البتہ اس کی گولائی کسی قدر بیضوی تھی — ہم نے سوچا عید کا چاند تو خطِ منحنی کی طرح باریک ہوتا ہے، ہمارے دفتر کی اینگلو انڈین ٹائپسٹ کے مصنوعی ابروؤں کی طرح جب دور بین آنکھوں سے ہٹا کر اس مکمل مگر بیضوی چاند کی طرف دیکھا تو دور بین سمیت چھت پر سے چھلانگ لگانے کو جی چاہا۔ یہ بیضوی چاند ہمارے پڑوسی چھابو میاں دفعدار کی چمکتی فارغ البال چندیا تھی۔ موصوف آسمان کی طرف سر اُٹھائے "چاند ماری" میں مصروف تھے۔ دوسرے روز ہم نے لگے ہاتھوں چھابو میاں دفعدار کو

پکڑا اور لگے ہاتھوں یہ مشورہ دیدیا۔ قبلہ! لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے سے بہتر ہے کہ اگلی عید سے پہلے آپ یا تو کوئی "وِگ" خرید لیجئے یا پھر اگر آپ کو اپنی چندیا دکھانے کا اتنا ہی شوق ہے تو کم از کم جس دن عید کا چاند متوقع ہو ٹوپی پہن لیا کیجئے۔!!

اپنے ملک میں چاند کو بطور تشبیہ استعمال کرنے کا حق یا تو صرف ماں کو حاصل ہے یا پھر شاعر حضرات کو۔ جب ماں کو اپنی سیاہ فام اولاد پر بہت پیار آتا ہے تو وہ بڑے پیار سے چاند کی مٹی پلید کر دیتی ہے۔ اس قسم کے تعریفی جملوں میں استعمال ہونے والے چاند سے مُراد ہوتی ہے۔ چودھویں کا چاند۔ اس کے برعکس عید کا چاند جس کی اہمیت اپنی جگہ عام مہینوں کے چاند سے بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے بطور تشبیہ کے ایسے افراد کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن کے کردار مشکوک ہوتے ہیں یعنی جو اپنی "انڈر گراونڈ" حرکتوں کی وجہ سے "باہر کم" اور "اندر" زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ایسے حضرات جب بھی مختصر سے وقت کے لئے تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے باہر تشریف لاتے ہیں، لوگ ان کی عدم موجودگی کے تعلق سے یوں گلہ کرتے ہیں "بھئی آپ تو عید کا چاند ہو گئے، بڑے دنوں میں نظر آئے۔ البتہ چاند کے تعلق سے شاعر حضرات کے احساسات، جذبات اور نظریات عام لوگوں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں، اس برادری کا چونکہ باوا آدم ہی نرالا ہوتا ہے۔ اس لئے اس قوم کے چاند، ستارے، سورج سیارے، سبھی کچھ الگ ہوتے ہیں، دراصل اس قوم کے ستاروں کی گردش کا تمام تر دارومدار "نظام شمسی" پر نہیں بلکہ "محترمہ ناظمہ شمسی" کے اشارے پر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس برادری کی کسی بات پر لوگ سنجیدگی سے غور نہیں فرماتے بلکہ جس بات کے بارے میں شاعر حضرات خاص طور سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ "مستند ہے میرا فرمایا ہُوا"

ایسی مستند بات کو بھی لوگ بے پَر کی اور غیر معتبر سمجھتے ہیں۔ یہاں پر "مشتے نمونہ از خروارے" کے مصداق چند ایسے ہی مستند مگر بے پَر کی شعر ملاحظہ فرمائیے جس کی کوئی نہ کوئی 'کل' اس 'پرزے' سے ضرور ملتی ہے جو عرفِ عام میں عید کا چاند کہلاتا ہے۔

؎ ہلالِ عید کا کیا ہے دِکھا دِکھا نہ دِکھا — تم ہی نقاب اُلٹ دو کہ عید ہو جائے

؎ اُنتیسویں کو رُخ کی تیرے دید ہو گئی — اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گئی

؎ پوچھا جو میں نے چاند نکلتا ہے کس طرح — زلفوں کو رُخ پہ ڈال کے جھٹکا دیا کہ یوں

؎ جب سے وہ آگئے ہیں مرے گھر میں مستقل — ہر روز روزِ عید ہے، ہر شب، شب برات

شاعروں کے ان شعری شوشوں کے باوجود، چرخ نیلی فام پر جو "شوشہ" نمودار ہو کر مطلع عرض کرتا ہے ہی مژدۂ عید سناتا ہے اس کی اہمیت آج بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا ہے بادلوں کے "دَل" ر ذوق سامعین کی طرح نمودار ہو کر اس قدر "ہوٹنگ" کرتے ہیں کہ بے چارا ہلالِ عید' مطلع عرض کرنا تو ڈائس پہ جلوہ افروز ہی نہیں ہوتا اور ایسے مجبور حالات میں بغیر چاند کے جو عید منائی جاتی ہے وہ کسی زل کی طرح پھیکی اور آدھوری معلوم ہوتی ہے جس کا مطلع نکلا نہ ہو۔!!

محرومیٔ قسمت

ظہیر ابن قدسی

میں کہ اک شاعر اردو ہوں نہایت قلاش
خدمتِ شعر میں گم ہو گئی ہر راہِ معاش
جب بھی چھڑتی تھی غزل گیسو و رخسار کے نام
چولہا ، ہانڈی کو ترستا تھا سحر تا شام
زندگی تھی کسی بیوہ کی جوانی کی طرح
بیوی لگتی تھی مرے بچوں کی نانی کی طرح
ہول آتا تھا یہ منظر جو نظر آتا تھا
آنکھ نم ہوتی تھی اور دل مرا گھبراتا تھا

ایک دن خیر سے غیرت نے لگایا چرکا
فکرِ روزی میں سویرے ہی میں گھر سے نکلا

کوئی پرساں نہ تھا اِس خادمِ اُردو کا یہاں
صاف دکھلاتا تھا یہ شہر قیامت کا سماں
تھی خبر گرم کہ ہم سب کے اُڑیں گے پُرزے
جس گھڑی لیب کے آکاش پہ ہوں گے ٹکڑے
جاں بحق ہوں گے جو ان ٹکڑوں کے نیچے آکر
جان کے بدلے میں پائیں گے ہزاروں ڈالر
میں نے اس آخری موقع کو غنیمت جانا
جس جگہ گرنا تھا اُس کو میں وہیں جا پہنچا

لیکن افسوس کہ کم بخت سمندر میں گری
یہ بھی امریکہ کی مانند فریبی نکلی
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجئے؟
ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں۔ سو وہ بھی نہ ہوا

○

ہزل

مجوب مانجھوی

(حضرتِ قتیل شفائی سے معذرت کے ساتھ)

کس سوچ میں ہیں، دل میں وہ کیا ٹھان رہے ہیں
ہم ان کی ہر اک چال کو پہچان رہے ہیں
تسلیم کریں میاں نہ کریں اپنا بھتیجہ
ہم حضرتِ غالب کو چچا مان رہے ہیں
اب خیر سے شوہر ہیں مرے اِن سے بھی ملئے
کل تک مری کوٹھی کے یہ دربان رہے ہیں
کس منہ سے کہیں حشر میں اللہ کے آگے
شرم آتی ہے کہتے ہوئے انسان رہے ہیں

میخانے میں اک ہم ہی نہیں حضرتِ مجوب
کل رات یہ واعظ بھی تو مہمان رہے ہیں

رؤف خوشتر (گلبرگہ)

مکمل آزادی کی طرح اب صاف ہوا بھی ہماری زندگی سے غائب ہو رہی ہے۔ آزادی کو تو خیر کتابوں، مقالوں، سیمناروں کی قراردادوں اور آئین کی ضخیم جلدوں میں پناہ مل گئی۔ لیکن صاف ہوا۔ نہ جانے کس جنگل میں چھپ گئی ہے۔ مگر اب جنگل ہیں کہاں؟ جنگل تو اب چڑیا گھر، فلم سٹوڈیو یا پھر اس محکمہ کے سرخ فیتہ والی فائیلوں تک محدود ہوگئے ہیں۔

کارخانے، صنعتی ادارے اور سائینسی تجربہ گاہیں فضا کو آلودہ کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے رہے ہیں۔ وادیٔ جمیل ہو یا حسین تاج محل سبھی اس کثافت کی لپیٹ میں آرہے ہیں۔ جہاں سائنس کی بے پناہ ترقی نے ہمیں بادِ سموم بخشی ہے وہاں اس کی ایجادنے بادِ ڈرائنگ روم بھی فراہم کی ہے۔ ان دو ہواؤں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر بالکل مفت، ہر جگہ دستیاب ہے اور اس کے لیے صرف ایک عدد ناک کی ضرورت ہے۔ جبکہ آخر الذکر کے لیے ایک کشادہ کمرہ اور برقی پنکھے کی ضرورت ہے۔

برقی پنکھے کی بدولت اب شرفا و امراء کو بادِ بہاری کے لیے مکانوں سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں۔ شہروں کی ہر ملی فضا کے باعث اہلیانِ شہر اپنے اپنے ڈرائنگ روم تک محدود ہوگئے ہیں۔ آپ نے ڈرائنگ روم کی تنقید، ڈرائنگ روم کا آدمی، ڈرائنگ روم سیاست، ثقافت اور سجاوٹ کی اصطلاحیں سنی ہوں گی۔ اب ڈرائنگ روم کی ہوا ہمارے معاشرے کی ایک اور اصطلاح بن گئی ہے۔

اگلے وقتوں کے لوگ صبح اٹھ کر "ہوا کھانے" جایا کرتے تھے۔ وہ دل کھول کر، پھیپھڑے بھر کر سانس

لیتے اور خوب زور سے ہنستے تھے۔ آج کل لوگ صرف طبی معائنہ کے وقت زور سے سانس لیتے اور فوٹو کھنچواتے وقت ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ عام حالت میں آہستہ آہستہ سانس لیتے ہیں کہ کہیں اس پر بھی ٹیکس نہ لگ جائے۔

اب لوگ دروازہ بند کرکے ڈرائنگ روم میں پنکھا کھول دیتے ہیں۔ پنکھا اور صاحب پنکھا بالترتیب ہوا اور باتیں اگلتے ہیں۔ گفتگو کا موضوع عموماً وہ شخص ہوتا ہے جو اس وقت ڈرائنگ روم میں نہیں ہوتا۔ اس کی خوبیوں کو ہوا میں تحلیل کرکے اس کی خامیوں اور برائیوں کو بیان کرتے ہیں۔ حاضرین کی خاموشی اور معنی خیز مسکراہٹ میزبان و ہوابان کو برائیاں گنوانے کے لیے اور ہوا دیتی ہے۔ جیسے ہی حاضرین میں کوئی اُٹھ جاتا ہے تو صاحب خانہ اپنی تنقید کا نشانہ اس "گذرتے شخص" کو بناتے ہیں۔ اسی لیے بعض حضرات دوسروں کے ڈرائنگ روم کا رخ نہیں کرتے۔

ہم اپنے ڈرائنگ روم کا رخ ہر شام دم سادھے کرتے ہیں۔ اس لیے کہ مکان میں قدم رکھتے ہی بیگم صاحبہ اور بچوں کی نت نئی فرمائشیں ہمارا استقبال کرتی ہیں۔ آج بھی یہی ہوا۔ مکان پہنچتے ہی بچے قدموں سے لپٹ گئے۔ بیگم نے دل نواز مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ ہمارا دل ڈوبنے لگا۔ اس غیر متوقع موافق ہوا کی لہروں میں ہم کسی فرمائش کی بو محسوس کر رہے تھے کہ بچوں نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

"لانڈری والے راموچاچا کی دوکان میں پنکھا آگیا ہے۔ آخر ہم کب تک مفت کی ہوا لیتے رہیں گے۔ آپ ہمارا بھی ایک پنکھا ضرور لائیے۔" ایسے میں بیگم کی خاموشی بچوں کے اصرار کو اور ہوا دے رہی تھی۔

لانڈری چاچا دھوبی ہیں (ہم نے بچوں کو تاکید کردی ہے کہ انہیں چاچا کہا جائے) بھائی چارگی اب سمیناروں، کمیٹیوں کانفرنسوں اور کتابوں سے زیادہ گلیوں میں رائج ہے۔ لانڈری والے چاچا کی طرح ہمارے بچوں کے دوسرے رشتہ دار راشن ماموں، تیل والے خالو اور نل والے پھوپھا ہیں (گیس کا تیل، شکر اور پانی کے حصول یابی کے لیے ان رشتوں کا گنوانا ضروری ہے) آج کل شہری زندگی قسطوں اور ان عصری رشتوں کے سہارے رواں ہے۔

پنکھے کی فرمائش پر ہماری سانس اکھڑنے لگی۔ ہماری دگرگوں حالت کو بھانپتے ہوئے بیگم نے لقمہ دیا۔ "شہر میں لاٹری طرز پر کئی پنکھا اسکیمیں چل رہی ہیں۔ چھوٹے منے کے نام اسکیم میں شامل ہوجائیے۔ اللہ نے چاہا تو پہلے ماہ ہی ہمارا نمبر نکلے گا۔"

اقساط، اسکیمیں لاٹری یہ لفظ کتنے فرحت بخش اور راحت جاں ہیں۔ بہرکیف ہم جیسے تیسے کرکے پنکھا اسکیم میں شریک ہوگئے۔ ہر ماہ مقررہ تاریخ و وقت پر دوکان پہنچتے، شوکیس میں سجے پنکھوں کو حسرت سے دیکھتے۔ نتیجہ نکلتا اور ہم نامراد ہوکر انگریزی اخبار گھر آجاتے۔ غیر متوقع طور پر انگریزی اخبار ہمارے ہاتھ میں دیکھ کر بچے سمجھ جاتے کہ اس بار بھی پنکھا ہمارے سے بچ نکلا۔ گھر کے ہر فرد کو اخبار کا ایک ایک صفحہ تقسیم کیا جاتا اور اس سے پنکھے کا کام لیا جاتا۔ ہندوستان جیسے غریب و ناخواندہ ملک میں انگریزی اخبارات کی کثیر الاشاعت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

اگلے ماہ ہم بیگم کی دعاؤں اور بچوں کی نیک تمناؤں کے ساتھ دوکان پہنچے۔ نتیجہ میں ہمارا نمبر نکلا ہمیں یقین نہیں آیا دوسرے امیدواروں نے پھیکی اور تیکھی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں صاحب پنکھا ہونے پر مبارکباد دی اور چائے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ مجبوراً ایک صاحب کو چائے پلانی پڑی اور اس طرح پنکھے کا پہلا جھونکا ناخوشگوار محسوس ہوا۔ چائے پی کر

ٹھنڈی سانس بھر کر اور ایک ایک انگریزی اخبار لیے وہ اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔

رات جب ہم بغیر اخبار گھر پہنچے تو کسی کو یقین نہ آیا۔ رات بھر ہم پنکھے کا خواب دیکھتے رہے۔ صبح اٹھتے ہی ڈھیر سارے اخبار ردّی والے کو بیچ ڈالے۔ تب گھر میں ہماری بات پر یقین آیا۔ اپنے دوست کے ہمراہ پنکھا لانے کے لیے نکلے۔ دوست نے بتایا کہ پنکھا ہمہ مقصدی چیز ہے۔

"مہمان کو ٹالنا ہو تو پنکھے کی ہوا کھلائیے پھر ایک گلاس پانی پیش کیجیے۔ مہمان ہوا اور میزبان کے تیور دیکھ کر کھسک جائیگا۔ بیوی کے ساتھ کھٹ پھٹ ہوگئی ہو اور آپ ان کی بلاعنوان تقریر سننے کے موڈ میں نہ ہوں تو پنکھے کا رخ بیوی کی طرف کیجیے۔ ساری جلی کٹی باتیں ہوا ہضم کر جائے گی۔ اور آپ کے کان محفوظ رہیں گے۔ خواتین اگر گھر کی صفائی سے بیزار ہو جائیں تو پنکھا کھول دیتی ہیں۔ کچرے کو مجبوراً پڑوسی کے مکان میں پناہ لینا پڑتا ہے۔ پنکھے سے تولیہ کا خرچ بچ جاتا ہے۔ منہ اور ہاتھ دھوکر (اگر دھونا ضروری ہو تو) پنکھے کے روبرو باادب کھڑے ہو جائیے۔ چند سیکنڈ میں آپ کا چہرہ خشک ہو جائے گا اور راز کی بات یہ ہے کہ مہینہ کے آخری ایک دو دن اپنے گھر ہی میں مہمان بن کر پنکھے اور پانی سے آخری دنوں کو ٹالتے رہیئے۔

پنکھا حاصل کرکے ہم نے "بائیسکل رکشہ راں" کو بلایا، رکشہ والے نے پہلے ہمیں اور پھر پنکھے کو دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ہمیں شرمسار کرتا ہم نے اسے رسید دکھائی۔ پنکھے کو سیٹ پر رکھ کر ہم اس کے قدموں میں اسے تھام کر بیٹھ گئے۔ رکشہ والے کو بھرپور سڑکوں اور دوستوں کی گلیوں سے گذرنے کی ہدایت دی۔ راستہ میں انکم ٹیکس کا دفتر تھا۔ وہاں ہم سے پوچھ تاچھ کی گئی۔ پہلی بار محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہونے پر ندامت ہوئی۔

محلہ والوں نے "پنکھا مبارک، پنکھا مبارک" کی صداؤں کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ انجام کار ہم اپنے گھر پہنچے گھر میں ہمارا استقبال اسی طرح کیا گیا جس طرح پرکاش پڈکون کا آل انگلینڈ کپ جیتنے پر کیا گیا تھا۔

ہمارے ساتھ محلہ والوں کا وہ ہجوم تھا کہ ہمیں مجبوراً یہ کہنا پڑا کہ "ہٹ جائیے۔ پنکھے کو ہوا دیجیے" یہ سن کر سب بتدریج ہوا ہوئے۔

بیگم نے پنکھے کو کھول کر باقاعدہ افتتاح کے طور پر دو چار ہوا کے جھونکے پھیپھڑوں میں لے کر وزیروں کی طرح اس افتتاحی تقریب میں بیان دینا ضروری سمجھا اور ان کا بیان تھا کہ "لوگ نہ جانے پنکھے کے بغیر کیسے زندہ رہتے ہیں"۔

افتتاحی تقریب کے بعد دوسرے افراد نے ایک ایک منٹ پنکھے کے سامنے باادب کھڑے ہو جانے اور گہری سانس لے کر آگے بڑھنے کو گھر کی ہوائی فضاء کو برقرار رکھنے کے لئے مناسب جانا۔

اب ہمارا نمبر تھا۔ اس حسین لمحہ کے لیے ہم بڑی دیر سے سانس روکے کھڑے تھے۔ اس سے پہلے کہ پنکھے کی ہوا ہمارے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی، ہمارے پڑوسی مرزا صاحب کی کرخت آواز کانوں کے پردوں کو چیرتی ہوئی پھیپھڑوں تک جا پہنچی۔ وہ ہم سے "پیڈ" مانگ رہے تھے۔ ہمیں ان کی اس مبارک ساعت پر دخل اندازی بہت بری لگی اور جھلا اٹھے۔ ٹالنے کے لیے کہا کہ ہمیں باہر جانا ہے، موپیڈ نہیں مل سکتا۔ وہ اندر آگئے اور کہنے لگے "میں یہی جاننا چاہتا تھا کہ آپ باہر جا رہے ہیں یا نہیں۔ دراصل ہمارے ہاں مہمان آئے ہوئے ہیں۔ مجھے موپیڈ نہیں پنکھا چاہیئے۔ ابھی آپ چونکہ اقرار کر چکے ہیں کہ باہر جا رہے ہیں۔ اس لیے میں پنکھا لیے جا رہا ہوں"۔ اتنا کہا اور پنکھا لے کر چلتے بنے۔ ہماری نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور ہم غش کھا کر گر گئے۔ آخری آواز جو ہم نے سنی وہ بیگم کی آواز تھی۔ وہ چلا رہی تھیں۔ "ارے اخبار لاؤ، ہوا کرو۔ اخبار لاؤ!" مگر اخبار تھے کہاں؟

شہباز امروہوی

دیا پتنی نے جو اک پتر سینما گھر میں	کھل گئے فرطِ مسرت سے کنہیا پرشاد
بولے سب اہلِ تماشا یہ بدھائی دے کر	لیجئے گود میں لالہ، یہ سنیما پرشاد

کوئی خدشہ ہے نہ خطرہ ہے نہ کھٹکا شہباز	چھٹ کے ہم قیدِ غلامی سے فری پھرتے ہیں
انتہا یہ ہے کہ سڑکوں پہ بغیرِ لائسنس	رکھ کے اب سر پہ تھری ناٹ تھری پھرتے ہیں

کچھ خرد کی جو سُن لیا ہوتا
حشر کیوں قیس کا بُرا ہوتا
نسل اپنی بڑھا لیا ہوتا
جو نہ فرہاد سر پھرا ہوتا
کوئی تجھ سا جو دوسرا ہوتا
میں ترے در پہ کیوں پڑا ہوتا
نفس کی بات میں اگر سُنتا
میرا گھر بھی بھرا بھرا ہوتا
فرق کیا ہیر اور گرٹیے میں
شیخ سے پوچھ ہی لیا ہوتا
کیا کمی تھی مرے لیئے بیگم
گر منسٹر ترا پِتا ہوتا
ہم کو آتی جو مصلحت سازی
سر پہ تہمت کا کیوں گھڑا ہوتا
ہم جو کر لیتے وقت پہ شادی
آج اپنا بھی پوترا ہوتا
چمچا گیری کا فن اگر آتا
آج نشتر تو کیا سے کیا ہوتا

محمود نشتر

بہار الدین ریاض

حسینوں کی آمد سے مہکا جو گلشن
مرا دِل ہوا مثلِ تھالی کا بینگن
مُنڈاتے ہی سر پہ پڑے میرے اولے
محبت میں ہوتی ہے ایسی ہی اُلجھن
بسا ہی نہ تھا گاؤں کتوں نے بھونکا
رقیبوں کے ہوتے ہیں ایسے ہی لچھن
کرم اُن کا ہے اونٹ کے مُنہ میں زیرہ
مہینوں میں ہوتے ہیں دیوی کے درشن
وہاں دال بٹتی ہے اب جوتیوں میں
سمجھتے تھے جس کو شریفوں کا مسکن
مجھے اب تو لگتے ہیں انگور کھٹے
دریچے میں ان کے لگا جب [illegible]
ریاض آپ تو کھیر ہیں ایسی [illegible]
سمجھ میں نہ آیا کبھی آپ کا [illegible]

عمر مجید
(سرینگر)

سیزن

ہیلو، یس، نو، تھینک یو، سوری، ہائی، ہو جیسے کارآمد الفاظ کے علاوہ انگریز ہمارے لیے "سیزن" جیسا لفظ بھی چھوڑ گئے ہیں جو ہر سیزن میں ہمارے کام آتا ہے۔ سُنا ہے کہ سیزن کے لغوی معنی موسم کے ہوتے ہیں۔ یعنی کسی خاص مقام کا خاص عرصہ کے لیے فضائی کیفیت کا بیان۔ لیکن ہمارے اس سیزن کا فضائی کیفیتوں سے بہت کم تعلق نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس روز محکمہ موسمیات کی طرف سے اعلان ہوتا ہے کہ آج موسم خشک رہے گا تو دن بھر موسلا دھار بارش ہوتی ہے اور جس روز موسلا دھار بارش ہونے کا اعلان کیا جاتا ہے اس دن آسمان صاف اور روشن نظر آتا ہے اور ہم لوگ سیزن میں بھی بے سیزن ہو جاتے ہیں۔ جس کا اثر محکمہ موسمیات نے براہ راست قبول کیا ہے۔ اسی لیے اب اس محکمے کی طرف سے موسم کے متعلق گول مول پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں۔ مثلاً شام کے وقت ریڈیو پر اعلان کیا جاتا ہے کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں موسم خشک رہے گا البتہ دو ایک مقامات پر گرج چمک کے ساتھ چھینٹیں پڑنے کا امکان ہے۔ دوسرے دن یعنی چوبیس گھنٹوں میں اگر موسم خشک رہا تو پیشین گوئی درست اور اگر گرج چمک کے بغیر ہی زبردست چھینٹیں پڑیں تب بھی پیشین گوئی درست۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ سیزن کا اثر ہے لیکن بعض لوگ اسے سیاست بتاتے ہیں۔ یعنی سیزن اور سیاست کا کوئی بھروسہ نہیں۔ حالانکہ سیاست کے لیے کوئی خاص سیزن نہیں بلکہ سیاست ہر سیزن میں چلتی ہے۔!!

موسم سرما یعنی "ونٹر سیزن" میں ہم مجبوری کی حد تک بے بس یعنی بے سیزن ہو جاتے ہیں۔ جسے دیکھیے شکتی مان کے ناکارہ پہیے کی طرح سکڑا ہوا نظر آتا ہے، ہر کوئی سہما سہما سا، سٹ پٹایا نظر آتا ہے جیسے اپنی کوئی عزیز شے بیتے ہوئے سیزن میں بھول آیا ہو۔ اس سیزن یعنی موسم میں ہر میدان پر ایک سکوت طاری ہوتا ہے جیسے کوئی سیاست دان الیکشن ہار گیا ہو — ریاست وسیاست، علم وقلم، کافی ہاؤس، حلوائی دنا فناک، انگریز ورنگریز، شریف وظریف آفتاب وماہتاب غرض جس شے کو دیکھیے سردی اور کہر کی لپیٹ میں نظر آتی ہے۔ نہ جانے اس موسم کو گلابی جاڑا کیوں کہتے ہیں۔ اس بے بسی کے

سیزن میں وزیروں کے سوا اگر کوئی دوسرا خوش حال وفارغ البال نظر آتا ہے تو وہ انگریزی ادویات بیچنے والا طبقہ۔ سمجھ لیجئے کہ یہ سیزن ان ہی لوگوں کا ہوتا ہے۔ شہر کی کسی تنگ و تاریک گلی میں جہاں تہذیب و شائستگی صحت وصفائی کی طرح ناپید ہوتی۔ اس میں ایک دکان ایسی ضرور نظر آتی ہے جس میں علم طب کی یورپی شاخ اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز رہتی ہے۔ علم طب کی مشرقی شاخ کو تو سیاست چاٹ گئی ہے۔ اس دکان پر جو بھی چڑھتا ہے۔ وہ کھانستا ہوا نظر آتا ہے۔ کھانستے ہوئے ڈاکٹر کو نبض دکھاتا ہے۔ کھانستے کھانستے انجکشن لگواتا ہے۔ کھانستے کھانستے کاونٹر پر جاکر ایک ہاتھ سے نئے کرارے نوٹ کاونٹر والے کو تھما دیتا ہے اور دوسرے ہاتھ ادویات کے بڑے بڑے پیکٹ لیتا ہے اور پھر کھانستے کھانستے دکان سے باہر آکر گندی نالی سے دامن بچاتا ہوا، آوارہ کتوں سے ٹانگ بچاتا ہوا گھر کی سیدھ باندھتا ہے اور رات بھر کھانستا رہتا ہے اور صبح صبح سارا بلغم تھوک کر پھر کھانسنے لگتا ہے۔ یعنی کھانسی نہ ہوئی پھانسی ہوئی جو گلے میں اٹک گئی ہے۔

ادھر ہمارے وزراء کرام ہیں جو ہر موسم میں اعلان کرتے رہتے ہیں کہ "ہم نے بڑی زبردست ترقی کی ہے۔ ہر میدان میں خاص طور سے صحت عامہ کے میدان میں۔ اب سرکاری ہسپتالوں میں غریبوں اور محتاجوں کو نہ صرف مفت کھانا ملتا ہے بلکہ ان کا علاج و معالجہ بھی مفت کیا جاتا ہے"۔ وزراء کرام کے ان خوش آئند اعلانات کے باوجود ہر کوئی کھانستا ہوا نظر آتا ہے شاید یہ سیزن کی کارستانی ہے۔

کہتے ہیں کہ امریکہ میں جب کسی شخص کو زکام ہو جاتا ہے تو اسے فوراً شیشے کے ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے تاکہ دوسرے لوگ اس کے اثر سے محفوظ رہیں۔ لیکن امریکہ امریکہ ہے اور ہندوستان، ہندوستان۔ یہاں ہر سیزن میں لوگوں کو زکام ہو جاتا ہے کبھی سردی کا زکام اور کبھی گرمی کا۔ کبھی خشک زکام اور کبھی تر۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی ادویات بیچنے والوں کا سیزن اپنے وزیروں کی طرح ہمیشہ ہرا رہتا ہے۔ موسم سرما میں ہر کسی کا منہ بگڑ جاتا ہے اور موسم گرما میں انتڑیاں جواب دے دیتی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے شاعر موسم سرما اور موسم گرما کی تعریف میں دیوان لکھتے ہیں۔

موسم بہار میں جب بلبل گاکر سورج کو چمکنے کا مشورہ دیتا ہے اور نرگس آنکھیں کھولتی ہے تو ہمارے ہاں سیاحوں کا سیزن شروع ہوتا ہے۔ ہوٹل اور ہاوس بوٹ ملکی و غیر ملکی سیاحوں سے ٹھسا ٹھس نظر آتے ہیں۔ زندگی جاگ سی پڑتی ہے لیکن اب اس سیزن میں بھی لوگوں کو "سیزن" بڑا پھیکا پھیکا سا لگتا ہے۔ لوگ انگریزوں کے زمانے کے سیزن کو یاد کرتے ہیں۔ اور ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں۔ "یہ بھی کوئی سیزن ہوا۔ سیزن تو انگریزوں کے زمانے میں لگتا تھا۔ کیا شان تھی انگریزوں کی۔ ایک کی بجائے سو روپیہ خرچ کرتے تھے۔ باقی یعنی ریزگاری تو واپس لینا ہی نہ جانتے تھے۔ اور کیا مجال کہ کبھی قیمت پر تکرار کرتے جو مانگا اس سے سوا ملتا"۔ گویا آج کل سیزن لگتا ہی نہیں۔ ملکی تو ملکی غیر ملکی سیاح بھی جیب میں ہاتھ ڈالتے سے ہچکچاتے ہیں۔ بس دال روٹی کا انتظام ہونا چاہیئے وہ بھی سستے داموں۔ تاج محل، نشاط، گلمرگ، اجنتا ہر صورت میں حسین نظر آتے ہیں۔ انسان چاہے دال کھائے یا چکن، سینڈوچ، مغلائی کھانے کھائے یا چینی، سبزی کھائے یا تندوری چکن۔ جمالیاتی شعور کا تعلق ذہن سے ہے نہ کہ معدے کے ساتھ۔ اگر جمالیاتی شعور کا تعلق معدے کے ساتھ ہوتا تو ہر سال ہندوستان آنے والے سیاحوں کی تعداد میں زبردست اضافہ ہوا کرتا۔ وہ ننگ دھڑنگ سیاح جو شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ بھی جمالیاتی

شور کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم انھیں بھی سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔

اس سیزن میں دیگر جملہ امراض کے علاوہ لوگوں کو ایک خاص قسم کی بیماری لگ جاتی ہے۔ اس موسم میں عشق کی بیماری کے جراثیم بڑی تیزی سے پھیلتے ہیں۔ شاید اس لیے کہ خوش گوار موسم کی وجہ سے مستورات کم سے کم لباس کا استعمال شروع کرتی ہیں۔ محکمہ پولیس بھی اس موسم میں خاص طور پر مستعد نظر آتا ہے۔ نہ جانے زمانہ محبت کرنے والوں کا دشمن ہمیشہ سے کیوں رہا ہے۔ اس سیزن میں ہماری پولیس اس قدر چوکنا اور مستعد ہو جاتی ہے کہ ہر دن لاتعداد بیمار عشق حوالات میں پہنچا دیے جاتے ہیں۔ اور ایسا لگتا ہے کہ جیسے پولس والوں کو عشق کی بیماری سے نمٹنے کی خاص تربیت دی جاتی ہے۔ ورنہ ہمارے یہاں سینکڑوں قسم کی ایسی بیماریاں بھی ہیں جن کا سدباب پولس کی معمولی دل چسپی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن پولیس کی دل چسپی کے پس منظر میں چونکہ ہمیشہ مصلحت ہوتی ہے اسی لیے سینما گھروں میں ٹکٹ بلیک کرنے والوں کا ہر سیزن میں ہرا ہوتا ہے۔

دو روپیہ کا ٹکٹ بیس روپے میں بکتا ہے لیکن پولس والوں کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ شاید اس لیے کہ ہماری پولیس کی روح میں بھی جوئیں بھری ہیں۔ اور فرض شناسی کے جذبے پر میل کی موٹی موٹی تہیں جمی ہوی ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو دو روپے کے ٹکٹ ۲۰ روپے میں نہ بکا کرتے، زہریلی شراب بنانے والے شریف نہ کہلاتے۔ رنگی ہوی گھاس کو زعفران کے نام سے نہیں بیچا جاتا، ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان کو نہ چھوتیں۔ رشوت کی دیوی کی حکمرانی نہ ہوتی۔ قانون کے محافظ ہی اپنے سیزن کو ہرا رکھنے کی فکر میں لگے ہوں تو قانون پانی مانگتا ہوا نظر آتا ہے۔

شادی بیاہ کا سیزن کسی بھی وقت شروع ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے یہاں عام طور پر یہ سیزن موسم خزاں میں شروع ہوتا ہے اور ایسے شروع ہوتا ہے جیسے ہر کوئی کنوارا ہو۔ جن کے ہاں شادیاں ہو رہی ہوتی ہیں وہ زبردستی مسکرانا سیکھ جاتے ہیں اور جن کے ہاں شادیاں نہیں ہوتیں وہ ان لوگوں پر ہنستے ہیں جن کے ہاں شادیاں ہو رہی ہوتی ہیں۔ شادیوں کے طفیل اس سیزن میں درزیوں کا بھی سیزن چمکتا ہے اور نئے ڈزائن اور نئے فیشن عام ہوتے ہیں۔ درزیوں کے ساتھ ساتھ آتش بازوں، سناروں، حلوائیوں، مراثنوں، طوائفوں، نائیوں کا بھی سیزن چمکتا ہے۔ غرض جسے دیکھیے دعوت کھانے جا رہا ہے یا کھا کے آ رہا ہے اور علاج کروا رہا ہے۔ اسی سیزن میں سماج میں پھیلی ہوی رسومات بد کا قلع قمع کرنے کا بھی سیزن شروع ہو جاتا ہے۔ کباب و روغن جوش، یخنی و قورمہ، بریانی و پلاؤ کھا کر ہر کسی کو خیال آتا ہے کہ جہیز ہمارے سماج کی سب سے بڑی بدعت ہے۔ ہمارا سماج کھوکھلا ہو چکا ہے۔ زندگی پریشان ہے۔ آسمان دور ہے۔ غریب جہیز کہاں سے لائے۔" دیکھتے ہی دیکھتے سماج سے سدھار کمیٹیاں وجود میں آجاتی ہیں۔ لگتا ہے اس سیزن میں لوگوں کے صرف دو کام رہ گئے ہوں۔ دعوتیں اڑانا اور رسومات بد کے خلاف بولنا یا لکھنا۔ دعوتیں ہضم کرنے کے لیے چورن کی ضرورت کسی موسم میں نہیں پڑتی لیکن جب کسی وجہ سے چورن کام نہیں کرتے تو سماج کے چہرے سے گھناونے پردے اٹھانے والے ادیب و شاعر پیدا ہوتے ہیں۔ ریڈیو اسٹیشنوں اور دوردرشن کیندروں سے ہر روز ڈرامے، فیچر، کہانیاں اور منظوم تخلیقات پیش کی جاتی ہیں کہ جن میں رسومات بد کے خلاف الفاظ کا ایک زبردست سیلاب بہتا نظر آتا ہے یعنی الفاظ ہی الفاظ ہوتا اور حقیقت نگاری عروج پر، انداز بیان دلکش، اور دل میں اترنے والا۔ منظر کشی دلاویز۔ بس ایسا لگتا ہے کہ سماج میں

زبردست انقلاب آنے والا ہے۔ اب کوئی معصوم دوشیزہ جہیز کی خاطر خودکشی نہ کیا کرے گی۔ کوئی مجبور باپ اپنی لڑکی کے جہیز کے لیے اپنی عزت کا نیلام نہ کرے گا اور نوجوان فرشتے بن جائیں گے اور سماج بدل جائے گا۔ لیکن جب سیزن بدلتا ہے تو سماج ویسے کا ویسا نظر آتا ہے۔

اللہ بڑا کارساز ہے لہٰذا ہر کسی کا سیزن لگتا ہے۔ ٹھیکیداروں کا بھی اور انجینیروں کا بھی، افسروں کا بھی اور چپراسیوں کا بھی۔ رنگ سازوں کا بھی اور چمچوں کا بھی، بٹیربازوں کا بھی اور پتنگ بازوں کا بھی۔ استادوں کا بھی اور شاگردوں کا بھی سیزن ہی کی توبات ہے۔ وہ سیزن کیا جو سیزن نہ ہو ـــــ فرق اتنا ہے کہ کسی کا سیزن ہمیشہ ہرا رہتا ہے اور کوئی سیزن میں بھی بے سیزن رہتا ہے۔!!

۵۵

شگوفہ کی ایک بے مثال خصوصی اشاعت

ڈرامہ نمبر

مہمان مدیر: ساگر سرحدی

- ★ فن ڈرامہ پر مضامین
- ★ ڈرامائی شگوفے
- ★ اردو کے علاوہ روسی، جرمن، انگریزی، مراٹھی، بنگلہ، تلگو، سنسکرت، پنجابی، اڑیہ اور گجراتی سنجیدہ و مزاحیہ ڈراموں کے تراجم

صفحات ۲۵۴

قیمت ۲۰ روپے

لائبریری ایڈیشن ۲۵ روپے

رقم بذریعہ منی آرڈر موصول ہونی چاہیئے۔

منیجر شگوفہ، ۳۱ مجرد گاہ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

وزیر اعظم کا ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام محنت کرنے والے کروڑوں عوام کے لئے ایک نعمت کی حیثیت رکھتا ہے

ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی جانب سے شروع کردہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام بلاشبہ آندھرا پردیش کے لیئے ہمہ گیر ترقی اور پیش رفت کی علامت کی حیثیت رکھتا ہے۔ کروڑوں کچلے ہوئے اور کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والوں کی ترقی کے لیئے کی جانے والی کوششوں میں اس پروگرام کی بدولت ایک نیا باب کھلا ہے اور کروڑوں کی تعداد میں کمزور طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کی زندگی میں ایک نئی اُمید پیدا ہوئی ہے۔

حقائق خود اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں :

ریکارڈ زرعی پیداوار :

سال ۷۹ - ۱۹۷۸ء میں غذائی پیداوار ۱۰۶ لاکھ ٹن کی ریکارڈ حدوں تک پہنچ گئی خشک سالی اور طوفان کے باوجود ہنگامی منصوبوں کی سرعت کے ساتھ عمل آوری کے نتیجے میں ۸۰ - ۱۹۷۹ء میں ۷۰ لاکھ ٹن پیداوار حاصل ہوئی۔

عوام کے لئے سستے کپڑے :

دستی پارچہ بافی کرنے والے ۶۰ فیصد بنکروں کو کوآپریٹیو اداروں کے دائرہ عمل میں لایا گیا ہے سستے کپڑے کی پیداوار سال ۷۸ - ۱۹۷۷ء میں ۱۸۹ لاکھ مربع میٹر ۷۹ - ۱۹۷۸ء میں ۲۱۳ لاکھ مربع میٹر اور ۸۰ - ۱۹۷۹ء میں ۳۳۰ لاکھ مربع میٹر تک پہنچ گئی۔ ۳۸۸ تاجروں کے توسط سے بازار میں سستا کپڑا عوام کو مہیا کیا جارہا ہے۔

سستے نرخ کی دوکانوں کے ذریعہ اشیائے ضروریہ کی فراہمی :

۲۲ ہزار سستے نرخ کی دوکانوں کے ذریعہ عوام کو اشیاء ضروریہ فراہم کئے جارہے ہیں۔

سلسلہ صفحہ ۲۲ پر

اصلاحات اراضی ریاست میں اصلاحات اراضی کو پوری قوت کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا جس کے نتیجے میں ۹ء۴۴ لاکھ ایکڑ فاضل زمینات حاصل ہوئیں ۔ ان زمینات کو ۱،۷۴،۱۲۵ خاندانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ زمین حاصل کرنے والے بیشتر خاندانوں کا تعلق درج فہرست اقوام درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات سے ہے ۔

کمزور طبقات کے لئے مکانات

اس اسکیم پر بڑے ہی جوش و خروش کے ساتھ عمل آوری کی جا رہی ہے ۔ ۵ ہزار نئی رہائش گاہیں تعمیر کی جا چکی ہیں جن میں ۲۶۵ لاکھ خاندان رہائش پذیر ہیں۔ ۱۲ لاکھ غریب خاندانوں کو مکانات کی تعمیر کے لئے اراضیات فراہم کی گئی ہیں ۔

DIRR/1/80

اعجاز علی ارشد
(پٹنہ)

شادی کے اصل معنی خوشی ہوتے ہیں مگر اس سے خوشی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے غزل کے لغوی معنی عورتوں کے ساتھ بات چیت کرنے کے ہیں مگر آج کل غزل میں صرف اپنے آپ سے بات کی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں پچھلے کئی صدیوں سے شادی کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں زیادہ سے زیادہ نمائش کے ساتھ زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عہد کریں۔ یہ عہد کرنے کے لیے پنڈتوں، ملاؤں اور پادریوں کی بھی خدمات حاصل کی جاتی ہیں اور عدالت کی بھی۔ یہ دوسری بات ہے کہ شادی کے زیادہ سے زیادہ دوسرے ہی سال سے لڑکا اور لڑکی دونوں ہی اپنے اپنے اس عہد پر پچھتانے لگتے ہیں۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے؟ جس طرح امتحان میں فیل ہو جانے والا طالب علم پڑھی ہوئی کتاب کو دوبارہ بلکہ بار بار پڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح شوہر نام کے قاری کو بھی بیوی نام کی کتاب بار بار پڑھنی ہوتی ہے اور بیوی ایک ایسی حوالے کی کتاب (Reference book) بن جاتی ہے جس کے اوراق الٹے بغیر کام نہیں چلتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ مرد بوڑھا ہو سکتا ہے۔ مگر بڑھاپے کو قبول کرنے میں ہمیشہ تنگ دلی سے کام لیتا ہے۔ اس لیے شادی کے وقت خواہ لڑکے کی عمر پچاس برس ہی کیوں نہ ہو، وہ لڑکا ہی کہلاتا ہے اور اگر یہ اس کی پہلی شادی ہے تو اسے سسرال والوں کو ستانے کا اتنا ہی حق حاصل رہتا ہے جتنا کسی پچیس سالہ لڑکے کو ہو سکتا ہے

آج کل شادی سے پہلے عام طور پر عشق کیا جاتا ہے بلکہ جو نہیں کرتا اسے بے وقوف سمجھا جاتا ہے۔ ویسے تو عاشق کو سزا دینا بالکل نا جائز ہے چونکہ عشق کے بعد زیادہ تر بات چیت ہی تو ہوتی ہے اور جدید لغت کی رو سے لڑکیوں کے ساتھ بات چیت کرنا مہذب ہونے کی نشانی ہے البتہ ان کو بھگا لے جانا جرم ہے۔ لیکن اسے کیا کہا جائے کہ جب اس عقل مندی کا راز کھل جاتا ہے تو جس طرح ارسطو اور افلاطون کو عقل مندی کی سزا ملی تھی عاشق کو بھی ملتی ہے۔ اور یہ سزا کیا ہے۔؟

بقول شخصے

عاشق کو محبت کی سزا کیوں نہیں دیتے
تم لوگ اسے باپ بنا کیوں نہیں دیتے

لیکن اس پردہ اٹھنے سے لے کر ڈراپ سین تک کچھ اور بھی منظر ہوتے ہیں جو شادی کا سے کم اہم نہیں ہوتے ہیں۔
شادی کے پہلے اور بعد کا منظر بالکل مختلف ہوتا ہے۔ جہاں تک لڑکے کے حلیہ کا تعلق ہے شادی سے پہلے اس کے چہرے سے داڑھی غائب رہتی ہے اور سر کے بال بڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد داڑھی اکثر بڑھی رہتی ہے اور سر کے بال غائب ہونے لگتے ہیں۔ لڑکی کا حال یہ ہے کہ شادی سے پہلے وہ عام طور پر دبلی پتلی اور جاذب نظر دکھائی دیتی ہے اور اپنے بناؤ سنگھار پر بھی کافی وقت صرف کرتی ہے۔ شادی کے بعد کچھ تو بناؤ سنگھار کی ضرورت نہیں رہتی اور کچھ فرصت نہیں رہتی۔ اس لیے شادی کے بعد عام طور پر ملازم پیشہ لوگوں کی بیویاں صرف مہینے کی پہلی دوسری تاریخ کو خوب صورت دکھائی دیتی ہیں۔ لطف یہ ہے کہ مرد بھی عورتوں کی اس فطری کمزوری کو خوب سمجھتے ہیں اور مہینہ میں ایک بار ہی سہی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا ہی لیتے ہیں۔

شادی کا معاملہ بڑی حد تک مشاعروں سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ جس طرح مشاعرہ پڑھ لینے کے بعد شاعروں کو کوئی نہیں پوچھتا بلکہ اکثر تو اگر وہ معاوضہ کی کچھ رقم ایڈوانس نہیں لیے ہوتے تو انہیں اپنے ہی خرچ سے واپس بھی آنا ہوتا ہے۔ اسی طرح شادی کر لینے کے بعد لڑکے کو کوئی نہیں پوچھتا اور گھر میں رہنے کے باوجود وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ پھر بے چارہ لڑکا جاب شوہر اور بعض صورتوں میں باپ بن چکا ہوتا ہے، کبھی دوسروں سے اور کبھی خود سے بھی جھوٹ بول کر دل کو تسلی دیتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بیان کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ایک صاحب کو فلم میں کام کرنے کا بہت شوق تھا اور وہ اکثر اپنے دور کے نئے فلمی اداکاروں کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کیا کرتے تھے مگر کوئی یقین ہی نہیں کرتا تھا۔ آخر کار ایک دن دوستوں کے مجمع میں کہنے لگے "بھائیو! پچھلے دنوں میں بمبئی چلا گیا تھا۔ وہاں ایک فلم میں کام کیا ہے۔" دوستوں کو بڑا تعجب ہوا۔ ایک نے پوچھا "اچھا تو تم ہیرو بن گئے؟"

کہنے لگے "نہیں تو، وہ دراصل قصہ یوں ہے کہ فلم میں ایک مکان تھا اور اس مکان کے اندر ایک نوکر بیٹھا ہوا تھا...

ایک دوست نے بات کاٹ کر کہا "اچھا تو وہ نوکر تم تھے؟"

وہ صاحب کہنے لگے "نہیں یار میں نوکر نہیں تھا۔ تم پہلے پوری بات تو سن لو۔"

دوست خاموش ہو گئے تو وہ پھر بولے "جب نوکر بیٹھا ہوتا ہے تو دروازہ پر دستک ہوتی ہے۔" ایک دوست نے پھر بات کاٹی "اور تم مہمان بن کر آ جاتے ہو۔"

"نہیں یار" وہ ذرا جوش سے بولے۔ "نوکر دروازہ کھول کر باہر آتا ہے تو باہر کوئی بھی نہیں دکھائی دیتا اور جو کوئی دکھائی دیتا وہ میں تھا۔"

زندگی کی فلم میں پارٹ ادا کرنے کے باوجود شادی کے بعد شوہر کا وہی مقام ہوتا ہے جو بمبئی کی فلم میں دروازے پر دستک دینے والے کا تھا۔ گویا ع

ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔

ویسے شادی کے بعد صرف دکھ ہی دکھ نہیں ملتا ہے۔ کم از کم شادی کا پہلا سال تو ایک حسین خواب کی طرح ہوتا ہے اور بعد میں جو عذاب ہوتا ہے تو وہ نظام قدرت کے عین مطابق ہے۔ چونکہ یہ ساری دنیا ہی ہر لمحہ تبدیلی کا شکار ہوتی رہتی ہے۔ ویسے شادی کے وقت عام طور پر لڑکا خوش نظر آتا ہے اور لڑکی رنجیدہ۔ شادی کے بعد معاملہ الٹ جاتا ہے۔ ہم نے ایک دوست سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے یہ قصہ سنایا جو کچھ اس طرح تھا کہ کسی شادی کے موقع پر حسب دستور دولہا خوش تھا اور دولہن رو رہی تھی۔ دلہن کی سب سے چھوٹی بہن کو جب ان دونوں کے ہنسنے اور رونے کی وجہ سمجھ میں نہ آئی تو اس نے اپنی ایک رشتے کی بہن سے پوچھا کہ باجی کیوں رو رہی ہیں؟ بہن نے جواب دیا کہ ان کی شادی ہے اس لیے رو رہی ہیں۔

بچی نے پھر پوچھا ـــــ مگر شادی تو دولہا بھائی کی بھی ہے اور وہ خوش ہیں"

بڑی بہن بولی" بات یہ ہے کہ تمہاری باجی کو صرف آج ہی رونا ہے اور تمہارے دولہا بھائی آج کے بعد سے زندگی بھر روتے ہی رہیں گے"

یہ تو ہوئی ان شادیوں کی بات جو شادی کی عمر آنے پر ہوتی ہیں۔ مگر کچھ شادیاں بچپن میں بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسی شادیوں کے بارے میں ایک بالغ نظر کا کہنا ہے کہ "جن کی شادیاں لڑکپن ہی میں ہو جاتی ہیں وہ گویا پیدا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں"

شادی کے لیے سب سے ضروری چیز پیسہ ہے۔ پیسہ بینک میں بھی رکھا جا سکتا ہے مگر شادی کے وقت اور شادی کے بعد اسے جیب میں رکھنا پڑتا ہے تاکہ ضرورت کے وقت دوسروں کی جیب میں ٹرانسفر کیا جا سکے۔ شادی سے پہلے لڑکی والوں کا زیادہ خرچ ہوتا ہے چونکہ انہیں لڑکے کی خواہشیں پوری کرنی ہوتی ہیں۔ شادی کے بعد صرف لڑکے کا خرچ ہوتا ہے۔ چونکہ اسے بیوی کی فرمائشیں پوری کرنی پڑتی ہیں آج کل عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ شادی کے بعد مرد غلام بنجاتا ہے گر یہ بات سو فیصد درست نہیں ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ایک ٹریولنگ کمپنی نے اعلان کیا کہ جو ملازمین اپنی بیویوں کے ساتھ پیرس کے سفر پر جانا چاہیں انہیں فری ایرپاس دیا جائے گا۔ آخری تاریخ تک کئی لاکھو درخواستیں موصول ہوئیں۔ پھر کمپنی نے ایک اور اعلان کیا کہ درخواست بھیجنے والے اپنے گھر کا پتہ اور بیویوں کا نام بھی لکھوا دیں تاکہ فری پاس ان کی بیویوں کے نام تحفے کے طور پر بھیجا جا سکے۔ یہ اعلان ہوتے ہی کل ننانوے لوگوں نے اپنی اپنی درخواستیں واپس لے لیں۔ جس ایک شخص کی درخواست باقی رہ گئی اس کے بارے میں معلوم ہوا کہ صرف ایک ہفتہ بعد اس کی شادی ہونے والی تھی۔

آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ شادی کے بعد مرد کی آزادگی پہلے ختم ہو سکتی ہے آزادی نہیں۔ چور چوری سے جائے مگر ہیرا پھیری سے نہیں باز آتا۔ اس لیے بلا کسی تردد کے شادی کر ہی ڈالیے۔

○○

جوہر سیوانی

ماراچہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت

دفتر سے مکاں آتے ہی چولھے پہ پدر رفت — اور اپنی سہیلی کو لیے فلم مدر رفت
شاعر پہ دمِ فکر جو بیگم کی نظر رفت — شوہر کو وہ دوڑاتی ہوئی جانب در رفت
گھر کا نہ رہا گھاٹ کا داماد بچارا — وہ اپنا مکاں چھوڑ کے جب ساس کے گھر رفت
جب بے ہنری چھا گئی ہر شعبۂ فن پر — چپکے سے دبائے ہوئے دُم علم و ہنر رفت
شاگرد سُناتا بھی تو کیا خاک سُناتا — اُستاد غزل جیب میں رکھے ہوئے گھر رفت
ہونے لگے ہپّی جو دِساور سے درآمد — اِس ملک سے بھی تفرقۂ مادہ و نر رفت
نَس بندی شوہر سے مساوات ہے گھر میں — فرقِ من و تو کشمکشِ زیر و زبر رفت
ہنستے کبھی روتے تو کبھی موج میں گاتے — جو پیار کا دیوانہ تھا وہ پیار نگر رفت
پہنے ہوئے پوشاکِ مصیبت غمِ دوراں — جس دن میرے گھر آیا مِرا کاسۂ زر رفت
سُسرال میں جس روز سے خود جا کے بسا ہوں — اُس روز سے بیوی کی جدائی کا اثر رفت
بن جائے گا وہ شخص شرافت کا لُٹیرا — اِس دور میں جس شخص کی دولت پہ نظر رفت

جوہر نے کہا ہم تو ہیں آگاہ ہیں سب کا
"ماراچہ ازیں قِصّہ کہ گاؤ آمد و خر رفت"

○

ضمیر الدین ساجد

پھانسی کا پھندا

ایک بچّے کو جب نرس نے ڈالا میرے آگے — کرتی کا میرے پھل، وہی آیا میرے آگے
سالی نہیں تو سالا ہی جھگڑے میں مرے گا — ہر روز ہی ہوتا ہے یہ جھگڑا میرے آگے
سسرال میں بیوی کے جو کرتوت سُنایا — چپ ہوگیا سن کر میرا سسرا میرے آگے
بیگم سے میں سسرال میں ملتا بھی تو کیسے — "سالی میرے پیچھے ہے تو سالا میرے آگے"
میں ایک ہی لنگوٹ پہ دس کُشتی لڑا ہوں — کیا چیز ہے پھر رستم و دارا میرے آگے

چھ بچوں کی ہر روز فکر کھاتی ہے مجھ کو
آتا ہے نظر پھانسی کا پھندا میرے آگے

دن ہمارے بیکاری کے

شیخ رحمٰن اکولوی

لوگوں کو اکثر کہتے سنا ہے "بیکار ہیں کام کی تلاش میں ہیں۔" اب ان بیکاروں کو کون بتائے کہ کام کی تلاش بذاتِ خود ایک مشکل کام ہے۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ ہم بیکار تھے۔ ایک دن رفیقِ عزیز ضمیر ساجد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ہماری طرح وہ بھی بے کاری کے مارے ہوئے ہیں۔ وہ جب کبھی، جہاں کہیں، جس کسی سے کام مانگنے جاتے ہیں تو یہی جواب ملتا ہے۔ "صاحب! بے روزگاروں کے دفتر میں نام درج کراؤ۔ کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا۔ ادھر ادھر گھوم کر کیوں بے کار وقت ضائع کرتے ہو؟" اب ان صاحبان کو کیسے سمجھائیں کہ بے روزگاروں کے دفتر میں نام لکھوانا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ کچھ بیکاروں نے بے روزگاروں کی دن بدن بڑھتی ہوئی بھیڑ سے فائدہ اٹھا کر مذکورہ دفتر میں نام درج کروانے کا کام شروع کر دیا ہے۔ یہ لوگ بے کاروں سے کچھ روپئے لیتے ہیں اور اس کمائی کا ساٹھ فی صد دفتر کے بابو کو دے کر پچھلے دروازے سے اندراج کرا دیتے ہیں۔ اب ہم جیسے لوگ جن کے گھر چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں ان ایجنٹ حضرات کو مطلوبہ رقم کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ اور اگر نام کا اندراج ہو بھی جائے تو اس کی کیا گیارنٹی ہے کہ کام ملے گا ہی؟ (اس ضمن میں گذشتہ اطلاعات بڑی حوصلہ شکن ہیں) ہم سے پہلے جن لوگوں نے اندراج کروایا تھا انھیں دفتر کی طرف سے آج تک کوئی بلاوا (انٹرویو کال) نہیں آیا جب کہ ان کی اولادیں بھی دفتر میں نام درج کروا چکی ہیں۔ بے روزگاروں کے دفتر کی معرفت کسی بے روزگار کو کام تو نہیں ملا البتہ بے روزگاروں کے دفتر کے اسٹاف میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے کہ کام بہت بڑھ گیا ہے۔

باتوں باتوں میں ضمیر ساجد صاحب نے بتایا کہ اکولہ میں صابن بنانے والی ایک نئی کمپنی قائم ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم دونوں فیکٹری کے منیجر کے پاس جا پہنچے کہ شاید کام مل جائے۔ منیجر نے ہماری روداد سننے کے بعد کہا "آپ ہماری نئی صابن "صفا چٹ" کے اشتہارات شہر میں چاروں طرف چسپاں کر دیں۔ اس کام کے عوض آپ کو ایک معقول رقم دی جائے گی۔"

ہم نامعقولوں نے یہ سوچ کر کہ کچھ نہیں سے، کچھ ہی سہی، اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم نے طے کیا کہ اشتہارات رات میں چسپاں کریں گے کیونکہ دن میں پریشانی ہوتی ہے۔ کسی دوکان، مکان، ریستوران کی دیواروں پر اشتہارات لگانے سے پہلے

مالکان سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ البتہ رات کو یہ پریشانی نہیں ہوتی۔ دوکان، ریسٹوران سب بند ہوجاتے ہیں۔ دیواروں، دروازوں اور کھڑکیوں کا کیا ذکر، آنگن میں سوئے ہوئے آدمی کے پیٹ اور پیٹھ پر بھی اشتہارات چسپاں کیے جاسکتے ہیں۔

رات میں ایک بجے ہم اشتہارات کا بنڈل اور منیر ساجد جکی کا ڈبہ لے کر محلے سے نکلے۔ اس نوعیت کا یہ پہلا کام تھا جو ہم رات میں کرنے نکلے تھے۔ اس لیے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی غیر قانونی کام کرنے نکلے ہیں۔ مالی پورہ چوک جاتے ہوئے ہم سبھاش چوک سے گذرے تو ہم نے دیکھا کہ آٹھ آدمی سڑک کے کنارے الکٹرک پول کے نیچے تاش کھیل رہے تھے۔ ہم لوگ ان کے پاس سے گذرے تو وہ ہمیں گھورنے لگے اور ہمارے متعلق لیل باری باری رائے زنی شروع کردی۔

پتہ نہیں کون لوگ ہیں؟ اتنی رات گئے کدھر جارہے ہیں؟"

"یہ کہو کیا کرنے جارہے ہیں؟"

یہ سنیما کے پوسٹر لگانے والے ہیں شاید؟

"چور اچکے بھی آج کل بہت ہشیاری سے کام لینے لگے ہیں۔"

ہم یہ سوچتے ہوئے وہاں سے چپ چاپ گذر گئے کہ رات کی سیاہی ذہن انسانی میں کالے کاموں کا تصور پیدا کرتی ہے، اس میں ان بیچاروں کا کیا قصور، پھر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم دونوں صورت سے بھی شریف نظر نہیں آتے مالی پورہ چوک پہنچ کر ہم نے مانیک ٹاکیز کے اطراف میں مختلف جگہوں پر "پلیس" اشتہارات چسپاں کردیئے۔ جب ہم مانیک ٹاکیز کے پاس والی گلی میں داخل ہوئے تو ہم نے دیکھا کہ دو آدمی ٹاکیز کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے ہیں۔ قریب پہنچے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ دونوں شراب کے نشہ میں دھت ہیں اور اپنی باتوں میں اس قدر کھوئے ہوئے ہیں کہ انھیں ہماری موجودگی کا بھی احساس نہیں ہے۔ ہم ان کی باتیں سننے لگے۔ نوجوان شرابی ادھیڑ عمر شرابی سے کہہ رہا تھا "میں آپ کو اپنا مصلحت God مانتا ہوں۔ چند سوالات نے میرے دماغ میں ادھم مچا رکھا ہے۔ میں ان سوالوں کے جوابات آپ سے چاہتا ہوں؟"

"پوچھو God son ۔ تمہیں مایوسی نہیں ہوگی۔"

نوجوان شرابی "حسن"

"جادو، جو سر چڑھ کر بولے۔"

"طلاق نامہ؟"

"دوسری شادی کا اجازت نامہ"

"آزاد نظم"

"شاعری کو مذاق بنانے کی کامیاب کوشش"

"علامتی افسانہ؟"

"آپ لکھیں، خدا سمجھے۔"

"مصلحت"

"بزدلی یا خود غرضی کا نیا نام"

نوجوان شرابی نے فرمائش کی: "اب کوئی ہزل سنائیے"
"سنو علامہ گنبد اکوبوی کی ہزل" "چور شاعر"!

وادیٔ شعر میں جس دن سے قدم رکھا ہے
چوریاں کرکے تخلص کا بھرم رکھا ہے
پہلے پہل تو ہر اک شعر چرایا ہم نے
لیبریری کی کتابوں سے اڑایا ہم نے
بڑھ گئی مشق لیا کام سمجھداری سے
نقل کرتے رہے ہم عقل سے مکاری سے
میر و غالب کی تراکیب پہ ڈالے ڈاکے
داغ و مومن کے تغزل سے نکالے خاکے
ہم نے اقبال کے شعروں سے خیالات لیے
ٹکڑے احسان کی نظموں کے لگے ہاتھ لیے
چربے ٹیگور کے گیتوں کے اڑائے ہم نے
فلمی گانوں میں نئے بول بڑھائے ہم نے
اس پلندے کو ٹھکانے سے لگانا ہے ہمیں
اپنا دیوان کسی بھاؤ چھپانا ہے ہمیں

اس نے ہزل اس قطعہ پر ختم کی:

چاند کل تک تھا یہاں ایک خوبصورت شے کا نام
روس و امریکہ نے لیکن کر دیا قصہ تمام
اپنی بیگم کو بھی کہہ نہیں سکتا قمر النساء
ایک شوہر کے لیے ہے ڈوب مرنے کا مقام

جی تو چاہتا تھا کہ ہم یہ ہنچ رنگی پروگرام سنتے رہیں لیکن تنگیٔ وقت کا خیال کرتے ہوئے ہم آگے بڑھ گئے۔ تین بجے تک ٹاکیز روڈ پر جگہ جگہ اشتہارات چپکانے کے بعد ہم نے محمد علی روڈ کا رخ کیا۔ اکولہ میں کسی بات کی تشہیر کے لیے محمد علی روڈ سے بہتر کوئی دوسرا مقام نہیں اشتہارات کے ذریعہ تشہیر تو بڑی بات ہے، آپ کسی سے کوئی عام بات رازدارانہ انداز میں کہہ دیجیے دیکھتے ہی دیکھتے یہ بات سارے شہر میں گشت لگاتی ہوئی مزید اضافوں کے ساتھ آپ کے کانوں تک پہنچے گی۔ اگر آپ اپنے سامع کو گفتگو کے دوران راز کو راز رکھنے کی تلقین کر دیں۔ تو یہ بات ا...

بھی تیزی سے پھیل جائے گی اور تھوڑی ہی دیر میں Talk of the town بن جائے گی۔

ہم پھلاری گلی میں پہنچے تو محمد علی روڈ اور اس کے اطراف میں بجلی فیل ہوجانے کی وجہ سے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہم نے کہا "آپ اندھیرے سے بغاوت کرکے مدھم چاندنی اور اندازہ سے کام چلایئے اور اشتہارات کو چپکی لگاتے جایئے۔" پھر تھوڑی ہی دیر میں ہم نے ۲۴ اشتہارات مختلف جگہوں پر چسپاں کردیئے۔ پچیسویں اشتہار پر چپکی لگاتے ہوئے ساجد صاحب نے اپنا ہاتھ روک لیا۔ ہم نے پوچھا "کیا بات ہے، کیوں ہاتھ روک لیا آپ نے؟"

"گشتی سپاہی سیٹیاں بجا رہے ہیں۔" وہ سرگوشی کے انداز میں بولے۔

"سیٹیوں کی آوازیں قریب ہوتی جارہی ہیں ——— وہ ادھر آنکلے اور ہمیں کسی شک و شبہ کی بنا پر گرفتار کرلیا تو؟ ساجد صاحب کی آواز میں لرزہ آگیا تھا۔

"آپ تو شیخ چلی کے باپ ہیں۔ ساجد صاحب، سوچتے سوچتے کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے یہ اشتہارات ہیں ہمارے پاس! اپنی صفائی پیش کرنے سنتے آئے ہیں کہ پولیس والے بے دماغ اور ہاتھ چھوڑ ہوتے ہیں صفائی پیش کرنے کی مہلت ہی نہ دی گئی تو؟ ساجد صاحب نے خدشہ ظاہر کیا۔ ہم نے کہا۔ "بے شک پولس والے دماغ نہ رکھتے ہوں۔ لیکن ان کے آنکھیں تو ہوتی ہیں۔ اشتہارات تو ہم انہیں دکھا سکتے ہیں نا؟" "اشتہارات اردو میں ہیں، سپاہی اردو داں نہ ہوئے تو؟ انھوں نے جرح کی۔ ہم نے جھنجھلا کر کہا" آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آخر ہم بھی تو ہیں آپ کے ساتھ۔ جو بھی ہوگا مل کر بھگتیں گے۔ ساجد صاحب سر دونوں ہاتھوں سے تھامے بیٹھے رہے۔ ہماری بات کا ان پر مطلق اثر نہ ہوا۔ جیسے انھوں نے ہماری بات سنی ہی نہ ہو۔ ہم نے دیکھا کہ خوف کی شدت سے ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

"اچھا ساجد صاحب! اگر آپ خوف زدہ ہیں تو ہم اپنا کام بند کر دیتے ہیں۔ باقی اشتہارات کل چسپاں کردیئے جائیں گے۔ ہماری بات سنتے ہی انھوں نے گرتے پڑتے اشتہارات کا بنڈل اور چپکی کا ڈبہ اٹھالیا اور بغیر کچھ کہے سنے ٹاور کی طرف چل دیئے۔ ہم بھی سعادت مند شاگرد کی طرح ان کے ساتھ ہولیے۔

کچھ دور چل کر ہم آپٹے لاج کی چوک تک پہنچے تھے کہ یکایک چار گشتی سپاہیوں نے چہار طرف سے ہمیں گھیر لیا۔ ان میں سب سے زیادہ بھیانک چہرے والا سپاہی جو صورت ہی سے دوزخ کا پہرے دار معلوم ہو رہا تھا۔

"اے، کیا چکر چلا رہے ہو۔ اتنی رات گئے؟"

ہم نے دیکھا ساجد صاحب ہونق بنے کبھی ہمیں دیکھتے ہیں تو کبھی پولس والے کو خوف کے مارے ان کے پیر کپکپا رہے تھے۔ ہم نے ساجد صاحب کی حالت اور موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا اور لرزتے، کپکپاتے، لڑکھڑاتے ہوئے لفظوں میں اصل بات بتائی۔ چند لمحے جلاد نما سپاہی ہمیں گھورتا رہا۔ پھر بولا "اگر تمہاری بات سچ بھی ہے تو اس کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ ہم لوگ اردو نہیں جانتے!!"

"یقین کیجئے ہم سچ بول رہے ہیں۔" ہم نے التجا کی۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے، وہ بولا آپ لوگ ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلئے۔ وہاں آپ کی سچائی ثابت ہوجائے گی۔ کیونکہ ہمارے تھانیدار صاحب اردو جانتے ہیں۔" جوں ہی اس کی بات ختم ہوئی ساجد صاحب چکرا کر

گر پڑے اور بے ہوش ہو گئے۔

خیر صاحب قصہ مختصر ــــــ فجر کے وقت تھانیدار صاحب نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اور ہم ستے ہوئے چہروں اور بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے گھروں کی طرف روانہ ہوئے۔ جب ہم محمد علی روڈ سے گذرنے لگے تو ساجد صاحب بے اختیار ہنسنے لگے۔ ان کے ہنسنے کی وجہ ہم سمجھ نہیں سکے۔ اس لیے ہونق بنے انھیں دیکھتے رہے۔ جب ان کی سینما اسکوپ ہنسی ختم ہوئی تو ہم نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی۔ کہنے لگے: "ذرا آس پاس نظر گھمائیے۔ آپ خود جان لیں گے"۔ ہم نے اِدھر اُدھر نظر گھمائی اور بے اختیار ہنسنے لگے۔ دراصل ہوا یہ تھا کہ رات میں ساجد صاحب نے مضمون والے حصے پر چکی لگا دی تھی۔ لہٰذا محمد علی روڈ پر تمام اشتہارات الٹے چسپاں ہوئے تھے۔ ٥

مُلک کی ایکتا کا راز
"بنیادی طور پر مُلک کے لئے باشندوں کی محبت اور اس کے لئے کام اور قربانی کرنے کا عزم۔
اور یہ صرف دوسروں کی بھلائی کے خیال سے ہی نہیں بلکہ اس لئے کہ ہر فرد یہ جانتا ہے کہ اس کا اپنا مستقبل دراصل اس کے مُلک کے مستقبل سے وابستہ ہے۔"
—— اندرا گاندھی
آیئے ہم اپنی آزادی کی
33 ویں
سالگرہ پر
سی۔آر۔داس کے ان الفاظ کی دائمی سچائی کو یاد کریں:
"اگر بھارت ہی نہ رہے تو رہے گا کون؟"
ہمارا ایک ہی نشانہ ——
مضبوط اور خود کفیل بھارت کی تعمیر
davp 80/154
آیئے! ہم سب مل کر کام کریں

زینت وفا

یہ نہ تھی ہماری قسمت...

چاند مبارک ہو! عید مبارک ہو!.... مبارک بادی کی پُرمسرت آوازوں سے محلہ گونج اٹھا۔ ہم بھی اپنا نیا کوٹ (جسے تقریباً آدھے گھنٹے سے مسلسل دیکھ رہے تھے) ہینگر پر ٹھیک سے لٹکا کر صحن میں نکل آئے۔ بیگم منے کو گود میں لیے چاند دکھلانے کی کوشش کر رہی تھیں...... ہم بھی وہیں چلے گئے...... اور عید کے چاند کو دیکھ کر ہمارے افق دل پر بھی خوشی و مسرت کا چاند پوری آب و تاب سے چمکنے لگا.... کیونکہ کئی سال کے شدید انتظار کے بعد آخر کار عید کا دن آ ہی گیا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ہم لوگ تو سال میں دو مرتبہ عید مناتے ہیں۔ پھر عید کے لیے کئی سال کا انتظار کیا مطلب؟... واقعی عید الفطر اور بقر عید دو بڑے تہوار ہر سال منائے جاتے ہیں۔ لیکن ہمیں جس عید کا انتظار تھا۔ وہ تو کل والی عید ہوگی..... کل ہمارا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہونے والا ہے.....

کل ہم اپنا نیا مغربی طرز کا سوٹ زیب تن کر کے نکلیں گے تو ہمیشہ ہماری سادگی پر ہمیں بنانے والے تمام دوست حیران رہ جائیں گے...... "ابا جان کیا آپ کو چاند نظر نہیں آیا؟" منا ہمیں یوں محو دیکھ کر پوچھ رہا ہے...... "آں..... ہاں۔ اصل چاند تو ہمارے قریب ہی کھڑا ہے۔" اور ہم نے منے کو باہوں میں لے کر اس کے معصوم چاند سے چہرے کو چوم لیا۔ پھر باورچی خانہ میں جا کر ہم نے بیگم کو ہدایت کی کہ وہ کل کی تمام تیاریاں آج ہی مکمل کر لیں۔ اس کے بعد ہم منے کو کچھ دیر کے لیے بازار اور گلیوں کی چہل پہل دکھا لائے۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے ہیں۔ منا اور بیگم میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ لیکن ہماری آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہیں ہے۔ ہماری انگلیوں کے درمیان پھنسا ہوا سگریٹ دھیرے دھیرے راکھ میں تبدیل ہو رہا ہے

[illegible] پلنگ کے قریب کھونٹی پر ٹنگے ہوئے نیلے رنگ کے کوٹ اور پینٹ کو دیکھ رہے ہیں۔ اور سوچ رہے ہیں کہ کل ہم یہ سوٹ پہنیں گے تو خوب جچیں گے...... حمید اور شاہد کی تو زبان ہی گنگ ہو جائے گی۔ ہمیں بہت بتاتے رہتے ہیں کہ ہم عید کی روایت نبھانے کے لیے ہی کبھی نیا جوڑا سلوا لیں..... اور بات بھی تو ٹھیک ہی ہے۔ ہماری شادی کو پورے پانچ سال ہو گئے ہیں اور ہم ہر عید کو اپنی شادی کی شیروانی کی مرمت کروا کے کچھ دیر کے لیے پہن لیتے ہیں...... ہماری سوچ کی انگلیاں ماضی کے اوراق کو ایک ایک کر کے الٹ رہی ہیں.....

جب ہم میٹرک پاس کر کے کالج کی رنگین فضاؤں میں داخل ہوئے تو ہمیں اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ایک کالج اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے ہمارے پاس کم از کم ایک قیمتی سوٹ کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اس بات کا احساس ہمیں یوں ہوا کہ ہمارے تمام دوستوں کی نظروں میں سلیم کے قیمتی ملبوسات کے سامنے ہماری تعلیمی قابلیت ہیچ تھی...... لہٰذا ہم پہننے کے لیے قیمتی ملبوسات کی ضرورت شدت سے محسوس کرنے لگے تاکہ سلیم کے سامنے ہمیں احساس کمتری میں مبتلا نہ ہونا پڑے لیکن ہم باوجود کوشش کے جلد ہی اس خیال کو عملی جامہ پہنا سکے۔ ہم نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی کہ عید کے موقعہ پر ہم ضرور ایک بہترین مغربی طرز کا کوٹ اور پتلون بنوائیں گے...... کالج کا فرسٹ ایئر ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ عید الفطر آ گئی.....

لیکن جب ہم نے اپنا قیمتی سوٹ والا خیال ابا جان پر ظاہر کیا تو کافی بحث کے بعد یہ طے ہوا کہ ہم اپنا پروگرام آئندہ عید کے لیے اٹھا رکھیں۔ ہم نے بھی گھر کے حالات کے پیش نظر دل پر پتھر رکھ لیا...... اور آئندہ عید کا انتظار کرنے لگے..... لیکن..... قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ ہر عید پر یہ معاملہ آئندہ عید تک کے لیے ملتوی ہو جاتا..... اسی کشمکش میں کئی عیدیں گزر گئیں..... اور جب ہم زندگی کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے بی اے پاس کر کے کلرک کی منزل پر پہنچے تو ہماری امی جان کو ہمارے سر پر سہرا دیکھنے کا ارمان ہوا اور ہم نے بھی اس لیے رضامندی دے دی کہ ہماری سسرال سے جوڑے کی [illegible] رقم لے کر بے حد شاندار سوٹ بنوا لیں گے۔ لہٰذا ہماری حسب خواہش جوڑے کی رقم مل گئی۔ لیکن ابا جان نے یہ کہہ کر ہمارے ارمانوں پر پانی پھیر دیا کہ حسب روایت دولہا کو شیروانی ہی زیب دیتی ہے اور ہمیشہ کی طرح ابا جان نے ہمیں سمجھایا کہ اب ہم خدا کے فضل سے گھر دار والے ہو گئے ہیں۔ ہر مہینہ تنخواہ ملتی ہے۔ لہٰذا ہم شادی کے بعد بہت جلد اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر ہوتے دیکھ لیں۔ بات معقول تھی لہٰذا ہم سعادت مندی سے چپ ہو رہے...... لیکن جب شادی کے بعد کئی مہینوں تک بیگم کے ناز اٹھاتے اٹھاتے..... ہم کافی مقروض ہو گئے تو انہیں چند دن کے لیے میکے بھیج دیا۔ اور ابھی آدھا قرض بھی ادا نہ ہو سکا تھا کہ بیگم معہ منے میاں کے پھر آ دھمکیں.... لیکن جلد ہی بیگم کے تعاون سے اس قابل ہو گئے کہ ہماری قلیل آمدنی میں گھریلو اخراجات بھی پورے کریں اور پچھلے قرض بھی ادا کریں۔ اور ساتھ ہی ہم نے اپنے سوٹ کے لیے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرنا شروع کر دیا...... اور...... آج شادی کے پانچ سال بعد ہم اس قابل ہو گئے کہ اپنے اس دیرینہ خواب کو حقیقت کا جامہ پہنا سکیں۔ اب جبکہ ہم نے ایک عمدہ سوٹ بنوا لیا ہے تو اس بات کا افسوس ہے کہ سلیم (جس کی امارت سے ہم ہمیشہ متاثر رہے) ہمیں اس سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھ سکے گا کیونکہ گریجویشن کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ جا چکا ہے۔ کافی سوچ بچار کے بعد ایک ترکیب ہمارے ذہن میں آئی کہ ہم کل اپنی تصویر کھنچوا کر سلیم کو بھیج دیں گے اور ہم فاتحانہ مسکراہٹوں کے ساتھ قد آدم آئینے کے سامنے آ گئے ہیں۔ گھر کی صفائی کی وجہ سے ہمارے جسم کا لباس

(جو لنگی اور بنیان پر مشتمل ہے) بہت میلا ہوگیا ہے۔ ہم نے اس کی پرواہ کیے بنا ہینگر سے کوٹ اتار کر پہن لیا۔ اور مختلف زاویوں سے خود کو آئینے میں دیکھتے رہے اور جب ہر طرح سے مطمئن ہو کر کوٹ اتارنے لگے تو چہرے پر ہماری نظر گئی (اب تک ہماری نظر صرف کوٹ کے مختلف حصوں کا ہی طواف کرتی رہی تھی) شیو بڑھا ہوا ہے اور تھکن کے آثار چہرے پر نمایاں تھے جن کے باعث ہم بیماروں کے مریض معلوم ہو رہے ہیں۔ رات کافی بیت چکی ہے لہٰذا ہم نے احتیاط سے کوٹ کو اپنی جگہ پر لگا دیا اور آنے والی خوش گوار صبح کے حسین تصور میں کھو کر نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

صبح جب منّے کے مسلسل رونے کی آواز سے ہم بیدار ہوئے تو معلوم ہوا کہ بیگم ہمیں بیدار کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کر کے تھک چکی ہیں۔ ہمارے غسل کا پانی تین دفعہ گرم اور پھر ٹھنڈا ہونے کے بعد اب پھر گرم کیا جانے والا ہے۔ اور لوگ عید کی نماز ادا کر کے لوٹ رہے ہیں۔ اور ادھر منّا باہر کی چہل پہل دیکھنے کو بے تاب ہے۔ ہم نے منّے کو تسلی دی کہ ابھی پانچ منٹ میں تیار ہو کر منّے کو باہر لے جائیں گے ...... ابھی ہم منّے کو سمجھا ہی رہے تھے کہ باہر دستک ہوئی۔ بیگم نے کہا "شاید دھوبی عید کا انعام لینے آیا ہے اس سے کہیں کہ آپ کے تیار ہونے تک منّے کو باہر گھما لاتے ہیں" بیگم کے تیور بدلے دیکھ کر بستر چھوڑ دیا۔ اور روتے بسورتے منّے کو لے کر صحن کی طرف آئے۔ اور جونہی ہم نے چٹخے ہوئے ٹاٹ کے پردے کو ہٹا کر قدم باہر رکھا تو بس ویسے ہی کھڑے رہ گئے۔ ایک قدم گھر کے اندر اور ایک قدم گھر کے باہر ..... (جسم پر میلی چکٹ بنیان اور لنگی۔ شیو بڑھا ہوا اور گود میں روتا بسورتا منّا) کیونکہ سامنے ہمارے تمام دوست ہم سے عید ملنے کے لیے کھڑے ہیں۔ منّا ہم سے ہمیں باہر کھینچ کر گلے سے لگا لیا ..... "ارے یار! کیا عید کے دن بھی یونہی گھر میں پڑے رہو گے؟" اور پھر جونہی منّا ہم سے الگ ہوئے تو ہم پھر توں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ...... سلیم منّا اپنے قیمتی سوٹ کے موجود ہے۔ "ارے منّا ..... سلیم ..... ہم صرف ہکلا کر رہ گئے ...... سلیم نے ہیلو کہہ کر ہاتھ ملانے پر ہی اکتفا کیا ...... اور ہم میں بھی اپنی ناگفتہ بہ حالت اور سلیم کے چمک دار سوٹ کو دیکھ کر اس سے گلے ملنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ہم نے اپنی ندامت چھپاتے ہوئے انہیں بتایا کہ کل رات بہت آفس ورک کرنا تھا اس لیے ہم صبح جلدی نہ اٹھ سکے۔ سب نے اپنا مخصوص قہقہہ فضا میں بلند کیا۔ وہ ہم سے عید ملاقات کر کے رخصت ہو گئے ...... اور اب ہم گھر میں داخل ہوتے ہیں تو ایک طرف نیلے رنگ کا خوب صورت سوٹ ہمارا منہ چڑا رہا ہے تو دوسری طرف بیگم ہم پر حملہ کرنے تیار بیٹھی ہیں اور ہم صرف انہیں تکتے رہ گئے۔

حیف اس پانچ میٹر کپڑے کی قسمت یارو
سوٹ بن کر کسی بدحال کے پلّے پڑ جائے

○○

غزلیں

محمد عبدالکریم ماہر

وعدہ وہ کرتا ہے پہلے اور پھر
پیار سے کہتا ہے پیارے ڈونٹ ویٹ انتظار مت کر
اُس کے ابّا نے دریچہ چن دیا
کر دیا آلیشین نے بند گیٹ
یاد آیا یں اُسے مرنے کے بعد
ریل گاڑی تھی مری قسمت کی لیٹ
مانگتا ہوں جب بھی اپنا برتھ رائٹ پیدائشی حق
یہ جواب آتا ہے ، دیکھو برتھ ریٹ شرح پیدائش
ہے ظریفانِ دکن کو اذنِ عام
کھل گیا دربارِ ماہر دی گریٹ ماہر اعظم

جگر نظام آبادی

ناکارہ ہیں دِل اور جگر بھی تو خطر کیا
بازار میں بکتے نہیں دِل اور جگر کیا
سیکل مری بکنے کا بہت آپ کو غم ہے
نیلام نہیں ہوتے کبھی لعل و گہر کیا
یہ دیکھنے بیٹھا ہوں تری بزم میں ساقی
لیتا ہے مرا نام کوئی بارِ دِگر کیا
میں بیٹھ کے گاڑی میں چلا جاؤں گا چکر
معلوم نہیں ہے مجھے محبوب نگر کیا

فیض الرحمٰن فیض

مرغ تو اُن کے اڑا جب نہ سہی اب سہی
توند کو اپنی بڑھا جب نہ سہی اب سہی
عشق کا ڈنکا بجا جب نہ سہی اب سہی
مار بھی سینڈل کے کھا جب نہ سہی اب سہی
پھر کوئی آئے اگر پوچھنے 'اِن کم' تیری
اُلٹی تو پٹی پڑھا جب نہ سہی اب سہی

اقبال شانہ

ٹاپ پر جب بھی لیڈری آئی
ہاتھ باندھے منسٹری آئی
اُس نے جب پیار کی قسم کھائی
مجھ کو بے ساختہ ہنسی آئی
چار گھنٹے سے گم ہیں "میک اپ" میں
کہہ رہے ہیں مگر ابھی آئی
گھپ اندھیرا تھا میرے کمرے میں
آپ آئے تو روشنی آئی
دوستی ہو گئی پتنگوں سے
جب مرے گھر میں چھپکلی آئی

قطعہ

بیباک مالیگاؤں

تیر و تبر نہ خنجر و نیزہ اُٹھائیے
شمشیرِ آب دار نہ ڈنڈا اُٹھائیے
بیباک شاعری کا اگر شوق ہو تمہیں
زندہ دلانِ شہر کا جھنڈا اُٹھائیے

عمر حنیف
(امراؤتی)

وعدوں کی حقیقت

وعدے اور حقیقت، ان دونوں کے درمیان ایک عجیب رشتہ ہے ـــــ بس یوں سمجھ لیجیے کہ وعدہ دلہا ہے اور حقیقت دلہن! وعدہ (دلہا کی مانند) ہمیشہ حقیقت (اپنی دلہن) کا حسین سا مکھڑا دیکھنے کے لیے بے چین رہتا ہے اور حقیقت ہمیشہ ایک دلہن کی طرح اپنی سیج سجائے وعدوں کا انتظام کرتی رہتی ہے ـــــ کہ کب اس کا دلہا آئے اور اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لے۔ لیکن نہ دلہا آتا ہے اور نہ ہی دلہن اس کے باہوں میں سمٹتی ہے! ـــــ کتنا سنگ دل ہے مُوا یہ دلہا' جو ایسی چاند سی دلہن کو انتظار کرواتا ہے۔ لیکن وہ بھی کیا کرے اسے بھی تو کوئی قید کر کے رکھتا ہے۔ اپنی زبان میں! کم بخت وہاں سے اسے آزادی ہی نہیں ملتی۔ حالانکہ وہ شخص جس نے اسے قید کر کے رکھا ہے بار بار اس سے کہتا ہے کہ بس اب کی بار میں تمہیں تمہاری دلہن سے ملوا دوں گا۔ لیکن نہیں! ایسا نہیں ہوتا ـــــ اور دونوں غم فرقت میں تڑپتے رہتے ہیں ـــــ اور ایک وہ ہے کہ جو دونوں کی اس بے قراری سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بے چارے محلے والے، گاؤں والے منتظر ہیں کہ کب دونوں کا ملن ہو اور ایک خوشی کا ترانہ جنم لے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا! حالانکہ ان دونوں کی شادی کے موقعہ (الکشن کی تقریر) پر ان صاحب نے ان دونوں کے ملن کا یقین دلانے کے لیے دو موٹے موٹے آنسو تک بہا دیئے تھے!!

آج کل ۹۸ فیصد وعدوں کا ایسا ہی حال ہے صرف ۲ فیصد وعدے اور حقیقتیں کامیاب ازدواجی زندگی گذار رہے ہیں ـــــ اور وہ محض اس وجہ سے کہ جن حضرات نے یہ ملن کروایا ہے ان کے گاؤں میں ان کے ٹکر کے ان کے حریف موجود ہیں۔ اس لیے وہ ڈرتے ہیں کہ اگر وہ یہ ملن نہ کروا سکے تو یہ ملن ان کے حریف کروا دیں گے اور پھر نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دوسری شادی (آئندہ الکشن کی تقریر) رچانے کے قابل نہ رہیں گے! ـــــ بزرگوں نے صحیح کہا ہے "سیر کو سوا سیر ملتا ہی ہے!!"

وعدے کرنا کوئی نیا آرٹ نہیں۔ وعدے تو سبھی کرتے ہیں (کئی تو گولڈن جوبلی منا چکے ہیں) جیسے لیڈر اپنے ووٹروں سے، مرد عورت سے، عورت مرد سے، عاشق معشوق سے، معشوق اپنے عاشق سے اور وغیرہ وغیرہ ...... ! ان وعدہ کرنے والوں میں کتنے فیصد ایسے کون سے ہیں آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں ــــ

وعدے سب ہی لوگ کرتے ہیں۔ لیکن ایک مخصوص قسم کے لوگوں کے وعدوں کا ایک " سیزن " ہوتا ہے لیکن یہ سیزن لاحق مقررہ وقت کے بعد نہیں آتا۔ یہ کبھی بھی آسکتا ہے۔ اس کا وقفہ دو سال بھی ہوسکتا ہے اور دو مہینے بھی ــــ یا پھر سات سال بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ سیزن جب بھی آتا ہے تو وعدوں کی بھر مار ہوتی ہے اور پھر اس وقت ہر الکشن مارکیٹ، ہر سیاسی گوڈاؤن، اور ہر لیڈر کی دوکان کے اسٹاک بورڈ پر ایک ہی شے کا اسٹاک دکھایا جاتا ہے۔ اسٹاک بورڈ کچھ اس طرح سے ہوتا ہے۔

دوکان نمبر ۱	دوکان نمبر ۲	دوکان نمبر ۳
" اسٹاک بورڈ "	اسٹاک بورڈ "	اسٹاک بورڈ
اشیاء ــــ مقدار	اشیاء ــــ مقدار	اشیاء ــــ مقدار
(۱) وعدہ ...... ۵۰ ٹن	(۱) وعدہ .... ۱۰۰ ٹن	(۱) وعدہ .... ۱۲۵ ٹن
(۲) حقیقت ... مال نہیں ہے	(۲) حقیقت .... Nil	(۲) حقیقت .... ۱۷ تاریخ تک ایک لاکھ ٹن مال آجا

لیکن اگر آپ یہاں ذرا باریک نظر سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ۱۷ تاریخ کا معاملہ بھی ایک وعدہ ہی ہے۔

ایک ایسے ہی سیزن کے کچھ وعدوں کی جھلکیاں پیش خدمت ہیں ــــ

ایک صاحب تقریر کے جوش میں کہنے لگے " میں ہماری جنتا کو دشواس دلاتا ہوں کہ میرے آنے " کے بعد تم لوگوں پر کوئی زیادتیاں نہیں ہوں گی (شاید وہ بھول گئے تھے کہ وہ اسٹیج پر آچکے ہیں۔ جنتا کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور نئے نئے وعدے کر رہے ہیں) اور یہ زیادتیاں اس وقت نہیں ہوں گی جب آپ ہمارے ہاتھ مضبوط کریں گے ـــ ہمیں ووٹ دے کر ! تم ہمارے ہاتھ مضبوط کرو، ہم تمہیں مضبوط کریں گے " ـــ لیکن افسوس ! آپ کو معلوم ہے انجام کیا ہوا ؟ ـــ بیچارے خود ہی اپنا بستر لپیٹ کر چلے گئے، نئے آشیانے کی تلاش میں۔ لیکن کوئی آشیانہ خالی بچا ہی نہیں تو انہیں ملے کہاں ـــ اور نئے آشیانوں کے ابھی خالی ہونے کے تو کوئی امکانات نہیں ! پتہ نہیں سردیوں میں بے چاروں کا حال ہوگا ــــ اللہ رحم کرے ! !

ایک اور صاحب جو کچھ ذرا جذباتی قسم کے تھے میں نے دیکھا تھا کہ وہ اکثر اپنی تقریروں میں ہمدردیاں جتاتے ہیں اور نئے نئے وعدے کرتے ہیں ـــ بارش کا زمانہ تھا سیلاب پر سیلاب آرہے تھے۔ چاروں طرف تباہی مچی ہوئی تھی۔ اس دوران میں ایک دن ان صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ صاحب ناشتہ کی میز پر دا... تھے۔ مرغی کی ایک ٹانگ بیچارہ ہاتھ میں تھی اور دوسری ٹانگ بائیں ہاتھ میں اور منہ جگالی کر رہا تھا۔ میں نے انہیں ... بے تکلفی سے کہا " یار عجیب آدمی ہو تم بھی ـــــ تم نے وعدے تو بہت کیے تھے، ہمدردیاں تو بہت جتائی تھیں ادھر سیلاب نے تباہی مچا رکھی ہے لوگ سیلاب کے پانی میں ڈوب رہے ہیں اور تم ہو کہ ادھر مرغیاں اڑا رہے ہو ؟

وقت

اجب کہنے لگے "تو اس میں کیا کر سکتا ہوں۔ لوگ ڈوب رہے ہیں تو کیا میں بھی ان کے ساتھ ڈوب جاؤں؟"

میں نے کہا "تمہیں ڈوبنے کو کون کہتا ہے —— لیکن تم نے جو ان سے وعدے کیے تھے ان تباہیوں کو روکنے، اگر وہ تم —— پورے نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کے ساتھ ہمدردی تو جتا سکتے ہو؟"

ہمدردی!" صاحب مسکراتے ہوئے بولے "ہمدردی تو میں نے الکشن کی تقریروں میں اتنی جتائی تھی کہ سارا اسٹاک ختم ہو گیا —— لیکن ڈوبنے والوں کی تم کیوں فکر کر رہے ہو؟ کیا آئندہ الکشن میں کھڑے ہونے کا ارادہ ہے —— ؟ اگر ایسا ارادہ ہے تو جاؤ ڈوبنے والوں کو بچاؤ۔ ان سے کچھ وعدے کرو۔ شاید وعدوں کی آواز سن کر کچھ ڈوبنے والے باہر نکل آئیں" یہ قوم کے اس ہمدرد کے الفاظ۔

آیئے آپ کو کچھ اور وعدوں کی طرف لے چلوں ——

ایک لڑکا اور ایک لڑکی نے اپنی محبت کو لیلیٰ مجنوں کی محبت کا نام دے رکھا تھا —— ایک دن لڑکا دوپہر کی تیز دھوپ میں کھڑا اپنی معشوقہ کے انتظار میں پگھل رہا تھا۔ کافی انتظار کے بعد لڑکی آئی تو لڑکا کچھ ناراضگی ظاہر کرتے ہوئے بولا "یہ کوئی تمہارے آنے کا وقت ہے؟"

لڑکی بولی "تم ناراض ہو گئے!؟ —— لو بابا اب وعدہ کرتی ہوں کہ پھر کبھی ایسا نہیں ہوگا مجھے تو تمہارے بغیر پل بھی چین نہیں ملتا —— مہیش مجھے بچا لو، میں اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!"

اور پھر مہیش نے بھی اپنی ہی حالت ظاہر کرتے ہوئے کہا "نیتا میں بھی اب تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا!"

اور پھر دونوں نے زندہ رہنے کی ایک ترکیب سوچی —— دوسرے دن دونوں گھر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

دونوں کے گھر میں سناٹا تھا۔ بڑی صورتیں سوچ رہی تھیں کہ یہ کیا ہو گیا؟ —— ایسا ہوگا یہ ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

ایک سال بعد!

جب سارے شکوے شکایتیں دور ہو گئیں اور دونوں کے والدین نے دونوں کو ہنسی خوشی قبول کر لیا تو ایک دن مہیش نے نیتا سے کہا "نیتا اب ہم ہمارے پیا کے گھر ہی رہیں گے۔ اب ہمیں الگ رہنے کی کیا ضرورت؟ لیکن نیتا اس بات پر راضی نہ ہوئی۔ اور پھر ایک دن نیتا نے اپنے پیارے محبوب سے جھنجلا کر کہا ——

"مہیش! تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ہوں؟!!!"

ایک اور وعدے کی نوعیت دیکھیے ——

لڑکا بولا "شہناز میں تم سے اور صرف تم ہی سے شادی کروں گا!"

سویرا کا دسمبر اردوخ ——

"تم یقین رکھو نکہت میں شادی کروں گا تو تم سے ورنہ موت سے!"

اس بے چارے کی معلومات کا دائرہ ذرا تنگ تھا۔ ورنہ اس کو یہ ضرور معلوم ہوتا کہ شہناز اور نکہت دونوں سگی بہنیں ہیں! —— خیر ایک دن تو معلوم ہو ہی جائے گا!!

اسمٰعیل ظریف

ذاتی غزل سُناؤ میاں

ظریف زورِ قلم ذات سے دکھاؤ میاں
اگر ہے ذوق تو ذاتی غزل سناؤ میاں

ہمیشہ چائے پلاکر نہ دِل جلاؤ میاں
کبھی کبھی تو کوئی اور شئے پلاؤ میاں

پڑھا کے پٹیاں لوگوں کو ساتھ لاؤ میاں
اِسی طریقے سے محفل میں چھت اڑاؤ میاں

ہمیشہ تازہ غزل ہی سُنانا ہے ہو حضور
کبھی تو باسی غزل بھی ہمیں سُناؤ میاں

جو اور لوگوں کو لاتے نہیں ہیں خاطر میں
تم ایسے لوگوں کو اب آئینہ دِکھاؤ میاں

میں دیر ہی سے سہی جب بھی آؤں محفل میں
جناب صدر کے بازو مجھے بٹھاؤ میاں

وہ مجھ سے پہلے ہی پڑھ لیں تو یہ مناسب ہے
اساتذہ کو مرے بعد مت پڑھاؤ میاں

بڑے بڑوں کو وہ جھانسے میں لاچکے ابتک
ہمارے بھائی کے چکر میں تم نہ آؤ میاں

تمہارے ساتھی کا حُلیہ بگڑ چکا ہے وہاں
اب اُن کے کوچے میں تم بھول کر نہ جاؤ میاں

یہ روز روز کی کھٹ پٹ سے کچھ نہیں حاصل
ہے نیک مشورہ اک اور گھر بساؤ میاں

ہے صرف عقد کی دعوت تو مت کرو شرکت
ڈِنر پہ چوتھی کے لیکن ضرور جاؤ میاں

کہا یوں باپ نے بیٹے سے جب وہ فیل ہوا
اب اپنے ماموں کی تم بکریاں چراؤ میاں

محلے والے جو ڈرتے نہیں ہیں اب تم سے
ڈرانے اُن کو اکھاڑے میں لٹ گھماؤ میاں

بگڑ کے بیٹھے ہیں جاکر حسین ساگر پر
بڑے میاں کو منا کر وہاں سے لاؤ میاں

سکونِ قلب کی خاطر کسی بھی گلشن میں
کبھی کبھی سرِ مغرب ضرور جاؤ میاں

میاں سے ملنے کی بھائی میاں کو ہے خواہش
میاں سے بھائی میاں کو ذرا مِلاؤ میاں

کسی کو چار بجے چائے پر بلا کے ظریف
پلا کے چائے غزل پر غزل سُناؤ میاں

اِدریس بانکے

مجھ کو کسی حسین کے نہ ملنے کا غم نہیں
گانجہ اگر نہیں تو مرے دم میں دم نہیں

تم پھلجڑی ہو کوئی پٹاخہ کہ بم نہیں
آنکھیں تمہاری سیفٹی ریزر سے کم نہیں

قارئین کے ہیپیوں کو چلم سے لگاؤ ہے
جب تک نہ دم لگائیں بڑھاتے قدم نہیں

لڑتے ہیں روز کھٹمل و مچھر کی فوج سے
کیا اب بھی تم کہو گے پہلوان ہم نہیں

روتے ہیں صبح وشام حسینوں کو دیکھ کر
بانکے یہ جھوٹ ہے کہ وفادار ہم نہیں

محمد وحید اللہ ، ورود (مہاراشٹر)

مچھر کا نام سنتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے ایک دبلے پتلے پتنگے کا ڈھانچہ گھوم جاتا ہے جس کا پیشہ ہی سو پشتوں سے ، بھن بھن کی بے سُری آواز سنا کر خون چوسنا ہے۔ کچھ اسی قسم کا شریفانہ بزنس ہمارے ساہوکاروں کا بھی ہے البتہ مچھروں کو ان کی طرح نہ بینک بیلنس کی ہوس ہے اور نہ سود کا لالچ۔

مچھر اور انسان میں روزِ ازل سے جنگ چلی آ رہی ہے جو آج تک جاری ہے۔ ویسے حضرتِ انسان نے اس میدان میں کسے بخشا ہے جو مچھروں پر رحم کرتے ، مچھر اسے پریشان کیے ہوتے ہیں تو وہ بھی سو تدبیروں سے اس کی جان کے درپے ہو گیا ہے۔ انہیں نامراد اور بدنصیب انسانوں میں ہمارا بھی شمار ہے۔ جو مچھروں کو روئے زمین سے نہ سہی کم از کم اپنے گھر ہی سے سہی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دینے پر ہزار جتن ہر دم جواں پیہم رواں ہیں۔

ہماری اس کوشش کا آغاز پڑھائی کے کمرے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک دن ہم نے گرد اور مکڑی کے جالوں سے لدے ہوئے کمرے کی صفائی شروع کی جو پچھلے کئی مہینوں سے مچھڑی ذات کا قرد بنا ہوا تھا، تب الماری کے پیچھے سے دس عدد کیلوں کے چھلکے ، مونگ پھلی کے چھلکے ، ردی کا غذ اور دھول مٹی کا بھرپور اسٹاک برآمد ہوا۔ جسے ہم نے فوراً انگوچھے میں چھپا لیا ، کیونکہ ان دنوں میسا (MISA) لاگو تھا ، ہمیں خدشہ لاحق تھا کہ کہیں ہم ان اشیاء کی اسٹاکنگ اور بلیک مارکٹنگ کے الزام میں دھر نہ لیے جائیں اور پھر راتوں رات یہ دولت ٹھکانے لگائی ——

خیر جب اس کام سے فارغ ہوئے تو مطالعہ کے لیے بیٹھے ——

چنانچہ ابھی کرسی پر تشریف فرما ہوئے ہمیں دو منٹ بھی نہ گذرے ہوں گے کہ چند مچھر "لبیک لبیک" کہتے ہوئے ہمارا طواف کرنے لگے ہمیں لگا کہ یہ بھن بھن کرتے ہوئے حقیر مچھر نہ صرف ہمارا بلکہ بنی نوعِ انسان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اچھا! تو ان نامعقولوں کی یہ ہمت کہ ہم پر ہنسیں۔ یہ آدمی تو ہوتے ورنہ تنسیخ کا عذر کر دیتے ، مگر یہ مخلوق تو ہر قسم کی اکتیسی اور بتیسی سے بے نیاز ہے خیر اب بھی کیا بگڑا ہے۔ یہ کہہ کر ہم نے کتاب کو ایک طرف فضا میں کبوتر کی طرح اڑایا اور تڑاک

تڑاک" کی آواز کے ساتھ مچھروں کے ایک جھنڈ پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ برآمد ہوا۔ بس تالی بج کر رہ گئی۔ تالی کی آواز سن کر ایک پرانا واقعہ ہماری کھوپڑی کے ایک دروازے پر آ کر جھانکنے لگا۔

ہوا یوں کہ ایک دن ایک چوک سے ہمارا گذر ہوا تو دیکھا کہ چوک پر بیٹھے تمام لوگ تالیاں بجا رہے ہیں۔ ہم نے سوچا ہو نہ ہو یہاں کوئی شعلہ بیان لیڈر مخالف پارٹی کی دھجیاں اڑا رہا ہے۔ ہم قریب جا کر کھڑے ہوتے۔ لیکن یہ کیا وہاں تو کوئی ایک لفظ بھی نہیں بول رہا تھا بس لوگ تالیاں بجانے میں مصروف تھے۔ کوئی اپنی ہتھیلی پر تالی بجا رہا تھا تو کوئی اپنے گال پر کوئی اپنے سامنے والے کے چاند پر تو کوئی پیٹھ پر۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ لوگ مچھر مار رہے تھے نہ کہ تالی بجا رہے تھے۔

چنانچہ پھر اب کی بار ہمارا نشانہ خطا کر گیا اور مچھر بھن بھن کرتا ہوا فضا میں غائب ہو گیا۔ ہمارا غصہ اب بام عروج پر تھا اور ہم ایک چالاک شکاری کی طرح پینترے بدل کر بیٹھ گئے کہ ادھر مچھر آیا اور ادھر ہم نے اسے زندہ درگور کیا۔ بہت دیر بعد ایک تھکی تھکی سی بھن بھن کی آواز ہمیں سنائی دی پھر یہ آواز ہمارے سر کے پیچھے سے ہوتی ہوئی کان تک اور کان سے پھسل کر رخسار پر ختم ہو گئی۔ مچھر ہمارے گال پر بیٹھ چکا تھا گویا لوہا گرم ہو چکا ہے۔ ہتھوڑا مارنے میں دیر نہ کرنی چاہیے چنانچہ ہم نے ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر پوری قوت سے اپنے گال پر حملہ کیا۔

اب کی بار ہمیں پوری امید تھی کہ مچھر ضرور مارا گیا ہوگا اور اس کی پچکی ہوئی لاش ضرور ہمارے منھ پر ہو گی۔ ہم نے نہایت اطمینان سے آئینہ اٹھایا کہ مچھر کی لاش کا دیدار کیا جا سکے۔ لیکن لاش کا کہیں پتہ نہ تھا شاید آئینہ ٹھیک نہیں تھا۔ احتیاطاً ہم نے آئینہ کو دو تین مرتبہ صاف کیا اور دیکھا گال کی چکنی سطح رنگین نظر آئی، مچھر کے خون سے نہیں بلکہ تھپڑ کی حرارت سے۔ گال پر پانچوں انگلیاں بھی بہ آسانی دیکھی جا سکتی تھیں۔ ابھی ہم اس خطرناک مہم کے اگلے اقدامات پر غور ہی کر رہے تھے کہ اشرف وارد ہوا۔ تمہاری عقل تو ٹھکانے ہے؟

کیوں کیا ہوا؟ ہم سراپا سوال بن گئے۔

ارے ہم نے میٹنی شو کا پروگرام نہیں بنایا تھا؟

افوہ! ہمیں تو یاد ہی نہیں رہا۔ تین بج گئے اور ہم ابھی تک مچھر ہی مار رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے فوراً کپڑے تبدیل کیے اور اشرف کے ہمراہ ہو لیے۔ اگلے دن سے مچھر ہٹاؤ تحریک اور زور و شور سے شروع کر دی۔ ہم نے گھر کے سامنے والی نالی کو خوب صاف کیا اور تین ڈول پانی بہا دیا۔ اس کام سے فارغ ہو کر کچھ آرام کیا۔

شام میں چہل قدمی کے خیال سے باہر نکلے ہی تھے کہ ہماری نظر ایک بچے پر پڑی جو نالی میں مٹی ڈال کر ہماری محنت کی پلید کر رہا تھا۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک زوردار چپت رسید کر دی اور اسے ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا۔

دوبارہ نالی میں دو ڈول پانی ڈالا اور ابھی اس کام سے فارغ بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ایک بھاری بھرکم آواز نے ہمارے ہوش اڑا دیئے۔ یہ وہی پہلوان صاحب تھے جن کے نامعقول بچے کو ابھی ابھی ہم نے ڈانٹ کر بھگایا تھا۔ پھر کیا تھا پہلوان صاحب کے ساتھ ساتھ ان کا سارا گھرانہ بالخصوص عورتیں اس عظیم سانحہ پر چراغ پا ہو کر ابل پڑیں۔ ادھر ہم اپنے کمرے میں جل تو جلال تو پڑھتے ہوئے کانپ رہے تھے اس دن والد صاحب نے ہماری وہ خبر لی کہ ہم نے تہیہ کر لیا کہ محلے کے کسی فرد کے ذاتی معاملے میں مداخلت نہ کریں گے۔ چنانچہ آج بھی کئی مچھر ہمارے سامنے سے بھن بھن کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں اور ہم ان کی طرف کان بھی نہیں دھرتے۔ ▭

کرنل محمد خان

بسلسلہ گزشتہ
(آخری قسط)

لندن۔ تجدید ملاقات

مانچسٹر کے بعد ہماری منزل چسٹر تھی۔ مانچسٹر سے تو ہمیں کئی نسلوں سے آشنائی تھی کہ پاک و ہند کی پوشش کا واحد شیکیدار وہ تھا لیکن چسٹر کا کبھی نام بھی نہ سنا تھا۔ پتہ چلا کہ یہ قصور چسٹر کا نہیں ہماری کم علمی کا ہے کہ یہ شہر اپنی شہرت کا علاوہ جواز رکھتا ہے ایک تو اس تاریخی فصیل کی وجہ سے جو اس نے کئی صدیاں قبل اپنے اردگرد تعمیر کی او دوسرے اُس چھاؤنی کی وجہ سے جہاں برطانوی ویسٹرن کمانڈ کا ہیڈکوارٹر تھا۔ چھاؤنی میں تو ہمیں بہرحال جانا تھا، فصیل تک ہمیں بزور لے جایا گیا لیکن اس کے متعلق ذرا بعد میں۔

ویسٹرن کمانڈ کی وسیع پارک میں باربرا نے کار روکی جہاں میجر لائیڈ کو ہمارا استقبال کرنا تھا۔ ہم کار سے نکلے۔ کچھ فاصلے پر میجر لائیڈ آتے دکھائی دیئے تو اچانک باربرا نے ہماری طرف مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا اور کہا۔

"گڈبائی اور شکریہ اس خوشگوار وقت کا جو آپ کے ساتھ گزرا۔"

"کیا مطلب ہے یعنی خوشگوار وقت آگے نہیں چلے گا؟"

"اس سے آگے نہیں۔ میری ڈیوٹی یہیں تک تھی۔"

"یعنی ڈیوٹی ختم اور دوستی ہضم؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ پیچھے مانچسٹر میں مجھے ایک اور مہمان کا استقبال کرنا ہے۔"

"یعنی ایک اور خوشگوار وقت کے شروع ہونے کا امکان ہے۔"

"ہے تو سہی۔ دعا کرو کوئی دلچسپ آدمی ہو، مجھے ڈل "DULL" لوگوں سے وحشت آتی ہے۔"

یعنی یہاں معیار دلچسپ ہونا تھا۔ ہم ہوں تم ہو یا کوئی میر صاحب ہوں۔ یہ باربرا نہ تھی۔ مجسم نراجی تھی۔ اور شوخی ملاحظہ ہو کہ خود ہم سے رقیب کے دلچسپ ہونے کی دعا منگوا رہی تھی۔ ہم اتنے ماڈرن عاشق نہ تھے کہا۔

"الله کرے وہ دل بھی ہو اور رو سیاہ بھی۔"

بولی: "میری خاطر ہی دعا دے دیجیے۔"

ایک دعائیہ شعر یاد آیا: "یہ دعا ہے آتش عشق میں تو بھی میری طرح جلا کرے۔"

یہ جنہیں کہ ہم سچ مچ باربرا کے عشق میں جل بھن کر جل رہے تھے بس معمولی سے جلے تھے۔ شاعر کا مصرعہ فقط ہمارے جذبات کے ترجمے سے گذرتا تھا۔ پڑھ دیا۔ باربرا شاعر کا کلام تو نہ سمجھ سکی لیکن ہماری شکل دیکھ کر اس کا منشا پا گئی اور ہمیں معنوی تسلی دیتے ہوئے ویرا لن کا گیت گنگنانے لگی:

"I DONT KNOW WHEN
I DONT KNOW WHERE,
BUT WE'LL MEET AGAIN."

اور پھر کھلکھلا کر ہنس دی کہ ہمارے ویرا لن والے قصور کا بھی کامیاب بدلہ لے چکی تھی ۔۔۔ اتنے میں میجر لائیڈ آ گئے اور باربرا نے ہمارا تعارف کرایا نیز مزاج پوچھنے کے بعد لائیڈ بولے:

"سنائیے سفر کیسا رہا؟ امید ہے باربرا نے آپ کا ہر طرح خیال رکھا ہوگا۔"

کہا: "جی ہاں۔ جہاں تک ان کی ڈیوٹی اجازت دیتی تھی۔"

لائیڈ بولا: "اگر میرا حافظہ خطا نہیں کرتا تو پچھلے مہمان نے بھی شاید یہی کہا تھا۔"

جواب میں باربرا نے قہقہہ لگایا اور ہمیں ٹاٹا کرتی ہوئی اور اپنی انگلیاں ہماری سمت میں چوم کر ہوا میں پھیلاتی ہوئی کار میں جا بیٹھی۔ گویا ہمیں بتا رہی ہو کہ مسافر چلتا بھلا اور مسافر نے مجبوراً اپنی ٹاٹا کیا۔ اگرچہ کہ مسافر کا دل ایک ناکام فلمی ہیرو کی طرح ڈائیلاگ بول رہا تھا کہ: "ارے یہ وہی تو وہی باربرا ہے جو تھوڑی دیر پہلے کار میں جھومتی اور جھولتی تھی اور جو کل شب کلب میں کھلتی اور کھیلتی تھی؟ تجھے یہ کیا ہو گیا؟ جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی ...... " لیکن یہ سب گلے شکوے دل ہی دل میں کیا کیے۔ بیرونی طور پر ہم نے کسی عاشقانہ بے چینی کا اظہار نہ کیا اور میجر لائیڈ کے ساتھ ہو لیے۔

کرنل ٹیلر کی جگہ فوج ہے یا سرکس؟

ہمارے اصل میزبان کرنل ٹیلر تھے۔ لائیڈ ہمیں ان کے دفتر میں لے گئے۔ کرنل ٹیلر سے ملاقات ہوئی۔ ہماری تخمین کی تشخیص کے مطابق متواضع اور مہذب پایا لیکن تشخیص سے کہیں زیادہ متکلم اور منطقی نکلے۔ باتونی آدمی کا ایک فائدہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے حصے کی باتیں بھی کرتا ہے اور سننے والے کے حصے کی بھی۔ یعنی دو طرفہ بولتا ہے۔ چنانچہ کرنل ٹیلر سے باتیں کرتے ہوئے ہمارا کام فقط وقفے وقفے سے چائے کا گھونٹ پینا تھا اور گھونٹوں کے درمیان مسکرانا یا کچھ کھلکھلا اٹھنا۔ کرنل ٹیلر کی بات بات میں لطیفہ تھا۔ ایک مرد کی صحبت سے محروم رہ جانے پر گوارا اگر چپ میسر ہو تو اور کیا چاہیے؟ لیکن ہمارا جسٹر آنے کا اصل مقصد کرنل ٹیلر کے لطیفے سننا نہ تھا بلکہ ان کے توسط سے

فوجی لائبریری دیکھنا تھا اور ان کی لائبریرین مسز سمتھ سے ملنا۔ چنانچہ ایک دو مرتبہ کرنل صاحب کی توجہ کا رُخ لائبریری کی طرف موڑنے کی کوشش بھی کی لیکن ان کی روانیٔ گفتار ہماری کوشش کو بھی اپنے ساتھ بہا لے گئی۔ بہرحال جب آپ اپنے لطیفے سُنا چکے تو اس وعدے پر کہ باقی نصف کھانے پر سُنائیں گے، ہمیں اچانک لائبریری دیکھنے کی اجازت دے دی اور ان الفاظ میں:

"تم نے ہماری چائے پی لی۔ اب جاؤ۔ مسز سمتھ کا دودھ پی لو۔"

"لاحول ولا قوۃ،" ہم نے چونک کر کہا۔ "اگر یہ بات مسز سمتھ سن لے تو کیا کہے؟"

"معلوم نہیں۔ لیکن تم اتفاقاً ادھر ہی جا رہے ہو۔ پوچھتے آنا۔"

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ لائبریری پہنچے۔ مسز سمتھ کو دیکھا تو ایک ماں ماتا قسم کی عورت نکلی۔ ظاہر ہے کہ کرنل ٹیلر کی لطیفہ گوئی اپنی بوڑھی لائبریرین کے ضمن میں کسی قدر بے لگام ہو گئی تھی۔ مگر کیا یہ لگامی اتفاقی تھی یا ارادی؟ مسز سمتھ نے یہ معمّا جلد ہی حل کر دیا۔ بولی:

"کرنل خان، ایک گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"

"میں تاخیر کی معافی چاہتا ہوں۔ وجہ یہ ہوئی . . . . ."

"کہ کرنل ٹیلر آپ سے چپکے رہے۔"

"جی ہاں، جی نہیں . . . ."

"پھر ایک گھنٹہ میری چائے چاٹنے کے بعد کہا کہ اب جاؤ اور جا کر مسز سمتھ کا دودھ پی لو۔"

ہمارے منہ سے ایک بار پھر بے ساختہ لاحول نکلی لیکن جلد ہی سنبھل کر کہا:

"دراصل بات یہ ہے مسز سمتھ . . . . . ."

"کہ کرنل ٹیلر بیہودہ اور باتونی بڈھا ہے۔" مسز سمتھ، "اصل میں کرنل ٹیلر . . . . ."

"کرنل نہیں مسخرا ہے، اس کی صحیح جگہ فوج نہیں سرکس ہے۔"

بار بار بات کٹ جانے سے ہمارا دم پھولنے لگا۔ ذرا موقع ملا تو کہا:

"ڈیئر مسز سمتھ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟"

مسز سمتھ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ایک گہرا سانس لے کر بولی:

"میں معافی چاہتی ہوں۔ ٹیلر کی وجہ سے آپ کی مزاج پرسی نہ کر سکی۔ مزاج شریف؟"

"شکریہ۔ آپ کی لائبریری تو ماشاءاللہ بڑی شاندار ہے۔"

لائبریری کا ذکر محض مسز سمتھ کی خوشنودی کے لیے نہیں بلکہ کرنل ٹیلر کا ذکر زائل کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ کارگر ثابت ہوا۔ مسز سمتھ کی طبیعت ایک لمحے کے لیے بحال ہو گئی اور بولی:

"آپ کو پسند آئی میری لائبریری؟"

"بے حد۔"

"میرے پاس کچھ کم ایک لاکھ کتابیں ہیں۔ ایسی بڑی لائبریری تو نہیں، پر اچھی ہے۔"

ہمیں یاد آیا کہ پیچھے ملتان میں ہماری کمانڈ لائبریری کی کائنات بمشکل دس ہزار کتابیں تھی۔ مرعوب تو بہت ہوئے مگر اپنی خ

پرپستہ ڈالتے ہوئے ذرا بے نیازانہ انداز میں کہا :

"ایک لاکھ ؟ اوہو ۔ خاصی تعداد ہے ۔"

مسز سمتھ جھٹ بولی : "آپ کی لائبریری میں کتنی کتابیں ہیں ؟"

اب کوئی افسر مملکت کے راز کا پردہ فاش کرنے کا مجاز نہیں ۔ علاوہ ازیں ہم برطانیہ کے بے بضاعت جزیرے سے مات کھانا چاہتے تھے نہ ایک عورت ذات سے ۔ فوراً ناموس وطن کی خاطر اصل تعداد کو دس سے ضرب دی ۔ جواب بہ ضرب ایک لاکھ پایا ۔ اُسے دو کیا ۔ پندرہ سے ضرب دی ۔ جواب ڈیڑھ لاکھ نکلا ۔ قبول کیا اور آنکھ جھپکے بغیر کہا ۔

"لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ ۔"

"پھر تو آپ کی لائبریری دیکھنے کے قابل ہوگی ۔"

"آپ کی دعا سے مرجع خاص و عام ہے ۔"

اِس ایک جواب سے مسز سمتھ کی برتری کا قلع قمع کر دیا ۔ پھر ہم نے طاقت کی پوزیشن سے وہ سکّہ بند سوال پوچھنا شروع کیے جو ہر لائبریرین سے پوچھا کرتے تھے ۔

"آپ کی لائبریری میں ہر روز کتنے آدمی آتے ہیں ؟"

"سو سے دو سو تک ۔"

ہمیں یاد آیا کہ ہمارے لائبریرین کی آنکھیں قارئین کی راہ تکتے تکتے سفید ہو گئی تھیں اور جس روز چھٹے کے بعد ساتواں آدمی آجاتا تھا ، غریب کی بینائی کو افاقہ ہونے لگتا تھا ۔ گفتگو جاری رکھی ۔

"آپ لوگوں کو لائبریری کی طرف کس طرح راغب کرتی ہیں ؟"

"ہمارا مسئلہ لوگوں کو راغب کرنے کا نہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ راغب لوگوں کو لگام دینے کا ہے ۔"

ہمیں اپنے لائبریرین کی وہ تجویز یاد آئی کہ " اگر ہر کتاب کے ساتھ ایک رس گلا مفت اِشو کر دیا جائے تو شائد افزائش رغبت کا باعث ہو ۔"

کہا : "آپ کے ہاں کس قسم کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں ؟"

"سینئر لوگ اکثر پیشہ ورانہ کتابیں پڑھتے ہیں ۔ مگر نوجوان فکشن اور پوئٹری بھی مانگ لیتے ہیں ۔"

"قدرتی بات ہے ۔ بوڑھوں اور نوجوانوں کی پسند میں کچھ فرق ہونا چاہیئے ۔"

"مگر کرنل ٹیلر اِس قاعدے سے مستثنیٰ ہے ۔"

"کیا مطلب ؟"

"وہ فقط ایک کتاب بار بار پڑھتا ہے ۔ کوئی بیس مرتبہ لائبریری سے لے چکا ہے ۔"

"کونسی کتاب ؟"

" THE DIRTIEST JOKES OF THE WORLD "

(دنیا کے غلیظ ترین لطیفے)

ہمارے منہ سے بے یقینی میں نکلا، "نہیں تو!"

بولی: "بالکل صحیح ـــ اسی لئے تو دنیا بھر میں غلیظ ترین دماغ کا مالک ہے۔"

گفتگو پھر کبھی کبھی کرنل ٹیلر کی سمت جارہی تھی جو ہر چند کہ خاصی کراہت تھی تاہم ہمارے مشن کے پیش نظر ذرا لیے وقت تھی۔ مسز سمتھ کی زبان کی تلوار کو اپنے محبوب شکار ـــ ٹیلر ـــ کے گلے سے جدا کرنا آسان نہ تھا لیکن ہم نے ایک متبادل موضوع پیش کیا۔

"کیا میں آپ کی خوبصورت لائبریری کا چکر لگا سکتا ہوں؟"

مسز سمتھ لفظ خوبصورت کی آواز پر آنا فانا پگھل گئیں اور ٹیلر کو نیم بسمل چھوڑ کر ہمیں لائبریری دکھانے لگیں۔ الماریوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے مسز سمتھ اپنی کتابوں کے کوائف اس پیار اور لاڈ سے بتانے لگیں گویا اپنی سہیلیوں سے تعارف کرا رہی ہوں۔ ایسے محبت بھرے تعارف کے بعد ان کتابوں یا بہ دیگر الفاظ مسز سمتھ کی سہیلیوں کو سینے سے لگانے کو جی چاہا۔ مسز سمتھ کے ساتھ کتابیں دیکھتے دیکھتے بہت وقت گزر گیا لیکن اس وقت تک احساس نہ ہوا جب تک میجر لائیڈ نے آکر یاد نہ دلایا کہ لنچ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ مسز سمتھ سے رخصت ہوئے تو محسوس ہوا کہ زندگی میں ایک حقیقی فنکار سے ملاقات ہوئی ہے۔ پھر لنچ کی میز پر جا بیٹھے تو کرنل ٹیلر نے لطیفوں کی دوسری کھیپ کھول دی۔ ملاقات یہ بھی یادگار تھی کہ کرنل ٹیلر بھی ایسے حقیر فنکار نہ تھے، فقط یہ کہ ان کا میدان ذرا مختلف تھا۔

وال کے معنی محض دیوار نہیں

لنچ کے بعد ہم میجر لائیڈ کی سپردگی میں تھے۔ ان کا فن چسٹر کی سیر کراتا تھا اور وہ بھی اپنے فن میں یکتا تو تھے لیکن خرابی یہ تھی کہ آج ان کے فن کا نزلہ ہم پر گرنے والا تھا۔ انگریز طبعاً تاریخی مقامات کا شوقین اور کھنڈروں کا دلدادہ ہے۔ معمر ماں باپ کے سوا وہ ہر معمر چیز کی پوجا کرتا ہے۔ لائیڈ نے لنچ سے فارغ ہوتے ہی ہمیں دعوت دی:

"آئیے کرنل خان ـ آپ کو وال WALL دکھائیں۔"

چسٹر میں وال کے ایک ہی معنی ہیں، شہر کی فصیل۔ عام دیواروں کو مالک دیوار کے نام سے ہی پہچانا جاتا ہے۔ ہمیں فصیل دیکھنے کا شوق نہ تھا۔ کہا:

"میجر لائیڈ کھانے کے بعد ذرا آرام نہ کر لیا جائے؟"

بولا: "آرام کرنے کو عمر باقی ہے۔ وال دیکھنے کا موقع پھر نہیں آئے گا۔ آئیے۔"

ہم نے ایک عصری حربہ آزمایا:

"میجر لائیڈ، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ شاید تم گھر جانا چاہو۔ تمہاری بیوی انتظار کر رہی ہو گی۔"

بولا، "وہ مرچکی ہے۔"

مجھے شک گزرا کہ اگر وہ ایک بخت زندہ بھی ہوتی تو یہ ترجیح دیوار ہی کو دیتا۔ ایسے آدمی سے بحث کرنا دیوار سے سر پھوڑنا تھا۔ بہرحال گفتگو میں یہ کہنے کا تھیں ہمدردی کا مقام تھا کہ غریب کی بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ ہم نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"بڑا افسوس ہے کب مری؟"

بولا: "مری نہیں، دراصل بھاگ گئی ہے۔ لیکن بھاگی یا مر گئی، ایک ہی بات ہے۔"

ایک ہی بات تو نہ تھی۔ بھاگنے اور مرنے میں بڑا واضح فرق ہے بشرطیکہ اس فرق کو محسوس کرنے والا دل بھی ہو۔ ہم نے لائیڈ کے چہرے پر دیکھا کہ مرا ہمیشگی کی کوئی تحریر رقم ہے یا نہیں۔ کوئی ایسی تحریر نظر نہ آئی۔ چہرے کے علاوہ وہاں کی دیوار پرستی پر غور کیا تو محسوس ہوا اس شکل اور شوق کے ہوتے ہوئے مسز لائیڈ نے بھاگ کر کوئی ایسا بڑا انکشاف بھی نہیں کیا۔ بہرحال مسٹر لائیڈ بیوی کا مستحق نہ سہی، ہمدردی کا مستحق ضرور تھا۔ ایک مظلوم اور زن مرید خاوند کو دیکھ کر کیسے ترس نہ آتا؟ — چنانچہ دعوت قبول کرنے سے زیادہ رحم کھا کر مسٹر لائیڈ کے ساتھ چل پڑے۔

فصیل کے پاس پہنچے۔ دیکھی۔ نیچے سے اوپر اور دائیں سے بائیں اور کہا کہ اب دیکھنے کا عمل ختم ہو گیا ہے لیکن لائیڈ نے دفعتاً اوپر جاتی ہوئی ایک سو سیڑھیوں میں سے پہلی پر قدم رکھا اور ہم پر اس توقع سے نظر ڈالی کہ پیچھے اس امام کے ہم بھی سیڑھی پر قدم رکھیں۔ اب اگر ہمارے سیر کرنے کا شوق ہوتا تو اپنے وطن ہی میں کر چکے ہوتے۔ چنانچہ دل نے نصیحت روکا مگر ہم مروت میں انکار نہ کر سکے۔ لائیڈ خوش ہو کر بولا۔

"اصل شے فصیل نہیں بلکہ وہ نظارہ ہے جو فصیل کی چوٹی سے نظر آتا ہے۔"

اوپر پہنچے تو نظارہ بے شک دلفریب تھا لیکن جس رفتار سے ہمارا دل چل رہا تھا اسے قریب کھانے کی فرصت نہ تھی۔ دم لے چکے تو لائیڈ فصیل کے اوپر بنی ہوئی سڑک پر آگے بڑھنے لگا۔ دوسرے لفظوں میں ہمیں دعوت دی جا رہی تھی کہ اس چار میل لمبی چوکور فصیل پر پیدل چل کر شہر کا طواف کریں۔ لائیڈ بحیثیت خاوند ناکام سہی لیکن بحیثیت پیادہ خاصا کامیاب تھا۔ ہم ہر چند کہ بہت کامیاب پیادے نہ تھے تاہم پاکستانی کم ہمتوں کی عزت کا سوال تھا۔ چیلنج قبول کیا اور چار میل لمبی سڑک پر عزت کر لی تھامے اپنے فگار پاؤں سے حکایت خونچکاں لکھنا شروع کی۔ نصف راہ طے کرنے کے بعد فصیل کے جنوب مغربی کونے پر پہنچے تو سامنے کوئی دو سو سیڑھی اونچا ایک عجائب گھر تھا۔ مسٹر لائیڈ کونے پر بائیں ہاتھ مڑنے کی بجائے عجائب گھر کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ناچار ہم بھی امام کے پیچھے ہولیے فلک بڑھنے لگے اور اپنی حکایت کو جسے دو میل اٹھا رکھا تھا، دو سو گز ممدود لکھنا شروع کیا۔ ایک مدت کے بعد عجائب گھر کے دروازے پر پہنچے تو محسوس ہوا کہ جسم تو ساتھ ہے مگر جان چند قدم پیچھے رہ گئی ہے۔ چنانچہ دو منٹ وہیں بیٹھ کر عجائب گھر کے اندر قدم رکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میم عمر ۸۵ برس، چھڑی کے سہارے ایک الماری سے دوسری الماری کی طرف بڑھ رہی ہے۔ کچھ دیکھ رہی ہے۔ کچھ پڑھ رہی ہے اطلاعی پرچیاں زبان اور دو چار دانتوں کی مدد سے جتنا چبا سکتی ہے چبا رہی ہے۔ چند سوال ذہن میں آئے: "کیا یہ خاتون ساری سیڑھیاں چڑھ کر آئی ہے یا کوئی ہوا کا جھونکا اسے ادھر اڑا لایا ہے؟ یا کیا اس فصیل کی ہم عمر بڑھیا کو بچپن ہی میں یہاں پہنچا کر اس کے پیچھے فصیل اور بعد ازاں گرد عجائب گھر تعمیر کر دیا گیا تھا؟"

—— اتنے میں لائیڈ نے بڑھیا کو سلام کیا اور بولا:

"ہیلو مسز ایمیٹ۔ آج کی … چڑھائی کیسی رہی؟"

بڑھیا بولی: "مسٹر! آج مجھے سیڑھیاں چڑھنے میں [illegible] منٹ لگے۔ پچھلی دفعہ ستانوے لگے تھے۔"

یہ ثابت ہوا کہ بکرو بالی حج بیج پیدل ہی اوپر پہنچی تھی اور ظاہر ہے کہ فصیل پیمائی کی لذت موصوفہ کو جوانی ہی میں لگی ہو گی۔ دفعتاً

ہمیں شک گذرا کہ اس کا خاوند بھی ابتدائے خاوندیت ہی میں بھاگ گیا ہوگا۔ نکڑ نانی سے آنکھ بچا کر لائیڈ سے پوچھا تو بولا:

"آپ کا شک درست ہے۔ مسز ایبٹ ہنی مون بھی فصیل پر منانا چاہتی تھی۔ اس پر مسٹر ایبٹ سہرے سمیت ہی بھاگ نکلا۔"

چنانچہ آجکل میجر لائیڈ اور مسز ایبٹ ہم مرض، ہمراز اور ہم شغل تھے اور اکثر عجائب گھر تک اکٹھی پرواز کرتے تھے۔

آخر عجائب گھر سے اُتر کر، باقی فصیل سے گزر کر، بسلامت زمین پر قدم رکھا تو ہم نے پہلے ٹیلی گراف آفس سے گھر تار بھجوایا کہ ایک کالے بکرے کی فوری نیاز دی جائے۔ تفصیل بعد میں۔"

تار دے کر جوں ہی اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہنچے ایک بے تاب مچھلی کی طرح گرم پانی سے لبالب بھرے ٹب میں داخل ہو گئے اور ایک مدت تک داخل رہے کہ چھوٹے موٹے غسل سے وہ تاریخی کوفت رفع ہونے کی نہ تھی۔ آخر ہمارے جسم وجان میں دیرینہ شگفتگی نے کروٹ لی تو ہم ٹب سے نکل کر ایک گداز بستر میں دراز ہو گئے۔ سروس کو چائے کے لئے فون کیا۔ روم میڈ چائے لائی تو اس سے ایک فالتو خدمت کی التجا کی کہ باہر دروازے پر "NO VISITORS" کا بورڈ لٹکا دے کیونکہ کرنل ٹیلر کا کوئی اعتبار نہ تھا۔ اس کے پاس ناگفتہ اور ناگفتنی لطیفوں کا ابھی خاصا ذخیرہ تھا۔ بے مداخلت کاروں سے مصئون ہو کر تمام رات آرام سے سوئے اور رات بھر میٹھے اور موافق خواب دیکھے۔ سوائے ایک خواب کے جس میں ایک کالا بکرا ہمارے سرہانے آ کھڑا ہوا اور تھوڑی دیر غیر دوستانہ نظروں سے گھور کر اوجھل ہو گیا۔ خدا جانے وہ اندر کیسے آ گیا، غالباً اُس نے باہر نوٹس بورڈ نہیں پڑھا تھا۔

تمنا مظفر پوری

الگو چودھری کا مکان ۔ کمرے کے اندر سامنے نمایاں جگہ پر ٹیلویژن سیٹ ہے۔ ٹی وی سیٹ کے سامنے کئی کرسیاں لگی ہوئی ہیں۔ الگو چودھری کرسی اٹھا کر ادھر اُدھر رکھ رہے ہیں تا کہ ٹی۔ وی پر پروگرام دیکھنے میں کسی کو دقت نہ ہو۔

دروازے پر دستک ہوتی ہے

(دستک کی آواز)

الگو چودھری: کون ہو بھیا!

پریم چند: میں ہوں پریم چند

الگو چودھری: اوہو! منشی جی۔ بھیا اندر ہی چلے آؤ۔ آج گھر پر کوئی نہیں ہے۔

(پریم چند ایک دروازے سے اندر داخل ہوتے ہیں)

پریم چند: کیوں بھئی الگو چودھری! گھر کے لوگ کہاں گئے ہیں؟ اور تم گھر میں اکیلے کیا کر رہے ہو۔

الگو چودھری: منشی جی! آج اتوار ہے نا! آج ٹی وی پر آنے والی فلم "ستیم شیوم، سندرم" سنا ہے اس فلم میں سیکس (S EX) دکھلایا گیا ہے۔ گھر کے سب لوگ پہلے ہی شہر کے سینما ہال میں دیکھ چکے ہیں لہذا آج ان لوگوں کو میں نے ایک مبٹ پکچر دیکھنے کو بھیج دیا ہے۔ سوچا اسے خود دیکھوں کہ سیکس پر کیسی پکچر بناتے ہیں یہ لوگ! سیکس کے بارے میں انہیں کیا علم ہے۔ سیکس تو انسان کو ساٹھ سال کے بعد سمجھ میں آتا ہے جب وہ کوئی کام کا نہیں ہوتا۔

پریم چند: چودھری جی، سیکس کی جانکاری سے آپ کو کیا ضرورت؟

چودھری: ضرورت مجھے نہیں دوسروں کو ہے، نوجوانوں کو ہے، ہمیں اپنا تجربہ اور معلومات انہیں بتانا چاہیے۔

پریم چند: چودھری، سیکس سن کر یا کتاب پڑھ کر نہیں آتا بلکہ ڈھیرے ڈھیرے تجربے سے حاصل ہوتا ہے۔

الگو چودھری: جی ہاں اور جب تمام رموز و نکات انسان کے سمجھ میں آجاتے ہیں تو وہ خود بےکار ہو جاتا ہے

یہی وجہ ہے کہ انسان بڑھاپے میں کم عمر لڑکیوں سے
شادی رچانا چاہتا ہے۔ سُنا ہے کہ آجاریہ رجنیش
اپنے تجربے کی بنیاد پر لوگوں کو سیکس کی تعلیم دیتے
ہیں۔ میں نے سوچا کہ فلم دیکھ کر پتہ چلاؤں کہ آخر یہ
لوگ کہاں تک پہنچے ہیں۔ ہاں منشی جی آپ نے بھی
تو فلم بنائی تھی۔

پریم چند: چھوڑو چودھری ان بیتی باتوں کو۔

الگو چودھری: بھیا تمہیں اس لائن کا تجربہ ہے اس لیے پوچھ
رہا ہوں۔

پریم چند: "جن ہاتھوں میں فلم کی قسمت ہے وہ بدقسمتی
سے اسے انڈسٹری سمجھ بیٹھے ہیں۔ انڈسٹری کو
مذاق اور اصلاح سے کیا نسبت وہ تو اکسپلائٹ کرنا
جانتی ہے۔ وہ یہاں انسان کے مقدس ترین جذبات
کو اکسپلائیٹ کر رہی ہے"۔[1]

الگو چودھری: مگر بھیا فلم سے اصلاح کا کام لیا جا سکتا
ہے۔ لوگوں کو برائیوں سے بچایا جا سکتا ہے۔

پریم چند: "یہ صنف بھی اسی طرح سرمایہ داروں کے
ہاتھ میں ہے، جیسے شراب فروشی۔ انہیں اس سے
بحث نہیں کہ پبلک کے مذاق پر کیا اثر پڑتا ہے۔
انہیں پیسے سے مطلب۔ برہنہ رقص، بوسہ بازی
اور مردوں کا عورتوں پر حملہ۔ یہ سب ان کی نظروں
میں جائز ہے۔ پبلک کا مذاق اتنا گر گیا ہے کہ جب
تک یہ حیاسوز نظارے نہ ہوں اسے تصویروں میں مزہ
نہیں آتا۔ مذاق کی اصلاح کا بیڑا کون اٹھائے۔
سینما کے ذریعہ مغرب کی بیہودگیاں ہمارے اندر
داخل کی جا رہی ہیں اور ہم بے بس ہیں۔

سائینس ایک برکت ایجاد ہے مگر تاجروں کے علاقہ
میں پڑ کر لعنت ہو رہی ہے"۔

الگو چودھری: یہی کارن ہے کہ سماجی فلم کے نام پر لوگوں کو
گندہ فلم دکھاتے ہیں۔ پبلک کو بدھو بنانا خوب
آتا ہے انہیں۔

پریم چند: چودھری جی چھوڑو ان باتوں کو۔ میں دراصل ایک
ضروری کام سے آیا ہوں۔

الگو چودھری: ہاں ہاں کہو بھیا، کیا کام ہے۔؟

پریم چند: کام صرف یہ ہے کہ ہندی والے مجھے ہندی کا لیکھک
کہتے ہیں اور اردو والے اردو کا۔ دونوں ہی غلط فہمی
میں مبتلا ہیں۔ اسی کا فیصلہ تم لوگوں سے کرانے آیا
ہوں۔ میں پنچایت بٹھا لینا چاہتا ہوں۔

الگو چودھری: منشی جی۔ میرا فیصلہ کون مانے گا۔ اب گرام
پنچایت بن گئی ہے۔ سکھیا رام دھن مصر اور سرپنچ
گوڈر شاہ ہو گئے ہیں۔ اب پنچایت کا کام یہی لوگ
دیکھتے ہیں۔

پریم چند۔ چودھری! وہ لوگ جو بے ایمان اور ضمیر فروش ہیں
ان لوگوں کو مکھیا کس نے بنایا؟

الگو چودھری: چناؤ سے وہ لوگ مکھیا اور سرپنچ بنے ہیں۔

پریم چند، لیکن آپ لوگوں نے انھیں ووٹ کیوں دیا؟

الگو چودھری: ووٹ ہم لوگوں نے دیا ارے منشی جی تم تو بڑے
بھولے ہو۔ ووٹ ہم لوگوں نے دیا ہی کب الکشن
بوتھ پر جو حاکم تھے اسے رشوت دے کر ملا لیا گیا
اور رام دھن مصر، جھو سیٹھ اور گوڈر شاہ کے غنڈوں
نے ملی کرکے ووٹ بکس دے دیا۔ اصلی ووٹر کو
بوتھ کے نزدیک جانے ہی نہ دیا گیا۔ چاروں طرف

---

[1] پریم چند کے مکالمے جو واوین میں ہیں وہ ان کی اپنی تحریر ہے۔

بم اور بندوق کی آواز اس طرح گونجنے لگی کہ شریف
لوگ گھر سے باہر نکلے ہی نہیں ۔

پریم چند: پولس کو مداخلت کرنی چاہیے تھی !

الگو چودھری: پولس اور مداخلت بھیا ۔ مجسٹریٹ اور گشتی
پولس اس وقت آئی جب سب کام ختم ہو چکا تھا
جو پولس والے بوتھ پر حاضر تھے وہ پریزائڈنگ
افسر کے حکم کا انتظار ہی کرتے رہ گئے ۔

پریم چند: چھی چھی بہت بری بات ہے ۔ اس طرح تو ملک
میں بدنظمی پھیل جائے گی ۔

(دستک)

الگو چودھری: کون ہو بھیا !

آواز: میں ہوں جمن

الگو چودھری: اندر آجاؤ ۔ گھر کے لوگ باہر گئے ہیں ۔

(جمن ایک دروازے سے اندر آجاتے ہیں)

جمن: (پریم چند کو دیکھ کر) ارے منشی جی! آداب عرض ہے
منشی جی

پریم چند: آداب عرض ۔ اچھا ہوا جمن بھائی ۔ آپ بھی آگئے ۔
آپ دونوں مل کر میرے مقدمے کا فیصلہ کر دیں تاکہ
میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے ۔

جمن: کیسا مقدمہ؟ اور مقدمہ ہم لوگ کیوں دیکھیں گے ۔
اب تو گرام پنچایت بن گئی ہے ۔

پریم چند: گرام پنچایت بننے کی منحوس خبر مجھے مل چکی
ہے ۔ "ڈیموکریسی کی ان دو صدیوں میں جو پامالیاں
ہوئیں وہ مطلق انسان کی لاتعداد صدیوں میں نہ ہوئی
تھیں ۔ اپنے ملک کے لیے ڈیموکریسی چاہے جتنی مبارک
ثابت ہو لیکن دنیا کی نظر میں تو اس نے کوئی کام نہیں
کیا جس پر وہ فخر کر سکے ۔ اب دنیا اس سے عاجز آگئی
ہے ۔ اس کا خاتمہ کرنے کے لیے انتظام کا سہارا لینا چاہتی
ہے جس میں مطلق العنانی اور ڈیموکریسی کی خوبیاں تو
ہوں لیکن برائیاں نہ ہوں ۔"

الگو چودھری: ہاں منشی جی تم ٹھیک کہتے ہو ۔ پڑھے لکھے آدمی
ہو تمہیں سب خبر رہتی ہے ۔

پریم چند: میں آپ دونوں کو اپنا پنچ چنتا ہوں ۔ آپ میرا
انصاف کر دیں ۔

جمن: اچھا کہو بھیا کیا بات ہے؟ کیسا مقدمہ ہے، کون
مدعا علیہ ہے اور جرم کیا ہے؟ کون کون گواہ ہے
اور وہ لوگ کہاں ہیں ۔ کہیں سانحہ لکھایا گیا ہے یا نہیں
اور کتنے کا نقصان ہوا ہے !

پریم چند: جمن بھائی آپ نے تو بالکل وکیلوں کا سا انداز
اختیار کر لیا ہے ۔ کچہری آنے جانے کا آپ پر
پورا اثر پڑا ہے ۔

الگو چودھری: کچہری کا اثر منشی جی جب سے گرام پنچایت
بنی ہے سب ڈویزن اور ججی کورٹ میں مقدمہ کا نمبر
بھی بڑھ گیا ہے ۔ اور سب کے پیروی کار یہ جمن بھائی
ہیں ۔

پریم چند: اچھا! گویا گرام پنچایت بننے کے بجائے یہ کہ گاؤں
کا جھگڑا گاؤں ہی میں سلجھے لوگوں کو کچہری کی دوڑ
لگانی پڑتی ہے ۔ بڑے افسوس کی بات ہے ۔

الگو چودھری: منشی جی آپ اپنی بات سنائیے بھرتی دی کا
وقت ہو جائے گا ۔

پریم چند: ہاں تو سنو ۔ چودھری جی اور جمن بھائی ۔ اردو
والے یہ کہتے ہیں کہ میں اردو کا ادیب ہوں اور
اردو میں لکھتا ہوں اور ہندی والے کہتے ہیں کہ میں
ہندی کا ادیب ہوں اور ہندی میں لکھتا ہوں ۔
اتنی ہی بات نہیں ہے ۔ میری تخلیق کو لے کر ہندی اور
اردو کا جھگڑا کھڑا ہو گیا ہے ۔

جمن : منشی جی! رسم الخط کے متعلق آپ کا کیا نظریہ ہے؟

پریم چند : "رسم الخط کا فیصلہ وقت کرے گا جو زیادہ جاندار ہے وہ آگے بڑھے گا۔ دوسرا پیچھے رہ جائے گا۔ رسم الخط کے اختلاف کی بحث کرنا گھوڑے کے آگے گاڑی کو رکھنا ہے۔ ہمیں اس شرط کو مان لینا چاہیے کہ ہندی اور اردو دونوں ہی قومی رسم الخط ہیں اور ہمیں اختیار ہے ہم چاہے جس رسم الخط میں اس کو استعمال کریں۔"

الگو چودھری : انگریزی بھاشا کو بدیشی اور اردو کو اپنی بھاشا مانتے ہوئے مہاتما گاندھی نے یہ بھی تو کہا ہے ۔

"انگریزی تو ایک غیر ملکی زبان ہے اردو تو ایسی نہیں ہے۔ مجھے تو اس بات پر فخر ہے کہ اردو ایک ایسی زبان ہے جو ہندوستان میں پیدا ہوئی اور ہندوستانی ہے۔"

پریم چند : اردو زبان چونکہ زیادہ لوچ دار اور نکھری ہوئی ہے اس لیے مختصر افسانوں کے لیے میں نے اردو ہی استعمال کی ہے۔

جمن ، تو پھر آپ ہندی میں کیوں لکھنے لگے ؟

پریم چند : جمن بھائی شاید آپ کو اعجاز صدیقی کی یہ تحریر یاد ہو"۔ زبانیں صرف اظہار کا ذریعہ نہیں ہوتیں ان سے بہت گہری تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی سماجی، قومی ملکی اور علاقائی وابستگیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہر زندہ زبان اپنے بولنے اور پڑھنے والوں میں عظیم انقلاب لاتی ہے۔ ہر زبان کو اپنا رسم الخط عزیز ہے۔"

جمن ، اس کا مطلب ؟

پریم چند : میرا اردو زبان میں لکھنا صرف اردو والوں تک رہ جاتا اور ان کی تعداد (آبادی) کم تھی اور میرے افسانے اور ناول کے کردار مسلمان کم ہوتے تھے۔ دراصل میں ہندو قوم کو بھی بیدار کرنا اور ان کو اپنا پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ فلم میں بھی اسی لیے گیا تھا۔ میں نے سوچا ــــ" وہاں جانے سے جو خاص فائدہ ہوگا وہ یہ کہ ناول اور کہانیاں لکھنے میں جو نہیں ہو رہا ہے اس سے کہیں زیادہ قلم دکھا کر ہو سکے گا۔ کہانیوں اور ناولوں سے تو جو لوگ پڑھتے ہیں وہی فائدہ اٹھا سکیں گے۔ فلم سے ہر جگہ کے لوگ فائدہ اٹھائیں گے۔"

جمن ۔ گویا آپ نے اردو والوں کو قابل اعتنا [illegible] ھا۔

پریم چند : نہیں! ایسی بات نہیں، اردو [illegible] پہلے ہی ثقافتی شعور اور تہذ[illegible] ہندی داں طبقہ یا ہندو قوم پسماندہ تھی۔ اس لیے میں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا۔

جمن ، تو آپ ہندی میں اسی لیے لکھنے لگے ۔

پریم چند : لکھنے نہیں لگے۔ شائع ہونے لگے۔ دراصل اردو میں ہی لکھتا تھا۔ پھر اسے ہندی میں منتقل کر کے شائع کراتا تھا۔ ہندی میں شائع کرانا میرے لیے آسان تھا۔

جمن : کیسے ؟

پریم چند: اردو رسالے میں لوگ آسانی سے بلکہ خوشی خوشی چھاپ دیتے مگر جب میری ناول یا افسانے کا مجموعہ چھاپنے کی بات ہوتی تو اردو کے پبلشر پیسے دینے میں آنا کانی کرتے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گؤدان پہلے ہندی میں شائع ہوئی تھی۔ پھر بہت دنوں بعد اردو میں شائع ہوئی۔ کیوں ؟

الگو چودھری ۔ کیوں ــــــ ؟

پریم چند: اردو میں کوئی پبلشر نہیں ملا ۔ پبلشر کی تلاش میں

پریشان ہوکر میں نے ایک خط اختر رائے پوری کو لکھا تھا ــــــ "گئو دان کے لیے ایک پبلشر تلاش کر رہا ہوں مگر اردو میں تو حالت تم جانتے ہی ہو۔ بہت ہوا تو ایک روپیہ صفحہ کوئی دیدے گا۔" اب تم ہی سوچو جمن بھائی کہ اردو میں کیونکر کوئی لکھے اور سچ پوچھو تو اردو کی ترقی میں ایک بڑی رکاوٹ یہ پبلشر بھی ہیں۔

الگو چودھری : منشی جی! اب صاف صاف یہ بتاؤ کہ تم لکھتے کس زبان میں ہو۔

پریم چند : "کبھی میں اردو میں لکھتا ہوں اور اس کا ہندی میں ترجمہ کرتا ہوں اور کبھی ہندی میں لکھتا ہوں اور بعد میں اس کا ترجمہ اردو میں کرتا ہوں۔"

جمن : یہ کیا بات ہوئی۔ صاف صاف بتایئے؟

پریم چند : میری بات سمجھنے کے لیے چودھری میرے ایک خط کا اقتباس سنو جو میں نے مولوی عبدالحق کو لکھا تھا "پہلا تھا گاندھی ہندی کے خدا نہیں اور نہ ان کی تاویل ماننے پہلے ہم مجبور ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہر بشر کی زبان ہندوستانی ہونا چاہیے۔ ہم میں جنہیں زبان کے مسئلے سے کچھ شغف ہے اگر اردو داں طبقہ ساتھ دیتا ہے تو وہ ہندوستانی بنے گی۔ سچ معنوں میں وہ الگ ہوجاتا ہے تو پھر وہ ہندی ہندوستانی ہوکر رہ جائے گی۔"

جمن : آپ کس کا ساتھ دیں گے؟

پریم چند : جمن بھائی۔ خیالات و افکار پہلے اردو الفاظ میں ہی میرے ذہن میں آتے ہیں۔ میں اردو میں سوچتا ہوں لکھتے وقت کبھی اردو میں لکھ لیتا ہوں کبھی ہندی رسم الخط میں مگر اردو رسم الخط میں لکھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

جمن : ہاں، اب سمجھ گیا کہ تم کس زبان کے ادیب ہو۔

چودھری : وہ کیسے؟

جمن : گورکی کی ناول "ماں" میں نے اردو میں پڑھی شاید منشی جی نے اسے انگریزی میں پڑھی ہو۔ ہندوستان میں یہ ناول اردو ہندی اور انگریزی زبان میں دستیاب ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ گورکی انگریزی یا اردو کا ناول نگار تھا۔ وہ دراصل روسی زبان کا ہی ادیب تھا۔

الگو چودھری : بالکل ٹھیک! اگر کسی تندور میں بلی جاکر بچہ دیدے تو وہ بچہ بلی کا ہوگا نہ کہ بسکٹ کہلائے گا۔

(قہقہہ)

جمن : منشی جی۔ اب تو آپ مطمئن ہیں۔

پریم چند : صرف آپ کے کہنے سے کیا ہوگا۔ اردو کے ٹھیکیدار جو سرکار میں اپنا رسوخ قائم کرنے کے لیے عوام کو بے وقوف بناتے ہیں۔ اور اپنا سیاسی میدان ہموار کرتے ہیں۔ وہ سمجھیں تب نا! ان ٹھیکیداروں کو نہ تو اردو کے ادیبوں سے ہمدردی ہے اور نہ اردو زبان سے۔ وہ صرف اردو کے نام پر ہنگامہ مچا کر حکومت سے مالی امداد لیتے ہیں اور گل چھرّے اڑاتے ہیں۔ اب یہ لوگ میرا ستیاناس کرنے پر تلے ہیں۔

جمن : وہ کیسے منشی جی۔

پریم چند : اس سال میرا جشن صد سالہ منانے کا لوگوں نے پروگرام بنایا ہے۔ رسالے کے مدیران نمبر نکال رہے ہیں اور طرح طرح کے مضامین میرے متعلق لکھے جارہے ہیں . . . .

الگو چودھری۔ کون؟

آواز : "برج بانو"

(الگو چودھری دروازہ کھولتے ہیں۔ برج بانو کو دیکھ کر سب کھڑے ہوجاتے ہیں)

برج بانو : (دروازے پر ہی کھڑے ہوکر) الگو چودھری۔ منشی

پریم چند اور جمن میاں سے میری گذارش ہے کہ آپ
حضرات اپنی اپنی چتا اور قبر میں جاکر آرام کریں ۔
اُردو کے ٹھیکیداروں کے چکر میں نہ پڑیں ۔

الگو چودھری : آپ اندر تشریف لائیے نا وہاں کیوں کھڑی ہیں ۔

برج بالو : جی میں ٹھیک ہوں ۔ ہاں اردو زبان کی ترقی ان
ٹھیکیداروں سے ممکن نہیں بلکہ یہ زبان کو مارنے پر
لگے ہیں ۔ اور یہ بھی سن لیجیے کہ اسے کوئی ختم نہیں
کرسکتا ۔ اردو زبان زندہ ہے اور زندہ رہے گی ۔

جمن : کیسے ؟

برج بالو : اپنی شیرینی اور لوچ کی وجہ سے ۔ اب تو عام غیر مسلم
بھی خدانخواستہ ، ماشاء اللہ اور چشم بد دور کا
برمحل استعمال کرتے ہیں بلکہ میرا یقین ہے کہ اُردو
کا مسئلہ ان ٹھیکیداروں نے الجھا رکھا ہے تاکہ
ان کی روزی روٹی اور رسوخ کا خاتمہ نہ ہو ۔ لیکن الگو
چودھری ؟

الگو چودھری : جی فرمایئے !

برج بالو : جب تک شہید ، انقلاب زندہ باد وغیرہ الفاظ عوام
کی زبان پر رہیں گے اور ٹرک ڈرائیور فلم ، کرکٹ کی
کمنٹری اور ٹی وی کا مقبول عام پروگرام "پھول کھلے
ہیں گلشن گلشن" چلتے رہیں گے اردو زبان نہیں مٹ سکتی

جمن : مرحبا ۔ مرحبا ۔

برج بالو : منشی جی ! آپ نے جس زمانے میں کام کیا وہ زمانہ
اور تھا ۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ آپ پنچ کو پرمیشور
مان کر پنچایت قائم کریں ۔ یہ گرام پنچایت کا زمانہ ہے ۔
یہاں پنچ حکومت ، سیاست اور مصلحت دیکھ کر فیصلہ کرتے
ہیں ۔ آپ گٹ بندی ، غنڈہ گردی اور ذات پات کے زمانے
میں کسی کا مقابلہ نہیں کرسکتے ۔

پریم چند : محترمہ برج بالو صاحبہ اردو زبان کی اور میری جو
دُرگت ہو رہی ہے ۔ میں چاہتا ہوں . . . .

(کٹ)

اندھیرا . . . . گھپ اندھیرا ۔

تماش بینوں کی آواز (شور و غل اور سیٹیوں کی آواز کے درمیان)
لو کمبخت بجلی ہی چلی گئی ۔

(شور و غل ، سیٹیوں کی متواتر آوازیں)

اناؤنسر : محترم حاضرین ! خاموشی اختیار کیجیے ۔ چیخنے اور
سیٹی بجانے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا ـــــ ہاں ہمیں
افسوس ہے کہ جب ڈرامہ نقطۂ عروج پر پہنچنا ہی
چاہتا تھا کہ بجلی فیل ہوگئی ۔ کب آئے گی اس کی کوئی
امید نہیں ۔ کیروسین تیل کی قلت کی وجہ سے روشنی کا
دوسرا انتظام بھی نہیں کیا جاسکا ۔ بقیہ ڈرامہ آپ پھر کبھی
دیکھ لیں گے ۔ اندھیرے میں یہاں سے نکلنے میں جو
پریشانی ہوگی اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں ۔

(اندھیرا ۔ لوگوں کے گرنے کرسیوں کے الٹنے
پلٹنے کی آواز ، چیخ ۔ پھر دھیرے دھیرے
سناٹا چھا جاتا ہے)

□□

خرافات

(مراسلے)

● پیارے شگوفہ کمال!
تمہارا ایسا ہی خط ملے گا، مجھے یہی اندیشہ تھا اور دیکھ لو، میرے خواب پورے نہیں ہوتے، اندیشے پورے ہو جاتے ہیں۔
میں نے وعدہ شکنی کی، تم نے صبر کیا۔ تم نہیں میں اسے صبر جمیل کہتا ہوں، بس یہ دنیا وعدہ شکنی اور صبر جمیل کے سہارے ہی چلی جا رہی ہے، چلتی جائے گی۔
سچ مانو، تم تو گئے نہیں کہ میری حالت دگرگوں ہو چکی ہے۔ (؟ شائیل) کپور کا نمبر نکال لو، اس کے بعد میرے نمبر کی تیاری کرو بلکہ تیاری کا اعلان بھی کر لو۔

فکر تونسوی

● کنہیا لال کپور کی موت واقعی ظریفانہ ادب پر ایک گہری چوٹ ہے۔ ان کے شایانِ شان نمبر نکالئے۔ میرے پاس ان کے دو ایک خطوط ہوں گے۔ ڈھونڈ کر نکالوں گا۔

رضا نقوی واہی پٹنہ

● آپ نے جشنِ گرامیٔ قدر جناب بھارت چند کھنہ "مِنا" کے گلشنِ ادب میں ایک ایسا شگوفہ کھلا دیا ہے کہ لوگ حیرت کے عالم میں ہیں۔ ہر مہینے پابندیٔ وقت کے ساتھ باقاعدہ شگوفہ مل رہا ہے جو اپنی نوعیت کا واحد پرچہ ہے جس کے لئے آپ قابلِ مبارکباد ہیں اور آپ کی کاوشیں قابلِ تحسین اور لائقِ ستائش۔

خیر اندیش: عالم تاج پوری

● "شگوفہ" ماہ جون ۸۰ء نظر نواز ہوا۔ اتنا سارا ظریفانہ ادبی مواد کا فراہم کرنا آپ ہی کا حصّہ ہے۔ "شگوفے" اور مولانا محمد علی جوہر مرحومؒ کا ظریفانہ مزاج بہت پسند آیا۔ میری ناقص رائے میں یہ سلسلہ جاری رہے تو مناسب ہے۔

نزاکت فیضی، ملکاپور (مہاراشٹرا)

● "شگوفہ" ماہ جولائی نظر سے گزرا۔ پڑھ کر بے حد مسرت ہوئی۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کی اشاعت میں اضافہ کرے۔ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ کسی جریدے کے پھلنے پھولنے اور زندہ رہنے میں ایڈیٹر کی صلاحیت کے ساتھ قارئین کے تعاون کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ تازہ شمارے میں شوکت حسین کا مضمون "کانا دجّال ہندوستان میں" بہت پسند آیا۔

مخلص
محمد زاہد غوری حیدرآباد

● آپ لوگوں کی محنت کارگر ہو رہی ہے اور "شگوفہ" دن بدن زیادہ "ظالمانہ" ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے زورِ شباب اور زورِ اشاعت اور زیادہ ہو۔

اعجاز علی ارشد، پٹنہ

● لوگ کہہ رہے ہیں اور میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ "شگوفہ" نکھرتا جا رہا ہے۔

شکیل اعجاز، اکولہ

● "شگوفہ" کی خاص بات یہ ہو گئی ہے کہ وہ سال بھر میں دو یا تین خاص نمبر کے علاوہ سوونیر بھی شائع کرتا ہے اور سالانہ خریداروں کو ایک اضافہ انعام کی صورت عطا کرتا ہے، یہ سہولت ایک نعمت سے کم نہیں۔ شعری حصّہ زیادہ پڑھنے کو مل رہا ہے۔ مزید نئی اور اچھی تخلیقات سے شگوفہ کو مزین کیجئے۔

ناصر الدین۔ گلبرگہ

INTENSIVE CARE

Talib

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

SEPT. 1980 RS.

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

جلد : ۱۳ شمارہ : ۹ ستمبر ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر :
سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت :
حمایت اللہ، منظور احمد، مسیح انجم

سالانہ (۲۲) روپے
لائبریریوں سے (۲۵) روپے
بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

جنرل منیجر : سمیع جلیل
منیجر : بشیر انور
ٹائیٹل : طالب خوندمیری

فی پرچہ : ۲ روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ : ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد فون : 57716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

فہرست

چُورن

رضا نقوی واہی

بلڈ بار

BLOOD BAR

چوپٹ ہوئی جب شربتِ گردہ کی تجارت
کچھ روز رہے سوگ میں یارانِ طریقت

اسٹاک میں جو مال تھا آپس میں بٹا وہ
بٹوارے میں تلخی کی بھی کچھ آگئی نوبت

دوکان میں خاک اڑتی رہی چند مہینے
بیکاری کے اس دور میں ہونے لگی وحشت

جینے کے لئے شغل کوئی تھا جو ضروری
یاروں نے نکالی گذر اوقات کی صورت

تھے سامنے نظروں کے کئی طرح کے بزنس
سرمایہ و محنت کی تھی جن سب میں ضرورت

طے پایا بالآخر کہ کھلے ایک "بلڈ بار"
دوکان میں ہو خونِ جہندہ کی تجارت

بزنس تو پرانا تھا مگر نفع رساں تھا
کم خرچ میں تھی پورے منافع کی سہولت

ہٹلر کے اصولوں پہ بنایا گیا نقشہ
ترمیم بھی کچھ اس میں ہوئی حسبِ ضرورت

دوکان میں کھلا شعبۂ افواہ طرازی
اس کام پہ مامور ہوئی زرد صحافت

کچھ نصب ہوئیں کذب فروشی کی مشینیں
رفتار سے راکٹ کے بڑھی جھوٹ کی صنعت

اک جھوٹ کو سو بار جو دہرائیں زباں سے
لوگ اس کو سمجھ لیتے ہیں مبنی بہ صداقت

عملے میں بلڈ بار کے کچھ لوگ تھے وہ بھی
تھی لوٹنے اور پھونکنے میں جن کو مہارت

جز وقتی رضاکار بنے سارے چھرے باز
اس طرح سے قائم ہوئی تنظیم کی وحدت

جیسے ہی سوئچ آن ہوا فتنہ و شر کا
ہر شعبہ معاً آگیا حرکت میں بہ سرعت

گلرنگ ہوئی خشک زمیں تازہ لہو سے
ابلا جو رگِ جاں سے بلڈ بار کا شربت

پر لطف ہے یہ بات کہ یاروں کی طرف سے
انصاف کے اجلاس پہ گذری یہ شہادت

مقتول نے خود اپنا گلا کاٹ لیا تھا
قاتل تو ہے معصوم، عبث اس پہ ہے تہمت

القصہ بلڈ بار کے عملے کی نظر میں
پینے میں نہیں، خون بہانے میں ہے لذت

اس مشغلۂ خاص میں دو طرفہ مزہ ہے
تفریح کی تفریح، تجارت کی تجارت

○

عوض سعید

"پہلی کرن کا بوجھ"

ممتاز افسانہ نگار عوض سعید نے یہ مضمون ایوانِ اردو میں منعقدہ ڈاکٹر مغنی تبسم کے شعری مجموعہ "پہلی کرن کا بوجھ" کے جلسۂ رسمِ اجراء میں پڑھا تھا۔ اور بے حد پسند کیا گیا تھا ——— (مدیر)

مجھے یاد نہیں کہ میری مغنی سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ ہاں یہ احساس ضرور ہے کہ میں انہیں آج بھی رگِ جاں کے قریب پاتا ہوں۔ اس قرب کے باوجود اگر میں یہ کہوں کہ مغنی کی شخصیت کی نقاب کشائی کا اہل صرف میں ہی ہوں تو یہ میری خوش فہمی ہوگی۔ کیوں کہ مغنی کی شخصیت کی گہرائی تک پہنچنا کم از کم میرے بس کی بات نہیں۔ اس لئے مغنی کی شخصیت کا تجزیہ کرنا میرے لئے واقعی مشکل کام ہے۔ مشکل ان معنی میں کہ وہ ۲ + ۲ = ۴ والی شخصیت نہیں بلکہ ۲ + ۲ = ۵ والی شخصیت ہے۔ ممکن ہے قدیر زماں مغنی کی تہہ دار شخصیت کے اس چیلنج کو قبول کریں۔ ویسے کسی بھی چیلنج کو قبول کرنا اور پھر حواس باختہ ہوجانا قدیر زماں کے لئے ایک معمولی سی بات ہے۔ یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ مجھے تو یہاں مغنی کی شخصیت کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔ مغنی سے جب صرف جان پہچان تھی تو ان کا بیشتر وقت "پارٹی" کے کاموں میں گذرتا تھا۔ ایک طرف والدِ بزرگوار جج دوسری طرف فرزند انجمن کامریڈ اور یہ ۵۰ یا ۵۲ کا سنہ۔

عجیب زمانہ تھا وہ بھی ———

پھر جب آگے بڑھے تو پیچھے مڑ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ صبح کا انتظار کرنے والے ساتھیوں پر رات کیسے گذر رہی ہے۔

مغنی کی شخصیت کا ایک جز اُن کی اپنی "نرگسیت" بھی ہے۔ اور وہ اس آئینے کو بڑی مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں جس میں ان کے چہرے کا عکس ملتا اور اُبھرتا رہتا ہے۔ وہ باہر نکلنے سے پہلے اپنے آپ کو سنوارنے میں کافی وقت صرف کرتے ہیں۔ وہ اس وقت تک آئینے کے سامنے سے نہیں ہٹتے جب تک کہ ان کا کوئی ساتھی انتظار سے تنگ آکر یہ نہ کہے۔ "مغنی صاحب اگر آپ مصروف ہوں تو میں پھر کبھی آجاؤں گا۔"

جواباً وہ صرف یہی کہتے ——— "معاف کیجئے گا۔ کچھ دیر ہوگئی۔ میں آرہا ہوں۔"

ادبی اور علمی بحثوں میں اچانک کوئی چونکا دینے والی بات کہہ کر اپنے ساتھیوں کو بحث میں اُلجھا دینا اور پھر خود

کھڑے ہوکر تماشہ دیکھنا مغنی کا وصفِ خاص ہے ۔ ایسے موقعوں پر انھیں اِس شرارت سے کوئی بھی باز نہیں رکھ سکتا ویسے مغنی فطرتاً ایک شریف اور وضع دار آدمی بھی ہیں۔ باہر سے آنے والے ساتھیوں کا خیر مقدم کرنا ، اور انھیں ایرپورٹ یا اسٹیشن تک پہنچا کر خدا حافظ کہنا مغنی کے معمولات میں سے ایک ہے ۔

ایسے موقعوں پر قدیر زماں اپنی کار کے ساتھ مغنی کے ایک ہلکے سے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ جوں ہی اشارہ پایا گاڑی اسٹارٹ کردی اور پلٹ کر یہ بھی نہ دیکھا کہ کار میں مہمان بیٹھا بھی ہے یا نہیں۔

مغنی صاحب بلند آواز سے ہانک لگائیں گے "قدیر صاحب ذرا رُکئے"

قدیر زماں مغنی کی بات کاٹ کر کہیں گے۔ "مجھے یاد ہے مغنی صاحب ہمیں کتاب کی رونمائی کے فنکشن میں جانا ہے"

"وہ تو ہے ہی۔ لیکن اصل مہمان ہی کو آپ نے چھوڑ دیا ہے۔ جن کے ہاتھوں کتاب کی رسم اجرا ہوگی"

"تھائی گڈنس۔ مغنی صاحب Really آج مجھے ہو کیا گیا ہے کہہ کر وہ باہر کھڑے ہوئے مہمان کو اپنی کار میں اس طرح ٹھونس لیں گے جیسے کوئی مالِ غنیمت کو محفوظ جگہ منتقل کر رہا ہو۔

ادھر مغنی نے بھی اسکوٹر کے حادثہ کے بعد ایک کار خرید لی ہے۔ اور وہ گھر سے اس طرح نکلتے ہیں جیسے کوئی اپنے گناہ بخشوا رہا ہو۔ جب کار چلانے والے کا یہ عالم ہو تو کوئی غیبی طاقت ہی سواریوں کو محفوظ رکھ سکتی ہے۔

دوسری طرف ان کے کار چلانے کی رفتار کچھ اتنی سُست ہے کہ معمولی سیکل سوار بھی بہ آسانی انھیں اوورٹیک (Over take) کرلیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر مغنی کا چہرہ دیدنی ہوتا ہے، اور جب وہ اچانک Turn لیتے ہیں تو فٹ پاتھ پر چلنے والے سارے لوگ چیختے چلاتے بدحواسی کے عالم میں اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔ اور یہاں تک کہ ان کی کار سگنل کے پاس آکر خود بخود رُک جاتی ہے۔ اور وہ اس وقت تک گاڑی نہیں بڑھاتے جب تک کہ کانسٹبل انھیں آگے جانے کی ہدایت نہ دے۔

یہ ناممکن ہے کہ جہاں مغنی تقریر کر رہے ہوں۔ وہاں قدیر زماں چُپ رہیں ۔ "ابھی آپ نے مغنی صاحب کی عالمانہ تقریر سُنی ۔ مجھے اس تقریر کے بعد اُصولاً کچھ کہنا نہیں چاہئے۔ کیوں کہ میں اس جلسہ کا نہ کنوینر ہوں اور نہ صدر۔ چونکہ ادب جدید میں ۔ ادیب کی شخصی آزادی کو بڑی اہمیت حاصل ہے ۔ اس لئے میں نے سوچا کہ کچھ کہا جائے لیکن اب جبکہ چائے درمیان میں آچکی ہے۔ تو میں مناسب یہی سمجھتا ہوں کہ جلسہ کے خاتمہ کا اعلان کیا جائے ۔ ویسے چائے پیتے ہوئے بھی "کافکا" کی زندگی کے منفی رویہ کے بارے میں بھی بات کی جاسکتی ہے۔ کیوں کیا خیال ہے۔ مغنی صاحب آپ کا۔"

موقع اور محل کی نزاکت کا خیال کرتے ہوئے اگر مغنی بھی چُپ ہو جائیں تو قدیر زماں کی نگاہیں عالم صاحب کو ڈھونڈنا شروع کردیں گی ۔ اگر محفل میں عالم خوندمیری بھی ہوں تو وہ جھرجھری لے کر کہیں گے۔ "نہیں نہیں قدیر اس موضوع کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھو۔"

میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں یہ خاکہ مغنی سے شروع ہوکر قدیر زماں کی شخصیت پر نہ ختم ہو جائے۔ اس لئے میں پھر ایک بار اپنی باتوں کا رُخ مغنی کی طرف موڑنا چاہتا ہوں۔

مغنی سے سو بار مل کر بھی یہی احساس ہوتا ہے۔ ...

اصغر سے ملے لیکن ۔ اصغر کو نہیں جانا

مغنی کی شخصیت اس بند کمرے کی مانند ہے جس پر تالا پڑا ہوا ہے ۔ اور چابی بھی کسی اور کے پاس نہیں خود ان کے جیب میں ہے ۔ اس لئے یہاں جو بھی باتیں میں ان کے بارے میں کہوں گا ۔ ضروری نہیں کہ آپ بھی اُس سے متفق ہوں۔

انور معظم کی طرح مغنی بھی اپنے ساتھیوں کے گھر شاذ ہی جاتے ہیں ۔ اکثر صورتوں میں تو ان کے ساتھیوں ہی کو ان کے گھر کا طواف کرنا پڑتا ہے ۔

ایک دفعہ وہ صبح ہی صبح میرے گھر آئے ۔ دروازے کو کھٹکھٹانے کے بعد اوصاف کو آواز دی ۔ (اوصاف میرے بچے کا نام ہے)

میں نے فاطمہ سے کہا ۔ " یہ مغنی کی آواز معلوم ہو رہی ہے ۔ ضرور کوئی مرا ہو گا "

فاطمہ نے ناگواری سے میری طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا ۔ " چپ بھی ہو جائیے ۔ بھائی اگر سُن لیں گے تو کیا کہیں گے "

پھر مغنی نے اندر آ کر جب چپ کی چادر اوڑھ لی تو میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے ۔ پھر وہی خبر اُنہوں نے سنائی جو میرے دل میں تھی ــــــ اپنے ایک عزیز کی موت ۔

حلقۂ ارباب ذوق اور میرا جی مغنی کی سب سے بڑی کمزوری ہے ۔ اور ان کی یہی کمزوری اُنھیں ادب کے بعض مخصوص حلقوں میں معتوب بھی کرتی ہے ۔ اس کے باوصف میرا جی اور راشد کے ادبی سرمایہ کی شیرازہ بندی میں وہ برسوں سے جٹے ہوئے ہیں ۔ اس کٹھن مہم میں اُنہوں نے اپنے دو ایک شاگردوں کو بھی شامل کر لیا ہے ۔ مغنی کے ورغلانے ہی پر ایک نے اپنے تحقیق کے لئے راشد کا انتخاب کیا ہے ۔ دوسرے نے میرا جی کا ۔

مغنی نے احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے دونوں شاگردوں پر کڑی نظر رکھی ہے کہ کہیں وہ ہتھے سے نہ نکل جائیں ۔

چنانچہ ان کے پہلے شاگرد نے اس بھاری پتھر کو چومنے سے بہتر یہی سمجھا کر چند برس کے لئے کہیں فرار ہو جائیں ۔ اور اس طرح ایک دن وہ لاپتہ ہو گئے ۔ سُنا ہے کہ اُنہوں نے اپنی نجات کا راستہ رحمت آباد کی درگاہ میں ڈھونڈ لیا ہے ۔ کوئی عجب نہیں کہ وہ وہاں یہ دعا بھی کرتے رہے ہوں کہ " معبود مجھے مغنی اور راشد سے بچائے رکھ "

دوسرے شاگرد کے بارے میں ایک اطلاع یہ ملی کہ وہ میرا جی کی بھٹکی ہوئی روح کے تعاقب میں بہت دور نکل پڑے ہیں اور ہنوز انہیں لو ہے کہ ان ۳ گولوں کے حصول میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی ہے جو میرا جی کے ہاتھ میں کبھی گھوما کرتے تھے ۔

مغنی کے انڈر میں ریسرچ کرنا گویا پل صراط پر سے گذرنا ہے ۔ اس پل صراط سے وہی سرکش گذر سکتے ہیں ۔ جن کے دل میں کام کی لگن اور سودا ہو ۔

دوستی اور یاری کے باب میں مغنی کی محبت کا انداز ہی کچھ نرالا ہے ۔ وہ جی جان سے ہر ایک کو چاہیں گے ۔ مگر اس طرح کہ اسے کانوں کان خبر نہ ہو ۔ لیکن جب جذبۂ محبت غالب آ ہی جائے تو زبان ان کے اظہار کا ذریعہ بن جاتی ہے ۔

وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے جب اُنھوں نے مشاعرہ کر خلوص سے گلے لگاتے ہوئے کہا تھا ۔ شاذ تم فیض سے اچھے شاعر ہو میں تم پر ضرور مضمون لکھوں گا ۔ یہ بات مغنی نے یوں ہی نہیں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہی تھی ۔

" مغنی صاحب یہ تو آپ کی محبت اور عنایت ہے ۔ ورنہ یہ بندۂ خاک "

"تم نہیں جانتے شاذ کہ تم فیض سے بہرحال اچھے شاعر ہو۔"

"یہ خاکسار بہرحال اپنے آپ کو فیض سے کچھ کم ہی سمجھتا ہے۔ لیکن خدا جھوٹ نہ بلوائے مغنی صاحب۔ میں بڑا بول نہیں بولتا۔ خدا نے مجھے اتنی عزت دی ہے کہ میری شہرت ہندوستان اور پاکستان ہی میں نہیں بلکہ افغانستان میں بھی ہے۔ اب تو مڈل ایسٹ اور امریکہ میں بھی شاذ ہی کی باتیں ہوتی ہیں۔ یار عوض تم چپ کیوں ہو۔ کیا میں یہ باتیں غلط کہہ رہا ہوں"

نہیں شاذ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ تمہاری شہرت آج کل فلم اسٹاروں سے کچھ کم نہیں ہے۔

اب آئے ہو راستے پر۔

اور پھر راستے دوسرے راستوں سے جا ملتے۔

منظر بدلا تو کچھ پرانے چہرے پھر مجھے دکھائی دئیے۔ ان چہروں میں قاضی سلیم کا بھی چہرہ تھا۔ اور انور معظم کا بھی۔ مصحف اقبال کا بھی اور مغنی کا بھی۔ رائل ہوٹل کے کمرے میں داخل ہو کر میں نے اپنی نشست سنبھالی ہی تھی کہ مجھے ایک آواز آئی۔ واہ کیا بات کہہ دی ہے۔ اقبال پھر سے یہ شعر سناؤ۔

جس سے لی تھیں اسی کو لوٹا دیں

یہ رہیں صبحیں، یہ تری شامیں

یہ مغنی تھے جن پر اس شعر نے ایک وجدانی سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اور جب ایک اور منظر بدلا تو اقبال نے انور معظم سے کہا۔

مغنی صاحب کی محبت اور ان کی شعر فہمی پر ہمیں فخر ہے۔ وہ کبھی جھوٹی تعریف نہیں کرتے۔

انور نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "اس میں کیا کلام ہے۔"

مغنی کی کم آمیزی بھی ان کے لئے ایک ہتھیار کا کام دیتی ہے۔ اور انھیں ناگہانی حملوں سے بچاتی ہے۔ کبھی کبھی تو اہم سے اہم مسئلہ بھی ان کی کم گوئی اور خاموشی کی نذر ہو جاتا ہے۔

مغنی نہ کسی کو مشورہ دیتے ہیں اور نہ کسی کا مشورہ سنتے ہیں۔

ایک دن مجھے ان سے مل کر ایک مشکل دور کرنی تھی۔ یعنی میں مشورہ کا طلب گار تھا۔ وہ میری باتیں بڑی دیر تک سنتے رہے۔ پھر ایک گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ میں ان کے اس استغراق کو دیکھ یہ سمجھ بیٹھا کہ وہ میری مشکل کا کوئی نہ کوئی حل ضرور نکالیں گے۔ کافی غور و خوض کے بعد انھوں نے جو جملہ مجھ سے کہا وہ یہ تھا۔

"کل ایوان اردو میں ایک ادبی نشست ہے۔ فرصت ہو تو آجائیے۔"

پھر اس کے بعد میں نے یہ عہد کر لیا کہ کبھی بھی مغنی سے مشورہ نہ طلب کیا جائے۔

ڈریسنگ اور کپڑوں کے بارے میں مغنی بڑے اپ ٹو ڈیٹ اور موڈرن بھی ہیں۔ وہ اپنے قیمتی کپڑوں کی ایرنگ اور پریسنگ خود ہی کرتے ہیں۔ دھوبی کی ایرنگ پر انھیں بھروسہ نہیں۔ کپڑوں پر جو کریز مغنی پیدا کرتے ہیں۔ اگر دھوبی بھی اسے دیکھ لے تو شاید شرمندہ ہو جائے۔

ایک دن میں جب ان کے گھر پہنچا تو وہ سوٹ میں ملبوس تھے۔ میں نے مغنی سے پوچھا۔

"کیا آپ باہر جا رہے ہیں ؟"

مغنی نے کہا ۔ "نہیں !"

پھر میں نے پوچھا ۔ "کیا مغنی صاحب آپ باہر سے آرہے ہیں ؟"

انہوں نے کہا ۔ "نہیں !"

میں گھر چلا آیا ۔ اور شعر و حکمت کے بند ہو جانے کے اسباب پر غور کرنے لگا ۔

مغنی تبسم جن کے ہونٹوں پر تبسم کی کلیاں ذرا کم ہی چٹکتی ہیں ۔ میرے ان دو ڈھائی دوستوں میں سے ہیں ۔ جن سے مل کر ہمیشہ خوشی ہوتی ہے ۔ خواہ وہ کسی موڈ یا رنگ میں کیوں نہ ہوں ۔ ہاں مغنی اُن ہی لوگوں کے لئے بوجھ بن سکتے ہیں ۔ جن کے کان ذہانت کی خوشبو سے ناآشنا ہوں ۔

مغنی کے مزاج میں فنکاروں کی سی قلندری بھی ہے ۔ تشہیر اور نام و نمود کے امام ضامن کو کبھی انہوں نے اپنے ہاتھ پر نہیں باندھا ۔ ملک کے بڑے سے بڑے ادبی سیمیناروں میں شرکت کی ۔ لیکن کسی بھی اخبار کو اپنے آنے جانے کی اطلاع نہیں دی ۔ خوب تعریفیں بٹوریں ۔ لیکن اس کا ذکر کسی کے سامنے نہیں کیا ۔ چپ چاپ گئے اور خاموشی سے لوٹ آئے ۔ ایسی باتیں ، بڑا ظرف مانگتی ہیں ۔

شاید یہ جان کر آپ کو حیرت ہو کر کبھی بھٹکی ہوئی روحوں سے بھی مغنی کا تعلقِ خاطر رہا ہے ۔ رات گئے کبھی جٹتے میں ، کبھی تنہا اور کبھی اپنے مخصوص احباب کے ساتھ جس روح کو بھی بلوانا ہوتا ۔ اُسے بلواتے اور اس سے کچھ سوالات کرتے اور یہ سلسلہ رات دیر گئے تک چلتا رہتا ۔ ان کے اصرار پر ایک دن میں نے بھی اس تماشے میں شامل ہونے کی کوشش کی ۔ بات چیت کے لئے میں نے اپنے ایک مرحوم ساتھی کا انتخاب کیا جو میرے بلاوے پر آتا ہی نہ تھا ۔ میں نے تھک ہار کر مغنی کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں میری ہمت بندھائی ۔ لیکن کنکشن کی غلطی سے ایک عجیب و غریب روح نے اچانک مجھے آدبوچا ۔ اور بات شروع ہو گئی ۔ میں ایکدم کھلا سا گیا ۔ میرے چہرے پر آئی ہوئی گھبراہٹ کی لکیروں کو پڑھتے ہوئے مغنی نے کہا ۔

"کبھی کبھی غلطی سے خبیث روحوں سے بھی ہمارا سابقہ پڑ جاتا ہے ۔"

"ہاں معاملہ ہی کچھ ایسا ہے ۔" میں نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا ۔

"کون تھا وہ ـــ !" مغنی نے تفصیل جاننا چاہی ۔

لیکن میں گریز سے کام لیتا رہا ۔ جب ان کا اصرار کافی بڑھ گیا تو میں نے بڑی مایوسی سے کہا ۔

"وہ میراجی تھے اور آپ ہی کو پوچھ رہے تھے ۔"

میں چلتے چلتے یہاں یہ انکشاف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ مغنی کا یہ پہلا شعری مجموعہ نہیں ہے ۔ ہر چند کہ مغنی اس سے اتفاق نہ کریں ۔ اس کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے ۔ [illegible] میں مغنی نے اقبال کی تتبع میں ڈھیر ساری نظمیں کہی تھیں ۔ جو کسی نہ کسی طرح ان کے والدِ محترم کی وساطت سے صفی اورنگ آبادی تک پہنچ گئیں ۔

صفی صاحب نے کہا ۔ "اسے چھوڑ جائیے ۔ میں دیکھ لوں گا ۔"

لیکن چند دنوں بعد جب مغنی نے ان کا در کھٹکھٹایا تو مغنی صاحب نہایت برہمی کے عالم میں گھر کے دروازے سے برآمد ہوئے اور یہ کہتے ہوئے مجموعہ کو باہر پھینک دیا کہ جناب اس کالج کے لونڈے اقبال کی تقلید کرتے ہیں۔

اس کے بعد جب یہی مجموعہ علی احمد جلیلی صاحب کے ہاتھ لگا تو انہوں نے مغنی صاحب کے برعکس مغنی کی کافی حوصلہ افزائی کی۔

اور ان کی اس حوصلہ افزائی ہی کا شاید یہ ثمر ہے کہ آج مغنی تبسم ادبی دنیا میں ایک اچھے اور منفرد شاعر کی حیثیت سے مانے جاتے ہیں۔

میں پہلی کرن کا بوجھ اٹھانے والے خالق کو مبارک باد دیتا ہوں۔

سریٹ حیدرآبادی

حسینوں کی گلی

جب گت مجھے لائی ہے حسینوں کی گلی میں
دُرگت، نظر آئی ہے حسینوں کی گلی میں

انجام کچھ اچھا نظر آتا نہیں اُس کا
جس کی بھی رسائی ہے حسینوں کی گلی میں

میں اپنے ارادے سے یہاں خود نہیں آیا
گردش مجھے لائی ہے حسینوں کی گلی میں

جانا ہو جسے بھی وہاں یہ سوچ کے جائے
دن رات پٹائی ہے حسینوں کی گلی میں

خنجر کے عوض ہاتھ میں ہر اک کے چھرا ہے
جو بھی ہے قصائی ہے حسینوں کی گلی میں

فاقوں سے سٹک جاتے ہیں بے چارے بھکاری
بے شل گدائی ہے حسینوں کی گلی میں

اس دور میں کہتے ہیں آسی مٹے کو کرشمہ
جو پینے میں آئی ہے حسینوں کی گلی میں

ہیں جھڑکیاں بھی پھُسپھُسی، نفرت بھی ہے نقلی
ہر فائر ہوائی ہے حسینوں کی گلی میں

محروم برسائی رہا میں تا دمِ آخر
موتی میری آئی ہے حسینوں کی گلی میں

مجھے یہاں بے وجہ حسینوں کا نہیں ہے
سریٹ کی سگائی ہے حسینوں کی گلی میں

○

پاگل عادل آبادی

پوچھا کسی نے حال ہے کیسا جناب کا
میں چپ رہا تو میرا بدن بولتا رہا

تکلے ہی فی زمانہ وزن دار ہیں میاں
یہ بات پتھروں کا وزن بولتا رہا

آزاد ہو کے میں کئی خانوں میں بٹ گیا
رو رو کے مجھ سے میرا وطن بولتا رہا

افلاس کی سمنٹ، نحوست کی ریت ہے
شاعر کا ہے مکان صحن بولتا رہا

لاٹھی ہے جس کے پاس، وہی بھینس ہانک لے
یہ بات اس صدی کا چلن بولتا رہا

نہ میں کسی کا یار نہ ہمدم نہ باوفا
سب سے یہ چیخ چیخ کے دشمن بولتا رہا

فن کا کوئی معیار نہیں فن ہوا غارت
یہ بات میرے دور کا فن بولتا رہا

وہ شخص بھی نوازا گیا ہے انعام سے
پیتل کی دیگ کو جو لگن بولتا رہا

بیٹھا ہے مائیک والا، سبھی لوگ جا چکے
پاگل تو اپنی دھن میں مگن بولتا رہا

پیروڈی

میری محبوب

میری محبوب تجھے میری محبت کی قسم
اپنی ہلکی سی شرافت کا اشارہ دے دے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے
میری محبوب تجھے ....

اے مری جان مرے الجھے ہوئے مقطع کی غزل
جسے دیکھا نہیں اس خواب کی الٹی تعبیر
تو مہرباں ہو تو کھل جائے مرے دل کا کنول
اپنی سے لوٹ محبت کی دکھا دے تاثیر
آکے دھوبی ہے کھڑا اس کا ادھارا دیدے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے

کیا بھلا سکتی ہے تو پہلی ملاقات اپنی
میری سیکل سے جو تو جان کے ٹکرائی تھی
بل برینر کی طرح سر تھا صفا چٹ تیرا
تیری چوٹی مری مٹھی میں سمٹ آئی تھی
بال نقلی ہی سہی ان کا اتارا دیدے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے

یاد ہے تجھ کو میرے ہاتھ کی سونے کی گھڑی
تیری خاطر ہی جسے چھاؤں میں رکھوایا ہے
سود کے پیسے جو مانگے ہیں چھڑانے کے لیے
ترچھی آنکھوں میں تری خون اتر آیا ہے
یہ تری ترچھی ادا بھی ہے گوارا دیدے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے

ناک پھولی ہوئی دونالی طمنچے کی طرح
تیرے تنتے ہوئے ابرو نے کیا دل گھائل
لے گئے چین مرا پچکے ہوئے گال ترے
دل کے درماں کے لیے آیا ہوں بن کر سائل
قلبِ مضطر کے لیے آلو بخارا دیدے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے

آرزو تھی مرے بچے تجھے اماں کہتے
اسی حسرت میں گزاری ہے جوانی میں نے
شوقِ اولاد نے کیا دل پہ ستم توڑا ہے
سادہ لفظوں میں سنائی ہے کہانی میں نے
اب بھی ہے وقت بڑھاپے کا سہارا دیدے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے

ٹیڈی پتلون ہی سلوا کے دیئے تھے تو نے
ڈھیلا ڈھالا کوئی پتلون کہاں سے لاؤں
بیل باٹم کا یہ فیشن تو ابھی نکلا ہے
خوامخواہ ضد ہے کہ فیشن میں میں باہر جاؤں
لے کے پتلون میری اپنا غرارا دیدے
جیب سے مارا ہوا نوٹ کرارا دیدے

غوث محی الدین احمد خوامخواہ (بمبئی)

وجاہت علی سندیلوی

یادِ رفتگاں

نہیں معلوم کیوں زمانے کے ساتھ انسان بھی بدل جاتے ہیں؟ لیکن یہ بھی ایک سوال بہت غور طلب ہے کہ انسان بدلتا ہے یا زمانہ؟ انسان بدلتے ہیں اس لئے زمانہ بدل جاتا ہے یا زمانہ بدلتا ہے اس لئے انسان بدل جاتے ہیں۔ علت اور معلول کی اس بحث کا سلسلہ انڈے اور مرغی تک پھیلا ہوا ہے۔ لیکن بات جہاں سے چلتی ہے گھوم پھر کر وہیں آجاتی ہے اس کے متعلق جب ہم نے اپنے دوست قاضی صاحب سے پوچھا تو انھوں نے ایک ایسا جواب دیا کہ جس سے اگرچہ ہم مطمئن نہیں ہو سکے لیکن ہمیں خاموش ضرور ہو جانا پڑا۔ انھوں نے فرمایا "نہ انسان بدلتا ہے نہ زمانہ۔ بدلتی ہیں دیکھنے والوں کی آنکھیں" اور اس کے بعد جب انھوں نے ڈپٹ کر پوچھا "سمجھ گئے یا اور سمجھاؤں" تو ہم کو اپنی آنکھیں پھاڑ کر بہت سعادت مندی سے اقبال ــــ جسے آپ اقبالِ جرم بھی کہہ سکتے ہیں، کرنا پڑا "جی ہاں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا"

ابھی کل کی بات ہے ــــــــ اگر آپ بیالیس سال کی مدت کو کل کہہ سکیں تو ــــــ جب قاضی طاہر حسین صاحب جو اپنا نام ایچ۔ ٹی لکھتے تھے۔ یونیورسٹی میں ہیٹ ٹرک قاضی کہلاتے۔ کیونکہ ممتحنوں کی ناقدرشناسی کی بنا پر وہ بی۔ اے پاس کرنے کی مہم میں تابڑ توڑ تین دفعہ ناکام رہ چکے تھے، حالانکہ اس اثنا میں انھوں نے طلبا کی یونین کے انتخابات میں جتنی بھی امیدوار کھڑے کئے تھے وہ سو فی صدی کامیاب ہو گئے تھے۔ یہاں قاضی صاحب کی صفائی میں یہ جملہ معترضہ کہہ دینا غالباً ضروری ہے کہ اس زمانے میں امتحان میں نقل کرنے کی وہ سہولتیں میسر نہیں تھیں، جو اب سکۂ رائج الوقت ہو چکی ہیں۔

اس وقت نہ قاضی صاحب نو بچوں کے والد بزرگوار تھے نہ سکریٹریٹ میں ملازم جہاں سے وہ اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔ نہ اُن کے داڑھی تھی نہ ان کے زہد و تقویٰ سے محلے والے آج کی طرح مرعوب تھے۔ اُن کی جس سنجیدگی، شائستگی اور سلامت روی کو آج مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور جس کی بنا پر وہ محلے کی ہر پنچایت

کے سرٹیفکیٹ بناتے جاتے ہیں، اُس کا اس وقت ان سے کہیں دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا۔ وہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والے شگفتہ منش ایک بہت آزاد خیال نوجوان تھے۔ ہمارے ماہرین تعلیم تو اب بڑی تفتیش اور تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ہمارا نصاب تعلیم ناکارہ اور ناقص ہے لیکن ہمارے قاضی صاحب اس حقیقت سے قریب نصف صدی پہلے واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ درسی کتابوں کے بجائے وہ اپنی خداداد ذہانت اور ذکاوت کا مرکز توجہ یونین کے انتخابات کو بنائے ہوئے تھے۔ اُن انتخابات کے متعلق منصوبہ بندی اور پیش بندی بلکہ فریق مخالف کی زبان بندی اور ناکہ بندی وہ ایسی ہوشیاری اور چابک دستی سے کرتے جیسے کوئی پختہ کار جنرل کسی ہونے والی جنگ کے متعلق کرتا ہے اور پھر ہر انتخاب میں کامیابی کے بعد وہ اپنے قدردانوں اور پرستاروں کے ہجوم میں تالیوں، نعروں اور سیٹیوں کے درمیان چٹکیاں بجا بجا کر یہ شعر پڑھتے ؎

کوہ میں دشت میں لے کر تیرا پیغام پھرے!
اور معلوم ہے تجھ کو کبھی ناکام پھرے؟

قاضی صاحب جب تیسرے حملے میں بھی بی۔ اے پاس نہ کر سکے تو اُن کے والد محترم نے جو پرانے زمانے کے ایک مذہبی نیک اور وضعدار بزرگ تھے، ان کی انتخابی سرگرمیوں کو دائرۂ اعتدال میں لانے کے لئے یہ ترکیب سوچی کہ ان کی شادی کر دی جائے۔ والد محترم کا خیال تھا کہ صاحب زادے بی بی پاس ہوں گے تو خود بخود بی۔ اے پاس ہو جائیں گے۔ اس زمانے کے بزرگ عام طور پر سوچتے کہ ہر نوجوان کی بے راہ روی کا علاج اس کی شادی ہے کیونکہ ان کے خود اپنے تجربے کچھ اسی قسم کے تھے۔

ہیبت لڑکی قاضی کے سامنے ان کی شادی کی تجویز رکھی گئی تو وہ بہت بھڑکے اور بھڑکے۔ وہ اس وقت اس مکتب خیال کے معلّم اور مبلغ تھے کہ شادی ایک فرسودہ بلکہ وحشیانہ رسم ہے جو خاندان اور ذاتی ملکیت کے اداروں کے ذریعے سرمایہ داری کو جنم دیتی ہے اور سرمایہ داری اُم الخبائث ہے یعنی دنیا کی ہر ناانصافی، استحصال، ظلم اور جنگ کا سرچشمہ۔

میں قاضی کا نہ صرف ہم جماعت اور دوست تھا بلکہ میرے اور ان کے خاندان کے بہت قریبی تعلقات کئی پشتوں سے چلے آ رہے تھے۔ قاضی کے والد محترم نے اپنے وطن سے قاضی کو ان کی شادی کے متعلق بہت سے خطوط لکھے جن میں بتدریج خوشامد سے عاق کر دینے کی دھمکی تک تھی اور ساتھ ہی ساتھ مجھے بھی کئی خطوط لکھے کہ میں شادی کے متعلق نہ صرف قاضی کو راضی اور ہموار کر دوں بلکہ مقررہ تاریخ کو مقررہ وقت پر "بر دکھائی" کے لئے ان کو ساتھ لے کر فلاں صاحب کے دولت خانے پر پہونچ جاؤں، ورنہ بصورت دیگر خاندان بھر کی ناک کٹنے کا سہرا میرے سر رہے گا۔ میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔

"نہیں یہ ہرگز نہیں ہو سکتا" قاضی غرّائے
"میں شہر چھوڑ دوں گا" قاضی چیخے
"میں ابّا جان کی اس آمریت کو ایک لمحے کے لئے برداشت نہیں کر سکتا" قاضی بکے

"میں خودکشی کرلوں گا" قاضی نے گلوگیر آواز میں کہا اور تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئے۔ غالباً اپنی جواں مرگی کے تصور پر یا طلبا کی یونین کے یتیم ہوجانے کے سوگ میں۔

میں نے اپنا آخری حربہ بھی استعمال کر ڈالا "قاضی بھائی آپ یونین کے اتنے الیکشن جیتے ہیں جتنی کہ نپولین نے لڑائیاں بھی نہ لڑی پائی ہوں گی لیکن تعجب ہے کہ ایک بہت چھوٹی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ آپ کو شادی کے لئے نہیں۔ صرف بر دکھاوے کے انٹرویو کے لئے جانا ہے۔ آپ تین دفعہ بی۔ اے کے امتحان میں فیل ہوسکتے ہیں تو کیا ایک انٹرویو میں فیل نہیں ہوسکتے؟ انٹرویو میں چلئے اور فیل ہوجایئے۔ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"

تیر نشانے پر بیٹھا اور قاضی راضی ہوگئے۔

صدر دروازے پر استقبال کے لئے دو حضرات موجود تھے جنہوں نے اپنی قیادت میں ہمیں سامنے برآمدے میں آرام کرسی پر دراز ایک بہت سن رسیدہ بزرگ کے حضور میں پیش کردیا۔ قاضی صاحب بالکل خاموش رہے اور ہم نے سلام علیکم کہہ کر "جیتے رہو! جیتے رہو" کی دوہری دعائیں حاصل کرلیں۔ ہم دونوں آرام کرسی کے سامنے والی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ دروازوں کی چقوں کے پیچھے سے مستورات کی کھسر پھسر اور دبی دبی کھل کھلاہٹوں اور ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔

"موسم کس تیزی سے بدل رہا ہے؟" انٹرویو لینے والے بزرگ نے گویا اپنی بولنگ کا آغاز کیا۔

"کچھ غور نہیں کیا میں نے" قاضی نے بے رخی سے جواب دیا۔

"شربت پیجئے گا یا چائے؟" استقبال کرنے والے حضرات میں سے جو قریب ہی منڈلا رہے تھے، ایک نے پوچھا۔

"دونوں" قاضی بولے۔ چقوں کے پیچھے نسوانی قہقہوں کی ایک ہلچل سی مچ گئی۔

"تعلیم ختم کرکے آپ کا کیا ارادہ ہے؟" بزرگ نے پوچھا

"عالمی سیاحت پر فوراً روانہ ہوجاؤں گا" قاضی نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اسپورٹس کا بھی کچھ شوق ہے آپ کو؟"

"کیوں نہیں؟ پتنگ بازی کرتا ہوں"

"اس سے بھلا کیا ورزش ہوتی ہوگی؟"

"واہ صاحب پتنگ اور ڈور لوٹنے میں وہ دھینگا مشتی اور دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے کہ دانتوں پسینہ آجاتا ہے"

غالباً یہ بتلانا غیر ضروری ہے کہ قاضی کے ہر جواب پر چقوں کے پیچھے نسوانی قہقہوں کے انار دانے داغ رہے تھے۔

"شاعری سے کچھ شوق ہے آپ کو؟"

"بس اس قدر کہ کبھی موزوں شعر نہیں پڑھا"

چائے اور شربت کی کشتی آ گئی تو قاضی صاحب شربت تو فوراً پی گئے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ حلق میں انڈیل لیا اور میری بنائی ہوئی چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ درمیان میں بسکٹوں اور نان خطائیوں کی پلیٹوں کو بھی بڑی بے تکلفی سے صاف کرتے جاتے۔

چق کے پیچھے سے کسی لڑکی کی ایک نامکمل سی آواز آئی جیسے سوال کرنے والے کو پیچھے گھسیٹ لیا گیا ہو:

" یہ آپ کی ٹوپی کا پھندنا کہاں کام آ گیا؟ " قاضی صاحب بغیر پھندنے کی ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔

" تماس میں یہ ٹوپی لاولد ہی بک رہی تھی " اس جواب پر نسوانی قہقہوں کا وہ طوفان برپا ہو گیا کہ اُس کے درمیان مجبوراً انٹرویو ختم ہو گیا بلکہ ڈوب مرا۔

ہم لوگ خوشی خوشی باہر نکلے تو میں نے قاضی کو بڑی گرم جوشی سے مبارکباد دی۔

" آج تو بس کمال ہی کر دیا آپ نے قاضی صاحب " اپنے مقصد کی کامیابی پر قاضی نے جھوم کر چٹکی بجائی۔

اور معلوم ہے تجکو کبھی ناکام پھرے! لیکن یہ ہیٹ ٹرک قاضی نہیں ان کی تقدیر بول رہی تھی۔ پندرہ دنوں کے اندر ان کی شادی ہو گئی۔ یونین کے انتخاب کے دن وہ میٹرنٹی ہاسپٹل میں اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا انتظار کر رہے تھے۔ اور یونیورسٹی کی ستم ظریفی ملاحظہ فرمائیے کہ بیچلر آف آرٹس کی وہ ڈگری جو ان کے بیچلر ہوتے ہوئے انہیں کبھی مل نہ پائی تھی ان کے شادی شدہ ہوتے ہی ان کے سر پر تھوپ دی گئی۔ ■■

فضل جاوید

موسم گرما جب شباب پر ہو اور دن بھر تیز دھوپ اور پریشان کر دینے والی گرمی کی شدت ہو تو طبیعت مضمحل اور بے زار سی ہو جاتی
لیکن جوں جوں شام کے سائے لمبے ہوتے جاتے ہیں ایک تازگی سی سارے بدن میں محسوس ہونے لگتی ہے۔ آنگن میں چھڑکاؤ
تے ہیں۔ پلنگ بستر باہر نکالے جاتے ہیں اور پھر شب مالوہ کا لطف بند کمروں میں نہیں بلکہ آنگن میں سو کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے
وہ موسم ہے جس میں پلنگ اور مچھر دانیاں بہ افراط دستیاب ہوتی ہیں اور خوب مہنگے داموں بکتی ہیں۔
گرمیوں کا موسم دراصل مچھروں کا موسم ہوتا ہے۔ کمبل تو درکنار ہلکی سی چادر بھی جسم پر جان کا وبال بن جاتی ہے۔ پلنگ
ساتھ مچھر دان اتنا ہی ضروری ہے جتنا مچھر کے ساتھ انسان بہ طور خوراک۔ حالانکہ مچھر کی نظر التفات صرف اشرف المخلوقات
پر کیوں ہے! اس سے پہلے کہ اس نکتہ پر سنجیدگی سے غور کیا جائے کیوں نہ ہم ایک واقعہ سنتے چلیں۔
ایک صاحب کسی دور دراز مقام سے تبدیل ہو کر ہمارے شہر تشریف لائیے۔ بڑی کوشش کے بعد جہانگیر آباد کے
ی خانے کے پاس ایک مکان انہیں کرایہ پر ملا۔ پہلی ہی رات مچھروں نے وہ شب خون مارا کہ موصوف تڑپ کر مارا ماری پر اتر
ے اور بہت سے مچھروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ایک فطری عمل ہے۔ اس قتل عام کے خلاف
ام مچھروں نے آواز بلند کی اور چاروں اطراف سے انہیں گھیر کر اس زور کا حملہ کیا کہ موصوف رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔
سرے دن انھوں نے مالک مکان سے مچھروں کی شکایت کی لیکن مالک مکان نے انہیں ایک ٹیوب کا نام بتا کر ٹال دیا۔
وسری رات تجویز کردہ ٹیوب جسم پر مل کر سوئے۔ لیکن جوں ہی دوا کی بو اڑی مچھروں نے تازہ دم ہو کر یورش شروع کر دی۔
دھی رات تک وہ ان سے لڑتے رہے۔ لیکن کب تک لڑتے۔ آخر انھیں ایک ترکیب سوجھی مچھروں کو دھوکہ دینے کے لیے
وہ چپ چاپ پلنگ سے اتر کر اس کے نیچے لیٹ گئے۔ کچھ ہی دیر بعد ایک جنگجو پلنگ کے نیچے گھس آیا۔ وہ اس قدر حواس باختہ
ہو چکے تھے کہ پلنگ کے نیچے سے چیختے ہوئے نکل آئے کہ "کم بخت اب ٹارچ لے کر مجھے ڈھونڈ رہے ہیں۔"
خیر یہ تو ایک لطیفہ معترضہ تھا۔ ہمیں تو اس بات پر غور کرنا ہے کہ آخر مچھر انسان ہی کو کیوں کاٹتے ہیں۔ کیا رشتہ ہے
ان دونوں کے درمیان ——— ؟ اگر سرسری جائزہ لیا جائے تو ہمیں چار طرح کے مچھر دکھائی دیتے ہیں۔ سفید مچھر، کالا مچھر

دبلا مچھر اور موٹا مچھر ــــ پیدا ہوتے ہی اس کا رنگ عموماً سفید ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب اس کے پر نکلنے لگتے ہیں تو وہ ہمارے خون سے غذا حاصل کر کے کالا ہو جاتا ہے۔

مچھر کے ارتقائی سفر کا ایمان داری سے اگر جائزہ لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی کہ مچھر دراصل ایک بے خو کیڑا تھا۔ گندگی اور غلاظت سے اسے بے حد پیار تھا۔ اس لیئے ٹھہرے ہوئے گندے پانی اور سڑی گلی چیزوں ہی کے آس پاس پایا جاتا تھا۔ اس وقت کا انسان، انتہائی پاک وصاف، نفاست پسند اور بلند کردار کا مالک ہوا کرتا تھا۔ گندگی نام کی کوئی شئے اس کے قریب بھی نہیں آتی تھی اس وقت کا مچھر حضرت انسان کے قریب آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا ــــ لیکن آہستہ آہستہ افق انسانیت پر حرص و ہوس کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ خود پرستی اور مفاد پرستی کے جنگل میں پھنس کر انسان نے تقدس کا لباس اتار دیا۔ اور پھر ایسا انقلاب آیا کہ ساری قدریں بدل گئیں انسان تقدس کی بلندیوں سے گر کر ذلت کے خارزاروں میں الجھ گیا۔ نفسا نفسی کے اس دور میں شیطان بھی حضرتِ انسان سے پناہ مانگنے لگا یہی وہ وقت تھا جب مچھر نے محسوس کیا کہ اب تک وہ جہاں رہتا آ رہا تھا اس سے کہیں بہتر اور موزوں جگہ تو انسان کا گھر ہے بس یہ سودا اس کے سر میں سمانے کی دیر تھی کہ مچھر انسان کے گھر میں گھس آیا اور آج تک وہ ہمارا خونی رشتہ دار بنا بیٹھا ہے۔

مچھر کا انسان سے یہ گٹھ جوڑ مونسپالٹی اور صحت کے محکمہ جات کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ ملیریا ہٹاؤ اسکیموں کے تحت دوا ملے ہوئے زہریلے بادل مشینوں کے ذریعہ فضا میں چھوڑے جاتے ہیں تاکہ دونوں کے درمیان ایک خلیج حائل رہے۔ ملیریا کا مچھر انہی عام مچھروں میں سے ہوتا ہے لیکن اسے امتیازی حیثیت اس لیے حاصل ہوتی ہے کہ وہ کچھ خاص قسم کے انسانوں کا زہریلا خون چوس کر دوسروں میں انجکٹ کرتا ہے۔ اب ذرا سوچیئے کہ زہریلی گیس اور دوسری دواؤں کے ذریعے مچھروں کی نسل کشی سے کیا فائدہ۔ ملیریا کے پس پردہ تو کوئی اور ہے یہ بے چارے مچھر ہرگز نہیں۔ اب اگر بھلا کر یہ مچھر انسان کو کاٹنے دوڑے تو اس میں وہ کہاں تک قصوروار ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا جب کبھی کسی دبلے پتلے انسان کو کسی سے تشبیہہ دی جاتی ہے تو وہ یہی مچھر ہوتا ہے اس طرح مچھر اور انسان ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں اور یہ قربت دن بہ دن گہری اور مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ دوستی کے رشتے باہمی تعاون ہی سے استوار ہوتے ہیں اور یہی آپسی تعاون دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کرتا جا رہا ہے۔ ایک روشن مثال ہمارے سامنے ہے۔ مچھر دان آخر کس نے بنایا؟ اور اس کا مصرف کیا ہے؟ جواب یقیناً یہی ہے کہ اسے حضرت انسان نے بنایا اور مقصد صرف یہی ہے کہ مچھروں سے محفوظ رہا جائے ــــ اب اس پر غور فرمائیں کہ شکردان، دودھ دان اور پاندان کا مصرف کیا ہے۔ یہی ناکہ شکردان میں شکر رکھی جاتی ہے۔ دودھ دان میں دودھ رکھا جاتا ہے اور پاندان میں پان اور اس کے لوازمات رکھے جاتے ہیں۔ اس طرح مچھر دان میں مچھر رکھے جاتے ہیں۔ مچھر جب اس حصار کے اندر داخل ہوتے ہیں تو ان کا مقصد خون چوسنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ اب اسے تعاون نہیں تو اور کیا کہا جائے۔

یوں تو کھٹمل بھی مچھر کی طرح انسانی خون کا پیاسا ہوتا ہے مگر دونوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ کھٹمل انسانی دسترس سے باہر نہیں رہتا جبکہ مچھر جل دے کر اڑ جانے میں بلا کا ماہر ہے۔ جب تک وہ جام پر جام چڑھا کر مدہوش نہیں ہو جاتا آپ اسے پکڑ نہیں سکتے۔ لیکن کبھی کبھی ان دونوں کا ساتھ انسان کے لیے ایک عجیب و غریب سچویشن پیدا کر دیتا ہے۔

ہمارے ایک مزاح نگار دوست جو دوسرے شہر سے تشریف لائے تھے ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہوئے آدھی رات بعد وہ چیختے ہوئے برآمد ہوئے اور منیجر سے شکایت کرتے ہوئے بولے "جناب آپ کی ہوٹل میں بے حد مچھر ہیں۔ آٹھ

دس ہوتے تو میں خود ہی نپٹ لیتا لیکن کیا کروں غول کا غول یکمشت حملہ کرتا ہے بھلا ہو ان کھٹملوں کا جنہوں نے مجھے پکڑ رکھا تھا ورنہ یہ مچھر تو مجھے لے ہی اڑتے ـــــــ"

مچھروں کے ایک خاص طبقہ میں ذوقِ شاعری عام ہے۔ وہ آزاد شاعری زیادہ کرتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی ہر قسم کی قیدو بند سے آزاد ہیں ایسے مچھر صرف کانوں کے آس پاس ہی محو پرواز رہتے ہیں اور اپنی تخلیقات کو مسلسل گوش گزار کرتے رہتے ہیں یہ موسیقی کے بھی دلدادہ ہیں جب یہ راگ الاپتے ہیں تو سماعت پر بار گزرتا ہے کیونکہ یہ بے سرے راگ موسیقی کے قواعد و ضوابط سے آزاد ہوتے ہیں۔ اگر وہ تھوڑی سی تربیت پا کر ان کو بہتر موسیقی کی دلکش دھنوں میں تبدیل کر لیں تو انسان موسیقی کے جادو میں ان کے تیز ڈنکوں کو بہ آسانی سہہ سکتا ہے۔ یہ راز مچھر نے نہیں جان پایا البتہ حضرت انسان پر یہ منکشف ہو چکا ہے۔ چنانچہ ہمارے سماج میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ایک طرف سے کانوں میں رس گھولتا ہے اور دوسری طرف سے خون چوستا ہے۔

ایک موٹا سیٹھ اپنے آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اتفاق سے کچھ مچھر وہاں گھس آئے اور اس کے نیم برہنہ جسم پر بیٹھ گئے سیٹھ کچھ دیر تک انہیں بغور دیکھتا رہا۔ نحیف اور کمزور مچھر آہستہ آہستہ پھولتے اور موٹے ہوتے جا رہے تھے۔ سیٹھ کے ہونٹوں پر ہنسی پھیل گئی۔ اس نے مچھروں سے کہا "بیٹا! چور کے گھر چوری کر رہے ہو۔ میں نے تو لوگوں کا بہت خون چوسا ہے۔ لیکن اب بھی یہ ظالم خون کا چسکا منہ سے چھوٹتا نہیں ـــــ لیکن ڈیر مچھرو! کیا تم میرا خون ہضم کر سکتے ہو ـــــ؟ مچھر بے چارے کچھ زیادہ ہی پی کر مدہوش ہو چکے تھے۔ سیٹھ نے آسانی سے انہیں پکڑ کر مسل دیا ـــــ اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک پورے معاشرے کا خون اس کے ہاتھوں پر پھیل گیا تھا ـــــ!

◁□

کنجوس زندگی سے تنگ آ چکا تھا ـ چنانچہ چھت سے رسی باندھ کے پھندا گلے میں ڈال لیا اور لٹکنے ہی والا تھا کہ نوکر نے دیکھ لیا اور اس نے رسی کاٹ دی:

کنجوس نے پہلی تاریخ کو نوکر کی تنخواہ میں سے اس کی قیمت کاٹ لی۔

❖ ❖ ❖

ایک شخص نے بنک کے بابِ الداخلہ پر مکئی کے بھٹوں کا کاروبار شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے حیرت ناک ترقی کر لی اور کافی مالدار ہو گیا۔

ایک دن ایک دوست نے کچھ قرض مانگا: اس نے جواب دیا "معاف کرنا یار ـــ اپنا بنک والوں سے معاہدہ ہے کہ ہم لوگوں میں کوئی تجارتی ٹکراؤ نہیں ہوگا ـــ وہ لوگ بھٹے نہیں بیچیں گے اور میں رقمی کاروبار نہیں کروں گا۔

❖ ❖ ❖

محبوب جغرافیہ کے آئینے میں

قمر الزماں قمرؔ (رانچی)

جی چاہتا ہے ان کا میں جغرافیہ لکھوں
کچھ حالِ مدّ و جزرِ رُخِ دلربا لکھوں

گر چہ نظامِ شمسیِ محبوب کا ہوں نجم
کتنا ہوں اُن سے دُور میں کیا فاصلہ لکھوں

زلفوں کو ان کی موجِ خلیجِ عرب کہوں
چہرے کو اُن کے ایک جزیرہ نما لکھوں

ابرو کو گر ہلال کہوں، لب کو جامِ مئے
نظروں کو اُن کی تیر و سناں بے خطا لکھوں

گالوں کو سیبِ سُرخ تو آنکھوں کو جامِ شہد
گردن کو کچھ نہیں تو صراحی نما لکھوں

اشکوں کو اُن کے بارشِ آسام گر کہوں
خود اپنے دل کو اس میں ڈبوتا ہوا لکھوں

ناک اُن کی ہے سُرنگ اگر یا نیہتال کی
ماتھے کو سطحِ مرتفعِ دندھیا لکھوں

بندیا کا جو مقام ہے ایر و ڈرام ہے
اپنے کو میں جہازِ ایر انڈیا لکھوں

گیسو کو لوگ کالی گھٹا لکھتے آئے ہیں
میں اس کو جنگلات کی کالی بلا لکھوں

سلجھا سکے نہ مومنؔ و غالبؔ بھی پیچ و خم
میری بساط کیا ہے کہ پیچوں کو وا لکھوں

سر ہو سکیں نہ کوہِ نور دوں سے جو کبھی
اِن چوٹیوں کی دوریاں کتنی ہیں، کیا لکھوں

آتش فشاں کا رُوپ کہوں اُن کے غیظ کو
چینِ جبیں کو اُن کے خطِ استوا لکھوں

اُن کے غضب کو دشتِ صحارا سے دوں مثال
ان کی ہنسی کو نغمۂ موجِ صبا لکھوں

قطرے نمی کے عارضِ رنگیں پہ دیکھ کر
شبنم کے موتیوں سے بھرا گُل کدہ لکھوں

گو سخت گرم و خشک ہے انکار کی ہوا
بہتر ہے اس کو حُسن کی رنگیں ادا لکھوں

انگڑائی ان کی دیکھ کے یہ سوچتا ہوں میں
عاشق کے واسطے اِسے اک زلزلہ لکھوں

حیران تھا مزاج کو تشبیہ کس سے دوں
آئی سمجھ میں بات کہ "آب و ہوا" لکھوں

سینے کی حد سے آگے نہیں سرحدِ خیال
میں بے ادب نہیں ہوں کہ اس سے سوا لکھوں

اپنی سمجھ میں آئی نہ پھر بھی قمرؔ یہ بات
جغرافیائی سطح پہ میں اُن کو کیا لکھوں

غزل

محمد حمید الدین ساغرؔ (حیدرآباد)

دھچکے بھی کھا کے وقت کے ہیں خوش جو ہم ابھی
شاید غمِ حیات میں تلخی ہے کم ابھی

بےروزگاری کا ہوا نہیں کیسے غم ابھی
سسرال کا ہے حال پہ جن کے کرم ابھی

معلوم یہ ہوا ہے کہ اب نل بھی کٹ گیا
فارغ ہوئے تھے لائٹ کٹا کر جو ہم ابھی

ساغرؔ شریف ہونے سے نقصان یہ ہوا
مشہور ہو سکے نہ محلے میں ہم ابھی

صفیہ

(ڈاکٹر انور سدید سے معذرت کے ساتھ)

مچھر سے ملیریا پھیلتا ہے اس لیے سارے مچھروں کو ختم کیا جائے۔ یہ سخت ناانصافی کی بات ہے۔ آخر سارے مچھر تو اس فعل کے مرتکب نہیں ہوتے، آدمی کے پاس دوربینیں خوردبینیں ان پر سوار آنکھیں اور آنکھوں پر سوار چشمے موجود ہیں مگر کسی اللہ کے بندے کو توفیق نہیں ہوتی کہ اصل مجرم یعنی مادہ انافیلیہ کو تلاش کرے اور کیفر کردار تک پہنچائے۔ ہماری سنوسائیٹی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ پتھر باندھے جائیں اور کتے گھومتے پھریں۔ خیر کتے زیادہ تر صرف بھونکتے ہیں۔ ان پر کوئی پابندی نہیں نہ سہی، درندے پالے جارہے ہیں اور ان کے شاخسار کا نام حفاظت گاہ رکھا گیا ہے۔ جہاں درندے محفوظ ہوں اور آدمی غیر محفوظ وہاں یہ بات کیسے سمجھائی جاسکتی ہے کہ بے گناہ مچھروں کا قتل عام نہ کیا جائے۔ اس پر بھی ہم سمجھانے کی کوشش کرتے، کوئی مانتا نہ مانتا ہم اہنسا کا علم اٹھا کر کھڑے ہوجاتے مگر اس کا انجام ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے اس لیے سوائے اس کے چارہ نہیں کہ مچھروں کو قتل ہوتے دیکھتے رہیں اور خاموش بیٹھے رہیں۔ میں یہ عرض کر رہا تھا کہ مجرم کی تلاش اور مجرم پر گرفت کا رواج اب ختم ہوگیا ہے اس لیے مادہ انافیلیہ بھی گنگناتی پھر رہی ہے۔

بوجھ ڈھوتے ہیں سب مرے سر سے
کوئی الزام کیا اتارے گا

ہاں جب شور و غوغا بڑھ جائے تو ارباب حل و عقد جاگتے ہیں۔ اور ظالم و مظلوم سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتے ہیں یعنی مچھروں کو من حیث القوم فنا کر دینے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ انسانوں اور مچھروں کے تعلقات میں کشیدگی نئے زمانے کا شوشہ ہے۔ آج بزرگوں کی ہر بات سے انحراف ترقی کی نشانی ہے۔ چاہے پرانی اقدار میں اخلاق، اخلاص، محبت اور دوستی

جیسی چیزیں ہی کیوں نہ شامل ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ گھنے تاریک جنگلوں کے مسکن سے نئے روشن شہروں کی آبادکاری تک مچھروں اور انسانوں کے تعلقات نہایت دوستانہ رہے ہیں۔ دوستی کی یہ روایت اتنی پرانی ہے کہ ماضی میں اس روایت کی نشان دہی کرتے کرتے تاریخ تھک کر بیٹھ جاتی ہے اور یہ ماقبل تاریخ کے اندھیروں میں اتر جاتی ہے۔ ایک ہونہار طالب علم امتحان میں .Dt حاصل کرے یہ خوشی کی بات ہے۔ مگر آگے چل کر .D.D.T ایجاد کرے اس ترقی پر جس قدر ماتم کیا جائے کم ہے۔

غیر محفوظیت آدمی کا مقدر ہے۔ درندوں کے درمیان زندگی بسر کرنے سے آدمی کے بذاتِ خود درندہ بننے تک خود حفاظتی کا ایک طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اب تو اس struggle سے چھٹکارے کے امکانات بھی تاریک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ معلوم نہیں کس غیر انسانی مخلوق نے اس فساد میں آدمی کی کمانڈ کی مگر مچھر کا کردار بے لوث مددگار کا رہا ہے۔ آدمی کو صحیح ڈھنگ سے لحاف اوڑھنا بھی مچھر نے سکھایا ہے۔ مانا کہ آپ لحاف سردی سے بچنے کے لیے اوڑھتے ہیں مگر سرد لہر کس طرف سے حملہ آور ہے، مچھر ہی اس کی اطلاع بہم پہنچاتے ہیں۔ نتیجتاً ہم معقولیت کے ساتھ صف بندی شروع کر دیتے ہیں اور ہمارا مورچہ مضبوط تر ہو جاتا ہے۔ درست طریقے سے لحاف اوڑھنا بھی معمولی بات نہیں ہے۔ جو لوگ transfer of training کے اصول سے واقف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ لحاف اوڑھنے کی ٹریننگ ہر مدافعتی مورچہ پر انسان کے کام آتی ہے۔

مچھر بیداری کی علامت ہے، خود جاگتا ہے اور خوابِ خرگوش کو دوسروں پر بھی مسلط نہیں ہونے دیتا۔ دھیمے دھیمے سروں میں جب مچھر راگنی چھیڑتا ہے تو آدمی سوتے جاگتے کی اس کیفیت کو پالیتا ہے جو غفلت اور ہوشیاری کے بین بین ہے کھٹکا ہو تو جاگ جائیے ورنہ آرام کیجیے:

رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں مچھر کو

کہتے ہیں کہ یہ عہد مزدور کا عہد ہے۔ آج کا مزدور جاگ رہا ہے۔ وہ بھیک نہیں مانگتا حق طلب کرتا ہے۔ اپنے حقوق کا خود محافظ ہے۔ اس ضمن میں آپ مارکس کو خراجِ عقیدت پیش کریں یا لینن کو یا کسی اور کو ہماری تحقیق یہ ہے کہ مزدور کی بیداری کا نظریہ چاہے کسی نے پیش کیا ہو، سیکھا مچھر سے ہے مگر اس کا اعتراف نہیں کیا۔ یوں بھی آج علم و ادب کی دنیا میں کوئی دانش ور اپنی دانشوری کے ماخذ کا پتہ نہیں دیتا۔ وہ تو کسی سے ٹھن جائے تو پول کھول دیتا ہے کہ آپ کا حسن و جمال جمالیات کی کس دکان سے راتوں رات اڑایا ہوا ہے۔ علم و ادب کی دنیا عمل کی دنیا سے (ظاہر ہے) زیادہ باادب ہوتی ہے۔ یہاں مجرم کی سزا بس یہی ہے کہ اس کا جرم ثابت ہو جائے۔ جرم ثابت ہو جانے پر کوئی سزا نہیں دی جاتی اور سب خوش ہوتے ہیں کہ مجرم اپنے انجام کو پہنچا۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آگے راستہ خطرناک ہے۔ آئیے بات تک پہنچیں کہ مچھر اپنی محنت کا صلہ با ادب با ملاحظہ کھڑے ہو کر نہیں مانگتا۔ فوراً وصول کر لیتا ہے چاہے آپ جاگ رہے ہوں، سو رہے ہوں، آپ کے پاس اسٹاک کم ہو یا زیادہ ہو۔ غرض اپنے حقوق کے سلسلے میں مزدور کی بیداری مچھر کی مرہونِ منت ہے۔

لیجیے مچھر کو یہ بات پسند نہیں کہ اس کی شان میں قصیدہ پڑھا جائے کہ قصیدہ سامنتی عہد کی نشانی ہے۔ اس لیے مجھے بار بار تنبیہہ مل رہی ہے کہ قلم رکھ لحاف سنبھال، آپ بھی بتی بجھا دیجیے، لحاف سنبھالیے۔ لحاف یعنی مورچہ۔ یعنی تحفظ۔

مچھر زندہ باد

پائندہ باد

انجم نجمی
بمبئی
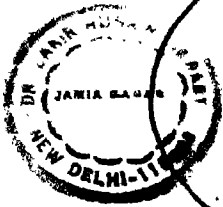
منگل سوتر

جی ہاں "منگل سوتر" بڑا ہی مقدس لفظ ہے۔ کس طرح؟ ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ منگل کے معنی ہیں "شبھ" "اچھا" (ویسے یہاں ہم اسے پاک کے معنی میں استعمال کر رہے ہیں) اور سوتر کے ہیں دھاگہ یعنی وہ مقدس دھاگہ جسے عورتیں اپنے گلے میں اس وقت اپنے پتی دیو کے ہاتھوں پہنتی ہیں جب پوترا گنی ت پھیرے پورے ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ منگل سوتر ہے جو ایک بار پہن لینے کے بعد اسی وقت اتارا جاتا ہے جب پہننے ں دار فانی سے کوچ کر کے مرحومہ کہلانے کی مستحق بن جاتی ہے بصورت دیگر اس وقت، جب اس کا سہاگ اجڑ ہے اور وہ بیوہ کہلائی جاتی ہے۔ اس سوتر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ پہنا بھی دوسروں کے ہاتھوں سے جاتا ہے ے اتارنے کا نیک کام بھی دوسرے ہی کرتے ہیں

یہ تو تھے منگل سوتر کے لفظی اور لغوی معنی۔ اب آپ کو بتا دوں کہ منگل سوتر کی قیمت مادی طور پر کیا ہوتی ہے۔ صاحب یہ ل شئے ہے جسے آپ نے بھی بغور دیکھا ہوگا۔ اس میں دو چھوٹے چھوٹے موتی کالی موتیوں کی لڑی کے بالکل بیچ میں ہیں (یہ موتی طلائی ہوتے ہیں) اور ان دو چھوٹے موتیوں کے درمیان دو بڑے بڑے موتی اور ہوتے ہیں (واضح ہو دو بڑے موتی بھی طلائی ہوتے ہیں) اب ان چھوٹے اور بڑے طلائی موتیوں کا شجرہ نسب جان لیجئے۔ دو چھوٹے موتی اس کے حامل ہوتے ہیں کہ یہ دو خاندانوں کو آپس میں ملا رہے ہیں اور بڑے دو موتی جان دو خاندانوں (یعنی دو چھوٹے موتیوں) میان ہوتے ہیں وہ ہیں میاں بیوی۔ اور ان موتیوں سے جڑے ہوئے کئی کالے چھوٹے چھوٹے موتی ہوتے ہیں جو انھیں سے بچانے کے لیے پرو دیے جاتے ہیں (جبکہ پنڈت کے اشلوک اور حلقہ کی دھاگوں کے باوجود ان کو نظر لگ ہی جاتی ہے) انوں اور میاں بیوی کے علمبردار یہ موتی کتنے تولے کے اور کتنے وزن دار ہوتے ہیں اس کا انحصار ہوتا ہے۔ خاندانوں کی طرفی

حرارت پر جو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔ منگل سوتر کی شکل میں . . . .
قصہ مختصر اتنا سب کچھ ہم نے اس لیے کہا کہ آج کل منگل سوتر جانے کیوں ہماری کمزوری بنا ہوا ہے۔ جہاں ہم منگل سوتر کو
کے گلے میں دیکھتے ہیں۔ جانے کتنے ان دیکھے اور ان چھوئے سپنے ہماری نگاہوں کے سامنے رنگ برنگی تتلیوں کی مانند لہرانے
لگتے ہیں۔ کئی خواب ذہن کے سلولائیڈ پر، دماغ کے اسکرین پہ، آنکھوں کے لینس کے ذریعہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ خواب
صرف ہمارا ہی سرمایہ نہیں۔ اس میں دنیا بھر کی کنواری تمنائیں انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں۔ کئی خوابیدہ خواب سحر جگاتے نظر آتے
ہیں مگر آج ہر کنواری دوشیزہ کا گلا یہ گلہ کرتا نظر آتا ہے کہ صاحب سوال ہے ایک منگل سوتر کا . . . . . .
جب انتظار کی یہ گھڑیاں بہت طویل ہو جاتی ہیں تب امارت کی صلیب پر ٹنگا ہوا منگل سوتر۔ اس صلیب سے اتار کر اپنی بیٹی
یا بہن کے گلے میں ڈالنے کے لیے باپ یا بھائی کسی ایک کو اس صلیب پر ٹنگنا پڑتا ہے (مگر ہمارا تو دونوں رشتہ داروں میں کوئی
بھی نہیں) کبھی کبھی ہر دو کی قربانی رائیگاں ہو جاتی ہے اور آئی ہوئی بارات دروازے سے لوٹ جاتی ہے۔ محض یہ کہہ کر کہ داماد کو
جو انگوٹھی دی گئی اس کا وزن رتی بھر کم نکلا یا پھر صاحب ایسے خاندان سے رشتہ جوڑنے سے کیا حاصل جو زبان کا پاس
نہ رکھیں تو نہ رکھیں مگر اپنی کہی ہوئی بات کا پاس رکھنے کے لیے جہیزوں کا وزن بھی اس پر رکھنے سے قاصر ہوں۔
منگل سوتر۔ قریباً ہر کنواری لڑکی کے دل کی دھڑکن اس وقت بن جاتا ہے جب ساون کی پھوار دل میں ترنگیں جگانے لگتی
ہے اور شام کی تنہائی میں ساتھی کی آرزو بانہیں پھیلانے لگتی ہے مگر ترنگیں زمانے کی نیرنگیوں کی نظر ہو جاتی ہیں، اور پھیلی
ہوئی بانہوں میں کیلیں ٹھونک دی جاتی ہیں اور ساتھی کی آرزو ارمانوں کے کسی کونے میں اپنے کسی کا گھونگھٹ نکال کر سسکتی اور دم
رہ جاتی ہے۔
اتنا ہی نہیں، ہم نے ایسی بھی ہستیاں دیکھی ہیں جو منگل سوتر پہلے بنواتی ہیں اور ساتھی کی تلاش جنھیں بعد میں ہوتی ہے۔ ماں باپ
کی چوری سے، سکھی سہیلیوں کی نگاہیں بچا کر ٹرین میں یا بس میں اپنے گلے کی زینت بنا کر خوش ہو لیتی ہیں۔ مگر ایسی خوش نصیب
ہستیاں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔
برے دنوں میں عورتیں چاہے اپنے سارے زیورات بیچ دیں یا گروی رکھ دیں مگر منگل سوتر کو بھولے سے بھی گروی رکھنے کا خیال
ان کے دماغ میں نہیں آتا۔ منگل سوتر گروی رکھنے کے معنی ہیں سہاگ گروی رکھنا اور سہاگ گروی رکھنے کے معنی ہیں کسی
حسین اور موہنی مورت کو گروی شدہ سہاگ کے گرویدہ ہونے کا موقع دینا۔ عورت سب کچھ تو برداشت کر لیتی ہے۔ مگر "سوتر"
بچاؤ کے لیے "سوت" کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔
منگل سوتر کا ایک فائدہ اور بھی ہے اور وہ یہ کہ گلے میں منگل سوتر ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں "کوئی اور دروازہ کھٹکھٹا"۔
اس طرح سے ان نوجوانوں کا وقت بچتا ہے جن کا کام ہے سڑک پر رومیو بنکر گھومنا اور ہر آنے جانے والی کا پیچھا کرنا۔ اپنی گھر والی کو چھوڑ کر
علاوہ ازیں ان لڑکیوں کی نشان دہی بھی ہو جاتی ہے جو منگل سوتر کی سوالی ہیں۔
گھورنے والی نظروں سے ہم پر تو لرزہ طاری ہو جاتا ہے کیونکہ ہم پیدا تو ہوئے ہیں بیسویں صدی میں۔ مگر دماغ، خیالات
پندرھویں صدی کی ہیں۔ جہاں لڑکی کی آواز تو دور کی بات اس کا سایہ تک نظر نہیں آتا تھا۔ سو ہم نے سوچا کیوں نہ ہم بھی منگل
والے بن جائیں۔ مگر یہ تو ہم کچھ عرصہ بعد جان پائے کہ یہ تمنا تو بڑی مہنگی ہے نہ تمنا کا پوری ہو سکتی ہے اور نہ ہی ہم پندرھویں صد

بچاؤ ہو سکتے ہیں۔ پیٹ ہے بھوک لگتی ہے بھوک کا واحد علاج چاندی ہے اور چاندی گھروں میں تو نہیں اگتی۔ سو فظروں کا فی الحال تو ہمارا مقدر بنا ہوا ہے۔

اسی کشمکش و پیچ میں ہم نے بڑی شد و مد کے ساتھ سوچنا شروع کر دیا کہ بچاؤ کا راستہ کیا ہو سکتا ہے اور ہم نے اسے جان محنت کے بعد کھوج ہی نکالا۔ خود کو اللہ کی نگہبانی میں پوری طرح کر دینے کی خاطر ایک دن ہم بڑے چاؤ سے بنئے کی کان پر گئے۔ اس سے کالا ریشمی دھاگا آدھا میٹر خریدا اور اللہ کے نام کا بڑا سا لاکٹ لیا جو دور سے بھی دکھائی دے جاتا ہے گھر آئے۔ کالے دھاگے کو دھو کر پاک کیا، خود نہائے۔ دھاگے پر سورۂ فاتحہ پڑھی۔ دونوں چیزوں پر دم کیا اور انھیں منگل سوتر بنا کر اپنے گلے کی زینت بنا کر فارغ التحصیل ہو گئے۔

یقین جانئے اسے پہن لینے کے بعد سے منگل سوتر کے خوابوں نے ہمیں پریشان کرنا قطعی چھوڑ دیا۔ اب نہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے رنگین لہریئے لہراتے ہیں اور نہ آنکھوں کے لینس سے دماغ کے اسکرین پر، ذہن کے سلولائیڈ پر ان خوابوں کی تصویر ہی بنتی ہے۔ جب کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے ہم بڑی مضبوطی سے اللہ کے لاکٹ کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیتے ہیں اور بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ سوچتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ (اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

کنجوس نے سوچا۔ ڈاکٹر سے مشورہ بھی کر لیا جائے۔ اور فیس بھی بچا لی جائے،

ڈاکٹر سڑک ہی پر مل گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"ڈاکٹر۔ جب تمہیں زکام ہو جاتا ہے تو تم کیا کرتے ہو؟"

"چھینکتا ہوں" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

●

"جاؤ بیٹے ذرا ہتھوڑی تو مانگ لاؤ" کنجوس نے بیٹے سے کہا۔

بیٹا گیا اور تھوڑی دیر میں خالی ہاتھ واپس آ گیا، کیونکہ پڑوسی نے جھوٹ بول کر ٹال دیا تھا کہ ہتھوڑی نہیں ہے۔

"لاحول ولا۔ کنجوسوں سے تو کچھ توقع ہی نہیں رکھنی چاہیئے۔

جاؤ الماری سے اپنی ہتھوڑی نکال لاؤ۔

اس نے غصہ سے کہا۔

نیا آدمی نامہ

مفلس فاروقی

فتنوں کی پوٹلی ہے، قیامت ہے آدمی
دنیا کے سر پہ ایک مصیبت ہے آدمی

جس کا ہر ایک لفظ ہے دیوار قہقہہ
اک ایسا اشتہارِ حماقت ہے آدمی

دن رات جوڑ توڑ فریب اور سازشیں
ہر لمحہ محوِ کارِ سیاست ہے آدمی

لاتا ہے خالی سیپیاں تہہ سے سمیٹ کر
غواصِ بحرِ فہم و فراست ہے آدمی

باطن میں جھانکئے تو ہے شیطان سر بسر
ظاہر میں یوں تو آدمی صورت ہے آدمی

ڈرتا ہے صرف اس سے کہ بیوی کہیں جسے
سرتا پا ورنہ پیکرِ جرأت ہے آدمی

مجموعۂ تضادِ عجیب الوجود ہے
سرتا پا اک عجوبۂ قدرت ہے آدمی

مفلس کو پھر بتاؤ بھلا منہ لگائے کون
دولت جو ہے تو صاحبِ عزت ہے آدمی

غزل

رشید عارف
پٹنہ (بہار)

اپنی گرہ سے پہلے وہ شربت پلا گئے
بعد اس کے میری جیب سے بٹوا اڑا گئے

ہم واہ واہ کرنے کی طاقت گنوا گئے
پھر بھی وہ اپنی غزلوں پہ غزلیں سنا گئے

سونے کی اک انگوٹھی نشانی کے طور پر
جب مل گئی انہیں تو انگوٹھا دکھا گئے

خط عشقیہ لکھے ہیں، کی شادی غیر سے
ہم تھے شریف آدمی جھانسے میں آ گئے

دیدار تو ہوا مگر اللہ رے بے رخی
گزرے قریب سے تو وہ کنی کترا گئے

سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا ہم نے جنھیں وہی
رسوائیوں کی کھائی میں ہم کو گرا گئے

ہم دیکھتے ہی رہ گئے حسرت سے الامان
مرغے کی ران شیخ جی اکیلے چبا گئے

اللہ ان سے سمجھے گا عارف کبھی ضرور
جو سو پچاس لے کے ہمارا پچا گئے

لن ترانیاں

نزاکت فیضی
گلکاپور

چپل جو لیں گی ہاتھ میں حوا کی بیٹیاں
آدم کو یاد آئے گی جنت کی داستاں

ست [illegible] گی ادب میں وہ پہلی سی ہچکیاں
پہلے بھی پیچتی تھی مثالوں سے ککڑیاں

کمسن نہ تھا تو ہے وہ کہتی تھی گاہک سے بار بار
لیلیٰ کی انگلیاں ہیں یہ مجنوں کی پسلیاں

مونچھوں پہ تاؤ دے کے یہ بیوی سے کہہ دیا
کیا تم سمجھتی ہو کہ میں پیتا ہوں چٹکیاں

فیشن نے کر دیا ہے لباسوں کو مختصر
سینہ ادھر عیاں ہے، ادھر صرف پنڈلیاں

بیگم بھی آ رہی ہیں لئے جوتا ہاتھ میں
فیضی ذرا تو بند کرو لن ترانیاں

شکیل رضا بنگلور

جب سے ملک کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا ہے تب سے مکانوں کا کال سا پڑ گیا ہے۔ جیسے مکان نہ ہو بلکہ ایٹم بم ہو۔ پچھلے سال ہمیں ایک چھوٹے مکان، بلکہ یوں کہیے کہ ایک چھوٹے سے کمرے کی تلاش میں نکلنا پڑا تھا اور آج تک راہ جستجو میں خون دل، خون جگر بہانا پڑ رہا ہے۔ اس لیے ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ مکانوں کی تلاش میں اپنی ہڈیوں کا سرمہ بنانے کی بجائے کیوں نہ کسی فٹ پاتھ پر اپنا ڈیرا سجا دیں۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ ہمیں سڑکوں، گلیوں اور نالیوں کی بو سے نجات مل جائے گی اور پھر فٹ پاتھ پر سونے سے محلوں کے خواب دیکھنا نصیب ہوگا۔

مگر بھلا ہو ہماری حسن پرستی اور جذبۂ عاشقی کا کہ ہم مفت میں اپنا دل جلا بیٹھے اور اس قتالۂ جہاں سے اپنا ناتا بھی جوڑ بیٹھے جو ہر وقت چلتے پھرتے، سوتے جاگتے ہماری نگاہوں کے سامنے کٹھ پتلی کی طرح ناچتی پھرتی تھی اور ہمیں نچایا کرتی تھی۔ اگر بات صرف ناچنے اور نچانے پر ہی لٹکی ہوتی تو آج ہماری یہ حالت نہ ہوئی ہوتی۔ ہمارا دل سمندر کے کنارے گیلی ریت پر، اس کی زلفوں کے منڈوے تلے، پیار کی آگ میں جل رہا ہوتا اور ہم مزے سے عمر خیام کی طرح شراب انگوری میں ڈوبے رہتے ہوتے مگر اب نہ اس کی زلفوں کا سایہ ہے۔ نہ اس کے ہونٹوں کی شراب، اب تو صرف بوڑھے سورج کی کرنیں ہیں اور سڑکوں کی خاک ہے۔ کیونکہ اس مہتابہ کی اماں نے الٹی میٹم دے رکھا ہے کہ جب تک ہم ریت کے محلوں کو چھوڑ کر کسی جنگل بیابان میں کوئی ڈیرا نہیں ڈھونڈ لیتے۔ وہ اپنی سندری کو ہمارے ساتھ بن باس کے لیے بدا نہیں کریں گی۔ وہ اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی ڈیرا نہیں ہے اور نہ ان

کہ ڈیرے میں کوئی جگہ ہے کیونکہ ان کے ڈیڑھ اینٹ کے ڈیرے میں، ڈیڑھ درجن نفوس نیچے اوپر بیٹھ تو سکتے ہیں مگر سو نہیں سکتے اور پھر ہم ٹھہرے داماد، جس کے لیے ڈیرے کو سجانا پڑتا ہے۔ لیکن ایک داماد کے چونچلوں کے لیے گھر کے سارے افراد کو بیٹھنے سے محروم تو نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر داماد بننا ہو تو ڈیرا تلاش کرو۔ ورنہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کھاؤ!

بزرگوں نے کہا ہے کہ اگر زندگی کے فلسفے کو سمجھنا ہو تو شادی کرکے دیکھو اور گھر بنا کے دیکھو۔ یعنی اور سنیئے اسے کہتے ہیں ایک نہ شد دو شد! یہ بات کیا کم تھی کہ صرف شادی پر اکتفا کیا جائے۔ مگر ساتھ میں گھر بنا کر دیکھنے کی جو بات کہہ دیگئی ہے وہ غور طلب ہے۔ شاید اس لیے کہ حقیقت بیانی بزرگوں کی شان رہی ہے اور پھر شادی کا تصور گھر کے بغیر نامکمل سا ہو گیا ہے۔ کیونکہ شادی کے بعد مرد کے لیے صرف گھر کی چار دیواری ہی رہ جاتی ہیں۔ جس میں وہ چولھا چکی کے ساتھ بچوں کو سنبھالتا ہے اور بیگم صاحبہ مزے سے اپنی سہیلیوں کے سنگ سیر سپاٹے اڑاتی رہتی ہیں۔ خیر اس بات کا موقع تو ان لوگوں کو ملتا ہے جن لوگوں کے پاس شادی سے پہلے کوئی گھر ہوتا ہے اور جن لوگوں کے پاس گھر جیسی کوئی شئے نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کے لیے اس فلسفے پر عمل کرنا ایک مشکل امر ہے۔ کیوں کہ فی زمانہ جو لوگ شادی کرکے دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان بے چاروں کو گھر بنانا نصیب نہیں ہوتا کیونکہ شادی کے بعد تو بے چارے گھر بنانے کے لیے زندہ نہیں رہتے!!! اور جو لوگ شادی سے پہلے گھر بنا لیتے ہیں، وہ زندگی بھر کنوارے ہی رہ جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اپنی ساری زندگی گھر کے اینٹ پتھر گننے میں گزار دیتے ہیں۔

لیکن ہم نے سوچا تھا کہ ہمارا کوئی گھر بنے نہ بنے مگر شادی کے بعد کہیں نہ کہیں کوئی گھر مکان اور کمرہ جھونپڑی یا ڈیرا تو ضرور مل ہی جائے گا۔ کیونکہ آج کل کنوارے آدمیوں کو کوئی اپنا مکان اور کمرہ کرایہ پر نہیں دیتا۔ اور ہم نے اپنے دل ہی دل میں یہ بھی طئے کر رکھا تھا کہ ایک دو بچے تک کسی طرح سسرال کے ہاں گزار ہی لیں گے۔ مگر خدا سمجھے ہماری بیگم کی اماں کو جنہوں نے الٹی میٹم دے کر ہمارے سارے منصوبوں پر کالک لگا دی اور ہم اپنا کالا منہ لے کر نکل پڑے تھے ایک ڈیرے کی تلاش میں۔

جب ہم مکان تلاش کرتے ہوئے ایک صاحب کے در پر پہنچے تو ان صاحب نے ہماری حالت کا جائزہ لینے کے بعد کہا "کیوں، بھیک مانگتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟" ہم نے ان کے حضور میں یوں عرض کیا تھا کہ "اے اینٹ اور پتھر کے دیوانے ہمیں بھیک نہیں بلکہ تمہارے محل کا ایک کمرہ چاہیے۔" تو وہ صاحب ایکدم خفا ہو کر چیخنے لگے۔ جاؤ میاں جاؤ۔ اپنا راستہ نا پو۔ ہم نے یتیموں کے لیے آشرم نہیں کھول رکھا ہے۔!!

ایک دن ہم چائے کی دکان میں بیٹھے، چائے اور بیڑی سے اپنی تھکان دور کر رہے تھے کہ اچانک ہماری نظر کسی جاسوس کی طرح سامنے پڑے ہوئے اخبار کی ایک سرخی پر جم کر رہ گئی۔ "ضرورت ہے کرایہ داروں کی" ہم

خوشی سے اچھل پڑے اور اشتہار کا تفصیلی جائزہ لینے لگے! لکھا تھا:-

"ہم نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ ادارۂ خدمت خلق ضرورت مندوں کے لیے بالکل سستے کرایے پر آرام دہ مکانات فراہم کرتا ہے۔ دیگر تفصیلات کے لیے ذیل کے پتے پر ربط پیدا کریں۔"

جب ہم ادارۂ خدمت خلق کے دفتر پر پہنچے تو سکریٹری صاحب نے ہمارے سامنے خوابوں کا نقشہ پھیلا یا۔ اور کہنے لگے۔ یہ دیکھیے۔ یہ مکان کا احاطہ ہے اور دالان ہے۔ یہ بیڈ روم، یہ ڈرائنگ روم، یہ ریڈنگ روم، یہ کچن روم۔ یہ باتھ روم اور یہ ڈیتھ روم ہے جس کا کرایہ ہم نے صرف ایک ہزار روپے مقرر کیا ہے!!

ایک اور مالک مکان نے کمال ہی کر دیا۔ جب ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ کسی ممتحن کی طرح ہمارے سامنے "فارم برائے مکان" بڑھایا۔ جس میں کئی سوالات درج تھے اور یہ بات بھی نوٹ کی گئی تھی کہ جوابات خوش خط لکھنے پر مکان کی صفائی کے لیے ایک جھاڑو مفت دی جائے گی۔ ہماری نظریں جب سوالات پر پھسلنے لگیں تو ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے ہم اپنا نامۂ اعمال پڑھ رہے ہیں۔ سوالات کچھ اس طرح درج تھے۔

نمبر ایک۔ آپ کس خاندان، مذہب، فرقہ، زبان، زمین، رنگ نسل، ہوا، پانی اور لباس سے تعلق رکھتے ہیں۔ نمبر دو۔ کیا آپ فیملی پلاننگ کے قائل ہیں؟ ہاں یا نہ میں جواب دیجیے! نمبر تین۔ کیا آپ کسی قیامت سے محبت کرتے ہیں؟ کیا آپ کی محبوبہ کا شوہر کسی اور سے محبت کرتا ہے؟ تفصیل سے لکھیے۔ نمبر چار۔ کیا آپ رات دیر سے سوتے ہیں؟ کیا آپ کو نیند آتی ہے؟ نمبر پانچ آپ کو نیند میں گانے کی عادت تو نہیں ہے؟ نمبر چھ۔ کیا آپ نے کبھی سچ بولا ہے؟ نمبر سات۔ آپ کی بیگم کا وزن کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

ایک اور جگہ ہم مکان دیکھنے کے لیے پہنچے تو کچھ لوگ سر جھکائے بیٹھے نظر آئے۔ جیسے ان کا کوئی رشتہ دار انتقال کر گیا ہو۔ ہم نے ڈرتے ہوئے ان سے پوچھا کیا آپ کے یہاں کوئی کمرہ خالی ہے؟ ان میں سے ایک صاحب بولے خالی ہونے والا تھا۔ کیونکہ والد صاحب بہت بیمار تھے۔ خیال تھا کہ وہ اللہ میاں کو پیارے ہو جائیں گے مگر آج ان کی طبیعت سدھرنے لگی ہے۔ ان کی بات پر ہمیں بہت غصہ آیا اور ہم نے ان سے کہا کہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا آپ کو شرم نہیں آتی؟ وہ صاحب بولے۔ ارے صاحب اس میں شرم کیسی۔ باپ کے مرنے کے بعد جائیداد پر حق تو بیٹوں کا ہی ہوتا ہے!

OO

"کیوں صاحب۔ پاؤڈر بھی لگایا جائے؟"

شیونگ کے بعد حجام نے پوچھا

"پاؤڈر بھی شیونگ کی اجرت میں شامل ہے؟" گاہک نے پوچھا

"جی ہاں"

"تو پھر علیحدہ سے ایک پڑیا میں باندھ دو، گھر لے جاؤں گا۔"

ایک شاعرِ اعظم سے ملاقات

تاج پیامی (بہار)

اُئے تاج! میرے ساتھ عجب واقعہ ہوا — ناگاہ ایک "شاعرِ اعظم" سے کل ملا
لغزش تھی اُن کی چال میں اور لب پہ شعر تھا — شاید کہیں سے آئے تھے پڑھ کر مشاعرہ
میں یہ ادب سے بولا "نہ پہچانا آپ کو؟" — کہنے لگے وہ "شاعرِ اعظم مجھے کہو"
اس دَور میں ہے شاعرِ اعظم وہی جناب — گا کر غزل جو پڑھتا ہو، پیتا ہو جو شراب
بزمِ سخن میں دے اُسے دعوت اگر کوئی — وہ خود کو بیچ ڈالے، قلم بھی ضمیر بھی
وہ نرخ اپنا خود ہی بڑھاتا ہے اس طرح — اک نوجواں کنوارا تلک مانگے جس طرح
اک کمیٹی جو بزمِ سخن منعقد کرے — شاہوں کی طرح اس کے مقدر ہی کھل گئے
جیسے گوالا دودھ لے، ہر قطرہ دودھ کا — شاعر بھی جانتا ہے یونہی پیسے اینٹھنا
کھانے سے پہلے اور کبھی کھانے کے بعد بھی — دو چار بوتلوں سے کرے گا وہ دل لگی
انڈے ہوں ناشتے میں تو کھانے میں مرغ ہو — یہ سب نہیں تو شاعرِ اعظم کرے گا فون
زادِ سفر کے بعد بھی کچھ روپیہ وہ لے — شاعر کی زندگی کا یوں ہی کارواں چلے
لیکن جو میزباں ہوا کوئی بے نوا — شاعر بھی اس کے سامنے بن جائیگا گدا
یوں گڑگڑا کے مانگے ٹکٹ کے وہ روپئے — بھوکا فقیر جیسے طلب روٹیاں کرے
افسوس ریل کا جو کرایہ نہ پائے گا — پھر میزباں کو گالیاں دیتا ہی جائے گا
تعریف میں نے شاعرِ اعظم کی جب سنی — ان سے کہا "جناب یہ اچھی ہے شاعری!!"
بولے کہ آپ ہوتے ہیں حیران کس لئے — اتنی سی بات شاعرِ اعظم کو چاہیئے

مشہور خود ہو اور ہو مشہور شاعری
حیوان اس کو جانئے یا کہیں آدمی

—— ۰۱۰ ——

غزل

عالم تاج پوری

فرآن سے فیضیاب ارے باپ کیا کروں — جل جل کے ہوں کباب ارے باپ کیا کروں
دعوت میں کر دی صاف جو میں نے کئی پلیٹ — پیٹو ملا خطاب ارے باپ کیا کروں
کیلری کہتے ہیں جو تعلیم سیکس کو — اس عقل پہ حجاب ارے باپ کیا کروں
بیگم مری ہے کالی کلوٹی تو کیا حرج — ہے نام ماہتاب ارے باپ کیا کروں
چھانٹ رہن جوانی کے مستی میں خوب رنگ — اب ڈھل گیا شباب ارے باپ کیا کروں

بیگم کا موڑ سے پوچھو نہ عالم کہ شیخ جی
ہیں جان کا عذاب ارے باپ کیا کروں

احمد عثمانی
مالیگاؤں

چند خطوط صرف تفننِ طبع کی خاطر لکھے گئے ہیں۔ اگر کسی سے ان کی آنکھ لڑ گئی تو اتفاق تصور فرما کر فدوی کی جاں بخشی اور ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر کی گلو خلاصی (خلاقی نہیں) ا۔ع

قابلِ احترام جناب مدیر صاحب۔
سلام شوق و نیاز!

آپ کا موقر جریدہ دیکھتے ہی خرید لیا۔ ٹائٹل تو ہفت رنگ کہکشاں کو بھی مات کرتا ہوا ہے صفحہ پلٹا تو باچھیں کھل گئیں۔ کیا ترتیب ہے کیا اندازِ متانت ہے اور بھی مواد نے تو اسے تاریخی دستاویز بنا دیا ہے۔ آپ نے یہ گلدستۂ ادب شائع فرما کر تشنگانِ ادب و زبان پر احسانِ عظیم فرمایا۔ میری دعا ہے کہ آپ کا یہ پرچہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کی شاہراہ پر ہزار میل کی رفتار سے دوڑے۔ آمین ثم آمین۔

چار عدد غزلیں بطورِ خاص آپ کی خدمت میں بہ تعاون سخن ارسال کر رہا ہوں۔ امید کہ آپ قبول فرما کر شکریے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔
آئندہ ماہ کی تنخواہ سے سالانہ خریداری کی رقم بھیج رہا ہوں

آپ کا مخلص
ہمزاد بالانشین پوری

مکرمی و محترمی
دام اقبالہٗ!

حضرت چپکے چپکے اتنا اچھا رسالہ نکال لیا اور ہمیں خبر نہ ہوئی۔ ارے بھائی غزل یا نظم ہی بھیج دیتے۔ اس مرتبہ تو آپ کا نام دیکھ کر ہم نے رسالہ بدقت بازار سے خریدا ہے اور آئندہ بلکہ آپ ہمیں اعزازی کے زمرے میں شامل فرما

فی الحال دس نظمیں اور پندرہ غزلیں بھیج رہا ہوں۔ یہ شائع ہو گئیں تو پوری بیاض بھیج دوں گا۔

آپ کا
دلشاد ناشادپوری

عالی مقام
نیاز!

ہم نے اتنی عرق ریزی سے کہانی بھیجی آپ نے واپس بھیجی
ہم نے دوبارہ پڑھی پھر لکھی پھر بھیجی۔ پھر آپ نے واپس بھیجی۔
ہماری آنکھ بھر آئی۔ ایک فنکار اور یہ نا قدری۔ یہ رُکھائی۔ ہم نے
کہانی دوستوں کو دکھائی۔ سب نے پسند فرمائی۔ لیکن واسطے
حضرت آپ کو نہ بھائی۔ یہ کیا معاملہ ہے بھائی۔ چھپے سب بنا سائی
اب نہ کرو ہماری جگ ہنسائی۔ اب کی بار کہی دو چھپائی۔

آپ کا
شاہی تباہی
ناچن کھیڑا

حبیب و صدیق
سلام صد ہزار شوق و نیاز سلامت!!

میرے مراسلے کا جواب حضرت خادم مالک پوری
نے دیا۔ وہ بھول گئے کہ میرا منشا کسی کو گرا کر اپنے کو اٹھانے کا
نہیں تھا (جبکہ میں خود استاد الشعرا رہوں) لیکن خادم صاحب
کے آٹھویں شعر کے پہلے مصرع میں "راہ" زائد ہے بارھویں شعر
کے دوسرے مصرعے میں "س" متحرک نہیں ہے۔ اب میں اپنی
استادی کو کیا کروں۔ یہ بھی نہ کہوں ادب میں جو ٹیڑھا پن چل رہا ہے
اس کو برداشت کریں۔ یہ تو نہ ہوگا صاحب ہم سے۔ ہم خاموش
رہنے والے نہیں (میرے شاگرد آستین چڑھا رہے ہیں۔ میں نے
انہیں کہہ دیا ہے کہ قلم کو سان دو) خادم صاحب سمجھ لیں کہ
ان کی تک بندی چلنے والی نہیں۔
امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

نیازمند
جلال آتش پوری

جناب ایڈیٹر صاحب۔
آداب شوق!

آپ کا پرچہ دیکھا۔ ہائے اللہ کتنا پیارا ہے۔ ہماری تو
خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جب اس میں پیاری پیاری نظمیں و غزلیں
دیکھیں۔ آپ کی نظم تو اتنی پیاری تھی کہ بس ہائے۔
ہم نے فوراً باجی کو پرچہ دکھایا۔ باجی نے بہت تعریف
کی اور ایک عدد غزل بھیج رہی ہوں۔ میں کیوں اتنے اچھے پرچے
سے محروم رہوں۔ چھاپیے نا ہیں۔
رسالہ چھپتے ہی ہمیں پہلے بھیجئے۔ ہم صبح کی طرح
منتظر ہیں۔
امید کہ آپ ہمارے شوق کو جلا دیں گے۔

آپ کی مخلص
شہزادی زہرہ نگاہ
چمپاکلی۔ عشق آباد

زباں نواز ادب یار جنگ
غزل محل کہانی منزل
نظم پور۔

مدیر کرم
خلوص بے کماں!

حضرت آپ نے رسالہ کیا نکالا آفت آگئی۔ ادب
میں تحریک، زبان متحرک ہو گئی۔ آپ کا پرچہ آسمانِ ادب
کا درخشندہ سورج ہے جو سب کو روشنی عطا کرتا ہے اور ہر خاص

دعام کی نگاہ لطف و کرم اس پر پڑتی ہے۔ مجھے بہت پسند آیا۔
دراصل میں میرے بھانجے کی سالی کے نکاح ثانی میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ اس کے بعد چوتھی بار غم جاناں کا شکار ہو گیا۔ اس لئے کچھ کہہ نہ سکا لیکن کئی مشاعروں کی صدارت فرما چکا ہوں (ایک مشاعرے کی رپورٹ آپ کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ افسوس آپ نے شائع نہیں فرمائی۔ خیر) اب میں نے میری تیسری محبوبہ کی دوسری شادی کا سہرا لکھا ہے وہ ارسال کر رہا ہوں (خواستگار تو کئی تھے لیکن ہمیں آپ عزیز ہیں) اور ساتھ ہی کئی غزلیں، نظمیں، رباعیاں ہر ماہ شائع کرتے رہیے انشاءاللہ میرے نام کی وجہ سے آپ کا پرچہ چل نکلے گا۔ کچھ دوستوں کے پتے بھیج رہا ہوں۔ بن داس[1] پرچے بھیج دیں یہ سب ادب ساس[2] لوگ ہیں اور کچھ کارلائق سے یاد کریں نوازش ہوگی

[1] بلاخوف [2] خوشناس

فقط آپ کا منتظر جواب
زباں نواز ادب یار جنگ

جناب محترم و مکرم ایڈیٹر صاحب
سلام شوق و نیاز و آداب عرض!
مجھے رسالہ "اجالے کی اندھیری کرن" کے ذریعہ آپ کے پرچے کا پتہ چلا۔ جناب میں افسانہ نگار، شاعر، ڈرامہ نگار اور تنقید نگار ہوں۔ آپ کی نگاہ سے مختلف رسائل میں میری تخلیقات گذری ہوں گی۔ میرا ایک پر مغز تنقیدی مضمون "فلمی ہنگامے" نامی پرچے میں پچھلے ماہ شائع ہوا ہے اور کئی غزلیں "رنگین جوانی" میں شائع ہوئی ہیں۔
آپ اپنا رسالہ مجھے بھیجیں۔ اگر میرے معیار پر اترے گا تو تخلیقات سے آپ کو نوازوں گا۔ میں معاوضہ لیتا ہوں۔ لیکن آپ کا پرچہ پسند آیا تو فری خدمت کروں گا۔ آپ ایک رسالہ ہر ماہ بھیجیں۔ کیا پتہ وہ کس ماہ میرے معیار کا ہو جائے۔ اکثر پرچے ادب کی بلند چوٹی پر چڑھ جاتے ہیں۔ پھر انھیں میرے معیار پر آنا ہی پڑتا ہے۔ کروڑوں لوگ میرا معیار پسند کرتے ہیں۔ صرف چند ترقی پسند (سر پھرے) اور کچھ جدیدیئے (نیم پاگل) بلند اور نافہم ادب کی بات کرتے ہیں۔
بہرحال آپ پرچہ بھیجئے۔ میں اسے میرے معیار پر لے آؤں گا۔ پھر یہ ترقی پسند کمینے اور جدیدیے ادیب آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔
پرچہ ذرا جلدی جلدی بھیجیں۔ شکریہ۔
آپ کا
مخلص تخلص پوری

حضرت!
آداب!!
خوب پرچہ نکالا
ہم نے سب کھنگالا
بہتر پایا
مبارکباد
ایک تپتی دوپہر کا گرم سلام

افسانہ حاضر ہے
قبول ہو
صرف آپ کا ہی
نج نصرت آبادی

جناب عالی!
سلام شوق!!
پچھلے شمارے میں میری غزل شائع ہوئی ہے (رسالہ میں نے بازار سے خریدا) لیکن اس غزل کو کاتب نے تختۂ مشق بنا ڈالا اور مجھے استاد سے شاگرد۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرع کی الف گرا دی اور بائے دبا دی اور ک اٹھا دیا۔

...ہ ایک لفظ بدل دیا ہیں "کرتب" لکھا تھا کاتب نے "سرپٹ"
...ہ مارا۔ میری اکثر غزلیں کاتبوں کی وجہ سے غلط ہو جاتی ہیں اور
...ب میرا یہ خیال پختہ ہوتا جارہا ہے کہ کاتبوں نے میرے خلاف
سازش کر رکھی ہے)

پوری مرصع غزل کا ستیاناس نہیں بلکہ اٹھیاناس مارا۔
...ب غزل آپ سے متقاضی ہے کہ اسے آپ مکرر شائع فرما کر
...یچ کو آنچ نہیں کر دیں (یار لوگ ہماری ٹھٹھول کرتے ہیں جی)
امید کہ آپ چند روز ہمیں اور زندہ رکھیں گے۔

آپ کا احقر

نامراد حیدر جعفردری

...فتاب احمد خاں ولد مہتاب احمد خاں

BA.Bed.M.A.Med.M.Fill, PhD. LONDON

साहित्य रतन (Banaras)

ریٹائرڈ ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس

بلاسپور تھانہ جگ پور

قبلہ و کعبہ جناب عالی مقام مدیر صاحب

سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

برادرم آپ کا رسالہ دیکھا اور اسے ہمارے بغیر تشنہ پایا
...س لیے جلد از جلد تشنگی دور کرنے کا انتظام کیا۔ ایک بے حد
...چھا صاف ستھرا تنقیدی مضمون بعنوان "اقبال کا جمال و کمال"
پیش خدمت ہے۔ اس مضمون کے فوراً بعد غالب پر ایک مضمون
شروع کیا ہے۔ عنوان ہے "ہمارے غالب تمہاری دومنی"
ہے نہ بھائی مزے دار چیز۔ اب چھاپنا آپ کا کام ہے۔ لکھنا
ہمارا کام۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ حصۂ مضامین ہمارے لیے
چھوڑ دیں۔ فدوی یہ خدمت راہ للہ ادب میں کرے گا۔ فقط

والسلام۔ آپ کا

آفتاب احمد خاں ولد مہتاب احمد خاں

نوٹ: بہت سے مدیرانِ محترم مجھ سے مضامین مانگتے ہیں لیکن
آپ کے رسالے کی بات ہی کچھ اور ہے اس کی ادا بھائی
اس لیے قلم متحرک ہو گیا۔ قلم برداشتہ مضامین چلے آرہے ہیں۔

آفتاب احمد خاں ولد مہتاب احمد خاں

برادرم!

اچھے رہو!

سنا ہے ادب کی سنگلاخ وادی میں آپ نے
بورنگ کر کے نخلستان بنا دیا۔ اب گلستان کی جستجو ہے۔
بھائی یہ وادی صرف ع

ہے باغ بہار ادب چند روز

اب ہم ڈبل چشمہ لگاتے ہیں اور مضمون لکھواتے ہیں۔ ہماری
سکریٹری مضمون لکھتی ہے لیکن کوئی چھاپتا نہیں۔ کیونکہ اب
ہم مدیر نہیں رہے۔ جب ہم مدیر تھے تو وہ خاطر مدارات ہوتی
تھی کہ ہم باغ ہماری سکریٹری نہال ہو جاتے تھے۔ لیکن صاحب
جب ہمارا آخری گھر بار پنشن بھی بک گئے اسکے بعد بھی پرچہ
بند ہو گیا تو یار لوگوں نے کوے کے دیدے کی طرح دیدے
پھیر لیے۔

بھائی کچھ پیسہ ہو تو کاروبار کرو۔ بال بچوں میں خوش رہو۔
چھوڑو یہ چکر۔ ہم نے دور اندیشی کی بات کی ہے۔ سمجھ میں آئے
تو بہتر ——

ایک عدد تنقیدی، ایک عدد مزاحیہ، ایک عدد ادب
لطیف، چند غزلیں میری اور سکریٹری کی بھیج رہا ہوں۔ شائع
فرما دیں۔

آپ کا

بادل گرج پوری

ایم اے۔ اختر
(اکولہ)

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے
صدائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

اس مصرع کو ہر زاویہ و ہر طرح سے پڑھا، سمجھا۔ ترنم میں، تحت اللفظ میں پڑھا اور پڑھوایا گویا کہ حکیم و ڈاکٹر دونوں سے رجوع ہوئے مگر ہنوز یہ مصرع سر درد بنا رہا کیونکہ اصل میں ہمیں "کنفیوژن" ہو گیا تھا۔

اب بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ کنفیوژن کیوں اور کیسے ہوا۔ یہ تو قصۂ چہار درویش کی طرح کہانی در کہانی ہے مگر پھر بھی ہم اس کی ابتدائی تصاویر کی جھلک قارئین کرام کو نظر نواز کرتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ میٹرک کا امتحان تین بار سپلیمنٹری دینے کے بعد پاس ہوئے جبکہ ہمارے محلے کے تمام ہی لڑکے فیل تھے۔ میرے اور خاص طور پر ان پڑھ اعزا کے لیے یہ تعلیم کی اونچائی ابوالہول کی طرح معلوم ہوئی۔ اور یک لخت وہ ہمیں سلام کرنے و خیریت پوچھنے لگے۔ اس دن ہم نے پینٹ کے باٹم کی چوڑائی اور بالوں کی لمبائی میں تھوڑا سا اضافہ کیا جو ہمارے لیے باعث صد افتخار تھا۔ اور اب ہم ۱۴ گز کا سینہ کیے شاہراہوں پر دندنانے لگے اور جا و بے جا ہمارا انٹروڈکشن دینے لگا۔ اب ہم ہر جملے میں انگریزی کے الفاظ بڑی بے تکلفی سے استعمال کرنے لگے جس سے ہمارے ذوق برتری کو تسکین میسر آیا۔ آلو، پیاز کی دوکان سے 'ریٹ'، دھوبی سے "لانڈری" کرانہ دوکان سے "شاپ" اور عزیز دوست سلیم سے "ایکوریٹ" سیکھے۔ ویسے سیکھنے کے معاملے میں ہم پہلے ہی سے فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ لیکن ہمیں کبھی کڑواہٹ بھی زہر مار کرنی پڑتی ہے۔ ایسا سیکھنا ہمیں گراں بھی گزرا۔ واقعہ یہ تھا کہ ہم نائی کے یہاں پہنچے وہاں پر چند اخبارات، پرانے رسائل و کھٹمل پیشگی ہی خدمت میں موجود تھے۔ ہم نے خبریں ذہن میں انڈیلنا شروع کیا اور کھٹملوں نے اس کا خراج مع سود کے وصول کیا۔ ہم اس نیر و نشتر سے محظوظ ہو ہی رہے تھے کہ نائی نے مسکرا کر کہا "ساب آپ کا نمبر ٹھیک ہے۔" کیا آپ شیونگ کر رہے ہیں" چہرے پر ایک رنگ آتا اور ایک رنگ جاتا رہا سامنے آئینہ ذرا آئینہ ہونے سے دو رنگ آتے اور دو رنگ جاتے نظر آنے لگے وجہ اس کی یہ تھی کہ شیونگ یہ ورڈ ہم نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس غور سے سنا تھا کیونکہ "کلین لانڈری" کا بورڈ کل ہی پوری توجہ سے پڑھا تھا

جبکہ بہ بقول ہمارے والد صاحب کے ہماری پیدائش سے ۱۳ برس پہلے ہی اپنی بنیادیں پوری کر چکی تھی۔

خیر مسئلہ زیرِ غور تھا ایک ہاں کہیں یا نا۔ ہاں کٹنگ سر کے بالوں کی چھٹائی کو اور شیونگ گالوں کے بالوں کی صفا
کو کہتے ہوں گے۔ بورڈ پر بھی تو کٹنگ اور شیونگ لکھا ہے۔ ہم نے ترچھی نگاہوں سے بغل کی کرسی کی طرف نظر ڈالی ا
اطمینان کا سانس لیا ہی تھا کہ نائی نے ان صاحب سے پوچھا "کٹنگ یا شیونگ" اور انھوں نے اثبات میں سر ہلا
اور جھٹ نائی نے گالوں پر برش شروع کر دی۔ اب آپ ہی میری حالت کا گمان کیجیے کہ مسئلہ کتنا گہرا اور مشکل تھا۔ مجھے تو
کا جو سے شیر نکالنا اور مصر کے اہرام تعمیر کرنا ڈھول معلوم ہونے لگے۔

اب نائی کو سیاست کی بحث میں زیادہ دیر تک الجھا کر رکھنا انتہائی مشکل نظر آ رہا تھا۔ اگر کٹنگ سر کے بالوں کی
ہے تو نائی نے گالوں پر صابن کیوں پھیری اور شیونگ داڑھی کو صاف کرنے کے لیے مستعمل ہے تو بال کیوں کٹنے لگے۔ اب ہم
الفاظ کے معنی جانچنا شروع کیے تو سمجھے کٹ یعنی کاٹنا ہے۔ اب کٹ کے معنی کاٹنا ہے تو سر کے بال ہی کاٹے جاتے ہیں
ڈاڑھی کے بال جڑ سے صاف کیے جاتے ہیں۔ سر کے پیڑ سے اور داڑھی کے جڑ سے تو پیڑ کہاں سے شروع ہوتی ہے اور جڑ
کہاں سے؟ نائی نے ملائمت سے دوبارہ پوچھا "کیا شیونگ کروں یا کٹنگ بھی" ہم نے معصومانہ اور انکسارانہ لہجہ میں کہا
کٹنگ نہ ہی شیونگ صرف داڑھی بنا دیجیے ایسا جملے کا ہوا میں تحلیل ہونا ہی تھا کہ وہ قیامت خیز قہقہہ چاروں طرف بکھرا کہ
کے لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ بچے گیند چھوڑ سیلون کے سامنے آ کر جمع ہو گئے۔ نائی نے کہا ساب داڑھی بنوانا اور شیونگ
ایک ہی مطلب رکھتا ہے۔

اس لیے ہم نے اس دن سے قصد کر لیا کہ نہ داڑھی بنوائیں گے اور نہ ہی کٹنگ کروائیں گے۔ اور اب تو وہ فیشن
بھی شامل ہو گیا ہے۔

اخاہ! ضمیر صاحب ہنس کر کہنے لگے تو صاحب زادے یوں کہو کہ تمہیں شیونگ اور کٹنگ میں "کنفیوژن" ہو گیا تھا
میری آنکھوں میں بجلی کی سی روشنی پھیلی اور دل باغ باغ ہو گیا کہ انگریزی کا ایک لفظ تو نیا مل گیا اور ہم نے اسے اچھی طرح
یاد بھی کر لیا تھا۔ قارئین کرام انصاف سے کہیے ہم نے ابتدا میں کتنے اچھے ڈھنگ سے استعمال بھی کر لیا ہے۔
خدا کا شکر ہے کہ مندرجہ بالا مصرع میں "کنفیوژن" ہمیں کنجڑے، دھوبی، پنساری و نائی کے یہاں جانے
سے پہلے لاحق ہو گیا۔ اور عزت بچ گئی۔

خوش دیو مینی (دوپچہ)

عوام کے لئے گپ باز اتنے ہی ضروری ہوتے ہیں جتنا کہ شاعروں کے لئے واہ واہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ہمیں اس طبقے کا ہونا چاہیئے جو گرانی کے اس دور میں بھی مفت مسرت کے مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔

عام طور پر گپیں تین قسم کے واقع ہوتے ہیں۔ پہلے وہ جو حقیقت میں گپ اس طرح ملا دیتے ہیں جیسے چائے میں چینی ملائی ہے۔ اس طرح بات کا حسن دوبالا ہوجاتا ہے اور سننے والا بور نہیں ہوتا۔ دوسری قسم اُن گپیوں کی ہے جو چوک میں کھڑے داتوں ن اور آنکھوں کا انجن بیچتے ہیں اور عرش اور فرش کے قصے اور خرافات سنا سنا کر محظوظ کرتے ہیں۔ یہ قسم بھی قابل برداشت گپیوں کی تیسری قسم وہ ہے جو مجذوب کی بڑ کی طرح بلا سوچے سمجھے ڈینگ پر ڈینگ مارتے جائیں گے اور اپنی عظمت اور خودستائی یسی ایسی داستانیں اور معرکے سنائیں گے کہ الف لیلیٰ کی کہانیاں اور ٹارزن کی بہادری مات کھا جاتی ہے۔ اگر آپ کو ہماری ۔میں مُجد نظر آتا ہے تو جناب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ہمارے دوست جناب گھاسی رام سے ملاقات کا شرف حاصل کرکے آزما ۔ یہ صاحب گپ بازوں کے تیسرے زمرے سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمیشہ آسمان کی وسعتیں ناپتے رہتے ہیں اسی لئے کبھی بھی زمین اُن پاؤں تلے نظر نہیں آتی۔

دور کیوں جائیں ابھی پچھلے ہی دنوں جب اُن کی شادی کی خبر آناً فاناً شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تو ہم شروع سے ہی اعتبار نہ کیا۔ سوچا۔ ضرور دشمنوں نے گپ اڑائی ہے یا حاسدوں نے شوشہ چھوڑا ہے۔ ورنہ اُن کی نظر شباب تو فاران کی اُس حسینہ پر آگئی ہوئی تھی جس کا تذکرہ انہوں نے بارہا یاروں کی محفل میں کیا تھا اور (جو) سکے شرلی جگر سے ہوئے خطوں کی کئی بار انہوں نے نمائش بھی کی تھی۔ تصدیق کے لئے جب ہم دوست اُن کے گھر پہنچے تو پہلے وہ کچھ شرمائے گھبرائے۔ آخر میں تھوڑا مسکرائے اور پچھتاوے بھرے محتاط مگر شیریں انداز میں فرمانے لگے کہ صاحب ہمارا تو اس شادی ہونے میں رتی برابر بھی دخل نہیں۔ اور ہم نے تو یہ شادی رکوانے کے لئے لاکھوں پاپڑ بیلے اور بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن

ئے ری قسمت کے بزرگوں کی چوکڑی کے آگے ہماری ہیکڑی نہ چل سکی۔ دوسری جانب ہم نے یہ بھی سوچا کہ ایک تو بال گر
ں۔ اُوپر سے دانت اُدھر رہے ہیں۔ جب ساکھ بھی تھوڑا گرتی دیکھی تو بغاوت کرنے کے بجائے شادی کرنے پر راضی ہوگئے۔

اس کے بعد آنجناب نے ہونے والی بیگم کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے (لیکن
محتی سے اُن کی بیگم ہماری پڑوسن تھیں اور ہم اُن کی تاریخ جغرافیہ سے پوری طرح واقف تھے)۔ پھر حضرت نے آنے والے
ہمیسر کی دھاک جانی شروع کی اور آخر شادی پر ہونے والے لمبے چوڑے خرچ کے بارے میں بیان دینے کے بعد براتوں
ں فہرست دکھانے لگے جو کوئی پچاس افراد پر مشتمل تھی۔ اس فہرست میں ملک کے نامور ادیبوں رہنماؤں اور عہدیداروں کے
م درج تھے۔ چونکہ یہ فہرست چوٹی کے عالموں، فاضلوں اور اُمرا، وزرا پر مشتمل تھی۔ اِس لئے اُنہوں نے اپنی شادی کی تقریب
ں اپنے دوستوں، ہم عمروں اور واقفکاروں کو بلانا مناسب نہ سمجھا۔ اس طرح اِس فہرست میں اپنے شہر کا ایک بھی آدمی شامل نہ تھا
بلن ہم اس لسٹ کو دیکھ کر خوش بھی تھے اور محوِ رشک بھی۔ خوش اس لئے کہ ہمارے چھوٹے سے شہر میں اتنے بڑے بڑے لوگ
شریف لا رہے تھے اور محوِ رشک اس لئے کہ ہمارے یار کی شادی پر آرہے تھے۔

جب یہ خبر انتظامیہ تک پہنچی کہ اتنے بڑے لوگ یہاں آرہے ہیں تو ایک تہلکہ مچ گیا۔ پوری ایڈمنسٹریشن
حرکت میں آگئی۔ پولیس کی تعیناتی شہر کی صفائی، بجلی کی فراہمی، دوکانوں کی سجاوٹ اور دفتروں کی حاضری وغیرہ وغیرہ۔
یعنی کہ ہر طرح سے چوکسی اور چابکدستی برتی گئی۔ اس طرح عوام اور انتظامیہ شری گھاسی رام کی دھڑلے دار شادی کا شدت سے
انتظار کرنے لگے۔

لیکن بیچ میں نہ جانے کیسے گڑبڑ ہوگئی کہ جب بارات نکلی تو ایک طرف دلہا میاں گھوڑے پر سوار تھے اور
دوسری جانب بینڈ باجا۔ لیکن درمیان سے باراتی غائب تھے۔ شہر والوں کو بلایا نہ گیا تھا اور باہر والے آئے نہ تھے۔
فقط بینڈ باجا زور زور سے یہ دھن بجا رہا تھا۔ "آجا آجا رے تجھ کو میرا پیار پکارے...." پر وہاں کوئی
نہ تھا جو اس آواز کو لبیک کہہ کر بارات میں شریک ہوتا۔ جوں جوں انوکھے اور نرالے انداز کی یہ بارات گلیوں، محلوں اور
بازاروں سے گزرتی رہی توں توں شریر اور شرارتی لچے بچے اس میں شامل ہوتے رہے۔ پھر جب یہ بارات مین بازار
پہنچی تو اس نے ایک جلوس کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اب اس جلوس میں بینڈ باجا بھی بج رہا تھا اور ٹوٹے ہوئے ٹین کے ڈبے بھی
بجائے جا رہے تھے۔ اُدھر نکڑوں اور چوکوں پر کھڑے تماشائیوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ اس بارات کی انفرادی حیثیت سے لطف
اندوز ہو رہے تھے۔ کیوں کہ اب بارات میں گھاسی رام کی لسٹ والے امرا و وزرا کی بجائے فقط گلیوں کے بن بلائے شرارتی
بچے شامل تھے جنھوں نے بارات کو دلہن کے گھر تک پہنچانا اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔

'آیئے.... !— اب ایک دوسرے قسم کے گُرو سے آپ کا تعارف کرائیں۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ
جس طرح ہندوستان زیادہ بچے پیدا کرنے کے لئے تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اِسی طرح لکھنؤ اچھے قسم کے مشاعروں کے سلسلہ میں
اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اِسی لئے جب حضرت منّے میاں لکھنوی کی سواری ہمارے شہر میں اُتری تو ادبی محفلوں میں ہلچل مچ گئی اور
بڑے بڑے استادوں کے دانت بجنے لگے کہ نہ جانے یہ کالا ناگ کس کس پر گرجے گا۔

چونکہ اُن دنوں ہم شہر کی ادبی محفلوں کے منتظم ہوا کرتے تھے اس لئے حضرت منّے میاں بلا کھٹکے ہمارے
ہاں آدھمکے۔ اب ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ہم اُن کی خالص لکھنوی پوشاک اور پلپلے گول چہرے پر خشخشی خضابی داڑھی

کو دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے تھے۔ علیک سلیک کے بعد حضرت فرمانے لگے۔

—— قبلہ! یہ تو اُردو کا درد ہے جو دَر دَر کی خاک چھنوا رہا ہے ورنہ اپنی دھوم کا تو یہ عالم سمجھو کہ کل ہند مشاعروں کی تان ہم پر ٹوٹتی ہے۔ پھر ریڈیو اور دوردرشن پر بولنے کے لئے دعوتوں کی بھرمار اُس پر موئے رسالوں اور اخبار والوں کی التجائیں کہ ہمیں اپنے کلام سے نوازیئے۔ اب تو میاں فلموں میں بھی لکھنے کے لئے بلایا جارہا ہے۔ یہاں تو بس ایک انار اور سو بیمار والا قصہ ہوگیا ہے۔ وہ تو یہ سمجھو کہ اُردو کی تڑپ تھی جو یہاں تک کھینچ لائی۔ ہو بھی کیوں نا۔ مرحوم اُستاد جگنؔ لکھنوئی کے شاگرد جو ٹھہرے۔ جن کی رگ رگ میں ادب سمایا ہوا تھا۔ اُن کا اوڑھنا اگر شاعری تھی تو بچھونا سنگیت۔ بہشتی ہر بات سُریں اور ہر کام تال میں کیا کرتے تھے۔ جس نے بھی مرحوم کا حقہ بھرا۔ یا پانی بھرا۔ یا دم ہی بھرا۔ آج شاعری کے بام پر اپنا نام چمکا رہا ہے۔ اُستاد کے دل میں اُردو ادب کے لئے وہ درد تھا، وہ درد تھا کہ آخر اسی درد نے ان کا کام تمام کردیا تھا۔ لیکن مرتے مرتے بھی آنجہانی وراثت میں چار دیوان اور چار بیویاں چھوڑ گئے ہیں۔ بندہ تو اُن کا ہی ایک ٹُڑنکا ہے۔ جو مرحوم کی روح کی تسکین کے لئے جگہ جگہ شاعری کے گل کھلا رہا ہے۔ پھر پان کی پیک والے سُرخ دانتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولے —— ہاں تو قبلہ اگر ہمارا جلوہ اور جلال دیکھنا چاہتے ہیں تو مشاعرہ کر ڈالو۔ پورا مشاعرہ لوٹ نہ لیا تو مُنّے میاں نام نہیں۔ بندہ نواز آج تک لاکھوں مشاعرے لوٹ چکا ہوں۔ سامعین کے دلوں میں وہ آگ لگاؤں گا۔ وہ آگ لگاؤں گا کہ بجھتے بجھتے ہی نہ بجھے گی ——!

توجناب۔ اِس طرح مُنّے میاں کی لچّھے دار باتوں۔ اور لکھنوی شاعر کو سُننے کے لئے عوام الناس کے اشتیاق نے ہمیں مشاعرہ منعقد کرنے پر مجبور کر دیا۔

ورنہ اس دور میں جب کہ شاعروں کی تعداد سامعین سے تجاوز کر گئی ہے۔ اور سامعین کو شعراء حضرات سے اللہ واسطے کا بیر ہو چلا ہے۔ مشاعرہ منعقد کرانا دل گُردے کی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ آج کل شاعروں میں تو عموماً وہ لوگ آتے ہیں جو بیگم سے جھگڑا کر کے نکلے ہوں یا جنھیں سنیما کی ٹکٹ نہ ملی ہو۔ یا پھر گاڑی چھوٹ گئی ہو۔

لیکن آج بات دوسری تھی۔ یہاں تو مُنّے میاں لکھنوی کے نام کا ڈنکا تھا جو گھر گھر بج چکا تھا۔ لہٰذا مشاعرہ شروع ہونے سے پہلے ہی ہال میں تِل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی۔ لوگ لکھنوی شاعر کو سننے کے لئے میلوں پیدل چل کر آئے تھے۔ سب سے پہلے نئے شاعر میدان میں اُترے۔ اور وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال چکے اور سامعین کے برداشت کی حد ہوگئی تو ہم نے مُنّے میاں کو میدان میں جھونک دیا۔

اب مُنّے میاں نے پان کی گلوریوں کو تھوکا۔ ہونٹوں سے ٹپکتی ہوئی کتھئی رال کو پونچھا۔ خشخشی خضابی داڑھی پر ہاتھ پھیرا کہ کہیں کوئی تنکا نہ اٹکا ہوا ہو۔ پھر مصنوعی کھانسی کھانسنے کے بعد فرمانے لگے۔

ہم راز و —— ہم درد و —— ہم دمو —— ہم سخنو۔ عرض کیا ہے۔

سننے والو تمہیں پتہ کیا ہے
ہم سے پوچھو مشاعرہ کیا ہے
پیٹ میں درد بھی ہے گڑبڑ بھی
آخر اس مرض کی دوا کیا ہے

مُنّے میاں گڑبڑ والا شعر دہرا ہی رہے تھے کہ ہال میں گڑبڑ مچ گئی ۔ اور واہ واہ کی جگہ ہاہا کی صدائیں گونجنے لگیں ۔ اس پر حضرت نے یہ شعر داغا۔

نہ شکٹ ہے کوئی نہ ٹیکس یہاں
شعر سُننے میں پھر بُرا کیا ہے

اتنے میں ہال کے ایک کونے سے کسی نے ہانک لگائی۔

مُنّے میاں تمہیں ہوا کیا ہے
تُونے یہ شعر بھی چرایا ہے

ادھر ہمارے مُنّے میاں بھی سخت جان واقع ہوئے تھے ۔اس چھوٹے موٹے جملے پر کہاں ہتھیار ڈالنے والے تھے ۔ اب کے اُنھوں نے یہ درا جمایا۔

مجھ سے پوچھو کہ ماجرا کیا ہے
بحر غالب کی شعر میرا ہے

تبھی ہال سے کسی تک باز نے کہا :

لوگ ہوشیار ہیں ریاضی میں
مُنّے میاں تمہیں ہوا کیا ہے

اِدھر مُنّے میاں کے شعر خیراتی دواخانے کی دوائی کی طرح ایک ایک کر کے بے اثر ثابت ہو رہے تھے ۔ اور دوسری جانب سامعین سے تکرار کرتے کرتے اپنی پوری غزل بھول چکے تھے۔ اِس لئے اب اُنہوں نے پچھلے شعر ہی دہرانے شروع کر دیئے۔

پیٹ میں درد بھی ہے گڑ بڑ بھی
آخر اِس مرض کی دوا کیا ہے

اب کے ہال میں وہ گڑبڑ مچی کہ تو بہ ہی بھلی۔ شریف لوگوں نے واپس جانا شروع کر دیا اور منچلوں نے محاذ جالیا۔ اور ہال کے ایک کونے میں کھڑے لڑکوں کے ایک گروہ نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔

مُنّے میاں تمہیں ہوا کیا ہے
تونے سب کا دماغ کھایا ہے

بس اب تک بازوں کی بن آئی تھی وہ سامعین کی طرف سے شعر پر شعر داغے جا رہے تھے اور اسٹیج پر بیٹھے شاعر بغلیں جھانک رہے تھے ۔ اِدھر مُنّے میاں اپنی آخری کوشش بھی کر چکے تھے۔ اب وہ بے پیندے کے لوٹے کی طرح ڈول رہے تھے ۔ اُن کی گھگھی بندھ چکی تھی ۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ چکے تھے ۔ اور گلے سے طوطوں کی آوازیں نکل رہی تھیں ۔ ہال میں ہوٹنگ پر ہوٹنگ ہو رہی تھی ۔ مُنّے میاں پر پھبتیاں کسی جا رہی تھیں اور ہم پر کچھ اچھا جا رہا تھا ۔ ہم نے سامعین سے لاکھ التجائیں کیں۔ لیکن نگار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے ۔ ہم بول ہی رہے تھے کہ ایک شرارتی نے شائیں کرتی ہوئی چپل ہماری طرف پھینکی ۔ بس پھر کیا تھا ۔ آلوؤں، انڈوں اور ٹماٹروں کی بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اسٹیج

سبزی منڈی کی صورت اختیار کر گیا۔ سارا معاملہ فری اسٹائل میں چل نکلا تھا۔ وہ بھگدڑ مچی کہ دوسری جنگ
یلم کی یاد تازہ ہو گئی۔ جھنڈوں کے ساتھ کچھ بھی اکھڑ گئے۔ یعنی سامعین کے ساتھ ساتھ شاعر بھی دُم دبا کر بھاگ نکلے تھے
میدانِ شعر، پانی پت کے میدان کی طرح پامال ہو چکا تھا۔ اب ہال میں صرف منّے میاں اور ہم رہ گئے تھے۔ منّے
یاں نے پہلے ہماری طرف دیکھا پھر اسٹیج پر پڑے آلوؤں، انڈوں اور ٹماٹروں کی طرف نظر دوڑائی۔ پھر تھوڑا سا سنبھلتے
ہوئے بولے۔

"میاں یہ تو اُردو کا درد ہے جو خاموش بیٹھے ہیں ورنہ اگر لکھنؤ ہوتا تو .... خیر چھوڑو اس بات کو
تو ادب نواز لگتے ہو۔ ہم دوسری غزل سناتے ہیں ــــ عرض کیا ہے۔"

اس پر ہمیں بہت غصہ آیا اور ہم نے باآوازِ بلند کہا ـ "قبلہ عرض کرنے سے پہلے ہماری عرض سُن لیجئے۔ اور
ین کرنا ترک کر دیجئے۔ اس طرح آپ اُردو ادب کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔ یہ سنتے ہی حضرت منّے میاں نے بہت
دُکھایا۔ اور رال ٹپکاتے اور بڑبڑاتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے۔

ــــ آخر میں مرزا جابر علی تنگے والا کا قصہ بھی سُن لیں ـ ان حضرت کا دعویٰ تھا کہ وہ ہمارے باپ دادا کو تب
سے جانتے ہیں جب سے کہ ہم نے ابھی آنکھ بھی نہیں کھولی تھی۔ انہیں ہماری سات پشتوں کا شجرۂ نسب ٹھیک اُسی طرح
یاد تھا جس طرح پانچویں کے طالب علم کو دونے کا پہاڑہ یاد ہوتا ہے۔ مرزا صاحب کا یہ بھی ارشاد ہے کہ انہیں ہمارے والد
محترم کے ساتھ باغوں سے آم چرانے اور حسین لڑکیوں (اپنے وقت کی) سے جوتے کھانے کی سعادت بھی نصیب تھی۔ لیکن عجیب
اتفاق یہ تھا کہ ہم نے مرزا صاحب کو پہلی بار اُس وقت دیکھا تھا جب پچھلے دنوں ہمارا ایک دوست ایک سفارش کے سلسلے
میں انہیں ہمارے پاس لایا تھا۔

بس وہ دن اور یہ دن حضرت ہمارے یہاں مہینے میں دو چار بار بے موسمی بارش کی طرح ٹپک پڑتے ہیں۔
ان کی خاصیت یہ ہے کہ باتیں گھڑنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ بات بات میں ایسی شکر گھول دیتے تھے کہ طبیعت صاف
ہو جاتی تھی۔ بس ایک ہی مصیبت تھی کہ کھانے میں اُن کا اسٹینڈرڈ ذرا اونچا تھا۔ وہ ہمیشہ فرمایا کرتے تھے۔

"ــــ بھائی کبھی ہمارے ہاں آؤ تو بتاؤں کہ کھانا کیا ہوتا ہے۔ تمہاری چچی کا پکایا ہوا روغن جوش، گشتابہ اور بھُنی ہوئی
مچھلی کھاتے کھاتے انگلیاں تک کھا جانے کو جی چاہتا ہے۔ اور میاں! جس روز گھر میں گوشت نہیں پکتا۔ ہم کھانا نہیں کھاتے
وہ دعوت ہی کیا ہوئی جس میں بریانی اور میٹھے کوفتے شامل نہ ہوں۔"

تو جناب اس طرح ہر بار ہمیں اپنی ساکھ بچانی پڑتی اور بریانی اور میٹھے کوفتوں سے مرزا صاحب کی خاطر کرنی پڑتی۔
خاطر کرتے بھی کیوں نہ حضرت ہمارے والدِ محترم کے لنگوٹیا جو ٹھہرے۔

پچھلے دنوں ایک دفتری کام کے سلسلے میں اچانک ہمیں مرزا صاحب کے گاؤں جانا پڑا تو ہم نے سوچا کہ ایک پنتھ دو
کاج والی بات ہو جائے گی۔ یعنی ایک تو دفتر کا کام کرتے آئیں گے اور مرزا صاحب کے ہاں دعوت کھاتے آئیں گے۔ جانے سے چند
دن پہلے ہم نے مرزا صاحب کو چٹھی لکھ کر اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا اور چلتے وقت تار بھی ارسال کر دی تاکہ اسٹیشن پر ہی مرزا صاحب
سے ملاقات ہو جائے۔ شام ڈھلتے ڈھلتے ہماری گاڑی مرزا صاحب کے گاؤں جا پہنچی۔ ہم نے اسٹیشن پر خوب آگے پیچھے جھانکا۔
لیکن مرزا صاحب نظر نہ آئے۔ آخر ان کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہوئے۔ جس حویلی کا انہوں نے پتہ دیا تھا ہم نے تانگہ رکوا کر سامان

اُترو الیا۔ پھر سامنے کھڑے ایک آدمی سے دریافت کیا۔
" بھیا صاحب مرزا جابر علی تنگے والا کی حویلی یہی ہے۔" اس پر اس آدمی نے پہلے تو ہمیں دیکھا۔ پھر ہمارے سامان کو دیکھا پھر کچھ مسکرائے اور حویلی کی بائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
" حضرت وہ رہی مرزا جابر علی تنگے والا کی کھولی۔" ہم نے اس طرف جو نظر دوڑائی تو ہمیں ایک کھولی نظر آئی جس کے آنگن میں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بیٹھے مرزا صاحب حقے کے پھکا پھک کش لگا رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی اور پاس جا کر چھوٹتے ہی ہم نے کہا۔
" کمال کر دیا مرزا صاحب! ہم اسٹیشن پر آپ کا انتظار کرتے رہے۔ اور آپ یہاں حقے پر دم مار رہے ہیں۔"
اس پر انہوں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔
" تم کون ہو بھائی۔"
" ہم زاہد ہیں چاچا جان۔ جن کے ہاں آپ شہر میں ٹھہرا کرتے ہیں۔ پہچانا نہیں ــ!"
" میاں آج ہمارا چشمہ ٹوٹ گیا ہے۔ اس پر شام کا دھندلکا کچھ ایسا ہے کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لئے کل دن کو تشریف لائیے گا۔" وہ بڑے آرام سے بولے۔
" چاچا جان ہمارے یہاں تو آپ ہماری سات پشتوں کی خبر رکھتے تھے اور یہاں ہمیں ہی پہچاننے سے کترا رہے ہیں۔ اور دیکھتے ہی نظریں پھیر لیں۔"
"ــ نظریں پھیری نہیں برخوردار بلکہ نظر کچھ آتا نہیں ہے۔ اور جب تک ہم تمہیں دیکھ نہ لیں کیسے اندر گھسنے دیں۔ کیا پتہ زاہد کے بدلے کوئی چور، ڈاکو اندر گھس آئے۔ کل آئیے گا تب تک ہم اپنا چشمہ ٹھیک کرالیں گے۔"
"ــ چچا جان اس پرائے دیس میں اتنی رات گئے ہم کہاں جائیں گے کچھ تو خیال کریں۔ ہماری شکل نہیں پہچانتے تو کم از کم ہماری آواز ہی پہچان لیں۔" ہم روہانسے ہو کر بولے۔
" جاؤ! جاؤ! میاں دق نہ کرو۔ ہم خاک پہچانیں تمہاری آواز اس میں تو بلغم اور نزلے کی ملاوٹ لگ رہی ہے۔ پہلے اپنے گلے کا علاج کراؤ۔ پھر آنا ہمارے پاس۔ سیدھی طرح راستہ ناپو ورنہ ہم ابھی اپنے کتے کھول دیتے ہیں۔" کہتے ہوئے وہ اپنے کتوں کی طرف لپکے۔ اور ہم اپنے سامان کی طرف۔ پھر سر پر پاؤں رکھ کر اندھیری رات میں وہ بھاگے کہ صاحب آج تک سانس پھولی ہوئی ہے۔

رقیبوں نے فیصلہ کیا۔ کسی اجنبی شہر میں جا کے ڈوئیل لڑا جائے جہاں کوئی انہیں جانتا نہ ہو
ایک نے آنے جانے کا ٹکٹ خریدا لیکن دوسرے نے صرف یک طرفہ ٹکٹ لیا ــ
" ٹھیک ہے" پہلے نے استہزائیہ انداز میں کہا " تو تمہیں یقین ہے کہ واپس نہیں لوٹو گے!"
" جی نہیں ــ میں آپ کے ٹکٹ پر واپس آؤں گا۔"

اشرف مالوی
(لکھنؤ)

محقق کے انتقال پر

اس سے پہلے میں بکوں اپنی طرف سے اول فول
عرض کر دوں پیش بندی کے لئے دلچسپ قول

گر بزرگوں پر کسی کا کوئی بھی احسان ہو
جب ملے موقع چکا دے، چاہیے اولاد ہو

لکھ رہا ہوں میں بزرگوں کے انیس حسن کا حال
تھے جو ناقد باشعور اور اک محقق باکمال

زندہ فنکاروں سے تھی حضرت کو ازلی دشمنی
شغل [illegible] کا مردہ فنکار اور خصوصاً شاعری

چلتی رہتی تھی کدال اُن کی سدا تحقیق کی
جب بھی مر جاتا کوئی شاعر انھیں ہوتی خوشی

کیونکہ یہ اُن کے لئے تشہیر کا سامان ہوا
نام چھپنے اور اُجرت کا بھی کچھ امکان ہوا

چارپائی بھی واپس آئی قبرستان سے
اک رسالے میں چھپا زریں مقالہ شان سے

جیسے تھا تیار پہلے سے مقالہ شاندار
تھا فقط موصوف کے مرنے کا ان کو انتظار

یوں لکھا کہ وہ فرشتوں سے زیادہ پاک تھے
جنگِ آزادی کے ہیرو تھے، نڈر بے باک تھے

داغ کے شاگرد تھے اور ذوق کے اُستاد تھے
میر سے تھی اُن کی چشمک، خانماں برباد تھے

حضرتِ غالب دکھاتے تھے انھیں اپنا کلام
اور گھوڑی سے اتر کر سودا کرتے تھے سلام

جانشینِ جوش میں کرتے تھے سب ان کا شمار
متنی شاگرد ہو چکے کم سے کم چھتیس ہزار

طرز کے اپنی وہ موجد اور خاتم بھی رہے
ہوتے اکبر کے چچا کرتی وفا گر زندگی

درد کے اشعار چپکائے ہیں ان کے نام سے
کام یوں لیتے رہے اپنے خیالِ خام سے

جتنی باتیں کچھ نہ کچھ اس میں نظر آیا تضاد
جو فقط اٹکل کا عادی ہو اسے کیا ہوگا یاد

زندگی بھر چاہے اس کی شکل بھی دیکھی نہ ہو
پھر بھی جگری دوست تھا آپ نے مرحوم کو

الغرض اس طرح سے ادبی ستم ہوتا رہا
مرنے والوں پر ہی الطاف و کرم ہوتا رہا

خیر صاحب ہو گیا دنیا سے اُن کا انتقال
اُن کی شخصیت پہ کچھ کہنا ہے اک ٹیڑھا سوال

اُن کے فن پر اب کوئی زندہ لکھے تو کیا لکھے
ہے تقاضہ اب یہی انصاف کا، مردہ لکھے

کوئی زندہ ملتفت اُن کی طرف ہوتا نہیں
اور کسی مردے نے اب تک اُن پہ کچھ لکھا نہیں

آج انھیں شرمندہ ہونا چاہیئے زیرِ مزار
کیوں نہ دنیا میں روش کی تھی کچھ ایسی اختیار

جس سے خوش ہوتے ہمیشہ حاضر و غائب سبھی
کیوں نہ کچھ گمنام فنکاروں کو شہرت بخش دی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہرگز نہ تھا پہلوئے ذم
زندہ گمناموں کی خاطر ان کا گر چلتا قلم

یہ کوئی قانونِ قدرت ہے جو ٹل سکتا نہیں
کیا محقق کا قلم زندہ پہ چل سکتا نہیں

اشرف اُن کا کچھ بزرگوں پہ غلط احسان ہے
اس لئے یہ نظم اُن کی ذات پہ قربان ہے

کرنل محمد خان

انگلستان: شہر اچھے کہ بن؟

موچ کی پرورش لازم ہے

دوسرے دن چسٹر سے فارغ ہوکر لندن کو لوٹے تو اسٹیشن پر گولڈہل کو انتظار کرتا پایا۔ وہی مامتا کا مارا، پیدائشی بے چین چہرہ۔ ہمیں دیکھتے ہی بولا۔

"گڈ آفٹر نون، کرنل خان۔ اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔"

ہمیں شرارت سوجھی کہ چلو اسے تھوڑا اور بے چین کریں۔ کہا،

"مسٹر گولڈہل یوں تو خیریت ہے، ذرا پاؤں میں موچ آگئی ہے۔"

"اوہو، ہوہوہو ـــــــ یہ تو غضب ہوگیا۔ ٹھہریئے۔ ہلیئے مت، میں اسٹیشن ماسٹر سے بیساکھیاں لے آتا ہوں۔" اور وہ بیساکھیاں لینے چل پڑا۔

"بیساکھیاں! خدایا،" ہم نے دل میں کہا۔ "بیساکھیوں سے تو ایک بے موچ اناڑی کو حقیقی موچ بھی آسکتی ہے۔" ہم چلائے۔

"گولڈہل، ٹھہرو۔ میں مذاق کر رہا تھا، دیکھو، میں دوڑ سکتا ہوں۔"

گولڈہل ہمیں دوڑتا دیکھ کر بھاگا بھاگا آیا اور ہمارے بازو کے نیچے اپنا کندھا دے کر ہمیں ٹیکسی تک لے گیا۔ جب بٹھا چکا تو بولا: "اب ہلیئے مت۔ موچ کی پرورش نہ کی جائے تو پیچیدگیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔"

ہماری موچ اپنی پیچیدگیاں پیدا کرچکی تھی! آخر ہوٹل پہنچے۔ گولڈہل نے رخصت ہونے سے پہلے مکمل آرام اور اسپرین کے فوائد بیان کئے اور پھر ہمیں بس پارس کا ایک لفافہ دیا۔ ساتھ ہی وضاحت فرمائی۔

"اس میں آپ کا اگلا پروگرام ہے ۔ کل اتوار ہے آپ چھٹی منائیے ۔ پرسوں صبح آپ کو یہیں ملوں گا۔"
اندر جاکر مس پارس کا محبت نامہ کھولا ۔ لب لباب یہ تھا ۔
"آپ نے دو فوجی لائبریریاں دیکھ لیں ۔ کیا آپ کو پسند آئیں ؟ یقیناً آئی ہوں گی ۔ اب ہم آپ کو دو کاؤنٹی لائبریریاں دکھائیں گے اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو ہماری کاؤنٹیوں سے عشق ہونے لگے گا ۔ اگلا ہفتہ آپ کینٹ میں گزاریں گے اور اس سے اگلا ولٹ شائر میں۔ آپ کا مفصل پروگرام کاؤنٹیاں تیار کریں گی ۔ ولٹ شائر سے واپسی پر آپ کی ملاقات کی اور آپ کے تاثرات سننے کی متمنی ــــــ این پارس۔"

مینارِ لندن : ارے چمگادڑیں کیا ہوئیں ؟

سوچا یہ عجیب شوق ہے کہ فوراً ملنے کی بجائے چودہ روز کے مزید فراق کا حکم صادر کر دیا ہے اور وہ بھی لندن میں رکھتے ہی ۔ خیر یہ کوئی نئی چیز نہ تھی ۔ الثم سے واپسی پر بھی ہمارے ساتھ یہی سلوک ہوا تھا ۔ بُتِ فرنگ سے پروگرام سے ہٹ کر وصال کی توقع عبث تھی ۔ بہرحال اگلا سفر اتنا گراں نہ تھا کیوں کہ ایک اتوار درمیان تھا اور یہ اتوار لندن میں ہم نے یوں گزارا جس طرح ٹھیٹ دیہاتی لاہور میں آ کر پہلا دن گزارتے ہیں ۔ وہ یوں گزارتے ہیں کہ شاہی مسجد کے مینار سے لاہور کی چھتیں دیکھتے ہیں، عجائب گھر میں کتبوں، کتابوں، برتنوں اور ہتھیاروں کے ناقابلِ استعمال ذخیروں پر حیران ہوجاتے ہیں ۔ چڑیا گھر میں بندروں اور بن مانسوں سے علیک سلیک کرتے، شالامار میں جاکر لسی یا فالودہ پی کر کسی پیڑ کے نیچے لیٹ جاتے ہیں اور پھر دن ڈھلے سینما میں بیٹھ کر گاؤں کی راہ لیتے ہیں اور اہلِ دہ کو چوپال میں چشم دید شہادت بہم پہنچاتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے۔

ہم بھی ناشتہ کر کے پہلی بس میں بیٹھ گئے ۔ جس نے ہمیں پوسٹ آفس کے مینار کے قریب جا اتارا ۔ ہم نے مینار کے چوکیداروں سے اوپر جانے کا ٹکٹ لیا اور دوسرے زائرین کے ساتھ جن میں اکثریت زائرات کی تھی ، لفٹ میں کھڑے ہو گئے اور کسی بٹن کے دب جانے سے شوشے فلک اٹھنے لگے ، لیکن یہ اٹھنا نہ اٹھنے کے برابر تھا ۔ ہم کہ شاہی مسجد کے میناروں کے خوگر تھے توقع رکھتے تھے کہ اوپر جاتے ہوئے سیڑھیاں ہوں گی اور سیڑھیاں گنیں گے ۔ پھر ایک جگہ دم پھولے گا اور دم لیں گے ۔ ایک جگہ چمگادڑیں اڑیں گی اور ہوش اڑیں گے ۔ کہیں گھپ اندھیرا ہوگا ۔ کہیں روشنی کا روزن آئے گا اور آخری جست لگا کر مینار کی چوٹی پر جا پہنچیں گے ۔ پھر اگر لندن کا کوئی شاہدرہ ہوا یا چوبرجی ہوئی تو اسے سیاحانہ اور طائرانہ نظروں سے دیکھیں گے اور واپس گاؤں جا کر قصہ بیان کریں گے کہ لندن لندن ہے ۔ لیکن اے اہلِ دہ ، لندن کے مینار کا کوئی قصہ بیان کے قابل ہی نہیں ۔ ہماری راہ میں کوئی زینہ آئی نہ کسی چمگادڑ ہی نے راستہ کاٹا ۔ ہمارے چاروں طرف ہلکی پھلکی گوری گلابی میمیں تھیں یا لفٹ کی بے روزن مگر روشن دیواریں جن کے بٹن دبانے سے جملہ حاجتیں پوری ہو جاتی تھیں ۔ ایک بٹن دبایا اور افلاک سے نالوں کا جواب آ گیا کہ یہیں آ جائیے

---

[1] ، COUNTY ، انگلستان کاؤنٹیوں میں منقسم ہے ، ہر کاؤنٹی کی اپنی انتظامیہ ہے جو جملہ شعبہ جات تعلیم ، تعمیر ، زراعت ، کتب خانوں وغیرہ کی ذمہ دار ہے ۔

ریستوراں پہنچ گئے۔ وہاں لندن کا نظارا تو تھا ہی، ایک گھومتا ہوا ریستوران بھی تھا۔ یہ انگریز کی چالاکی تھی۔ تفریح کے بہانے بھی سے تجارت کر لینا شرفا کا دستور نہیں لیکن۔

طرفِ عالی معاندوں میں کہاں سب دکاندار ہیں ذلیل ہیں سب

ہم لوگ شاہی مسجد کے دروازے پر زیادہ سے زیادہ آلو چھولے کی چھابڑی لگا لیتے ہیں۔ لیکن اتنے بڑے پیمانے پر ریستوران چلانا نہیں شروع کر دیتے کہ زائرین اشتعال میں آکر نہ کھاتے بھی کھائیں۔ ہم نے غور سے دیکھا تو بلوری پلاؤں والے ریستوراں کی ہر گھومتی میز دامنِ دل کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی اور کہہ جاتی تھی کہ جا اینجا است۔ ہم آخر انسان تھے، ان کی باتوں میں آگئے اور کچھ کچھ ریستوران کے دروازے پر جا پہنچے لیکن دربان نے روک کر ٹکٹ کا مطالبہ کیا۔ ہم نے کہا "ہم نقد ادا کریں گے۔"

بولا: "معاف کرنا۔ داخلے سے پہلے سیٹ ریزرو کرانا ضروری ہے اور اگلے سات دن کے لئے سب سیٹیں ریزرو ہیں۔"

ہمیں اچانک یاد آیا کہ انگریزوں کا کھانا پھیکا ہوتا ہے۔ چنانچہ سلسلۂ کلام منقطع کر دیا اور ریستوراں پر لات مار کر تیزی سے مینار سے اترے اور شفیع کے ریستوراں کی راہ لی جہاں ایک گلاس یخنی، دو روغنی پراٹھے، تین نرگسی کوفتے اور ایک درجن شاہی ٹکڑے کھا کر اور سبز چائے کی چینک پی کر انگریزوں سے بھرپور انتقام لیا۔ انتقام کے بعد بے شک ہم چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ لیکن اصل چیز انتقام ہے۔ چل پھر تو مال مویشی بھی سکتے ہیں۔ بہرحال جس وقت ہم کرسی سے اٹھنے کے قابل ہو گئے اٹھے اور انگریزی کے یکے یعنی بس پر بیٹھ کر اپنے ہوٹل کو سدھارے جہاں باقی دن اور پوری رات کے لئے سو گئے۔

صبح سفر کے لئے تیار ہو کر کمرے سے نیچے لونج میں آئے تو حسبِ توقع گولڈ بل کو مامتائی مسکراہٹ کے ساتھ منتظر پایا۔ معلوم ہوتا تھا ہمیں دیکھ کر ابھی کہہ دے گا۔ "کیا چاند سا مکھڑا نکل آیا۔" لیکن ہم نے گولڈ بل کو بولنے کا موقع نہ دیا اور چھوٹتے ہی کہا۔

"ہیلو مسٹر گولڈ بل۔ ہماری موچ بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔"

بولا۔ "خوب، لیکن ابھی کچھ روز اور ٹکور جاری رکھیں۔"

گویا دوسرے لفظوں میں گولڈ بل تاکید کر رہا تھا کہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر۔

ہم نے ایک بھرپور لمحے کے لئے اس ازلی فکرمند کو دیکھا اور مسکرا دیئے۔

بولا۔ "آپ کو معلوم ہے آج ۱ بجے آپ کینٹ کے صدر شہر میڈسٹون جا رہے ہیں؟"

جواب دیا۔ "مس پارس کے خط سے کچھ اندازہ تو ہے۔"

"تو ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں، چلئے آپ کو گاڑی میں بٹھا آؤں۔"

"مسٹر گولڈ بل" ہمیں گاڑی میں بیٹھنا آتا ہے۔ آج آپ چھٹی منا لیں تو اچھا نہ ہو گا؟"

گولڈ بل نے اس غیر ضروری سوال کا جواب بھی غیر ضروری سمجھا اور سوٹ کیس اٹھا کر باہر ٹیکسی کی طرف چل پڑا۔ قصہ کوتاہ اسٹیشن پہنچنے کے بعد جب تک ہماری گاڑی نے حرکت نہ کی، گولڈ بل ہمارے ڈبے کے سامنے کھڑا نگرانی کرتا رہا۔ شاید اس خیال سے کہ کہیں ہم آخری منٹ میں بھی صحیح گاڑی سے نکل کر غلط گاڑی میں نہ جا بیٹھیں ________ احساس فرض اچھی چیز ہے لیکن اعتدال کے ساتھ۔ اعتدال سے ذرا ہی آگے اختلال کی حد شروع ہوتی ہے اور گولڈ بل یہ حد عبور کر کے مستقل طور پر دوسری طرف قیام پذیر تھا۔

کینٹ کاؤنٹی کے حُسن کا راز کیا ہے؟

آخر گاڑی لندن سے نکلی۔ لندن بڑا ہے، لندن اُونچا ہے اور لندن بارونق بھی ہے لیکن لندن توخوبصورت نہیں
ن سکون بخش تو کسی طور نہیں۔ چنانچہ لندن کے دھُوئیں آلودہ مضافات سے نکل کر بتدریج کھلی فضا میں پہنچے تو اعصاب کو
یب ریشمی سے لمس کا احساس ہوا اور یہ محض شہر سے دوری کا نتیجہ نہ تھا بلکہ بَن سے قربت کا! شہر سے باہر کا انگلستان از بس حسین ہے اور
، کاؤنٹی تو باقی کاؤنٹیوں میں ملکۂ حُسن سمجھی جاتی ہے ——— اور اگر نہیں بھی تو ہم نے اُس کے سر پہ اخلاقی تاج رکھ دیا
— ارضِ کینٹ کے کسی حصے میں بھی بے رنگ چپٹا پن نہیں بلکہ اس کے سینے پر سبز ساٹن میں لپٹے ہوئے بڑے دلربا نشیب و
ہیں اور یہی نشیب و فراز اُس کے حُسن بے پرواکا راز ہیں۔ چپٹی شئے مکروہ نہ سہی، حسین نہیں ہو سکتی ——— حُسن گولائیوں میں ہے
ں میں ہے، محرابوں میں ہے، مرغولوں میں ہے۔ الغرض جو شئے رُخِ یار یا سینۂ دلبر سے دور کی مشابہت بھی رکھتی ہو، حُسن سے خالی
ہو سکتی۔ کسی چوڑی، چپٹی، سیدھی سپاٹ چیز میں حُسن ڈھونڈنا صحرا میں باغبانی کرنا ہے۔ قدم نے کیا پتے کی بات کہی ہے۔

میں سیدھی لکیروں کی کیا داد دوں جو خط دلربا ہے وہ خمدار ہے

اور اب سوچتا ہوں کہ جب ہمارے یار آغا کو ایک روز کوکا کولا کی بوتل دیکھ کر غش آگیا تھا تو کس قدر
بجانب غش تھا۔

گاڑی میڈسٹون کے اسٹیشن پہنچی تو ایک ادھیڑ عمر کا کسی قدر گبا پتلا انگریز ——— جو گھسائی پٹائی کے
تھا اور کُبڑا ابھی تھا ——— ہمارے استقبال کو آیا۔ تعارف پر پتہ چلا کہ آپ کاؤنٹی لائبریری کے اسسٹنٹ لائبریرین
ہمارا استقبال خاصا شیر گرم سا تھا۔ لیکن اس لئے نہیں کہ ہمارے میزبان نے کچھ گرمائش ہم سے دانستہ بچا کر رکھی تھی بلکہ موصوف
جلد حرارتِ عزیزی کی مقدار ہی اسی قدر تھی۔ لائبریری میں کام کر کر کے، کر کر کے لائبریری کے باہر کے کسی کام کے نہیں رہے تھے۔
وم ہوتا تھا کہ ان کے OVER WORK (کثرتِ کار) نے جو اثر آن کے سر کے باہر کیا تھا، وہی عمل سر کے اندر بھی کیا تھا۔
ی بے چارے دھڑ فرسکنے تھے۔ ایسی نیم حالت میں اُن سے کسی پُر جوش استقبال کی توقع زیادتی تھی۔ چنانچہ ان کا اپنی گاڑی کو
ہانک کے جنیسر لائبریری تک لے جانا اور ہمیں اپنے باس تک پہنچا دینا ہی بڑا کمال تھا۔ جس کا ہم نے شکریے کے ساتھ اعتراف کیا

ٹروین کے مزاج بخیر نہیں

باس صاحب کا نام ٹروین تھا۔ فرینک ٹروین۔ انگریز میں نجانے خوبی ہے کہ اجنبی کے ساتھ مہر و محبت کے ساتھ پیش
تکلیے اور خاصے خلوص کے ساتھ۔ لیکن اگر کسی وجہ سے خلوص پیدا نہ بھی کر سکے تو اتنی منافقت ضرور پیدا کر لیتا ہے کہ بظاہر
ہربان اور متواضع نظر آئے۔ ٹروین صاحب نے بھی کوشش تو کی مگر قدرا اناڑی منافق نکلے۔ یعنی منافقت کی مگر چھپا نہ سکے۔

ہم سے معانقہ کرتے ہوئے بولے،
"ہیلو کرنل خان۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"
لیکن ساتھ ہی آپ کے چہرے پر کرب کی کچھ ایسی علامتیں نمودار ہوئیں جیسے چرائتے کا گھونٹ پی لیا ہو۔ ہم نے کہا:
"وہ تو ظاہر ہی ہے۔ آپ کے مزاج تو بخیر ہیں؟"
"مزاج بھی کوئی خاص بخیر نہیں۔"
سوچا، ٹرومین کی بدتمیزی کا جواب ناراضگی سے نہیں دینا چاہیئے۔ ذرا اُس کے مزاج کی دُم مروڑنا چاہیئے۔
چنانچہ سلسلۂ کلام جاری رکھا:
"اللہ رحم کرے۔ یہ عارضہ آپ کو اکثر ہو جاتا ہے۔؟"
"نہیں، آج صبح ہی ہوا ہے، ابھی ابھی۔"
"تو یقیناً یہ صبح کا قصور ہے۔ میرا اپنا مزاج صبح سے کچھ برہم ہے۔"
"برہم ــــــ؟ کیا وجہ؟"
"اگر آپ کو وجہ بتائی تو آپ یقین نہیں کریں گے۔"
"بتا کر تو دیکھیں۔"
"وجہ یہ ہے کہ آج صبح کسی منحوس کا مُنہ دیکھا ہے۔"
فرینک ٹرومین نے ایک لمحے کے لیے ہمارے جواب پر غور کیا۔ ذرا مسکرایا اور پھر ہمیں کرسی پیش کرتے ہوئے بولا۔
"براہِ کرم تشریف رکھیئے، کافی پیا جائے؟ اور ہاں مجھے فرینک کہہ کر پکاریئے۔"
ہم نے کہا: "کافی پلیز، فرینک!"
ــــــ اور فرینک اور ہم ایک دوستانہ ہنسی ہنس دیئے۔ ظاہر ہے کہ ابتدائی علیک سلیک پر ہماری باہمی دوستی کے امکانات اتنے روشن نہ تھے۔ جتنے بعد میں ثابت ہوئے لیکن جیسا کہ تجربہ کار سیاستدان کہا کرتے ہیں، ذاتی تبادلۂ خیالات سے بڑے بڑے مسائل کا حل نکل آتا ہے۔ چنانچہ اِس مختصر سی گفتگو کے بعد مسٹر ٹرومین اور ہمارے تعلقات میں ایک عجیب خوشگواری آگئی۔
کافی کے دوران ٹرومین نے اپنی کاونٹی کے نظام لائبریری کی مدح میں لیکچر دینا شروع کیا۔
"یہ بارہ منزلہ عمارت جس کی تیسری منزل پر ہم بیٹھے کافی پی رہے ہیں، کینٹ کاونٹی کی مرکزی یا مادر لائبریری ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے تمام قصبوں اور دیہات میں ذیلی لائبریریاں ہیں اور بہت چھوٹے یعنی دو دو چار چار گھروں والے دیہات کے لئے سفری لائبریریاں ہیں۔ چنانچہ ساری کاونٹی میں کوئی ایسا باشندہ نہیں جو لائبریری سے یا جس سے لائبریری چند قدم سے زیادہ فاصلے پر ہو اور نہ کوئی ایسا باشندہ ہے جو کسی کتاب کی خواہش کرے اور اسے مہیا نہ کی جا سکے خواہ وہ کتاب لندن سے لانا پڑے، لاہور سے یا قاہرہ سے۔ اس کے علاوہ ......"
ٹرومین کا لیکچر ہم خاموشی سے سنتے رہے لیکن دل نہ مانا۔ آخر ہمارے ملک میں بھی ضلعے ہیں اور ضلعوں میں قصبے اور

دیہات ہیں۔ مثلاً ہمارا اپنا گاؤں بل کسر ضلع جہلم کا ایک معتبر گاؤں ہے اور بابا گاما وہاں کا ایک معزز باشندہ ہے۔ لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ بابا گاما اُستاد امام دین کی بانگ دہل مانگے اور لاہور اور لاسہ تو مجھ بھی، ہمارے صاحب ضلع گجرات سے یعنی دریا پار ہی سے یہ فرمائش پوری کردیں؟ مشکل ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ تحصیلدار کو حکم دیں گے۔ تحصیلدار پٹواری کو کہہ دے گا اور پٹواری بابا دلبر سے رشوت لے کر بانگِ دہل کی جگہ اسے بانگِ درا پڑھا دے گا۔ اور اصل مال خود ہضم کر جائے گا۔ تو ظاہر ہے کہ جو کام ضلع جہلم نہیں کر سکتا، وہ اس کی انگریز بہن کینٹ کاؤنٹی بھی نہیں کر سکتی۔ بلکہ ہمیں شبہ سا ہوا کہ فرینک شرومین داستان گو قسم کا آدمی ہے۔ ہر بات کو پریوں کی کہانی بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہم نے نیم مذاق میں یہ سوال بھی پوچھ لیا:

"فرینک۔ تمہیں پریوں کی کہانیاں سُنانے کا شوق بھی ہے؟"

بولا: "تو تم اسے FAIRY TALE سمجھتے ہو؟ اگر ایسا ہے تو میں خوش ہوں کہ یہ حقیقی پریوں کی کہانی ہے"

"اور اگر میں نہ مانوں تو؟"

"تو میرا فرض ہے کہ تمہیں منواؤں اور منوانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ تمہیں ان پریوں سے ملوا دوں۔"

پریوں سے ملاقات! ایسے کارِ نیک سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ہم نے کہا:

"ضرور ملوائیے ——— کتنی پریاں ہیں؟"

"تین ہیں، تمہیں کاؤنٹی کونسل کے کیفے ٹیریا میں لنچ پر ملیں گی۔ تم آج ان ہی پریوں کے مہمان ہو۔"

بیتابی میں ہمارے منہ سے نکل گیا: "لنچ کے کے بجے ہوتا ہے؟"

شرومین ذرا مسکرایا اور گھڑی دیکھ کر بولا:

"صرف پندرہ منٹ باقی ہیں۔ کیفے ٹیریا یہاں سے صرف پانچ منٹ کی واک ہے۔ ایک گائیڈ تمہارے ساتھ جائے گا۔

ہم نے سنبھل کر مختصراً کہا: "درست" اور انگریزی زندگی ہمیں پہلی بار بے عیب نظر آئی۔

ادھر شرومین نے اپنا لیکچر جاری رکھا لیکن جس شخص کو پندرہ منٹ کے بعد تین پریوں سے ملنے کی نوید مل چکی ہو اور وہ مسئلہ بین الاقوامی پھوہڑ بھی نہ ہو، اُسے لیکچر سننے کا دماغ نہیں رہتا۔ چنانچہ دس منٹ کے لیکچر کے دوران جہاں تک ہمارا تعلق ہے، تصور عرش پر تھا اور سر تھا پائے ساقی پر اور جوں ہی گیارہواں منٹ شروع ہوا ہم ایک گائیڈ کے ساتھ راہرو کوئے تمنا تھے یعنی پریوں کے میس کو جا رہے تھے۔

(باقی آئندہ)

سریندر سنگھ چوہان
مترجم سالکیا پرشاد

میرے لوئر ڈویژن کلرک ہوجانے کی خبر رشتہ داروں تک پہنچتے ہی پیام مبارک بادی کے ساتھ شادی کے درجنوں رشتے بھی لگے ہاتھ آپہنچے۔ اس ضمن میں ایک صاحب ہمارے ماموں کے ہم زلف کے ساتھ میرے گھر آدھمکے۔ وہ کافی دیر تک اپنی امارت کا ذکر کرتے رہے۔ اس اثنا میں وہ یہ بتلانا بھی نہیں بھولے کہ انھوں نے اپنی پہلی دو لڑکیوں کی شادی میں جہیز میں کیا کیا سامان دیا تھا۔ ان کے گھر میں ٹیلی فون، فرج کے علاوہ دو نوکر بھی ہیں۔ اپنی اس لڑکی کی شادی میں بھی وہ جہیز میں طرح طرح کی چیزوں کے علاوہ بنا مانگے دس ہزار روپے نقد دینے پر تلے ہوئے تھے۔

ماموں صاحب کے ہم زلف بھی کیوں پیچھے رہتے؟ مجھے تنہائی میں لے جاکر لڑکی کے روپ رنگ کا جو دلکش نقشہ کھینچا وہ ناقابل بیان ہے۔ انھوں نے کہا۔ "لڑکی کیا ہے؟ بالکل ہیما مالینی ہے۔ ایک بار دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔ ایک شام تو انھوں نے چائے کے بہانے اپنے گھر بلا کر مجھے اس ہیما مالینی کے درشن بھی کروا دیئے۔ سچ مچ وہ ہیما مالینی جیسی تھی، روپ میں نہ سہی عمر اور صحت میں تو تھی ہی۔ میں ٹھیرا 400 - 260 کی شرح تنخواہ پر چھ سو روپے ماہوار پانے والا ایک کلرک۔ میرا سررشتہ بھی ایسا تھا جہاں نہ رشوت کا آسرا اور نہ بونس کی امید۔ فی الحال بیوی تو کیا کسی کتیا کا خرچ بھی برداشت کرنے کے موقف میں نہیں ہوں جب کہ کتیا کا خرچ بیوی سے کہیں کم ہوتا ہے۔ بیچاری کو نہ پاؤڈر چاہیے نہ پیٹی کوٹ۔

بڑی مشکل سے انھیں سمجھا سکا کہ بندہ اس حسن کی ملکہ کا شوہر ہونے کے قطعی قابل نہیں ہے وہ اگر اس حسینہ کے لیے کسی بہتر بر کی تلاش کریں تو مجھ پر بڑی مہربانی ہوگی۔

بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ اس طرح میں شادی کی قربان گاہ پر شہید ہونے سے بال بال بچ گیا۔
مگر رشتہ داروں کو مجھ سے نجانے کس جنم کی دشمنی نبھانی تھی۔ اس لفڑے سے ابھی بری ہوا ہی تھا کہ پھر سے شادی

رشتے آنے لگے۔ اب تک تو غنیمت یہ تھی کہ شادی کرنے کے لیے مجھ پر اپنے خاندان کے لوگوں کی طرف سے کوئی دباؤ نہیں پڑ رہا تھا مگر اب میرے خلاف چلنے والی اس سازش میں ماں اور دادی بھی شامل ہو گئے۔ انھیں رشتہ داروں نے یہ کہہ کر بہکا دیا۔ جوان لڑکا ہے۔ کل کہیں ادھر ادھر بھٹک گیا تو دنیا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟ آج کل کے لڑکے لڑکیوں کا کیا بھروسہ؟ لڑکیاں ایسی بے لگام گھومتی ہیں کہ اس کے بعد۔۔۔۔

اس کے بعد تو گھر میں شادی کی جھک جھک شروع ہو گئی۔ دادی اپنے پوپلے منہ سے یہی رٹ لگانے لگی "بس ایک بار بہو کا منہ دیکھ لوں پھر چین سے مر سکوں گی۔"

دوسری طرف اپنے شادی شدہ دوستوں کے حالات دیکھ کر شادی کے تعلق سے سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہو رہی۔ شادی سے پہلے جو اچھے خاصے شاعر تھے ان بے چاروں کی شاعری بیوی اور بچوں کی نت نئی فرمائشوں کے درمیان دم توڑ چکی تھی۔ مضمون نگاروں کا لکھنا اور گھومنے پھرنے کے شوقین حضرات کے سیر سپاٹے بند ہو گئے تھے۔ رات بارہ بجے تک کافی ہاؤس کو اپنے قہقہوں سے آباد رکھنے والے یار دوست، شام ڈھلتے ہی پالتو مرغیوں کی طرح اپنے اپنے ڈربوں میں گھس جاتے۔ مزید استفسار کرنے پر ایک بیوی زدہ دوست نے مجھے یہاں تک صلاح دے ڈالی اور کہا ہے جو کچھ کرنا مگر شادی کا خیال خواب میں بھی نہ لانا۔ خون کر کے تو آدمی شاید بچ بھی جائے مگر شادی کر کے نہیں بچ سکتا۔

بڑی الجھن میں تھا۔ ادھر گھر سے شادی کرنے کے لیے روز بروز دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ دادی میری تاریخ پیدائش یاد کر کے انگلیوں پر عمر کا حساب لگاتی اور کہتی ــــ "بائیسواں چل رہا ہے۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تب تمہارے دادا اٹھارہ کے تھے اور میں گیارہ کی۔ سولہویں سال میں پہلا لڑکا ہوا تھا۔ زندہ رہتا تو پچاس سال سے اوپر ہوتا۔ پیدا ہونے کے دوسرے ہی دن اس دنیا سے۔۔۔۔۔"

کہتے کہتے ان کی آنکھیں مرحوم تایا کی یاد میں ڈبڈبا جاتیں۔

اب دادی ماں کو کون سمجھاتا کہ سولہ سال کی نازک عمر میں بچہ پیدا کرنا کوئی بھلا کام نہیں اس سے زچہ و بچہ دونوں کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

ادھر بنا میری رائے جانے مجھے اپنا داماد بنانے کے لیے بے تاب لوگ بڑی مستعدی سے اپنی لڑکیوں کی جنم پتری مع فوٹو ہمارے گھر پہنچا رہے تھے۔ جنم پتریاں ملانے کے لیے پنڈت جی کے حوالے کر دی جاتیں۔ ان کے مطابق کسی لڑکی کے ستارے بھاری پڑتے تو کسی کے مجھ پر۔ ہر جنم پتری سوا پانچ روپے کے حساب سے ان کی اچھی چاندی بن رہی تھی۔ لڑکیوں کے فوٹو میرے چھوٹے بھائی بہنوں کے لیے دل چسپی کا باعث ہوتے۔ فرصت کے اوقات میں ان تصاویر کو بڑے ادب سے دیکھ پرکھ کر ان پر جم کر بحث ہوتی۔ کونسی لڑکی کس قدر خوب صورت ہے۔ کس کے ہونٹ ریکھا جیسے ہیں اور کس کی آنکھیں ہیما مالنی جیسی۔

جس سنجیدگی سے میرے ماں باپ میری شادی کی بات سوچ رہے تھے اسی سنجیدگی سے ملک سوچ رہا تھا۔ اگر ہمارے بزرگوں نے بیوی کی پرورش کی بہ نسبت مرغی کی پرورش اور مچھلی کی پرورش جیسے منفعت بخش دھندوں کی طرف زیادہ دھیان دیا ہوتا تو آج ملک کی اقتصادی حالت اس قدر خستہ نہ ہوتی۔

چند واقف کاروں کی معرفت لڑکیوں کے سرپرست جنم پتریاں بھجواتے وہ ہر دوسرے تیسرے دن آکر پوچھتے "کیا بیٹے جنم پتری ملی یا نہیں؟"

کئی لوگ تو باتوں باتوں میں ٹیلی ویژن، فرج، اسکوٹر وغیرہ کا بھی لالچ دلاتے۔ شاید انھیں معلوم نہیں کہ ہر چیز بکاؤ نہیں ہوتی ہے۔

آخر روز روز کی جھک جھک سے تنگ آکر میں نے گھر میں صاف بتا دیا ___ کہ فی الحال شادی کرنا نہیں چاہتا اور اس ضمن میں مجھ پر کوئی دباؤ ڈالا گیا تو مجبوراً گھر سے چلا جاؤں گا۔ میری اس دھمکی کا مثبت ردعمل ہوا اور ملان کے لیے آئی سبھی جنم پتریاں معہ فوٹو ان کے سرپرستوں کو افسوس کے ساتھ لوٹا دی گئیں۔

کچھ دن چین سے گزرے مگر دنیا نہ جانے کیوں کسی کو کھاتا پیتا یعنی کہ کنوارا نہیں دیکھنا چاہتی۔ اب لڑکی والے شادی آفر لے کر سیدھا میرے پاس آنے لگے۔

ایک صاحب سے ایک پان والے کی دوکان پر تعارف ہوا۔ وہ بھی پان کھانے اسی پان کی دوکان پر آتے تھے اور میں بھی وہیں جاتا تھا۔ کبھی کبھار پانچ سات منٹ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہو جاتی تھیں۔ ایک دن وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑے اپنے پن سے پوچھنے لگے ___ "آپ کی شادی ہوگئی ہے کیا؟"

اب تک مجھے تلخ تجربے ہو چکے تھے۔ ایک دم تاڑ گیا۔ ہو نہ ہو یہ صاحب مجھے برباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے کسی احتیاط سے کام لیا اور چہرے پر مایوسی لاکر کہا ___

"جی میں تو رنڈوا ہوں۔"

"بچے کتنے ہیں؟" انھوں نے دکھ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"بچے نہیں ہیں۔ بیوی سہاگ رات ہونے سے قبل ہی چل بسی تھی" کہتے ہوئے میں نے جیب سے رومال نکال کر آنسو پونچھنے کی اداکاری کی۔

"او بڑا المناک حادثہ ہوا ہے"۔ اور پھر وہ اس سلسلہ میں آتا جاتا رہا اور چین • مرتیو کو لے کر تھوڑی فلاسفی جھاڑنے کے بعد اپنے مطلب کی بات پر آئے۔

ابھی عمر ہی کیا ہے آپ کی پوری زندگی سامنے پڑی ہے۔ ایسے ہمت ہارنے سے کام نہیں چلے گا۔ ایک لڑکی ہے نظر میں۔ اگر آپ کہیں تو بات آگے بڑھاؤں۔"

اس دن خیر میں انھیں ٹالنے میں کامیاب ہوگیا۔ مگر اب وہ روز ہی مجھے شادی کرکے دوبارہ گھر بسا لینے کا مشورہ دینے لگے۔ میری شادی کے لیے وہ کافی فکرمند تھے گویا شادی کی بات نہ ہو کر کوئی گمبھیر قومی مسئلہ ہو۔ ان سے چھٹکارا پانے کی کوئی ترکیب نہیں سوجھ رہی تھی۔

ایسے آڑے موقعوں پر میرے ایک دوست اکثر کام آتے ہیں۔ میں ہار کر ایک بار پھر ان کی پناہ میں گیا اور انہیں سارا واقعہ سنا دیا۔ میرا دوست یہ سن کر گمبھیر ہو گیا۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد انھوں نے مجھے اپنے قریب کھینچا اور کان میں کچھ کھسپھسا سنتے ہی میری باچھیں کھل اٹھیں۔ وہاں سے بے فکر ہو کر گھر لوٹا۔ شام کو پنواڑی کی دوکان پر مجھے دولہا بنانے کی فکر میں دبلے ہوتے

رہے۔ انھیں صاحب سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ دیکھتے ہی بولے "کیا سوچا ہے آپ نے؟ بس آپ ایک بار ہاں کر دو پھر لڑکی والوں کو سنبھال لینا میرا کام۔"

"اب آپ اتنا زور دے رہے ہیں تو میں انکار نہیں کروں گا لیکن شادی کیس کا فیصلہ ہوجانے کے بعد ہی ہوگی" میں نے لیناں سے کہا۔

کیس کا نام سنتے ہی وہ کچھ چونکے۔ بڑی بے قراری سے بولے۔ کیسا کیس؟" کچھ خاص نہیں بس یوں ہی ایک معمولی اغوا اور عصمت دری کا کیس چل رہا ہے میرے اوپر نچلی عدالت نے تو سزا سنادی تھی اب میں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی ہے۔ آج کل ضمانت پر ہوں" میں نے اس سادگی سے جواب دیا گویا اغواء اور عصمت دری میرے لیے ناک پر بیٹھی مکھی اڑانے جیسا حقیر کام ہو۔

یہ سن کر وہ مجھے ایک ٹک گھورتے رہے۔ پھر بڑے نفرت آمیز لہجے میں کہا ——— "شکل سے تو اول پالیکر لگتے ہو، اور کام ہے پریم چوپڑہ جیسا۔" اب اس رشتے کے بارے میں کبھی بھول کر بھی مت سوچنا" یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑ گئے۔

ادھر میں نے بڑی راحت کی سانس لی اور اس دوست کا دل ہی دل میں سینکڑوں مرتبہ شکریہ ادا کیا جنہوں نے مجھے لڑکی والوں سے چھٹکارا پانے کی ترکیب بتائی تھی۔ ۵۵

تبصرے

تبسّم

(مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

—— از: رام لعل نابھوی ——

۱۹۷۱ء کی بات ہے 'شگوفہ' نے اپنی زندگی کے تین سال مکمل کر لیئے تھے اور زندہ دلانِ حیدرآباد کو سارے ہندوستان میں طنز و مزاح کے فروغ کے لئے کام کرنے والی انجمن کی حیثیت سے شہرت حاصل ہو چکی تھی کہ ایک دن (WIT - AND HUMOUR FORUM -) چنڈی گڑھ کے لیٹر پیڈ پر رام لعل نابھوی کا خط ملا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ زندہ دلانِ پنجاب کی روایات کو رام لعل نابھوی زندہ کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ "شگوفہ" نے ان کے ساتھ بھرپور تعاون کیا ان ہی دنوں رام لعل نابھوی نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون 'بولئے' بھجوایا جو ستمبر ۱۷ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اس کا پہلا جملہ ہے۔

"بچہ پیدا ہوتا ہے۔ دنیا میں تشریف لانے پر سب سے پہلا کام جو اس کا ہوتا ہے وہ ہے 'بولنا' بلکہ چیخنا، چلّانا، اس کی آمد کا پتہ انتظار کرنے والوں کو اس کے بولنے سے ہی لگ جاتا ہے"

اس مضمون کے ساتھ ہی طنز و مزاح کے میدان میں ایک نئے مزاح نگار کی آمد کا پتہ چلا۔ وہ مسلسل بولتے رہے۔ تبسّم پھیلاتے رہے، پھر اپنی ان تحریروں کو یکجا کر کے اسے "تبسّم" کے زیرِ عنوان شائع کیا۔ اس مجموعہ میں ۱۹ مضامین شامل ہیں جس کے بیشتر مضامین شگوفہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

حالیہ عرصہ میں نابھوی کے بولنے کی رفتار کچھ دھیمی پڑ گئی ہے۔ لیکن وہ میدانِ ظرافت میں برابر ڈٹے ہوئے ہیں۔

رام لعل نابھوی کے مضامین کا انداز ہی الگ ہے۔ کبھی وہ مکالموں سے کام لیتے ہیں۔ کبھی آپ بیتی سناتے ہیں اور کبھی بیانیہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ زبان پر پنجابی لب و لہجہ حاوی ہے۔ سیدھے سادے جملوں میں تصویریں کھینچ کر اس میں مزاح کا رنگ بھرتے ہیں۔ ان کے مزاح اور طنز کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ بھی نہیں ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی اس رائے سے ہمیں اتفاق ہے کہ — "قدرت نے ان سے انتقام لینے کی یہ صورت پیدا کی ہے کہ انھیں مزاح کے پُل صراط پر سے گزرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوا کہ رام لعل نابھوی اس پُل پر سے بخیر و خوبی گزر گئے ہیں۔ درمیان میں وہ چند ایک مقامات پر ڈانواں ڈول سے ہوئے اور ایک آدھ جگہ لڑکھڑائے بھی مگر وہ گرے نہیں اور مزاح کی مملکت میں تلوار کی دھار پر سے خود کو گرنے نہ دینا کوئی معمولی بات نہیں"

کتاب ۱۲۳ صفحات پر چھپی ہے۔ کتابت و طباعت عام معیار سے بلند ہے قیمت پندرہ روپیے ہے۔ انجمن ترقی اردو ہند اور مکتبہ جامعہ کے بک اسٹالوں سے حاصل کی جا سکتی ہے

(مدیر)

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

کتابوں پر انعامات

اردو اکیڈمی آندھرا پردیش کی جانب سے ریاست اور بیرونِ ریاست کے مصنفین کی کتابوں پر دیئے گئے انعامات کی فہرست حسب ذیل ہے۔ مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ ۱۸۔ اگسٹ میں ان ایوارڈس کے بارے میں جیس کے متفقہ فیصلوں کی توثیق کر دی گئی۔

دو دو ہزار روپے کے سات انعامات

۱۔ غنچہ لب بستہ (شاعری) اوج یعقوبی
۲۔ صدف تمام ریت ریت (شاعری) علی الدین نوید
۳۔ شاہ معظم (تنقید و تحقیق) ڈاکٹر حسینی شاہد
۴۔ مدراس میں اردو (〃) ڈاکٹر افضل الدین اقبال
۵۔ لہو آسیس کا (ناول) محسن علی
۶۔ پنجرہ کا آدمی (ڈراما) قدیر زماں
۷۔ انڈین کاجو (انشائیہ) عاتق شاہ

ایک ایک ہزار روپے کے گیارہ انعامات

۱۔ موسم سنگ (شاعری) مضطر مجاز
۲۔ نئی رتوں کا سفر (〃) رؤف خلش
۳۔ ادبی مطالعہ (تنقید) ڈاکٹر راج بہادر گوڑ
۴۔ مہاراجہ چندو لال شاداں (تحقیق) ڈاکٹر ثمینہ شوکت
۵۔ گونگے دریچے (افسانے) نعیم زبیری
۶۔ سیپ کا درخت (〃) نجمہ نکہت
۷۔ یونگ کا نظریۂ شائیپ (نفسیات) ڈاکٹر اصغر خانم
۸۔ سفرنامہ (سفرنامہ) فرید مرزا
۹۔ تجلیات رسالت (سیرت) علی افسر
۱۰۔ ڈالی ڈالی پھول (بچوں کا ادب) وقار خلیل
۱۱۔ دھر گھسیٹ (طنز و مزاح) سرپٹ حیدرآبادی

پانچ پانچ سو روپے کے چھبیس انعامات

۱۔ اجنبی پرندے (شاعری) اسلم عمادی
۲۔ آئینۂ دل (شاعری) رئیس اختر
۳۔ شکن در شکن (〃) صلاح الدین نیر
۴۔ نصاب دل (〃) رشید عبدالسمیع جلیل
۵۔ نفس نفس (〃) ناصر کرنولی
۶۔ الفاف (〃) محسن جلگانوی
۷۔ انجمن در انجمن (〃) صاحب حیدرآبادی
۸۔ مہاراجہ کشن پرشاد (تنقید و تحقیق) ڈاکٹر حبیب ضیاء
۹۔ مرزا علی لطف (تحقیق) ڈاکٹر اکبر علی بیگ
۱۰۔ ذکر سالک (تحقیق) میر سراج الدین علی خاں
۱۱۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری (تحقیق) ڈاکٹر صابرہ سعید
۱۲۔ خوشۂ گندم (افسانے) بیگ احساس
۱۳۔ ہارا ہوا پرندہ (افسانے) مظہر الزماں خاں
۱۴۔ لب گفتار (ڈراما) جمیل شیدائی
۱۵۔ نازنگی کی خوشبو (ڈراما) اطہر افسر
۱۶۔ سیاہ آنسو (ڈراما) شجاع احمد قائد (مرحوم)
۱۷۔ سرِ مژگاں (افسانے) طیبہ خسرو
۱۸۔ ہندوستانی افسانے (افسانے) عزیز احمد جلیلی

۱۹۔ ظہور ترتیب (سائنس) ڈاکٹر سکندر حسین
۲۰۔ حیرت انگیز معلومات سائنس (سائنس) عابد انصاری
۲۱۔ ترکش باتھ (طب) ڈاکٹر غوث الدین
۲۲۔ ہمارے بچے (معلومات عامہ) ڈاکٹر رضیہ اکبر
۲۳۔ پرندوں سے جانوروں تک (معلومات عامہ) شاہد عظیم
۲۴۔ سات دوست (بچوں کا ادب) بانو طاہرہ سعید
۲۵۔ شوشے (طنز و مزاح) ارشد علی خاں
۲۶۔ چوں چوں کا مرتبہ (〃) پاگل عادل آبادی

بیرون ریاست کے اہل قلم کی کتابیں

ایک ایک ہزار روپے کے پانچ انعامات

۱۔ کرب خود کلامی (شاعری) اعجاز صدیقی مرحوم
۲۔ غزل اور غزل کی تعلیم (تنقید) اختر انصاری
۳۔ الف لام میم (افسانے) کلام حیدری
۴۔ سوانح عمری مولانا آزاد (سوانح) مشتاق احمد
۵۔ سپنے سلونے (بچوں کا ادب) ایس۔ ایم۔ آئی۔ ساجد

پانچ پانچ سو روپے کے نو انعامات

۱۔ یم بریم (شاعری) مظفر حنفی
۲۔ آثار خیر (تنقید) اختر قادری
۳۔ وجدان (〃) ڈاکٹر عصمت جاوید
۴۔ یوں سوچا تھا (ناول) ظفر ادیب
۵۔ نقوش (تذکرہ) حفیظ مالیگاؤں
۶۔ زمیندار کی حویلی (بچوں کا ادب) ریاض احمد خاں
۷۔ نئی دھڑکنیں (افسانے) رضا ر الجبار
۸۔ تبسم (طنز و مزاح) رام لال نابھوی
۹۔ فلمیں کیسے بنتی ہیں (معلومات) پریم پال اشک

چندر سریواستو
سکریٹری ڈائرکٹر اردو اکیڈمی آندھرا پردیش

ستمبر ۱۹۸۰ء

آندھرا پردیش میں سریکاکلم مہم کا جنگی اساس پر اہتمام

سیلاب زدوں کے لئے بہ افراط امدادی اقدامات

آندھرا پردیش کے چیف منسٹر نے راجہ کینوٹ کے مانند یہ نہیں کیا کہ لہروں کو [illegible] دیتے یہ لارڈ وینکٹیشورا نے کردیا۔ جن کے چرنوں میں چیف منسٹر پرارتھنا میں مصروف تھے۔ لارڈ [illegible] کے فضل و کرم کے سہارے اس طرح کے ہنگامی حالات سے نمٹنے میں اپنے تجربے کی بدولت انھوں نے صورت حال پر قابو پالیا اور سیلاب کے [illegible]ت ہونے والے نقصان کی تلافی کے لئے وسیع اور موثر اقدامات شروع کردیئے۔

نقصان کی وسعت

★ ۱۵۸ مواضعات میں ۵ء۱ لاکھ اشخاص متاثر ہوئے ہیں ★ ایک لاکھ ایکڑ سے زائد رقبے میں دھان، گنا اور مونگ پھلی فصلیں یا تو زیر آب ہیں یا بہہ گئی ہیں ★ اندیشہ ہے کہ بڑی تعداد میں مویشی اور مرغیاں ہلاک ہوگئی ہیں۔ ★ چھوٹی آبپاشی کے بیسیوں تالابوں اور سڑکوں میں شگاف پڑ گئے ہیں۔ ★ مٹی سے بنی ہوئی ہزاروں جھونپڑیاں منہدم ہوگئی ہیں۔

امدادی اقدامات

★ ضلع سریکاکلم کے ۱۵۸ سیلاب زدہ مواضعات میں فی الفور امدادی کاموں کے لئے ایک کروڑ روپیوں کی منظوری ★ ہر خاندان کو ۱۰ کیلو چاول اور ہر شخص کو ایک جوڑا کپڑوں کی فوراً فراہمی ★ متاثرہ عوام میں عمارتی سامان کی تقسیم ★ وبائی امراض کے انسداد کے لئے فوری طبی امداد۔

یہ ہیں ان اقدامات سے چند اقدام جو حالیہ سیلاب کے باعث پیدا شدہ مسائل سے نمٹنے کے لئے کئے گئے۔ یہ سیلاب ماضی میں آئے ہوئے سیلابوں کے مقابلے میں ڈیڑھ گنا شدت کا حامل تھا۔ دفاعی عہدیداروں کی جانب سے ۱۰ کشتیاں اور ۳ ہیلی کاپٹر امدادی کاموں میں مصروف کردیئے گئے۔ ہیلی کاپٹروں نے پانی میں گھرے ہوئے عوام کے لئے زیادہ ... دن میں ۴۰،۰۰۰ غذائی پیکٹ گرائے۔ ضلع کلکٹر کو ہدایت کی گئی ہے کہ جس قدر عملے کی ضرورت ہو پڑوسی اضلاع سے بلالیا جائے۔

"مصیبت زدوں کو امداد کی فراہمی میں پیسہ رکاوٹ نہیں بنے گا" - (چیف منسٹر)

جاری کردہ : محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ، حکومت آندھرا پردیش

No. 15822/68 Postal Regd. No. H.HD 6

SHUGOOFA

Vol. 13 Copy 9 31 Bachelor Quarters, M.J. Market Hyderabad-1 Sept. 1980 Phone: 57716

"PHIR MILENGEY....."

OCTOBER 1980 **RS. 2/-**

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

حیدرآباد

جلد : ۱۳
شمارہ : ۱۰

اکتوبر ۱۹۸۰ء

ایڈیٹر :
سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت :
حمایت اللہ، منظور احمد، مسیح انجم

سالانہ (۲۲) روپے
اداروں سے (۲۵) روپے
بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

فی پرچہ : (۲) روپے

جنرل منیجر : سمیع جلیل

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ : ۲۱ ۔ [illegible] معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۔ فون 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

سالانہ خریداروں سے درخواست ہے کہ کنہیا لال کپور کی بہ حفاظت ترسیل کے لئے دو روپے پیشتر کے پوسٹل اسٹامپ رجسٹری خرچ کے لئے بھجوائیں۔

(منیجر)

آندھرا پردیش ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے!

یہ آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے کہ وہ ایک الگ اکیلے تھے لیکن ہم اپنی بہترین صلاحیتوں اور اپنے مخصوص دائرہ کار کے تحت ہمیشہ ایسی کوشش کر سکتے ہیں۔

آندھرا پردیش نے ایسا ہی عید الفطر کے روز ۱۳ اگست کو کر دکھایا جب چیف منسٹر ایک یادگار رسید ملاپ میں پہلے مسلمان بھائیوں سے دوسرے ہندوؤں کے ساتھ گلے مل ہوئے۔

آندھرا پردیش نے دوبارہ ۲۳ ستمبر کو یہ کر دکھایا جب صرف حیدرآباد میں دس لاکھ سے زائد ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر گنیش مورتیوں کے وسرجن کے دن گنیش تیوہار کی خوشیاں بانٹیں۔ چیف منسٹر نے کئی پر تھکن لیکن مسرت بخش لمحے ان کے درمیان گزارے۔ یہ ایک بے نظیر موقع تھا۔

گاندھی جی نے ہمیں کہا تھا کہ ہم سب خدا کے بچے ہیں۔ آندھرا پردیش میں ہم نے اس بات کو اپنے چھوٹے پیمانہ پر ثابت کر دیا ہے۔

اس روایت کو برقرار رکھئے

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ
آندھرا پردیش

یوسف ناظم

سلسلہ در سلسلہ

قوموں کی زندگی میں منزل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی اس میں صرف مرحلے ہوا کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر مرحلے ایسے آتے ہیں جب قوموں اور افراد کو صرف تحقیقاتی کمیشنوں کے سہارے جینا پڑتا ہے۔ تحقیقاتی کمیشنوں کو متمدن ممالک میں بڑی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی اس طرح پذیرائی کی جاتی ہے جیسے یہ کمیشن نہ ہوں، گھر داماد ہوں۔ بعض ملکوں کو تحقیقاتی کمیشنوں کے بغیر بھی ترقی کرتے اور پروان چڑھتے دیکھا گیا ہے۔ لیکن اس پروان چڑھنے سے کیا حاصل جس کی مدت عارضی ہو۔ یعنی اکابرین کا خیال ہے کہ جن ملکوں میں کمیشن نہیں بیٹھا کرتے ان ملکوں میں آئے دن فوجی انقلابات آتے رہتے ہیں ــــ (فوجیں خوش قسمت ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب فوجیں آہ بھی بھرتی تھیں تو مشہور ہو جاتا تھا کہ فوجوں نے بغاوت کردی ــــ اب فوجیں جب بھی بندوق بھرتی ہیں، ایک انقلاب آجاتا ہے ــــ فوجوں کی دوسری خوش قسمتی یہ ہے کہ ان دنوں امن کے زمانے میں بھی فوجوں کو کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی مصروفیت مل جاتی ہے۔

تحقیقاتی کمیشنوں کا مدّعا اور مطلب کچھ نہ کچھ تو ہوتا ہی ہے لیکن یہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے بس کمیشن ہونے چاہئیں۔ ان کا ایک سالانہ کوٹہ ہوتا ہے اور ہر بجٹ میں ان کی تعداد اور اخراجات کی رقم درج ہوتی ہے۔ اگر کسی سال مقررہ کوٹے کے مطابق کمیشن نہ بیٹھے تو یہ ایسا ہی سانحہ ہوتا ہے جیسے آدمی کی ریڑھ کی ہڈی میں کوئی فتور ہو جائے ــــ اور ریڑھ کی ہڈی آدمی کی پشت میں لگی ہوتی ہے اور عقب سے آنے والی بلاؤں سے اسے محفوظ رکھتی ہے۔

حکومتیں تو حسبِ دستور اور حسبِ مقدور کمیشن قائم کرتی ہی رہتی ہیں لیکن عوام کا بھی فرض ہوتا ہے کہ وہ وقفے وقفے سے کسی نہ کسی کمیشن کا مطالبہ کرتے رہیں اس طرح حکومت کے ہاتھ مضبوط ہوتے ہیں اور اس زمانے میں حکومتوں کا جسم چاہے کیسا ہی ہو ہاتھ ضرور مضبوط ہونے چاہئیں ــــ

دست سوال دراز کرنے کے لیئے۔

عوام اگر صرف جلوس نکالتے رہیں یا فقط دھرنے دیتے رہیں بازار بند کرواتے رہیں تو اس عمل سے ان کے چاق و چوبند ہونے کی اطلاع تو ضرور مل جاتی ہے لیکن ایسے چھوٹے موٹے کام کر لینے سے ان کا فرض پورا نہیں ہو جاتا ان کا فرض یہ بھی ہے کہ وہ ہر ہفتے ایک کمیشن کی مانگ کریں ـــــ بیمار قوموں کے لیے کمیشن دوا ہے اور تندرست قوموں کے لیے طاقت کی گولی۔

دنیا میں مسائل کی کمی نہیں اور اگر ہے بھی تو یہ ہنستے کھیلتے پیدا کئے جا سکتے ہیں ۔ اگر عوام چاہیں تو مطالبہ کر سکتے ہیں کہ پانی ملے دودھ میں پانی کی مقدار اتنی کم کیوں ہے اور کیا اتنی قلیل مقدار میں پانی ملانے سے عوام کا ہاضمہ ٹھیک طور سے کام کر سکتا ہے ۔ اس مسئلہ کی تحقیقات کے لیے ایک کمیشن آسانی سے قائم ہو سکتا ہے (یہ دودھ پیتا کمیشن ہوگا) کمیشن قائم ہو جائے تو کئی سرگرمیاں فروغ پا سکتی ہیں کیونکہ کمیشن ہمیشہ حرکت کرتا رہتا ہے۔ یہ سب سے پہلے ایک سوال نامہ مرتب کرتا ہے (سوالوں کی تعداد کم سے کم تنو ہونی چاہیئے دو نسو ہو تو کیا کہنے) یہ سوال نامہ ملک بھر میں وبا کی طرح پھیلایا جا سکتا ہے (محدود فیض کوئی فیض نہیں ہوتا۔ یہ ہر شخص تک پہنچنا چاہیئے) تحریری جواب چونکہ تعداد میں کم وصول ہوتے ہیں اس لیے کمیشن شہر شہر قریہ قریہ گھوم سکتا ہے۔ گواہیاں قلم بند کر سکتا ہے (گواہوں کا معتبر ہونا ضروری نہیں ہوتا صرف جاندار ہونا کافی ہوتا ہے) کمیشن گواہوں کے معاملے میں ہر اُس شخص کو شریف سمجھتا ہے جو اُس کے ہاتھ لگ جائے البتہ خود کمیشن کی حیثیت کے بارے میں بعض وقت کچھ سوال اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ یہ سوال عموماً ٹیڑھے ہوتے ہیں لیکن ہر کمیشن چاہے وہ کسی حیثیت کا ہو، درپردہ مجلسِ قانون ساز کی جائز اولاد ہوتا ہے اور اسے سوال نامے مرتب کرنے، گواہیاں قلم بند کرنے اور ۲، ۴ سو صفحوں کی رپورٹ پیش کرنے سے روکا نہیں جا سکتا۔

اصنافِ ادب کی طرح کمیشنوں کا بھی اصناف مقرر کر دی گئی ہیں ۔ ان کمیشنوں کو موقعہ و محل کی مناسبت سے برتا جاتا ہے مثلاً اگر کسی مال گاڑی کے ڈبے پٹری سے اُتر جائیں تو یہ ایک رُکنی کمیشن مقرر کرنے کا موقعہ ہوتا ہے اِس کمیشن کا کام عام طور پر کسی غیر مجسٹریٹ شخص کے سپرد کیا جانا چاہیئے۔ (مال گاڑی کے ڈبوں کے پٹری سے اُتر جانے کے معاملے میں مجسٹریٹوں کو زحمت نہیں دی جا سکتی) ہاں اگر ریل گاڑی کے ڈبے پٹری سے اُتر جائیں (جو عام طور پر اُترتے رہتے ہیں تو ایسی صورت کسی مجسٹریٹ کو تکلیف دی جا سکتی ہے لیکن اگر بدقسمتی سے اس حادثے میں کوئی جانی نقصان نہ ہوا ہو تو اس کمیشن کی نوعیت محکمہ جاتی کمیشن کی بھی ہو سکتی ہے (گھر کا معاملہ گھر ہی میں رہے تو بہتر ہوتا ہے) کمیشنوں میں سب سے اعلیٰ قسم عدالتی کمیشن کی ہوتی ہے ۔ اس پر روپیہ ضرور زیادہ صرف ہوتا ہے لیکن ملک و قوم کے وقار کے لیے کچھ اعلیٰ قسم کے کمیشن تو قائم کرنے ہی پڑتے ہیں۔

بعض اوقات ایسے ہوتے ہیں جن کی تحقیقات کروانا بے سود ہوتا ہے مثلاً اگر کسی مقام پر فساد ہو جائے جس میں دو مختلف فرقوں کے لوگ جی کھول کر حصہ لیں تو اس معاملے کی کیا تحقیق ہوگی۔ ایسے موقعوں پر صرف بیانات تردیدی بیانات اور تردید کا در تردیدی بیانات کا سلسل شروع کیا جانا از حد مفید ہوتا ہے۔ بیانات کی نوعیت

کچھ اس طرح کی ہونی چاہیئے۔

پہلا بیان : اس واقعے کے پیچھے فلاں جماعت کا ہاتھ ہے۔

دوسرا بیان : اس واقعے میں فلاں جماعت کا نہیں فلاں جماعت کا ہاتھ ہے۔

تیسرا بیان : اس واقعے میں مذکورہ جماعتوں کا نہیں بلکہ اصل میں فلاں جماعت کا ایک ہی نہیں دونوں ہاتھ ہیں۔

پہلا بیان (مکرر) : اگر انتظامیہ کی آنکھیں بند نہیں ہوتیں تو یہ سانحہ ٹل سکتا تھا۔

دوسرا بیان (مکرر) : پولیس خاموش تماشائی کی طرح کھڑی رہی۔

تیسرا بیان (مکرر) : یہ دونوں بیان غلط ہیں۔ انتظامیہ کی آنکھیں بالکل کھلی ہوئی تھیں اور پولیس نے بھی گولی چلائی لیکن غلط سمت ہیں۔

آخری بیان : جو کچھ ہوا اسے بھول جانا چاہیئے (اور صرف خدا کو یاد کرنا چاہیئے)

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے انسائیکلوپیڈیا گواہ ہیں کہ بڑے بڑے کمیشنوں نے برسوں کی محنت، ریاضت اور مشقت سے پہاڑ کھودے اور ان میں سے چوہے برآمد کئے ___ بعض کمیشن تو چوہوں کی نعمت سے بھی محروم رہے۔

جس طرح کسی شاعر کے مصرعے پر گرہ لگائی جا سکتی ہے اسی طرح ایک کمیشن کی رپورٹ کی جانچ کے لئے دوسرا کمیشن بھی بیٹھ سکتا ہے۔ ان دونوں کمیشنوں کے بیچ کم سے کم ۲۰ سال کا عرصہ ہونا چاہیئے ___ کیا ضروری ہے کہ ۲۰ سال پہلے جو کمیشن قائم ہوا تھا اس کی رپورٹ صحیح اور درست ہی ہو۔ شک و شبہ کا یہ سلسلہ ہمیشہ برقرار رہنا چاہیئے اسی پر ہم سب کا دارومدار ہے جس دن بھی ہم کسی قطعی اور آخری نتیجے پر پہنچ جائیں گے، وہی ہمارا آخری دن ہوگا۔ کسی فرد یا قوم کی زندگی کوئی کرکٹ میچ نہیں ہے کہ آخری ۲۰ اوور پھینکے جائیں اور نتیجہ نکل آئے۔

رضا نقوی واہی

کرسی

لیڈر کے لیے بخششِ جمہور ہے کرسی جمہور کی قسمت سے مگر دور ہے کرسی
مل جائے تو صد انجمنِ نور ہے کرسی حاصل نہ ہو جب تو شبِ دیجور ہے کرسی
جب اپنے تصرف سے بہت دور ہے کرسی گیدڑ کی طرح ترشیٔ انگور ہے کرسی
جب چمچہ و کفگیر سے محصور ہے کرسی حق تلفیٔ جمہور پہ مجبور ہے کرسی
چھوٹی سے بھی چھوٹی ہو، بڑی سے بھی بڑی ہو جس ساخت کی ہو، دولتِ مستور ہے کرسی
دروازۂ صمصم کی کلید اس کے ہیں پائے لچھمی کی عطا، ثروتِ تیمور ہے کرسی
ان کے لیے جو اہلِ سیاست کے لنگ ہیں بریانی و ماہیِ سقنقور ہے کرسی
ڈھول اپنا بجاتے پھریں گاتے پھریں ہر سو "چھٹ بھیّوں" کو مل جائے تو تنبور ہے کرسی
ان کے لئے جو قوم کے دکھ درد کو سمجھیں کانٹوں کی خلش، نشترِ زنبور ہے کرسی
ملتی ہے وہ داداؤں، لفنگوں کی مدد سے کہنے کو، نمائندۂ جمہور ہے کرسی
اربابِ حکومت کے لئے شہد و قلاقند اوروں کے لیے املی و انگور ہے کرسی
ان کے لیے دل اپنا بدلتے ہیں جو دن رات ہر فصل میں خوش ذائقہ انگور ہے کرسی
دکھلایا ہنومانِ سیاست نے جو کرتب "چھو" کہتے ہی پنڈال سے کافور ہے کرسی

تختوں سے جو ٹوٹل ایوولیوشن کے بنی تھی
اب گھر میں کباڑی کے، اِک آخور ہے کرسی

قصیدۂ مدحیہ

(بجلی ملازمین کی ہڑتال کی نذر)

اے زندگی کے لمحۂ خوش حال الوداع
بجلی ملازمین کی ہڑتال الوداع

اُنیس[19] روز و شب جو ترا فیض عام تھا ہر اہلِ شہر مستقلاً شادکام تھا
بجلی ہوئی نہ فیل کبھی رات ہو کہ دن اس طرح ہم کبھی بھی رہے تھے نہ مطمئن
برسات کی اُمس میں بھی ہم کو سکوں ملا راتوں کو روشنی بھی ملی، فین بھی چلا
بجلی کی جست و خیز تھی معمول سے بچند پانی کا نل بھی وقت سے پہلے ہوا نہ بند

آنے سے پہلے تیرے، یہی سوچتے تھے ہم — تو آگئی تو کیسے کٹے گی شبِ الم
گرمی میں مل سکے گی نہ راحت جو فین سے — دفتر میں کام ہوگا بھلا کیسے چین سے
دہشت سے تیری لرزہ براندام تھا سماج — تھا انتظامیہ کو بھی تھوڑا سا اختلاج
لیکن ہمارا وہم ہوا سربسر غلط — تجھ سے جو خوف تھا وہ خیالی تھا، ڈر غلط
تو آئی تیرگی کو فروزاں کئے ہوئے — "جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے"
اک انقلاب آگیا برقی نظام میں — راحت کی لہر دوڑ گئی خاص و عام میں
بے روک کارخانوں سے آتا رہا کرنٹ — سپلائی میں ہمیشہ رہا امپرومنٹ
تھوڑے سے کامگار کرشمہ دکھا گئے — ہڑتالیوں کے منہ پہ طمانچے لگا گئے
ثابت ہوا کہ ادھر جو ہیں کام چور ہیں — بجلی ملازمین نہیں مفت خور ہیں
ہم اہلِ شہر کی ہے یہ اب تجھ سے التجا — تو پھر کسی بہانے ہماری مدد کو آ
اے کاش شہر میں ہو ترا مستقل قیام — بس مختصر سی ہے یہی درخواست والسلام

اے زندگی کے لمحۂ خوش حال الوداع
بجلی ملازمین کی ہڑتال الوداع

غزل

جوہر سیوانی

بختِ بندر میں تھا کل والدِ انساں ہونا — آج "نلکی" کا مقدر ہے بی اماں ہونا
ڈارون کہتا ہے، انسان ہے بندر زادہ — چھوڑیئے بیتوں کو دیکھ کے حیراں ہونا
دیکھ کر ہپی کو غالب نے یہ برجستہ کہا — "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"
بھائی آئے ہو سرِ بزم تو میری مانو — سیکھ لو پہلے ترنم تو غزلخواں ہونا
اُف ری شاعر کی یہ وحشت دمِ تولیدِ غزل — بڑبڑانا، کبھی ہنسنا، کبھی گریاں ہونا
چیل کی طرح جھپٹ لینا مری کل تنخواہ — اور پہ دلشٹ پہ بیگم کا وہ خنداں ہونا
عقل والوں کے یہاں آتی نہیں ہے کچھ بھی — اس کے درشن کے لئے شرط ہے ناداں ہونا
میزباں جل کے یہ کہتا ہے کہ کب تک ہے قیام — کس قدر بوجھ ہے اس دور میں مہماں ہونا
جب بھی حملہ ہو مرض کا تو غٹاغٹ پی لو — اس کی تلخی سے نہ زنہار ہراساں ہونا

آپ کی مہر و نوازش کو ہے جوہر کا سلام
اُس نے سیکھا نہیں شرمندۂ احساں ہونا

قطعات

اسمٰعیل ظریف

آدھی رات کو

شاعروں میں ایسے شاعر بھی ملیں گے آج کل
لوٹ کے محفل سے گھر آتے ہیں آدھی رات کو
کھٹکھٹانے پر بھی جب دروازہ کھلتا ہی نہیں
گھر کے باہر ہی لڑھک جاتے ہیں آدھی رات کو

تاڑبن کی بات کرو

جدیدیت کی نہ عہدِ کہن کی بات کرو
جس انجمن میں ہو اُس انجمن کی بات کرو
نہ پالو مفت کو غم اس سے کچھ نہیں حاصل
سنو مشاعرے اور تاڑ بن کی بات کرو

کرتے ہیں جگال

پان چھپے زردوں کا کھاکر بھائی کرتے ہیں جگال
آپ کے اس شوق سے سب گھر کا گھر بیزار ہے
بھائی کے دیوان خانے کا یہ نقشہ ہے ظریف
چاندنی گلنار ہے دیوار لالہ زار ہے

شہنائی کی شہنائی ہے

ناس لینے کے بھی انداز جدا ہیں سب کے
ناک والوں نے بھی کیا خوب ادا پائی ہے
آپ کی ناک کا کیا پوچھتے ہو حال ظریف
ناک کی ناک ہے شہنائی کی شہنائی ہے

امام رائچوری

ضرورت

سر کھپا کے رات دن دس سال میں
جانے کیا ڈھونڈے مُرغ کی کھال میں
کر کے یہ تحقیق بتلاتے ذرا
کتنے ہوتے ہیں وٹامن دال میں

غلط فہمی

انداز ہو بہو کسی ماہ لقا کا تھا
اسٹائل سر کے بالوں کا بھی سادھنا سا تھا
ہم نے چھلانگ مار کے آگے نکل کے جب
دیکھا قریب جا کے تو چہرہ چچا کا تھا

برق آشیانوی

ریلوے ٹائم ٹیبل

حال ہی میں ساؤتھ سنٹرل ریلوے نے یہ اعلان کیا ہے کہ اکتوبر سے نیا ٹائم ٹیبل شائع ہونے والا ہے۔ اگر کوئی صاحب اپنی تجاویز روانہ کریں تو ان پر غور کیا جائے گا۔ اور اگر قابلِ عمل ہوں تو عمل بھی کیا جائے گا۔ اس خبر کو پڑھ کر پہلے تو ہمارا دل خوشی سے قطب مینار سے بھی زیادہ بلندی تک اچھل پڑا تو ہم نے اس کو واپس بلا کر اپنے سینے میں رکھ لیا۔ اس کے بعد سب سے پہلے ہماری یہ تجویز ہے کہ حضور آپ ٹائم ٹیبل شائع کرنے کی زحمت ہی کیوں گوارا فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کا ٹائم ٹیبل تو ریلوں کے مقررہ اوقات بتاتا ہے لیکن ٹرینیں آزادئ ہند کے بعد سے خود بھی اتنی آزاد ہو گئی ہیں کہ وہ ٹائم کی پرواہ ہی نہیں کرتیں بلکہ اپنی مرضی سے جب جی میں آتا ہے چلتی ہیں اور جب جی میں نہیں آتا تو چلتی ہی نہیں۔ ہماری اس تجویز کو شرفِ قبولیت "نہ بخشتے" ہوئے اگر آپ ٹائم ٹیبل شائع کرنے پر تلے ہوئے ہی ہیں تو ہماری اولین گذارش یہ ہے کہ خدا کے واسطے ہماری ایک تجویز بھی منظور فرمائی جائے تو ہم دعا کریں گے کہ خدا ریلوں کی عمروں کو اس حد تک دراز کرے کہ وہ بالاخر چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں لیکن محکمہ ریلوے انھیں پھر بھی چلاتا رہے خدا کا واسطہ ہم اس واسطے دے رہے ہیں کہ سابق میں ہم بندوں کا واسطہ دیتے دیتے تھک گئے ہیں کیونکہ ہماری ایک تجویز پر بھی عمل نہیں ہوا۔ حالانکہ ہم نے بہت ہی آسان تجاویز پیش کی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ریلوں کے ڈبوں میں اضافہ کیا جائے، بیت الخلاء میں روشنی کا انتظام کیا جائے۔ ویسے ڈبوں میں بھی روشنی نہیں رہتی تو دیا سلائی جلا کر سامان کو وقتاً فوقتاً دیکھ لیا جا سکتا ہے۔ ایک نہایت ہی معقول تجویز یہ بھی پیش کی تھی کہ براہ کرم بغیر ٹکٹ سفر کرنے کی اجازت دی جائے جس کے نامنظور ہونے کے باوجود ہمیں کئی قبائلی مسافرین کو بڑے آرام و اطمینان کے ساتھ بلا ٹکٹ سفر کرتے دیکھ کر اپنی نادانی پہ افسوس ہوتا ہے۔ البتہ ایک نامعقول تجویز ہمیشہ پیش کرتے رہے ہیں کہ ریلوں کو ٹائم ٹیبل کے اوقات کے مطابق چلایا جائے

چونکہ یہ تجویز محکمہ ریلوے کے اصول کے لحاظ سے نہایت ہی نامعقول تھی اس لیے اس کو آج تک شرف قبولیت نہیں بخشا گیا۔ چنانچہ کئی مرتبہ ایسا ہوتا کہ ہم ٹائم ٹیبل دیکھ کر گھر سے ایک گھنٹہ قبل ہی نکل کر اسٹیشن پہنچ جاتے ہیں کیونکہ ٹکٹ لینے کے لیے کیو میں ایک گھنٹہ کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ بکنگ آفس پہنچنے سے قبل ہی ہمیں ایک تازہ خبر مل جاتی ہے کہ ٹرین بارہ گھنٹہ لیٹ ہے۔ چنانچہ ہم ٹکٹ لے کر گھر واپس چلے جاتے ہیں اور مزید دو وقت کا کھانا پکوا کر لے آتے ہیں۔ کیونکہ ایک وقت کا کھانا تو ہم احتیاطاً ساتھ ہی لے آئے تھے۔ ٹکٹ لے کر ویٹنگ روم میں فرش پر دری اور چادر بچھا کر اس طرح بیٹھ جاتے ہیں جیسے یہ ہمارا اپنا ہی مکان ہے۔ گڑبڑ میں گھر سے بغیر تناول طعام ہی نکلے تھے اس لیے سب سے پہلے اپنے اہل و عیال کے ساتھ پورے اطمینان و آرام سے تناول طعام فرماتے ہیں۔ اہل و عیال کی تعداد بتانے میں اس لیے تامل ہوتا ہے کہ "اہل" تو بہ فضل خدا تقریباً چالیس سال سے ایک ہی ہے (اگرچہ لوگ اضافہ کی رائے دے رہے ہیں۔ لیکن ہم ابھی غور کر رہے کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے ہیں کیونکہ نتیجہ پر پہنچنے پر کئی خطرناک نتائج کے پیش آنے کا خطرہ لاحق ہے) لیکن عیال کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ خدا نظر بد سے بچائے کیونکہ "عیال" کی تعداد در تعداد "ایال" تک جا پہنچی ہے۔ خدا سچ نہ بلوائے تو عرض کریں کہ خود ہمیں بھی یہ تعداد یاد نہیں ہے۔ بہرحال ابھی بارہ گھنٹے بھی نہیں گذرنے پاتے کہ ایک اور تازہ بہ تازہ خبر ملتی ہے کہ ٹرین اٹھارہ گھنٹے لیٹ ہے۔ چنانچہ ہم دوڑے دوڑے گھر جا کر پورے خاندان کے واسطے بستر بھی لے آتے ہیں تاکہ سرد رات گذر جائے تو صبح بستر واپس کر کے سفر پر روانہ ہو جائیں جو صرف چھ گھنٹے کا ہے۔

ٹرینوں کے اس طرح لیٹ چلنے پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آیا۔ ایک نوجوان شادی کے دوسرے ہی دن خودکشی کے ارادے سے گھر سے نکلا، اس ارادے سے کہ کسی ٹرین کے نیچے لیٹ کر اپنی جان، اپنی نئی نویلی دلہن کے سپرد کر دے۔ چنانچہ جب وہ ریل کی پٹری کے پاس پہنچا تو اس کے ساتھ ایک بڑا سا توشہ دان اور ایک واٹر کیاریر بھی تھا۔ کسی صاحب کا اس طرف گذر ہوا تو انہوں نے نوجوان سے دریافت کیا ـــــ "میاں یہاں کیا کر رہے ہو ـــــ؟" نوجوان نے جواب دیا۔ "صاحب میں پٹری پر لیٹ کر خودکشی کرنا چاہتا ہوں" ان صاحب نے دریافت کیا۔ "میاں جب مرنا ہی ٹھہرا تو یہ توشہ دان اور واٹر کیاریر کیوں لے آئے ہو" نوجوان نے جواب دیا۔ "صاحب ٹرین نہ معلوم کب آئے۔ اگر دو ایک دن لیٹ ہو جائے میں بھوکا رہ جاؤں گا۔ مرنا تو میں چاہتا ہوں لیکن بھوکا نہیں مرنا چاہتا۔"

ٹرین کے لیٹ ہو جانے کے وجوہات عمر بھر ریل کا سفر کرتے رہنے کے باوجود ہماری سمجھ میں نہ آئیں۔ بعض وقت ہم نے دیکھا ہے کہ ٹرین اسٹیشن پر تیار کھڑی ہے۔ انجن، ڈرائیور، گارڈ وغیرہ سب موجود ہیں لیکن ٹرین اپنی جگہ سے نہیں ہلتی۔ جب گارڈ صاحب سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ٹرین کب روانہ ہوگی تو جواب ملتا ہے۔ "ہمیں نہیں معلوم"۔ ان کے اس بیان میں ہمیں کامل صداقت معلوم ہوتی ہے۔ وہ گارڈ ہوتے ہوئے بھی حقیقت میں یہ نہیں جانتے کہ ٹرین کا مقررہ وقت گذر کر تین گھنٹے ہو چکے ہیں لیکن ٹرین اپنے سفر کے نقطۂ آغاز سے ملنے کا نام کیوں نہیں لیتی۔ بعض وقت تو ایسا بھی ہوا ہے کہ ٹرین "ہلتی" ہوئی بھی نظر آئی۔ وہ اس طرح کہ اچانک آہستہ سے آگے نکل پڑی۔ ہم نے ابھی شکر ادا کیا ہی تھا کہ چلو ٹرین چل پڑی کہ وہ رک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ تقریباً آدھا گھنٹہ خاموش کھڑی رہتی ہے کہ گویا سوچ رہی ہے آیا آگے بڑھے یا نہ بڑھے۔ اب ہم اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کم از کم دو چار قدم اور بڑھے تاکہ ہمارے سفر میں سے دو چار قدم طے ہو جائیں لیکن دفعتہً ٹرین میں حرکت ہوتی ہے۔ ہم پھر خوش ہو جاتے ہیں کہ ٹرین حرکت میں آگئی ہے لیکن یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوتی ہے کہ ٹرین آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی

طرف چلنے لگتی ہے۔ اور جتنا سفر اس نے منزل کی طرف طے کیا تھا اس سے کچھ زیادہ ہی پیچھے چل کر پھر رک جاتی ہے۔ پلیٹ فارم آکر اس طرح ساکت و صامت کھڑی ہو جاتی ہے جیسے اب نہ کہیں جانا ہے نہ آنا ہے۔ بس کھڑے رہنا ہے۔ ریلوے کا عملہ ادھر ادھر پھرتا نظر آتا ہے بلکہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتا بھی دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب ان سے ٹرین کی روانگی کے بارے میں سوال کیا جائے تو کچھ جواب نہیں ملتا۔

غرض ٹرینوں کے اوقات کی پابندی کے بارے میں ہم نے اپنی تجویز پیش کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ بعض ممالک اپنے ملک کی قدیم روایات پر بڑی سختی اور پابندی کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔ دیر کرنا تو ہمارے ملک کی روایات میں داخل ہے۔ کسی وزیر صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوتا ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہو جاتے ہیں اور حاضرین بھی اپنے اندازے کے مطابق وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ دیر سے آجاتے ہیں۔ لیکن وزیر صاحب وقت پر نہیں آتے بلکہ دو ڈھائی گھنٹہ دیر سے آنے کے بعد جلسے کی کارروائی کا آغاز ہوتا ہے۔ ہمارے ملک کی روایت ہے کہ کوئی کام وقت مقررہ پر نہیں ہوتا۔ تو پھر ریلیں کیسے اس روایت سے انحراف کر سکتی ہیں۔ اس نتیجہ پر پہنچ کر ہم نے محکمہ ریلوے کو اس طرف متوجہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

شہر کے ایک مشہور سینما ہاؤس میں ایک انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ جس میں ایک منظر ایسا تھا کہ ایک نوجوان حسین لڑکی سوئمنگ پول کے کنارے نہانے کی غرض سے لباس تبدیل کرنا شروع کرتی ہے کہ اچانک ٹرین آجاتی ہے۔ جب پوری ٹرین گزر جاتی ہے تو وہ لباس تبدیل کر چکی ہوتی ہے۔ اور پانی میں اتر جاتی ہے۔ ایک صاحب مسلسل ایک ہفتہ اس پکچر کو دیکھتے رہے۔ آخر تنگ آکر انھوں نے کہا: "یہ انگریز بھی بڑے وقت کے پابند ہوتے ہیں۔ میں ایک ہفتہ سے مسلسل پکچر دیکھ رہا ہوں کہ اگر کسی دن ٹرین لیٹ ہو جائے تو لباس تبدیل کرنے کا منظر دیکھوں لیکن عین اسی وقت ٹرین آجاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ریلیں ایسی پابندی سے نہیں چلتیں۔"

ٹرینوں کے لیٹ چلنے کے علاوہ باتھ روم میں پانی نہ ہونے، بوگی میں لائٹ نہ ہونے کی شکایت تو اکثر ہم کرتے ہی رہتے ہیں۔ عملاً شکایت کرنے پر آج تک محکمہ ریلوے اپنی روایات کو نہ بدل سکا تو ہم ایک کاغذ کے پرزے پر اگر کچھ لکھ کر بھیج دیں تو اندازہ کر لیجیے کہ کیا نتیجہ نکلے گا۔ چنانچہ ہم نے کچھ تجاویز پیش کرنے سے پیش نہ کرنے کو بہتر سمجھا اور خاموش ہو رہے۔

نتیجہ: محکمہ ریلوے کو کوئی تجاویز بھیجنے سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا

ھدایت: (الف) مسافروں کے لیے: عزیز مسافرو۔ اب تک تم نے جتنی تکلیفیں ریلوں میں برداشت کی ہیں اس کے نتیجے میں تم کو ان تکالیف کا عادی ہو جانا چاہیے تھا بلکہ ہمیں امید ہے کہ تم عادی بھی ہو گئے ہوں گے۔ چنانچہ کسی تکلیف کے عادی ہو جانے کے بعد وہ تکلیف پھر تکلیف نہیں معلوم ہوتی۔ تمہیں غالب کا یہ شعر زبانی یاد کر لینا چاہیے ؎

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

(ب) محکمہ ریلوے کے لیے: بعض ناعاقبت اندیش لوگ اعلان کی بنا پر تجاویز پیش کریں گے۔ لیکن محکمہ کو اپنے وقار اور روایات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ ان میں سے ایسی تجاویز کا انتخاب کیا جائے جن سے مسافروں کو زیادہ سے زیادہ تکلیف ہو اور ریلوے کو زیادہ سے زیادہ آسانی ہو۔ جب مسافر آواز نہ اٹھائیں تو ذمہ داری تجاویز بھیجنے والوں پر رکھ کر خود بری الذمہ ہو جائیں۔

غزل

نرگس سہسوانی

چارہ سازو یہ عارضا کیا ہے — "آخر اس درد کی دوا کیا ہے"
ایک دل اور سیکڑوں جھنجھٹ — "یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"
چاہنے والا کوئی غصیر نہیں — "کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے"
اُن پہ آیا نہیں ہے جب آسیب — "پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے"
حُسن ہے چند روز کا مہماں — "غمزۂ و عشوہ و ادا کیا ہے"
جب کہ کاجل نہیں تو پھر اس میں — "نگہِ چشم سرمہ سا کیا ہے"
کون جانے گا بھید قدرت کا — "ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے"
وعدہ آنے کا وہ بھی کرتے ہیں — "جو نہیں جانتے وفا کیا ہے"
آگیا تیرا چاہنے والا — "اور درویش کی صدا کیا ہے"
جبر یہ اُن کو کھینچ لاؤں گا — "میں نہیں جانتا دعا کیا ہے"

وہ زیادہ حسیں نہ ہو نرگس
"مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے"

دوستوں کا بھلا..... ہوگیا

یوسف یکتا
(سکندر آبادی)

زخمِ دل پھر ہرا ہوگیا
ڈاکٹر کا بھلا ہوگیا
کیوں نہ ڈوبے گی کشتی میاں
ناخدا جب خدا ہوگیا
میں کھلایا جو اِڈلی بڑا
دوست میرا خفا ہوگیا
دستِ نازک وہ جب رکھدیئے
دردِ دل سے جُدا ہوگیا
اس نے شادی بڑھاپے میں کی
دوستوں کا بھلا ہوگیا
دوست یکتا کو دفنا چکے
فرض ان کا ادا ہوگیا

❁ ❁ ❁

غزل

انوار عالم ایم۔ اے۔ ایل ایل بی
دھمری (ایم۔ پی)

ببر کی کھال میں گیدڑ چھپا معلوم ہوتا ہے
سیاست کا اثر اُس کو ہوا معلوم ہوتا ہے
یہ سمجھتے کی اکڑ یہ بولنا کرسی پہ چڑھ چڑھ کر
کسی لیڈر کا شاید منہ لگا معلوم ہوتا ہے
مفکر دورِ نو کا میرے آگے گھاس چرتا ہے
خِرد کی سیدھی پٹڑی سے ہٹا معلوم ہوتا ہے
کہاں غائب ہے سونا اور غلّہ پوچھئے ہم سے
کسی لالہ کے اینٹے میں دبا معلوم ہوتا ہے
تعصب اور سیاست سے نہیں رشتہ کوئی اسکا
مجھے انسان سے بہتر گدھا معلوم ہوتا ہے

علی عباس امید
(بھوپال)

لنچ کا وقفہ

تقرری کا پروانہ تھامتے ہی جس چیز نے مجھے سب سے پہلے چونکا دیا وہ تھے، دفتری اوقات نہ جانے کس ستم ظریف بلکہ زندگی بیزار شخص نے یہ طے کیے ہوں گے؟ صبح اٹھیے تو ناشتہ سے زیادہ دفتر پہنچنے کی فکر اور دن ڈھلے گھر کی جانب رخ کیجیے تو پاؤں میں چکی باندھنے کے لیے یہ خیال حاضر کہ بزعم خود نصف بہتر کن کونا پسند کی آڑ لے کر ہماری خبر لے سکتی ہے اور بچے کن عنقا چیزوں کی فرمائش نہ پوری ہونے کا بہانہ کرکے گھر کو سر پہ اٹھا سکتے ہیں۔ سکیے بعد بچے رات کے چند گھنٹے سو وہ تو سوتے جاگتے گزرتے ہی ہیں۔ چند ہی دنوں کی نوکری نے ہمیں یقین دلا دیا کہ اب ہماری زندگی سے آزادی، چین، سکون، امن، بے فکری اور اس قبیل کے تمام لمحات یک لخت ہجرت کر چکے ہیں۔ بارہ گھنٹوں کے دن اور بارہ گھنٹوں کی رات میں ایسا کوئی بھی وقت نہیں تھا جس میں ہم کھلی فضا میں اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ سکتے۔

مورچہ کوئی بھی ہو، دفتر کا یا گھر کا دونوں ہی پر ہمارے نصیب میں مات لکھی تھی۔ ادھر افسران کا یقین تھا کہ میرا محکمہ جاتی علم صفر ہے اور ادھر وہ خاتون جن کی زندگی کی فلم کا میں ہیرو تھا، بڑے وثوق سے فرماتی تھیں کہ میں جملہ معاملوں میں زیرو ہوں۔ اس شکنجہ میں پھنس کر مجھے یقین ہو چلا تھا کہ افسر خواہ دفتر کا ہو خواہ گھر کا ماتحت کے معاملہ میں ان میں قطعی اختلاف نہیں ہوتا۔

قریب تھا کہ میں اس صبر آزما ماحول کی تاب نہ لا کر ملازمت کو خیر باد کہہ دیتا اور پچاس فیصد آزادی حاصل کر لیتا کہ دفتر کے سب سے مشاق کھلاڑی لبھے داس نے اپنی بزرگی کو میری خوردی پر مہربان کر دیا اور مجھے ان تمام اسرار و رموز سے روشن کرانے لگے جن سے زندگی کے خاکے میں رنگ بھرا جا سکتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ دفتری زندگی سے بہتر اور کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ جتنی بے فکری دفتر میں کام کرنے والوں کو ہوتی ہے، اتنی تو قارون اور سکندر کو بھی نہیں رہی ہوگی۔ بس شرط یہ ہے کہ آدمی سوجھ بوجھ سے کام لے اور قلم سے زیادہ زبان کا استعمال جانتا ہو۔ دراصل دفتری اوقات کا محور ہوتا ہے لنچ کا وقفہ ـــــ جس شخص کو وقت کے اس ٹکڑے کا صحیح استعمال آگیا اسے پورے وقت پر حاوی ہونے میں کوئی زحمت نہیں ہوتی۔

رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہو گیا کہ دفتر کے سبھی لوگ بے حد مطمئن ہیں اور ایسے تمام کام جو گھروں میں بھی ممکن نہیں ہیں دفتر میں ہی کیے جاتے ہیں۔ دفتر ان کے لیے جائے پناہ ہے اور لنچ کا وقفہ آزادیٔ مطلق کا دور۔ دفتر آنے کے بعد کا وقت اس ریسرچ میں صرف

کیا جاسکتا ہے کہ آج اس وقفہ کو کس طرح استعمال کیا جائے گا اور اس کے کامیاب اختتام کے بعد کا وقت اس پر تبصرہ کرنے اور مزید گوشے تلاش کرنے میں لگایا جاسکتا ہے۔

ایسے بہتیرے لوگ ہیں جنھیں اس وقفہ کی کشش ہی کھینچ کر دفتر لے آتی ہے۔ اس نعمت مترقبہ کو لوگ اپنی اپنی پسند اور سہولت کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے دوست نگم بے حد بااصول انسان ہیں۔ وہ کبھی بھی کسی حال میں بھی لنچ آور کو بے لطف نہیں ہونے دیتے۔ ان کا اصول ہے کہ لنچ شروع ہونے سے بیس منٹ پہلے چھوڑ دیتے ہیں اور باہر جاکر پچاس گرام مونگ پھلی خرید کر ناک کی سیدھ میں چل پڑتے ہیں اور بے حد تکلف سے تھوڑی دیر بعد ایک ایک مونگ پھلی کو چھیل کر ایک ایک دانہ منہ میں ڈالتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے ہیں اور اس وقت تک چلتے رہتے ہیں۔ جب تک کہ آخری مونگ پھلی کا آخری دانہ بھی داغ مفارقت نہ دے جائے۔ جس جگہ آخری دانہ ان کے معدہ میں پہنچ جاتا ہے وہاں ٹھہر کر دیر تک وہ خلا میں تکتے رہتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ دفتر کی جانب لوٹ پڑتے ہیں۔ لنچ کا وقفہ نصف گھنٹہ کا ہوتا ہے لیکن نگم کے اس پورے عمل میں ڈیڑھ گھنٹے لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ گھریلو کاموں کی زیادتی کی وجہ سے انھیں صبح کو ٹہلنے کا موقع نہیں ملتا۔ لہٰذا وہ لنچ کا استعمال کر لیتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ اس قدر پابند ہیں کہ اگر کبھی لنچ شروع ہونے سے چند منٹ پہلے بھی دفتر پہنچتے ہیں تو بھی اس چہل قدمی پر ضرور نکلتے ہیں۔

ہمارے اکاؤنٹنٹ دوبے تو اس وقفہ کو اور بھی کارآمد اور پُر لطف بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں تو وہ اپنی میز پر سر ٹکا کر اس طرح کے خراٹے لیا کرتے تھے جیسے کئی ہفتوں بعد سونا نصیب ہوا ہو۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اپنے ایک ماتحت منڈلوئی کے ساتھ شطرنج کھیلنے لگے۔ فائیلوں میں تو منڈلوئی مات کھا جاتا تھا لیکن بساط پر اس کی شہہ کا سامنا کرنا دوبے کے لیے ممکن نہ ہوسکا ـــــــ کچھ دنوں بعد انھوں نے بساط ہی الٹ دی اور مردوزن کا قریبی مطالعہ شروع کر دیا۔ ابھی برسوں کی ہی بات ہے ایک ٹائپسٹ جس کے لیے دوبے نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ اپنے لنچ باکس کے ساتھ انصاف کر رہی تھی کہ یہ حضرت جاکر اس کی بغل میں بیٹھ گئے۔ وہ اخلاقاً مسکرائی اور ڈبہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے کمال بے اعتنائی سے دوپہر میں کھانے کے طویل نقصانات پر مختصر روشنی ڈالی اور پھر جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر سگریٹ سلگانے لگے۔ وہ خاتون منہ میں جاتے ہوئے نوالے کو روک کر بولی"۔ سگریٹ کے دھوئیں سے میری طبیعت خراب ہونے لگتی ہے"۔ انھوں نے ایک گہرا کش لے کر اس کے گرد دھوئیں کا ہالہ کھینچتے ہوئے صلاح دی۔ ایسی صورت میں تو میں آپ کو یہی مشورہ دوں گا کہ آپ سگریٹ بالکل نہ پیا کریں"۔ اس قابل رحم خاتون نے بے بسی سے ان کی جانب دیکھا اور لنچ باکس وہیں چھوڑ کر باتھ روم میں گھس گئی۔ دوبے کافی دیر تک اس کی مسلسل کھانسیوں سے محظوظ ہو کر مسکراتے رہے

لنچ کے وقفہ میں آفس کینٹین کا بُرا حال ہوتا ہے۔

ڈربے سے نکلی ہوئی مرغیوں کی طرح ملازمین اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جو پہلے مارے وہی میر، کی صداقت یہیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہم نے اکثر حضرات کو "جائے تنگ است مردمان بسیار" کا ورد کرتے ہوئے پایا ہے۔ اگر کینٹن میں اُدھار بھی ملتا ہے۔ (جو ملتا ہی ہے) تو سمجھئے کہ وہاں اچھے اچھوں کی دال نہیں گل سکتی کیونکہ بیشتر حضرات آنے والے دنوں کی پرشکن پیشانی کو یکسر فراموش کرکے آرڈر دیتے ہیں۔

ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہیں اپنی صحت ہر حال میں عزیز ہوتی ہے۔ چونکہ یہ بیویوں کے انتہائی وفادار ہوتے ہیں

لہذا انھیں زحمت دے کر ٹفن لانے کے بجائے کینٹین کا رُخ کرتے ہیں۔ وہاں ان کے دو ہی کام ہوتے ہیں ـــــ رونکی کھائی ہوئی ایسی چیزیں، آرڈر دینے کے قبل جن کا ذائقہ زبان پر آجاتا ہے، کھانا اور اپنے تجربات کی روشنی میں ازدواجی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کرنا۔ مثلاً ایک صاحب کہیں گے "بھائی! کیا پوچھتے ہو، شادی تو چیونگم ہے۔ منھ میں ڈالو، کچھ دیر تو بہت میٹھا لگتا ہے لیکن پھر جاہے جتنا بھی کچلا جائے بے ذائقہ ہی رہتا ہے۔" مقابل والے حضرت تائید میں دیر تک سر ہلاتے رہیں گے اور پھر سرد آہ بھر کر لب کھولیں گے "بالکل یہی بات ہے۔ شادی! خدا دشمن کو بھی محفوظ رکھے اس بلا سے۔ یہ تو ایسا جوتا ہوا جو تا ہے جو ہر شخص پہننا چاہتا ہے لیکن وہ کہاں کہاں کاٹتا ہے۔ اس کا احساس صرف پہننے والے کو ہی ہوتا ہے۔" دو شخص کو ایسے ہی دو ستم رسیدہ بزرگ سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے کہ ان میں سے ایک کو خیال آیا کہ آرڈر دیئے ہوئے نصف گھنٹہ گزر چکا ہے لیکن تعمیل کے آثار ندارد ہیں۔ اور معدہ باغی ہوتا جا رہا ہے۔ انھوں نے بیرے سے پھر تاکید کی۔ لیکن وہ مردِ آزاد اپنی مرضی کا مالک نکلا۔ سہ بارہ گزارش کرنے کے بعد بھی محرومی ہی ان کا مقدر رہی تو یہ سن رسیدہ منیجر کے پاس پہنچے اور مودبانہ دریافت کیا "جناب کیا آپ کو جیوتش میں کچھ دخل ہے؟" اس نے کہا "جی ہاں میں نے باقاعدہ ایک آچاریہ کی کھڑاؤں سیدھی کرکے یہ حاصل کیا ہے۔" یہ سنکر انھوں نے آہستہ سے فرمائش کی "تو ہمیں صرف یہ بتا دیجیے کہ جس ناشتہ کا ہم گھنٹہ بھر قبل آرڈر دے چکے ہیں وہ ہمیں کب تک مل جائے گا؟" یہ سن کر منیجر نے نہ صرف معذرت کی بلکہ بیرے کو بلا کر تنبیہہ بھی کی "اتنی لاپرواہی ٹھیک نہیں ہے۔ گھر اور کنٹین میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔"

اگر دنیا کے کسی بھی حصہ میں کرکٹ چل رہا ہو تو یہ وقفہ بے حد اہم ہو جاتا ہے۔ ہر میز پر ٹرانزسٹر ہوتے ہیں اور اس کے گرد بیٹھنے والوں سے زیادہ کھڑے ہونے والوں کی تعداد ہوتی ہے۔ ان دنوں ویسے تو اس آوٹ ڈور گیم کے احترام میں دفتر کے سبھی انڈور پروگرام معطل ہو جاتے ہیں۔ اگر کبھی کسی مجبوری کے سبب جاری بھی ہوں تو پھر کان اور ہاتھ الگ الگ مہموں میں لگے رہتے ہیں۔ افسروں کے ساتھ ساتھ بابوؤں کی بھی مصروفیت بڑھ جاتی ہے کیونکہ بابو اپنے ٹرانسسٹر پر جو گانے سنتا ہے پھر صاحبوں سے اسکور پوچھ کر ان کی انا کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتا ہے۔ لنچ میں پھر پور بحث شروع ہوتی ہے کہ کھلاڑی نے پہلے اور تیسرے بال کو کھیلنے میں کیا غلطی کی، گواسکر کو پیکر سرکس میں کھیلنے کی حامی قطعی نہیں بھرنی چاہیے، ویسٹ انڈیز کی ٹیم میں اب دم نہیں رہا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان آراء اور بعد کی بحثوں نے دفتر یا اس کے قریب ہی ایسے محاذ کھول دیئے ہیں جن کے طفیل میں لنچ کا وقفہ ختم ہونے کے بعد دفتر میں لوٹنے کے بجائے کئی لوگوں کو گھر یا اسپتال جانا پڑتا ہے۔

کئی ایسے دور اندیش حضرات بھی ہوتے ہیں جو اپنا پورا وقت نئے نئے لطائف یاد کرنے میں صرف کردیتے ہیں اور پھر لنچ کے وقفہ میں افسر کی دلجوئی کم اور اس کی گڈ بک میں نام درج کرانے کے خیال سے زیادہ، اسے سناتے ہیں اور اس کے ٹیم والیوں کے مقابل اپنی پوری بتیسی رکھ دیتے ہیں۔ ان کے اس عمل سے دونوں ہی کو فائدہ ہوتا ہے۔ افسر کی بلا ٹکٹ تفریح ہو جاتی ہے اور انھیں مفت کی چائے مل جاتی ہے، نیز جو مراسم استوار ہوتے ہیں ان کا مول لگانا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ ایسے ہی ایک صاحب اپنی لطیفہ بازی کے بل پر خود افسر بن گئے۔ لطیفہ سنانے کا انکا ایک عمر کا ریاض تھا لہذا پورے وقت ماتحت عملہ کو لطیفے سنانے کے علاوہ ان کا اور کوئی شغل ہی نہیں تھا۔ شروع میں تو لوگ خوش ہوئے کہ بہت ہی زندہ دل افسر آیا ہے۔ جو ماتحتوں میں امتیاز نہیں کرتا اور ہنستا ہنساتا رہتا ہے لیکن چونکہ زیادتی خیر کی ہو یا شر کی، بہر حال غیر مفید ہوتی ہے ـــــ آہستہ آہستہ لوگوں کی سمجھ میں آگیا کہ لطیفہ بازی موصوف کا دیرینہ مرض ہے جو لاعلاج ہو چکا ہے۔ وقت بے وقت، نئے اور پرانے مہذب و غیر مہذب موقع و محل سے بے نیاز لطائف سن سن کر

اُک اکتانے لگے کیونکہ انھیں دیگر کاموں کے لیے وقت ہی نہیں مل پاتا تھا، بس دفتر پہنچے اور صاحب نے بغیر کسی تمہید کے لطیفے چھوڑنا شروع کر دیئے۔ لطیفہ خواہ ایک ہزار دو مرتبہ کے بکے ہوئے کیوں نہ ہوں خود تو بلند و بالا قہقہہ لگاتے ہی تھے ماتحتوں سے بھی متوقع رہتے تھے کہ ان کی باچھیں بھی پسندیدگی کی مہر ثبت کریں۔ اس دفتر میں کام کرنے والے ایک حضرت سرِ راہ ہم سے ٹکرا گئے۔ نہ جانے کس سلسلہ میں ہم نے ایک لطیفہ سنانا چاہا لیکن وہ ہاتھ جوڑ کر قدموں میں آ رہے اور بولے کہ "للہ باز آئیے۔" جب راہ چلتے مسافر بھی ان کی کور ذوقی پر مبہوت ہوئے تو انھوں نے بتایا کہ ہنسنا تو کجا ان میں مسکرانے کی بھی تاب نہیں ہے کیونکہ وہ پچھلے کئی ماہ سے مسلسل خوف کی وجہ سے ہنستے چلے رہے ہیں۔ استعجاب اور بھی بڑھا کہ آخر خوف کی ہنسی کیسی ہوتی ہے! وہ نیم زندہ لہجہ میں بولے "آپ کو ہمارے مصائب کا کیا علم، ہمارے افسر لگاتار لطیفے سناتے رہتے ہیں اور ان کے خوف کی وجہ سے ہمیں ہنستے رہنا ہوتا ہے۔" ظاہر ہے کہ ان کی ہنسی کا درد رحم کا متقاضی تھا اور ہم نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

نسبتاً نئے ملازمین لنچ کے وقفہ کا استعمال کچھ رومانی مصروفیات کے لیے کرتے ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ گھر سے روانہ ہوتے ہوئے لباس، میک اپ اور حلیہ آرائش صرف اسی وقفہ کیلئے کی جاتی ہیں کیونکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دفتر کے کونے میں، آس پاس کسی درخت کے نیچے یا ہوٹلوں کے کیبن میں بیٹھ کر خوش ہوں، خیالات یا زیادہ ہوا تو رومال کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اکثر ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ یہ دفتری عشق یوں پروان چڑھا ہے کہ کونوں کھدروں میں ملنے والے کھلے بندوں اس طرح چلتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ خاتون فتح مندی کے نشہ میں چور آگے آگے اور پیچھے پیچھے ان کا لنچ باکس اٹھائے ہوئے وہ حضرت جن کے سر سے عشق کا بھوت تو اتر چکا ہوتا ہے۔ لیکن گردن کسی نامعلوم اندیشہ سے جھکتی ہی چلی جاتی ہے۔

رفتار و گفتار اور عادات و اطوار میں ایک انسان کا دوسرے سے جدا ہونا فطری ہے۔ کبھی کبھی اس سچائی کا سنگھاسن ڈانوا ڈول ہوتا ہوا بھی نظر آتا ہے۔ اب دیکھیے نا ہمارے دفتر کے تصنیف حسین اور شنکر لال میں تمام تر اختلافات کے باوجود لنچ کا وقفہ گزارنے کے معاملہ میں جو عظیم اتحاد ہے وہ نہ صرف مثالی بلکہ تقلید کے قابل ہے۔ یہ حضرات لنچ آور کو کھانے کی چھٹی کہتے ہیں اور اس کا استعمال بھی اسی لیے کرتے ہیں۔ ہر دو اشخاص وقفہ شروع ہونے کے چند منٹ بعد نہایت ہی شائستگی سے اپنی اپنی نشستوں سے اٹھتے ہیں اور پھر ان میزوں کا رخ کرتے ہیں جہاں اور لوگ کچھ کھانے پینے میں مصروف ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ بڑی بے نیازی سے اس میز تک پہنچتے ہیں جس پر کھانے پانی کے علاوہ بھی کچھ رکھ دیا ہو۔ قبل اس کے کہ ان اشیاء کا منگانے والا ان کا استعمال شروع کرے یہ اس کے بال بچوں کے علاوہ رشتہ داروں کی عافیت بھی دریافت کرنے لگتے ہیں۔ اگر اس نے 'لاحول کی طرح' 'ٹھیک ہے' کا ورد کر کے نجات چاہی تو یہ اس کے کیریکٹر رول، ریٹائرمنٹ، پروموشن جیسے موضوعات چھیڑ کر اسے یوں بے بس کر دیتے ہیں کہ وہ انھیں کرسیاں پیش ہی کر دیتا ہے۔ پھر تو ان کے فن کا ماہرہ صرف اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ مقابل میں اعلیٰ انگشت بہ دنداں دیکھتا ہی رہے۔ اس وقت تک جب تک کہ بیرا بل کی رقم کے لیے تماشا نہ نہ ہلا دے۔ آپ کے لئے (میرے لئے بھی) یہ کام بے حد مشکل بلکہ ناممکن ہے لیکن ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہے جنھوں نے اپنی پوری ملازمت دوران لنچ کے وقفہ کا انتہائی کامیاب استعمال کیا ہے۔ آپ جیسے (مجھ جیسے بھی) لوگ ان پر تبصرہ کرتے ہیں، تذکروں میں بے نقط تک کہہ جاتے ہیں پھر بھی ان سے مفر ممکن نہیں۔ وہ تو کامیاب ہو کر اجنبی بن جاتے ہیں اور ناکام دوگنی شدت سے غیبت میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ غیبت ایک دم ہوائی ہوتی ہے اور اشیاء بالکل ٹھوس۔

ہم نے اکثر ایسے سن رسیدہ حضرات دیکھے ہیں جنھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ وقفہ لنچ کے انتظار میں گزار دیا ہے۔ ان

حضرات کو جو لذت اس انتظار میں ملی ہے اس سے تو یار طرحدار کا وعدہ وصال بھی عاری رہا۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ صبح کی بیداری دن کے زرد پہاڑ کو سر کرآتی ہے۔ اس لمحہ کرب میں آس بندھانے والا پہلا اور آخری سہارا صرف لنچ کا وقفہ ہوتا ہے چنانچہ وہ دفتر پہنچنے کے قبل ہی اس کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ یہ انتظار انھیں پرشکل موڑ سے بہ عافیت گزار لے جاتا ہے اور اس کی آمد تک نصف معرکہ سر ہو جاتا ہے۔ لنچ تو خیران کا ہوتا ہی ہے، تمام بندشوں سے آزاد آسمان میں اڑنے والے بے فکر پرندوں کی طرح مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں جائے خانوں کے جملہ حقوق اپنے نام کرانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ دل دنیا سے بے نیاز ہونے لگتا ہے اور یہ اپنے کو مایا جال سے بالکل الگ کر لیتے ہیں۔ ان دنوں میں اس وقفہ کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ کبھی بھی پورا نہ ہونے والا بجٹ سلا غور و خوض کا متقاضی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ اس کی نذر کر دیا جاتا ہے۔

خاکسار نے بھی اب تک کی دفتری زندگی کا بڑا حصہ اسی وقفہ کی پناہ میں گزار دیا ہے۔ ہر چند کہ ہم ملازمت سے بیزار ہیں پھر بھی اسے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری حکمت عملی ہے نہ کہ کم عقلی۔ اگر آپ نے بھی حکمت عملی کی انگلی پکڑ لی تو یہ یک وقت مہر و ماہ و نجوم اور کہکشاں کے علاوہ یہاں وہاں کا جائزہ لینے میں بھی کامیاب رہیں گے۔

شگوفے

(مرسلہ شمیم زیدی (بمبئی))

○ علی عباس امید بیمار تھے۔ ان کے دوست معروف ہندی شاعر دشینت کمار عیادت کو پہنچے اور ان سے پوچھا "یار! تم نے کوئی دوا لی یا نہیں"۔ امید صاحب نے نفی میں جواب دیا تو وہ بولے "دوا تو لینی ہی ہوگی۔ تم یہ بتاؤ کہ علاج کے لیے تمہارے دوست حکیم اختر عالم کو بلاؤں یا ڈاکٹر یوسف کو؟"

امید صاحب نے کہا "حکیم اختر عالم کو بلاؤ تو اچھی بات ہے۔ ڈاکٹر یوسف کو بلاؤ گے تو دو باتیں ہونگی یا تو وہ دوا دیں گے یا انجکشن لگائیں گے۔ انجکشن لگائیں تو اچھی بات ہے۔ دوا دیں گے۔ تو دو باتیں ہونگی یا تو میں اچھا ہو جاؤں گا یا مر جاؤں گا۔ اچھا ہو جاؤں گا تو یہ ٹھیک ہے مر گیا تو دو باتیں ہوں گی تم لوگ میری لاش کو دفن کر دو گے یا جنگل میں پھینک دو گے۔ دفن کر دیا تو اچھی بات ہے۔ جنگل میں پھینک دیا تو دو باتیں ہوں گی۔ میری لاش کو جنگلی جانور ہڑپ کر جائیں گے یا چیل کوے نوچیں گے۔ جنگلی جانور ہڑپ کر جائیں تو اچھی بات ہے چیل کوے نوچیں گے تو دو باتیں ہونگی۔ یا تو میری ہڈیاں مٹی میں مل جائینگی یا کارخانے والے اٹھا لے جائینگے۔ مٹی میں مل گئیں تو اچھی بات ہے۔ کارخانے والے لیگئے تو دو باتیں ہونگی وہ میری ہڈیوں سے فاسفورس بنائیں گے یا صابن۔ فاسفورس بنائیں تو اچھی بات ہے صابن بنائیں گے تو دو باتیں ہوں گی۔ اس صابن سے مرد نہائیں گے تو اچھی بات ہے عورتیں نہائینگی تو مجھے بڑی شرم آئے گی مجھے شرم آئے گی تو دو باتیں ہونگی...." اور دشینت کمار نے امید صاحب کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ جب قہقہوں نے دم لیا تو طے پایا کہ انہیں کسی دوا کی ضرورت نہیں ہے (بشکریہ تیر نیم کش بھوپال)

○ چند صاحب ذوق حضرات اُردو کے ایک شاعر کی مدح سرائی کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا "صاحب! ان کی کیا بات ہے، بہت بڑے شاعر ہیں۔ اب تو حکومت کے خرچ پر یورپ بھی ہو آئے ہیں۔ ہری چند اختر جو دیر سے خاموش تھے یہ سن کر متانت سے بولے "جناب! اگر کسی دوسرے ملک میں جانے سے کوئی آدمی بڑا شاعر ہو جاتا ہے تو میرے والد ملک عدم جا چکے ہیں لیکن خدا گواہ ہے کبھی ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکے۔ (بشکریہ "دوشیزہ" کراچی)

غزلیں

ساک میں دی چمک مہ کامل بنا دیا
لیلیٰ کو تو نے قیس کے قابل بنا دیا
بزم وہ پھیکی تھی بے ذوق و شوق سے
دل آگیا تو رونقِ محفل بنا دیا
تارے دکھا کے دن میں ہمارے ہی چاند نے
رات اور دن میں فرق کو مشکل بنا دیا
دیدار کا وہ نٹر یہ رہا دو گھڑی مگر
اس نے ہمارے نام پہ اک بل بنا دیا
زلفوں کی چھاؤں اتنی گھنی ہے کہ کیا کہیں
ہم کو تمہارے پیار نے کاہل بنا دیا
مطلع غلیظ، مصرعے غلط، بور قافیے
آخر غزل کو بزم کا قاتل بنا دیا
بیگم سلیقہ مند ہے بے انتہا جلیل
ہم ایسے شیر دل کو بھی بزدل بنا دیا

رشید عبد السمیع جلیل

مولانا جزاک اللہ، کیا شکل بنائی ہے
شملے کی ہے دُم پیچھے، اور سامنے ٹائی ہے
پاجامہ سے باز آجا، تہمد پہ گزارا کر
جب کپڑے کی قیمت سے سلوانا سلائی ہے
کالا ہے، کلوٹا ہے، گنجا بھی ہے لنگڑا بھی
کیسا ہی سہی لیکن، پھر بیوی کا بھائی ہے
کالج میں جو پڑھتا ہے وہ نورِ نظر ان کا
لڑکی سے کہیں بڑھ کر سُنتے ہیں کہ شائی ہے
مسجد میں امامت کو مولانا نہ آئے
بیوی تو نہیں اُن کی میکے سے گھر آئی ہے
کیوں پاؤں نہ دھو دھو کر بڑھیا کا پئے ہاشم
بیگم کی خدا رکھے وہ دودھ پلائی ہے

ہاشم عظیم آبادی

زندگی اپنی اجیرن یوں بنا لیتے ہیں لوگ
خود نمائی میں خودی کو خود ہی کھا لیتے ہیں لوگ

دال، جب مطلب کی پارٹی میں گلا لیتے ہیں لوگ
ڈھیر سے دو گز دُکاں اپنی بڑھا لیتے ہیں لوگ

شوقِ موسیقی تو ثقہ حضرات بھی رکھتے ہیں خوب
باتھ روم اور لیٹرن میں گنگنا لیتے ہیں لوگ

در پہ رکھوں گا کسی نیپالی پہرے دار کو
دیکھوں کیسے نیند چپکے سے چرا لیتے ہیں لوگ

بوجھ جب کاندھے پہ اپنی زیست کا اٹھتا نہیں
رکھ کے "گن" اوروں کے شانے پر چلا لیتے ہیں لوگ

ماحضر کا لفظ تو بس رہ گیا ہے کارڈ تک
دعوتوں کو لوٹ کا میداں بنا لیتے ہیں لوگ

کھاتے پیتے نام کیسے رب کا اپنے لے کوئی
مفلسی میں رات دن نام خدا لیتے ہیں لوگ

دوپہر کی دھوپ کا احساس کیوں کر ہو انہیں
بند کمرے میں جو پنکھے کی ہوا لیتے ہیں لوگ

شخصیت کی کور چشمی کو چھپانے کے لئے
آنکھ پہ اک گولڈن چشمہ لگا لیتے ہیں لوگ

ہے یہی رسم و رواج اہلِ دنیا، دوستو!
دل سے روتا ہے جو صابرؔ تو مزہ لیتے ہیں لوگ

صابرؔ بہاری (رانچی)

رؤف خوشتر
(گلبرگہ)

پرورشِ لوح و قلم

ہم قوم کی زبوں حالی پر اظہارِ غم کے لیے دہاڑیں مار مار کر رونا چاہ رہے تھے جسے دھاڑیں کہتے ہیں کہ یکایک ہمارے سامنے پانچویں فرزند نمودار ہوئے۔ ان کے چہرے کی مایوسی بتلا رہی تھی کہ اس بار بھی انٹرویو میں کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ ڈگری پاس تو ہیں نوکری پاس نہیں۔ دیگر چار فرزند چہار درویش کی طرح سفر میں ہیں چونکہ عصری درویش ہیں اسی لیے حصولِ ملازمت سفر کا مقصد ہے۔ یہ تمام بی۔اے ہو کر بے روزگاری کے پی۔اے ہیں۔ ہم نے رودادِ انٹرویو پوچھی تو صاحبزادے فرمانے لگے۔

"متعلقہ افسر میرے جوابات سے مطمئن نظر آنے لگا کہ یکایک فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون پر گفتگو کے بعد اس کا آئس کریم سا چہرہ سخت کیک کی شکل میں تبدیل ہو گیا سرد مہری سے جواب ملا: "مجھے افسوس ہے" میں سمجھ گیا کہ کسی بڑے آدمی کا فون تھا۔ (ویسے بھی دورانِ انٹرویو فون کی گھنٹی ہونہار قابل مگر غریب امیدواروں کے لیے خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے کیونکہ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے کہ کسی اوپر والے نے اپنے بیٹے بھانجے یا سالے کے لیے فون کیا ہے) اس طرح ہمارا پتہ کٹ گیا۔ سوچتا ہوں اس قسم کی اقربا نوازی اور جانب داری کب ختم ہو گی۔

بچہ نہ جانے کیا کیا بکتا رہا لیکن ہمارا ذہن کہیں اور کھو گیا تھا۔ پانچ فرزند، چھ دختران، ماں باپ، بیوی سالے اتنے گنجان آباد مکان کو قبرستان بننے سے کیسے بچایا جائے۔ یکایک بجلی کی طرح ایک خیال ذہن میں کوندا۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے خود جامہ زیب تن کیا اور چل پڑے۔

محلہ کے بزرگوں کی ایک میٹنگ بلائی۔ جس میں سامعین یہ فرق محسوس نہیں کر پائے کہ دھواں؟ — تقریروں کا تھا یا بیڑیوں کا۔ ہم میٹنگ سے پیشتر مگر مچھ کی تصویر کے کافی بوسے لیتے رہے اس لئے قوم کے غم میں آنسو بہانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ زار و قطار روتے ہوئے ہم نے قوم کے بچوں کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا اور ہچکیوں کو بریک لگاتے ہوئے بتلایا کہ "محلہ میں ایک انگریزی سکول کا قیام ناگزیر ہے اس لئے کہ تعلیمی ممالک کو منتقلی کے لیئے عربی کے بعد انگریزی واقفیت ضروری ہے"۔ فوراً اسی میٹنگ میں سکول کی انتظامیہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ہمارے چمچوں نے صدارت کے لیئے ہمارا نام پیش کیا۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں مارشل ٹیٹو (اب مرحوم) کی طرح ہمیں بھی تادمِ حیات صدر منتخب کیا گیا۔ بدلے میں ہم نے اپنے ہم نواؤں کو کمیٹی کے دوسرے زرخیز عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ گویا ع کیا خوب سودا نقد ہے اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے

ایک وفد کی شکل میں اسکول کی منظوری کے لئے ناظم تعلیمات کے حضور میں پیش ہوئے اور ہمیں بہ آسانی اجازت مل گئی کیونکہ ناظم انگریزی سے مرعوب نظر آ رہا تھا۔ چونکہ انگریزی مدارس کے نام پھولوں سے منسوب کرنے کا چلن ہے۔ ہم شہر کے قدیم گل فروش سے اپنا مدعا بیان کیا۔ اس نے ایک بوسیدہ بیاض نکال کر بتلایا کہ گلاب سے لے کر گوبھی سبھی پھول الاٹ ہو چکے ہیں صرف دھتورا رہ گیا ہے۔ ہم نے اس پھول پر دھول ڈالنے کہا۔ لاچار ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔ دن میں تارے نظر آئے۔ فوراً ایک جگمگاتا نام ذہن میں ابھرا۔ فائیو اسٹار سکول (جب ہوٹل ہوں تو سکول کیوں پیچھے رہیں)

اسکول کی عمارت کے لیئے موقعہ دیکھا نہ محل۔ اپنے آبائی مکان کے چار کمروں کو سکول کے لئے وقف کر دیا۔ (یہ اور بات ہے کہ محکمۂ تعلیم سے ہر ماہ کرایہ ہمارے اکاونٹ میں جمع ہو رہا ہے)

اسکول میں اساتذہ کے تقررات کے لیئے ہم نے محتاط روی اور سوجھ بوجھ سے کام لیا۔ "نیکی اور بھلائی مکان سے شروع کی جائے" کے مصداق اپنے پانچوں فرزندان کو مستقل جائدادوں پر لینے کے بعد سیکولر پالیسی کو عملی شکل دینے اور قومی دھارے میں ڈوبنے (اب بہنا کافی نہیں) کے لیئے ہندی، کھیل کود اور علاقائی زبان کی جائدادوں پر دوسرے مذاہب کے امیدواروں کو بلا فرق و فون بھرتی کر دایا۔

قوم کی معاشی حالت کا بغور اور ہمدردانہ جائزہ لینے کے بعد فیس ۲۰ روپے ماہانہ مقرر کی گئی ہے۔ سالے صاحب کو کتابوں، بیاضوں کی دوکان کھول کر دی گئی۔ بہنوئی صاحب پارچہ فروش تھے۔ لیکن ہمارے سوا کوئی دوسرا کپڑا خریدنے نہیں آتا تھا۔ معلوم ہوا کہ شہر میں دیگر مدرسہ والوں نے اپنے پسندیدہ رنگوں کا یونیفارم بنوا لیا ہے۔ ہمارے لیئے سیاہ رنگ رہ گیا تھا۔ جھٹ بہنوئی صاحب کو سیاہ رنگ کپڑوں کے کئی تھان منگوانے کہا گیا۔ سرپرستوں کو سیاہ رنگ کے ہمہ پہلو فوائد سے آگاہ کیا گیا۔ جیسے سیاہ رنگ کو دیکھ کر سواریاں فوراً رُک جاتی ہیں۔ بچے حادثے سے بچ جاتے ہیں۔ کتے بیل گھوڑے اِس رنگ سے سہم جاتے ہیں اور یوں بھی ہندوستان میں آئے دن کسی نہ کسی دن قائد کی موت یا برسی رہتی ہے۔ ان موقعوں پر مجسم سوگواری کے لیئے سیاہ رنگ کام آتا ہے۔

الغرض بہنوی صاحب کی دوکان پر سیاہ رنگ کے کپڑے کے لیئے تانتا بندھ گیا۔ مدرسہ کے لیئے سیاہ یونیفارم

بنانا ہمارے سفید کارناموں میں ایک ہے۔

مدرسہ کے افتتاح کے لئے اپنے حلقہ کے وزیر کو مدعو کیا گیا۔ وہ مصنوعی پس و پیش اور عدیم الفرصتی کے نخرے کے بعد تشریف لائے۔ وزیر موصوف حسبِ عادت مدرسہ کی ترقی کے لیئے ہر ممکنہ تعاون کا وعدہ فرمایا۔ ہم نے اس وعدہ کو ہوا میں تحلیل ہونے نہیں دیا بلکہ ٹیپ میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا تاکہ وقتِ ضرورت ٹیپ بجوا کر ان سے پوچھا جائے کہ ع کیا ہوا تیرا وعدہ

قلیل عرصہ میں بچوں کے ساتھ اسکول چل پڑا۔ اسکول میں شرکت کے لیئے بچوں کی تعداد مہاجن کے سود کی طرح بڑھنے لگی۔ ادھر مکان میں بیگم صاحبہ کا تقاضا تھا کہ بچیاں جوان ہو کر بھی محض اس لیئے گھر میں ہیں کہ اُن کے جہیز کا انتظام نہ ہو سکا۔ ہم نے فوراً تعلیمی سال کے آغاز میں بچوں کی شرکت کے لیئے درجہ ذیل تحائف کی شرط عاید عائد کر دی۔

جماعت ہفتم : آہنی الماری جماعت ششم : آہنی میز جماعت پنجم : آہنی کرسی
جماعت چہارم : برقی پنکھا جماعت سوم : دیوار گھڑی جماعت دوم : تھرماس
جماعت اول : گلاس سیٹ۔

(واضح ہو کہ یہ تمام اشیاء عصری اسکول میں بچوں کا معیارِ تعلیم و صحت کے لیئے ضروری ہیں) اس طرح دھوم دھام سے گھوڑے جوڑے کے علاوہ ڈھیر سے جہیز کے ساتھ بچیاں اسکول کے بچوں کو دُعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ اب مدرسہ میں بچوں کی شرکت سیلاب کی طرح بڑھ رہی ہے اور ہر سال ہمارے اکاونٹ میں کئی صفروں کا اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم خاصے مصروف آدمی بن گئے ہیں۔ ہماری پُرخلوص خدمات کے پیشِ نظر ہمیں سرسید ثانی کے خطاب سے نوازا گیا۔ پانچ منزلہ عمارت تعمیر کی گئی اور پانچ فرزندوں کا فائدہ سٹار سکول چمک رہا ہے مکان میں کار ہے کوئی بے کار نہیں۔ مدرسہ میں جیسے ہی کوئی جائداد نکل آتی ہے کسی رشتہ دار کا تقرر کیا جاتا ہے۔

قوم کے بچے پڑھ رہے ہیں ہمارے بچے پل رہے ہیں۔

اور ہم صوفے پر لیٹے سگار منہ میں دبائے مدرسہ کی شاندار عمارت یا گھریلو روزگار عمارت کو دیکھ کر زیرِ لب گنگناتے ہیں ——— ع : ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے!

لئیق صلاح

خدا کی دین

اس دور کے بعض مستثنیات میں ایک یہ بھی ہے کہ کثرت میں وحدت کے جلوے نظر آنے کے بجائے، وحدت میں کثرت نظر آتی ہے۔ بچوں کی کثرت کے سلسلے میں ایک بہت ہی دلچسپ واقعے کا اگر ذکر کروں تو شائد نامناسب نہ ہوگا۔ ایک صاحب جن کے پاس کنسٹر اکٹر ہونے کے ناطے مال بھی کثیر ہے، اور قاضی صاحب نے نکاح کے وقت جو دعا مانگی تھی • اَوْلَادًا کَثِیْرًا " تو آمین کہنے والوں نے نہایت صدقِ دل سے • آمین • کہا تھا۔ تو کنسٹر اکٹر صاحب کو اولاد بھی اسی مناسبت سے ہوئی۔ روز آنہ کا حال تو خدا جانے لیکن جب اُن کے نونہالوں کو مدرسہ میں شریک کرانے کی نوبت آئی تو بے چاروں کو ایک ناگہانی صورتحال سے دوچار ہونا پڑا۔ اپنے باقاعدہ فوج کے ساتھ مدرسہ پر حملہ آور ہوئے۔ خدا نے انھیں علم سے بے نیاز کر دیا تھا۔ لہذا اُنہوں نے آتے ہی، شرکت کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے، اس اہم راز کو بھی افشاء کر دیا کہ، فارمس مدرسہ ہی میں پُر کئے جائیں۔ فیس کی بات چلی تو اُنہوں نے کہا کہ وہ ماہانہ فیس ادا کرنے کی دردسری قبول کرنے کی بجائے، ایک مُشت، دو قسطوں میں یا ایک قسط میں ادا کر دیں گے۔ مدرسے والے تو یہ سُن کر بہت خوش ہو گئے۔

ہاں! تو اَب فارمس کی خانہ پُری کرنی تھی۔ بڑی لڑکیوں نے اپنے اپنے نام بتائے تو آفس والوں نے اُن کے حسبِ ارشاد جلد جلد نام اور نشان سب قلم بند کر لیئے۔ لیکن جب چھوٹی صاحبزادی کی باری آئی تو اُنہوں نے والدِ بزرگوار سے نام دریافت کیا۔ والد صاحب نے بڑے اعتماد سے ..... النسا ء کہا۔

تب بڑی لڑکیوں نے کہا۔ نہیں ابّا آپ جو نام لے رہے ہیں وہ تو گھر پر ہے۔! ابّا صاحب نے نہایت بے اعتنائی سے کہا، میں نے جو نام کہا ہے، لکھ لیجئے، یعنی فی البدیہہ اب نام کہنا مشکل ہے۔ اس لئے اُس گھر والی کا نام بدلنا آسان ہے۔ آفس والے بھی خوش ہو گئے کہ اسی بہانے عقیقے کی دعوت آ جائے گی۔ دریں غا برگوش ...... سنا ہے صاحب موصوف دو حرم سراؤں کے مالک ہیں۔ شائد اسی وجہ سے وہ فرسٹ لانرز اور سکنڈ لانرز کو گڈ مڈ کر دیتے ہیں۔

—— • : • ——

ہمارے بھی مہماں ہیں کیسے کیسے!!

غوث محی الدین احمد خواہ مخواہ
(بمبئی)

بمبئی جیسے شہر میں ۲۰ برس کی صبر آزما جد و جہد کے بعد جب ہم اپنے ذاتی مکان میں منتقل ہوئے تو کئی دنوں تک یقین ہی نہیں ہو پاتا تھا کہ ہم مالک مکان بھی ہو سکتے ہیں۔ جب آہستہ آہستہ یقین ہوتا گیا تو ہمیں بڑی سے بڑی سائز کی بنیان بھی اپنے نحیف اور لاغر جسم پر تنگ محسوس ہونے لگی۔ یوں جی چاہتا کہ ہر راہ گیر سے گلے ملیں اور اسے اپنی خوشی میں شریک کریں۔ یہ تو خیر ہم نہ کر سکے البتہ اتنا کر سکے کہ قریب و دور کے رشتہ داروں اور دوست احباب کو اپنے نئے مکان کے پتے سے مطلع کر دیا۔

اب اسے شومئ قسمت کہیئے یا کچھ اور کہ اتفاق سے ہمارا غریب خانہ سانتا کروز ہوائی اڈے سے بے حد قریب واقع ہے۔ نتیجتاً وطن مالوف سے، اپنے نام سے پہلے لفظ 'حاجی' کی اضافت کے شائقین سے لے کر بہتر مستقبل کے لئے عرب ممالک کو جانے والے اور بالترتیب حج سے فارغ ہو کر اور تیل کی دولت سے مالا مال ہو کر واپس آنے والے ایسے نوجوان جن سے یا جن کے والدین سے ہماری معمولی سی علیک سلیک رہی ہو گی، ہمیں میزبانی کے شرف سے نوازے بغیر واپس جانے کیلئے تیار نہیں ہیں۔

رفتہ رفتہ ہم مہمانوں کے (یا مہمان ہمارے) اس قدر عادی ہو گئے کہ مہمان گھر پر نہ ہو تو گھر کی دیواریں کاٹنے کو دوڑتیں۔ پھٹا ہوا صوفہ ہمیں منہ چڑاتا نظر آتا۔ نل کے اندر سے آنے والی بھن بھن کی آواز ہمارے کمزور قلب پر ضرب لگاتی محسوس ہوتی۔ یہ صورت حال اگر اتفاقاً ۲، ۳ دن تک جاری رہتی تو چوتھے دن ہم اپنے ہی گھر میں ایک دوسرے سے مہمانوں جیسا برتاؤ کرنے لگ جاتے۔ بظاہر اچھے خاصے دکھائی دینے والے کھانے ہمیں بھی پھیکے سیٹھے لگتے۔

غسل خانے میں جی نہیں لگتا۔ ریڈیو پر پکے گانے اور شاستریہ سنگیت سُن کر جی بھر آتا اور آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں دنیا سے جی اس قدر بیزار ہو جاتا کہ طبیعت خودکشی کی طرف مائل ہونے لگ جاتی ۔ اگر ایک ہفتہ بھر کے لئے مہمانوں کا ہجوم نہ ہوتا تو ہم میاں بیوی اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے کہ مبادا کسی نادانستہ حرکت سے مہمانوں کے آبگینۂ دل کو ٹھیس تو نہیں پہنچی جس کے بدلے میں ہم دونوں قید تنہائی کی سزا بھگت رہے ہیں۔!

مہمان موجود ہوں تو سبھی قسم کے کھانے اچھے لگتے ہیں۔ غسل خانے میں زیادہ دیر تک رہنے کو جی چاہتا ہے۔ ریڈیو پر کلاسیکل سنگیت سے نفرت ہو جاتی اور ہلکے پھلکے تو کجا، چھچھورے اور بور کر دینے والے فلمی گانوں کی دھنوں پر محض مہمان کی خوشنودی کی خاطر اپنا سر دھنتے۔

اب یہ ہمارا روزمرہ کا معمول سا ہو گیا ہے کہ قبل از وقت اطلاع ملتے ہی ایرپورٹ پر مہمانوں کو خوش آمدید کہیں پروٹوکول کی یہ ذمہ داری اتنی بڑھ گئی ہے کہ ہمارا زیادہ تر وقت دفتر کی بجائے ایرپورٹ پر گذرتا ہے۔ نتیجتاً ایرپورٹ کے قلی اور ٹیکسی ڈرائیور ہم سے مانوس ہو چکے ہیں۔

مہمانوں کی مسلسل آمد و رفت سے متاثر ہو کر ایک دن ہمارے پڑوسی نے شکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے آپ نے اپنے مکان کا ایک کمرہ مہمانوں کے لئے کرایہ پر اٹھا رکھا ہے۔" ہم نے اپنی صفائی میں مہمانوں کی آؤ بھگت اور اُن کی خدمت کو عبادت سے تشبیہ دے کر اُن کی غلط فہمی دور کی۔

ایک دن سر شام ہم دفتر سے واپس آئے تو مکان میں کچھ نئی صورتوں کو دیکھ کر کھٹکے کہ مبادا کسی دوسرے گھر میں نہ گھس آئے ہوں۔ پھر بچوں کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔ بیگم موجود نہ تھیں۔ اُن نئی صورتوں نے خود اپنا تعارف کروایا کہ وہ میرے کسی دوست کے دور کے رشتہ دار ہیں۔ اُن کے ٹکٹ کنفرم Confirm نہیں ہوئے تھے۔ اور بطور حفظ ماتقدم اُنہوں نے ہمارا پتہ حاصل کر لیا تھا۔ اس لئے وہ اطلاع دیئے بغیر ہمارے غیاب میں آ دھمکے تھے۔ ہمیں گھر پر نہ پا کر بچوں سے کہا کہ ہم تمہارے ابا کے بہت پرانے دوست ہیں۔ بچوں نے نہ صرف خوش آمدید کہا بلکہ چائے پانی سے تواضع بھی کر ڈالی۔ اُن ہی کی زبانی بچوں کی مہمان نوازی کی تعریف سنی تو بچوں کو تو خیر خوش ہونا ہی تھا۔ ہم بھی اگر خوش نہ ہوتے تو اور کیا کرتے۔

ایک بار یوں بھی ہوا کہ دو مسافر جدہ سے بمبئی تک ہوائی جہاز میں ایک دوسرے کی بازو والی نشست پر سفر کرتے ہوئے اجنبیت کا شکار رہے، تھوڑے سے وقفے کے بعد یکے بعد دیگرے ہمارے ہاں پہنچ کر محو حیرت ہو گئے کہ دونوں کی عارضی منزل مقصود ہمارا غریب خانہ ہی تھی۔ پھر ہمیں نظرانداز کر کے اس طرح محو گفتگو ہو گئے کہ اپنے ہی مکان میں ہمیں اپنا وجود گراں محسوس ہونے لگا۔

میرے ایک دوست کی والدہ محترمہ ہیں جو سال میں نہ جانے کتنی بار ہندوستان سے سعودی عرب کو آتی جاتی رہتی ہیں۔ ان کا ہمیشہ یہ اصرار رہتا ہے کہ ٹیلیگرام ملتے ہی میں بنفس نفیس انہیں خوش آمدید کہنے ایرپورٹ پر نہ صرف موجود رہوں بلکہ تین چار گھنٹوں تک کسٹم سے گلو خلاصی ہونے تک اُن کا انتظار کروں اور پھر ٹیکسی پر لاد کر گھر لے آؤں۔

ایک بار خدا کا کرنا یوں ہوا کہ وہ اکیلی گھبرا گئیں بعد ازیں رونے دھونے کہ میں اس بار ٹیلیگرام ملنے پر بھی جان بوجھ کر نہیں لینے نہیں آیا۔ میں نے بہتیرا سمجھایا کہ مجھے ٹیلیگرام نہیں ملا ورنہ میری کیا مجال کہ میں حسب معمول در کام قدیم

معمول سے کوتاہی برتوں۔ وہ کسی طرح مانتی ہی نہ تھیں کہ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی اور ڈاکیئے نے ان کی آمد کی اطلاع کا تار ہاتھوں میں تھما دیا۔ ہم کبھی ان کو دیکھتے اور کبھی ڈاکیے کو۔

آیئے! آپ کو ایک اور مہمان سے ملاؤں۔ یہ ہر سال جب ایک زائد اولاد کے ساتھ نازل ہوتے۔ تو اپنے ساتھ نوزائیدہ کی دودھ کی بوتل سے لے کر کرسیٔ فراغت، پتیلی، شکر، چمچے، پاندان، اگالدان، لوٹے اور ضرورت کی ہر وہ چیز اپنے ساتھ لے آتے جس کی دورانِ سفر ضرورت پیش آنے کا انھیں احتمال ہوتا۔ اُن کی آمد کے بعد ہمارا گھر ریلوے اسٹیشن کا ویٹنگ روم جیسا نظر آتا۔ اُن کا تمام سامان اس سلیقے سے بکھرا پڑا رہتا کہ دیکھنے والے سلیقہ مندوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔ درمیانی شب کو یکے بعد دیگرے اپنے تین چار ننھے منّوں کو پیشاب کراتے تو اس اطمینانِ قلب اور سکون کے ساتھ کہ پڑوسی تک جاگ اُٹھتے اُن کا ہر ننھا درمیانی شب کو دودھ پینے کا عادی ہوتا۔ دودھ گرم کرنے کے بعد دو تین بوتلوں میں بھر کر ہر ایک کے منہ میں باٹلیاں تھمانے تک ہماری نیند کے طوطے پھر نہ آنے کی قسم کھا کر اُڑ جاتے۔

میرے ایک دوست ہیں جو محض تبدیلیٔ آب و ہوا کی غرض سے ہمارے ہاں آتے ہیں اور جب تک بمبئی کی آب و ہوا تبدیل نہیں ہو جاتی واپس نہیں ہوتے۔

خیر یہ تو ہوا اُن مہمانوں کا تعارف جو اپنی شانِ نزول اور تاریخِ نزول سے قبل از وقت مطلع کر دیتے ہیں تاکہ ہم انہیں برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو مستعد کر لیں۔

مزہ تو وہ مہمان دے جاتے ہیں جو بغیر کسی اطلاع کے بصورتِ گربۂ مسکین دروازے پر نمودار ہوتے ہیں اور ہمیں شرمندہ کر جاتے ہیں۔ ایسے میں اگر کچھ مہمان پہلے ہی سے موجود ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اِن نوواردوں کا کیا کریں۔ پھر جو کچھ ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمیں باورچی خانے میں اور بچوں کو راہداری میں سونا پڑتا ہے۔ اور ہم یہ شعر گنگنا کر خدا سے التجا کرتے ہیں ؎

میرے خدا مجھے تو اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں ہوں اس کو میرا گھر کر دے

کئی بار جی میں آیا کہ کبھی ہم بھی ان مہمانوں کے ہاں چلے چلیں اور اُن کی مہمان نوازی کے مزے لوٹیں مگر یہ مہمان ہمیں مہلت دیں تب نا!

جگ خالہ

فیض الرحمٰن فیضی

ہے محلہ تمام گرویدہ   آپ میں کیا کمال ہے خالہ
گو نہ مانیں بُرا تو کہتا ہوں   آپ سے اک سوال ہے خالہ
خالو صاحب گئے جوانی میں   مجھ کو اس کا ملال ہے خالہ
گو سے مکھڑے پہ آگئی سرخی   اور غصّے سے لال ہے خالہ
عقدِ ثانی سے جائے گا غصّہ   میرا ایسا خیال ہے خالہ
زندہ درگور اہلِ دنیا میں   زندگی اک وبال ہے خالہ
اب زمیں پک کے ہوگئی پنڈو   اک نہ اک دن زوال ہے خالہ
کس لیئے آپ ہوگئیں خاموش   کیا طبیعت نڈھال ہے خالہ
آپ بیتی بھی میری سن لیجئے   کیسی دنیا کی چال ہے خالہ
پہلی تاریخ چٹ ہوئی تنخواہ   میری بنڈی کو آلال ہے خالہ
سب کے سب پڑ گئے ہیں اب بیمار   گھر مرا اسپتال ہے خالہ
بن بلائے پٹک گیا سسرال   جیتے جی انتقال ہے خالہ
سامنے سے گزر گئی بلّی   بدشگونی کی فال ہے خالہ
اب مرغن غذا نہیں ملتی   روز دلیہ ہے دال ہے خالہ

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
فیضؔ کا اب یہ حال ہے خالہ

جگرؔ نظام آبادی

واسطہ پڑ جائے سب کو ظلم سے بیداد سے
ناک میں دم آگیا ہے ناخلف اولاد سے
جس جگہ رشوت سفارش زور چل سکتا نہیں
کام میں اپنا چلاتا ہوں وہاں فریاد سے
عشق بھی مل جائے گا تم کو محبت بھی مگر
روپیہ [illegible]ل نہیں سکتا دل ناشاد سے
لیڈروں کی بات چھوڑو ان کے چمچوں کا بھی اب
خیر مقدم کر رہے ہیں لوگ زندہ باد سے
گالیاں سن کر ہماری اس نے یہ رو کر کہا
"ایک دن کا ظلم اچھا روز کی بیداد سے"
اہم اِک اعلان کرتا ہوں کہ جگرؔ آپ کا
بھاگ کر پہنچا ہے "مٹ پلی" نظام آباد سے

○

سراجؔ نرملی

وہ بھی کوشش میں ہے لیڈری کے لیئے
جو کہ فیس تھا داداگری کے لیئے
رشوتوں کی تو اب یار بھرمار ہے
ہم نے بیچا ہے گھر نوکری کے لیئے
نام لکھ دے تو میرا ہی میرے خدا
لاکھ روپئے کی اِس لاٹری کے لیئے
کون پوچھے ہے علم و ہنر کو بھلا
چاہیئے زر یہاں برتری کے لیئے
بن پیئے بیر کی ایک بوتل سراجؔ
موڈ آتا نہیں شاعری کے لیئے

غالب حسنین (پٹنہ)

میں کنوارا ہی مرا

ایک عظیم حادثہ مجھ پر مہربان ہوا اور میری ناگہانی موت واقع ہوگئی — جوانی میں ہی مجھے ٹرانسفر سرٹیفکیٹ مل گیا۔ ع

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

مرجانے کے فوراً بعد مجھے اس حقیقت پر ایمان لے آنا پڑا کہ انسان کی زندگی کا کوئی ٹھکانہ ہے اور نہ موت کا۔ یہ زندگی کب ساتھ چھوڑ دے اور موت کب آ دبوچے۔ میں اپنی موت سے گرچہ دل برداشتہ نہیں ہوا پھر بھی بہت افسوس ہوا۔ اس لیے کہ موت نے نہایت غلط وقت پر مجھے اپنے شکنجہ میں جکڑا۔

موت سے پہلے یعنی دنیاوی زندگی میں یقیناً پر امید تھا کہ میری عمر کافی طویل ہوگی (بڑے بوڑھے بھی یہی دعا کیا کرتے تھے) ایام جوانی میں جوانی کی شرارتیں کروں گا، مستیاں ہوں گی، رنگ رلیاں ہوں گی۔ داستان عشق و محبت کا ایک طویل سلسلہ ہوگا اور تقریباً وہ تمام ممکنات ہوں گے جن کی امید دور جوانی میں کی جاسکتی ہے یا کم از کم جن کی تمنا تو کی ہی جاسکتی ہے — اور جب شباب ڈھلنے لگا، جسم کی توانائی، چہرے کی رنگت اور رنگینی مزاج الوداعی سلام کہنے لگے گی اور درازی عمر اور نقاہت جسم اپنے تمام تر مہلک ہتھیاروں سے مجھ پر حملہ آور ہوگی تو باقی ماندہ زندگی عبادت و ریاضت میں گذار لوں گا، توبہ و استغفار کر لوں گا، اس کے حضور چند قطرے آنسو بہا لوں گا، اگر آنسو کا دریا نہ بہا سکا۔ جس طرح بڑے بڑے سیٹھ ساہوکار، بلیک میلر، اسمگلر، ناجائز پیشہ ور مندر اور ناتھالیہ بنوا دیتے ہیں اور دان کو پُن کمانے کا گمان کر لیتے ہیں اور اسے مکتی کا ذریعہ سمجھ لیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر موت آ ہی گئی تو بخوشی اسے گلے لگاؤں گا۔ اس وقت مرجانے کا اتنا غم بھی نہ ہوگا۔ مگر برا ہو ظالم ملک الموت کا جس نے میرے مرتب کردہ پلان کو ہندوستان کا پنجسالہ منصوبہ بنا دیا۔

میں چونکہ غیر شادی شدہ تھا، اس لیے زیادہ افسوس ہوا۔ راز کی بات تو یہ ہے کہ (یہ راز صرف دنیا میں تھا) ایک عدد اقبالہ عالم (میری نظر میں) کو اس کی رضامندی سے اپنا محبوب بنائے ہوئے تھا، اپنے خانۂ دل میں بسائے ہوئے تھا اور دنیا کی

نظروں سے چھپائے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے بہت کچھ وعدے وعید بھی کئے تھے جو تمام تر خوشنما و دلفریب تھے۔ میں نے اس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر ہندوستان میں کوئی ایسا نسخہ برآمد ہو گیا جس سے یہاں کے لوگوں کی بے روزگاری دور ہو گئی تو اس کھیپ میں میں بھی باروزگار ہو جاؤنگا ـــــ اور پھر ہم تم شادی کرلیں گے، ہنی مون منانے شملہ چلیں گے، جہاں ہواؤں میں میری اور تمہاری سانسوں کی خوشبو ہوگی، قدرت کی رعنائی ہوگی اور خوشی کا بیش بہا خزانہ ہمارے گرد محو خرام ہوگا ..... مگر افسوس، اپنے وعدے کا پاس نہ کرسکا میرے یوں بغیر اطلاع دئے گذر جانے سے میری محبوبہ کو گہرا شاک لگا ہوگا (ایسا میں سوچنے میں حق بجانب ہوں) میرے اس اچانک مرجانے سے والدین بھی کم رنجیدہ خاطر نہ ہوئے ہوں گے۔ کنوارا مرجانا تو ویسے ہی واہیات فعل ہے مگر لڑکے کا کنوارا مرجانا ماں باپ کے لیے المیہ ہے (انھیں لڑکے کی شادی سے تلک کی جو رقم ملنی تھی وہ نہ مل پاتی ہے) چھوٹی بہنوں کے لیے المیہ ہے) کہ ان کی شادی پر کثیر رقم خرچ کرنے والا چلا گیا۔ بڑی بہنوں کے لیے المیہ ہے کہ مائیکے میں فضول خرچیوں کا ناقابل برداشت بوجھ ہنس کر برداشت کرنے والا ختم ہو گیا۔ اس طرح حسب مراتب اور حسب خواہش سب المیہ کا شکار ہوتے ہیں۔

میری موت پر بہر شئے ماتم کناں تو نہ ہوئی البتہ گھر کی عورتوں نے ایک ساتھ سُر میں سر ملا کر میری روح کو بے چین کرنا شروع کر دیا۔ جنھیں با آواز بلند نہ رونے آتا تھا۔ انھوں نے آہ وزاری کرنا اور سسکیاں لینا شروع کیا۔ تقریباً نصف گھنٹے تک اشک ریزی اور آہ وزاری کرنے کے بعد جب سبھوں کی آنکھیں خشک ہونے لگیں تو چپ ہو رہیں۔

میری چھوٹی بہن نے ماما سے کہا۔ "ماما، میری فلاں سہیلی کو بھی خبر کردو۔ دیکھو بھولی نہیں ورنہ اسے عمر بھر شکایت رہے گی" (جیسے لڈو تقسیم کیا اور میرا حصہ نہ دیا) میرا چھوٹا بھائی جو اسٹینڈرڈ تھری کا طالب العلم ہے (جسے ٹافیاں اور کھیل کود کا سامان مہیا کرنے کا واحد ذریعہ میں ہی تھا) نے انجانے جذبہ کے تحت ماں سے پوچھا۔ "بھائی جان کیوں مرگئے؟ میں انھیں نہیں مرنے دوں گا۔" ماں تقریباً جھنجھلا گئیں۔ ماں سے مجھے اندازہ ہوا کہ واقعی ماں کو سب سے زیادہ افسوس ہے۔ گویا سب حتی الوسع مجھ سے ہمدردی کیے جاتے تھے اور محبت کا ثبوت پیش کیے جارہے تھے۔ میں بھی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا کہ کچھ باہری عورتیں در آئیں اور مجھ پر تبصرہ فرمانے لگیں۔ ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا۔ کیا نیک سیرت لڑکا تھا۔ اس کے اطوار کتنے عمدہ تھے۔ سب کے ساتھ بڑا ہی اچھا سلوک کرتا سب سے خندہ پیشانی سے ملتا اور خوش شکل تو ایسا کہ حسینائیں شرمسار ہیں تو اس سے اپنی ...... "

میں نے ایک سرد آہ بھری۔ "کاش میں نہیں مرتا؟!"

پھر میں گھر سے باہر نکالا گیا اور لوگوں کے ہجوم میں گھر گیا گویا ان کی ذرا بھی چوک مجھے بھاگ کھڑا ہونے پر مجبور کردے گی یا میں ایک تماشہ ہوں اور لوگ مجھے بڑے انہماک سے دیکھ رہے ہیں (واقعی میں تماشہ تو تھا ہی)

ایک شخص نے چادر سر کائی اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ آہ ..... ظالم نے کس نا موزوں وقت پر بے چارہ کو اپنے شکنجہ میں جکڑا یہ وقت تو مرنے والے کے لیے زمانے کی نیرنگیوں سے لطف اندوز ہونے کا تھا۔ اب بھی چہرے پر کیا بشاشت ہے، کیا نور ہے۔ ایسا لگتا ہے خواب خرگوش میں ہے" ـــــ اور اس پُر نور چہرے کو چھپا دیا گیا (تاکہ اوروں کی نظر نہ لگے)

میرے گرد لگی بھیڑ میں میرا دوست شمیم بھی شامل ہو گیا۔ عام لوگوں کے درمیان چرچا تو یہی ہے کہ شمیم کو میرا سب سے قریبی دوست ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وہ بالکل میرے قریب آیا، کہنے لگا۔ "معاف کرنا یار، میں دیر سے آیا۔ مجھے خبر بھی دیر سے ملی تم اتنی جلدی کیوں مرگئے۔ ملک الموت سے تھوڑی مہلت مانگ لی ہوتی۔ تم نے تو وعدہ کیا تھا کہ ہر کام ایک ساتھ کریں گے۔ حتیٰ کہ مریں گے

بھی ایک ساتھ (تم کتنے ظالم ہو، اب عنقریب میرا کاروبار فیل ہو جائے گا۔ رقم کہاں سے لاؤں گا۔ لوگوں کے قرض کہاں سے ادا کروں گا۔ اب اس دنیا میں کوئی بھی میرا پرسان حال نہ ہوگا ..... کاش میں تمہارے ساتھ مرجاتا) اور اس کی پلکیں واقعی آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اپنے دوست کے ان ہمدردانہ الفاظ سے میرا دل بھر آیا، مگر رو نہیں سکتا تھا، کیونکہ مر گیا تھا، سینہ جذبۂ عشق سے سرشار ہونے لگا مگر وفورِ محبت سے لبریز ہو کر شمیم کو تھپکیاں نہ دے سکتا تھا۔ اسے شاباشی نہ دے سکتا تھا۔

مُردوں کے ساتھ سب سے بڑی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ ہنس نہیں سکتے اور نہ رو سکتے ہیں اور زندوں کے ساتھ سب سے بڑی کامیڈی یہ ہے کہ وہ صرف ہنس سکتے ہیں۔ (اور رونے کے تصور سے کانپ جاتے ہیں) وہ آزاد ہیں۔

القصہ مختصر مجھے غسل دیا گیا ——— اور خوشبو میں بسایا نہایت ہی عمدہ قسم کا کفن میرے مردہ جسم سے لپیٹ کر زندہ دلی کا ثبوت دیا گیا کاندھے بدلے چلنے لگے۔ وہ سارے لوگ جو جنازے میں شریک تھے، پر میرا دوست، شمیم یہ دھاک جمانے کی بھرپور سعی کیے جا رہا تھا کہ میں ہی مرحوم کا واحد غم گسار ہوں، واحد ہی خواہ رہا ہوں (واقعی خوش قسمتی ہے میری)

میرے ساتھ چلتے ہوئے لوگ اب کھل کر آپس میں گفتگو فرما رہے تھے۔ میں غلط فہمی میں پڑ گیا کہ شاید یہ لوگ میری تعریف کر رہے ہیں۔ کیونکہ عام طور پر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ مرنے والے کی شان میں بے جا تعریفیں کی جاتی ہیں۔ وہ اپنی زندگی میں کتنا برا کیوں نہ رہا ہو، مر جانے کے بعد اس کی برائیوں پر پردہ ڈال کر اسے فرشتہ صفت، فرشتہ خصلت ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں نے اس گفتگو کی طرف دھیان دیا۔ میرے کالج کا ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی سے کہہ رہا تھا۔ یار کیا بتاؤں حسنین کے مرنے سے مجھے کتنی تکلیف پہنچی ہے۔ اگر یہ مبالغہ آرائی نہیں تو مجھے دلی صدمہ پہنچا ہے۔ سچ کہتا ہوں، تنہائی میں جب اس کی یاد آئے گی تو خون کے آنسو روؤں گا۔ اس کی ذات سے مجھے بہت سارے فائدے تھے۔ میں نے اس کی صحبت میں جتنا بھی وقت گذارا اسی کے خرچ پر گذارا ہے۔ ظالم کمال کا سخی تھا۔ کیا کہنے ہیں اس کی دریا دلی کے۔"

دوسرے نے تال میں تال ملایا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو، وہ ذرا خوشامد پسند تھا۔ اگر کوئی کام نکالنا ہے تو اس کی ذرا سی تعریف کردو پھر کیا مجال کہ تمہارا الّو سیدھا نہ ہو اور وہ الّو نہ بن جائے۔ وہ مر کیا گیا کہ ہم لوگوں کو اذیت میں مبتلا کر گیا۔ میرا باپ تو پکا بخیل ہے میرے باپ کی وصیت ہے کہ مرنے کے بعد پرانے کپڑے کو سل کر کفن تیار کرایا جائے، نیا نہ خریدا جائے۔"

ان دونوں کے بیچ ایک اور آٹپکا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا "میں نے ابھی ابھی ایک ایسا منظر دیکھا ہے کہ اللہ کی پناہ۔ حسن بھیا تھا بلکہ کر دل پھڑک اٹھا مگر اس کا معصوم چہرہ دیکھ کر اچھل کر حلق میں آگیا۔ جب میت فلاں موڑ سے گذر رہی تھی تو فلاں بالکنی سے ایک مہ جمال جنازہ کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سسکیاں بھر رہی تھی اور یہ زبان خاموش یہ شعر پڑھ رہی تھی۔ ع

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے

کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

جانتے ہو کون تھی وہ؟ وہ محبوبہ مرحوم ہے۔ بے چارا اپنی معشوقہ کو تڑپتا ہوا چھوڑ کر چلا گیا۔ بہت سارے ارمان کو سینے میں دفن کیے ہوئے، خرمن محبوب میں آگ لگا کر بے چاری من مسوس کر رہ گئی۔ اس کی روح کو بھی شانتی نہ ملی۔ جب یہ مہ وش یاد آئے گی تو تڑپ کر رہ جائے گا۔ اسی طرح تقریباً سارے کے سارے سوائے چند قدامت پسندوں کے کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو فرما رہے تھے۔

خدا خدا کر کے میں اپنی آرام گاہ تک پہونچا۔ مجھے نہایت نزاکت سے قبر میں اتارا گیا جس طرح ایک نئی نویلی دلہن کو سسرال

میں اتارا جاتا ہے۔ ریٹا سب نے میری زیارت کی جس کے بجا میں جو آیا کہا۔ کہا کسی کی زبان اور خیال پر تو پابندی ہے نہیں۔

قبر کو تختہ سے ڈھک دیا گیا اور میں سب کی نظروں سے روپوش ہو گیا۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوی کہ میں اب مٹی میں ملا دیا جاؤں گا۔ یعنی جزو خاک ہو جاؤں گا۔ میرا دوست مجھ سے اپنی حد درجہ محبت کا ثبوت سب سے پہلے مٹی میں ملا کر دینا چاہتا تھا۔ مجھ سے برداشت نہ ہوا اور حلق پھاڑ کر چیخا۔ "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ... ..." کہ میری آنکھ کا پٹ کھل گیا۔ ذہن کے دریا میں سوچ کی لہروں کی روانی تیز ہو گئی آواز کی بازگشت کمرے میں گونج گئی!

میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ خواب دیکھ رہا تھا یا حقیقت سے دوچار۔ اگر حقیقت سے دوچار تھا تو دوبارہ زیست کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا (مرجانے کے بعد خواب کا آنا ممکن نہیں۔ خواب تو زندہ سے دیکھتے ہیں بھوکا، روٹی کا، ننگا لباس کا ....) میں نے سب سے پہلے اپنے جسم کا جائزہ لیا تو سلیپنگ ڈریس اپنی موجودگی کا اعلان کر رہا تھا۔ سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کا حال معلوم کیا تو وہ حسب دستور دھڑک رہا تھا۔ کمرے کا لائٹ آن کیا تو ہر چیز صاف صاف دکھائی دے رہی تھی۔

مجھے پورا یقین ہو گیا کہ خوابستان کی سیر کر رہا تھا پھر بھی سراسیمہ ہو گیا کہ کہیں خواب سچ نہ ہو جائے۔ ابھی رات نصف باقی ہے اور موت عموماً رات ہی کے وقت آتی ہے۔

اس وقت سے اب تک سراسیمہ ہوں اور اس خوف سے گھلا جا رہا ہوں کہ نہ جانے کب موت آ دھمکے اور بھارت کی آزاد فضا میں سانس لے رہے پسماندگان کی سانسوں میں کوئی بھارت واسی کب اور کتنی مقدار میں زہر گھول دے اور اپنی تمام تر خواہشات کے باوجود میرا دوست ——— ہونقوں کی طرح زہر باز کا منہ تکتا رہے۔

۵۵

ہلمٹ

رؤف رحیم ایم اے
حیدرآباد

ہم اپنی اسکوٹر پر سوار شان بے نیازی کے ساتھ اپنے وظیفہ یاب والدِ محترم کا پٹرول جلاتے پھر رہے تھے کہ ایک بے رحم ہاتھ نے ہمیں روکا۔ کئی بار سوچا کہ کوئی پری پیکر نازک مرمریں ہاتھ ہلاکر ہم سے لفٹ مانگے لیکن ہائے ری قسمت ...... کانسٹبل صاحب کے روبرو پسینے میں تربتر ہو گئے۔ ہم جانتے تھے کہ جب کانسٹبل صاحب روکیں گے تو بغیر جرمانے کے ہمارا گھر لوٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے اور ہم ٹھہرے بے روزگار پوسٹ گریجویٹ۔ جیب میں ایک عدد کنگا، دستی کے علاوہ ایک ڈائری، جو ہمارے مفلس یعنی شاعر ہونے کا عملی ثبوت۔ کانسٹبل صاحب نے رعب دار انداز میں کہا۔ "کیا آپ نے ریڈیو نہیں سنا، اخبار نہیں پڑھا کہ آج سے ہر مشین سے چلنے والی دو پہیہ گاڑی سوار پر ہلمٹ کا لزوم ہے؟"

ہم نے معصومیت سے جواب دیا "انسپکٹر صاحب (معلوم رکھتے ہوئے کہ موصوف کانسٹبل ہیں) ہمارے پاس ریڈیو سننے اور اخبار پڑھنے کی فرصت کہاں؟"

"پھر آپ کیا کرتے ہیں؟" کانسٹبل صاحب نے کرخت لہجہ استعمال کیا۔

"صرف اسکوٹر پر گھومتا ہوں۔ کبھی ایمپلائمنٹ کے چکر تو کبھی منسٹر صاحب کے گھر کے چکر۔"

کانسٹبل صاحب نے ناامید ہوکر صرف وارننگ پر ہی اکتفا کرلیا کہ آئندہ سے آپ ہلمٹ میں نظر آئیں گے۔ ورنہ جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ ہم پسینہ پونچھ کر روانہ ہو گئے۔ اسکوٹر کو گلیوں کوچوں سے لے جاکر اپنی منزل مقصود تک پہنچے۔ کسی طرح والد بزرگوار سے ہلمٹ کی ضرورت اور اہمیت بتائی کہ اگر ہلمٹ نہ ہو تو حادثہ میں آدمی مارا جاتا ہے۔ وہ چونکہ بہت معصوم واقع ہوئے ہیں اور اس نالائق بیٹے کو حد سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ بغیر کسی ضد کے قیمت خرید دے دی۔ یہ کہتے ہوئے کہ ــــ "جان ہے تو جہان ہے۔"

ہم ہلمٹ کی دکان پہنچے جہاں ہر گاہک کی بھیڑ نظر آرہی تھی۔ کل تک سیٹھ صاحب ہر آنے جانے والے کو مایوسی سے دیکھا کرتے تھے۔ اب انہیں نظر اٹھاکر دیکھنے کی بھی فرصت نہیں۔ سیلس مین صاحب نے ہلمٹ

کی تعریف میں قصیدے پڑھنا شروع کر دیئے ۔ صاحب جلدی کیجئے ۔! ورنہ پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی صاحب! اگر حادثہ ہوجائے تو انسان مرجائے لیکن اس کا سر بھی سلامت رہ جائے گا ۔ ایک بار آزما کر دیکھئے ہم نے سوچا کہ واقعی یہ ٹھیک کہتا ہے ہمارے جسم پر تو یہی ایک اہم چیز ہے ۔ ایک شاعر اور بے روزگار امیدوار کے لئے دماغ کا رہنا لازمی ہے چاہے جسم نہ ہو۔

دکان دار نے فخریہ انداز میں کہا کہ "آج اسے ہر شخص خرید رہا ہے ۔ چاہے اس کے پاس موٹر سیکل ہو کہ نہ ہو۔"
ہم مبہوت ہوکر استفسار کرنے لگے "آخر وہ لوگ کیوں خرید رہے ہیں جن پر اس کا لزوم نہیں ؟"

جواب میں دکاندار صاحب نے فرمایا کہ صاحب اس ہلمٹ کے کئی فوائد ہیں ۔ ابھی جنھوں نے ہلمٹ خریدی ہے وہ گنجے سر ہیں ۔ دن بھر ہلمٹ لگائے گھوما کریں گے ۔" ہم نے سوچا کہ گرمی کی شدت سے وہ گھومتے ہی رہیں گے خدا نخواستہ کاغذ چنتے ۔

دکاندار صاحب نے دوسری مثال پیش کرتے ہوئے کہا کہ ۔ یہ دیدہ زیب ہلمٹ جسے ہم نے دوگنی قیمت میں اس نوجوان کو فروخت کی ہے ۔ اُس کے پاس ابھی اسکوٹر نہیں ہے وہ اپنے آپ کو SCOOTER HOLDER کہلوانا چاہتا ہے اور اس ہلمٹ پر I love you لکھا کر اپنے اظہار محبت کا وسیلہ بنانا چاہتا ہے کیسے وہ اور تعریف نہ کرے ۔ ہم نے تاخیر کے بغیر ہلمٹ خریدلی ۔

آئینے کے روبرو کھڑے ہوکر ہلمٹ پہن لی ۔ بے ساختہ آنسو اُمڈ پڑے ۔ کیونکہ ہم نے اپنے بالوں کو عرصۂ دراز سے لاڈو پیار سے پال رکھا تھا ۔ ہم شہر کے بڑے سیلون میں بال ترشوایا کرتے تھے ۔ لوگوں اور خاص کر حسینوں کو ہمارے خوبصورت بال ہی پسند تھے ۔ وہ نظروں سے اُوجھل ہوجائیں گے ۔ ہم دست بہ دعا ہوگئے کہ قانون ایسا ہوجائے کہ ہلمٹ بالوں کے نیچے رہے ۔ ہم نے دل ہی دل میں کہا ۔ شاید بدقسمتی ہمارا ساتھ نہ چھوڑی ہے نہ چھوڑے گی ۔ ہم بندشوں کے غلام بن گئے ۔ جمہوریت میں بھی آزاد نہیں ۔ بہر حال ہم نے ہلمٹ کو سر پر وارد کئے ایمپلائمنٹ اکسچینج کے لئے رخت سفر باندھا جیسے ایک سپاہی سر پر کفن باندھے میدان جنگ جاتا ہے ۔

ایمپلائمنٹ آفیسر صاحب کے روبرو "ہلمٹ" ہاتھ میں اُٹھائے پہنچے ۔ اُنہوں نے ہم پر جائزہ لیتی نظر ڈالی اور اطمینان کے ساتھ ٹال دیا جیسے کہ ہم کو ملازمت کی ضرورت نہیں ہے ۔ ہم نے بڑے اُدب سے رخصتی سلام کیا ۔ چونکہ ہم پست اقوام سے تعلق نہیں رکھتے ۔ لہٰذا ہمیں انتظار کرنا پڑے گا ۔ تاآنکہ ہم پست اقوام میں شامل ہوجائیں ۔ ہماری طرح کئی نامراد بیروزگار ہڑتال پر آمادہ تھے ۔ سنگ باری ہوئی ۔ ہم نے جھٹ پٹ ہلمٹ پہن لی ۔ تب ہمیں احساس ہوا کہ یہ واقعی کار آمد چیز ہے ۔ کئی پتھر جسم پر لگے ۔ لیکن جس دماغ کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہلمٹ کے طفیل سے بچا رہا ۔ کسی طرح لنگڑاتے تڑپتے وہاں سے رخصت ہوئے ۔

ہمیں رفتہ رفتہ ہلمٹ کے فوائد کا علم ہوتا گیا کہ بعض صاحبان نے جو تھیلی کو معیوب تصور کرتے تھے ہلمٹ کو اُس کی جگہ دے دی ہے ۔ مقروض حضرات نے اسے پہن کر اپنے قرض دار کی آواز کو ہوا میں تحلیل کردیا ۔

شوہروں نے اپنی بیگمات کی گالیوں اور فرمائشوں سے تنگ آکر گھر میں بھی اس کے التزام کو قانوناً ضروری قرار دیا۔ برسات کے اولے گنجوں کے سر کی بجائے ہلمٹ سے ٹکرا کر اپنے آپ کو ضائع کر رہے ہیں۔ آفتاب اپنے آپ سے شرمندہ ہو چکا ہے کہ وہ کسی کے دماغ پر اثر پذیر ہونے سے قاصر ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ماڈرن فقرا کشکول کی جگہ ہلمٹ استعمال کرنے لگے ہیں۔ بدلتے فیشن کا ہر شخص پر اثر بے حد ضروری ہے۔

ہلمٹ کے فوائد سے متاثر ہو کر ہم اُس کی اتنی ہی حفاظت کرتے ہیں جتنی ایک ماں اپنے بچے کی کرتی ہے جس کا جدا ہونا گوارہ نہیں۔ اپنے سینے سے لگائے دفاتر، سینما گھر، ہوٹل گھومتے ہیں۔ گو ہر جگہ اس کا رہنا لازم ہے ہماری رائے ہے کہ یہ قانون ہر جاندار پر لازم رہے۔ پیدل چلنے والے راہرو بھی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں جہاں پر ہر ہلمٹ ہولڈر کو جانی فائدہ ہے وہاں کارخانے دار کو مالی۔ وہ بھی آخر پیٹ رکھتے ہیں۔ ہم جس ہلمٹ سے متنفر تھے اب وہ ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔ اب یہی خیال ہے سہ

ہلمٹ ہے مرے سر پر فکر کی نہیں پرواہ
یہ جان چلی جائے پر سر تو بچالوں گا

خمسہ بر غزل قدسی

ڈھکن رائچوری

یاجوج ہے ماجوج ہے دجّال ندارد بازار قیامت کا ہے دلّال ندارد
پیتے ہیں تو پینے کے ہیں احوال ندارد "سوڈا ہے فقط! آتشِ سیّال ندارد
محفل میں تری داغ ہے اقبال ندارد

بچپن میں کھلاڑی تھا جوانی میں اناڑی لیڈر بنا قسمت سے تو چلنے لگی گاڑی
اک لت جو اگاڑی رہی دولتی پچھاڑی "تقدیر دُکھی رام نے اس رنگ سے جھاڑی
جلسے سے ہوا چیپ کے مگن لال ندارد

انکھیاں جو لڑائیں شیخ کی اِک ماہ جبیں سے یہ دیکھ لیا جورو نے نظارہ کہیں سے
پاؤں کی لیا ہاتھ میں عزت کو وہیں سے "یہ راز کھلا آپ کی پاپوشِ حسیں سے
چندیا سے ہوا کرتے ہیں کیوں بال ندارد

خیرون مرے کاناں پو ہے بات یہ ڈالی گھر بھر کو تو بچے اِچ ہیں ذرّی ہے کمائی
دفتر میں نیچ ملتی کیا اُپَر کی ملائی "وہ ہیں کہ بناتے ہیں رضائی پہ رضائی
اپنا ہے یہ عالم کہ پھٹی شال ندارد

شادی سے بھی گھر ہوتے ہیں برباد ہزاروں سہنے پو ہیں لاچار یہ بیداد ہزاروں
سسرال سے کرتے ہوئے فریاد ہزاروں "ایسے بھی ملیں گے تمہیں داماد ہزاروں
جن کے لیے قسمت سے ہے سسرال ندارد

رہ رہ کو یہ ہونٹاں پو سوال آتا ہے قدسی دِل شیشہ ہے دکھ جانے پو بال آتا ہے قدسی
ڈھکن کو بھی کہنے کا کمال آتا ہے قدسی لوگوں کو ترنّم سے بھی حال آتا ہے قدسی
کیا غم ہے جو دنیا سے ہوں قوّال ندارد

ہم نمازِ عشق پڑھتے ہیں سینما ہال میں

عالم تاج پوری

ایک دن نورِ نظر پہ دستِ شفقت پھیر کر
ہم نے فرمایا کہ راہِ حق میں تم بڑھتے رہو
چپقلش چھوڑ کسی مسجد میں جاکر صبح و شام
تم نمازِ پنجگانہ وقت پر پڑھتے رہو

وہ نصیحت کو ہماری غور سے سُنتا رہا
پھر بڑے ہی طیش کے عالم میں اُٹھ کر یہ کہا

مذہبی بکواس ابّا جان اپنی چھوڑ دیئے
ورنہ ڈیرا ڈال دیں گے جاکے ہم سسرال میں
مسجدیں ویران ہیں سُنسان ہیں تو کیا ہُوا
ہم نمازِ عشق پڑھتے ہیں سینما ہال میں

اس کی باتیں سن کے دھم سے ہم زمیں
اور آ جھبک کی طرح سے رہ گئے

محمد طارق
کھولاپور
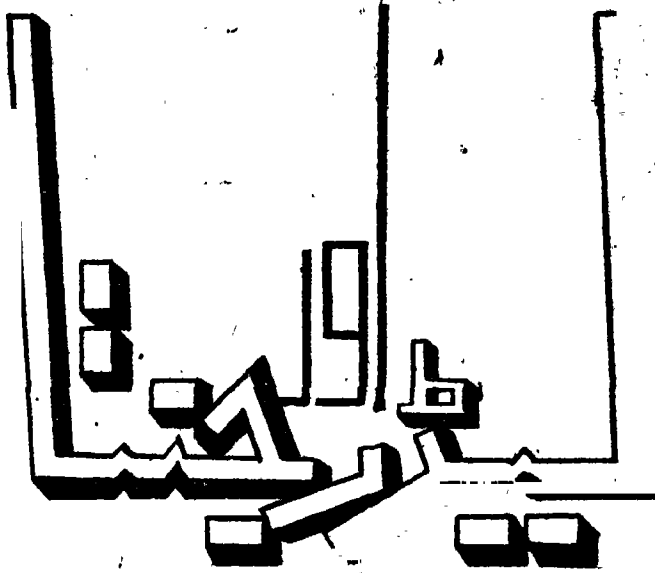
اس بات سے ہم سب اچھی طرح واقف ہیں کہ لیڈر آسمان سے نہیں اُترتا بلکہ ماں کے پیٹ سے ہی پیدا ہوتا ہے
مانی ساخت کے اعتبار سے وہ ہم سا ہی ہوتا ہے۔ ہمارا بھائی ہی لگتا ہے۔ لیکن تحقیق سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ
لچھ اور ہو سکتا ہے لیکن بھائی نہیں ہو سکتا ـــ صرف ہمارا لیڈر ہی ہو سکتا ہے۔
اُس کے ہاتھ، پیر، زبان، آنکھ، ناک، کان وغیرہ کے کام ہمارے اعضا کے کاموں سے مختلف ہوتے
)۔ اس لئے وہ ہمارا لیڈر بن جاتا ہے۔
اُس کے دو کان ہمارے کانوں کی طرح سننے کے لئے نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ ایک کان سے سننے کا کام لیتا ہے تو دوسرے
ن سے اسی بات کو باہر نکال دیتا ہے۔ کیسا ہی اچھا ہو؟ اگر لیڈر اپنے دونوں کانوں پر دو چھوٹی چھوٹی تختیاں
انی شروع کردے۔ ایک پر لکھا ہو "IN" تو دوسری پر "OUT"۔ اس معاملے میں قدرت بھی اس کی معاون
۔ تختیاں بآسانی لٹکائی جاسکتی ہیں۔
قدرت نے ہمیں دو آنکھیں عطا کی ہیں۔ اور ہم سب کو ایک نظر سے دیکھتے ہیں۔ لیکن لیڈر سب کو دو آنکھوں سے
ھتا ہے۔
لیڈر اپنی ایک زبان سے بہت سارے کام لیتا ہے۔ اپنی دو تولے کی زبان سے وہ ڈھیروں ۔ منوں
ں ـــ وعدے کرتا ہے جو ایک مشکل امر ہے۔ دوسروں کی زبان میں اتنی طاقت کہاں کہ وہ بھاری بھرکم وعدے کرے۔
اسی پر وہ اکتفا نہیں کرتا ـــ بہت ساری باتیں کرتا ہے۔ تقریریں بھی کرتا ہے۔ کسی بھی موضوع پر
کسی بھی اسٹیج سے اُس کی زبان بولتی ہے ـــ بولتی ہے .... اور بولتی ہے ..... ـــ اُس کی تقریریں

اتنی لمبی چوڑی ہوتی ہیں کہ بس آپ سنتے ہی جائیے ــــ سنتے ہی جائیے . . . . اور سنتے جائیے ــ اگر لیڈر کی تقریر
کو کیلومیٹر میں ناپا جائے تو دنیا کا احاطہ کم پڑے ــ

علاوہ اس کے وہ اپنی زبان سے چاٹتا بھی ہے ۔ جنتا کے ذہنوں کو ــ اس کی زبان قینچی کی طرح ہوتی
جو ذہنوں پر چلتی ہے اور منٹوں میں نہیں لمحوں میں عوام کے ذہنوں کو جدھر چاہتی ہے موڑ لیتی ہے۔

لیڈر کی ناک بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے ۔ اس کی ناک کی ایک خاص خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں کافی لچک
پائی جاتی ہے۔ لیڈر جس طرح اور جس طرف چاہے اسے موڑ سکتا ہے۔ اسی سبب لیڈر کی ناک کبھی کٹتی ہی نہیں اور
نہ ہی زخمی ہوتی ہے۔

صرف ایک عضو ایسا ہے جس سے لیڈر زیادہ کام نہیں لیتا ۔ وہ ہے پیر ــــ !

لیڈر اپنے پیروں سے چلنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں لیتا۔ ٹھوکر مارنے کے کام سے عوام واقف ہیں۔ اور
یہ کام بہ حسن و خوبی انجام دیتے ہیں۔

جنتا زندہ ہے ــــ!

وہ خوش ہو کر جنتا کو شاباشی دیتا ہے اور اس پر فخر کرتا ہے ۔ جب جنتا زیادہ ٹھوکریں مارنی شروع کرتی
ہے تب لیڈر انقلابی بن جاتا ہے ۔ انقلابی لیڈر کافی حساس ہوتا ہے۔ اس قدر حساس کہ اس کے ایک ہاتھ
کے کام کی خبر دوسرے ہاتھ کو فوراً ہو جاتی ہے ــ

ہاتھ کی بات نکل آئی تو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ لیڈر اپنے ہاتھوں سے ہمیشہ اچھے کام
ہی کرتا ہے مثلاً ہاتھ جوڑ کر نمسکار کرنا ۔ سلام کرنا ۔ آداب کرنا۔ مصافحہ کرنا ــ "ربن" کاٹنا ۔ درس گاہوں
دواخانوں ، بنکوں ، ہوٹلوں ، کلبوں وغیرہ کا سنگ بنیاد رکھنا ۔

تالیاں بجانے کا کام اس کے ہاتھ کبھی نہیں کرتے ۔ کیونکہ تالیاں بجانے کا کام ہمارے ذمہ ہوتا
ہے۔ اتنا کام بھی ہمارے ہاتھ نہ کر پائیں تو کتنی شرم کی بات ہے ــ ؟ ویسے تو ہم یہ کام کرتے ہی ہیں اور
کرنا بھی چاہیئے ۔

بات یہ نہیں کہ لیڈر کے بھائی ہوتے ہی نہیں ــ ہوتے ہیں ۔ انھیں ہم اپنی زبان میں "منی لیڈر"
کہتے ہیں۔ وہ لیڈر کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ نقش قدم کا مطلب سمجھ گئے نہ آپ ــ لیڈر کے پیچھے پیچھے ــ
اس کے سائے کی طرح ــ ہم انھیں لیڈر کا سایہ بھی کہیں تو بیجا نہ ہوگا ۔

وہ لباس بھی لیڈر کے لباس کی طرح ہی پہنتے ہیں اور ٹوپی بھی سر پر رکھتے ہیں ۔ اسی رنگ کی جس
رنگ کی لیڈر رکھتا ہے ــ ٹوپی کا رنگ مخصوص نہیں ہوتا ۔ وقت کے ساتھ بدلتا ہے ــ گرمیوں میں سفید
ٹوپی پہننا فائدہ بخش ہوتا ہے اور دیگر دنوں میں نیلی، کالی وغیرہ ۔ وہ سائنسی نقطۂ نظر سے ٹوپی نہیں بدلتے۔
ان کے پاس نقطۂ نظر تو ہوتا ہی نہیں ۔ نظر بھی نہیں ہوتی ۔ نقطہ ہوتا ہے۔ جس کا تلفظ اس طرح ہے ۔

نکتہ — یہ نکتہ بھی خاصیت کے اعتبار سے لیڈر کے "نکتہ" کے مماثل ہوتا ہے۔ جو لوگ لیڈر کے دام میں آجاتے ہیں، لیڈر کی پیروی میں وہ بھی ٹوپی بدلتے ہیں۔ اور لباس بھی۔

مشاہدے سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ ——

لیڈر پر بہت ساری چیزوں کا اثر نہیں ہوتا — سڑے ٹماٹر اور گندے انڈے اس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

—— لیڈر زندہ باد —— !

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسبِ ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جاسکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/-	روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۵/۵۰	روپے
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰	〃
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	〃	۶/-	〃
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	〃	۶/-	〃
فقط	یوسف ناظم	〃	۶/-	〃
در پردہ	مسیح انجم	〃	۶/-	〃
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/-	〃
چوڑی کے غلام	〃 〃 〃	مضامین	۷/-	〃
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	〃	۸/-	〃
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	〃	۸/-	〃
دھر گھسیٹ	سرمست حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/-	〃
انڈین کاجو	عاتق شاہ	مضامین	۸/-	〃
شوشے	ارشد علی خاں	〃	۱۰/-	〃
بھلاویں کے داغ	عظمت بھلاول	مجموعۂ کلام	۷/-	〃

عظمت چاریارا

ڈیڈی کی طرح....

آج کل کے ننانوے فیصد نوجوان عشق کبھی دولت حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں تو کبھی عزت و عظمت کو بڑھانے، کبھی شہرت و مقبولیت کے لیے تو کبھی عہدے کے لیے۔ اسی قسم کے ایک زندہ دل عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا۔۔۔"

"ڈارلنگ ... ہم ہر روز اسی جگہ ملا کریں گے۔"

"کیوں ۔۔۔؟ اس جگہ میں کونسی ایسی خوبی ہے جو تمہیں اس قدر پسند آئی کہ ہر روز ملنے کے لیے اسے پسند کیا ۔۔۔؟"

محبوبہ کے استفسار پر عاشق نے تفصیل کے ساتھ جواب دیا۔

"ڈارلنگ .... اس ہوٹل میں امن و شانتی ہے جس سے دل کو سکون و اطمینان اور دماغ کو فرحت و تازگی اور شگفتگی حاصل ہوتی ہے اور یہاں کی سروس بھی بڑی ہی اچھی و عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی ہے۔

فریج کا ٹھنڈا پانی .... اور ..... اور.....

"اور کیا ۔۔۔؟"

"اور ٹی وی کے پروگرام بھی ہم یہاں دیکھ سکتے ہیں۔"

لڑکی یا محبوبہ نے حیرت و تعجب سے لڑکے سے پوچھا۔

"تو کیا تمہارے ہاں ٹی وی اور فریج نہیں ہیں ۔۔۔؟"

"نہیں ۔۔۔"

"تو پھر موٹر، بنگلا اور بنک بیلنس بھی نہ ہوگا اور دیگر لوازمات جدید زندگی کے اہم جز ہیں تمہارے پاس نہیں ہیں ۔۔۔؟"

عاشق نے انتہائی سکون اور اطمینان کے ساتھ جواب "آجائیں گے جانی ۔۔۔ آجائیں گے۔ فکر نہ کرا اور بات یہ ہے کہ میں غریب ہوں ۔۔۔"

لڑکی نے فوراً پوچھا۔۔۔

"لیکن کہاں سے آئیں گے ۔۔۔؟"

عاشق لڑکے نے فوراً ہی اور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔

"تمہارے ڈیڈی دیں گے، جہیز میں۔ اور اگر کچھ چیزیں وہ بھول جائیں اور دینے سے رہ جائے یا نہ دے سکیں وہ میں جوڑے کی رقم سے کچھ نہ کچھ خرید لوں گا کیا سمجھیں ۔۔۔؟"

اور سرد آہ بھر کر لڑکی نے کہا۔۔۔

"سمجھ گئی اور اچھی طرح سمجھ گئی ۔۔۔"

فخر سے سینہ پھلا کر اور محبوبہ کی جانب دیکھتے ہوئے لڑکے نے کہا۔

"کیا ۔۔۔؟"

لڑکی نے کمال سنجیدگی و سادگی، متانت و معصومیت اور بھولپن کے ساتھ جواب دیا۔

"یہی کہ تم بھی میرے ڈیڈی کی طرح قلاش اور کنگال ہو ۔۔۔"

~~~
~~~

شکیل رضا بنگلوری

ظلِ سبحانی کے جلال کی قسم!

ہمارے ایک بہت ہی قریبی دوست ہیں جو خیر سے دور کے رشتہ دار بھی ہیں۔ اس بات کو آپ ان کی خوش نصیبی سمجھیں یا بدنصیبی کہ وہ ایک ہفتہ وار اخبار کے مالک، مدیر، پرنٹر، پبلشر، منیجر ہونے کے علاوہ کاتب اور چپراسی بھی ہیں۔
ایک دن انھوں نے ہماری مستقل فاقہ کشی پر رحم کھا کر ہمیں اپنے اخبار کا اشتہاری ایجنٹ مقرر کر دیا تو ہمیں ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیں کسی ملک کی سیکرٹ سروس کا ایجنٹ بنا دیا گیا ہے جو ہمیشہ اپنے ملک کی سلامتی کے لیے دوڑ دھوپ کرتا ہے (لیکن کیا آپ یہاں ہمیں یہ بتا سکیں گے کہ اس دوڑ کے ساتھ دھوپ کیا چیز ہوتی ہے؟) ہمارے دوست نے ہمیں ایجنٹ مقرر کرنے کے بعد چلتے وقت ہم پر اس قدر نصیحتوں کی بارش برسائی کہ ہم پورے ایک ماہ تک مسلسل چھینکتے رہے تھے۔
جب ہم گھر پہنچے تو بیگم صاحبہ نے ہماری چھینکوں سے اپنا دامن سمیٹ کر ہم سے استفسار کیا تو ہم نے چھینکتے ہوئے ساری داستان سنانے کی کوشش کی۔ مگر اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے۔ کیونکہ ہم نے جیسے ہی داستان شروع کی اچانک بن بادل برسات کی چھینکیں شروع ہو گئیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم داستان سُنا نہیں رہے ہیں بلکہ داستان چھینک رہے ہیں! ابھی ہم انہیں چھینکوں اور داستان کی صلیب پر لٹکے ہوئے ہی تھے کہ ہمارے کرم فرما دوست نے پیغام بھجوایا کہ ہم صبح سے قبل اخبار کی سلامتی کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دیں تاکہ اخبار جلد سے جلد شائع کیا جا سکے۔ ہم نے گھڑی پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ ہماری طرح گھڑی بھی فاقہ کر رہی ہے۔ لہٰذا ہم نے پڑوسی سے وقت پوچھا اور ان کی اجازت سے ان کا شیونگ کریم اور بلیڈ لے کر اپنے چہرے پر پالش کی۔ اور نہا دھو کر باہر نکلے تو ہمیں محسوس ہوا جیسے آج عید کا دن ہے۔
وقت کا چمکتا سورج زندگی کی راہوں پر اپنی تیز کرنیں پھینکتا ہوا آسمان کے سمندر میں تیر رہا تھا۔ اور ہمارے قدم لہروں کی طرح بازار کی طرف رینگ رہے تھے مگر شومیِ قسمت کہ ابھی کوئی دکان کھلی ہوئی نہ تھی! ہمارا وجود گرمی کی شدت سے

زخمی کبوتر کی طرح پھڑپھڑائے جا رہا تھا۔ مگر ہم نے اپنے پھڑپھڑاتے جسم کو صبر و ضبط کے پنجرے میں جکڑ دیا اور آگے بڑھنے لگے اور پھر ایک طویل سڑک اور دھوپ کے بعد ہماری نظر ایک دکان کے سائن بورڈ کی طرف اٹھی، جہاں .B.S.C کے لال لال حروف کسی دلہن کی افشاں بھری مانگ کی طرح خوب صورت نظر آرہے تھے، ہم نے شیشہ کا دروازہ کھولا اور دکان میں داخل ہوئے۔ وہاں لوہے کی بڑی بڑی شلفوں میں مختلف رنگ و نسل کے جوتے اور چپل سجے ہوئے نظر آئے۔ ہمیں اپنا بچپن یاد آنے لگا۔ ابھی ہم انہیں یادوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ایک صاحب ہماری طرف جوتا بڑھاتے ہوئے کہنے لگے "کہیے مہربان، جوتوں کے قدرداں، ہم آپ کی خدمت میں کیا پیش کریں۔ جوتا پیش کریں یا چپل دکھائیں۔ ہم نے آپ کے لیے دنیا بھر کے نت نئے جوتے سجا رکھے ہیں۔ یہ دیکھیے آج کا مشہور ہیرو جوتا! اس کی ایڑی، میرا مطلب ہے اس کے ہیلس ذرا ملاحظہ فرمائیں۔ ہمالیہ سے بھی اونچی ہے۔ ایک دم مضبوط B.S.C کا کمال اور آپ کا جمال !" سیلس مین کی باتوں سے ہماری ناک دھیرے دھیرے سکڑتی ہی چلی گئی۔ اور پھر اس قدر سکڑی کہ ایٹم بم کی طرح چھینک آئی اور ہمیں اپنے دوست کی نصیحت یاد آئی۔ ہم نے سیلس مین کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی خیریت دریافت کی تو وہ کہنے لگے B.S.C کی دعا سے ایک دم فسٹ کلاس، کیونکہ ہم بھی یہی جوتے استعمال کرتے ہیں جو ہمیں ہر بلا سے محفوظ رکھتے ہیں۔ صحت کا نشان، تندرستی کا مکان! آپ بھی یہی جوتے استعمال کیجیے اور اپنی صحت بنائیے! اس بات پر ہمیں ایک اور چھینک آئی اور ہم نے جھٹ سے اشتہار طلب کیا تو انھوں نے پوچھا کہ کس اخبار کے لیے اشتہار چاہیے؟ ہم نے فوراً اپنے دوست کے اخبار کی ایک کاپی آگے بڑھائی! جسے قریب کھڑے ہوئے ایک اور سیلس مین نے بڑھ کر تھام لی اور چپکے سے کسی گاہک کا جوتا پیک کرنے لگا۔ ادھر ہم نے پلٹ کر دیکھا تو پہلا سیلس مین بھی گدھے کی سینگ کی طرح غائب تھا۔ کچھ دیر تک ہونقوں کی طرح کھڑے رہنے کے بعد ہم باہر نکل آئے اور پھر دوڑنے لگے۔ ابھی ہم تھوڑی ہی دور دوڑ سکے تھے کہ کڑی دھوپ میں ایک دکان کے سائن بورڈ پر یہ عبارت دیکھ کر "یہاں مغلیہ دور کی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں" ہمارے قدم فطرتاً تھم سے چپک کر رہ گئے اور پھر ان پرانی چیزوں کو ایک نظر دیکھنے کی تمنا نے ہمیں دکان میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا اور ساتھ ہی ایک موہوم سی امید کہ ہوسکتا ہے اس دکان سے ایک آدھ اشتہار حاصل ہو جائے۔ ہم اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ایک صاحب جو مغلیہ دور کی پوشاک پہنے، مغلیہ خاندان سے اپنی وفاداری کا ثبوت پیش کر رہے تھے !! ہمیں دیکھ کر آگے بڑھے اور تسلیمات بجا لاتے ہوئے کہا:

واللہ چشم بد دور، حسن مسعود، کوہ نور و کوہ طور، صاحب جمال۔ بندۂ باکمال! زہے قسمت و عنایت کہ آپ تشریف لائے۔ ارشاد جناب عالی، حاضر خدمت ہے خاکسار فانی!! ہمیں بے حد خوشی ہوئی کہ آپ جیسے عاشقان ظل سبحانی آج بھی زندہ و پائندہ ہیں! فرمائیے ہم آپ کی کیا خدمت انجام دے سکتے ہیں، ہمارا شمار خاندان مغلیہ میں ہوتا ہے اور ہم اکثر راتوں میں شہزادہ سلیم کے ساتھ، نور نظر، قرار جگر انارکلی کو یاد کرکے آنسوؤں بھرے گیت گاتے ہیں۔!! اندر تشریف لائیں بندہ پرور، ہم آپ کو ایسی ایسی نادر و نایاب چیزیں دکھائیں گے جنہیں دیکھ کر آپ یقیناً ہمارے حسن ذوق و حسن انتخاب کے قائل ہو جائیں گے!!

.... "یہ دیکھیے، مہتاب کرن! یہ جگمگاتا ہوا یاقوت، اپنی زبان عاشقی سے کہہ رہا ہے کہ شہزادہ سلیم نے یادگار الفت کے طور پر انارکلی کو نذرانہ دیا تھا، جب انارکلی کو دیوار میں زندہ چنوایا جانے لگا تو انارکلی نے یہ یاقوت ہماری نانی جان مرحوم کی نانی

کے حوالے کیا تھا۔ جب ہم اس یاقوت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارا دل آب آب ہو جاتا ہے اور ہم عنداہ آہ وفغاں کے تالاب میں ڈبک ڈوب جاتے ہیں!! اور یہ دیکھئے موتیوں سے سجا، چودھویں کے چاند کی مانند چمکتا ہوا فانوس! جس میں شہزادہ سلیم اور کنیز انارکلی کی محبت کی شمعیں جھلملا رہی ہیں! جن کی کرنوں میں پیار و وفا کے نغمے پھوٹ رہے ہیں۔ جب ہم اس فانوس کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو ہماری نگاہوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگتا ہے۔ اور ہمارے دل کے نہاں خانے پر ہول سناٹوں سے پُر ہو جاتے ہیں!!

"لوللہ ذرا اس توے کے سانچے میں ڈھلا، غم زدہ مخملی قالین پر ایک نظر تو ڈالیے! آپ اس کے نرم و نازک دامن پر انارکلی کے نقش پا نمایاں پائیں گے!! ہمارے دادا جان مرحوم کہا کرتے تھے کہ جس شام انارکلی کو شہزادہ سلیم سے جدا کیا گیا تھا تو اس شام شہزادہ سلیم اسی قالین پر بے ہوش پائے گئے تھے!!۔۔۔۔"

ان صاحب کو بے تکان بولتے ہوئے دیکھ کر ہم نے مجبوراً انہیں ٹوکتے ہوئے پوچھا! قبلہ محترم گستاخی معاف کیجئے کیا ہم کچھ عرض کرنے کی جسارت کر سکتے ہیں!

"واللہ جناب عالی! آپ بھی کیا فرماتے ہیں! یہ بھی کوئی عرض کرنے کی جسارت ہے! آپ تو ہمارے آقاؤں میں سے ہیں! ہم تو محض حکم کے غلام ہیں۔ آپ حکم کیجئے عاشقانِ جہاں پناہ!!

صاحب موصوف کی انکساری پر ہمارا دل پگھلنے لگا۔ اور ہم نے جھجکتے ہوئے عرض کیا! حضور آپ تو ہمیں شرمندہ کرتے ہیں! ہم تو آپ کے مقابلے میں خاک برابر بھی نہیں ہیں! ہم تو صرف آپ سے صرف اتنا دریافت کرنا چاہتے تھے کہ کیا آپ ان نادر و نایاب چیزوں کا اشتہار شائع کرنا پسند فرمائیں گے؟" ہمارے اس طرح کہنے پر میاں قبلہ کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ آگ بگولہ ہو کر کہنے لگے۔

"لاحول ولاقوۃ، میاں صاحب زادے آپ کیا بکتے ہیں! خبردار اگر آپ نے اس قسم کا کوئی لفظ نکالا تو ہم آپ کی زبان تالو سے کھینچ لیں گے!! جی صاحبزادے ذرا بتائیے بھلا آپ کی تعریف کیا ہے؟"

"جی ناچیز کو خاکسار کو ظل شبحانی، کالے دیہقانی، رومال الدین ستمگر کہتے ہیں! ستمگر ہمارا تخلص ہے، رومال الدین دادا مرحوم کا اسم گرامی ہے۔ ظل شبحانی اور کالے دیہقانی تو ہمارے خاندانی القاب ہیں! میاں آپ نے یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے۔ ہم نے آپ کے خاندانی القاب نہیں پوچھا تھا بلکہ ہم نے یہ معلوم کرنا چاہا تھا کہ آپ کا پیشہ کیا ہے؟"

"اب ہم آپ سے کیا بتائیں قبلہ کہ ہمارا پیشہ کیا ہے! ہم تو خاندانی شرفاء میں سے ہیں اور شرفاء کا پیشہ تو شریفانہ ہی ہوتا ہے! جس کام میں عزت کی روکھی سوکھی مل جائے وہی ہمارا پیشہ ہے"

"دیکھیے میاں صاحبزادے! ہمیں زیادہ طیش مت دلائیے ہمیں یہ بتائیے کہ یہاں آپ کی موجودگی کس مرض کی دوا ہے یعنی کہ دوا ہے؟"

"معاف کرنا محترم! ہم آپ کی باتوں میں یہ بات تو بالکل بھول گئے بلکہ فراموش وغیرہ وغیرہ کر گئے، ویسے قبلہ! کیا آپ ہمیں اس وغیرہ وغیرہ کا مطلب سمجھا سکیں گے!!

بالکل نہیں میاں! اپنا بیان جاری رکھیں!!

جی بہت اچھا! تو ہم آپ سے یہ عرض کر رہے تھے کہ ہم ظلِ شیخانی، کالے دہقانی کے ترجمان، مذہب و ملت کے قدردان، زبان و ادب کے پہلوان، دو صفحات کے عظیم ہفتہ وار "جل تو جلال تو" میں جلتا پھرتا اشتہار ہیں! یعنی کہ ایجنٹ ہیں!

ہم یہ محسوس کر رہے تھے کہ ہماری گفتگو سے قبلہ محترم کے بدن میں کھجلی ہو رہی ہے، جب ہم نے اپنی زبان کو بریک لگایا تو وہ اسرائیلی بم کی طرح پھٹ پڑے اور ہمیں دھکے پہ دھکا لگاتے ہوئے کہنے لگے:

"نکل جاؤ، ہماری کمزور نگاہوں کے سامنے سے! اگر دوبارہ پھر کبھی اس طرف کا رخ کیا تو یاد رکھنا، شہنشاہ جہاں پناہ ظلِ سبحانی جلال الدین محمد اکبر کے تیز رفتار جلال کی قسم ہم تمہیں دیوار میں زندہ چنوا دیں گے!!

کرنل محمد خان

(بسلسلۂ گزشتہ)

انگلستان: شہر اچھے کہ بن؟

پریوں کا سایہ ہو گیا

میس میں پہنچے تو دیکھا کہ سینکڑوں مرد و زن خالی پلیٹیں اٹھائے قطار میں کھڑے ہیں اور اتنے ہی مرد و زن بھری پلیٹیں لئے خالی میزوں کی تلاش میں چکرائے پھر رہے ہیں۔ ہم نے اپنے رہنما سے اپنی پریوں کا پتہ پوچھا تو دکلا ہجوم پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا:

"آیئے" ــــ اور ہماری انگلی پکڑ کر ایک ایسی میز کی طرف لے گیا جس کی تین کرسیاں پُر تھیں اور چوتھی خالی تھی۔ ہمیں تینوں کرسی نشینوں کے سامنے پیش کرتے ہوئے بولا:

"خواتین ملئے اپنے معزز مہمان، کرنل خان سے"

خواتین بیٹھے بیٹھے ہی مسکرائیں اور ہمیں کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

شائد اب آپ ہم سے یہ سننے کے متوقع ہوں گے کہ

دیکھتے ہی ہم پہ ان پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر ارتعاش[1]

تو عرض ہے کہ ایسی کوئی بات نہ ہوئی جب آپ کو حوروں اور پریوں کا لالچ دے کر کاونٹی لائبریری کی تین بے نمک، بے رنگ اور بے مزہ ملازماؤں کے آگے ڈال دیا جائے اور ملازمائیں بھی ایسی کہ فی ملازمہ اوسط عمر ساٹھ سال سے متجاوز ہو تو از راہ کرم آپ ہی بتائیں کہ دل ارتعاش کرے گا یا انتقال کر جائے گا۔ بہرحال ہم نے دل کو تھاما اور ثروین کے آباؤ اجداد پر لعنت سے

---

[1] ۔ اکبر کا شعر یوں ہے: جب سے اس پہ ان پریوں کا سایہ ہو گیا ؛ جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر ارتعاش

مختلف چیز سمجھتے ہوئے خالی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ہماری ہمجولیوں نے اپنا اپنا تعارف کرانا شروع کیا:

"میرا نام مسز پامر ہے۔ میں لائبریری میں فہرست سازی پر مامور ہوں۔"

"میں مسز جیکب ہوں۔ میں سفری لائبریریوں کی ذمہ دار ہوں۔"

"میرا نام مس پیل ہے۔ میں جیلوں اور ہسپتالوں کی لائبریریوں کی نگران ہوں۔"

سوچا: "اے خالق و عادل۔ اگر مجھے آثار قدیمہ میں دلچسپی ہوتی تو فوج میں کیوں بھرتی ہوتا؟ اب تو ہی بتا۔ اس آزمائش میں کیوں ڈال دیا ہے؟"

اپنے اللہ سے شکوہ کر چکے تو اپنی ہمجولیوں سے مخاطب ہوئے۔

"آپ سے مل کر بڑی مسرت ہوئی۔"

ہماری اس دو عملی کو خدا تو دیکھ ہی رہا تھا۔ خدا جانے ہمجولیاں بھی دیکھ رہی تھیں یا نہیں۔

"تو پھر آئیے اپنا اپنا کھانا لے آئیں نا۔" مسز پامر اچانک بولی۔

جب کھانا لانے کے لئے اٹھے اور ہم اس خیال سے کھڑے ہو کر رک گئے کہ خواتین آگے آگے چلیں تو مس پیل نے پھرتی سے ہمارے کندھے پر اپنا ہاتھ اور بوجھ ڈال دیا، محبت کی وجہ سے نہیں، لقوے کی وجہ سے! معلوم ہوا کہ موصوف نے بچپن میں یعنی پہلی جنگ عظیم سے ذرا قبل فالج سے جنگ لڑی تھی۔ اور اب سوائے زبان کے آپ کے سب اعضا میں لکنت تھی۔ جب مس پیل کو کھانے کی میز سے کھانے کے دیگچوں تک اور دیگچوں سے میز تک کامیابی سے کھینچ لائے تو ہمارا اپنے کندھوں کا توازن تقریباً مفلوج ہو چکا تھا۔

پھر کھانا شروع ہوا یا یوں کہنا چاہیئے کہ باتیں شروع ہوئیں کہ تین عورتوں کے ہوتے ہوئے کھانا محض ضمنی شغل بن جاتا ہے۔ مسز پامر نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔

"کرنل خان، پاکستان میں آپ کہاں رہتے ہیں؟ میرٹھ میں؟"

مسز پامر کے باپ نے اپنی ملازمت کا بیشتر حصہ غالباً میرٹھ ہی میں گزارا تھا لیکن ظاہر ہے کہ موصوف نے اپنی بیٹی کے جغرافیہ پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی تھی۔ عرض کیا:

"میرٹھ تو کسی دوسرے ملک میں ہے۔ میں راولپنڈی میں رہتا ہوں۔"

"اوہ پنڈی! جو مری کے رستے میں ہے؟"

پنڈی کی یہ ہتک کہ مری کے حوالے سے پہچانی جائے ہمیں بہت ناگوار گزرا۔ بلکہ یوں محسوس ہوا جیسے خود پنڈی اقبال بیگم کی درد انگیز لے میں، فریاد کر رہی ہو: "دل توڑنے والے دیکھ کے چل، ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں ——" لیکن انگریزی راج کے دنوں میں پہاڑوں کی دیوانی میموں کے لئے پنڈی کی اہمیت اسی قدر تھی۔ بہرحال ہم نے کسی قدر انتقاماً کہا:

"جی ہاں۔ مری، اسلام آباد اور بھارا کہو وغیرہ پنڈی کے مضافات میں سے ہیں۔"

مسز پامر نے ہمارا کنایہ نہ سمجھا یا سمجھنے کی کوشش نہ کی اور حسرت بھری آواز میں بولی۔

"کاش، میں ایک دفعہ پھر مری دیکھ سکتی۔ کرنل خان، آپ پاکستان کب لوٹ رہے ہیں؟"

"یہ تو اس بات پر منحصر ہے کہ ہمارا انگلستان سے کب جی بھرتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اپنی بیوی کی یاد کب ستانا شروع کرتی ہے۔"

یہ تبصرہ ہمارے آخری جملے پر مسز جیکب کی طرف سے تھا جو سب سے کم بوڑھی تھیں اور جن کی رگِ ظرافت اچانک پھڑک اٹھی تھی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم کوئی مناسب جواب دیتے، مسز پامر ماہرِ ہندوستان کی حیثیت سے پھر میدان میں کود پڑیں اور مسز جیکب کو سمجھانے لگیں۔

"بیوی نہیں بیویاں کہو۔"

مسز جیکب نے حیرت سے پوچھا: "کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ کرنل کی دو بیویاں ہیں؟"

مسز پامر آرام سے بولی: "دو نہیں، چار۔"

چار کا لفظ سن کر مسز جیکب کے ہاتھوں سے چھری کانٹا گر پڑے اور مبہوت ہو کر ہمارا منہ تکنے لگی گویا ابھی غش کھا کر ابھی گرتی ہے۔ ہم گرتی کو تھامنے کی سوچ رہے تھے کہ مسز پامر نے مسز جیکب کو سمجھایا۔

"مائی ڈیئر میری، بے ہوش ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ انڈیا میں ہر کھاتے پیتے آدمی کی دو، تین یا چار بیویاں ہوتی ہیں۔ میرٹھ میں ہمارے کمشنر محشر کمال بہادر صاحب کی چار تھیں۔"

یہ ہماری موجودگی کے باوجود ہم سے مشورہ کئے بغیر ہماری بیویوں کی تعداد کا تعین کر رہی تھیں۔ بلکہ اب چھری کانٹا اٹھا کر ہمارے ازدواجی معاملات پر دھواں دھار بحث کرنے لگی تھیں۔ اس زنانہ مناظرے کے اڑتے ہوئے دھوئیں میں ہمیں کوئی شگاف دکھائی نہ دیتا تھا جس کے رستے اپنی صفائی میں ایک دو لفظ کنارے کے بل ہی داخل بحث کر سکتے۔ چنانچہ ہمارے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ خاموشی سے بیبیوں کی جنگ دیکھیں اور فیصلے کا انتظار کریں۔ خدا خدا کر کے آخر مطلع ذرا صاف ہوا تو ہم نے کہا:

"خواتین، کیا میں اب پوچھ سکتا ہوں کہ ہماری کتنی بیویاں ہیں؟"

مسز پامر اور مس بیل جو مناظرے میں ہم خیال ہو گئی تھیں، یک زبان ہو کر بولیں۔

"چار۔ کم از کم۔"

ہم نے کہا۔ "تو براہِ کرم باقی تین بیویوں کا محلِ وقوع بھی بتا دیں کہ ہم اُن کے نان نفقہ کا بندوبست کریں اور حقوقِ زن و شوئی کا مطالبہ کر سکیں۔"

اس پر مسز پامر اور مس بیل نے ایک دوسرے کو سوالیہ انداز سے دیکھا جیسے ہم سے ناانصافی کا احساس ہو رہا ہو۔ ادھر مسز جیکب جو باور ہی نہ کر سکتی تھی کہ کوئی باہوش مرد ایک بیوی کے علاوہ ایک بلی بھی کامیابی سے پال سکتا ہے، ہماری حمایت میں الف میموں کو کہنے لگی۔

"دیکھا؟ کرنل خان مہذب آدمی ہے۔ یہ صرف ایک بیوی کا قائل ہے (اور پھر ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے) کیوں ٹھیک ہے نا کرنل خان؟"

اب ہم سے ایک ایسا سوال کر دیا گیا تھا جس سے مصلحت اور شریعت میں ٹکر ہوتی تھی۔ ہم نے درمیانہ رستہ اختیار کر کے مصلحت اور شریعت میں سمجھوتے کی کوشش کی اور کہا۔

"جی ہاں - عام حالات میں ہماری ایکٹو بیوی ایک ہی ہوتی ہے۔ نقطۂ احتیاط کے طور پر تین مزید بیویوں کا حق ذرا محفوظ رکھتے ہیں۔"

اور پھر جو حشر سڑک کے درمیان چلنے والوں کا ہوتا ہے، وہی ہمارا ہوا۔ یعنی دونوں طرف کی ٹریفک سے ٹکرا گئے۔ ہمارے جواب سے نہ مخالف ہمیں متفق تھیں اور نہ موافق میم مطمئن۔ ہماری میانہ روی ہمیں لے ڈوبی تھی۔ علامہ اقبال نے کب کا کہہ رکھا ہے کہ رہا سراپا نالہ بن جایا نوا پیدا کر۔ لیکن علامہ کی نصیحت اس قدر بعد از وقت یاد آئی کہ اب نالہ کھینچنے کا فائدہ تھا نہ نوا دو کرنے کا۔ اب ساکھ بچانے کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ موضوع گفتگو بدل کر کسی ایسے دلچسپ مضمون پر لے آتے کہ ہمیں ہمارے ازدواجی نظریات بھر بھول جائیں۔ ڈیل کارنیگی کا کہنا ہے کہ آپ کے مخاطب کے لئے دلچسپ ترین موضوع خود مخاطب کی ذات ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی یہی گُر کارنیگی فارمولے کے ساتھ ملا کر آزمایا۔ یعنی پہلے مسکرائے، پھر قہقہہ لگایا، پھر کہا "ہم تو آپ کی ٹانگ کھینچ رہے تھے۔"[1] پھر بائی دی وے کہہ کر فقرہ کی طرح پیش کیا۔

"بھئی ہم نے آج تک کسی باس کو اپنے اسٹاف کی اتنی تعریف کرتے نہیں سنا جتنی آج فرینک ٹرومین نے کی۔"

ہمارا موضوع سیدھا ہماری سامعات کے دل سے جا ٹکرایا کیونکہ ٹرومین کے اسٹاف کی پہلی صف میں تھیں۔ تقریباً یک زبان ہو کر بولیں۔

"کچھ ہمارے متعلق بھی کہتا تھا؟"

"بہت کچھ۔"

(ہم نے اپنی سامعات کی آتش تجسس کو ذرا ہوا دی)

"سچ؟ کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا آپ تینوں پریاں ہیں۔"

"پریاں؟ اموئی! ہوائے!!"

ظاہر تھا کہ پریاں خوشی سے اُڑنے لگی ہیں۔ بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ بس چلے تو اپنے مفلوج گلے سے غٹرغوں کی آواز بھی نکال رہی ہے۔ ہم نے مکالمہ جاری رکھا۔

"جی ہاں گُڈ پریاں۔ وہ کہتا تھا یہ تینوں گرلز[2] اس قدر باکمال ہیں کہ ان کی کارگذاری پریوں کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔"

مسز چیل بولی۔ "میں نہ کہتی تھی فرینک ڈارلنگ ہے۔"

مسز پامر نے کہا۔ "بے شک۔"

مسز جیکب نے تائید کی: "سو فیصد۔"

اور کوئی پچاس فیصد ڈارلنگ ہم بھی بن گئے کہ اصلی ڈارلنگ کا پیام لائے تھے۔ بُلبل کی ہر دل عزیزی کا آخر کیا راز ہے؟ مژدۂ بہار لاتی ہے؟ تو ایسا ہی مژدہ ہم بھی لائے تھے۔ سو کھانا ختم ہوا تو ہم ایک بے پایاں خیر سگالی کی فضا میں کیفے ٹیریا سے باہر نکلے

---

[1] مذاق کرنے کے معنوں میں انگریزی محاورہ : PULLING YOUR LEG

[2] GIRLS یعنی لڑکیاں۔ انگریز مذاق میں بعض اوقات بوڑھیوں کو لڑکیاں کہتے ہیں۔

اکا اثر تھا کہ مس مچل کا دوستانہ بوجھ ہمارے دوشِ ناتواں پر تھا۔ بوجھ بہت سبک تھا نہ بہت گوارا لیکن ہم خوش تھے
یل کارنیگی کا مطالعہ رائیگاں نہیں گیا تھا اور جیسا کہ ڈیل کی کتاب کے نام[1] کا منشا تھا، ہم فی الواقع سیکھ چکے تھے کہ دشمنوں کو
اور میموں کو موم کیسے کیا جاتا ہے۔

لنچ کے بعد ہمیں لائبریری کے مختلف شعبوں کی تعارفی سیر کرائی گئی۔ ہم اپنی بوڑھی میزبانوں کو ابھی ابھی مل چکے تھے لیکن
ں اپنے اپنے شعبوں کی سربراہی کرتے دیکھا تو ان کے انداز ہی کچھ اور تھے۔ وہی کیفے ٹیریا والی ویران صورت بڑھیاں اپنے
ور عملاً دفتروں میں رنگا رنگ کتابوں کے سائے تلے بڑی طراوت بخش نظر آتی تھیں اور سچ مچ یوں لگتی تھیں جیسے پریا
ں پیاں بیٹھی ہیں۔ پھر جب ان سے لائبریری کے فن پر بات ہوئی تو معلوم ہوا کہ ہم تو ہنوز طفلِ مکتب ہیں اور یہ کہ وہ جنول
ے کو بھی دو چار سبق پڑھا سکتی ہیں۔ بے شک بڑھیوں نے اپنے ابتدائی بیان میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ تھوڑا سا بد تمیز
، غلط بیان نہ تھا۔

کیا مس ماریہ سچ مچ لونلی ہیں ؟

لائبریری سے فارغ ہوئے تو ہمیں اپنے ہوٹل لے جایا گیا۔ جہاں ہمارا سامان پہلے ہی بھیج دیا گیا تھا۔ کمرہ کھولا تو اندر
امان اور ہوٹل کے علاوہ ایک محترمہ رکھی تھیں یا بیٹھی تھیں جو لائبریری والی محترمات سے خاصی مختلف تھیں۔ یعنی ایک تو
بہت مناسب تھی، دوسرے ان کے اعضا متناسب تھے، تیسرے ان کے رنگ میں ایک دلآویز سی ملاحت تھی اور چوتھے
ختصر یہ کہانی طویل ہے۔

اب یہ بی بی ہمارے سامان میں تو آئی نہیں تھی۔ کیا یہ ہوٹل کے سامان کا حصہ تھی؟ مثلاً روم میڈ وغیرہ لیکن اس کی جسمانی
م میڈوں سے واضح طور پر سپیریر قسم کی تھی۔ دماغ پر ناحق زور دینے کی بجائے ہم نے سیدھا سوال کر دیا۔

"آپ کی شانِ نزول؟"

جواب آیا۔ "اور آپ کی؟"

ہم ذرا مؤدبانہ جواب کی توقع رکھتے تھے لیکن جو جواب اس روپ اور رفتار سے آئے جیسے بلے سے ٹکرا کر گیند آتی ہے
بلکہ گستاخانہ کہلانے کا مستحق ہے۔ ہم نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"ہماری شانِ نزول یہ ہے کہ یہ کمرہ ہماری خاطر ہفتے بھر کے لئے ریزرو ہے اور اس لمحہ سے ہم یہاں رہنے آئے ہیں۔"

"اور ہماری شانِ نزول بھی حرف بحرف یہی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ ہم کوئی آدھ گھنٹے سے یہاں رہ بھی رہے ہیں
سامان رکھا ہے۔"

"سوال صرف اتنا ہے کہ ہمارا سامان یہاں کیسے آگیا؟"

---

1. "HOW TO WIN FRIENDS AND INFLUENCE PEOPLE"

"جی ہاں۔ اسی سوال کا جواب ہمیں بھی مطلوب ہے۔ شاید آپ اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں۔"

ہم نے کانوں پر ہاتھ رکھے کہ ہمارے پاس ایسی کوئی روشنی نہ تھی اور ہاتھ ابھی رہیں تھے کہ ہوٹل کا بوڑھا پورٹر بھاگا بھاگا کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے محترمہ سے اور پھر ہم سے معذرت چاہی۔ پھر ہمارا سامان اٹھا کر کمرے سے نکلا اور ہمیں پیچھے پیچھے آنے کو کہا۔ ہم محترمہ کو سلام کرتے ہوئے باہر نکلنے کو تھے کہ محترمہ بولیں۔

"ٹھہریئے ـــــ میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کہاں سے آئے ہیں؟"

"پاکستان سے۔ اور معافی چاہتا ہوں، اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ میرا نام خان ہے۔"

"اوہ، خان فیملی؟ آپ ایوب خان کے رشتہ دار ہیں؟"

پہلے تو ہم ذرا جھجکے لیکن پھر رواں ہو گئے۔

"جی ہاں۔ اُن کے لاکھوں رشتہ داروں میں سے ایک ہوں۔ پاکستان میں ہر دوسرا شخص خان ہے۔ ہر تیسرا شخص ڈبل خان ہے اور ہر چوتھا شخص خانخاناں ہے۔"

"پھر تو آپ بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔"

"اگر آپ نے یہی سمجھا ہے تو ہم تردید نہیں کریں گے۔ اور اگر گستاخی نہ ہو تو آپ کی تعریف؟"

"اوہ ـــــ میں بھول گئی ـــــ میرا نام ماریہ ہے ـــــ میں سپین سے برٹش گورنمنٹ کی دعوت پر برطانوی نظامِ تعلیم کا مطالعہ کرنے آئی ہوں۔ میں لیکچرر ہوں اور تاریخ پڑھاتی ہوں۔"

"تو مس ماریہ آپ شاید یہ سُن کر خوش ہوں گی کہ ہم آپ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ ہم بھی برٹش گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔"

"ارے، سچ؟"

"جی ہاں۔ اور ہم کتب خانوں کا مطالعہ کرنے آئے ہیں۔"

"آپ کا اور ہمارا مشن تقریباً ایک ہے۔ پھر یہ لوگ ہم غیر ملکی مہمانوں کو ایک ساتھ دورہ کیوں نہیں کرنے دیتے؟ کچھ معقول بھی رہے۔"

ہمیں اس سوال کا صحیح جواب معلوم نہ تھا۔ محض جواب کی خاطر شوشہ چھوڑا۔

"شاید اس لئے کہ ہم مختلف ملکوں کے باشندے ہیں، یا شاید اس لئے کہ آپ خاتون ہیں اور ہم . . . . . ."

"نان سینس۔ ہم دونوں انسان ہیں۔"

خدا جانے ہمیں اسی لمحہ احمد فراز کا مصرع کیوں یاد آگیا: "دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں"، لیکن کوئی شعر یاد آجائے تو لازم نہیں کہ اسے بآوازِ بلند گا یا سُنایا بھی جائے۔ چنانچہ ہم شعر پی گئے اور گفتگو کو غیر عاشقانہ سطح ہی پر رہنے دیا۔ عرض کیا۔

"شاید یہ انگریز نہیں چاہتے کہ ان کے مہمان آپس میں نوٹ ملائیں۔"

"تو اب نہ ملاتے بھی ملائیں گے ہر شام کو۔"

پیشتر اس کے کہ ہم نوٹ ملانے کے معاہدے پر دستخط کر دیتے، دروازہ کھلا اور ایک بار پھر پورٹر کا سر نمودار ہوا حسب معمول بڑی لجاجت سے بولا۔

"سر آئیے گا۔ میں آپ کو کمرہ دکھادوں۔"

ہم نے ماریہ سے رخصت لی۔ اپنے کمرے میں گئے اور پورٹر سے پوچھا کہ ہمارا سامان مس ماریہ کے کمرے میں کیسے چلا گیا؟ پورٹر بولا

"سر آپ کا سامان تو آپ ہی کے کمرے میں تھا۔ مس ماریہ وہاں چلی گئی۔" —— "بالجبر؟"

"بالجبر ہی کہیں۔ یہ دو کمرے برٹش گورنمنٹ نے ریزرو کرائے تھے۔ مس ماریہ نے دونوں دیکھے اور آخر وہ کمرہ پسند کر لیا جس میں آپ کا سامان رکھا تھا۔ ہم ابھی آپ کا سامان اٹھا نہ پائے تھے کہ آپ آگئے۔"

"لیکن ان کمروں میں کچھ فرق تو نہیں۔ مس ماریہ نے یہ حرکت کیوں کی؟"

"میں مس ماریہ کی نیت کی تشخیص وثوق سے تو نہیں کر سکتا لیکن وہ غاصب نہیں تھی۔ فقط بے چاری LONELY ہے اور ہمدردی کی مستحق ہے۔ رفاقت کا فاقہ بڑی چیز ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھے پورٹر کی آنکھیں دھندلا سی گئیں، گویا مس ماریہ کی حالت سے متاثر ہو کر کہہ رہا ہو۔ کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ —— اور پھر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

رحم دل اور جہاندیدہ پورٹر نے ہمارے خیالات کا دھارا بدل کر رکھ دیا ورنہ سچی بات ہے ہمارے خیالات ذرا فاسد ہی تھے

—— ÷ —— : —— ÷ —— (باقی آئندہ)

خرافات

(مُراسلے)

مملکت طنز و مزاح کے آتا ترک!

سلامت رہیئے:

بمبئی شگوفہ کا ڈرامہ نمبر تو خوب نکالا۔ بڑی دیر بعد باقاعدہ رسالہ پڑھنے کو ملا۔ روح خوش ہوگئی۔

ڈاکٹر اسعد اللہ، جلگاؤں

محترمی تسلیم

شگوفہ، شمارہ جولائی میں پیکران بے سخن کے عنوان سے جناب مناظر عاشق نے اپنی علی میر و جمیل اختر کے ہمراہ ہوئی کچھ باتوں کا ذکر کیا جس میں "مشتری و بھانڈ" والے واقعہ کو جمیل اختر نے خود سے منسوب کیا ہے جو غلط ہے۔ یہ واقعہ داغ دہلوی صاحب کو ایک بارات میں پیش آیا تھا جس میں وہ شریک تھے۔ بارات میں بھانڈ و طوائف مشتری ناچ گا رہے تھے داغ کو آتا دیکھ کر مشتری نے کچھ کہہ کر بھانڈوں کو اشارہ کر دیا۔ اور وہ "داغ سالے کو" "داغ سالے کو" کی تکرار کرنے لگے تو داغ نے ایک بھانڈ کو بلا کر یہ شعر گانے کے لیے کہا کیوں کہ مشتری کا پیٹ کچھ اونچا نظر آ رہا تھا۔

حمل نو مہینے کا ہے مشتری کو
کوئی دم میں بچہ ہوا چاہتا ہے
جس پر مشتری نے برجستہ جواب دیا۔
خوشی آپ کو کیوں نہ ہو سالے برادر
کہ ہمشیر زادہ ہوا چاہتا ہے

یہ تنقید نہیں اپنی معلومات کے مطابق لکھ رہا ہوں۔

ارشاد علی، بالاسپور

مکرمی:

شگوفہ ڈرامہ نمبر ۷۹ء کو ہمارے ڈرامہ گروپ نے کافی پسند کیا۔ اسٹیج کلا سنگم بمبئی کی مبارکباد قبول فرمائیے

ایس ایل۔ شیخ

پریسیڈنٹ اسٹیج کلا سنگم، بمبئی ۲۹

○ شگوفہ پابندی کے ساتھ مل رہا ہے جس کے لیے میں آپ کا نہایت مشکور و ممنون ہوں۔ کرشن چندر میموریل کلب کے ارکان میں یہ مزاحیہ رسالہ بہت مقبول ہوا ہے۔

خوشس دلیمنی، پونچھ

○ کافی دنوں کے بعد شگوفہ پڑھنے کا موقعہ ملا۔ "شگوفہ" دیکھا، میرے چاروں طرف شگوفے ہی شگوفے نظر آنے لگے۔ "شگوفہ" واقعی اچھا لگا، اگر آپ اسے شگوفہ نہ سمجھیں۔ کتاب کی اہمیت مواد سے ہوتی ہے اور جاذبیت کتابت اور طباعت سے۔ اس لحاظ سے بھی مجھے اچھا لگا ــــ واقعی اچھا لگا۔ اگر آپ اسے بھی شگوفہ نہ سمجھیں۔

غالب حسنین، پٹنہ

قبلہ! تسلیمات

میں "شگوفہ" کا پرانا قاری ہوں، مجھے طنز و مزاح سے خاص دلچسپی ہے۔ طنز و مزاح کے میدان میں چونکہ شگوفہ کا کوئی ثانی نہیں ہے اسی لئے بڑی پابندی سے شگوفہ خرید کر پڑھتا ہوں۔ پڑھتے پڑھتے لکھنے کا شوق چرایا۔

محمد اظہر حیات، ناگپور

○ اس دور میں جبکہ عوام تفکرات میں ملوث ہیں ہم شگوفہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو کچھ دیر کے لئے تفکرات کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ میں مزاحیہ مشاعرہ کی روئیداد کا مطالعہ کر رہا تھا کہ میری نظر اس نظم پر پڑی جس میں صبغۃ اللہ بمباٹے نے آجکل کے طلباء و طالبات کے حالات کو اچھے انداز میں سنوارا ہے۔ انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جبکہ عوام بغیر شگوفہ کے زندگی میں کمی محسوس کریں گے۔

ایم۔ اے۔ احمد، انوار العلوم کالج حیدرآباد

No. 15822/68 Postal Regd. No. H.HD 6

SHUGOOFA

Vol. 13 Copy 10 31 Bachelor Quarters M.J. Market, Hyderabad- October 1980 Phone : 57716

NOVEMBER 1980
RS. 2/-
CM
BANK
STRIKE
SCHOOL

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر: سید مصطفیٰ کمال

جلد: ۱۳
شمارہ: ۱۱
نومبر ۱۹۸۰ء

مجلس ادارت: حمایت اللہ، منظور احمد، مسیح انجم

سالانہ (۲۲) روپے
لائبریریوں سے (۲۵) روپے
بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ
فی پرچہ (۲) روپے

جنرل منیجر: سمیع جلیل

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان حیدرآباد ۲

خط و کتابت کا پتہ: ۳۱۔ چیمبرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔ فون: 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مال مسروقہ (ڈائجسٹ)

مال مفت (انشائیے)

دخل در معقولات (ڈرامہ)

حق تو یہ ہے (ترجمہ)

اڑیں گے پرزے (خاکہ)

بال کی کھال (تبصرہ)

چوٹیں

* *

کرنل محمد خان

انگلستان: شہر اچھے کہ بن؟

شام کو ڈنر کے لئے ڈائننگ ہال میں گئے تو مس ماریہ کو بدستور کارخپ تنہائی سے دوچار پایا۔ بہت دکھ ہوا اور فوراً ہمدردی کے جوش میں اپنی تمام تر رفاقت اس کے قدموں میں ڈھیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ اپنی میز چھوڑ کر محترمہ کی اجازت لے کے اس کی میز پر جا بیٹھے اور پھر اسے اس طرح مخلصانہ وارفتگی سے دیکھا جیسے کہتے ہوں کر! MAIDEN IN DISTRESS (دوشیزۂ مظلوم) اے۔ ہم حاضر ہیں۔ اب حکم کر! دل چاہیئے یا جان؟ یا دونوں؟ کہ دل ہے سو حیسز تیری جان ہے سو حال تیرا —— لیکن مس ماریہ نے ہماری جاں نثاری کی پیشکش کا کوئی واضح خیر مقدم نہ کیا۔ بس ہمیں دیکھ کر ذرا مسکرائی اور بولی۔

"آپ آگئے؟ بیٹھیے —— اور جیسا کہ میں کہہ رہی تھی یہ برٹش گورنمنٹ . . . ."

اور پھر دس منٹ نہیں، بیس تیس، پورے ایک سو بیس منٹ بلا وقفہ بولتی رہی جیسے اپنی کلاس کو سبق پڑھا رہی ہو۔ ہم پہلے چند منٹ تو کچھ سوچ سمجھ کر ہاں نہ کرتے رہے لیکن جب محترمہ کی برق گفتاری سے رشتۂ معانی ہاتھ سے چھوٹنے لگا اور محترمہ برٹش گورنمنٹ کو روندتی ہوئی برٹش پارلیمنٹ میں جا داخل ہوئی تو ہم نے سر ہلانا بند کر دیا اور ایک سکتے کے عالم میں اس کی لرزتی، پھڑکتی، سرسراتی، سنسناتی زبان کو دیکھنے لگے۔ پھر ہم پر اچانک القا ہوا کہ ماریہ کو بےشک ایک رفیق کی ضرورت ہے لیکن اس لئے نہیں کہ اس کے سامنے تنہائی کا مارا دل چیر کر رکھ دے بلکہ اس لئے کہ فاقے کی ماری زبان توڑ کر رکھ دے۔ بہرحال ایک بات واضح تھی کہ ہمارے بوڑھے اور جہاندیدہ پورٹر کی یہ تشخیص درست نہیں تھی کہ خاتون اکیلی ہے اور ساتھی چاہتی ہے بلکہ یہ کہ خاتون باتونی ہے اور سامع چاہتی ہے۔ لیکن ہم نے سوچا: چلو! ایک باتونی پردیسن کا سامع بننا بھی ایک طرح کی سوشل سروس ہے۔ چنانچہ خدمت کرتے کرتے ہم نے کھانا بھی ختم کر لیا لیکن اپنا حسن سماعت ختم نہ ہونے دیا۔ پھر اچانک ہمارے لئے ایک بیرا پیغام لایا کہ آپ کا ٹیلیفون آیا ہے۔ ہم ماریہ سے معذرت کرتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے ہال سے باہر گئے مگر ٹیلیفون سے فارغ ہو کر لوٹے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ماریہ کے روبرو ہماری نشست پر ایک خوش وضع سا آدمی بیٹھا ہے اور غور سے دیکھا تو یہ وہی شخص تھا جو کافی دیر سے ڈائننگ ہال کے دروازے کے قریب منڈلا رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی تپاک سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

"امید ہے آپ مجھے معاف کریں گے۔ میں . . . ."

وہ شخص یہ جملہ مکمل نہ کر پایا تھا کہ ماریہ بولی:

"مسٹر خان - فرینیڈ سے ملیں - یہ میرا خاوند ہے ۔"

ہم حیران تھے کہ ماریہ نے اتنا جلد خاوند کیسے پیدا کر لیا - نرگس کا تجربہ تو یہ ہے کہ ہزاروں سال رونے کے بعد بھی دیدہ ور پیدا ہونے میں نہیں آتا - بہرحال ہم نے کہا :

"کیسے مزاج ہیں مسٹر فرینیڈ ؟ لیکن آپ کی بیگم نے تو ہمیں نہیں بتایا کہ آپ بھی اُن کے ساتھ آئے ہوئے ہیں ۔"

بلکہ سچ تو یہ تھا کہ ہمارے سامنے بیگم صاحبہ نے اپنے بیگم ہونے کا ہی اقرار نہیں کیا تھا اور ہم بھی یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ موصوفہ ایک چندے سن باکرہ ہیں - فرینیڈ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ماریہ جھٹ بول پڑی :

"ہم آئے تو اکٹھے تھے لیکن یہاں آکر یہ گرل فرینڈ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا ۔"

فرینیڈ بولا : "ڈارلنگ یہ الزام غلط ہے اور بہرحال میں معافی مانگ چکا ہوں ۔"

"لیکن تمہارا کوئی اعتبار نہیں ۔"

"ڈارلنگ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا ۔"

پھر ماریہ کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے تھپتھپانے لگا - ہاتھ کا ہاتھ سے مس ہونا تھا کہ ماریہ کے دل کو خبر ہو گئی اور دل ہی تو تھا شتابی سے پگھلنے لگا - ماریہ ایک گہرا اور خمار آلود سانس لے کر بولی :

"مسٹر خان - آپ کی رفاقت کا شکریہ - اب دیر ہو گئی ہے - آپ آرام کریں ۔"

اپنی برطرفی کا حکم سن کر ہم اُٹھے - اپنی سوشل سروس کی نرم و نازک بساط کو لپیٹا اور اپنا سا منہ لے کر اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئے - مزید سوچنے پر معلوم ہوا کہ ماریہ صاحبہ نے بوڑھے پورٹر جیکو نہیں ، ہمیں بھی چکمہ دیا ہے - اس عورت کو رفیق ضرورت تھی نہ سامع کی بلکہ ایک عارضی رقیب کی ضرورت تھی کہ اپنے خاوند کی آتشِ حسد کو بھڑکا سکے اور یہ خدمت اُس نے ہماری اطلاع کے بغیر ہم سے لے لی تھی - ہم زندگی میں خواتین کے بہت کام آئے ہیں لیکن ہمارا یہ استعمال کبھی نہیں ہوا تھا - تھی تو شاید یہ بھی ایک قسم کی سوشل سروس لیکن کاش یہ سروس ہماری بجائے کسی زیادہ معتدل مزاج شخص سے لی گئی ہوتی ——— قصہ کوتاہ ، اُس رات ہمیں بہت کم نیند آئی - بس ایک چنگاری سی ہمارے سینے میں سلگتی رہی اور کیسے نہ سلگتی کہ بے ننگ سینۂ دل اگر آتش کدہ نہ ہو۔

مس مچل کی پیشکش : میرا لال دوپٹہ ململ کا

دوسرے روز فرینک شرومین سے ملنے گئے تو اسے مس مچل سمیت کاؤنٹی لائبریری کے باغیچے میں انتظار کرتے پایا شرومین گڈ مارننگ کے بعد گھڑی دیکھ کر بولا :

"آپ بالکل صحیح وقت پر تشریف لائے ہیں - دیکھئے گھڑی نے ابھی ابھی دس بجائے ہیں اور اسی لمحے سے آپ آئندہ کا پروگرام مشوروں کے لئے مس مچل کی کمان میں آ گئے ہیں - اس کے بعد آپ کو جو احکام مس مچل ہی سے ملیں گے اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان پر مکمل اور غیر مشروط تابعداری کے ساتھ عمل کریں گے ۔"

ہم نے کمر سے جھک کر مس مچل کو سلام کیا یعنی بولے بغیر حلفِ وفاداری اُٹھا لیا - ایسے موقعوں پر فلموں میں تو ہیروئین

اپنا ہاتھ بھی الٹ کر آگے بڑھاتی ہے جسے بیرا اپنے ہاتھ سے تھام کر اور ہونٹوں سے چوم کر باادب نخوت چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن مس پچل بظاہر وفاداری کا اتنا پختہ ثبوت بیزفرمودی بھی تھیں اور ان کی توجہ آ بھی جاتی تو شاید یہ ثبوت ہم بہت کامیابی سے بہم کر سکتے ـــ آپ کو یاد ہوگا کہ مس پچل ان معجزات میں سے وہ معجزہ تھیں جو نصف صدی قبل تاریخ سے جنگ لڑ کر پروان چڑھی تھیں اور ابھی آخری رنجیں بھی دوسروں کے کندھوں سے ہی لٹک رہی تھیں اور ان کا جسمانی ساز بالکل بے آواز تھا سوائے زبان کے جس میں آواز بھی باقی تھی اور حرکت بھی۔ یعنی ہرچند کہ موصوفہ ساقین کی کمزوری کی وجہ سے بے سہارا نہیں چل سکتی تھیں، تاہم ان کی زبان بے تیغ بھی لڑتی تھی۔ مس پچل نے کار میں متمکن ہوتے ہی ہمیں پہلا حکم دیا ۔

"چلیے بیٹھیے کار میں ۔ میں آج آپ کو ہم پہلے سے زیادہ پُرعزم ہوں گے ۔"

ہم کار میں بیٹھ گئے۔ ظاہر تھا کہ آج ہماری ڈیوٹی شہر سے کہیں باہر ہے اور کینٹ ہی شہر سے باہر نکل کر فطرت کی آغوش میں جاتا ہے۔ ہم تو خوشی کے مارے قبلہ شیخ صاحب کی طرح ــــ اپنے شیخ چلی ہو رہے ہیں ـــ پیشگی ہی آغوشِ فطرت میں داخل ہو کر کھو گئے اور کھوئے رہے تا آنکہ ہمارے دائیں ہاتھ کی سیٹ پر کوئی مجہول قسم کی چیز نازل ہوئی۔ ہم نے آنکھ کھولی اور دیکھا تو مس پچل بیٹھی ہے ۔

ہم نے ازراہِ ہمدردی خیریت مزاج پوچھی اور کہا ۔

"میں سہارا دے کر پچھلی سیٹ پر لٹا دوں ؟"

مس پچل بولی ۔ "اگر میں پچھلی سیٹ پر لیٹ گئی تو یہ کار کون چلائے گا ؟"

مارے خوف کے ہمارے ہاتھ سے مصلحت کا دامن چھوٹ گیا اور ہمارے منہ سے ایک وحشت کے عالم میں نکلا ، "کیا آپ خود کار چلائیں گی ؟"

مس پچل ہماری طرف دیکھے بغیر نہایت سکون سے بولی ۔

"معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا ہے ۔؟"

ہم نے ایک فٹ بال کے سائز کا اچھو روکتے ہوئے دل میں کہا ، "مارے گئے" اور زبان سے بولے۔ "یعنی آپ سچ مچ کار چلا لیتی ہیں ؟"

مس پچل مسکراتے ہوئے بولی ۔ "کوشش تو کرتی ہوں ۔"

اور ادھر مس پچل کے منہ سے کوشش کی شش نکلی اور ادھر انجن کے منہ سے بررررر نکلی ۔ مس پچل نے انجن اسٹارٹ کر دیا تھا لیکن ہم ابھی بھی اسے اپنی ماڈھی کا ٹھڈر کا غزہ سمجھ رہے تھے کار کو اسٹارٹ تو زبان کے اشارے سے بھی کیا جا سکتا ہے لیکن کار چلانا دو سالم ٹانگوں کا محتاج ہے اور ہمیں یقین تھا کہ مس پچل زبان سے خواہ پہاڑوں کا دل چیر دے، اپنے پاؤں سے پنگ پانگ کی بال کو بھی مخاطب نہیں کر سکتی۔ پھر ہم نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں سے کوئی ڈرائیور نمودار ہوتا ہے۔ لیکن دفعتاً ہمیں کار کے پہیوں میں جنبش محسوس ہوئی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا تو کار حرکت میں تھی اور دوڑنے پر آمادہ تھی۔ میٹر پر نظر دوڑائی تو سوئی صفر سے اچھل کر دس بیس عبور کرتی ہوئی تیس سے آگے بڑھ رہی تھی ...... تیس ! ...... چالیس ! (ہم نے مضبوطی سے کار کا گریبان پکڑ لیا) ...... پچاس ! (ہم نے سانس روک لیا) ...... ساٹھ ! (ہماری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا) ـــــ معلوم ہے ایکسیلیریٹر مس پچل کے پاؤں کے نیچے اتفاقاً دب گیا ہے اور کار بھاگنے کے ساتھ ساتھ یعنی خدا تعالیٰ کے سپرد کیے ہوئے ہے ـــــ ہمیں دنیا ختم ہوتی محسوس ہوئی اور آنے والے کرشن کے انتظار میں

تصادم ہے ۔ یہ مفادات کا تصادم نہیں کہ استحصال کی نوبت آئے ۔ وہ فرزانوں کا کھیل ہے ۔"
ڈاکٹر پال سے ملاقی پاگلوں کی رواداری کا قصہ سنا تو محسوس ہوا کہ یہ اخلاق دنیا بھر میں ایک جیسی ہوتی ہے ۔ گورے اور کالے فرزانوں میں ہزار فرق سہی، گورے اور کالے پاگلوں میں کوئی فرق نہیں ۔ لیکن مزید سوچا کہ فطرت کی کیا ستم ظریفی ہے کہ انسانی مساوات کا آدرش صرف پاگل پن کی سطح ہی پر قابلِ حصول ہے ۔

ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے بعد مس جیل ہمیں شفاخانے کی لائبریری دکھانے لے گئیں جہاں کئی معزز مریض " بیشہ مصروف مطالعہ تھے ۔ مس جیل نے ہمارا دو تین اصحاب سے تعارف کرایا اور باہم بڑی سنجیدہ باتیں شروع ہو گئیں ۔ ایک صاحب جو برٹرینڈ رسل کی کتاب پڑھ رہے تھے، ہمارے کان کے قریب منہ لاکر سرگوشی کرنے لگے ۔

" مصنف بلبلا الحواس ہے ۔ میں مناظرے کے لئے تیار ہوں ۔ کیا لندن جاکر آپ اُسے میرا چیلنج پہنچا دیں گے ؟ "

ہم نے بجوشی یہ کارِ خدمت انجام دینے کا وعدہ کیا اور اپنے دوست سے ایک معانقہ کا انعام پاکر بخیریت لائبریری سے نکل آئے ۔ واپسی پر راہ میں مس جیل سے پوچھا ۔

" اِن لوگوں کو رسل کی کتابیں دے کر آپ کتابیں ضائع نہیں کر رہے ۔ ؟ "

بولی ۔ " ہمارا کام ان کی فرمائش پوری کرنا ہے ۔ ویسے رسل کی کتابیں اکثر قارئین پر ضائع ہی ہوتی ہیں ۔ "

(باقی آئندہ)

رضا نقوی واہی

اسٹوڈنٹ

[آج کل طلباء کے اندر جو ان ڈسپلن ہے اس کو پیشِ نظر رکھ کر میں نے ایک نظم لکھی تھی جو انھیں پسند نہ آئی۔ اب ذیل کی نظم طلباء کی وکالت میں لکھی گئی ہے ـــ (واہی)]

جب اور شگوفہ نہ ملا اس کے قلم کو
واہی نے چنا مشقِ سخن کے لئے ہم کو

بے رحم نے چھوڑا نہ ہمیں کو نہ شما کو
جی کھول کے مطعون کیا ہم طلباء کو

شکوہ ہے کہ ہم صاحبِ کردار نہیں ہیں
بینا نہیں عاقل نہیں ہشیار نہیں ہیں

پڑھ لکھ کے بھی ہم لوگ گروہِ جہلاء ہیں
لیلیٰ کوئی مل جائے تو مجنوں کے چچا ہیں

جو کچھ بھی وہ فرما گئے سر خم ہے ہمارا
تلخیٔ سخن ذوقِ سخن کو ہے گوارا!

وہ خوش ہوں تو دن کو بھی گھنی رات کہیں ہم
لیکن جو اجازت ہو تو اک بات کہیں ہم

چال اپنی ہے ٹیڑھی تو خفا کیوں ہیں وہ ہم پر
چلتے ہیں بزرگوں ہی کے ہم نقشِ قدم پر

الزام ہے کیوں ہم پہ کہ ہم بانیٔ شر ہیں
ہم لوگ تو ماحول کے اک بیرومیٹر ہیں

استاد ہمارے ہوں کہ اربابِ سیاست
دونوں ہی ہمیں دیتے ہیں جُلّابِ سیاست

دونوں ہی کا فیضان ہے ذہنِ طلباء پر
دونوں ہی کا احسان ہے ہم اہلِ وفا پر

دونوں ہی کی دن رات یہی رہتی ہے نیت
لاتے ہیں مصرف میں ہمیں حسبِ ضرورت

استادوں کو فرصت ہی کہاں ہے کہ پڑھائیں
تہذیب سکھائیں ہمیں اخلاق سکھائیں

کالج میں جو دن رات لڑاتے ہوں سیاست
اک دوسرے کی خود ہی بناتے ہوں حجامت

جو ذات کے اور نسل کے خانوں میں بٹے ہوں
جو اپنے ہی اغراض کے پھندوں میں پھنسے ہوں

ان سے یہ توقع کہ ہمیں راہ دکھائیں
جو خود ہی ہوں بگڑے وہ ہمیں خاک بنائیں

یہ دیکھتے پھرتے ہیں جو حضراتِ سیاست
ہم لوگوں کے حق میں ہیں نئی ایک مصیبت

جب دیکھئے دھاڑو کالج پہ کھڑے ہیں
اور گرم سی تقریر کوئی جھاڑ رہے ہیں

انگیخت کیا کرتے ہیں جذبات ہمارے
تا ایں کہ بدل جائیں خیالات ہمارے

ٹوٹل ریوولیوشن کا ہرا باغ دکھا کر
کہتے ہیں کہ چھوڑو بھی یہ تعلیم کا چکر

مطلب ہے کہ ماحول سے کالج کے ہٹا کر — رکھیں ہیں خاص اپنا رضاکار بنا کر
القصہ ہیں ہم وہ خس و خاشاکِ نشیمن — تنورِ سیاست کا جو بنتے ہیں جلاون
جس طرح کے ماحول میں انسان پلے گا — ظاہر ہے اسی رنگ کے سانچے میں ڈھلے گا
جب تک کہ نہ بدلے گا یہ ماحول سماجی — بدلیں گے نہ بچے ہی نہ بچوں کے پتا جی
ہم سے جو تمدن کو گلہ ہے تو غلط ہے — تہذیب اگر ہم سے خفا ہے تو غلط ہے

واہی سے ہے یہ عرضِ گروہِ طلباء کی
اڑتی ہے اگر گرد تو وحشت سے ہے ہاکی

سرپٹ حیدرآبادی

تضمین بر غزل غالبؔ دہلوی

بموں پہ بم یوں ہی برساؤ میری جاں کے لیے — رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لیے
ملال و حزن ہے سرپٹ کے خاندان کے لیے — بنا ہے عیش، تجمل حسین خاں کے لیے
ارادہ ہے کہ کروں میں بھی اپنے دستِ دراز — درازدستیٔ قاتل کے امتحاں کے لیے
اٹھا کے لکڑی بڑھا مارنے جو میری طرف — اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے
خدا کرے کہ بتاؤں میں تو بھی گھر جائے — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے
یہ کس نے شکر و شکر نگر کا نام لیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
زمیں کو مارے نہ ٹھوکر تو اور کیا کرے وہ — بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے
چرا کے بھر لیے سب تم نے اپنی افشاں میں — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے
ہے میرے واسطے بے کار چلو بھر پانی — سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے
میاں خضر، زیست میں بھی شاہ ہوں بعد مرگ بھی شاہ — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے
میرا کلام ہے سنجیدہ بھی، مزاحیہ بھی — کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

سنائیں بزم میں سرپٹ سب اپنا ذاتی کلام
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے

دادِ سخن

مفلس فاروقی

کرتے ہیں ملّا اور پنڈت　　پیٹ کی خاطر سو ہتھکنڈے
جو مل جائے کھا لیتے ہیں　　گوشت، پراٹھے، مچھلی، انڈے
پیار میں ملتی ہیں سوغاتیں　　لائیں گھونسے، جوتے، ڈنڈے
عشق کا بھوت نہ سر سے اُترا　　لاکھ کئے تعویذ اور گنڈے
کرسی میں ہیں سبھی برابر　　چاہے سنڈے ہو یا منڈے
کیسے عرضی پاس کرائیں　　نہیں جیب میں اپنے گنڈے
رشوت کی چکی کو کھا کر　　بابو صاحب ہوئے مشٹنڈے
ہفتہ میں بس ایک ہے اپنا　　بیگم کا ہر دن ہے سنڈے
ممی گرم انگارے جیسی　　ڈیڈی قلفی جیسے ٹھنڈے
دبلے پتلے سارے لیڈر　　کھا کھا کر ہو گئے مشٹنڈے
ایک ہے شعلہ ایک ہے شبنم　　میڈم گرم تو مسٹر ٹھنڈے
تم بے حس ہو ہم ہیں مفلس　　تم بھی ٹھنڈے ہم بھی ٹھنڈے

ہم نے پائے داد میں مفلس
سڑے ٹماٹر گندے انڈے

غزل

محمود نشتر

دید کو جن کی ہم ترستے ہیں　　وہ گلی میں عدو کی بستے ہیں
وہ بھی پی کر کہیں سے آئے ہیں　　لڑکھڑاؤں تو لوگ ہنستے ہیں
دیدنی حجام ہو گئے مہنگے　　بی اے، ایم اے بہت ہی سستے ہیں
نقلی چہروں کا گرم ہے بازار　　اصلی چہروں کو ہم ترستے ہیں
دام زلفوں کا چھوڑتا ہے کسے　　اچھے اچھے بھی اس میں پھنستے ہیں
لوگ اڑنے لگے خلاؤں میں　　پیر اپنے زمیں میں دھنستے ہیں

ان کے وعدوں کو کیا کہوں نشتر
دیکھیں یہ ابر کب برستے ہیں

محمد برہان حسین

کاروبار

لندن سے تین ماہ بعد لوٹے تھے اور ہم نے غلطی سے والد صاحب کو "ڈیڈ" کہہ دیا تو والد صاحب بہت ناراض ہوئے اور نصیحت فرمائی کہ کل جو شادی ہونے والی ہے اس میں ہم احتیاط کریں بلکہ خوش اخلاقی، ملنساری وغیرہ کا مظاہرہ کریں۔

ہم نے محفل میں پہنچتے ہی ذرا سا جھک کر فضا میں چند سلام پھینکے پھر دائیں اور بائیں مڑ کر اسی حرکت کو دہرایا۔ ایک بزرگ نے جو ہمارے صاف استری کیے ہوئے کوٹ کو دیکھا تو کہا "ادھر آؤ بیٹے" اور ہم سے لپٹ گئے۔ بس پھر کیا تھا ڈیڑھ دو سو انسانوں نے ہم سے گلے ملنے کے بہانے ہمارے کوٹ پر گویا ہل چلا دیا۔

اس ہنگامہ سے فارغ ہو کر ہم ایک کرسی پر جا بیٹھے۔ اتنے میں پھر خوش اخلاقی کے مظاہرہ کا خیال آیا۔ ہم نے بازو کی کرسی پر بیٹھے ناک میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شخص سے پوچھا "میں شرف الدین آرکیٹکٹ ہوں، آپ کا نام فرمائیے اور آپ کے کاروبار کیا ہیں؟" ان صاحب نے ہم کو چند سکنڈ خوں خوار نظروں سے دیکھا اور اٹھ کر دور جا بیٹھے۔ ہم کچھ سمجھ نہ سکے حیران تھے کہ سیدھی جانب پر بیٹھے ہوئے صاحب نے ہم سے کہا۔

"آپ کو ان کے کاروبار کے بارے میں سوال نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آپ شہری تہذیب سے واقف نہیں معلوم ہوتے۔ جائیے ان سے معافی مانگ لیجئے۔"

ہم نے کہا "بے شک میں معافی مانگ لوں گا اگر وہ تو ابھی تک غصے میں ہیں کیا آپ گیارنٹی دے سکتے ہیں کہ گلے ملتے ہوئے چاقو نہیں ماریں گے؟" انہوں نے کہا "وہ واقعی غصہ میں ہیں، آپ نے سوال ہی ایسا کیا تھا۔ خیر آج جس لڑکی کی شادی ہو رہی ہے آپ اس کے ہونے والے پیشے سے واقف ہیں؟"

ہم نے پہلے سوچا پیشہ کیا ہوگا معلوم ہوا لڑکا کے بڑے بھائی
تو کیا گھما کر بات کرنے والا انسان ہے، کہیں کسی اور مشکل میں نہ ڈال دے۔"

ان صاحب نے پھر کہا: "تو دلہن کے جیٹھ کی لڑکی کی کل سالگرہ ہے۔ پندرھویں۔ گو اس لڑکی کی عمر ۲۰ سے اوپر ہے لیکن وہ ہر سال پندرھویں سالگرہ ہی مناتے ہیں۔ چونکہ وہ بڑے اصولی آدمی ہیں ان کا خیال ہے کہ لڑکی کی شادی کی عمر پندرہ سال ہی مناسب ہوتی ہے۔ وہ بڑی عمر کی لڑکیوں کی شادی کے قائل نہیں ہیں اس لیے شاید وہ شادی تک اس لڑکی کی عمر کو بڑھنے نہیں دیں گے۔۔۔۔"

میں نے چڑھ کر کہا "ارے صاحب وہ ہزار سال تک یہی کرتے رہیں مجھے ان سے کیا لینا ہے۔ آپ صرف یہ بتائیے کہ وہ صاحب غصہ کیوں ہوئے۔

"آپ نے ان سے ان کے کاروبار کے بارے میں سوال کیا تھا نا؟۔۔۔۔ ان کا پھٹے جوتوں، ناکارہ بوتلوں اور ٹوٹی ہڈیوں کا کاروبار ہے۔ وہ سمجھے کہ آپ نے ان کی ہتک کرنے کے لیے ایسا سوال کیا تھا۔۔" خیر۔ مگر آپ جیٹھ کی لڑکی کی سالگرہ میں ان سے معافی مانگ سکتے ہیں وہ وہاں مدعو ہیں اور آپ آیئے۔ دعوت اچھی ہی رہتی ہے اب اگر وہ بیس کی بجائے پندرہ کہتے ہیں تو ہمیں اس سے کیا۔۔۔۔"

میں نے جگہ بدل دی، توبہ کیا۔ کیا باتونی آدمی ہے مگر لوگ کاروبار کی نوعیت پر کیوں شرمندہ ہوتے ہیں۔ کیوں دوسروں کے کاروبار کا مذاق اڑاتے ہیں۔ غالب نے بھی کاروبار کی نوعیت کا مذاق اڑایا ہے۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

اب بتائیے بھلا گل کو بلبل کے کاروبار پر ہنسنے کی کیا ضرورت ہے لیکن کریں کیا۔ آج کل تو ہر طرف غالب کا طوطی بول رہا ہے۔۔۔۔ توبہ یہ کیا بات ہوئی کہ طوطی بول رہا ہے یا تو طوطی بول رہی ہے۔ ہونا چاہیے یا پھر طوطا بول رہا ہے۔ جانے یہ غلط محاورے کیسے چل پڑتے ہیں۔ اف کیا۔ الجھن ہو رہی ہے۔ اندر قمیص پر لوسی کی لپ اسٹک کے نشان نہ ہوتے تو میں کوٹ اتار دیا ہوتا۔ خیر باقی تو پینا چاہیے۔۔۔ اب یہی دیکھئے غالب نے جو کہہ دیا تھا کہ جو گدھے ہیں وہی آم نہیں کھاتے وہ آج ہر شخص کو آم پسند ہوں نہ ہوں کھائے چلے جا رہا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جنھیں قطعاً آم پسند نہیں ہیں لیکن اس غالبی فقرہ سے بچے بیٹھے ہیں۔ ایک دفعہ ہم سنگترے خریدنے میوہ کی دکان پہ گئے۔ وہاں دکاندار کسی صاحب کو غالب کا یہی ام الاطیفہ سنا رہا تھا۔ اس نے آخر میں اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ ہم سنگترے کی بجائے آم خرید لائے۔

ہمارے پڑوسی طوطا رام طوطی پرشاد نے ایک دن گھر پر "ٹی اینڈ ٹی پی کمپنی" کا بورڈ لگا دیا۔ ہم نے پوچھا کہ کیا کاروبار ہوں گے اس کمپنی کے، چونکہ صرف ٹی اینڈ ٹی پی سے کچھ پتہ نہیں چلتا تو وہ بولے "میں نے سوچا ہے کہ کاروبار ہوں گا۔ کیا کاروبار کروں گا۔۔۔ یہ تو ابھی سوچا نہیں۔ آپ کے خیال میں کوئی کاروبار۔۔۔۔؟"

ہم نے اس ترقی پسند خیال پر آفرین کہا کہ۔ پیدا ہیں اب بھی ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ یہ تو ایسا ہی تھا جیسے ایک ترقی یافتہ ملک کے صدر صبح آٹھ بجے وزیر جنگ اور وزیر خارجہ کو طلب کرتے ہیں اور کہتے ہیں "میں آج بمباری کراؤں گا مگر کب اور کہاں، یہ فیصلہ کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔"

پھر بھی لوگوں نے طوطا رام طوطی پرشاد سے کہا کہ کاروبار کی پیچیدگیاں لکھنؤ کے بھول بھلیاں جیسی ہوتی ہیں جہاں میں بغیر گائیڈ کے داخل ہونا خطرناک ہو سکتا ہے۔ چنانچہ طوطا رام طوطی پرشاد کو محلہ کے سب سے سیانے

انسان عباسی صاحب سے رجوع کرنے لگا۔

طوطا رام نے عباسی صاحب سے کہا "حضور مجھے کوئی ایسا کاروبار بتائیں جس میں فائدہ ہو۔"

عباسی صاحب جلال میں آگئے بولے "ارے بے وقوف اگر کسی کاروبار میں فائدہ نہ ہوتا تو اس کاروبار کا نام تاریخ میں رہ جاتا۔ ہر کاروبار میں فائدہ ہے جبھی تو لوگ کرتے ہیں۔"

طوطا رام نے یہ فلسفہ سمجھا نہیں اور کہا "جی لوگ کیا کرتے ہیں ... کون سا کاروبار"

عباسی صاحب کا جلال پسپائی میں بدل گیا "توبہ! کیا بے وقوف طوطا ہے۔

اتنے میں ایک گورا اونچا پورا نوجوان کمرہ میں داخل ہوا، اس نے عباسی صاحب کا ہاتھ چوم کر کہا۔ "حضور کیا کروں میں پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ میرا گاؤں سرحد پر واقع ہے۔ جنگلوں کی وجہ سے زمین پر کاشت نہیں کر سکتا۔"

عباسی صاحب نے کچھ دیر اسے گھور کر دیکھا پھر مسکرا کر آنکھ ماری۔ نوجوان نے تڑپ کر کہا۔ "جی نہیں فوج کا پہرا سخت پہرہ رہتا ہے۔ اسمگلنگ بالکل نہیں ہو سکتی۔"

عباسی صاحب مسکرائے اور کہا "ہو گی اور تو ہی کرے گا۔ پھر کبھی ملنا۔"

طوطا رام طوطی پرشاد کو اطلاع ملی کہ اس پنجابی نوجوان نے ہند و پاک سرحد پر بڑی کامیاب اسمگلنگ کی۔ وہ ہر روز سرحد پار کر کے ہندوستانی علاقے میں داخل ہوتا اور سورج کے ڈھلتے ڈھلتے وہ جانے کہاں سے ایک تھیلا ریت بھر لاتا اور سیکل کے پیچھے باندھ کر سرحد پار کرتا۔ کسٹم کے عہدہ داروں نے اس سے تھیلے چھینے، کیمیائی تجزیہ کروایا مگر لاحاصل۔ کسٹم والے حیران تھے کہ آخر ہو کیا رہا ہے۔ چونکہ کسٹم آفس میں ریت کے تھیلوں کا ڈھیر بڑھتا جا رہا تھا۔ ادھر وہ نوجوان تھیلے کو اسمگل کرنے کی کوشش چھوڑ نہیں رہا تھا۔ آخر ایک منچلے آفیسر نے اُسے پکڑ لیا "میاں! اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا۔ اب اگر نہیں بتایا کہ قصہ کیا ہے تو ہم ان تھیلوں کے ساتھ تم کو دہلی بھجوا دیں گے اور پھر تم ہو گے اور . . . . . .

اس نوجوان نے اس وعدہ پر کہ اسے گزند نہیں پہنچایا جائے گا بیان کیا کہ وہ ریت کا تھیلا ہر روز نئی سیکل خرید کر اس پر رکھ لاتا تھا۔ کسٹم والے تھیلا روک لیتے تھے اور وہ سیکل اسمگل کر لیا تھا۔

ٹی اینڈ ٹی پی کمپنی نے پیاز کا کاروبار شروع کیا۔ چند ہی مہینوں میں خوب دولت کمائی۔ دیوالی آئی تو کمپنی کی طرف سے سارے مندروں کو رنگ روغن کروایا گیا۔ رمضان آیا تو ساری مساجد کو سفیدی کروائی گئی۔ دو سال گزرنے سے پہلے پتاجی سے "ڈیڈی" اور طوطا رام راجہ صاحب بن گئے۔ گھر محل میں تبدیل ہو گیا۔ اتنا سب کچھ ہوا لیکن انکم ٹیکس والے لاکھ سر ماری کرتے لیکن کاروبار میں کوئی کی آمدنی نہ نکال سکتے۔ وہ پیاز جس قیمت پر خریدتا اسی قیمت پر فروخت کر دیتا تھا۔ پھر یہ سب روپیہ آتا کہاں سے تھا؟

ایک دن طوطا رام طوطی پرشاد نے اپنے بیٹے کو دو پیار کیے اور ڈانٹے کر ایک۔ جب لڑکی نے شکوہ کیا تو طوطا رام نے اس کو نئی کوٹھی میں منتقل کر دیا۔ لڑکی نے ایک نوکر سے جو دراصل سی آئی ڈی کا آدمی تھا کہا۔ "بوڑھے میاں کا روپیہ نے دماغ خراب کر دیا ہے۔

نوکر نے کہا "بڑا دماغ پایا ہے سیٹھ جی نے۔ کیا کاروبار جمایا ہے"
لڑکی نے کہا: "خاک کاروبار جمایا ہے۔ پہاڑ کی چھوٹی تلی بڑی تلی میں ڈال کر بیچ کر روپیہ جمایا ہے۔"

اتنا سب کچھ تھا لیکن کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔ عباسی صاحب کے لڑکے جونیر عباسی کو کالج کے نام سے چڑ تھی۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتے تھے۔ آخر جانوروں کی ڈاکٹری کے ایک سرٹیفکیٹ کورس کے بعد خود کو ڈاکٹر کہنے لگے تھے۔ پڑوس میں کسی کمپنی کے منیجر رہتے تھے۔ ان کے لڑکوں نے ایک بڑے بڑے بالوں والا کتا پالا۔ جونیر عباسی نے ان لڑکوں سے کہا کہ ان کے پاس ایک انجکشن ہے جس کے دینے سے کتے کے بال دگنے لمبے ہو جائیں گے۔
لڑکوں نے وہ انجکشن کتے کو لگوا لیا۔

دوسرے تیسرے دن کتے کے بال جھڑنے لگے اور ایک ہفتہ میں وہ بالوں سے محروم ہو گیا اور اس کی جلد پھٹ کر خون رسنے لگا اور آخر کتا مر گیا۔ منیجر صاحب کو بڑا غصہ آیا جب انہیں اس کے مرنے کی وجہ بتائی گئی وہ غصہ میں بھرے ہوئے عباسی (سینیر) کے پاس پہنچے تاکہ اعلیٰ لیول پر شکایت کر سکیں۔

انہوں نے کہا "آپ کے لڑکے نے ہمارے کتے کو جانے کیا انجکشن دیا کہ اچھا خاصا اس قدر قیمتی کتا مر گیا وہ ڈاکٹر ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ میں ان کا سرٹیفکیٹ ضبط کروا دوں گا۔"

عباسی صاحب نے کہا "خوب! تو معلوم ہوا کہ آپ نے جیتا جاگتا کتا اس اناڑی کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اس کا علاج کرے۔ ارے صاحب میں تو اس اناڑی سے اپنے گھوڑوں کی کیل نہ ٹھکواؤں۔"

منیجر صاحب اپنا سا منہ لے کر لوٹ گئے۔ عباسی جونیر کا تبادلہ کر دیا گیا۔ چند دن بعد انہوں نے والد بزرگوار سے کہا "ابا جان! یہ سرکاری نوکری بھی خوب چیز ہے کام نہ دھام، گاؤں میں پڑے ہوئے تھے۔ جو کچھ پڑھا تھا وہ کبھی کام آتا ہی نہیں۔"

سینیر عباسی نے کہا "ہاں برخوردار اسی طرح پانچ دس سال میں انسان جب کسی کام کا نہیں رہ جاتا تو اسے تجربہ کار کہہ کر ترقی دی جاتی ہے۔"

مختار یونس ایم اے
(مالیگاؤں)

ماڈرن ڈراکیولا

کھٹمل کا خط مچھر کے نام

علامہ کھٹمل بیگ
قومیت ریڈ انڈین
پلنگ نمبر ۴۸
جنرل وارڈ میونسپل ہاسپٹل

میرے خلا باز میرے ہوا باز خون شریک مچھر بھائی
سلام سرخ!

جہاں رہو جنگی طیارہ بن کر رہو۔ اڑتے رہو گنگناتے رہو۔ مگر کبھی کبھی اپنی خیریت کا ٹیلی گرام بھیج دیا کرو۔ کان تمہارے سریلے "ٹرنک کال" کو ترس گئے ہیں۔ خود نہیں آسکتے تو مجھے ہی بذریعہ وی پی اپنے پاس بلوالو۔ بڑی عنایت ہوگی میں یہاں بوند بوند کو ترس گیا ہوں اور تم وہاں فضا میں گلچھرے اڑاتے ہو۔ سچ ہے ایئرفورس والے بڑے تندرست ہوتے ہیں۔

یاد ہے تم نے ایک دن مجھے سرخ روشنائی کی دوات میں گرا کر قلم ڈبانا چاہا تھا۔ آج اسی ایک ہاتھ میں انگلیاں ڈبو کر تمہیں لکھ رہا ہوں۔ لکھنے کا مزہ آتا ہے۔ مجھ سے سفارتی تعلقات مت توڑو۔ کبھی کبھی غریب خانے کا وزٹ کر لیا کرو۔ ورنہ میں یہی سمجھوں گا تمہارا خون سفید ہو گیا ہے (بالفرض دیگر تمہارے خون میں صرف سفید ذرات ہیں) شکایت کے بعد حکایت سنو۔ تین دن ہوئے ایک مریض کے پلنگ کی خندق و دراڑوں میں پناہ گزیں ہے۔ جب سے آپ کو

سیاسی قیدی سمجھو یا شرنارتھی وارڈ پلنگ میں عمر قید گزار رہا ہوں۔ رات کو چوری چھپے نکلتا ہوں۔ تکیہ کی ترائی سے ہوتے ہوئے کمبل کی گھاٹی میں پیدل جاتا ہوں اور پھر انسانی جسم کے چرنی دسترخوان پر ٹوٹ جاتا ہوں۔ مریضوں کا خون پی پی کر BMR (بیمار) ہو گیا ہوں۔ پرسوں کا تماشا تھا ٹیڈ میں بھی رہا تھا وہ تو اچھا ہوا کہ ایک ڈاکٹر کی گردن سے صحت مند سرخ لیبل والا ٹانک مل گیا اور تب شیر بچہ اترا۔ پچھلے ہفتہ کی بات ہے۔ ایک دل کا مریض مجھے مفت خون دے بیٹھا۔ میرا بلڈ پریشر بڑھ کر ہی تو گیا۔ ہارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ تو اچھا ہوا نرس آگئی اس کا ٹوٹا خون ملا تو دل کی بے قراری کو قرار آیا۔

مچھر بھائی! میں بڑا بدنصیب ہوں۔ کل ایک مریض نے میرے خلاف ڈاکٹر کو رپورٹ کر دی کہ میں نے نہ صرف اس کی نیند چرائی ہے بلکہ خون بھی بلا اجازت پی لیا ہے۔ بس پھر کیا تھا پلنگ کی آہنی سرزمین پر (پچکاری سے) ہری بارش برسائی گئی۔ میں جام زہر پیتے پیتے رہ گیا۔ سقراط بننے میں ایک انچ کی کسر رہ گئی تھی۔ کیونکہ پلنگ کی ایک ویلڈ دراڑوں میں پناہ مل گئی تھی۔ گویا اسرائیل کو فلسطین مل گیا۔ مچھر بھائی! یاروں کی چراگاہ میں میری شہرت مچھر جیسی ہو گئی۔ میں نے اسے پسند کیا تھا مگر اس نے "پاسپورٹ"

طلب کیا۔ میرے ہوش و حواس "ایکسپورٹ" ہوگئے اور گھبراہٹ کے مارے پسینہ "امپورٹ" ہونے لگا۔ میں مس جوں کے پیروں پر گر پڑا مگر "جوں" کے کان پر جوں نہ رینگی وہ جوں کی توں فیصلہ پر اٹل رہی۔ تب میں نے یہ ڈائیلاگ ادا کیا۔ "پاسپورٹ اور ویزا کی رسم انسانوں کی بدعت ہے۔ تم مجھے زلفوں کا سایہ دو، میں تمہیں خون کا مایہ دوں گا۔" جوں نرم پڑ گئی بولی ٹھیک ہے مگر یہ بتاؤ تمہاری پیٹھ پر توند کیوں ہے؟ میں بولا "یہ توند نہیں بلڈ بینک ہے۔ اس میں انسانوں کا لہو ہے۔ ہر گروپ کا خون ہے۔ امیر اور غریب کا خون ہے۔ ڈاکٹر اور مریض کا خون ہے۔ مذکر اور مونث کا خون ہے۔ بالغوں کا لہو بھی ہے بالکوں کا بھی۔ میرے خون میں قومی یک جہتی کی دھارا بہتی ہے۔" مختصر مس جوں سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ انسانی دماغ چاٹنے والی نے میرا دماغ چاٹ ڈالا۔

میرے دوست! پلنگ کے گھر والے میرے پیچھے پڑ گئے۔ میری ناکہ بندی کے لیے مریض کے بستر کے گرد پاؤڈر کی منڈیر کھڑی کر دی ہے۔ میرے لیے یہ فصیل دیوارِ چین ہے اسے سدِ سکندری بھی کہہ سکتے ہیں۔ اسے پار کرنے کے لیے یاجوج ماجوج کی طرح تڑپ رہا ہوں۔ کاش تمہارا ہیلی کاپٹر پلنگ کے ہوائی اڈے پر اترے اور مجھے انسانی بدن پر ناز ل کرے۔

کل کسی مریض کے لیے ڈاکٹر خون کی بوتل لائے تھے۔ ایک انسان کو بچانے کے لیے جتنا خون لایا گیا تھا۔ ہماری سرخ قوم کے ہزاروں افراد کا کئی ہفتے کا راشن بن سکتا تھا آج انسانی حکومت انسان کی آبادی کم کرنا چاہتی ہے۔ پھر یہ خون کی بربادی کیوں؟ مرنے والوں کو خون دے کر زندگی دینا فیملی پلاننگ کے خلاف ہے۔ میری نظر میں حکومت کو انسانی آبادی کم کرنے کے لیے یہ انقلابی اقدامات کرنے چاہئیں۔

(۱) ہسپتالوں پر قفل لگا دے (۲) غیر سند یافتہ ڈاکٹروں اور نرسوں کو پریکٹس کا پروانہ دے (۳) کھٹملوں کو بلڈ بینک تسلیم کیا جائے اور انہیں خون سے توانا جائے۔

(۴) مچھر برادری کو مل ایریا میں ملیریا پھیلانے کا بنیادی حق دیا جائے تاکہ ٹھنڈی بخار میں کچھ انسان دنیا سے کوچ کر جائیں۔

دیکھا! میمورنڈم میں خاکسار نے تمہاری دوستی کا حق ادا کر دیا۔ تم اپنی دوستی کا حق کیا ادا کروگے۔ خون کی چند بوندوں کے لیے تمہیں عرصہ سے یاد کر رہا ہوں۔ بجلی کا ٹیلی فون رسیور چکے ہوگے۔ لہٰذا فوراً لہو لے کر آؤ۔ خدا تمہیں جنت میں پرواز کا لائسنس عطا کرے۔ ہاں آتے وقت ہوشیار رہنا۔ یہاں مچھر دانی کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ ڈی۔ ڈی۔ ٹی اور فلٹ یہاں کی آب و ہوا میں شامل ہے۔ سنبھل کے پیرا شوٹ کے ذریعہ اترنا کیونکہ انسان تالی بجانے کے بہانے مچھر مارتا ہے اور ہاں اپنا ماؤتھ آرگن چھوڑ کر آنا۔ ورنہ وہ تمہارے لیے "موت آرگن" ثابت ہوگا اور تم کسی انسانی ہتھیلی پر شہید ہو جاؤ گے اور میں بھی بے موت مارا جاؤں گا۔

فقط

تمہارے لہو کا پیاسا

کھٹمل

مچھر نامہ

مچھر جنگ بہادر
۹/۵ گٹر کالونی ساکن پانی
ملیریا نگر

عزیزم کھٹمل سرخ رو

سلام سیہ فام!

تمہارا سرخ نامہ ملا۔ بھائی تم بیڈ انڈیپنڈنٹ ہو تو میں بھی نیگرو ہوں۔ تم خون کے بھوکے ہو تو میں پیاسا ہوں۔ تم سرخ روشنائی کی مہر بند مکتوبات ہو تو میں کالا بین ہوں۔ جس میں لہو کی روشنائی کا قحط ہے۔ آؤٹ آف اسٹاک سمجھ لو ورنہ میں اور انکار کرتا

یہ صحیح ہے میں کبھی کبھی انسانی جسم پر پولیس کی طرح چھاپہ مار سکتا ہوں اور انسان کا "دو نمبر کا لہو" ضبط کر سکتا ہوں مگر ضبط سے کام لے رہا ہوں جان کا خطرہ ہے اور میری زندگی کا بیمہ اب تک نہیں ہوا ہے۔ ہاں میرا قیمہ بنانے کی انسانی تیاریاں شباب پر ہیں۔ اور بندہ آج کل شہادت کے موڈ میں نہیں ہے۔

ادھر تم چارپائی میں عمر قید بھگت رہے ہو اور ادھر میری گرفتاری کا وارنٹ نکلا ہے مگر پھر بھی آزادانہ فضا میں گنگناتا اڑ رہا ہوں کیونکہ آزادی میرا پیدائشی حق ہے۔ گندے پانی کی بستی میں جنم لیا ہے مگر میرے خیالات بڑے اونچے ہیں ہمیشہ بلندی پر اڑتا رہتا ہوں۔ پچھلے جنم میں خاکسار شاہین تھا اور آج میرے گیت کے بول کچھ تبدیل ہو گئے ہیں۔

پلٹنا جھپٹنا جھپٹ کر پلٹنا
لہو گرم چینے کا ہے اک بہانہ
پتنگوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ مچھر بناتا نہیں شامیانہ

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا انسان کی سازشوں کا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے ایک "فربہ اجسام" سندھی خاتون کے دولت کدے پر جانا ہوا۔ سرخ و سفید جلد کے پیچھے خون کا بحر ذخار نظر آ رہا تھا۔ میرے منہ میں پانی آ گیا۔ رات ہوئی۔ کوہکن کی طرح تیشہ لیے "جوئے خون" نکالنے چلا۔ مگر کمرے میں قدم رکھتے ہی سر پر رکھ کر بھاگنا پڑا۔ میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا کمرے میں "مچھر بھگاؤ اگربتی" سلگ رہی تھی۔ صبح تک اگربتی سلگتی رہی اور میں بھی من ہی من میں سلگتا رہا اب گیس ماسک لگا کر آنا پڑے گا۔

پچھلے ہفتہ مزدور بستی میں خاکسار "خون کی مانگ" نظم گاتے جا رہا تھا۔ وائلن ہاتھ میں تھا۔ میرے ساتھ میرے ہم نوا مچھروں کا بھاری آرکسٹرا بھی تھا۔ مزدوروں کی گندی بستی میں مزدوروں سے زیادہ ہماری آبادی ہے۔ وزیر محنت و مشقت کی نظر میں ایک مزدور تقریباً سو مچھروں کا راشن ہے مگر راشن کی لمبی قطار کا دور دور تک پتہ نہ تھا نہ راشن کا مدعا جھگڑا نہ راشن کا خون پینے میں اولیت حاصل کرنے کے لیے مچھروں میں خانہ جنگی! نہ اس علاقہ میں چھپکلیوں کا قید خانہ تھا نہ "اوڈوماس" کا زہریلا "مرہم بے درد"۔ غرض مزدوروں پر ڈاکہ ڈالنے کی پوری آزادی تھی۔ میرے کمیونسٹ ضمیر نے مجھے روکا۔ "محنت کشوں کا لہو نہ چوسو" مگر میرے خمیر نے کہا۔ "مزدور کا لہو چوسنے کا ہر کسی کو حق ہے۔ خواہ سرمایہ دار ہو کہ مچھر"۔ ہم نے شب خون مارنے سے پہلے مزدوروں کی ہر دو کان پر سریلی دستک دی اور مزدوروں پر ٹوٹ پڑے مزدور ہڑبڑا کر اٹھے اور دونوں ہاتھوں سے دفاع کرنے لگے۔ ایک مزدور بولا کاش دیوی دیوتاؤں کی طرح ہمارے بھی کئی کئی ہاتھ ہوتے۔ اور اس نے خود کو چادر میں لپیٹ لیا۔ ہم نے ہمت نہ ہاری چادر پر تشریف فرما ہو کر اپنا نشتر مزدور کو چبھو دیا۔ شریان اور ورید کی تمام پائپ لائن کھنگال ڈالی مگر بقول غالب ع

جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

کہتے ہیں قطرہ قطرہ دریا می شود مگر ہمارے لیے مزدوروں کا "قطرۂ خون خطرہ می شود" کیونکہ مچھر لاکھوں ہیں اور خون کے قطرے چند ہیں۔ آخر جب خون کی تقسیم ہوئی تو ہر مچھر کو اتنا خون ملا جتنا کسی انعامی معمہ میں ... خوش نصیبوں کو صبح جیل بھیجنے پر ملتا ہے۔ مچھروں کی زبردست آبادی اور غذا کی شدید قلت کو دیکھتے ہوئے ہماری قوم میں بھی سرخ تکون نافذ ہو جانا چاہیے۔ "چھوٹا خاندان سکھی خاندان اسی طرح کم مچھر زیادہ انسانی خون"۔

اچانک جیو تھیلی کے کسی ستم ظریف نے ڈی ڈی ٹی کا دھواں دھار عذاب برسایا اور قوم مچھر کی قلعی بلا جنگ ہو گئی میں نے

ہائی جمپ اور لانگ جمپ کے ذریعہ خود کو بچا پایا۔ میرے بچپنے ہی سے مجھے اولمپک کھلاڑی تسلیم کرلیا گیا۔ اور جب میں نے میونسپل سرونٹ کی رگ سے ایک قطرہ پار کرلیا تو خاکسار کو "نمر وہ ایوارڈ" دیا گیا۔ میاں کھٹمل تم بھی کسی لیڈی ڈاکٹر کی گردن کا ہو لیکر ڈراکیولا پرائز حاصل کرسکتے ہو۔ یوں بھی کھٹمل فرقہ ڈراکیولا نسل سے ہے جتنا مسلا اور کچلا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ جنم لیتا ہے۔ کھٹمل کو دنیا میں ہی ایک کا ستر اجر مل جاتا ہے۔ (ایک کھٹمل کی شہادت تقریباً ستر کھٹمل پیدا کرتی ہے) بُرا مت ماننا میرے یار تم بھی چھپے رستم ہو۔ دن میں کسی دیوار کے کسی گوشے نما غار میں عبادت کرتے ہو اور اور دعائے شفا کرتے ہو مگر انسان کی خوشبو پاتے ہی مصلیٰ تہہ کرکے رکھ دیتے ہو۔ خون کی زکواۃ لینے کے لیے چل پڑتے ہو۔ آج کل خون کی قلت ہے روزی بند ہے اور روزہ جاری ہے۔ لہٰذا تم وہاں اور میں یہاں خون کے لیے مشترکہ دعا مانگیں۔

"اے اللہ انسانی خون سستا فرما۔ ٹک ٹوئنٹی اور فنائل کو تباہ و برباد کر۔ مجھے مچھر دانی کراس کرنے کے لائق بنا اور کھٹمل بھائی کو زہریلے پاؤڈر پار ہونے کی ترکیب و توفیق دے۔ اگر یہ سب ناممکن ہے تو اے پروردگار سارے دیش میں دنگا فساد برپا کر تاکہ خون کی ندیاں بہنے لگیں اور ہم کئی سال تک کے لیے خون کا ذخیرہ محفوظ کرلیں۔ آمین۔

امید ہے مذکورہ بالا دعا تم جلد از بر کرلوگے اور یہاں یہ دعائے مذاق گڑگڑا کر مانگنا۔

فقط

تمہارا

دُعا شریک + خون شریک بھائی

مچھر

لئیق صلاح

چھپّر پھاڑ کر دینا

رکشہ والوں کو یہ احساس تھا کہ ملک کے ہر طبقے کے افراد باہر جا سکتے ہیں سوائے ہمارے۔ ہم پیشہ لوگوں کے ہمارا
بیشہ صرف بیل گاڑی والے ملک تک ہی محدود ہے۔ لیکن اب جب یہ خبر اخبار میں شائع ہوئی کہ جرمن لڑکی مس ایڈتھ ایلر
نے جے پور میں گوپال نامی رکشا راں سے شادی کر لی اور وہ اسے مغربی جرمنی لے جا رہی ہے تو سب کی باچھیں کھل گئیں۔
اب تو ہتھیلی میں جنت نظر آنے کے مقولے پر صدقِ دل سے یقین ہو گیا۔ دیکھو اسے کہتے ہیں چھپر پھاڑ کر دینا یا بلی کی قسمت
سے چھینکا ٹوٹنا۔ ابھی یار لوگوں نے ہزاروں روپیے خرچ کر کے [illegible] جا کر کیا تیار [illegible] یہاں صاحب
بائیاں تھے۔ لیکن وہاں جا کر ان میں سے کچھ بیرے بنتے ہیں تو کوئی اخبار بیچنے والے وغیرہ اور green card حاصل
کرنے کے لیے کرایہ کی بیوی سے رشتۂ ازدواج قائم کرنا پڑتا ہے جو بقول غالب گلے کا پھندا اس طرح بن جاتی ہے کہ اس
سے چھٹکارا پانا مشکل ہے نہ تو پھندا ہی ٹوٹتا ہے اور نہ ہی دم ہی نکلتا ہے۔ یہاں ماں اور بہنیں نہ جانے کتنی تمناؤں
کی دنیا بسائے ہوتے ہیں کہ لال آئے گا تو ایسی خوب صورت اور مال دار لڑکی سے بیاہ رچائیں گے۔ لیکن وہ لال
پری، سبز پری کی طرح ان کے لعل کو ایسی گھیری ہوئی ہے کہ پرستان سے نکال لانا مشکل۔ اگلے زمانہ میں دیو اور پریاں
آدم زادوں کو قید کیا کرتے تھے تو اب قانون اور سفارت خانے ہیں جن کے پنجے نکلنا آسان تصور ہے لیکن ہم کو دیکھو وہ
ادھر ہی خوشامد کر کے لے جا رہی ہے۔

رکشا والے یہاں کے مالک جب گاڑی کو رنگ کرواتے ہیں تو اس پر نام اور پتے کے ساتھ کسی ہیرو ہیروئن
کی فوٹو یا باذوق ہوں تو کچھ شعر بھی لکھوا لیتے ہیں اور یہ اشعار کچھ اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ محقق اور نقاد کو بحث کے لیے
زیادہ مواقع فراہم کر سکتے ہیں جیسے وہ ایک شعر نیچے درج کیے جاتے ہیں۔ جس کے متعلق آپ قطعی طور پر فیصلہ کرنے سے [illegible] پیش
کریں گے کہ یہ کلاسیکی کہیں یا ترقی پسند، یا جدیدیت کا نمونہ۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ کس شاعر کا شعر ہے۔ اس لیے
کہ آپ نے مجموعۂ کلام میں یا کسی ادبی رسالے میں جو اشعار پڑھے تھے وہ بالکل الگ نوعیت کے تھے۔ ان آوارگی کی

ناپائیداری کے تعلق سے کچھ اس طرح کے اشعار ہ

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

ہم کو مٹا سکے یہ زمانے میں دم نہیں
زمانہ ہم سے ہے، زمانے سے ہم نہیں
"ہم کسی سے کم نہیں"

اب ان تمام اشعار کی بجائے (کچھ پھڑکتے ہوئے اشعار کی ضرورت تھی اس لیے اس نے تمام اشعار مٹا کر صرف "ہم کسی سے کم نہیں" والی عبارت باقی رکھی ہو گی۔

سچ ہے قسمت تو ان کی سنور گئی۔ لیکن بیٹھنے والوں کو ایک اور مشکل آن پڑی۔ اب کوئی رکشہ والا، اپنے ملک کی سواریوں کو بٹھاتا ہی نہیں۔ وہ بس اس تلاش میں رہتا ہے کہ foreigner کی سواری ملے اور وہ بھی لڑکی ۔۔۔!

شگوفے

شمع زیدی (بمبئی)

۱۹۳۸ء میں جامعہ اسلامیہ دہلی میں ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے برطانوی حکومت پر علامہ اقبال نے ان الفاظ میں چوٹ کی

"جنگ عظیم کے ایام میں ابلیس کے چند مرید اس کے پاس گئے، تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھا سگار پی رہا ہے۔ مریدوں نے اس سے بیکاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے جواب دیا

"آج کل مجھے بالکل فرصت ہے کیونکہ میں نے اپنا سارا کام برطانوی وزارت کو سونپ رکھا ہے۔"

(بشکریہ سب رنگ کراچی)

امرتسر میں ایک کل ہند مشاعرہ تھا۔ کئی شاعروں کو ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ ساحر لدھیانوی اور فراق گورکھپوری کے کمرے بھی اسی ہوٹل میں تھے۔ وہاں جب یہ حضرات پہنچے تو ہوٹل کے منیجر نے ایک رجسٹر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ذرا اس کی خانہ پری کر دیجیے۔"

ساحر نے اپنا نام اور پتہ لکھنے کے بعد پیشے کے خانہ پر نظر ڈالی تو الجھ گئے اور فراق صاحب سے پوچھا "کیوں صاحب میں اپنا پیشہ کیا لکھوں؟"

"معشوق لکھ دو" فراق صاحب نے گمبھیرتا سے کہا۔

"ارے صاحب، اب اس عمر میں؟" ساحر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آگے پنشن یافتہ لکھ دینا" فراق صاحب نے سادگی سے صلاح دی۔

فرحت زیدی
(کٹک)

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے

کہا جاتا ہے کہ ایک بار شہنشاہ اکبر نے راجا بیربل سے پوچھا کہ سچ اور جھوٹ میں کتنا فاصلہ ہے۔ تو بیربل نے جواب دیا "حضور چار اُنگل کا۔"

"وہ کیسے!" اکبر نے پوچھا۔

تب بیربل نے اپنی چار انگلیاں اپنی کنپٹی پر رکھ کر دکھا دیں۔ یعنی جو کچھ سنا جائے وہ جھوٹ (یا جھوٹ بھی ہو سکتا ہے) لیکن جو کچھ دکھائی دے وہ یقیناً سچ ہوگا اور سچ کے سوا کچھ نہ ہوگا لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ کبھی کبھی آنکھیں بھی غلط دیکھ جاتی ہیں۔ ہم ان آنکھوں کی بات نہیں کرتے جن کی بینائی کمزور ہوتی ہے اور اس سبب سے طرح طرح کی بوالعجبیاں وجود میں آتی ہیں خواہ وہ آنکھیں چشمہ کے شیش محل میں قید ہوں خواہ آزاد۔ ہم ان آنکھوں کی بات بھی نہیں کرتے جو کسی حادثے کے سبب یا کسی اور وجہ سے دن میں تارے دیکھنے لگتی ہیں اور ہم ان آنکھوں کی بات بھی نہیں کرتے جنھیں ایک کے دو اور دو کے چار نظر آتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مزیدار وہ واقعہ ہے کہ ایک شب سنسان سڑک پر پولیس کے ایک گشتی سپاہی کو ایک صاحب ملے جو ہاتھ میں کنجی لیے بیچ سڑک پر کھڑے تھے۔ سپاہی نے پوچھا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"جی میں اپنے مکان میں جانا چاہتا ہوں۔"

"تو جاتے کیوں نہیں؟"

"جب آجائے گا تو چلا جاؤں گا۔"

"کیا آجائے؟"

"مکان — !"

"کیا مطلب؟"

"جی بات یہ ہے کہ اس سامنے والے ٹاک میں میرا مکان ہے اور یہ پورا ٹاک گھوم رہا ہے اور کبھی میرے قریب آجاتا ہے کبھی دور چلا جاتا ہے۔ لہذا میں کبھی ہاتھ میں لے کر منتظر کھڑا ہوں، جیسے ہی ٹاک قریب آئے گا۔ اور میرا مکان سامنے آجائے گا میں مکان میں داخل ہو جاؤں گا۔"

تو صاحبان صاحب کی آنکھیں بہت کچھ دیکھ رہی تھیں۔ کیوں کہ ان صاحب کی آنکھوں کی بینائی نہ صرف شیشے میں بلکہ شیشے میں قید لال پری کے جڑوں میں بھی قید تھی۔

میں تو بات اپنی سیدھی سادی آنکھوں کی کرنا چاہتا ہوں۔ جو وہی دیکھتی ہیں جو ہوتا ہے۔ لیکن اب اس کو کیا کیا جائے کہ اگر آنکھوں نے بھی صرف "لا تقربو الصلوٰۃ" تک دیکھا تو بڑی مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے ایک واقف کار اردو کے پروفیسر صاحب ہیں کافی متقی و متشرع۔ سفید ٹوپی، سیاہ داڑھی، سفید کرتا، علی گڑھ کٹ کا پاجامہ۔ زیادہ تر پیدل چلتے ہیں کہ پیدل چلنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے۔ ایک دن جمعہ کی نماز کے بعد جناب واپس جا رہے تھے۔ میں نے دور سے دیکھا بائیں ہاتھ میں چھاتا اور دائیں ہاتھ میں تسبیح۔ سوچا جب میری سائیکل مولانا کے مثل سے گذرے گی تو سلام کر لوں گا۔ جب میں مولانا کے برابر پہونچا تو مولانا کی گردن مڑی ہوئی تھی اور چہرہ میری طرف نہیں بلکہ مخالف سمت تھا۔ اس سے پیشتر کہ مولانا کو السلام علیکم کہوں، مولانا نے صدا لگائی

"کتنا ؟"

اور اب جو میری نگاہ مولانا کے مخاطب کی طرف اٹھی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک عورت مولانا کو بڑے خلوص سے ہاتھ کے اشارے سے قریب بلا رہی تھی۔ معاذ اللہ! کہاں مولانا اور کہاں یہ اشارے بازی! ۔ اور میں نے یہ واقعہ جب اپنے احباب کو سنایا تو سبھی بہت محظوظ ہوئے لیکن مولانا کے تقویٰ پر پھر بھی کسی کو ذرہ برابر شک نہ گذرا۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے تو اس لطیفے کو وہیں تک سنایا تھا جہاں۔ "نماز کے قریب مت جاؤ" کا جملہ ختم ہوتا ہے۔ "جب تم نشے کی حالت میں ہو۔" والی بات ہمارے احباب نے خود ہی سمجھ لی کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ جس جگہ کا ذکر ہے وہاں درجنوں کیلے فروخت کرنے والیاں بیٹھی رہتی ہیں اور مولانا نے صرف کیلے خریدنے کا ارادہ کیا ہوگا۔

دیکھا آپ نے۔ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اگر اسے بھی ایک محدود انداز میں دیکھا جائے تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے نہ جانے کتنے متشرع و متقی حضرات کا تقویٰ خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ چلئے اگر ہمارا زاویۂ نظر محدود نہ بھی ہو تو بھی بعض اوقات واقعے ہی ایسے الجھے ہوتے ہیں کہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے اور سمجھ میں آتا ہے وہ ہوتا نہیں۔

ہمارے ایک دوست کا واقعہ ہے۔ بچپن میں انہوں نے زانوئے ادب ایک مولوی صاحب کے آگے تہہ کیا تھا معذا کہ صبح شام اُردو عربی پڑھنے مولوی صاحب کے گھر جایا کرتے۔ ایک دن مولوی صاحب نے ہمارے دوست سے کہا کہ جاؤ اندر سے ایک گلاس پانی لے آؤ۔ یہ حضرت اندر گئے تو دیکھا کہ ایک خاتون جو شکل سے ہمارے دوست کی بڑی بہن کی عمر کی ہوں گی، باورچی خانہ میں ہانڈی بھون رہی ہیں۔ مولوی صاحب کی عمر اندازاً ہمارے دوست کے والد کی عمر سے بھی زیادہ تھی تقریباً سفید داڑھی تھی۔ انہوں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"آپا! آپ کے ابا ایک گلاس پانی منگا رہے ہیں۔"

لہ اڑیسہ کی عام بول چال کی اردو۔

پانے گھورکر دیکھا اور کچھ بولیں نہیں، بلکہ ہانڈی چلاتی رہیں۔ یہ کچھ دیر کھڑے رہے پھر باہر چلے آئے۔ کچھ دیر بعد مولوی صاحب نے پوچھا "پانی لائے؟"

یہ پھر اندر گئے اور بولے "آپ کے ابّا پانی منگا تے ہیں۔"

اس بار محترمہ نے جھڑک کر کہا "چلو بھاگو باہر!"

میرے دوست بڑے دل برداشتہ ہو کر باہر آ گئے۔ اُس عمر میں ایسی جھڑکیاں تو اکثر سنتے رہتے تھے لیکن بے سبب ڈانٹ کا ذرا افسوس تھا۔ بہرحال اُنہوں نے باہر آکر مولوی صاحب سے کہدیا۔ "کہتی ہیں بھاگو باہر۔"

مولوی صاحب کچھ بولے نہیں۔ تھوڑی دیر بعد اندر گئے پانی پی کر واپس آ گئے لیکن چہرہ کچھ سرخ سا تھا آنکھیں نیچی تھیں یاشد رشندہ ہوں۔ بہرحال یہ واقعہ میرے دوست کے ذہن سے آسانی سے محو نہ ہو سکا۔ رات کو سوتے وقت اُنہوں نے اپنی والدہ سے یہ قصّہ پوچھا۔

"امّی کیا کسی سے پانی مانگنا بُری بات ہے؟"

"نہیں بیٹے۔"

"پھر مولوی صاحب کی لڑکی ہم کو کیوں ڈانٹیں[1]۔"

یہ سن کر امی بے ساختہ ہنسنے لگیں اور پورا واقعہ سننے کے بعد اُنہوں نے بتایا۔

"بیٹے وہ مولوی صاحب کی بیٹی نہیں بیوی ہیں۔"

"لیکن مولوی صاحب تو ابّا سے بھی بڑے ہیں ان کی سفید داڑھی ہے ان کی بیوی تو آپ کے عمر کی ہوں گی اور ان کے گھر ساجو بی بی ہیں وہ تو آپا کے اتنی بڑی ہیں۔"

اور بہرحال بڑی مشکل سے امی کی اس بات کا میرے دوست کو یقین آیا کہ وہ خاتون مولوی صاحب کی بیٹی نہیں بلکہ بیوی ہی ہیں۔

لیجئے آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اور عقل جو سمجھاتی ہے وہ تو صحیح ہو سکتا ہے لیکن اگر واقعہ اور حقیقت ہی عجیب و غریب ہو تو کوئی کیا کرے۔

اب ایک واقعہ اور سُن لیجئے۔ اس واقعہ میں واقعہ کا کوئی حصہ زیب داستاں کے لئے کم نہیں کیا گیا ہے۔ جو آنکھ نے دیکھا ہی عقل نے سمجھا بھی ہے۔ پس پردہ حقیقت بھی کچھ نہیں ہے۔ بس اک ذرا سی ترتیب اور واقعاتی تسلسل نے وہ رنگ بھرا ہے کہ

حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

میری ایک عزیزہ کی شادی تھی۔ نکاح پڑھانے کے لئے مولانا صاحب دوسرے شہر سے تشریف لائے تھے اور بڑے ہال سے متصل والے کمرے میں قیام کا انتظام تھا۔ نکاح خوانی بعد عشاء ہونی تھی۔ ستمبر اکتوبر کا مہینہ تھا۔ میں اپنے ایک ہم عمر عزیز کے ساتھ اسی کے ایک کونے میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ مجھے نئی نئی سروس ملی تھی وہی بتا رہا تھا کہ میرے فرائض کیا ہیں۔ دفتر میں کیا کام ہوتا ہے۔ صحن کا فی طویل و عریض تھا جس کے ایک کونے پر تو وہ کمرہ ہے جس میں مولانا صاحب کا قیام تھا اور دوسرے کونے میں پھاٹک کے قریب

---

[1] [illegible] کا نام لڑکی [illegible] کی ضد۔

بیت الخلاء تھا۔ عشاء کے وقت سے کچھ پہلے مولانا کو استنجا کی حاجت پیش آئی تو موصوف نے ان بندگ سے کہا جنھیں مولانا کے قیام وغیرہ کا انچارج بنایا گیا تھا۔ نام تو موصوف کا کچھ اور ہے۔ آئیے! ہم آپ تھوڑی دیر کے لئے انھیں قاضی صاحب کہیں۔

قاضی صاحب نے اپنے بیٹوں کو حکم صادر کرنے شروع کئے۔

" اظہر لالٹین جلاؤ۔ " (پاخانہ میں بجلی نہیں تھی)۔

" اختر لوٹے میں پانی لاؤ۔"

" افسر جاؤ دیکھو پاخانہ خالی ہے۔"

اور جب قاضی صاحب کے تینوں دلبران نے احکامات کی تعمیل کی تو ہمیں یہ منظر نظر آیا کہ آگے آگے افسر، اُن کے پیچھے قاضی صاحب راستہ بتانے کے لئے، ان کے پیچھے اظہر جلتی ہوئی لالٹین لئے ہوئے، اُن کے پیچھے جناب مولانا صاحب قبلہ، اُن کے پیچھے اختر لوٹے میں پانی لئے ہوئے اور اُن کے پیچھے قاضی صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے بطور اسٹپنی کہ شاید اسی دوران قاضی صاحب کوئی اور حکم صادر فرمائیں تو حکم کی بجا آوری کے لئے کوئی تو ہو۔ اور اس شان سے جب ایک قطار میں یہ قافلہ ہال کے پہلو سے نکل کر روانہ ہوا اور طویل سیڑھیاں اتر کر صحن کو درمیان سے عبور کرتا ہوا مقابل کے کونے کی طرف روانہ ہوا تو میں بھی باتیں کرنا بھول گیا، میرے عزیز بھی بھول گئے کہ کیا گفتگو تھی اور ہم مسحور ہو کر یہ منظر دیکھنے لگے۔

اس کے تھوڑی دیر بعد نکاح کا انتظام ہونے لگا۔ مختلف حضرات صحن میں اِدھر سے اُدھر جانے لگے اور مولانا کب اور کس شان سے واپس ہوئے ہم نے خیال نہیں کیا۔ نکاح کے بعد کھانا ہوا اور انتظامات میں ضروری تعاون دینے کے بعد جب ہم لوگ پھر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو پھر ایک بار ہماری نظر جس منظر پر پڑی یعنی ہماری آنکھوں نے جو دیکھا وہ یہ تھا کہ مولانا پھر ایک بار اسی کونے کا رخ کر رہے تھے اور اس بار مولانا کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں لوٹا۔ ظاہر ہے ہم اس منظر سے کافی محظوظ ہوئے لیکن ہوا صرف یہ تھا کہ پہلی بار لالٹین اور بچہ تھی لوٹا اور بچہ، اور بیت الخلاء کا راستہ مولانا کا دیکھا ہوا نہ تھا۔ دوسری بار، لوٹا اور لالٹین مولانا کے کمرے میں ہی رکھ دیئے گئے تھے اور راستے سے بھی موصوف واقف ہو چکے تھے۔ لیکن اتفاق یہ تھا کہ کہاوت ہے کہ الکشن کے بعد ووٹر، مشاعرہ کے بعد شاعر اور نکاح کے بعد مولوی کو کوئی نہیں پوچھتا، اسی طرح نکاح کے پیشتر مولانا کا وہ جلوس بیت الخلاء تھا اور نکاح کے بعد مولانا اپنی مدد آپ کر رہے تھے۔ ویسے مولانا کی مہمان داری آخر تک ہوئی لیکن ہم تو صرف یہ کہہ رہے تھے کہ آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اگر اسے ہی سچ سمجھا جائے تو بڑے لطیف اور کبھی کبھی مضحک واقعات بھی سامنے آتے ہیں۔ کیا آپ کو بھی ایسے کچھ واقعات یاد آئے؟

شاعرِ شیریں بیاں

ہیں ہمارے شہر میں اک شاعرِ شیریں بیاں — عرض کرنا چاہتا ہوں آج اُن کی داستاں
جب کوئی دیتا ہے ان کو دعوتِ شعر و سخن — تب بتاتے ہیں وہ نامہ بر کو شرکت کا چلن
ڈھائی سو سے کم کا "آفر" ہے تو آسکتا نہیں — ہو منسٹر کی سفارش تب بھی جا سکتا نہیں
شاعروں میں نام میرا اس قدر مشہور ہے — مجھ کو "کنوینر" بلانے کے لئے مجبور ہے
میں جہاں جاتا ہوں ہنگامہ شور دیتا ہوں وہاں — میرے گانے پر فدا ہوتے ہیں سب پیر و جواں
وہ غزل ہو یا رباعی سب ہی گا لیتا ہوں میں — بحر میں بے بحر کو بھی گنگنا لیتا ہوں میں
فاعلاتن فاعلن کے کیوں جھمیلے میں پڑوں — کیا ضروری ہے کہ اس میں کھوپڑی پچی کروں
ہاں مجھے دو چار بوتل کولڈ وہسکی چاہیئے — اور کچھ کھانے میں مجھ کو مرغ و ماہی چاہیئے
میں "غزل گا" ہوں غزل گوئی سے مجھ کو کیا غرض — ہو گیا ہے مجھ کو تو پیسہ کمانے کا مرض
جب غزل گاتا ہوں میں چلتا ہے ریلا داد کا — نام مجھ سے چل رہا ہے اب مرے اُستاد کا
داد مل جاتی ہے مجھ کو ایسے مصرعوں پہ بھی — گو نظر میں ناقدوں کی سخت مہمل ہی سہی
مجھ کو تنقیدوں سے کیا مطلب گلے پر ناز ہے — گانے والوں سے یہاں کے میرا ساز و باز ہے
فن میں کیا رکھا ہے فن کو پوچھتا بھی کون ہے — اور اب اہلِ سخن کو پوچھتا بھی کون ہے
اب بتائیں آپ کیا شرطیں مری منظور ہیں؟ — آپ کیا میرے بلانے کے لئے مجبور ہیں؟

میری شرطیں ہوں اگر منظور تو بتلائیے
ورنہ جس رستے سے آئے ہیں اسی سے جائیے

کرگس سہسوانی

اقبال شانہ

غزل

جب ترے ہاتھ میں کفگیر نظر آتی ہے
تھرتھراتی ہوئی شمشیر نظر آتی ہے

نیند میں چیخ کے تکئے سے لپٹ جاتا ہوں
خواب میں جب تری تصویر نظر آتی ہے

محفلِ شعر میں دھوبی کے گدھوں کی آمد
شاعری میں بڑی تاثیر نظر آتی ہے

اپنا استاد ہے دلدار ستارہ یارو
اس کی دُم میں مری تصویر نظر آتی ہے

سادہ کاغذ پہ میں کچھ کیڑے مکوڑوں کے نقوش
یہ ترے ہاتھ کی تحریر نظر آتی ہے

آج کل شیخ کے بیڈ روم کی دیواروں پہ
ہیما مالنی کی تصویر نظر آتی ہے

گولڈن جوبلی غزلوں کی ہوئی ہے شانہ
شاعری باپ کی جاگیر نظر آتی ہے

قطعات

نظر برنی

دلِ سیاہ

ایک فاؤسے ملے جب ان کے دیرینہ رفیق
دیکھ کر بالوں کی رنگت، لی انھوں نے سرد آہ
سن کے باتیں دوست کی کہنے لگے یہ سیٹھ جی
بال گر کالے نہیں ہیں دل تو ہے میرا سیاہ

خود غرضی

فلتے کی موت مرنے سے کچھ فائدہ نہیں
پیڑوں کی چھال کھائیے جی بھر کے سوئیے
سنتا ہے کون آج کے حالات میں نظر
اپنے ہی حالِ زار پہ منہ ڈھک کے روئیے

دُم نکل آئی

جس کو سوچا نہ تھا وہ دیکھ لیے
ہائے قدرت کی کار فرمائی
دیکھ لی آدمی کی اصلیت
ایک لڑکے کے دُم نکل آئی

مکانِ دل

پہلے آدابِ عشق تھے کچھ اور
اور دل کی جگہ تھی بائیں طرف
یہ ہے دِلّی کے ڈاکٹر کی کھوج
دل بھی ہلنے لگا ہے دائیں طرف

چوٹ

میں الیکشن میں ہو گیا ہوں کھڑا
ووٹ کے ساتھ دیجئے کچھ نوٹ
ورنہ پھر تو کسی جماعت سے
پیسے لے کر میں دوں گا تم کو چوٹ

سالانہ الیکشن

الیکشن آ گیا بیروزگاری کی بنی چاندی
بلاسے کوئی جیتے اور ہارے ان کو کیا غم ہے
الیکشن اب تو ہونا چاہیئے ہر سال بھائیو
ہمارے نوجوانوں میں بلا کا جوش اور دم ہے

نوادرات

وہ جو ہیں 'نوادرات' کے ڈیلر
ان کے 'دھندے' بھی اور ہوتے ہیں
جو 'زراعت' میں 'آرٹ' بھی شامل
'مورتی' وہ زمیں میں بوتے ہیں

پان کی پیک

پان کو منہ میں دبا کر، بیٹھنا چپ سادھ کر
یہ ہے اپنے دوست کی عادت، یہی اس کا شعار
کھولتا ہے جب کبھی منہ کو وہ اس دوران میں
پیک سے کر ڈالتا ہے سارے کپڑے داغدار

ایک آنکھ

انصاف کی نگاہ میں آنکھیں ہیں دو کہ ایک
اکبر نے بیربل سے کہا یہ بتاؤ آج
بولا، حضور حاکمِ دانا تو ہے وہی
جنتا کو ایک آنکھ سے دیکھے چلے گا راج

پُلِ صراط

ملک فیاض
(حیدرآباد)

حسبِ معمول جب ہم گھر سے باہر جانے لگے تب چھوٹی بہن نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ "بھائی جان — ٹرافک کو دیکھ کر سڑکیں عبور کیجئے۔" ہم نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور باہر نکل گئے۔ ہم ٹرافک کی زیادتی سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوتے تھے لیکن جب دوست احباب بار بار ٹرافک کے بھیانک حادثات کے متعلق اپنی دہشت انگیز رائے ظاہر کرنے لگے تو ہمیں بھی اس بات پر سنجیدگی سے غور وفکر کرنا پڑا کہ واقعی ہمیں بھی بہت احتیاط اور پوری ہوشیاری سے سڑکوں پر سے گذرنا چاہیئے۔ کیونکہ آج کل لاریاں ملک الموت بن کر ہر راہ گیر کو دبوچ رہی ہیں اور سڑکیں پل صراط بن چکی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ حشر میں آپ پل صراط پر سے اپنے نیک اعمال کی وجہ سے گذر کے جنت میں داخل ہوجائیں۔ لیکن یہاں سڑکوں پر سے چلتے ہوئے شریف، معصوم اور نیک انسان اپنے گھر یا دفتر میں داخل ہونے کے بجائے سیدھے پوسٹ مارٹم کے کمرے میں داخل ہوجاتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں سے ہر لاری ڈرائیور اپنی لاری کو "سوپر سانک" بنانے کی جدوجہد میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ اور جب پُر ہجوم سڑکوں سے یہ "سوپر سانک" لاریاں گذرتی ہیں تب کوئی نہ کوئی اس سے خواہ مخواہ کے ٹکرا جاتا ہے اور عموماً اس کی شناخت کے لئے پولیس کو اخبارات میں اعلان شائع کروانا پڑتا ہے۔ اب تو لوگ گھر بیٹھے اپنے دوست احباب اور عزیز و اقارب کی خیر خیریت اخبارات میں اتفاقی حادثات کی خبریں پڑھ کر معلوم کرلینے لگے ہیں۔ اخبارات میں ٹرافک حادثات کی ایسی خبروں کا ردِعمل ہر سڑک پر سے گذرنے والے راہ گیر کے چہرہ پر بہ آسانی پڑھا جاسکتا ہے۔ زیادہ ٹرافک میں بعض راہگیر تو اس قدر سہمے ہوئے ہوتے ہیں جیسے انہیں تختہ دار پر زبردستی چڑھایا جارہا ہو۔

آج کل شہر کی خوبصورت لمبی چوڑی سڑکیں مقتل بن چکی ہیں۔ آپ نے رات کا کھانا تناول فرمایا اور چہل قدمی کے لئے سڑک پر نکلے۔ چند منٹوں بعد آپ نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی بم آپ کے جسم پر چڑھ بیٹھا ہے۔ پھر اس کے بعد آپ کے ہوش وحواس اُڑ گئے۔ تقدیر مہربان رہی یا آپ کا دانہ پانی باقی رہا تو سمجھ لیجیے کہ ایک ہاتھ، ایک پاؤں مکمل طور پر زائل ہوچکا ہے اور آپ ناکارہ ہو گئے پھر بھی لیکن زندگی سے محروم نہیں ہوسکے۔ گھر کے افراد پریشان کہ آپ واپس نہیں لوٹے۔ خیر ڈھونڈتے ہوئے افرادِ خاندان پولیس کی فراہم کردہ اطلاع پر دواخانے پہنچے اور آپ کو زندہ دیکھ کر روتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔

آج کل ٹرافک حادثات سے تقریباً ہر شخص پریشان وحیران ہے۔ موت لازمی ہے لیکن ایسی بھی کیا موت کہ کل پر رونے والا کوئی نہ ہو اور وہ لاوارث لاش بن کر مردہ خانے میں محفوظ رکھ دی جائے۔ گمنامی اور ذلت کی سڑک پر تکلیف دہ موت کون پسند کرتا ہے؟ اپنی لاش کو لاوارث [illegible] سے بچانے کے لئے ہمارے ایک [illegible] جنہیں اکثر کاروبار کے سلسلے میں شہر بھر میں گھومنا

سیکل پر گشت لگایا کرتے ہیں۔ ایک ترکیب نکال لی ہے۔ ایک دن کہنے لگے۔

"ملک صاحب! آج کل جس رفتار سے حادثے ہو رہے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ سامنے آنے والی لاری میرے اوپر سے گذر جائے گی اور میں ہڈیوں اور گوشت کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاؤں گا۔ اسی لئے اب میں نے ایک چاندی کی تختی بنوا کر اپنے گلے میں ڈال لی ہے جس پر میرا پتہ اور نام کندہ ہے۔"

ٹرافک کے حادثات کا یہ لامتناہی سلسلہ اگر یونہی چلتا رہا تو ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے۔ جب لوگ اپنے رشتہ داروں کو گھر سے کسی بھی کام سے نکلتے وقت اس طرح رخصت کرنے لگیں گے جیسے وہ "محاذ جنگ" پر جا رہے ہوں۔ جب سے اخبارات میں حادثات کی خبریں شائع ہونے لگی ہیں۔ ہمیں گھر کے بڑوں نے حکم دے رکھا ہے کہ ٹھیک چھ بجے شام کو مکان پر موجود رہنا چاہیئے یوں ہمارے شام کے اوقات جو دوست احباب میں گذرتے تھے۔ گھر کی چار دیواری میں بیوی بچوں کے ساتھ گذرنے لگے۔ اس طرح ہماری بیگم بہت خوش تھیں۔ لیکن اتفاقاً ایک دن ہم مقررہ وقت پر مکان نہیں پہنچ سکے۔ تین گھنٹوں کی تاخیر ہو گئی۔ جب ہم رات کو نو بجے گھر میں داخل ہوئے تب دیکھا گھر کے سب لوگ ہمارے منتظر ہیں اور ان کے چہروں پر ایسی سنجیدگی برس رہی تھی جیسے مکان میں کوئی لاش رکھی ہو ہمیں دیکھتے ہی اہل خاندان کے چہروں پر خوشی کی لکیریں نمایاں ہو گئیں۔ ہمارے دس سالہ فرزند دوڑ کر آئے اور ہماری ٹانگوں سے لپٹ گئے اور ارشاد فرمایا۔

"آپ سیکل سے دفتر مت جایا کیجئے۔"

"بیٹے — پھر کس طرح جائیں ؟" ہم نے پوچھا چند لمحوں تک سوچ کر کہنے لگے۔

"ابا . . . . آپ ایک ٹینک خرید لیں۔ ویسا ہی جیسا کہ حسین ساگر کے کٹ پر پڑا ہوا ہے۔"

ٹرافک کے ان اتفاقی حادثات سے ہونے والی اموات کو دیکھ کر ہم نے سوچا کہ آج جس طرح موت ارزاں ہو گئی ہے۔ کاش شکر بھی اتنی ہی سستی ہو جائے۔ مگر افسوس کہ ایسا اس لئے نہیں ہو سکتا کہ شکر کو موت نہیں ہے۔

روزمرہ کے ان حادثوں نے اچھے اچھوں کا دماغ تقریباً خراب کر دیا ہے۔ ذی فہم اور باشعور حضرات بھی اپنے تحفظ کی خاطر عجیب طرح کی باتیں کرنے لگے ہیں۔ اچانک کل شام دفتر سے گھر آتے ہوئے راستہ میں ہمارے دوست ہاشم صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے باتوں کے دوران یہ انکشاف کیا کہ وہ اپنی فیئٹ کار فروخت کرنے والے ہیں۔ ہم نے پوچھا۔

"کیوں بھئی — ؟ خیریت، اتنی اچھی اور کم خرچ سواری کو . . . . . ؟ !!"

"نہیں یار، یہ ٹین کا ڈبہ ہے۔ کسی حادثہ میں لاری کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر — ؟"

"اسے فروخت کرکے میں ملٹری ڈسپوزل کی کوئی بکتر بند گاڑی خرید لوں گا۔"

چند سال قبل کی بات ہے کہ ہم موت کو کبھی ناگہانی نہیں سمجھتے تھے۔ ہمارا عام خیال یہ تھا کہ موت بچپن اور جوانی کی سرحد عبور کرنے کے بعد آتی ہے۔ مگر جب چھ سال کے معصوم بچے اور کڑیل جوان بھی ٹرافک کے حادثات میں داعی اجل کو لبیک کہنے لگے۔ تب ہمیں موت کی ناگہانی ہونے کا کامل یقین ہو گیا۔ اور ٹرافک کی اس ناگہانی موت کے خیال ہی سے ہم نے باقاعدہ نماز پڑھنی شروع کر دی ہے اور گھر سے نکلتے وقت "بولا چالا" معاف کروا کر نکلتے ہیں۔ پتہ نہیں کہ کب فولادی فرشتہ ہمارے کو قیمے میں تبدیل کر دے . . . . . !

—— ⁂ ——

ایس ایس علی
(بلاپور)

شیخ چلی کی عقلمندی، فہم و فراست اور اعلیٰ ظرفی کے بہت سے واقعات آپ نے سُنے اور پڑھے ہوں گے۔ دنیا [illegible]سی شئے کو ثبات ہو یا نہ ہو لیکن شیخ چلیت کو ضرور ثبات ہے بلکہ زمانہ کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس میں بھی ترقی ہوئی ہے [illegible]ہم آپ کو ایک ارتقار یافتہ شیخ چلی سے متعارف کروا رہے ہیں۔ موصوف ہمارے محبوب ترین دوستوں میں سے ہیں۔ چند سال [illegible]، وہ راہیٔ ملکِ شعر و سخن ہوئے تھے۔ اور اسی دشوار گذار سفر نے انھیں شیخ چلی بنا کر چھوڑا ورنہ وہ بھی آدمی تھے کام کے۔ کسی [illegible]ن منزل کی جانب گامزن ہونے کے لئے یا کسی دشوار کام پر کمربستہ ہونے کے لئے عزم و ارادہ نہایت ضروری ہے۔ لیکن موصوف [illegible]یال تھا (اور اب بھی ہے) کہ عزم کو فکر کرتے پھرتے رہیں آدمی سے قوی مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس لئے پہلے کام کرو بعد اس کے [illegible]ے میں سوچو۔ بیٹھے بٹھائے ایک دن جانے کیا دل میں سمائی (اور اُردو شاعری کی جو شامت آئی) تو انھوں نے فوری طور پر شاعری [illegible]ول ڈال دیا۔ رہا سوال اُس پر غور و خوض کرنے کا تو یہ کام طاؤں کا ہے کہ ان کو دوزخ میں منہ کے بل کھینچے جانے کا مژدہ سنائیں [illegible]رہے نقادوں کی ذمہ داری ہے کہ ایار ٹیاں وغیرہ کھائیں "کر) ان کو اکبر کے نو رتنوں کی صف میں کھڑا کر دیں یا (بصورت دیگر) [illegible]کے اشعار کو عروض کی میزان پر تولتے رہیں اور ان پر تُک بندی کا فتویٰ صادر کرتے رہیں، ان کی صحت پر بہر حال کوئی اثر [illegible]ہیں پڑے گا۔

موصوف کا نام دو ارکان پر مشتمل ہے۔ شیخ اور چلی۔ شیخ کا نام سن کر پہلے ایک نورانی چہرہ تصور کے پردے پر [illegible]ن ہو جایا کرتا تھا۔ بڑی سی داڑھی، اس میں کنگھا کرتی ہوئی انگلیاں کہ غلطی سے اگر کوئی گستاخ تنکا اٹک گیا ہو تو نکل جائے [illegible]بلے ڈھالے سفید کپڑے اور ان سے پھوٹتی ہوئی کافور و عنبر کی خوشبو کہ لا محالہ آدمی ڈر جائے۔ خشمگیں (بلکہ شعلہ بار) آنکھیں جو [illegible]نابر، کو گھورتی ہوئی۔ لیکن آج کل تو شیخ کا نام سنتے ہی عجیب تصویر سامنے آجاتی ہے۔ لیکن ہم جن شیخ صاحب کا ذکر [illegible]ہے ہیں۔ وہ نہ تو کلاسیکل شاعری کے شیخ ہیں نہ ہی ماڈرن عرب ملک کے بلکہ یہ جدید ادب کے شیخ ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ [illegible]ساتھ پشتوں میں ان کے یہاں کوئی شاعر نہیں ہوا اور نہ ہی اگلی سات پشتوں میں کسی کے شاعر ہونے کا امکان ہے، اور [illegible]د اس دشت کی سیاحی میں ان کی یہ پہلی ہی پشت ہے۔ لیکن شاعری پر گفتگو کچھ اس انداز سے کرتے ہیں گویا سینکڑوں

پشتوں سے ان کا پیشہ آبا و شاعری رہا ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ان کے یہاں شاعری (یا شاعری) کی روایت نہیں ہے تو پھر شاعری کے جراثیم ان کے دماغ میں کہاں سے پہنچے ؟

موصوف کے نام کا دوسرا جزو " چلی " ہے، سو یہ محض ایک جغرافیائی علامت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد ایسے علاقے سے تعلق رکھتے تھے جہاں CHILLI یعنی مرچ کی پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔

بیچارے شیخ چلی سیدھے سادے آدمی، لوگوں نے ان کی تک بندی کی ہوٹنگ ان کے شایان شان کی لیکن اس ہوٹنگ کو اگر وہ اپنی مداحی سمجھ بیٹھیں تو لوگوں کا کیا قصور ؟ رفتہ رفتہ ان کا دماغ عرش پر پہنچنے لگا۔ ان کے انداز میں ایک شان بے نیازی پیدا ہونے لگی۔ بازار میں دوستوں اور نیازمندوں کے ساتھ چہل قدمی کرتے گھومتے ہیں، اچانک کسی ہمدم سے پان لانے کی فرمائش کر بیٹھتے ہیں۔ اب اگر جواب میں دو جوتے بھی پڑ جاتے ہیں تو سودا گھاٹے کا نہیں۔ اسی سانحہ پر نظم جھاڑ دیں گے۔ کسی سنگدل نے جب انہیں اردو ادب کی " شخصیت " سنبھالنے کا مشورہ دیا تو انہوں نے اپنے دونوں کلوں میں پان کے بیڑے ٹھونسے اور کھلی باچھیں سمیٹ کر نئے نئے خواب بننے لگے۔ یار دوستوں نے کہا کہ کوئی منصب اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آیا کرتا۔ بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ بڑی جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اگر آپ کو اردو ادب کی شخصیت سنبھالنا ہے تو آپ کو اردو ادب پر اپنی غزلوں اور نظموں کے پے در پے حملے کرنے ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ ایک دن آپ بابر کی طرح اردو ادب کی تمام پرانی روایتوں اور قدروں کو پامال کرتے ہوئے ضرور بضرور اس پر قبضہ جمالیں گے۔ بوقت ضرورت دنیائے ادب پر ایمرجنسی بھی نافذ کی جا سکتی ہے۔ یقین ہے کہ اس طرح آپ کی آنے والی نسلیں بھی آپ کے منصب کتابی کو سنبھال سکیں گی بلکہ اس میں چار چاند بھی لگاتی رہیں گی۔ اور جمہوریت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ایسا ہونا بھی چاہئے کیونکہ آپ کی پچھلی نسلوں پر اس سلسلے میں بہت ناانصافی ہوئی ہے۔ تو صاحب انہوں نے اپنے ڈھیلے ڈھالے قمیص پاجامے کو اتار کر پھینک دیا (جلدی میں نہیں)، پینٹ شیلا زیب تن کیا، سر پر بندھے رومال کو بچوں کے منہ ہاتھ صاف کرنے کے لئے وقف کر دیا۔ پان میں خوشبودار مسالہ شامل کر لیا اور ہونٹوں میں سگریٹ دبالی۔ بائیں ہاتھ میں لوح اور دائیں ہاتھ میں قلم تھام لی اور لگے شاعری کرنے۔ اب جو غزلوں اور نظموں کا سیلاب آیا کہ الاماں! بیماری کی طرح ہر اخبار اور رسالہ سے چپک گئے۔ ہر جگہ ان کا نام دیکھتے دیکھتے لوگوں کو ابکائیاں سی آنے لگیں۔ لیکن بغیر بریک کی گاڑی کی طرح وہ ڈھلان پر پھسلتے ہی رہے اور اس طرح انہوں نے چند ہی سالوں میں اردو ادب پر قبضہ جما لیا۔ بطور قرطاس ابیض انہوں نے اپنا ایک مجموعۂ کلام مالی معاونت سے شائع کروایا تاکہ لوگ پڑھیں اور سیریڈون کھائیں، دماغی استحکام عطا کریں اور ان کے مخالفین بغلیں بجاتے پھریں۔ . . . حکومت چلانے کے لئے کانفرنس، سیمینار اور عام اجلاس بھی کروانے پڑتے ہیں۔ موصوف کے حلقۂ یاراں میں کیسی کیسی جمیل و شکیل صورتیں ہیں کہ ان کے لئے ایک [illegible] بڑے بڑے اہم کرتی ہے لیکن یہ صرف ان ہی کا اعجاز ہے کہ صاحب کے حصہ کا ثواب اپنے نامۂ اعمال میں لکھوا لیتے ہیں۔ اور ان کے احباب بیچارے اپنے ضمیر کی آواز پر صابر و شاکر رہتے ہیں۔ اپنے اقتدار کو مزید مستحکم کرنے کی خاطر انہوں نے " مراسلہ بم " شروع کردیا۔ اب حال یہ کہ کسی بھی اخبار یا رسالے میں خطوط کا کالم دیکھئے۔ ایک نہ ایک خط شیخ چلی صاحب کا موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں پہلے ایڈیٹر کی تعریف اور پھر اپنی توصیف بیان کی گئی ہو۔ مثلاً مارکیٹ میں کتابوں " بیانوں کی شاعر شیخ ہے، سٹ پٹ آٹھ دس خطوط مختلف اخباروں کو لکھ دیں گے کہ آپ اس سلسلے میں جو خبریں شائع کر رہے ہیں اس کے لئے آپ قابل صد تحسین و مبارکباد ہیں۔ میں بھی وزارت تعلیم سے خط و کتابت کر رہا ہوں۔ شکر کی کمی، مٹی کے تیل کی نایابی، مشاعرہ کا اعلان، نشست نامساعد، کسی کی کتاب کی رسم اجرا پر مبارکباد، کسی کے بچے کی سالگرہ پر مبارکباد، فرضی نام سے کوئی انجمن بنا کر

اس کے عہدیداروں کے نام کا اعلان ، اور اس کے اغراض و مقاصد ، میٹرک کا رزلٹ اچھا آنے پر ہیڈ ماسٹر کو ڈیپرس کو نیپیں مبارکباد ، ریڈیو پر اسلامی پروگرام شروع کروانے کی درخواست ، اردو کو دوسری سرکاری زبان بنانے کی درخواست ، غرض کہ زندگی کے ہر شعبے میں ان کے یہ کاغذی گھوڑے دوڑتے رہتے ہیں - یہ اور بات ہے کہ ان کی پہنچ صرف اخبار و رسائل تک محدود رہتی ہے - آٹھ دس خطوط اور آٹھ دس غزلیں اور نظمیں لکھنا ' ان کا روز کا معمول بن چکا ہے - ہمیں امید ہے کہ ان کی آنے والی نسلیں بھی اسی طرح اردو ادب پر قابض رہیں گی اور ہماری آنے والی نسلیں ان کی اسی طرح شکرگزار رہیں گی جس طرح آج ہم حضرت علامہ شیخ چلی کے شکر گزار ہیں -

---

ادارۂ شگوفہ

کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کی جا سکتی ہیں

کتاب	مصنف	نوعیت	قیمت	
کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	-/۱۵	روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	مجموعۂ کلام	۵/۵۰	"
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰	"
چھیڑ چھاڑ	پرویز ید اللہ مہدی	"	-/۶	"
سائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	-/۶	"
فقط	یوسف ناظم	"	-/۶	"
در پردہ	مسیح انجم	"	-/۶	"
تو تو میں میں	پرویز ید اللہ مہدی	ڈرامے	-/۱۰	"
چوڑی کے غلام		مضامین	-/۷	"
کب نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	"	-/۸	"
سمن زار	خواجہ عبد الغفور	"	-/۸	"
دم گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	-/۸	"
بیر جاک	مجتبیٰ حسین	مضامین	-/۷	"
[illegible]	عاتق شاہ	"	-/۸	"
شورشے	ارشد علی خان	"	-/۱۰	"
جھل جوں کا مربہ	پاگل عادل آبادی	مجموعۂ کلام	-/۶	"
بھلاوے کے داغ	عفت جلالی	"	-/۷	"

قطعات

عبدالکریم ماہر

کیا چھتری چھوٹی ہو گئی؟

جب سے مہنگی دال روٹی ہو گئی
بس بیچاری اور موٹی ہو گئی
اتنی موٹی اور پھر برسات میں
ہو نہ ہو چھتری ہی چھوٹی ہو گئی

نظر بندی

کھینچا تانی کے دور میں عورت
جیسے گڑیا کوئی ربڑ کی ہے
پاس سے ہو گی اس کی عمر پچاس
دور سے بیس کی جو لڑکی ہے

ممتاز طالب علم

میں جانتا ہوں باندھے ہیں کیا کیا توقعات
امی نے اور قوم نے ہر نونہال سے
اسکول بھر میں اس کے برابر تو ہو کوئی
جو ساتویں کلاس میں ہو آٹھ سال سے

مدرسہ اور ہم

پہلے ہوتی تھی اس قدر سختی
مدرسے جیسے جیل ہوتے تھے
ہم بھی ایسے کہ امتحانوں میں
کاپی کر کے بھی فیل ہوتے تھے

غزلیں

بگڑ رائچوری

کبھی نیں سو رقعہ یہ کیکو بھجائیں کی
کھوٹی دوپہر میں کیکو بلائیں کی
میں آچھی آڑانان کبھی نیں آڑا تھا
مہاڑی پو آچھی یہ کیکو بٹھائیں کی
بڑا پن جتانے بڑے گھر کی سودھی
بڑا گوشت منگا کو کیکو کھلائیں کی
نیں دیکھنے کے چیزاں ہیں سب دیکھنے والے
ہوا ناد کپڑے یہ کیکو سلائیں کی
ہے جلنے کی عادت تو یہ جل کو بولے
نشیرے میں بگڑ کو کیکو بلائیں کی

(مشاعرہ)

داؤد بلیہاروی

راتاں کٹتے تھے نیں خواباں چھوٹتے تھے نیں
تیرے بن ہجر کی لمبی راتاں کتے
ناک نقشے کی تعریف کیا کیا کریں
انکھیاں نرگس ہوٹاں لعلاں کتے
بنگڑیاں پھولاں کے آتیج ہلکے ہوں
ڈالیاں پھولاں کے ایسے ہاتاں کتے
آتا جل کھا کو انگڑائیاں لیو نکو
دل پو دیوانے کے گرتیں بجلیاں کتے
پوچھ قاصد ذرا جا کو ان سے بھی تو
بھانکا بھانکی کے کب تک یہ کاماں کتے
مرزا غالب تھے شاعری میں تلک
وہ دبانے تھے پیادہ کے پاواں کتے
گھر میں جو دو بچے بلبلا رہے ہیں
کئی کے خط تیرے سے یہ ماماں کتے

جہانگیر انس رانی پوری

موڈرن حکیم

[موڈرن حکیم صاحب کا مطب ـــ تین ٹوٹی ہوئی کرسیاں مطب کی رونق بڑھانے کے لئے اینٹ کے سہارے رکھی ہوئی ہیں۔ کرسیوں کے درمیان ایک میز ہے جس پر پرانے اخبار بچھے ہوئے ہیں اور ہارلکس کی شیشیوں میں کالی، سفید، سبز اور لال گولیاں رکھی ہوئی ہیں۔ موڈرن حکیم صاحب پاجامہ کرتا پر ٹائی باندھے ایک اسٹول پر بیٹھے اُلّو کی طرح اونگھ رہے ہیں۔ مطب میں حکیم صاحب کا کمپاؤنڈر (جو چپراسی اور نوکر ملازم کے بھی فرائض انجام دیتا ہے اور دیکھنے میں کسی مداری کا جمورا لگ رہا ہے) داخل ہوتا ہے۔ کمپاؤنڈر کے پیروں کی آواز سے حکیم صاحب چونک کر کمپاؤنڈر کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں]

کمپاؤنڈر : حکیم صاحب!

حکیم صاحب : ابے گدھے کی اولاد " پھر مجھے حکیم صاحب کہہ رہا ہے

کمپاؤنڈر : آپ بھی میرے باپ ہیں۔ جانتے ہیں ....

حکیم صاحب : بات کاٹے بیٹے، کیا میں گدھا ہوں؟

کمپاؤنڈر : حضور! گدھا تو میرا باپ ہے۔ آپ تو موڈرن حکیم ہیں

حکیم صاحب : ابے کم عقل " میں حکیم نہیں بلکہ موڈرن حکیم ہوں۔ اور تو مجھے بار بار حکیم صاحب کہہ کر میرا مارکیٹ ویلیو خراب کرتا رہتا ہے۔

کمپاؤنڈر : حضور! پہلے تو آپ اچھے خاصے حکیم صاحب تھے اب یہ موڈرن کا دُم چھلا کیوں لگا لیا؟

حکیم صاحب : تو زندگی بھر کمپاؤنڈر کا کمپاؤنڈر ہی رہے گا۔ تجھے آج تک یہ معلوم نہیں کہ دنیا کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ آج کا دور "جدیدیت" کا دور ہے۔ پرانی چیزوں اور پرانی باتوں کی اب کوئی قدر نہیں۔ آج ہر شخص جدیدیت کا پرستار ہے۔ جدید ادب، جدید [illegible]، جدید [illegible]، جدید اولاد، جدید بیوی، جدید تعلیم، جدید پوشاک، جدید اخلاق، غرضکہ آج ہر چیز جدید ہو گئی ہے۔ آج کا جدید انسان "قدیم چیزوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس لئے قدیم چیزوں کے ساتھ بھی عقل مند انسان لفظ جدید لگا دیتے ہیں تاکہ اس کا مارکیٹ ویلیو بڑھ جائے

کمپاؤنڈر : لیکن حکیم کے ساتھ موڈرن لگا دینے سے آپ کا مارکیٹ ویلیو کیسے بڑھ جائے گا؟

حکیم صاحب : کمبخت کے دماغ میں بات [illegible] نہیں آئے گی بس سمجھ لے آج کے دور میں [illegible]

پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ میرے پاس علامتوں کے طفیل
مریضوں کی کس طرح لائن لگتی ہے

کمپاؤنڈر : وہ تو میں دیکھ رہا ہوں قبلہ موڈرن حکیم صاحب! صبح
سے آپ مطب میں بیٹھے اونگھ رہے ہیں اور میں باہر کھڑا
مکھی مار رہا ہوں۔ اور مریض تو کیا ایک کتا بھی اپنی دم
سیدھی کرانے ابتک نہیں آیا۔

حکیم صاحب : (کمپاؤنڈر پر بگڑتے ہوئے) کیا بکا؟ میں جانوروں کا حکیم
ہوں کہ کتے میرے پاس اپنی دم سیدھی کرانے آئیں
گے۔؟

کمپاؤنڈر : (عاجزی سے) نہیں حضور، آپ تو آدمیوں کے حکیم
ہیں۔ سو فیصد موڈرن حکیم! لیکن افسوس آدمیوں
کو دم نہیں ہوتی۔

حکیم صاحب : (غصے) کمبخت تو میرا مذاق اڑاتا ہے؟

کمپاؤنڈر : حضور آپ یہ کیا فرمارہے ہیں! میری اتنی مجال کہاں
کہ آپ جیسے موڈرن حکیم کا مذاق اڑاؤں۔ (دھیرے
سے تاکہ حکیم صاحب نہ سن سکیں) آپ تو خود اپنا مذاق
آپ اڑا رہے ہیں۔ کوا چلا ہنس کی چال ......

(مطب کے باہر کسی کے آنے کی آہٹ ہوتی ہے۔ حکیم صاحب اسٹول پر
اُچھل پڑتے ہیں اور خوشی سے ہکلاتے ہوئے کہتے ہیں)۔

حکیم صاحب: آگیا۔

کمپاؤنڈر : کون آگیا حضور؟

حکیم صاحب: (غصے سے) تیرا باپ۔

کمپاؤنڈر : (تعجب سے) میرا باپ زندہ ہوکر قبرستان سے آگیا
نہیں نہیں ـــ اس کا بھوت ہوگا۔ ارے باپ رے
باپ بھوت آگیا ......

حکیم صاحب : (بگڑتے ہوئے) صرف باتیں ہی بنائے گا یا جاکر
دیکھے گا۔ شاید کوئی مریض آیا ہے۔

(کمپاؤنڈر باہر جاتا ہے اور ایک دبلے پتلے آدمی کو ساتھ لے کر مطب
میں آتا ہے۔)

نووارد : آداب عرض ہے حکیم صاحب۔

حکیم صاحب: موڈرن حکیم کہئے، موڈرن حکیم

نووارد : (طنز سے مسکراتے ہوئے) موڈرن حکیم صاحب کی خدمت
میں آداب عرض کرتا ہوں۔

حکیم صاحب: آداب، آداب، کہئے آپ کو کیا تکلیف ہے؟

(نووارد اپنی تکلیف بیان کرنے سے قبل کرسی پر بیٹھنا چاہتا ہے
کرسی سے لگی ہوئی اینٹ کھسک جاتی ہے اور وہ کرسی سمیت
فرش پر ڈھیر ہوجاتا ہے)۔

نووارد : ارے باپ رے باپ، مرگیا۔

(حکیم صاحب اور کمپاؤنڈر مل کر اسے اٹھاتے ہیں)

نووارد : آیا تھا پیٹ کا علاج کرانے۔ لگتا ہے اب پسلیوں
کا بھی علاج کرانا پڑے گا۔

حکیم صاحب: کیا ہوا تمہاری پسلیوں کو؟

نووارد : کرسی کو دعا دے رہی ہیں۔

حکیم صاحب: معمولی چوٹ ہے کمپاؤنڈر مالش کر رہا ہے ٹھیک
ہوجائے گی ـــ ہاں اب بتائیے آپ کو کیا
تکلیف ہے؟

نووارد : حضور، صبح ہی سے پیٹ میں کافی درد ہے۔

(حکیم صاحب مریض کی نبض دیکھتے ہیں، پپوٹا اٹھا کر دیکھتے ہیں
زبان نکلوا کر دیکھتے ہیں۔ داب داب کر پیٹ کا معائنہ کرتے
ہیں۔)

حکیم صاحب: صبح آپ نے کیا کھایا تھا۔

مریض : جلی ہوئی روٹیاں۔

حکیم صاحب: کمپاؤنڈر! مریض کی آنکھوں میں مجرب چاپ سرمہ
کی سلائی پھیرو۔

مریض : قبلہ موڈرن حکیم صاحب! آپ یہ کیا غضب کر رہے
ہیں؟ پیٹ کے درد سے آنکھ کا کیا تعلق ہے؟

حکیم صاحب : میں موڈرن حکیم ہوں۔ مرض کا علاج کرنے سے
پہلے مرض پیدا ہونے کے اسباب کا خاتمہ کرتا

ہوں۔ آپ کی آنکھیں خراب ہیں۔ اگر آنکھیں خراب
نہ ہوتیں تو آپ جلی ہوئی روٹیاں دکھاتے اور آپ
کے پیٹ میں درد نہیں ہوتا۔ اس لئے پہلے آپ
کی آنکھوں کا علاج ضروری ہے۔
(کمپاؤنڈر مریض کی آنکھوں میں کبوتر چھاپ سرمہ کی سلائی
پھیرتا ہے)۔
حکیم صاحب: کمپاؤنڈر! مریض کو کالی، سفید، سبز اور لال
گولیوں میں سے دو دو گولی عرقِ بادیان ڈال کر
دے دو۔ اور ایک خوراک فلفل سیاہ کا بُرادہ
کھلا دو۔
(کمپاؤنڈر مریض کو دوا دیتا ہے۔ حکیم صاحب دوا کھانے کا
طریقہ اور پرہیز بتاتے ہیں)۔
حکیم صاحب: پہلے ایک گولی سُرخ، پھر ایک گولی سیاہ، پھر
ایک گولی سبز، پھر ایک گولی سفید، ہر دو گھنٹے کے
بعد، دوا کے اندر جاتے ہی درد باہر آجائے گا۔
پرہیز، کھٹا، میٹھا، نمکین غرضکہ ہر چیز سے
پرہیز مکمل دو دن۔
مریض: قبلہ موڈرن حکیم صاحب! کتنے پیسے ہوئے؟
حکیم صاحب: پیسے نہیں روپے پوچھئے میں موڈرن حکیم ہوں میری
فیس زیادہ ہے۔
(کمپاؤنڈر سے)
کمپاؤنڈر! مریض کو میری فیس اور دوا
کی قیمت بتاؤ۔
کمپاؤنڈر: (حساب جوڑتا ہے) نبض دیکھنے کے دو روپے
آنکھ دیکھنے کے دو روپے، زبان دیکھنے کے دو
روپے، پیٹ کا معائنہ کرنے کے دو روپے، سرمہ
کی قیمت دو روپے، سرمہ لگائی دو روپے، دوا کی
قیمت دو روپے، حکیم صاحب کی فیس دو روپے
کمپاؤنڈر صاحب کی فیس دو روپے، ٹوٹل اٹھارہ
روپے، فیس بتانے کی فیس دو روپے ملاکر بیس روپے
دیجئے۔
مریض: ارے باپ رے مر گیا۔
حکیم صاحب: کیوں کیا ہوا؟
مریض: ہوا کیا خاک، آپ کی موڈرن فیس نے میری کمر
توڑ دی۔
حکیم صاحب: کمپاؤنڈر، مریض کی کمر میں مرہم خاص لگاؤ اور
دو روپے اس کا بھی چارج لے لو۔
مریض: قبلہ موڈرن حکیم صاحب! کمر میں اب مرہم لگانے
کی ضرورت نہیں۔ مرہم خاص لگائے بغیر ہی درد
اچھا ہو گیا۔
حکیم صاحب: میں موڈرن حکیم ہوں، پنساری نہیں کہ چار آنے
کا جوشاندہ دے دوں۔
مریض: (روہانسی آواز میں) ہاں میں سمجھ گیا کہ آپ موڈرن
حکیم ہیں خدا سب کو آپ کی موڈرن حکمت سے
محفوظ رکھے۔
(مریض بیس روپے کا نوٹ دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔)
حکیم صاحب: کمپاؤنڈر! دیکھا تم نے لفظ موڈرن کا کمال۔ اگر موڈرن
حکیم کے بجائے میں صرف حکیم ہوتا تو مریض ایک روپیہ
سے زیادہ نہیں دیتا . . . . .
کمپاؤنڈر: (حکیم صاحب کی بات کاٹتے ہوئے) قبلہ موڈرن حکیم صاحب
آپ صرف اپنی تعریف کئے جا رہے ہیں اصل کمال تو موڈرن
کمپاؤنڈر کا ہے۔ تمام بڑے ڈاکٹروں کے خون ٹیسٹ، تھوک
ٹیسٹ، پیشاب ٹیسٹ، پاخانہ ٹیسٹ چارجز کی طرح
میں نے بھی ہر چیز کا الگ الگ چارج بنا کر بیس روپے کا
بل بنا دیا۔ نہیں تو وہی ایک روپیہ کا ایک روپیہ ہی ملتا۔
حکیم صاحب: آخر شاگرد کس کا ہے۔ تم تو اُستاد سے بھی آگے نکلے۔
(کمپاؤنڈر اپنی تعریف سن کر پھیل گیا ہے اور شاید حکیم صاحب کا پیر
دابنے لگتا ہے اور حکیم صاحب اسٹول پر پہلے کی طرح اونگھنے لگتے ہیں)
(جاری)

محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

عوام کی خدمت کے لئے

★ ایک حقیقی عوامی حکومت
★ صاف ستھرا اور کارکرد نظم و نسق
★ کسی بھی سطح پر بدعنوانی کی گنجائش کے بغیر
★ کسانوں اور صنعتی مزدوروں کے ساتھ منصفانہ برتاؤ
★ کمزور طبقات کی ترقی کے لیئے ترجیحی پروگرام

حکومت آندھرا پردیش نے چیف منسٹر شری ٹی۔ انجیا کی قیادت میں ایک ایسے انتظامیہ کو وجود میں لانے کے لیئے ہمہ رخی مہم شروع کردی ہے۔ جس کا مقصد کام کرنا اور عاجلانہ و فائدہ مند نتائج کا حصول ہے۔

بدعنوانی کے خلاف جنگ: اعلیٰ عہدوں پر متعین عوامی شخصیتوں کے خلاف الزامات کی تحقیقات کے لیئے لوک ایوکت اور اپ لوک ایوکت کا قیام عمل میں لایا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے ریاستی مقننہ کے آئندہ اجلاس میں قانون سازی کا اقدام کیا جائے گا۔ بدعنوانی کے سراغ کے لئے ایک "فلائینگ اسکواڈ" تشکیل دیا جائے گا۔

روشن تر مستقبل: وزیر اعظم اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام اور سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام کی موثر اور بامقصد عمل آوری کے تیقن کے لیئے ایک خصوصی شعبہ تشکیل دیا جائے گا۔

کمزوروں کی بھرپور مدد: سرکاری زمینات پر ایک سال سے زائد مدت سے جھونپڑیوں میں رہنے والوں کا تخلیہ نہیں کردیا جائیگا ایسی صورت میں جب زمین سرکاری اغراض کے لئے درکار ہو تو رہائشی کا متبادل انتظام کیا جائے گا۔ حکومت ہر ملازمت سے سبکدوشی کے موقع پر اپنے ذاتی مکان کی فراہمی میں مدد کرے گی۔

مصیبت زدوں کی امداد: خشک سالی کے سلسلے میں امداد و تدابیر کی عمل آوری کے لئے ۱۵ کروڑ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔ ضلع سریکاکلم میں سیلاب زدہ عوام کی مدد کے لیئے مرکز سے ۱۵ کروڑ روپیے کی امداد طلب کی گئی ہے۔

قیمتوں کی روک تھام: قیمتوں پر کڑی نگرانی رکھی جائے گی۔ غریبوں اور متوسط طبقات کو تاجروں اور دکانداروں کے استحصال سے محفوظ رکھنے کے لئے اقدامات کئے جائیں گے

آندھرا پردیش عظیم کامیابیوں کے ایک نئے دور میں داخل ہورہا ہے جہاں خاص کر کمزور طبقات کی بھلائی کو ترجیح دی جارہی ہے۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی رہنمائی کے زیر سایہ ہماری ایک روشن اور خوب تر مستقبل کے یقین کیلئے سرعت سے مسلسل پیش قدمی ہے۔

جاری کردہ: ناظم اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

اوسا راہن
انگریزی سے ترجمہ نعیم زبیری

میں اور میرا بھوت

خاموشی چھائی ہوئی تھی ــــ آدھی رات کی خاموشی جھاڑیوں میں پتوں کی سرسراہٹ سے کبھی کبھی ٹوٹ جاتی تھی ــ پورے چاند نے اپنی مہربان کرنیں سوتی ہوئی دنیا پر پھیلا رکھی تھیں۔

"کراریک" ــــ ایک آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ میرے بیڈ روم کا دروازہ آہستہ سے کھلا ــ سفید لبادے میں ملبوس ایک جسم میرے کمرے میں در آیا ــ رکا ــ اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور اس نے ناگواری سے پوچھا ــ! "یہ کیا حرکت ہے۔ سوئے کیوں نہیں اب تک؟ ــ"

یہ وہ بھوت تھا جو اس دن سے مسلسل میرے پاس آ رہا تھا۔ جب میں اس گھر میں منتقل ہوا تھا ــ پہلے پہل تو اس نے مجھے ڈرا کے حواس باختہ کر دیا تھا۔ لیکن پھر جیسے تیسے کر کے میں نے بہرحال اس سے دوستی کر لی تھی۔

میں نے ایک بھوں ترچھی کر کے پوچھا۔ "کیوں؟"

"کیونکہ" بھوت نے جواب دیا۔ "جیسا کہ تم جانتے ہی ہو ہم نے خاص طور پر سوتے ہوئے لوگوں کو ڈرانے میں مہارت حاصل کی ہے۔"

"لیکن اب مجھے تو ڈر نہیں لگتا ــ یاد ہے؟"

اس پر بھوت پارس سا ہو گیا اور پھر اپنے ہاتھ گھٹنوں کے بیچ میں دبا کے میری گھومنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے میری طرف التجا سے بھری ایک نظر ڈالی — "یار — تمہاری وجہ سے ایک نہ ایک دن میری نوکری جاتی رہے گی — یہ کوئی معقول بات نہیں ہے۔"

"اچھا — ؟" میں نے کہا — "دیکھئے بھائی جان — آپ اپنی ملازمت کے معاملہ میں یقیناً عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ اور اس کا ایک حل ہے — یونین!"

"یونین!"

"یونین!!"

"کیسی یونین — ؟"

بات نہایت بھونڈے انداز میں آگے بڑھ رہی تھی — لیکن بھوتوں سے بات چیت کے معاملے میں نہایت محتاط رہنا ضروری ہے۔ ورنہ ان میں آپ کے اندر سے گذر جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اور اس بات کے تصور سے جھرجھری سی آتی ہے۔ چنانچہ میں نے نہایت صبر و تحمل سے وضاحت کی۔

"تم لوگوں کا ایک گروپ بن جائے — اور ایک یونین بنائے — اور پھر تم کچھ قواعد و ضوابط اور اپنی مانگوں کی فہرست تیار کر لو — اور کسی مرحلہ پر جب تمہیں یہ اندازہ ہو کہ مانگیں پوری نہیں ہو رہی ہیں — تو کر دو ہڑتال — بے نا آسان ؟"

کھو کھلے چہرے پہ روشنی سی آگئی — "کیا آئیڈیا ہے۔" بھوت نے جس قدر جوش کا مظاہرہ ایک بھوت سے ممکن ہے۔ (یقین مانئے — اس معاملے میں کچھ دیکھنا ہی بہتر ہے) کرتے ہوئے کہا۔

"اور اب آپ کی خدمت میں اسی طرح کر سکتا ہوں — کہ غائب ہو جاؤں —"

کچھ ہی دیر میں مجھے ایک زنجیر کے کھڑکھڑانے کی آواز سنائی دی۔

"دھڑ دھڑ" کی ایک تیز چرچراہٹ کی سی آواز آئی۔ کسی کھڑکی کا دروازہ بھڑ سے بند ہوا۔ اور پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ بھوتوں کو پتہ نہیں کیوں کھڑکیوں میں سے نکل جانے کا کچھ شوق سا ہوتا ہے۔

اگلی رات بھوت نمودار نہیں ہوا — میں سوچتا رہا کہ پتہ نہیں یونین والے مشورہ کا کیا ہوا۔

اور اس کے بعد والی رات — ! دروازہ پھر چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔

اس مرتبہ ڈرانے والا بھوت — خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

"کب ہو گیا — ؟" میں نے پوچھا

"یونین بن گئی — اور" اس نے کہا۔

اس کے بیان کے مطابق قواعد و ضوابط حسب ذیل تھے :-

(۱) کوئی بھوت ہفتہ میں تین دن سے زیادہ کام نہیں کرے گا۔

(۲) ایک بھوت ! ایک وقت میں صرف کسی ایک شخص ہی کو ستائے گا۔

(۳) تمام بھوتوں کو صرف نصف شب سے ایک بجے رات تک ہی کام کرنا ہو گا۔ اس سے زیادہ دیر کام کرنے والا بھوت اوور ٹائم کا مستحق ہو گا اور اس کے علاوہ چار دو گھڑیوں کی میٹنگوں میں شرکت کیلئے اسے ایک رات کی آف ملے گی

(۴) ایک بھوت کے مصاف میں ایک بھوت صرف دو دروازوں کی دو زنجیریں کھڑکھڑائے گا۔ تین کھڑکیوں کے پٹ زور سے بھیڑے گا اور صرف چار بدمعاشوں کو بھگانے کی کوشش کرے گا۔ ان حدود سے زیادہ مصروف رہنے والا بھوت جادوگرنیوں کی میٹنگ میں شرکت کے لئے ایک ہفتہ تک کا مستحق ہوگا۔

(۵) ہڑتال کی دھمکی

"اب! میرے دوست"۔ میرے بھوت نے فرطِ مسرت سے اپنے (بے گوشت) ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہی ہو اس کا مطلب ہے ۔۔۔؟ ۔۔ مطلب اس کا یہ کہ سیدھے سیدھے اُڑ جاؤ ۔ ورنہ"

"ٹھیرو ۔ ٹھیرو ۔ میرے یار" میں نے کہا ۔ "مت بھولو کہ تمہیں یہ راہ سُجھانے والا میں ہی ہوں۔ تم مجھے نہیں دھمکا سکتے ۔۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا ۔ مجھے مجبوراً کہنا ہوگا کہ یہ تو چیٹھ میں چھپا گھونپنے والی بات ہوئی۔"

میرے بھوت کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ کوئی اس کی حرکت کو غیر منصفانہ قرار دے۔ اس نے اپنی ناک دروازے کی طرف اُٹھائی اور کچھ کہے بغیر اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گیا۔

دوسری رات میں اپنے بھوت کا انتظار کرتا رہا کہ وہ آئے گا اور فراخدلی سے مجھے اپنے اصولوں سے مستثنیٰ قرار دے گا۔ آدھی رات کے قریب مجھے اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے قریب کچھ عجیب و غریب آوازیں سنائی دیں۔ میں نے باہر جھانکا اور ۔۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والا وحشتناک ترین نظارہ دیکھا ۔۔ میری کھڑکی کے عین نیچے کوئی پچاس سالہ بھوت کھڑے تھے ۔۔ اُن کے ہاتھوں میں تختیاں تھیں ۔۔ زنجیریں تھیں ۔۔ اور پتہ نہیں کیا الا بلا تھی۔ وہ نعرے لگا رہے تھے اور میرا بھوت ان کی قیادت کر رہا تھا۔

میں نیچے اُترا اور اپنے بھوت کے قریب پہنچ کر پوچھا: "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

"ہم ہڑتال پر ہیں۔" اس نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ" میں نے کہا ۔۔ "مانگیں کیا ہیں تمہاری؟"

"ہمارا مطالبہ ہے کہ تمہیں فوراً اس گھر سے نکال دیا جائے۔"

ہمارا نصب العین کسانوں کی بھلائی ہے

★ کسان ہماری معیشت کے لیئے ریڑھ کی ہڈی کے مماثل ہے۔ وہ زمین سے اناج اُگا کر ہمیں غذا فراہم کرتا ہے۔ چیف منسٹر شری ٹی۔ انجیا کی سرکردگی میں حکومت آندھرا پردیش نے کسانوں کے مفادات کے تحفظ کے لئے بہت سی رعایتیں اور سہولتیں مہیا کرنے کا اعلان کیا ہے۔

★ ایسے کسان جن کے پاس پانچ ایکر تری یا دس ایکر خشکی کی حد تک اور اس سے کم اراضیات ہیں یکم جولائی ۸۰ء سے محصول اراضی کی ادائی سے مستثنیٰ قرار دیئے گئے ہیں۔

★ دھان، جوار اور مونگ پھلی جیسے اہم فصلوں کے لئے بیمہ اسکیم رائج کی گئی۔

★ نیشکر کی قیمت خرید کو بڑھا کر ۱۸۵ روپے فی ٹن کر دیا گیا ہے۔ ۸٫۵ فیصد سے زائد وصول کی صورت میں کسانوں کو ۲۰۰ روپے فی ٹن تک قیمت ملے گی۔

★ ایسی تری اراضیات پر محصول ترقیات اراضی، مخصوص محصول اراضی اور لازمی محصول آب ختم کر دیا گیا ہے جن پر پانی کی عدم سربراہی کے باعث فصلیں نہیں اُگائی جاسکی ہیں۔

★ کاشت میں استعمال کے لیئے تصدیق کئے ہوئے بیجوں پر محصول فروخت برخاست کر دیا گیا ہے۔

★ قلیل مدتی اور طویل مدتی قرضوں کے بقایاجات اگر ۳۰ جون ۱۹۸۱ء سے قبل ادا کر دیئے جائیں تو ان پر تاخیری سود معاف کر دیا جائے گا۔

★ چھوٹے کسانوں کو دیئے ہوئے طویل مدتی اور قلیل مدتی قرضوں کی میعاد ادائی پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

★ ۶۵ سال سے زیادہ عمر والے دیہی مزدوروں اور دوسرے بے سہارا ضعیفوں کو شہروں میں ۳۰ روپے ماہانہ ایک لاکھ سے زائد آبادی والے مقامات میں ۲۵ روپے ماہانہ اور ایک لاکھ سے کم آبادی والے مقامات میں ۲۰ روپے ماہانہ کی شرحوں سے وظائف دیئے جائیں گے۔

جاری کردہ : محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش۔

راجندر سنگھ
مترجم : کالیکا پرشاد

کیا کہنے سردی کے

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تمہیں سال میں کون سا موسم سب سے اچھا اور سب سے پیارا لگتا ہے تو میں بلا تا[illegible]
کہوں گا: "سردی کا موسم"۔

شاید آپ بھی میری ہی تائید کریں گے۔ گرمی اور برسات کے موسم میں بھی کوئی موسم ہوتے ہیں؟ دن میں گرمی، [illegible]
میں گرمی اور دوپہر میں جھلسا دینے والی لو۔ جب تک کولر یا خس کی ٹٹیاں نہ ہوں، پینے کو فرج کا پانی یا کوئی دیگر مشرو[illegible]
نہ ہوں، تب تک کیا گرمی سے نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ پھر لو کے سبب دن بھر گھر میں یا دفتر میں قیدی سے ہو[illegible]
برسات کا موسم شاعروں کے لیے اچھا ہو سکتا ہے۔ سب طرف پانی اور کیچڑ ہی کیچڑ۔ نئے لق و دق سوٹ میں [illegible]
بن کر گھر سے نکلے۔ پانی برس گیا یا کوئی کار، اسکوٹر، ٹرک یا ٹیمپو پاس سے نکل گیا تو پتہ چلے کہ کپڑوں پر پکاسو کی شہ[illegible]
تصویر اتر گئی ہے۔ واپس چلے آ رہے ہیں۔ ان کپڑوں میں آپ اپنی محبوبہ سے ملنے جا بھی کیسے سکتے ہیں؟

سردی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ اس موسم میں تو آدمی کو دوپہر اور شام کو گھومنے میں اور رات ہوتے
گھر میں گھس کر لحاف میں دبکنے میں مزا آتا ہے۔ اس موسم کے متعلق جتنا بھی کہا جائے کم ہے۔ شروع میں پڑنے والی سر[illegible]
گلابی سردی کہلاتی ہے۔ کوئی اور موسم ہے جو گلابی کہلاتا ہو؟ صبح کی دھوپ گلابی دھوپ کہلاتی ہے۔ اس گلابی د[illegible]
کے تو مزے ہی نرالے ہیں۔ کسی اور موسم میں آپ نے گھر کے باہر آنگن میں، چھتوں پر چارپائی ڈالے کرسیاں [illegible]
دھوپ سینکتے مفت کا وٹامن "ڈی" حاصل کرتے ہوئے کرکٹ کی کامنٹری سنتے ہوئے، کنٹا کھٹ بنائی کرتی لڑکیاں او[illegible]
شادی شدہ خواتین کو دیکھا ہے؟ اور تو اور دفتروں میں بھی بابو لوگ باہر بیٹھ کر دھوپ سینکتے ہوئے کام کرتے ہیں۔

گرمی کے دنوں میں ہزاروں روپے لگا کر خریدے ہوئے کولر، فرج، پنکھے وغیرہ سردیوں میں بے کار ہو[illegible]
بقیہ سال کو ایک کونے میں رکھ دیا جاتا اور یہ اپنی تقدیر پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے ہیں۔ گرمی کا انتظار کرتے ہیں۔ قدرت
اس موسم کے ساتھ کھلم کھلا طرف داری کرتی ہے۔ ان دنوں دن چھوٹے اور راتیں لمبی ہو جاتی ہیں۔ یہ قدرت کی طرف [illegible]

حسین تحفہ ان مردوں کے لیے جن کی بیویاں پاس ہیں مگر یہی سردی کی راتیں ان لوگوں کے لیے تکلیف دہ ہے جو لوگ کنوارے ہیں۔ یہ لوگ اکیلے گنگناتے رہیں ـــــ "سجنی بن کٹتی نہیں راتیں"

اگر ان لوگوں کے اختیار میں ہو تو سردی کا رومانٹک موسم آنے ہی نہ دیں۔ ان لوگوں سے بھی مجھے پوری ہمدردی ہے۔ دن بھر تو دفتر ہے، گپ شپ، ایک دوسرے پر چھینٹا کشی کرتے، کمنٹری سننے یا چائے پینے میں کٹ جاتا ہے مگر راتیں جلدی نہیں کٹتیں۔ یہ سردی کے موسم کا ہی اثر ہے کہ کنوارے رہنے کا دم بھرنے والا شادی کرنے میں دلچسپی لینے لگتا ہے، خواہ بعد میں پچھتانا پڑے۔ جن کی بیویاں اس موسم میں میکے میں آرام کرتی ہیں۔ انھیں شوہروں کے اکثر تار اور لمبے لمبے محبت نامے ملتے ہیں: "ڈارلنگ تم بن یہ جاڑے کی راتیں اکیلی کاٹے نہیں کٹتیں۔ سردی کا موسم آگیا ہے" اور ہندوستانی شوہر پرست بیوی اپنے شوہر کی حکم عدولی نہیں کرتی۔

یہ موسم دراصل رومانس کا موسم کہلاتا ہے۔ اس موسم میں رومانس تیزی سے پنپتا ہے۔ چھت پر دھوپ سینکتے ہوئے محبوبہ کے دیدار سے نہال ہو جاتے ہیں۔ پرانی محبت کی تجدید بھی اس موسم میں ہوتی ہے۔ دوپہر میں پارک میں محبوبہ کے ساتھ بیٹھ کر مونگ پھلیاں کھاتے ہوئے پیار کی رنگین باتیں کرنا اس موسم میں بڑا دل خوش کن ہوتا ہے۔

اس لیے اس موسم میں غریب بھی پیار کرتا ہوا کھلے عام دکھائی دے جاتا ہے۔ گرمی میں رومانس کرنے کے لیے جیب خالی کرنی پڑتی ہے۔ شام کے وقت پارک میں بھی جایا کرے تو محبوبہ کی خدمت میں آئس کریم یا کولڈ ڈرنک یا شربت پیش کرنا پڑتا ہے۔ خالی محبت کی باتیں کرنا محبوبہ کو ناگوار گزرتا ہے۔ ویسے بھی یہ تہذیب کے خلاف ہے۔ سردی میں پچاس پیسے کی مونگ پھلی ہی کافی ہے۔ دیر تک محبوبہ سے پیار کی باتیں کی جا سکتی ہیں۔

یہ جاڑے کا ہی کمال ہے کہ دبلا پتلا، مریل آدمی بھی اونی کپڑوں کے سبب فلمی ہیرو نظر آنے لگتا ہے۔ کچھ عمر والی عورتیں بھی اس موسم کے کرم سے دور سے پہچاننے میں نہیں آتیں۔ اور منچلوں کی باتیں سن کر اپنے کو جوان سمجھنے لگتی ہیں۔ اس موسم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس موسم میں پھٹے پرانے کپڑے بھی چل جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پھٹی قمیص پر بڑھیا سلا یا نئے ڈیزائن والا سوئٹر ہوتا ہے۔ کالر پھٹا ہونے پر مفلر لپیٹنے سے کام چل جاتا ہے۔ سیدھا سادھا آدمی بھی طرح طرح کے رنگ برنگے کپڑے و ٹوپی پہن کر اس موسم میں مسخرہ نظر آتا ہے۔

بعض پڑھے لکھے لوگ اس موسم سے بے حد خوف زدہ رہتے ہیں۔ جہاں تیز جاڑا پڑا اور بارش ہوئی کہ بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ان دنوں زکام میں مبتلا لوگ بار بار جیب سے رومال نکال کر ناک رگڑتے ہیں اور کھانسی سے حیران لوگ "کھوں کھوں" کر کھانستے ہیں تو دیکھنے سننے میں لطف آتا ہے حالانکہ ان سے بچا کوئی بھی نہیں ہے۔ بچے نانی، دادی یا ماں سے آگ کے کنارے بیٹھ کر یا لحاف میں دبک کر پریوں اور بادشاہوں کی کہانیاں بھی انہیں دلکش پاتے ہیں۔

ان دنوں سہارا چائے کی قدر اور بڑھ جاتی ہے۔ صبح بستر چھوڑنے سے پہلے رات میں لحاف میں گھسنے تک چائے کا دور گھر اور باہر چلتا رہتا ہے۔ کچھ آدمی تو اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور وہ دختر رز سے گرمی اور سکون حاصل کرتے ہیں۔ اخلاقیات کے مبلغ بھی سمگلنگ کے ذریعہ حاصل کردہ بوتل کو لے کر چپ چاپ کمرہ بند کر کے پیتے اتفاقاً

کی کینچلی اتار پھینکتے ہیں۔

یہ موسم ہاتھ پیر پھٹنے اور جیب خالی ہونے کا بھی موسم ہوتا ہے۔ صنفِ نازک کے ہاتھ پیر اور منھ اس موسم میں ملائم اور چکنے بنے رہیں اس غرض سے کریم کی مانگ میں تیزی آجاتی ہے۔ چھٹیوں میں دوپہر کے وقت بازار میں بھیڑ بڑھ جاتی ہے۔ کون کہتا ہے کہ گرانی بڑھ گئی ہے؟ اگر گرانی بڑھی ہے تو بازار میں ایسی بھیڑ کیوں دکھائی دیتی ہے؟ دکانیں گاہکوں سے کیوں بھری پڑی ہیں؟ رسیٹورنٹ بڑا ہو یا چھوٹا کیوں بھرا ہوا ملتا ہے؟ کیوں سینما گھر کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں؟

ایسے میں بھی بازار میں اکیلے پن کی تلاش میں بھٹکنے والے پینٹ کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے گلے میں مفلر لپیٹے، گلے کو صاف کرنے والی گولیاں چوستے سڑکوں پر گھومتے ملتے ہیں۔

سردی لگ جانے کے خوف سے رات کو دیر گئے گھر لوٹنے کے لیے بدنام شوہر اندھیرا ہوتے ہی گھر میں بیوی کے پاس آجاتے ہیں۔ سارا شہر ساڑھے آٹھ بجنے کے بعد ویران نظر آنے لگتا ہے۔ سینما ہال میں بھیڑ چھٹنے لگتی ہے۔

ان دنوں محبوبائیں بھی اپنے عاشقوں کو دوپہر کا ہی وقت ملنے کے لیے دیتی ہیں، رات کا نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سردی سے پریشان بوڑھا باپ کھانستا رہتا ہے۔

اگر ایسی پریشانی نہ ہوتی تو ہمارے عزیز دوست اپنی ہونے والی بیوی کو دوا دیتے دیتے پریشان کیوں ہو جاتے؟ کھانسی ٹھیک ہو تو محبوبہ سے ملاقات کا موقع ملے۔ شادی کے بعد تو ملے گا ہی لیکن رومان کا لطف تو شادی کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اور محبوبہ کے نزلے کی وجہ سردی رہتے ان کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے۔

نہانا کم ہو جاتا ہے یہ اس موسم کی خصوصیت ہے۔ آدمی پانی کے لمس سے ہی ڈرتا ہے پھر نہانا تو بڑے ہی دل گردے والے کا کام ہے۔ اسی لیے اس موسم میں پانی کا بل برائے نام آتا ہے۔ اگر آدمی کا بس چلے تو وہ پورے موسم بھی پانی کو نہ چھوئے۔ بھلا ہو ہندوستانی عورتوں کا جو نہانے کے لیے اپنے شوہروں کو مجبور کر دیتی ہیں۔ بھلے ہی گرم پانی سے نہائے۔ روزانہ صبح سویرے نہانے میں مشہور ہمارے دوست بھی کبھی کبھی نہانا گول کر جاتے ہیں۔

یہ موسم ادیبوں کے لیے بہت کم حوصلہ افزا ہوتا ہے۔ ادیبوں کی اکثریت نوکری والی ہے۔ ادب کے سہارے رہیں تو فاقہ کرنا پڑے۔ ہفتہ میں ایک دن ملتا ہے اتوار۔ اس دن بیوی اور بچوں کے درمیان وقت نہیں ملتا اور دن ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے تیسے بہانہ بنا کر گھر سے نکلے بھی تو ان کی محبوبہ گھر کے کاموں سے فرصت پاکر ہی وقت پر آجائے گی۔ اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ رات کو ملنا تو ویسے فی صد غیر ممکن ہے۔ جب محبوبہ نہیں مل پاتی لکھنے کے لیے ترغیب نہیں ملتی۔ بیوی سے ملنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

اس کے سامنے گھر گرہستی ہے، بچے ہیں۔ انھیں دیکھ پانچ سطر لکھنے کی ترغیب ملے۔ اسی لیے سب ادیب ایک عدد محبوبہ (خیالی ہی سہی) دل میں بسائے پائے جاتے ہیں۔ نواب شرویب کا سہارا لینے والے ایک پیگ پی کر اس موسم میں بھی افسانے اور مضامین کی تخلیق کرتے ہیں۔ دوسرا پیگ چڑھانے پر اپنی تخلیق بغیر کسی جھجک کے شائع نظر آنے لگتی ہے۔

بیویوں کے لیے یہ موسم بطور خاص تکلیف دہ ہے۔ انھیں اپنے شوہروں کی اچھی خاصی خدمت کرنی پڑتی ہے اور ضرورت سے زیادہ بیوی کا پیار پاکر شوہر بور ہونے لگتا ہے۔!

○○

انصاری اصغر جمیل،
(ناگپور)

بانگی شاعر ــــ
ناظم انصاری

آپ ناگ پور کے سنتروں کی کھٹ مٹھی لذّت سے تو واقف ہی ہوں گے اور ہندوستانی پھلوں میں اس کی اہمیت سے بھی۔ ٹھیک یہی مقام ناظم انصاری کو بھی ہندوستان کے ہزل گو شعراء میں حاصل ہے۔ اگر یقین نہ ہو تو چکھ کر دیکھ لیجئے ؎

کشتی کے بادباں یاد آ گئے مجھے
بیگم تمھاری نو گزی شلوار دیکھ کر

ـــــ

سر انجمن کس نے چھیڑا غانی
ہوئے جا رہے ہو تم پانی پانی

ـــــ

لیڈری اپنی کھپا لوں گا کہیں بھی لیکن
شاعری کس کو سناؤں گا ڈیڈی تیرے بعد

ناظم انصاری صاحب میرے حقیقی چچا ہیں (جملہ حقوق محفوظ) ہندوستان کے دل یعنی ناگ پور شہر کے محلہ مومن پورہ میں ایک مسلم قبرستان واقع ہے۔ قبرستان سے کچھ ہی دور چل کر آپ کو بائیں ہاتھ پر ایک بورڈ نظر آئے گا۔ جس پر "پناہ گاہ" تحریر ہے۔ آپ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں اس پناہ گاہ میں آپ کو جیتے جی پناہ نہیں مل سکتی۔ البتہ مرنے کے بعد کچھ فیصد چانس ضرور ہے۔ جو شخص اپنی زندگی میں ناظم چچا سے مل نہیں پاتا، مرنے کے بعد ان کے درشن ضرور کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ چچا نے اس جگہ رہائش اختیار کی ہے۔

ناظم چچا کا پورا نام محمد نظام الدین ہے لیکن انہوں نے والدین کے رکھے ہوئے نام سے بغاوت کرکے اپنے نام کا پوسٹ مارٹم کر ڈالا اور ناظم انصاری کے نام سے مشہور ہوئے۔ ناظم پیدا کب ہوئے۔ یہ کوئی نہیں جانتا سوائے ان کے والدین کے اور وہ اب اس دنیا میں نہیں۔ رہ گیا میں، تو میں نے کبھی ان سے یہ سوال پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کی۔ عورتوں کی طرح یہ بھی اپنی عمر چھپائے پھرتے ہیں۔ اور بڑھتی ہوئی عمر کو چھپانے کے لیے خضاب کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے شاعری کب اور کیسے شروع کی یہ تو میں نہیں جانتا کیونکہ یہ مجھ سے پہلے پیدا ہوئے ہیں اور میں ان کے بعد جب میں نے ہوش سنبھالا تو انہیں اس کا مرتکب پایا۔

ناظم چچا دراز قد ہیں۔ رعب دار چہرے پر ایک عدد داڑھی جو دن بدن چھوٹی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ سفیدی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔ سامنے کے دو ٹوٹے ہوئے دانتوں نے ان کی شخصیت کو پرکشش بنا دیا ہے۔ عام انسان کی طرح خدا نے انہیں بھی دو ہاتھ اور دو پیر عطا کیے ہیں۔ دیکھنے کے لیے آنکھ، سننے کے لیے کان اور کھانے کے لیے منہ بھی ان کے پاس ہے لیکن یہ اپنے منہ کو کھانے کے لیے کم اور اشعار کے اخراج کے لیے زیادہ استعمال کرتے ہیں اس طرح چچا جان سننے کے علاوہ دیکھنے کی چیز بھی ہیں۔ یہ صورت سے جھاڑ پھونک کرنے والے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا اپنی شخصیت سے متاثر ہو کر ہی انھوں نے یہ شعر کہا ہے ؎

بھوت ہو، جن ہو، پری ہو یا ہو کوئی آسیب
لے کے چلیے مجھے، میں نقشِ سلیمانی ہوں

لیکن چچا جان کیا ہیں؟ خود ان ہی کی زبانی سن لیجیے ؎

خدا کے فضل سے عاشق مزاج ہوں میں بھی
یہ اور بات ہے مُلّا دکھائی دیتا ہوں

یا یہ قطعہ ؎

بے جھجک تھا جب تو وہ کہتے تھے دیوانہ مجھے
اب جھجکتا ہوں تو فرماتے ہیں مولانا مجھے
ان کو اپنی بے وقوفی کا ہوا احساس کب
جب پولس والے پکڑ کر لے چلے تھانہ مجھے

اس سلسلے میں یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

آگے نکل گیا ہوں میں حدِ شباب سے
ڈیڈی سمجھ رہے ہیں ابھی چھوکرا مجھے

یہ آہیں کچھ اس طرح بھرتے ہیں ؎

بالغ ہوا ہوں صوفی و علماء کی گیگ میں
یہ ٹھنڈی ٹھنڈی رات لیے باپ کیا کروں

یا یہ شعر ؎

کہیں لوہے سے لوہا ٹکرا نہ جائے
ادھر بھی جوانی ادھر بھی جوانی

ناظم چچا کی ان حرکتوں کو دیکھتے ہوئے دادا جان مرحوم نے ان کی شادی کرنے کی ٹھانی۔ اپنی شادی کی خبر سن کر بھی انہیں شرم نہیں آئی اور والد محترم سے یوں مخاطب ہوئے

ابّی بہو تو لا دو مگر یہ رہے خیال
بیوی ملے، ملے نہ کوئی شاعرہ مجھے

دادا جان مرحوم نے یہ خبر سن کر انہیں آنکھیں دکھائیں۔ لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور دادا جان سے یوں مخاطب ہوئے۔

ابھی تو میں نے محبت کی ابتدا کی ہے
ابھی سے الّو کا پٹھا دکھائی دیتا ہوں

شادی کے بعد انھوں نے چچی جان کو تختۂ مشق بنایا۔ ایک مرتبہ چچی جان نے دبی دبی زبان میں ان کی شاعری سے متعلق کہا تو انھوں نے پلٹ کر کہہ دیا ؎

تم اپنے باپ سے پٹوا دیا کرو انکل سے
ہم اہلِ عشق کو عادت ہے مار کھانے کی

ناظم چچا شاعری میں کافی ایمان دار ہیں۔ اشعار کے ساتھ پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ عام فہم میں شاعری کرتے ہیں۔ اُردو ساتھ ہی ساتھ انگریزی، ہندی و مراٹھی کے الفاظ بھی ان کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ جنہیں تعلیم یافتہ طبقہ کے ساتھ ان پڑھ طبقہ بھی بہ آسانی سمجھ سکتا ہے بلکہ بھی ان اشعار سے اتنے ہی محظوظ ہوتے ہیں جتنے کہ ہو تے ہے۔ غزل ہو، گیت ہو یا نظم بے ترنم سے پڑھتے ہیں۔ اور وہ بھی کام چلاؤ ترنم نہیں بلکہ ایسا ترنم جو سکۂ رائج الوقت کی طرح چلتا ہے۔ ناظم چچا بہت ہی کم عرصے میں نہ صرف ناگ پور بلکہ سارے ہندوستان میں مشہور ہو گئے ہیں۔ اور یہاں تک کہ ایشائی مشاعرہ بھی لوٹ چکے ہیں۔ اس کے برعکس چچا جان شاعری کے سلسلہ میں تاجرانہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ جس کا شکار میں بھی ہو چکا ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں ناگپور مہاودیالیہ اسٹوڈنٹس یونین کا سکریٹری تھا۔ عیدملن کے سلسلہ میں یونین کی جانب سے ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا اور صدارت کے فرائض چچا جان کے ذمہ سونپے گئے جسے انھوں نے بادلِ ناخواستہ منظور کر لیا۔ لیکن افسوس کہ مشاعرہ کے وقت چچا جان کا نیچے نہیں پہنچے۔ میں گاڑی لے کر گھر بھاگا تو چچی جان نے بتایا کہ وہ کہیں باہر مشاعرہ میں گئے ہوئے ہیں۔ دوسرے دن پتہ چلا کہ چچا جان نے وہ مشاعرہ اس لیے منظور کیا تھا کہ انہیں وہاں سے روپے ملے تھے جب کہ میں انہیں کچھ بھی نہ دیتا۔ دوسرے سال جب میں بزمِ ادبیات اُردو کا سکریٹری تھا ہم جوہر کے سلسلہ میں پھر ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف شعرا شریک ہوئے تھے۔ ناظم چچا اس میں شرکت فرمانے کے لیے مجھ سے مبلغ ایک سو روپیہ سکۂ رائج الوقت وصول کیے۔

میری چچی نہایت ہی شریف خاتون ہیں۔ مگر اب ایسی بھی نہیں کہ چچا جان کی شاعری کو مستقل طور پر برداشت کر لیتیں۔ لہٰذا اس گھر میں روزانہ خانہ جنگی کا چھڑا رہنا ناگزیر تھا مگر ایسا نہیں ہوا جس کی وجہ یہ ہے کہ چچی جان بے چاری

شاعری سمجھتی ہی نہیں اور یہی چچا جان کی زندگی کی سب سے بڑی خوش نصیبی ہے لہٰذا وہ بے تحاشہ اشعار پر اشعار کہے چلے جا رہے ہیں۔ چچی جان کی غیر شاعرانہ طبیعت کا اعتراف کرتے ہوئے انہوں نے اس طرح اظہار مسرت کیا ہے ؎

چولھا نہ جلتا وقت پہ شعروں کی فکر میں
بیگم کا شکر ہے تو شاعرہ نہیں

ویسے چچی جان دیگر خواتین کے برعکس اپنے شوہر نامدار کا بہت ہی زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ لیکن ناظم چچا انہیں بخشتے ہی نہیں اور دنیا سے یہ کہتے پھرتے ہیں ؎

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں

صرف یہی نہیں بلکہ ڈھنڈورا بھی اس طرح پیٹتے ہیں ؎

اس لباس پہ بیگم سے ہو گئی ان بن
جس لباس میں چھیلا دکھائی دیتا ہوں

میں یہ بات یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ چچی جان نے کبھی کوئی فرمائش ناظم چچا سے کی ہی نہیں اور نہ ہی کبھی ان کے چھیلے پن پر نکتہ چینی کی۔ ناظم چچا کی شاعری میں تفریح کے ساتھ ہی ساتھ کچھ بامقصد اشعار بھی نکل آتے ہیں عریانیت کے سلسلے میں یہ شعر دیکھیے ؎

ننگ تہذیب میں داخل تھا کبھی اے ناظم
آج فیشن میں گنا جاتا ہے عریاں ہونا

میک اپ سے متعلق فرما رہے ہیں ؎

تم ذرا قریب آؤ، میں کھرچ کے تو دیکھوں
حسن ہے بھی اور یہ تیل یا حضور پالش ہے

چست کپڑوں کی ستائش میں خواتین سے اس طرح ہم کلام ہیں ؎

یہ جامہ زیبی تمہاری ارے معاذ اللہ
تمہارا جسم تو لکیر دکھائی دیتا ہے

اور کبھی کبھی تو ان کا انداز تخاطب یوں بھی ہوتا ہے ؎

چھوڑ دو یہ پینٹ وا، میری محترم اہلیہ!
حکم یہ نہیں میرا، یہ مری گذارش ہے

ناظم چچا آج عمر کی اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں دنیا کی رنگینیاں ان کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ یہ کئی بچوں کے والد ماجد ہی نہیں بلکہ دادا میاں، نانا جان بھی کہلاتے ہیں۔ لیکن اس طرح کے اشعار کہنے سے باز نہیں آتے ؎

مرے بڑھاپے میں پھر سے بہار لانے کو
سنا ہے ایک بڑی بی حری تلاش میں ہے

اس میں قصور ان کا نہیں بلکہ آج کے دور کا ہے۔ نوتے سال کے جوان جب سترہ سالہ حسینہ سے شادی کر سکتے ہیں تو یہ بچا تو ابھی عمر میں ان سے کافی پیچھے ہیں۔ پھر بھی نوسے سالہ جوان اور سترہ سالہ حسینہ کے تعلق سے صرف اتنا ہی کہنے اکتفا کرتے ہیں ؎

اگر ہو جیب میں نقدی تو حسن والوں کو
بڑے میاں بھی کنوارے دکھائی دیتے ہیں

بچا جان کے اشعار سن کر سامعین مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ لیکن نہ جانے یہ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ ان کے لبوں کو ہلکی سی جنبش بھی نہیں ہوتی۔ یہ دوسروں کو کم اور خود کو زیادہ نشانہ بناتے ہیں ؎

ملے گا پدم شری کا خطاب ناظم کو
یہ اسے گریڈ کا جوکر دکھائی دیتا ہے

اور ؎

اس نے یہ کہہ کے ملنے سے کر دیا انکار
ناظم ہے وا ہیات اسے باپ کیا کروں

لیکن پھر یہ کہہ کر خود کو مطمئن کر لیتے ہیں ؎

کسی کے باپ سے کیا لینا دینا ہے ناظم
میں اپنے باپ کو اچھا دکھائی دیتا ہوں

کہتے ہیں کہ مندا ادب نواز نہیں ہوا کرتے۔ وہ مشاعرہ میں صرف کچھ وقت کے لیے آتے ہیں اور اپنی نمائش کر کے لوٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کا طنز دیکھئے ؎

سنائے جاؤ لگاتار تم غزل پہ غزل
ادب نواز منسٹر دکھائی دیتا ہے!

بیگم صاحبہ کی تعریف میں فرماتے ہیں ؎

میری اتی کی بہو اسے مرے منے کی ماں
تو مری صبح بنارس تو مری شام اودھ
موڈ میں آکے پکا دیتی ہے جب تو کھچڑی
ہو کے رہ جاتی ہے بریانی کی ایسی تیسی
میرے اللہ نے بخشا ہے تجھے ایسا ہنر
مرے منے کی ماں

اس بزم میں ایک شاعرانہ گذارش کچھ اس طرح ہے ؎

کب یہ کہتا ہوں کہ کرسیٔ صدارت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

سینکڑوں میل کی دوری پہ ہے میرا گاؤں
چل کے آیا ہوں بہ مشکل یہاں پاؤں پاؤں
دھوپ ہی دھوپ ملی ہے ذرا کر دو چھاؤں

جیب خالی ہے مگر پھر بھی نہ اجرت دیجیے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجیے

آج کل اُردو ادب وہ نہیں رہا جس کی کشش سے ادب نواز شخصیتیں اس کی محفل میں شریک ہوا کرتی تھیں۔ آج ایک جاہل صاحبِ زر سیاسی و مذہبی جلسوں کے ساتھ ساتھ ادبی جلسوں کی صدارت بھی کیا کرتے ہیں۔ چچا جان سے یہ دیکھا نہیں جاتا اور کہہ اٹھتے ہیں ؎

شاعر ہیں انگوٹھا چھاپ نہیں پھر کس لیے کٹی کاٹیں
جب کلن و چمن جیسے بھی جلسے کی صدارت کر بیٹھے

شاعری سے قطع نظر ناظم چچا دوسرے میدان میں بھی موجود نظر آئیں گے۔ ایک خوش گلو مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بہت اچھے مؤذن بھی ہیں۔ ان کا اذان دینے کا اپنا الگ انداز ہے۔ اذان دینے کی ادا اتنی پیاری ہے کہ زندے تو کیا مردے بھی قبرستان سے اُٹھ کر ان کی آواز پر نماز ادا کرنے مسجد امان اللہ سیٹھ میں چلے آئیں۔ کسی زندہ دل نے ناظم چچا کی اذان سے متاثر ہو کر مرزا غالب کی روح کو جس طرح سکون پہنچایا ہے اسے آپ بھی سماعت فرما کر ایصال ثواب میں شریک ہو لیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں مؤذن بہت اچھے
کہتے ہیں کہ ناظم کا ہے اندازِ اذاں اور

شاعر اور مؤذن کے علاوہ یہ فٹ بال اور بیڈمنٹن کے بہت اچھے کھلاڑی بھی ہیں۔ پیروں کے ذریعہ فٹ بال اور ہاتھوں کے ذریعہ بیڈمنٹن کھیلتے ہیں۔ ملک کے کئی مشہور فٹ بال ٹورنامنٹ کھیل چکے ہیں۔ اور اپنا لوہا منوا لیا ہے۔ گراؤنڈ میں نیکر پہنے ہوئے ان کی شخصیت بڑی پیاری لگتی ہے اور بچے انہیں دیکھ کر بے ساختہ سیٹیاں بجاتے ہیں اور محظوظ ہوتے ہیں۔ ان کے بیڈمنٹن کھیلنے کا انداز بھی بہت پیارا ہے۔ گراؤنڈ میں بیڈمنٹن ریکٹ لیے یہ کھڑے نظر آتے ہیں تو بے اختیار لگتا ہے کہ میدان جنگ کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر چچا جان بھی ناظم انصاری کی بجائے شمشیر بکف ٹیپو سلطان نظر آتے ہیں۔

میرے چچا کے جسم میں اچھی عادتوں کے ساتھ ساتھ دوسری عادتیں نہ جانے کس راستے سے داخل ہو گئی ہیں اور وہ ہیں ان کی چائے پینے اور پان کھانے کی عادتیں۔ پان کثرت سے کھاتے ہیں اور ہر پندرہ منٹ میں چائے کا کپ خالی کرتے ہیں۔ بالاتفاق آپ نے جلسے میں ان کی ضیافت کی ذمہ داری لی تو میری یہ گذارش ہے کہ انہیں چائے پان ضرور دیجیے کھانا دیا یا

نہ دینا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ کچھ نہ کہیں گے کیوں کہ ناظم چچا اس معاملہ میں اللہ میاں کی گائے ہیں لیکن دسترخوان پر چائے پان نہ ہو تو یہ چیخ اٹھیں گے۔ یہ کہتے ہوئے ؎

ہے جیب خالی تو کیا پھر بھی ان باقی ہے
ضیافتوں کے لیے چائے پان باقی ہے

اپنی پان نوشی سے متعلق فرماتے ہیں ؎

ایک دو بیڑوں سے ہوگا کیا مرا
پان کھاتے ہیں چھپن بھوں میں

غرض کہ ناظم چچا ایک آل راؤنڈر انسان ہیں اور ہر میدان میں مقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ اپنے اس شعر پر عمل پیرا ہیں ؎

فیلڈ ہو کوئی کلا اپنا جمائے رکھیے
ٹانگ ٹوٹی ہی سہی پھر بھی اٹھائے رکھیے

ناظم چچا کے کلام کا مجموعہ "گوبھی کا پھول" حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

...ی کی کھال (تبصرہ)

...کتابیات: (جلد اول) ۱۹۷۶ء
...: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مظفر حنفی
...: ترقی اردو بیورو نئی دہلی
...: ۱۷ روپیہ

...اردو میں کتابیات" کے کام کو جس منظم انداز میں ڈاکٹر
...چند نارنگ نے شروع کیا ہے، اس سے یہ امید بندھتی
...ہے کم از کم دس بیس سال بعد یہ روایت اس قدر مضبوط ہو
...گی کہ مستقبل کے ریسرچ اسکالروں کو اندھیرے میں
...ہاتھ پیر مارنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔
پچھلے ستر بہتر برسوں میں کتابیات کے کام کی اہمیت
...کا اندازہ کیا جاتا رہا۔ محدود پیمانے پر یہ کام بھی ہوا۔ ملک
...کی لائبریریوں کی فہرست مطبوعات تیار ہوئیں۔ لیکن
...موضوع سے انصاف نہ ہو سکا۔ اب ڈاکٹر نارنگ نے
...اہتمام کے ساتھ یہ کام شروع کیا ہے۔ اس سے بڑی
...توقعات وابستہ ہو جاتی ہیں۔ تاہم فہرست کی تیاری کے
...میں وسعت پیدا کرنے کی ضرورت ہے یہ کام بے سر و سامانی
...کی حالت میں قطعاً انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اپنی اور احباب
...کی معلومات اور تعاون کے ذریعہ سال بھر کی مکمل فہرست
...مرتب کرنا از حد دشوار ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ ترقی اردو
...بیورو کی ایک لائبریری تشکیل دی جائے۔ بورڈ باضابطہ ہر
...کتاب کے ایک یا دو نسخے خریدنے کا کام شروع کر دے
...اس کام کے لیے کوئی زیادہ سرمایہ درکار نہ ہوگا۔ البتہ
لائبریری کے لیے جگہ فراہم کر لینی ہوگی۔ ملک میں چھپنے والی تمام
تازہ مطبوعات کے ایک یا دو نسخے خرید لیے جائیں تو مرتبین
اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ اپنا کام کر سکیں گے ایک اچھی لائبریری بھی
بن جائے گی۔ مرتبین نے اپنے مقدمہ میں ۱۹۷۶ء کی فہرست مطبوعات
کی روشنی میں اردو کتابوں پر سرسری لیکن دلچسپ تبصرہ
بھی کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تبصرہ مطبوعات میں دی گئی تفصیلات
پر مبنی ہے۔ ہمارے ادیب اور شاعر اداروں کے نام سے خود
کتابیں چھاپ لیتے ہیں۔ تعداد اشاعت بھی عام طور پر صحیح
نہیں دی جاتی۔ مرتبین نے ۷۶ء کی مطبوعات میں جس کے بارے
میں اندازہ لگایا ہے کہ جزوی مالی امداد سے
شائع ہوئیں۔ یہ تعداد بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ کتابیں چاہے
مصنف خود چھاپے یا کسی ادارہ کا نام ہو۔ اکثر اکیڈمیوں اور
انجمنوں کی امداد سے شائع ہو رہی ہیں۔ بعض کتابوں پر واضح
جزوی امداد کا اندراج ہوتا ہے بعض مصنفین اپنے پیش لفظ
میں اس کا ذکر کرتے ہیں اور بعض بخل سے کام لیتے ہیں۔
وضاحتی کتابیات ۱۹۷۶ء ترقی اردو بورڈ کے معیار
کے مطابق اچھی چھپی ہے۔ (مدیر)

ہمارا قدیم سماج

مصنف: سید یحییٰ حسن نقوی
ناشر: ترقی اردو بیورو نئی دہلی
قیمت: ۶ روپے ۵۰ پیسے

ترقی اردو بیورو نے یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں شائع کی تھی
اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے جس میں ہندوستان
کی ابتدائی اور قدیم ترین تہذیبوں سے لیکر مسلمانوں کی آمد تک کے
سماجی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے مختلف جامعات کے
نصاب میں یہ کتاب شریک کی گئی اور بڑی مقبول ہوئی۔
جس کا ثبوت دوسرے ایڈیشن کی طباعت ہے ۲۱۶ صفحات پر
مشتمل اس مفید کتاب کی قیمت اتنی کم رکھی گئی ہے کہ یقین ہی نہیں آتا۔

عمر حنیف (کماٹنڈا)

"ڈاکٹر پریشان" ـــ ڈائی بیٹک (DIABATICS) مریض آنا بند ہو گئے۔ اگر چینی سستی نہ کی گئی تو ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا۔

"آسام کے آفسوں میں پھر سے کام کاج بند" ـــ
ہندوستان ترقی کیسے کرے گا۔

"سنجے گاندھی کی موت پر غنی خان چودھری نے قرآن خوانی کروائی"
ـــ اللہ اس کارِ خیر پر غنی خان چودھری کو جنت نصیب کرے ـــ

"ایرانی حکمران پاگل ہو گئے ہیں" ـــ پاگل تو وہ پہلے تھے۔ لیکن اب یہ پاگل پن انتہا کو پہنچ چکا ہے۔

"پولیس والوں کی تنخواہوں میں اضافہ"
ـــ صرف ایک عید کا کرشمہ

"۱۹۸۲ء میں تیسری عالمی جنگ ہوگی"
ان بے چارے سرکس کے جوکروں کا کیا ہوگا جو ان کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔

"ریل کے حادثوں کو روکنا ہے تو سبھی فاسٹ ٹرینیں بند کی جائیں" ـــ آج کل ریل گاڑیاں ویسے ہی آہستہ لگتی ہیں۔ پھر کس سواری سے سفر کرو گے جارج صاحب۔

"دہلی کے کناٹ پلیس کا سنٹرل پارک ٹریننگ کا اڈہ"
یہاں آر ایس ایس کے سیوک اپنے آدمیوں کو پٹاخے چھوڑنا سکھلا رہے ہیں۔ سرکار نے تو آنکھیں بند کر لی ہیں۔ آپ بھی اس طرف دھیان نہ دیں۔

عورتوں پر ظلم اور زیادتیاں نہیں ہونی چاہئیں"
ـــ صرف عورتیں ستی ہو سکتی ہیں یا اُن سے زبردستی ستی کی رسم ادا کروائی جا سکتی ہے۔

"مسجد سے پندرہ ۱۵ ہزار بم برآمد" ایک حیرت انگیز انکشاف "
"یہ بم نہیں پٹاخے تھے" دوسری خبر
"مسجد سے نہیں متصل مکان سے برآمد" تیسری خبر

"ایک سال کے اندر اندر سرکار بدل جائے گی" مرارجی۔
ـ پیشاب کی ریسرچ کے بعد علم نجوم کی اسٹڈی!!؟

"لفافوں اور ٹکٹوں میں گوند لگا ہوا نہیں ہوتا ـــ
محکمہ ڈاک و تار سے لوگوں کی شکایت"
ـــ سیونگ کا دکیل محکمہ ڈاک و تار گوند بچت" (GUM-SAVINGS) کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔

"لیڈر آج کل خاموش نظر آ رہے ہیں"
ـــ شاید باڑھ کا پانی علاقوں میں آ گیا ہے۔

SHUGOOFA

ol; 13 Copy 11 | 31 Bachelor Quarters, M.J. Market Hyderabad-1 | Nov. 1980 Phone: 57716

When you have problems
looking through your
spectacles for
what you
want to
see

LOOK TOWARDS

OPTICAL CENTRE

PHONE : 42[illegible]

MAHATMA GANDHI ROAD SECUNDERABAD.

DECEMBER 1980

Rs. 2/-

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان
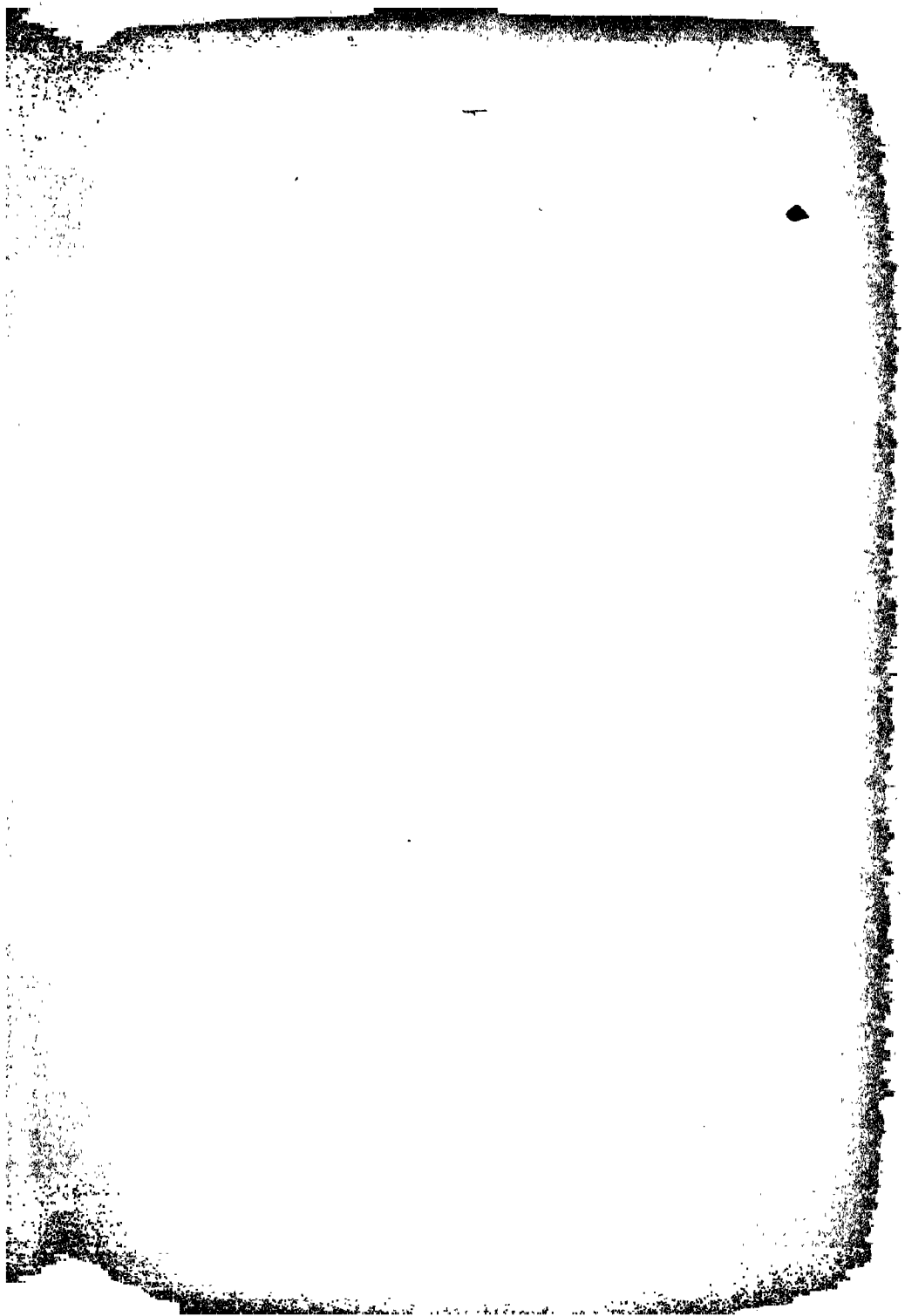
جلد : ۱۳

شمارہ : ۱۲

دسمبر ۱۹۸۰

ایڈیٹر :

سید مصطفیٰ کمال

سالانہ (۲۵) روپے

سالانہ انفرادی (۲۲) روپے

بیرونِ ہند سے (۳۵) شلنگ

فی پرچہ (۲) روپے

طباعت :

نیشنل فائن پرنٹنگ پریس

چارکمان حیدرآباد — ۵۰۰۰۰۲

خط وکتابت کا پتہ : ۳۱ - بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ

حیدرآباد — فون : 57716

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

ادارہ شگوفہ کے توسط سے حسب ذیل مزاحیہ کتابیں حاصل کیجاسکتی ہیں

کیوڑے کا بن	سلیمان خطیب	مجموعۂ کلام	۱۵/- روپے
نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	"	۵/۵۰ "
تیر نیم کش	بھارت چند کھنہ	مضامین	۷/۵۰ "
چھیڑ چھاڑ	پرویز یداللہ مہدی	"	۶/- "
ہمسائے اور ہمسائے	یوسف ناظم	"	۶/- "
فقط	یوسف ناظم	"	۶/- "
گوبھی کے پھول	یوسف ناظم	"	۱۰/- "
تو تو میں میں	پرویز یداللہ مہدی	ڈرامے	۱۰/- "
چوڑی کے غلام	پرویز یداللہ مہدی	مضامین	۷/- "
کیا نام نہ ہوگا	بھارت چند کھنہ	مضامین	۸/- رو
سمن زار	خواجہ عبدالغفور	"	۸/- "
دھر گھسیٹ	سرپٹ حیدرآبادی	مجموعۂ کلام	۸/- "
بہرحال	مجتبیٰ حسین	مضامین	۷/- "
انڈین کاچھ	عاتق شاہ	"	۸/- "
شوشے	ارشد علی خاں	"	۱۰/- "
چوں چوں کا مربہ	پاگل عادل آبادی	مجموعۂ کلام	۶/- "
بھلاویں کے داغ	عظمت بھلاواں	"	۷/- "

○

(بسلسلہ گذشتہ)

کرنل محمد خان

لندن: تجدیدِ ملاقات

اَلحمدُلِلّٰہ یا شیخ الکومب

ہوٹل میں پہنچے تو ہرچند کہ دن بھر کی تکان کے بعد ضرورت آرام کی تھی تاہم ہم نے فی الفور غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور کرنل کومب
کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلی شب ہم ماریہ کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اچانک ٹیلی فون پر طلب کیا گیا
تھا۔ ٹیلی فون پر ہم نے ہیلو کی تو اُدھر سے عربی زبان اور انگریزی لہجے کے ملغوبے میں جواب آیا:

"السلام علیکم یا حبیبی، کیف حالک"

اور ہم سمجھ گئے کہ یہ جان کومب بول رہا ہے کیوں کہ پورے انگلستان میں یہ واحد انگریز دوست تھا جو عربی بھی بولتا
تھا اور ہمیں حبیب بھی سمجھتا تھا۔ ہمیشہ اسی انداز سے ابتدائے گفتگو کرتا تھا۔ ہم نے بھی اشتیاق بھرے لہجے میں وہی جواب
دیا جو دیا کرتے تھے:

"الحمدللہ یا شیخ الکومب۔ انت طیب؟"

اس جواب کے بعد ہماری عربی ختم ہوگئی اور کرنل کومب کی مزید عربی کی روانی بھی رک گئی۔ چنانچہ اس نے انگریزی
انٹا بدلتے ہوئے اپنے مخصوص بے تاب انداز میں خیر و عافیت پوچھی اور کہا:

"کل شام کیا کر رہے ہو؟"

اس وقت ہم ماریہ کی محفل سے عارضی طور پر اُٹھ کر آئے تھے اور فرینڈ نے بھی دخل در معقولات نہیں دیا تھا۔
چنانچہ ایک نشے کے عالم میں کہا:

"جان ـــ یہ تم ماریہ سے پوچھ کر ہی بتا سکتا ہوں۔"

ماریہ کا نام سن کر کرنل کومب کے منہ سے ایک انگریزی جملہ نکلا جس کا پہلا حصہ ناقابلِ تحریر ہے۔ لہٰذا حذف

لیا جاتا ہے۔ باقی جملہ یہ تھا:
"کل شام پانچ بجے تمہیں ہوٹل سے لینے آرہا ہوں۔ تیار رہنا۔"
"لیکن ماریہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟"
کرنل کومب نے ماریہ کے متعلق ایک اور ناگفتنی لیکن بے حد شستہ سا کلمہ دہرایا — عورت کے سامنے انگریز سے زیادہ مؤدب کوئی نہیں اور اس کی غیر حاضری میں انگریز سے بڑھ کر دریدہ دہن بھی کوئی نہیں — آخر میں حکم دیتے ہوئے کہا:
"کل شام پانچ بجے تیار رہنا۔ بالکل تیار۔ بہانہ مافیش۔"
ناچار ہمارے منہ سے نکلا: "نعم یا سیدی!"
اور دل میں سوچا کہ چلو کرنل کومب کی خاطر کل میں ماریہ سے چھٹی لے لیں گے لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے چند ہی لمحوں بعد فرینڈز کی آمد نے ہمیں ماریہ سے چھٹی کی بجائے پنشن دلا دی تھی — مایوسی اور نامرادی کی پنشن جسے حاصل کر کے ہم شب بھر بستر میں سلگتے رہے تھے اور کرنل کومب جیسے عزیز دوست کی متوقع ملاقات کی خوشی بھی ہماری آتشِ ارمان کو فرو نہ کر سکی تھی، دل ہی تو تھا نہ سنگ و خشت ہے۔ لیکن دوسرے دن دیوانوں اور فرزانوں کی رنگا رنگ صحبت تھی ہمیں غمِ ماریہ سے کچھ افاقہ ہو گیا اور پچھلے پہر لوٹے تو جان کومب کی آج شب کی ملاقات ہمیں ایک ہونہار سی تقریب نظر آنے لگی۔

کیا تعزیت میں زوجیت ملائی جا سکتی ہے؟

جان کومب ہمارے پرانے یار تھے اور بڑے رونق آفریں یار۔ آئیے، اُن کا آپ سے تعارف کرائیں: ہم سے ملنے سے پہلے کرنل کومب برطانیہ میں توپیں چلا چکے تھے، سوڈان میں مونگ پھلی بیچ چکے تھے اور ملایا میں تعلیم دے چکے تھے۔ پھر پاکستان میں ایک کیڈٹ کالج کی سربراہی سنبھالی۔ پہلے کالج کی بنیاد رکھی، پھر اس کی آبیاری کی اور آخر اسے پروان چڑھایا۔ متواتر چھ سال اس کے پرنسپل رہے اور متواتر چھ سال ہمارے رفیق رہے۔ ہمارا سرکاری رشتہ یہ تھا کہ وہ کالج کے پرنسپل تھے اور ہم کالج کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن تھے لیکن پہلی ملاقات کے بعد یہ رشتہ فائلوں میں دب گیا اور اس کی جگہ ایک نئے رشتے نے لے لی۔ جس کا ایک سرا جان کومب کے دل میں اور دوسرا ہمارے قلب میں پیوست تھا لیکن اس رشتے کی استواری سراسر جان کے مخلص اور مثبت دل کی وجہ سے تھی۔ ہم ہی نہیں جان کا ہر جاننے والا اپنے دل پر اس دلبر کے خلوص کی گرفت محسوس کرتا تھا۔ چنانچہ یہ کہنا کہ جان بڑے مقبول تھے، جان کی ہر دل عزیزی کی تشنہ سی تعریف ہے۔ جان مقبول نہ تھے، محبوب تھے۔ آپ پاکستان ہی میں تھے کہ انگلستان سے آپ کی بیگم کی موت کی خبر آئی۔ جان ولایت گئے، اور تجہیز و تکفین کے بعد واپس آئے تو کراچی کی کئی فارغ میموں نے تعزیت میں زوجیت کی پیشکش بھی شامل کر دی لیکن جان نے اپنی ہر دلعزیزی کھوئے بغیر صرف تعزیت قبول کی اور دوسری چیز کو ہاتھ تک نہ لگایا یا معمولی چھو کر چھوڑ دیا۔ ہاں صرف ایک خاتون کی کہ پیمائشِ ثلاثہ کے اعتبار سے ناقابلِ انکار سی امیدوار تھیں، جزوی حوصلہ افزائی کی یعنی اسے شرفِ ہمدمی بخشا لیکن اس تعلق کو شادی کے تکلف سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ غالباً یہ مرحومہ کے احترام کا تقاضا تھا اور شاید یہ اسی احترام کا نتیجہ تھی کہ تین سال بعد آخر پاکستان چھوڑ کر ولایت گئے تو تنہا گئے مگر اپنی پس ماندہ کا دل برا نہ ہونے دیا۔ یعنی اسے ایک نعم البدل ڈھونڈنے کی فراخدلانہ چھٹی دے دی اور یہی رعایت اپنے لئے بھی محفوظ رکھی کہ اس سے فائدہ اٹھانے کے مواقع ولایت میں کہیں زیادہ تھے۔ ایسی خوشگوار جدائیاں اس دنیا میں شاذ ہی واقع ہوتی ہیں لیکن جان کی سدا بہار شخصیت فراق میں بھی وصال کی شیرینی گھول دیتی تھی — سو یہ تھے کرنل جان کومب جن کے انتظار میں ہم نہا دھو کر گرینڈ سٹار ہوٹل ہیلیوپولس کے دروازے پر کھڑے تھے۔

پورے پانچ بجے ہوٹل کی ڈیوڑھی کے سامنے ایک کار رکی اور حسبِ توقع کرنل کو صاحب برآمد ہوئے۔ وہی بھاری بھرکم جثہ، وہی کھرج کی آواز، وہی بے تکلف مسکراہٹ، وہی منہ میں پائپ اور ہاتھ میں تولیہ بعوض رومال کہ جان رومال کی تنگ دامانی سے بیزار تھے ——— ہم سے مصافحہ کے بعد چھوٹتے ہی سوال کیا:

"ہماری ماریہ کہاں ہے؟"

کہا: "ایک تو ماریہ ہماری نہیں۔ دوسرے جس کی ہے اُسے ہی معلوم ہوگا کہاں ہے۔"

"میں سوچ رہا تھا ماریہ کو بھی ساتھ لے چلتے۔"

"جان! بھول جاؤ ماریہ کو۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اُس کا اپنا ذاتی خاوند بھی ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟ اُس کا اپنا خاوند ہے تو ہماری اپنی بیوی بھی ہے۔ مہذب لوگ فیملی سے باہر بھی ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔"

جان اور "اپنی" بیوی ہمیں حیرت ہوئی ——— جان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا:

"کیا کہا، اپنی بیوی؟"

بولا: "تم نے جو کچھ سنا ہے، ٹھیک سنا ہے۔"

"سچ مچ! تمہارا مطلب ہے اصلی بیوی جیسی کہ ہوتی ہے؟"

"بالکل ویسی ہی۔ منکوحہ، جائز اور حلال بیوی۔ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"لیکن اتنا بڑا واقعہ ہو گیا اور دنیا میں کوئی دھماکہ نہیں ہوا، بی بی سی بھی چپ سادھے بیٹھی رہی۔ یہ سب کچھ کب، کہاں اور کیسا ہو گیا؟"

جان آرام سے بولا: "جہاں تک کب کا تعلق ہے، یہ ہو چکی ہے بات پرانی نہ پوچھے جائے وقوعہ وہی ہے جہاں اب جا رہے ہیں۔ باقی رہا کیسے؟ تو یہ سوال پوچھنا شرفا کے بیڈ روم میں جھانکنے کے برابر ہے۔"

ہم نے کہا: "بجا ——— چلو بھابی سے ملاؤ۔"

چلے تو دیکھا کہ اسی سڑک پر جا رہے تھے جو پاگل خانے کو جا رہی تھی یعنی جو آج صبح میں پل کی جولانگاہ رہ چکی تھی اور جس پر موصوف کی معرفت موت سے ہماری سرسری ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے مقابلے میں جان کی کار میں نوائے زندگانی بڑی نرم خیز تھی۔ میٹر کی سوئی احتیاط سے تیس اور پینتیس کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھ رہی تھی گویا مینا خانہ بار دوش ہے کہاں وہ میں پل کی سوئی کی سرمستیاں کہ قیامت ہم رکاب معلوم ہوتی تھی اور پھر سوئی ساٹھ پر ہوتی تو زبان سترہ پر۔ ادھر جان پینتیس میل فی گھنٹہ سے آگے نہ بڑھتے تھے کہ پھر باتیں نہ کر سکتے تھے۔ کہتے تھے: پینتیس سے زیادہ تیز چلانے کے لئے دانت بھینچنے پڑتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں میں پل والی ہنگامہ خیز گڑگڑاہٹ تو نہ تھی لیکن جان کے عربی لطیفوں کی گڑگڑاہٹ ضرور تھی۔

ایشورڈ کے خوبصورت قصبے سے گزر کر ایک خوبصورت ترگاؤں سیمیضہ میں پہنچے تو جان نے ایک کھلے باغیچے میں داخل ہو کر ایک چھوٹے سے پیارے سے بنگلے کے سامنے کار روکی۔ بولا:

"یہ ہے مزیب خانہ پسند ہے؟"

"باہر سے بُرا نہیں۔"

اندر داخل ہوئے تو دیوڑھی میں ایک شفاف اور بجلی سے منور شوکیس میں ایک ضخیم سی کتاب رکھی تھی۔ بڑھ کر دیکھا تو حیران رہ گیا: قرآن مجید تھا! ہمیں متحیر دیکھ کر جان بولا:

"مزیب خانہ باہر سے تو بُرا نہیں اندر سے کیسا ہے؟"

"نور علیٰ نور ہے۔" ہم نے بلا تامل کہا۔

اور قرآن مجید اٹھا کر ہم نے آنکھوں سے لگا لیا۔ ہمیں یاد آیا کہ پشاور کالج کی دعائیہ صبحگاہی کے دوران تلاوتِ قرآن کے بعد بحور کی آیاتِ کریمہ کا ترجمہ سنایا جاتا تھا تو یہ فرض جان کومب بحیثیت پرنسپل خود ہی انجام دیتے تھے۔ بلکہ معلوم ہوا کہ یہ وہی پشاور والا نسخہ پاک ہے جسے جان ساتھ لے آئے تھے اور اب اسے قیمتی متاع سمجھتے تھے۔

خبردار! اس تعارف میں جان کا خطرہ ہے

ابھی ڈیوڑھی ہی میں کھڑے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کی سادہ اور ستونتی سی خاتون درونِ خانہ سے نکلی۔ جان نے اسے دیکھتے ہی کہا:

ڈارلنگ۔ یہ ہے میرا دوست خان، لیکن اسے شدید سا شبہ ہے کہ تم واقعی میری جائز اور منکوحہ بیوی ہو۔"

مرد قارئین، براہِ کرم بتائیں کہ کبھی آپ کے کسی دوست نے اس انداز سے اپنی بیوی سے تعارف کرایا ہے؟ اگر جواب ہاں میں ہے تو ذرا اس آنے کا نام بھی بتا دیں جس کے ساتھ محترمہ نے آپ کا خیر مقدم کیا: طمانچہ؟ کفگیر؟ یا پوش وغیرہ، وغیرہ، خوش قسمتی سے ہماری میزبانہ کے ہاتھ میں تو کچھ نہ تھا لیکن اس کے ناخنوں کی تیزی کے متعلق کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ چنانچہ بظاہر تو ہم نے جھک کر ایک خاموش اور خوشامدانہ سلام کیا مگر بباطن ایک مضبوط دفاعی پوزیشن لے کر آنے والے وار کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن دیکھا تو وہ دریا دل خاتون لبوں پر تبسم، آنکھوں میں شبنم اور ہاتھوں میں ریشم لیے ہماری طرف بڑھنے لگی۔ پہلے ہم سے ایک مخلصانہ مصافحہ کیا، پھر ہمارا مزاج پوچھا اور آخر میں اپنے خاوند سے مخاطب ہو کر بولی:

"تمہارے ماضی کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ اپنے شکوک میں بالکل حق بجانب ہیں۔"

جان بولے: "گویا میں جو دو سال سے فرمانبرداری سے خاوندی کر رہا ہوں، اس کی اس لئے قدر نہیں کہ زمانہ قبل مسیح میں دانہ گندم کھا لیا تھا (پھر ہم سے مخاطب ہوتے ہوئے) خان، میں ایک مظلوم خاوند کی حیثیت سے تم سے کہ تم بھی ایک خاوند ہو انصاف کا طالب ہوں۔"

ہم نے بعض وجوہات کی بنا پر ثالث بننے سے انکار کر دیا۔ جان نے انصاف کا دروازہ بند دیکھا تو بولا:

"ایلس میں تم سے لڑائی کا حق محفوظ رکھتے ہوئے اس وقت صلح کی درخواست کرتا ہوں کہ چائے کے لئے جان نکل رہی ہے پلیز ڈارلنگ چائے تو پلاؤ۔"

مسز کومب کی مسکراہٹ ذرا اور پھیل گئی۔ جان بھی کچھ اور برخوردار نظر آنے لگے اور اس مکمل امن کی فضا میں ہم بھی ذہنی مورچے سے نکل آئے۔ ظاہر تھا کہ جان کا مقصد اس چھیڑ کو گھر میں بھی جاری رکھنا تھا جو کبھی خوبانی سے گھر کے باہر روا رکھتے تھے۔

مسز کومب نے ہمیں دیوان خانے میں داخل ہونے کا اشارہ کیا اور خود کچن میں چلی گئیں۔ دیوان خانے کے وسط میں چارپائی کے برابر تپائی رکھی تھی جو شیریں و نمکین ماکولات سے پُر تھی۔ صرف چائے آنا باقی تھی۔ ہم یکے بعد دیگرے ماکولات کو ٹھونگنے لگے لیکن کرنل کومب چائے سے پہلے کسی مادی شئے کو چکھنا یا چھونا چائے کی تقدیس پر حملہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ وہ تلملاتے پھرتے رہے لیکن جونہی مسز کومب بھاپ چھوڑتی ہوئی چائے دانی لے کر دروازے سے نمودار ہوئی جان نے مستانہ وار ایک ناقابلِ فہم انگریزی نعرہ بلند کیا اور آنا فانا چائے کی پیالی بنا کر دوسرے لمحے میں غٹ غٹ پی گیا ——— ہمیں محسوس ہوا کہ اگر چائے کے منہ میں زبان ہوتی تو اس بدسلوکی پر احتجاج بلکہ فریاد کرتی۔ ہمارے نزدیک اس رفتار سے چائے پینا چائے کی عصمت دری کرنا ہے ——— تیسرے لمحے جان نے ایک اور پیالی بنائی جو چوتھے لمحے میں چڑھا گئے اور پھر قدرے آسودہ ہو کر اپنا انگریزی نعرہ دہرایا جو اب کے ہماری سمجھ میں آگیا:

IT'S NOT TEA; IT'S NECTAR, NECTAR ......°

معاً ہمیں اپنے گاؤں کا سائیں حبیب یاد آگیا جو تازہ بھنگ کا پیالہ ہاتھ میں تھام کر پینے سے پہلے جھومتا تھا اور پھر لمبی سی
ن نعرہ لگاتا تھا:

"ساوی نہیں، گھاہ اے۔ عاشقاں نوں مباح اے"•

ہم نے نعرہ تو نہ لگایا۔ لیکن چائے کے دو چار گرم اور گداز گھونٹوں کے بعد ہمارے اندر بھی ایک نعرے نے کروٹ
ز ور لی۔ اور سچی بات ہے مسز کومب کی موجودگی مانع تھی ورنہ ہم بھی جان کومب کے مقابلے میں دما دم مست قلندر کی صدا لگاتے۔ بلکہ
نھوڑا سا دھمال کھیل کر قصبہ تہ خاطر سے بھی نجات حاصل کرتے۔ بہر حال اس منصوبے کو تو عمل نہ کر سکے لیکن ہماری نیت کا رخ واضح تھا
رت مسز کومب ہی تھی جو متبسم مگر بے آواز ہونٹوں سے ننھی ننھی چسکیاں لگاتی بیٹھی رہی اور کسی چھوٹے بڑے نعرے کا قصد نہ کیا۔
ور مسز کومب کے لئے یہی مناسب بھی تھا کہ نعرہ زن عورت اذان دینے والی مرغی کی طرح کچھ جچتی بھی نہیں ـــــ اگرچہ یہ بھی
رست ہے کہ کئی سیاسی طبیعت کی خواتین اور مذہبی مزاج کی مرغیاں ہماری پسند کا خیال نہیں رکھتیں ـــــ مسز کومب بڑی شستہ
راق خاتون تھیں اور یہ انہیں کی کوشش تھی کہ ہماری گفتگو کو رندانہ نعروں اور دھمالوں سے نکال کر شریفانہ چال ڈھال
ل سے لے آئی۔

° یہ چائے نہیں نیکٹر ہے نیکٹر یونانی دیوتاؤں کے مشروب کو کہتے ہیں اور پھولوں کے رس کو بھی جس سے شہد بنتا ہے!۔

• بھنگ حرام شئے نہیں کیونکہ یہ فقط گھاس ہے جو عاشقوں کے لئے حلال ہے۔

رضا نقوی واہی

کرپشن

لیلائے کرپشن کہتی ہے اک شعلۂ عالم تاب ہیں ہم اس ملک کے گوشے گوشے میں محبوبۂ شیخ و شاب ہیں ہم
کشمیر سے تا آسام ہیں ہم آسام سے تا پنجاب ہیں ہم

مکھڑوں پہ ہماری لالی ہے آنکھوں میں ہمارا درشن ہے تاریخ کا دامن رنگیں ہے تہذیب کا چہرہ روشن ہے
آزادی کے افسانے کا دل چسپ سنہرا باب ہیں ہم

وہ نیتا ہوں یا سیوک ہوں، وہ چیلے ہوں یا سادھو ہوں وہ پنڈت ہوں یا ملّا ہوں وہ صاحب ہوں یا بابو ہوں
سب جس میں ننگے ہوتے ہیں وہ حوض ہیں وہ تالاب ہیں ہم

ہم کھاد نہ ڈالیں اس میں اگر یہ نخل سیاست پھل نہ سکے ہم اپنی ہوا اس کو جو نہ دیں کاغذ کی یہ نیّا چل نہ سکے
اس ساز میں جنبش ہم سے ہے حق میں اس کے مضراب ہیں ہم

ہے جس کا کنارہ تا بہ عدم ہم ایسی گہری ندی ہیں تنو مکے جس میں کھو جائیں ہم تاڑی کی وہ بلنی ہے
تنو دیگیں جس کو بھر نہ سکیں بریانی کی وہ قاب ہیں ہم

جو زینت ہر دوکاں ہوئے جو رونق ہر بازار ہوئے رشوت کے دھاگے سے جس کے تانے بانے تیار ہوئے
وہ امرت سر کا دوشالہ، وہ کاشی کے کمخواب ہیں ہم

سکھی میں پسیا کیلا ہیں آٹے کے اندر بالو ہیں ہم دودھ میں گندے نالے کے پانی کی بھینی خوشبو ہیں
ہم گھی میں روغن گھاس کے ہیں اور روغن میں تیزاب ہیں ہم

جب چہرہ ہمارا اسکوں کی صورت میں کوئی دکھلاتا ہے فیتے کی آنتیں کھلتی ہیں فائل باہر آ جاتا ہے
الماری کے معدے کے لئے وہ قبض کشا جلاب ہیں ہم

طارق جامی
(سعودی عرب)

ڈارون کو جگ چاہے کچھ کہتا رہے مگر اس کی اس بات میں کچھ شک نہیں کہ انسان اور حیوان میں فرق صرف عقل و تمیز کا ہے۔ ورنہ سب باتیں وہی ہیں۔ اگر دوسرے جانوروں کو بھی حصولِ تعلیم کی سہولت میسر ہوتی اور وہ بھی شہروں میں زندگی بسر کرنے کے اہل ہو سکتے تو کچھ ناممکن نہ تھا کہ وہ بھی ریلیں اور جہاز بنا لیتے۔ اس کے علاوہ اگر ہم سوچیں تو انسان اور حیوان یا اپنی آسانی کے پیشِ نظر انسان اور بندر میں کیا فرق رہ جاتا ہے؟ دو کان، دو آنکھیں، دو بازو انھیں بھی اسی طرح دیے گئے ہیں جس طرح انسان کو اور اگر بندر کو پونچھ لگی ہے تو انسان کے مونچھ۔ اس نکتے پر تو دونوں کی وحدت اور بھی زیادہ مرتکز ہو جاتی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ بغیر مونچھ کے آدمی ایسے ہی ہے جیسے بغیر پونچھ کے بندر۔ جو یقیناً کوئی نارمل بات ہرگز نہیں۔ آپ نے کبھی کوئی بندر بغیر پونچھ کے دیکھا ہے، نہیں! مگر آدمی ضرور دیکھے ہوں گے۔ اور اسی بات سے دونوں کے اعتبار زمین و آسمان کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور یہی وہ مجبوری تھی جس نے ڈارون کو آبا و اجداد کی چھان بین کرنے پر اکسایا تھا۔

مونچھیں مرد کی نشانی ہیں۔ اب یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ بندریاؤں کی پونچھیں کیا ہوئیں کیونکہ عورتوں کے پاس تو اس کا جواب کچھ نہیں۔ میں آپ کے اس سوال پر آپ کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہی کیونکہ آپ جیسے دُم نواز لوگوں کو ایسے اُلٹے سیدھے سوال کرنے کے سوا اور کام ہی کیا ہوتا ہے۔ پتہ نہیں یہ ایک چھوٹی سی بات آپ کے پلّے کیوں نہیں پڑی کہ جو...! عورتیں دو دو چٹیائیں کرتی ہیں۔ اور یہ لمبے لمبے زلف دراز طواف جسم و جاں کو چھوڑے رکھتی ہیں، انہیں آپ کیا کہیں گے۔ اگر بات اب بھی صاف نہیں ہوئی تو مری اس بات کا جواب دیجیے کہ مردوں کو چٹیا گوندھنے سے آپ نے کیوں روک رکھا ہے؟ کیا تم آپ خود چٹیا کیوں نہیں گوندھتے! صرف اسی لیے تاکہ دُم کی جگہ جو مردانگی کا پرچم مونچھوں کے اوپر لہرا رہا ہے، اُسے گردن کے پیچھے

سرنگوں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ عادت بدل کر اپنی اصلی جگہ نہ لوٹ جائے۔ لیکن دوسری طرف اپنی عورتوں کو دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ انہیں تو کچھ نہیں ہوا لیکن خوف ایک جال ہے جب چاہے آدمی کو دبوچ لے۔

دیکھا جائے تو مونچھ کے بنا، مرد کی شان ہی نہیں۔ آج کل کے مونچھ منڈے دیکھ لیں، اگر ذرا بھی بال بڑھے ہوں تو ان میں اور لڑکیوں میں کوئی فرق ہی نظر نہیں آتا۔ بالکل ویسے ہی، جیسے بندروں اور بندریاؤں کو ایک جگہ دیکھ کر کوئی نہیں بتا سکتا کہ ان میں بندر کون کون ہیں اور بندریا کون مگر عورتوں اور مردوں کی پہچان اس کی نسبت آسان ہے اور اس کے لیے صرف ایک ہی ثبوت کافی ہے ——— مونچھیں۔ باقی دل ودماغ کی چھان بین کی تو ضرورت ہی نہیں۔

انسان بہت ترقی کر گیا ہے۔ پہلے تو یہی دیکھ لیں کہ کرسیوں پر بیٹھتے بیٹھتے اس کی پونچھ ہی گھس گئی۔ لیکن پونچھ کے "ہارمونز" نے تو اندر زندہ رہنا تھا اور انہیں کہیں نہ کہیں جسم میں اُگنا بھی تھا۔ داڑھی کی جگہ تو پہلے ہی سے "اکوپائیڈ" تھی۔ بازوں پنڈلیوں، لاتوں، کندھوں، سینے اور پشت کو ویسے ہی قمیص، پتلون، ٹائی اور کوٹ کے نیچے چھپ جانا تھا اور یہ ویسے بھی کچھ اس ڈھب کے لباس ہیں کہ ان میں سے پونچھ جیسی کسی شے کا باہر نکل آنا خاصہ "آکورڈ" معلوم دیتا تھا۔ لہٰذا خاصی جدوجہد کے بعد ان ہارمونز کو ایک ایسی ستھری جگہ ہاتھ لگی جہاں پہلے کچھ بھی نہیں تھا اور مٹی بھی خاصی زرخیز تھی بس ذرا سے نم کی ضرورت تھی سو دیکھتے دیکھتے ہی بڑے بڑے سرداں کے جھنڈوں نے ڈیرہ یہاں ڈال دیا اور پونچھ سے آدمی کو پوری خلاصی مل گئی ورنہ تو اس بڑی شاید ہی دکھ کی بات کوئی اور ہوتی کہ آدمی کو پتلون میں ایک سوراخ پونچھ کے لیے رکھوانا پڑتا۔

پونچھ کے گو آدمی کو فائدے بھی بہت ہوتے تھے مگر پھر بھی سائیکل اور موٹر سائیکل کے پیچھے لمبا سا کیریر اور کسی کام نہ آسکتا تھا۔ کار کی پچھلی نشستوں پر بھی کوئی خاص انتظام کرانا پڑتا اور پیچھے بیٹھنے والوں کو بہت بیزاری کا سامنا ہوا کرتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ فائدہ بھی ضرور تھا کہ حضرت انسان کو ہاتھ منہ کے ساتھ سنگھار کرنے کی ایک جگہ اور مل جاتی میک اپ کا ایک اور موقع ہاتھ آتا اور رنگ برنگی دگوں کے ساتھ ساتھ خوب صورت پونچھیں بھی سجانے کو دستیاب ہوتیں۔ لوگ بازار میں پونچھ میں پونچھ ڈال کر چلتے بلکہ زبان میں محاورے ترقی کرتے کہ لو بھئی آج کل فلاں کی پونچھ فلاں سے بہت اڑی ہوئی ہے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مصافحے اور معانقے جیسے ناقابلِ برداشت مرحلے سے بھی انسان کی جان چھوٹ جاتی۔ ذرا کی ذرا پونچھ سے پونچھ ملالی اور سلام ودعا کے سب درجے پاس کر لیے۔ عید بقر عید کے لیے یہ عمل خوب رہتا۔

گو فوائد کی فہرست خاصی طویل بنائی جا سکتی ہے۔ مگر پھر بھی جو بات مونچھ میں ہے وہ پونچھ میں ہرگز نہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی بندر سے پوچھ کے دیکھ لیں۔ وہ ہمیشہ پونچھوں سے بیزار نظر آئے گا۔ اور اس کے مقابلے میں مونچھوں کو ترجیح دے گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہمارے اداکار اور مشہور شخصیتیں آج مونچھوں سے "پرسنیلٹی" بنانے کے کتنے ہی ڈھنگ جانتی ہیں۔ یہ کام پونچھ سے ہرگز نہیں لیا جا سکتا مثلاً پونچھ کو وہ تاؤ نہیں دیا جا سکتا جو کسی ساگ توڑتی دوشیزہ کو دیکھ کر دیا جا سکتا ہے۔ گو پونچھ سے لٹکے لٹکے کا کرتب دکھایا جا سکتا ہے۔ مگر مونچھ کی ایک نوک ہی اچھے بھلوں کو کنارے کرنے کو کافی ہے۔

دنیا میں زندہ رہنے کے انسانی کمالات اور عزت کی زندگی بسر کرنے کے بے شمار وسیلے ہیں۔ بہادری، شجاعت اور جرأت کی طول طویل داستانوں میں اتنا حصہ چھریوں اور کرپانوں کا نہیں، جتنی اہمیت مونچھ اور ناک کی ہے۔ ناک تو خیر وہ چیز ہے جسے کبھی کچھ نہیں ہو سکتا۔ بس دھوم مچ سکتی ہے کہ فلاں کی ناک کٹ گئی اور اسے بھی زیادہ تر زبان کا استعارہ ہی کہا جا سکتا ہے مگر

مونچھوں کی کھیتی وہ کھیتی ہے۔ جس میں اُگنے والی فصل کبھی کبھی میلوں ٹھیلوں میں کاٹ لی جاتی ہے تو غیرت مند بردباری اور شرم کی کھاد سے اگلے سال پھر تیار کرلاتے ہیں۔ کیا یہ تجربہ صرف ایک بار ہی سہی، کبھی مونچھ پر کیا جا سکتا ہے؟

گاؤں، بستیوں میں آج بھی مونچھ کو تاؤ دینا، مردانگی کا اعلان اور اپنی موجودگی کا اظہار کہلاتا ہے اور جن لوگوں کو مونچھوں کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا وہ لوگ ہمیشہ مونچھیں نیچے کیے رکھتے ہیں اور جنہیں اس کے بیک گراونڈ کا علم ہے کہ یہ مونچھ کا نعم البدل ہے، وہ روزانہ صبح گھر سے نکلنے سے پہلے یہ یقین کرلیتے ہیں کہ آج پھر تو مونچھ نہیں نکل آئی حالانکہ انہیں کرسی پر بیٹھنے کا موقع بھی زیادہ ملتا رہتا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اگر آپ میرا تجزیہ کی آتی پھر رمق بھی موجود ہے تو یہ بات آسانی سے آپکی سمجھ میں آسکے گی۔ مونچھیں انسان کی صلاحیتوں میں ایک تازیانے سے کم قیمت نہیں۔ آج اگر ہم بڑے سائنس دانوں، سیاست دانوں، مفکروں فلاسفروں اور منتخب شاعروں کی تصویروں میں سے مونچھیں نکال باہر کریں تو باقی پیچھے رہتا ہی کچھ نہیں۔

مونچھیں انسانی مزاج کا شناختی کارڈ ہیں۔ جو آدمی جتنی لمبی چوڑی مونچھوں کا مالک ہوگا، اتنا ہی اس کا دل کشادہ اور دماغ فراخ ہوگا۔ مونچھیں جتنی چھوٹی اور باریک ہوں گی، آدمی اتنا ہی کم آمیز، بد دل اور بے مہر ہوگا۔ اسٹالن، لینن مسولینی جیسے شاہی مزاج لوگوں کی تو بات ہی الگ ہے، ہٹلر ہی کو دیکھ لیں کہ اتنی کم مونچھیں ہونے کے باوجود اس کا دل اتنا غنی تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر وہ توپ کا منہ کھول دیتا تھا۔ آج سے چالیس پچاس سال قبل توپ کا منہ کھولنا، دیگ کا منہ کھولنا سمجھا جاتا تھا۔ ہٹلر سے کسی نے پوچھا "تمہاری کامیابی کا راز؟"

"ڈسپلن!" ــــ سوال کرنے والے نے پوچھا "مثلاً کس طرح؟" جواب ملا ادھر آؤ۔ اُسے باہر لے جاکر پریڈ کرنے والے سپاہیوں میں سے سو سپاہیوں کو قطار میں کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ وہ قطار میں آگئے تو حکم دیا' انہیں شوٹ کردو اور اگلے ہی لمحے وہ سو آدمی قطار میں زمین پر پڑے ہٹلر کو دعائیں دے رہے تھے۔ صرف سو گولیاں خرچ ہوئی تھیں اور ڈسپلن کی ایک عمدہ مثال سامنے آگئی۔ ابھی تو اس غریب کو قدرت کی طرف سے مونچھوں کا کوٹہ بھی صحیح طور پر نہیں ملا تھا۔ وگرنہ اس کے کارنامے سکولوں کالجوں کے نصاب میں اس قدر تاخیر سے شامل نہ کیے جاتے۔

جو لوگ فطری بزدلی کے سبب آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں رکھتے، وہ اپنے آپ کو شریف اور پُرامن شہری کہلانا پسند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ یا تو مونچھوں سے ایک دم "فارغ البال" ہوں گے یا پھر اگر ذرہ برابر مونچھ رکھتے بھی ہوں گے تو نہ ہونے کے برابر اور انہیں ویسے بھی مونچھیں نیچے کیے رکھنی پڑتی ہیں جبکہ بڑی اور سیاست دانوں جیسی مکھن کی ٹکیہ سائز مونچھیں رکھنے والے لوگ زندگی میں ہلچل اور گرما گرمی کا باعث ہوتے ہیں۔ فصلیں سروں سے پہلے نہیں اُترنے دیتے یہ لوگ بابر بہ عیش کوشش کی زندہ تفسیر ہوتے ہیں اور آج کا کام کل پر نہیں ٹالتے کیونکہ کل کس نے دیکھا ہے؟ اسی لیے جو کماتے ہیں، دمڑی نہ چھوڑ کفن کے لیے پر عمل کرتے ہیں یا پھر سرکاری اہل کار آکے انہیں خود ہی لے جاتے ہیں۔ اس میں عدالتوں اور وکیلوں کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ فراخ دلی کی مثال اس سے الگ اور کیا ہو سکتی ہے؟

ان کے مقابلے میں مونچھ منڈوں کو آپ نے ہمیشہ مصلحت پسند اور مستقبل اندیش ہی دیکھا ہوگا۔ ہر بات پر آنے والے کل کا حساب کرنا ان کے لیے ضروری رہتا ہے۔ ہر معاملے میں مشورے کرتے پھرتے ہیں اور ہر کام کے آغاز سے پہلے ضمیر سے اجازت لینی لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہنسنے سے پرہیز ہوتا ہے۔ اسی بنا پر دوسروں کی بھلائی سوچتے

ہیں اور ٹھوکریں کھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان لوگوں میں پونچھ کی طرف مراجعت کا رجحان بہت شدید ہوتا ہے اور اگر ان کا تعلق موسیقی سے ہو تو اپنے نام کے ساتھ "پونچھ والے" ضرور لکھتے ہیں۔

پنجابی میں کہتے ہیں "مچھ نئیں تے کچھ نئیں تے مچھ دی بڑی پچھ اے" دیکھا جائے تو اس کے بھی پنجابی گرامر کے حساب سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ مونچھوں کو اونچے بڑ دار لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ مشکل کیا ہے یہ لوگ تھانے دار تحصیل دار اور نمبردار قسم کے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ کچہریوں میں اسی قبیل کے لوگوں کو کرسی ملتی ہے۔ پہلے سے حیدرآباد ہوں یا سانحہ تھانوں میں انہی کی آؤبھگت ہوتی ہے جبکہ مونچھ دشمن عناصر شکل ہی سے کلرک، ٹائپسٹ دکھائی دیتے ہیں کیسی ہی گٹ پٹ انگریزی بول کے دکھادیں، انہیں کوئی گھاس نہیں ڈالتا اوران کے لب و لہجہ میں زور ہوتا ہے اور نہ سمجھ میں آنے میں بات۔ تبھی یہ لوگ مار کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ "مچھ دی وڈی پچھ" کا اصل مطلب یہ ہے کہ جتنی لمبی مونچھ اتنی ہی زیادہ پوچھ (اور اگر پونچھ ہو تو اس پر کسی کے پیر پڑ جانے کا اندیشہ بھی ہے) تو اب آپ بخوبی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ مونچھ کے فوائد زیادہ ہیں یا نقصان؟

—— جبکہ مونچھ کے معنی ہیں مونچھ جمع پونچھ (پوچھ!) ——!! (پنجابی سے ترجمہ)

غوث محی الدین خواہ مخواہ
(بمبئی)

کتب بینی ایک مفید مشغلہ ہے۔ ایک مفکر نے کہا ہے کہ انسان کی بہترین ساتھی کتابیں ہیں۔ اب یہ بات اس مفکر نے تفصیل سے نہیں بتائی کہ کون سی کتابیں انسان کی بہترین رفیق ثابت ہوتی ہیں۔؟ خریدی ہوئی یا مانگی ہوئی۔

موجودہ زمانے میں ایسے کتب بینوں کی تعداد قلیل رہ گئی ہے جو کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ نتیجتاً مانگ کر پڑھنے والوں کی تعداد دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے اور اب نوبت ایں جا رسید کہ وہ جو کسی زمانے میں مانگے کی کتابیں پڑھنا معیوب سمجھتے تھے۔ اب اسی عیب کو فیشن سمجھنے لگے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح ضرورت ایجاد کی ماں ہے اسی طرح مجبوری، بے شرمی کی قریبی نہ سہی تو دور کی رشتہ دار ضرور ہوگی۔

کچھ کتب بین تو قسمیں کھا کھا کر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خرید کر پڑھی ہوئی کتابوں میں وہ لطف نہیں آتا جو مانگ کر پڑھی ہوئی کتابیں مزے دے جاتی ہیں۔

اپنے ایک دوست کے گھر جب میں نے دیکھا کہ ڈھیر ساری کتابیں بے ترتیبی سے ادھر اُدھر پڑی ہیں۔ تو انہیں مشورہ دیا کہ ان کتابوں کو کسی الماری میں قرینے سے کیوں نہیں رکھتے۔ دوست نے جواب دیا۔

"یہ ساری کتابیں جو تم دیکھ رہے ہو دوسروں سے مانگ کر لائی ہوئی ہیں۔ اب تم یہ کہو کہ انہیں قرینے سے رکھنے کے لیے الماری بھی دوسروں سے مانگوں تو لوگ ابھی اتنے فراخ دل کہاں ہوئے ہیں کہ کتابیں بھی دیں اور انہیں رکھنے کے لیے الماری بھی مہیا کریں۔"

دیکھا آپ نے میرے دوست کو دوسروں کی مجبوری کا کتنا خیال ہے!

کتب بینوں کے اس شوق کو محدود بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کا اندازہ آپ میرے ساتھ پیش آئے اس واقعے سے لگائیے:

میں نے اپنی ایک کتاب اپنے دوست کو مطالعے کی غرض سے دی۔ اس دوست نے اپنے کسی دوسرے دوست کو وہ کتاب مستعار دے دی۔ پھر اس دوسرے دوست نے اپنے کسی تیسرے دوست کو۔۔۔ اور یہ سلسلہ یہاں تک چلا کہ بالآخر اپنی ہی کتاب مجھے اپنے دوست در دوست سے مستعار مانگ کر پڑھنی پڑی۔

یہ تو خیر ایسے واقعات ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مستعار دی ہوئی کتاب کبھی نہ کبھی اپنی اصلی حالت اور صورت میں نہ سہی مگر واپس مل ہی جاتی ہے۔

ایک بار یوں ہوا کہ ایک مشہور اور پسندیدہ مصنف کی کتاب جو بازار میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور تھی اس خیال سے خریدی کہ اطمینان سے پڑھیں گے۔ کتاب خرید کر مکان پہنچے تو ایک دوست نے اس کتاب کی ظاہری خوبصورتی کی تعریف کی اور کتاب ہاتھ میں لے کر یوں دیکھنے لگے جیسے اس کی افادیت کا اندازہ اس کے حجم اور وزن سے لگا رہے ہوں۔ پھر وہ کچھ اس انداز سے کتاب مانگ بیٹھے جیسے مجھ پر احسان کر رہے ہوں۔

"تم جانو کہ مجھے اچھی کتابوں کے مطالعے کا کس قدر شوق ہے۔ اور فی زمانہ اچھی کتابیں دور سے دیکھنے اور سونگھنے کو بھی نہیں ملتیں اور جن کے پاس ایسی کتابیں ہیں وہ چاہے خود نہ پڑھیں مگر دوسروں کو بھی پڑھنے کی غرض سے نہیں دیتے اور اپنے سینے سے لگائے رہتے ہیں جیسے بندریا اپنے بچے کو چمٹائے رہتی ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ ہم جیسے باذوق کتب بینوں پر یہ سراسر ظلم ہے یا نہیں؟"

ان صاحب کی باذوقی کا اندازہ تو کچھ ان کی گھٹیا قسم کی مثال سے ہوا جس کے ذریعہ انہوں نے مجھے بندریا سے نسبت دے ڈالی۔ اب گویا یہ طے تھا کہ اگر میں انہیں کتاب نہ دیتا تو خود کو بندریا ثابت کر دیتا (ویسے بندر بھی ناقابل برداشت ہوتا) مجبوراً اس کتاب پر حسرت کی نظر کرتے ہوئے ان کے حوالے کیا۔ ایک ہفتہ بعد میں نے یاد دلایا تو کہنے لگے ۔۔۔

"اب تم سے کیا کہوں! تمہاری وہ کتاب میری بیوی کو اس قدر پسند آگئی کہ اس سے پیشتر کہ میں پڑھتا انہوں نے اپنی سہیلی جمیلہ کو دے دی۔ جمیلہ شاید پڑھ چکی ہوں گی۔ میری بیوی بھی پڑھ لیں تو میں بھی سرسری طور پر پڑھ کر واپس کر دوں گا۔"

میں چپ نہ رہتا تو کیا کرتا۔۔۔؟

کچھ دنوں بعد اخبار میں اسی کتاب پر تنقیدی نظر سے گزری تو یاد آیا کہ اب اس کتاب کو بہرصورت پڑھ لینا چاہیے دوست کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اپنی بیگم صاحبہ کے ہمراہ سینما دیکھنے گئے ہیں۔ دیوان خانے میں ان کے چھوٹے صاحب زادے اسی کتاب کے سرورق کو توڑ مروڑ کر شہنائی بجانے کی مشق کر رہے تھے۔ باقی کتاب کئی حصوں میں تقسیم ہو کر دوسرے بچوں کے ہاتھوں میں تختۂ مشق بنی ہوئی تھی۔ اپنی نئی کتاب کی یہ درگت دیکھ کر خون کھول گیا۔ اپنے دوست کے نام درشت لہجے میں چٹھی لکھی کہ اگر کل تک میری کتاب صحیح اور سالم واپس نہ کی گئی تو۔۔۔!

دوسرے ہی دن میرے دوست گھر آئے اور قبل اس کے کہ میں ان سے اپنی کتاب کے بارے میں دریافت کرتا انہوں نے مجھ ہی سے باز پرس شروع کر دی۔

"یار! چٹھی میں تمہارے طرز تخاطب اور انداز تحریر سے مجھے سخت اذیت پہنچی ہے۔ دو کوڑی کی کتاب کی خاطر کیسے تم برسوں کے یارانے پر پانی پھیرنا چاہتے ہو؟۔۔۔ تو یہ ہی سہی! مجھے تم سے اس قسم کے سلوک کی قطعی توقع نہ تھی۔ یہ پہلی

(تا)ریخ کو تنخواہ ملتے ہی کتاب کی قیمت تمہیں واپس مل جائے گی۔ خدا حافظ۔"
یہ تھے ... کہ وہ میری کتاب کسی صورت سے واپس نہیں کر سکتے۔ اب لے دے کے انھوں نے یہ ... کہ
(پانچ روپ)ے کی کتاب پہ سے دوستی کو قربان کر دیا جائے ... اور اس طرح میں اپنے دوست اور پسندیدہ کتاب ... دونوں سے
(محر)وم ہو گیا۔

اب پھر اس مفکر کا قول یاد آتا ہے جو میرے خیال میں یوں ہونا چاہیے کہ "کتابیں انسان کی بہترین رفیق ثابت ہوتی
ہیں بشرطیکہ وہ مانگی ہوئی ہوں ..."

بسا اوقات مانگ کر پڑھنے والوں کی سبکی بھی ہو جاتی ہے۔ دوران سفر میں ایک صاحب اپنے ہم سفر سے ایک
کتاب وقت گزاری کے لیے مانگ بیٹھے۔ ہم سفر نے ٹکا سا جواب دیا۔
" جناب یہ کتاب میں بھی اگر کسی سے مانگ کر لاتا تو آپ کو ضرور دیتا مگر آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کتاب
میں نے روپیوں سے خریدی ہے۔" ان حضرت نے اپنا منہ لٹکا لیا اور کھسیانے ہو کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔

مگر کچھ لوگ ڈھیٹ بھی ہوتے ہیں۔ میں ایک بار مراٹھی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے دوست آدھمکے جنھیں مراٹھی
زبان سے قطعی واقفیت نہ تھی۔ مجھے کتاب میں منہمک دیکھ کر وہ اپنی عادت پر اتر آئے اور لگے کتاب مانگنے ... میں نے
بتایا کہ یہ مراٹھی کتاب ہے۔ جواب ملا۔
"تو کیا ہوا؟ کتاب ہی تو ہے۔ کم از کم تصویریں دیکھ کر ہی واپس کر دوں گا۔"
بہر حال ان دنوں اچھی کتابوں کا میسر آنا جتنا مشکل ہے انھیں اپنی پہلی فرصت میں پڑھ کر محفوظ رکھنا اس سے
کہیں زیادہ مشکل ہے۔ اس لیے کہ مانگ کر پڑھنے والے بآسانی دستیاب ہونے لگے ہیں۔ ●●

فیض الرحمٰن فیض

غزل

دیکھ کے بھی انجان بہت ہے
تیرا یہ احسان بہت ہے

پہلے کی وہ بات نہیں ہے
کچھ دن سے انجان بہت ہے

گھر میں کتنے پال رکھے ہیں
ناجائز سامان بہت ہے

کھائیں ہم تو کیسے کھائیں
قورمہ کم ہے نان بہت ہے

کرکے دکھائیں تب ہم جانیں
کہہ دینا آسان بہت ہے

قبر میں پاؤں لٹکائے ہیں
جینے کا ارمان بہت ہے

نان جویں تک گھر میں نہیں ہے
باہر جھوٹی شان بہت ہے

بے پر کی ہر بات اڑانا
ان کے لئے آسان بہت ہے

پیٹ سے آخر پاؤں نکالے
سمجھے تھے نادان بہت ہے

اُلٹے گدھے پر بیٹھ کے چل دیں
ملک میں اب بحران بہت ہے

چھوٹی بحر میں لکھنا غزل کا
سمجھے غلط! آسان بہت ہے

جیل میں سب شاعر مدعو ہیں
شرکت کا امکان بہت ہے

فیض کرے کیا خواہش پوری
آپ کا ایک فرمان بہت ہے

ہے وہ وزیر کا چپڑ تو بھاؤ کھاتا ہے — مزے میں اس کے وہ مرغی پلاؤ کھاتا ہے
گریجویٹ ہے کمائے نہیں تو کھائے کیا — تلاشِ روزی میں جھڑکی کے گھاؤ کھاتا ہے
کئی دنوں سے ہے محروم روکھی سوکھی سے — اسی لئے تو وہ بیچارہ تاؤ کھاتا ہے
کباب اور پراٹھے تو اب نہیں ملتے — وڑا بٹاٹے کا، میدے کا پاؤ کھاتا ہے
نیا ہے مولوی اس کا علاج کیا کیجئے! — نکلتا شین کے نقطے نہ واؤ کھاتا ہے
ازل کا بھوکا سمندر ہے پیٹ کیسے بھرے! — ڈنر میں روز ہی دو چار ناؤ کھاتا ہے

تمام کہتے ہیں کیسی عجب ہے طارق کی
خیال ہوتا ہے پاگل سبھاؤ کھاتا ہے

غزل

نوٹی بوائے
(بالاپور، اکولہ)

میرے خوابوں کے جھروکوں کو سجانے والی
کبھی گھر کے بھی دریچوں کو سجا دے آ کے

تیرا چہرہ ہے چمکتا ہوا مانندِ چراغ
خرچ بجلی کا مرے گھر کا بچا دے آ کے

تیرے سنگھار کا سامان، ارے باپ رے باپ
مجھ کو ڈر ہے میرا باجا نہ بجا دے آ کے

ڈر ہے ممی کو یہ، ابّی کو بھی یہ ڈر ہے
ساتھ موٹے کے نہ ہم کو بھی نچا دے آ کے

ذکر تیرا کیا، ڈیڈی نے اٹھایا جوتا
تیرے ڈیڈی کے جو تیور ہیں بتا دے آ کے

رؤف خوشتر ایم اے گلبرگہ

یہ بات تو اب عام آدمی بھی سمجھ رہا ہے کہ کیوں کوئی وزیر بن کر عوام کو روتا بلکتا چھوڑ کر بیرونی ممالک کے دورہ پر نکل پڑتا ہے۔ انہیں ملک کے سلگتے مسائل، جھلستے دیہات، اُگلتے حزب مخالف مزدوروں کی گرما گرم ہڑتالیں اور سب سے بڑھ کر یہاں کی گرم آب و ہوا کا بخوبی اندازہ ہے۔ اب یہ بیچارے تھکے ماندے قوم کے خدمت گار کچھ دن باہر آرام کر لیں تو ملک میں کونسی قیامت آجائے گی؟

مگر قیامت کا رخ تو ہمارے مکان کی طرف اس صبح (اسے رات ہی کہنا مناسب ہے) کو ہوا جب ہمارے پڑوسی مرزا صاحب (اردو و ہندی میں پڑوسی بالترتیب مرزا و شرما ہوتے ہیں) مکان میں اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر گوتم بدھ کی طرح نکل پڑے چونکہ آپ عصری گوتم ہیں اس لیے عرفان بجائے بیابان میں ڈھونڈنے ہم جیسے شیطان کے پاس چلے آئے۔

ان کی اس غیر متوقع آمد پر ہمارا خیال ان کے مکان میں بچھڑوں، کھٹملوں سے ہوتا ہوا ان کے کثیرہ شریر بچوں کو پھلانگتا ہوا ان کی نصف بہتر و نصف بدتر کی چرب زبانی تک جا پہنچا۔ اس لیے دفتر میں ان کا اداس و خاموش چہرہ "میں ناخوش و بیزار ہوں اپنے ملک سے" کا چلتا پھرتا اشتہار بنا رہتا تھا۔ لیکن خلافِ امید وہ اپنی اس بے وقتی بلکہ غلط آمد کے لیے ان میں سے کسی کو قصوروار ٹھہرانے کے حق میں نہ تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ ہمارے کمرہ میں داخل ہوتے، ہم نے دو چار منٹ کی مہلت چاہی اور ان لمحوں کو قیمتی جان کر کتابوں کو پلنگ کے نیچے چھپا دیا جو ہم نے مرزا صاحب سے بغرض مطالعہ حاصل کی تھیں اور ہماری لائبریری کی زینت بنی ہوئی تھیں ہر چند یہ کتابیں ان کی خریدی ہوئی بھی نہ تھیں بلکہ ملک کی لائبریری کی دھندلی مہر ان کتابوں کی "ہجرت" کی تاریخ بتا رہی تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ دوست سے ہی کتابیں ... کتابوں کو چھپایا اور مرزا کو اندر بلایا۔ اندر آتے ہی کہنے لگے۔

"میاں لوگوں کی اخلاقی قدریں گر رہی ہیں۔ اس کا تدارک ممکن نہیں۔ لیکن مجھ سے تمہاری گرفتگی کو ادا کرنے کے بعد وہ ان جاتی۔ میں عملی انسان ہوں اور صحت کو اخلاق پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں نے طے کیا ہے کہ ہم دونوں،

ہوا کھائیں گے۔ ایک تو مفت ملتی ہے۔ دوسرے کوئی ٹیکس نہیں۔ چلو گھوم آئیں۔"

ہوا خوری کے نام سے ہماری سانس تیز چلنے لگی۔ گرم گرم بستر چھوڑ سرد ہوا میں ٹھٹھرتے، بچے کچے دانت بجاتے گھر سے نکلنے میں کہاں کی دانش مندی ہے۔ ہماری ذاتی لغت میں سب سے موذی پرندہ مرغ ہے۔ اس لیے نالۂ مرغ سحر تیغ دو دم ہے مگر کیا کریں مرزا جی ہمارے افسر اور ہم ان کے ماتحت ٹھہرے جہاں ملازمت کو برقرار رکھنے کے لیے زمانے کی گرم گرم ہوا کے تھپیڑے کھا کر زندہ ہیں۔ وہاں اب اس کی بقا اور ترقی کے لیے سرد ہوا کے دو چار جھونکے سہی۔ اس دور میں وہی انسان کامیاب ہے جو جسم اور روح میں ہم آہنگی اور توازن رکھ سکتا ہو۔ ہماری ترقی کی سرخ فیتے والی فائیل کو بڑے صاحب تک پہنچنے کے لیے مرزا کی میز سے ہو کر گذرنا ہے، طوعاً و کرہاً راضی ہوئے۔

دبے پاؤں جوتے بغل ہی میں دبا کر مکان سے ایسے نکلے جیسے قیدی جیل سے فرار ہوتا ہے۔ باہر نکلے تو تارے ہماری دیوانگی پر منہ چڑا رہے تھے۔ ہم نے مرزا سے صحیح وقت پوچھا۔ اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہنے لگے "کیا ہمارے کیا تمہارے اور کیا یہ تارے۔ اب سبھی لیٹ لطیف ہو گیے ہیں۔ دیر سے نکلتے ہیں اور دیر میں ڈوبتے ہیں۔" نظام فلکیات میں ان کی دخل اندازی پر عش عش کر اٹھے۔

خوش گوار ہوا اور دل کش منظر کے شوق میں آگے بڑھے تو دو چار کتوں کو عدیم الفرصت سیاست دانوں کی طرح محو بحث پایا۔ قریب جانے پر علم ہوا کہ عظیم سیاسی حریفوں کی طرح آپس میں غرا رہے ہیں۔ ہماری آمد پر وہ چونک اُٹھے ان کی غراہٹ ہماری طرف منتقل ہو گئی۔ یہ دیکھ کر ہم نے دو چار قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔ اے معزز کتو! ہمیں تمہاری اس تقریب سے کچھ سروکار نہیں۔ اس غلط وقت پر گھر سے بے گھر ہونے میں کچھ راز ہے اس لیے۔

مجھ کو مت کاٹیو مرے پر موشن کی ہے آس

یہ کہہ کر ہم تو حسب دستور آداب بجالاتے ہوئے کھسک گئے۔ لیکن مرزا پر سگ فہمی کا خبط سوار تھا۔ وہ یہ کہتے ہوئے کہ جو بھونکتے ہیں وہ کاٹتے نہیں" آگے بڑھے۔ کتے مرزا کو بن بلائے مہمان سمجھ کر حملہ کر بیٹھے۔ ایک نے پیر پکڑا دوسرا پیرہن اتارنے لگا۔ مرزا صاحب اب چچا ڈارون کی تصویری کا جیتا جاگتا اچھلتا کودتا شاہکار معلوم ہونے لگے۔ ہم حسب عادت بھاگ کھڑے ہوئے۔ مرزا بدحواس پیچھے دوڑتے آرہے تھے۔

اگلے موڑ پر دو پولیس کے جوان نمودار ہوئے۔ اس سے پہلے کہ مرزا کچھ کہتے ان کو جیپ میں بٹھا کر تھانہ لے گئے۔ ہم نے کہا مرزا کتوں ہی میں بھلے تھے۔ کتے تو کپڑے اتارنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ بھلا پولیس والے چمڑی اتارے بغیر رہتے ہیں؟

ہم زندگی میں پہلی اور آخری بار تیز دوڑ کر جب تھانہ پہنچے تو دیکھا کہ مرزا صبح کی لطیف و خوش گوار ہوا کی بجائے ڈانٹ کھا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ پولیس کو عرصہ سے چور کی تلاش تھی اور کھسیانی ہو کر مرزا کو نوچ رہی تھی۔ بدقت تمام ہماری کوششوں سے انہیں رہائی نصیب ہوئی۔ انھوں نے عہد کر لیا کہ مہذب شہری کی طرح پنکھے کی ہوا کھائیں گے۔ مفت کی فضیحت ہوئی۔ مکان پہنچ کر ڈرتے ڈرتے جب ساری روداد ہم نے بیگم صاحبہ کو سنائی تو بغیر چھاپ منہ کا ٹیپ ہارے آپ مجبت ازل سے ہی مردم گوشت خور، رشوت خور اور بیوی خور رہا ہے۔ اسے ہوا خوری کی توفیق کہاں۔ یہ نعمت تو صرف ہم کو آتی ہے۔ پھر ہوا کے دو چار خوشگوار جھونکے پھیپھڑوں میں لیتے ہوئے اور ناک پر بیٹھا مچھر اڑاتے ہوئے کہا۔

مرد منت کش ہوا نہ ہوا

قاسم فریدی
اورنگ آباد (بہار)

(انشائیہ)

خواہ مخواہ

"خواہ مخواہ" آپ نے تکلیف کی۔ "خواہ مخواہ" آپ پریشان ہوئے۔

یہ ایک ایسا لفظ ہے جو اس زمانے میں مقبول عام ہو چکا ہے۔ جہاں جائیے، جسے دیکھیے بس خواہ مخواہ کا ہر غلام نظر آتا ہے۔ بات یہاں پر ہی اکتفا نہیں ہوتی بلکہ کبھی کبھی تو خواہ مخواہ کی تکرار عذاب جان بن جاتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خواہ مخواہ کی ترکیب خلوص و محبت اور ایثار و قربانی کا مرکب ہے۔ عہد موجودہ میں "خواہ مخواہ" بڑا ہی پائیدار لفظ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کی پائیداری کی انتہا یہ ہے کہ زندگی جب موت سے ہمکنار ہو جاتی ہے تو "خواہ مخواہ" وہاں بھی حاضر ہو کر اپنی شخصیت کی انفرادیت کے گل بوٹے کھلا دیتا ہے۔ ظاہراً اس لفظ میں کسی توانائی کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن وقت ضرورت اس کی شخصیت کے جوہری عناصر کھل کر سامنے چلے آتے ہیں ——— !

انسانی زندگی میں "خواہ مخواہ" کی موجودگی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ خواہ مخواہ کی شخصیت کا ایک جوہری عنصر یہ ہے کہ بڑے سے بڑا احسان صرف ایک جملہ "خواہ مخواہ" آپ نے تکلیف کی" کے ذریعہ ادا کر دیا جاتا ہے گویا یہ چھوٹا سا لفظ بڑے سے بڑا احسان اپنی وسعت، اپنی ہمہ گیری اور اپنی ہر دل عزیزی کے توسط سے اتار دیتا ہے ———

بات صرف اتنی ہی نہیں کچھ اور تفصیل ضروری ہے یعنی دوستوں کے درمیان تو خواہ مخواہ نے رعب و دبدبہ کا ایک لامتناہی سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ جس کی وجہ بیشتر احباب نقصانات کے سمندر میں غوطہ زن نظر آتے ہیں۔ آئیے اب ذرا "میاں خواہ مخواہ" کی مہربانیوں سے پیدا ہونے والے نتائج پر نگاہ غلط ڈالیں۔ واقعہ اول یہ ہے کہ میرے ایک دوست دلی سے آئے۔ انھوں نے اپنا ایک کام میرے سپرد کر دیا۔ اس کام کو انجام دینے میں پتہ نہیں میرا کتنا نقصان ہوا۔ ہاں یہ ضرور یاد ہے کہ میں بال بال بچ گیا۔ ورنہ آج سر کا ایک بال بھی موجود نہ ہوتا۔ چند دنوں بعد میری ملاقات اپنے دوست سے ہوئی انھوں نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا "تمہیں میری خاطر خواہ مخواہ تکلیف اٹھانی پڑی" اور اس جملے کو ادا کرنے کے بعد انھوں

طرح میری طرف سے بے نیاز ہو گئے گویا میری محنت کا صلہ انھوں نے اس جملے کے ذریعہ دے دیا ہو ——— !

دوسرا واقعہ میرے ایک دوست کی بدقسمتی کا ہے ان کے پاس ایک صاحب ایم اے کا نوٹ لینے آئے۔ انھوں نے میرے دوست کو پورا یقین دلایا کہ میں کل تک "خواہ مخواہ" کے ذریعے واپس کر دوں گا۔ میرے دوست اخلاق کے فریب میں آ گئے انھوں نے صاحب پر یقین کر کے اپنا قیمتی خونِ جگر سے سینچا ہوا نوٹ انھیں دے دیا۔ وہ صاحب تو نوٹ لے کر چلے گئے لیکن چند دنوں میں ہی انھوں نے ایک خط جس میں نوٹ کا ماتم تھا روانہ کیا۔ جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ "بہت افسوس کی بات ہے کہ میں جس گاڑی میں سفر کر رہا تھا میرے ساتھ ایک سوٹ کیس تھا۔ جس میں آپ کا نوٹ رکھا ہوا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ آپ کا نوٹ میرے سوٹ کیس کے ساتھ کوئی صاحب لے کر چلتے بنے اس لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنے وعدے پر قائم نہ رہ سکا اس لیے شرمندہ ہوں۔ خواہ مخواہ آپ کو میری ذات سے نقصان پہنچا۔ تیسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک صاحب نے میرا قلم مانگا۔ میں نے مجبوراً اپنا قلم انہیں دے دیا۔ قلم تو چلا گیا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ "خواہ مخواہ" آڑے آئے گا اور مجھے صبر دلائے گا۔ حادثہ بھی وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ صاحب آئے اور بولے "بھئی تمہارا قلم کہیں گر پڑا۔ خواہ مخواہ تمہیں تکلیف ہوگئی۔ اس جملے کو ادا کر کے وہ اتنی جلد رفوچکر ہو گئے جیسے میرا قلم واپس دے گئے ہوں۔ میں خاموش رہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ کیونکہ "خواہ مخواہ" بڑا ہی طاقت ور ہے۔ اگر اس کے خلاف آواز اٹھائی بھی تو خیر نہ ہوگی اور دنیا بھی یہی کہے گی کہ بڑا بے خلوص ہے۔ ہاں یہاں یہ بات ظاہر کر دوں کہ "خواہ مخواہ" اور "خلوص" کا کیا رشتہ ہے؟ دونوں سوتیلے بھائی ہیں اور وقت ضرورت ایک دوسرے کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اب ذرا آپ ہی سوچیے جہاں "خواہ مخواہ" جیسا تندرست و توانا لفظ حاضر ہو وہاں ایک شریف انسان کی زبان اس کے خلاف آواز نکالنے کی جرأت کیسے کر سکتی ہے؟ بھائی میرے! ذرا سوچیے تو سہی کیا آپ "میاں خواہ مخواہ" کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ اگر آپ کا جواب اثبات میں ہے تو میں بھی کہوں گا کہ آپ یہ رسالہ "شگوفہ" مجھے دے کر دیکھیے تو میں کتنی آسانی سے کہتا ہوں کہ "ارے بھئی دیکھو نا تمہاری کتاب میری سائیکل کے کیریر سے گر پڑی اور مجھے کچھ پتہ ہی نہ چلا" خواہ مخواہ تمہیں اپنے رسالے سے ہاتھ دھونا پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ جملہ سن لینے کے بعد آپ مجھے کچھ نہ کچھ کہیں گے۔ کیونکہ "خواہ مخواہ" کی مدد سے میں نے کتاب کا خسارہ جو ادا کر دیا ہے۔

"خواہ مخواہ" کی آخری تعریف کا واقعہ یہ ہے کہ کل میرے ایک دوست میرے کمرے میں آئے۔ میرا بیڈ سوئچ کافی دنوں سے بے کار پڑا تھا۔ انھوں نے کوشش کر کے اسے بنانا چاہا میں نے انہیں منع کیا کہ "خواہ مخواہ تم پریشان ہو رہے ہو۔ وہ ٹھیک نہ ہوگا۔ مگر وہ نہ مانے اور کافی محنت کے بعد انھوں نے سوئچ بنا ڈالا۔ میں نے برجستہ کہا کہ "خواہ مخواہ تم نے تکلیف کی۔" اب آپ خود سوچیے کہ میں نے کتنی آسانی سے ان کا احسان اتار دیا اور وہ بھی خوش ہو کر اپنے رستے چلے گئے۔ لیکن میں اب تک سوچ رہا ہوں کہ واقعی "خواہ مخواہ" کتنا عظیم اور مہربان ہے۔ اس کی ذات نورِ لافانی ہے جس کی روشنی میں ہر احسان کو آسانی کے ساتھ اتارا جا سکتا ہے یعنی احسان فراموشی کیا جا سکتا ہے۔ اس سرزمین پر جب تک انسانوں کا جم غفیر موجود رہے گا۔ اس وقت تک لوگ "خواہ مخواہ" کے نورِ لافانی سے فائدہ حاصل کرتے رہیں گے۔ بات صرف یہی نہیں "میاں خواہ مخواہ" تو ہر وقت اور ہر جگہ جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ آپ آنکھیں کھول کر دیکھیے تو یہاں بھی موجود ہیں۔ ان کی موجودگی کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کیونکہ اگر وہ موجود نہ ہوتے اور ان کا نورِ لافانی میرے قلم کو روشنی و طاقت نہ عطا کرتا تو میں یہاں "خواہ مخواہ" اپنا وقت برباد نہیں کرتا اور نہ ہی آپ میری تحریر پر اپنی نگاہ مرکوز کرتے۔ اس لیے اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ "میاں خواہ مخواہ" بہت ہی عظیم ہیں ——— !!

○

شاکر کھام گانوی

ہم اور ہماری داڑھی

، کی جب بھی ضرورت ہوتی تو اپنے کاروبار سے دو گھنٹے قبل فرصت نکال کر نائی کی خدمت میں روانہ ہونا پڑتا پھر وہاں بھی کبھو لگا
آدھا ایک گھنٹہ بور ہوتے جمائیاں لیتے، چائے پر چائے پی کر طبیعت کو بہلاتے، پان پر پان کھا کر ٹائم پاس کرتے تب
نمبر لگتا اور ہم اپنے آپ کو نائی کے حوالے کر دیتے۔ وہ جیسا چاہتا ہمیں اٹھاتا بٹھاتا۔ کبھی کان پکڑ کر کبھی ناک پکڑ کر کبھی دائیں کبھی
کبھی دکھن غرض جس طرف اور جیسے چاہتا ہماری گردن گھماتا جہاں چاہتا صابن لگاتا جب چاہتا پانی پھرا دیتا۔ پھر استرے کا جوہر
سترا چلتا اور اُدھر اُس کی زبان، اور شاید دنیا بھر میں قینچی کی طرح نائی کی زبان جتنی چلتی ہے اتنی کسی کی بھی نہیں چلتی۔ نائی کی زبان
یمت بھی ہے۔ لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ آپ سے استرا چلاتے وقت اِدھر اُدھر دیکھنے کا بھی مرض ہوتا ہے۔ جس کے نتیجے میں فری
ن بھی صاف ہو جاتی ہے۔ غرض یہ کہ دس پندرہ جگہ استرا مارنے اور پاؤ آدھا پاؤ خون بہانے کے عوض وہ ہم سے پچاس پیسے
بن چھوڑ دیتا اور اس سے چھٹکارا پاتے ہی ہمیں راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں اپنی عافیت محسوس ہوتی۔

ہ جب ہم نائی اور اس کے استرے کی کرم فرمائی پر غور و فکر میں مبتلا تھے کہ ہمارے دوست مشیر خاں، شیخ چاند، سید جمیل
ردلاور خاں کے ہمراہ وارد ہوئے۔ یہ ہمارے پنچ رتن بھی ہیں۔ مشیر خاص بھی اور پنچ کمیٹی بھی۔ ہماری داڑھی کے مسئلہ کو حل
یہ پنچ کمیٹی بطور کمیشن مقرر کی گئی۔

اس کمیشن نے جو سفارشات پیش کیں وہ حسب ذیل تھیں۔

خرچ : ایک داڑھی کے لئے ۴ گھنٹے ہفتے میں دو دفعہ کے ۸ گھنٹے سال بھر کے ۵۲ ہفتوں کے ۴۱۶ گھنٹے اگر کم از کم بیس سال تک داڑھی بنائی جائے تو بیس سال کے ۸۳۲۰ گھنٹے یعنی ۳۴۶ دن گویا ایک سال۔

سائل : صرف داڑھی بنوانے میں زندگی کا ایک سال ضائع کر دینا حماقت ہے۔ اس ایک سال کے وقفے میں عمدہ تخلیقات تیار ہو سکتی ہیں یا گھر کے سودا سلف خریدنے کی ٹریننگ لی جا سکتی ہے یا کوئی ہنر سیکھ کر آمدنی
ـتا ہے۔ لہٰذا اپنے ہاتھوں داڑھی بنائی جائے جس میں صرف ۵ منٹ لگتے ہیں۔

رقم کا خرچ

نائی کی دکان تک جانے کا رکشہ کرایہ ۱-۰۰ ٹائم پاس کرنے کے لئے چائے پان کا خرچ ۱-۰۰ مزدوری ۰-۵۰ پیسے یعنی ایک داڑھی کا خرچ ۲-۵۰ ہفتے کی دو داڑھی بنوانے کا خرچ ۵ ایک سال کے ۵۲ ہفتوں کا خرچ ۲۶۰ روپے کم از کم ۲۰ سال داڑھی بنوانے کا خرچ پانچ ہزار دو سو روپے۔

سفارشات: صرف داڑھی بنوانے کے لئے پانچ ہزار دو سو روپے خرچ کرنا نہایت ہی خطرناک حد تک خرچیلا ہے۔ اس رقم سے ایک مکان بنایا جا سکتا ہے یا بڑی لڑکی کی شادی کی جا سکتی ہے یا زیورات خریدے جا سکتے ہیں۔ لہٰذا اپنے ہاتھوں داڑھی بنائی جائے تو ایک بلیڈ میں پانچ دفعہ داڑھی بنا سکتے ہیں۔

:- اپنے ہاتھوں داڑھی بنانے میں خرچ کا نیا بجٹ :-

۱۔ بلیڈ :- ایک بلیڈ میں پانچ داڑھی کے حساب سے ۲۰ سال میں صرف ۲۰۰ بلیڈ .... ۱۰۰ —— ۰۰
۲۔ برش :- دس سال میں ایک کے حساب سے صرف ۲ عدد برش .... ۱۰ —— ۰۰
۳۔ صابن :- دو سال میں ایک کے حساب سے ۲۰ سال میں صرف دس گود ریج صابن .... ۲۰ —— ۰۰
۴۔ پھاوڑی :- ۲۰ سال میں صرف ایک اعلیٰ ترین قسم کی .... ۳۰ —— ۰۰
۵۔ بڑا آئینہ :- ۱ عدد .... ۲۰ —— ۰۰
۶۔ شیونگ ٹیبل مع دیگر لوازمات .... ۲۰۰ —— ۰۰
۷۔ ٹیکسی کے ذریعہ سامان خریدنے اور گھر لانے کا خرچ .... ۳۰ —— ۰۰
۸۔ خریداری کے وقت پنج رتن کی چائے پان وغیرہ خرچ .... ۵۰ —— ۰۰

---

۲۰ سال کا —— کل خرچ .... ۴۵۰ —— ۰۰

ہمیں اور ہم سے زیادہ بیگم کو کیش کی سفارشات بہت پسند آئیں اور ہم نے متفقہ طور پر اپنے ہاتھوں داڑھی بنانے کا فیصلہ لہٰذا بیگم سے پانچ سو روپے طلب کرے گے جو انھوں نے خوشی خوشی فوراً دے دیئے اور ہم اپنے پنج رتن کے ہمراہ ٹیکسی شیونگ میٹریل کے لئے نکل پڑے۔

ہمیں دکاندار کا بار بار یہ پوچھنا کہ "یہ میٹریل بیچنے کے لئے چاہیئے یا نائی کی دکان لگانے کے لئے" سخت ناگوار گذرا اور اس ناگوار اس کی وہ مسکراہٹ تھی جو ہمارے دوستوں کے یہ کہنے پر نمودار ہوئی تھی کہ "نہیں صاحب یہ تو صرف مرزا صاحب کی دا لئے ہے"

بہر حال ہم شیونگ میٹریل سے لدے پھندے خوشی خوشی گھر پہنچے بیگم کو سب سے زیادہ خوشی اس بات پر تھی کہ ہمارے (جنھیں وہ غصے سے پانچ پانڈو کہا کرتی تھیں) کے مشورے کے باعث آج چار ہزار سات سو پچاس روپے کی بچت ہو گئی اب نہ م کے گہن رکھے ہوئے زیور ہی چھوٹ جائیں گے بلکہ نئے زیورات کا بھی اضافہ ہو جائے گا۔ آج پہلی دفعہ بیگم کو یقین ہوا دوست کتنے مخلص، ہمدرد، ایماندار، نیک اور بلند کردار کے مالک ہیں۔

ہمارے گھر میں قدم رکھتے ہی بیگم نے بالکل اسی طرح ہمارا پر جوش استقبال کیا جس طرح وہ اپنے والد ماجد کا کرتی ہیں۔ نیز آج پہلی دفعہ انھوں نے اسی طرح اصرار کر کر کے ہمیں اپنی پسند کا کھانا کھلایا اور خوب ڈٹ کر کھلایا جس طرح وہ ا والدین کو کھلاتی ہیں۔

معمول کے مطابق ہم بدھ اور اتوار کے روز داڑھی بنوایا کرتے تھے اور آج پیر کا دن تھا لیکن ہم شیونگ پر

دیکھ دیکھ کر سیدھے چین ہو رہے تھے اور ہماری خواہش تھی کہ آج ہی افتتاح کر لیا جائے لیکن بیگم نے سمجھایا کہ ایک کمرہ خا
کے اس میں سب سامان قرینے سے سجانے میں پورا ایک دن لگ جائے گا پھر اس کے بعد باضابطہ تقریب ہوگی اس وقت تک
آپ اپنی داڑھی کا افتتاح نہیں کر سکتے۔ یہہ بات ہمیں بہت پسند آئی اور ہم نے اسے افتتاحی تقریب کا نام دیدیا۔

خدا خدا کر کے "افتتاحی تقریب" جس میں ادبی نشست اور پر تکلف دعوت شامل تھی ختم ہوئی اور ہم اپنے گلے سے پھ
کے ہار اُتار کر بڑے ٹھاٹھ کے ساتھ شیونگ ٹیبل پر براجمان ہو گئے۔

صابن وغیرہ لگا چکنے کے بعد بلیڈ چلانے کی نوبت آئی اور ہم نے زوردار بسم اللہ کی آواز کے ساتھ سیدھے رخسار پر بلیڈ
لیکن بلیڈ کے ساتھ خون کی دھار دیکھ کر ہم چونک پڑے اور بڑی دیر کے بعد علم ہوا کہ خون بلیڈ سے نہیں بلکہ ہمارے
رخسار سے نکل رہا ہے جہاں ہمارے ہاتھ کی ذرا سی لغزش کے باعث تقریباً دو کعب سینٹی میٹر کا گڑھا پڑ گیا ہے۔

سیدھے رخسار کا حشر دیکھ کر بائیں رخسار کی طرف بلیڈ لگانا مناسب نہ سمجھتے ہوئے ہم نے پہلے مونچھ بنانے کا خیال کر
کافی احتیاط کے باوجود سیدھی طرف کی مونچھ پتلی اور بائیں طرف کی مونچھ موٹی ہو گئی۔ بائیں طرف کی مونچھ ٹھیک کی تو دائیں طرف کی مو
آنے لگی پھر دائیں طرف کی مونچھ برابر کرنے کی جو کوشش کی تو پوری مونچھ ہی صاف۔ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر
طرف کی بھی مونچھ صاف کرنے کی جو کوشش کی تو مونچھ کے ساتھ ہی ساتھ ہونٹ بھی کٹ گیا پچاس ساٹھ جگہ زخم لگا
بعد جوں توں کر کے ہم نے اپنی داڑھی مکمل بنائی۔

زخموں کی وجہ سے بے چینی بڑھ گئی تو ہم چہرہ پر کپڑا لپیٹ کر ڈاکٹر کے پاس پہنچے۔ جہاں ہمیں ٹیٹنس کا انجکشن لگو
گولیاں اور کیپسول کے ساتھ ڈاکٹر کی تمسخر آمیز ہنسی لے کر اور ۲۰ روپے ڈاکٹر کو تھما کر ہم گھر لوٹے۔

اب ہم زخمی چہرہ لئے بستر پر پڑے ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اب ذرا کوئی ہمیں اپنے ہاتھوں سے داڑھی بنانے کا مش
دے اور پھر دیکھے کہ کیا ہوتا ہے۔

پاگل عادل آبادی

غزل

نہ چھوڑے ایک بھی پیسہ، فیض ہی ایسا تھا
جنابِ شیخ کے کھانے کا فن ہی ایسا تھا

وہ بات کرتا اگر منہ سے جھڑتے رس گلے
قسم خدا کی وہ شیریں دہن ہی ایسا تھا

دکھائی دیتا تھا ہر زاویے سے تو بندر
میں کیا کہوں ترا نقشِ بدن ہی ایسا تھا

جو شخص آتا تھا تکتا تھا غور سے اسکو
کہ ٹیری کاٹ کا میرا کفن ہی ایسا تھا

رکھا تھا جس نے قدم ٹانگ اسکی ٹوٹ گئی
کہوں کیا گھر کا ہمارے صحن ہی ایسا تھا

کہ ایک فائیٹ میں بتیسی جھڑ گئی میری
خدا رکھے تیرے گھونسے کا فن ہی ایسا تھا

وہ آئے مائیک پہ پنڈال ہو گیا خالی
جنابِ شیخ کا طرزِ سخن ہی ایسا تھا

گدھے کو باپ سمجھنا پڑا ہمیں یارو
کریں کیا وقت کا اپنے چلن ہی ایسا تھا

خرد کے نام پہ بکتا رہا جنون پاگل
تمہاری بزم کا رنگِ سخن ہی ایسا تھا

تاج پیامی
بہار

جدیدیت جو نہ کرائے

مجھ کو زمانہ ساز نے فرزانہ کر دیا
باغِ سخن کو میں نے بھی ویرانہ کر دیا

نام و نمود کے لئے شہرت کے واسطے
فن کو، ادب کو، علم کو نذرانہ کر دیا

قدروں کے ٹوٹنے کا بہانہ تراش کر
معنی سے میں نے لفظوں کو بیگانہ کر دیا

ترسیلِ فکر جب نہ علامت سے ہو سکی
اپنے سخن کو عشوۂ جانانہ کر دیا

میرا کلام جس نے بھی پڑھنے کی سعی کی
اس کو حواس و ہوش سے بیگانہ کر دیا

کمرے میں اپنے بیٹھ کے تنہا تمام رات
میں نے نشاط خانہ کو غمخانہ کر دیا

اپنی بھی آرزو تھی کہ رندوں میں نام ہو
حسرت بھرا تھا دل اسے پیمانہ کر دیا

اے تاج، جب سے سمجھا تجھے مصلحت شناس
ساقی نے تیرے نام پہ میخانہ کر دیا

ضیا حسنی
(فتح پور یوپی)

مغربی ممالک کے باشندے بغیر تعارف ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوتے، ہم اس شائستگی پر کوئی تبصرہ کیے بغیر
ے بڑھے جا رہے ہیں۔ کیونکہ ہر ملکے ہر رسمے لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے یہاں لوگ تعارف کے جھمیلے میں نہیں پڑتے
رہ وہ صرف بغیر وسیلہ باتیں کرتے ہیں بلکہ آپ کی سات پشتوں کو کھنگا لیتے، آپ کے معاشی حالات، رہن سہن
راہل وعیال کے متعلق پوری تفصیلات حاصل کرنے بعد نیک مشوروں کے دینے، خطرات سے آگاہ کرنے اور کامرانیوں کے
منصوبے بتانے بھی نہیں چوکتے۔ سرراہ ایسے تیر بہدف نسخے بتا دیتے ہیں جو اطبائے حاذق کو بھی یاد نہ ہوں گے اور جن کو
زبے میں لانے کے بعد آپ انہیں چراغ لے کر ڈھونڈتے پھریں گے۔ سردست جب کہ بعض اطبا کو مریضوں سے زیادہ روپے
سے رغبت ہو گئی ہے۔ ان گرم فرماؤں کا وجود کافی غنیمت ہے۔ جو راہ چلتے اچانک مل کر بن پوچھے انمول نسخے بتا دیتے ہیں۔

غرض ہمیں اس مختصر سی زندگی میں سرراہ بے شمار مصلح اور مشیر مل چکے ہیں۔ جن کی نصیحتیں اور مشورے آڑے وقتوں
کام آئے۔ ان میں سے ایک صاحب کے چند مفید مشوروں کا تعلق درج بالا موضوع سے ہے اس لیے ان کو گوش گزار کرنا
بس ضروری ہے۔ ان صاحب سے ٹرین پر اچانک ملاقات ہو گئی تھی۔ انہوں نے ہمارے چہرے کا اس طرح جائزہ
لیا کر جیسے ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہیں سکے تھے کہ انھوں نے پہل کر دی۔

"کیا مشغلہ ہے آپ کا؟"

"ملازمت"

اب انھوں نے مشفقانہ انداز سے گفتگو شروع کی۔

"پیشہ ملازمت اور پردیس میں سکونت، پھونک پھونک کر قدم رکھیے۔ ہمیشہ چار پیسے بچا لیجئے۔ آڑے وقتوں پر
کام آئیں گے۔ دھیان رکھیے! چادر سے آگے پیر نہ پھیلنے پائیں۔"

پہلی ملاقات میں انھوں نے جس طرح کافی اہم مشوروں سے ہمیں نوازا اس جذبۂ خلوص سے بہرحال خوشی ہوئی۔ اد
انھوں نے ہمارے سگریٹ کے پیکٹ سے اس طرح اطمینان سے سگریٹ نکالی کہ جیسے انھوں نے اسے اپنی گاڑھی کما
سے خریدی ہو اور کسی کہنہ مشق اسموکر کی طرح اسے پیکٹ پر دو بار دبا کر اس کی تمباکو برابر کی اور پھر اسے اپنے ہونٹ
سلیقے سے دبا کر سلگا ہی تو لیا اور بہے ہولے کش لگانے لگے۔ اسی دوران انہیں شاید اپنی بے تکلفی کھٹکی یا رگِ حمیت پھ
تو بول پڑے۔

"میں لتی قسم کا اسموکر نہیں ہوں۔ پیکٹ کو دیکھ کر جی چاہا کہ سگریٹ پیوں۔
سفر میں کبھی کبھی پی لیتا ہوں۔
" بشوق پیجئے!"

"شکریہ، میں اپنی آمدنی کے حساب سے خرچ کرتا ہوں کیونکہ جو شخص آمدنی سے زیادہ خرچ کرتا ہے اسے پھر ا
لینا پڑتا ہے اور ادھار لینے والے کی نگاہیں ہمیشہ نیچی رہتی ہیں۔ یقین جانئے! قرض مقراضِ محبت ہے۔"

" ہم ان کی تقریر دل پذیر سے کافی خجل ہوئے۔ انہیں سگریٹ بھی پلائی۔ اور وہ ہمیں فضول خرچی کی تہمت بھ
دے گئے۔ اب ہم ان سے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ جھٹکے سے گاڑی رکی اور وہ خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے۔
یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا کہ ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ غرض تھوڑے دنوں ہمیں ان کے مفید مشوروں پر غور کرنا
کا موقع نہیں ملا کیونکہ جس قدر ہمیں تنخواہ ملتی تھی وہ ہماری ضروریات کے لیے کافی ہوتی تھی اور ہم تھوڑے روپے پس اندا
بھی کر لیتے تھے۔ لیکن بیگم جو ہمارے یہاں جلوہ افروز ہوئیں تو اس میں شبہ نہیں کہ گھر سے ہماری دلبستگی بڑھ گئی لیکن ہما
اخراجات میں اضافہ بھی ہو گیا۔ چنانچہ ایسے موقع پر ہمیں وہ مصلح یاد آئے جنہوں نے اثنائے سفر میں ہمیں چند قیمتی مشو
دیئے تھے۔ اسی لیے ان غیر ضروری اخراجات جیسے کسی ریستوران میں بیٹھ کر دو تین پیالی چائے پینا وقتاً فوقتاً
سگریٹ پھونکتے رہنا" اخبار و رسائل خریدنا، غیر ضروری سفر کرنا ان سبھی مدوں کو بیک جنبشِ قلم موقوف کر دیا اور صرف بیگم سے
دل لگانے لگے۔ ان سے بے تکلفی بڑھی تو وہ موقع بموقع فرمائشیں جتانے لگیں۔ اسے جانب داری نہ سمجھئے۔ بیگم جیسی
خود حسین و نازک سی ہیں ویسی ہی ان کی فرمائشیں ہوا کرتی ہیں۔ لہٰذا ان کی ہلکی پھلکی فرمائشوں کو بھی ہم خوشی خوشی
پوری کر دیتے ہیں۔ بڑی ناشکری ہوگی اگر ہم یہ اعتراف نہ کریں کہ ہماری تنخواہ میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر بھی جس
تیزی سے ضروری چیزوں کے نرخ بڑھ رہے ہیں ان بڑھتے ہوئے نرخوں سے بے چاری ہماری تنخواہ آنکھیں چار نہیں کر پاتی
لہٰذا ہم نے اپنے روزانہ کے اخراجات کا بغور جائزہ لیتے ہوئے ان میں سے چند کو رد کرنے کی کوشش کی لیکن ہمیں اندازہ ہوا کہ
صرف ہوا تو ہمیں بغیر معاوضہ ملتی ہے اور وہ بھی گنجان آبادی میں تنگ مکانوں میں میسر نہیں آتی اور باقی سبھی اشیا کا مول کافی بڑھ گیا ہے
اور مشکل یہ ہے کہ ان کا خریدنا ضروری بھی ہے۔ ابھی تک ہماری زندگی کافی پرسکون تھی۔
شورش ہنگامہ اور ہل چل کسے کہتے ہیں۔ اسے ہم جانتے ہی نہ تھے۔ اچانک ہماری سسرال سے ایک دعوت نامہ آگیا
جسے دیکھتے ہی بیگم کھل اٹھیں اور دلربائی کے انداز میں بولیں۔
"دو تین سو روپے دے دیجئے تاکہ ہم شادی میں ٹھیک ٹھاک طریقے سے شریک ہوں۔ یہ ایسا موقع ہے کہ جبھی اعزاز

لیں گے۔"

ہم نے بیگم کے اس مطالبہ کو فن کارانہ انداز میں ٹالنا چاہا لیکن بیگم اڑگئیں اور ہم نے نہ صرف سپر ڈال دی بلکہ تنخواہ ہی انہیں تین سو روپے دے کر انہیں ان کے مائکے بھیج دیا۔

اب ہم تہی دست ہوگئے تھے اور تہی دستی کے عالم میں وہ مصلح ہمارے ذہن میں بار بار ضربیں لگا رہے تھے۔

"قرض لینا ٹھیک نہیں"

"قرض دار کی نگاہیں نیچی رہتی ہیں۔"

"قرض مقراض محبت ہے"

ہم پریشان ہوکھلائے ہوئے خیالوں کی گہرائی میں ڈوب رہے تھے کہ کسی طرح روپے کا بندوبست کریں اور ان کے مائکے سے لے آئیں۔ اسی دوران میں ایک دوست آگئے جو کاندھے کاندھے قرض میں ڈوبے رہتے ہیں اور ایک مدت سے اس پر عمل پیرا ہیں کہ جب انہیں کوئی رقم ملتی ہے تو وہ اس سے پہلے ہی اس سے زیادہ روپے خرچ کرچکے ہیں تاکہ قرض لینے کا سلسلہ چلتا رہے اور قرض خواہ ان سے بے فکر نہ ہوں۔ غرض ہم نے اپنے دوست سے اس طرح بات شروع کی۔

"ہمیشہ ہم اپنی چادر کو دیکھ کر پیر پھیلاتے ہیں۔"

"دنیا کے جیسے بزدل افراد کا یہی عمل ہے۔ اور وہ گھٹ گھٹ کر مرا کرتے ہیں۔"

"قرض دار کی نگاہیں نیچی رہتی ہیں۔"

"ہم ہر دن قرض لیتے ہیں۔ لیکن سینہ تان کر اور آنکھیں چار کرکے چلتے ہیں۔ ان قرض داروں کی نگاہیں نیچی رہتی ہیں جو قرض لے کر ادا کرتے میں لیت و لعل کرتے ہیں۔ ممکن ہے وہ روزانہ دستک کی جھنکار سننے کو پسند کرتے ہوں لیکن ہمارا عالم تو یہ ہے کہ الٹا قرض خواہ ہم سے نیچی نگاہ کرکے باتیں کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی نیچی نگاہوں کو دیکھ کر ہمارے سامنے کسی محبوب کی نگاہوں کا تصور ابھرا ہے۔"

محبوب کی بات چلی تو ہم خاموش نہیں رہ سکے۔

"قرض مقراض محبت ہے۔"

"ہم نے ہمیشہ قرض لے کر محبت کی اس کا بیج ڈالا اسے پروان چڑھایا ہے۔ اور جب وہ سرسبز پودا بن گیا تو اس کے پھل بھی کھاتے ہیں۔ بھائی! ان جھگڑوں میں نہ پڑیے۔ تنگ دستی ہو تو جم کر قرض لیجیے۔"

"آج کل ہم بے حد پریشان ہیں لیکن قرض لینے سے سبکی محسوس ہوتی ہے اور جی ڈرتا ہے۔"

"پھر وہی بات۔ رشوت، اسمگلنگ، چور بازاری اور جعل سازی سے تو بہتر ہے کہ قرض لے کر کام چلایا جائے۔ یہ کونسی عقل مندی ہے کہ آدمی گھٹ گھٹ کر مرے اور ملتی ہوئی رقم کو چھوڑ دے۔ میرے بھائی! پہلے زمانے کے رؤسا قرض لیتے تھے اور اس سے ان کی حیثیت کا اندازہ ہوتا تھا۔ اُن دنوں صرف انہیں کو رئیس کہا جاتا تھا جن کے پاس ہاتھی، طوائف اور قرض ہوتا تھا۔

اور آپ کو نہیں معلوم سرکار بھی قرض دیتی ہے۔ مکان، زمین، موٹر سائیکل، سائیکل اور موٹر کی خریداری کے لیے اس سلسلہ میں ایک بات بھی سنتے چلئے کہ اکثر سرکاری نوکر صرف انہیں لوگوں کیلیے جلد قرض منظور کراتے ہیں کہ جنہیں کاغذات کو جلد سے جلد حرکت میں لانے کی ترکیب آتی ہو۔ ہاتھ چکنے کر دیتے جاتے ہیں تو کاغذ جلد ہی جلدی کھسکنے لگتے ہیں۔ لوگ دفتروں میں معاملوں کے پڑے رہنے کی شکایت تو کرتے ہیں لیکن کاغذوں کو چلتا پھرتا کر دینے کے حربے کو استعمال نہیں کرتے۔" اب وہ ایسی روانی سے بول رہے تھے کہ ہم خاموشی سے ان کا منہ دیکھے جا رہے تھے۔ انھوں نے ہماری اطلاع کے لیے یہ بھی بتایا کہ دودھ، ڈبل روٹی، مکھن، شکر، چائے، مرچ، مصالحے، اور اخبار سبھی کچھ وہ ادھار لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ مکان کا کرایہ برسوں نہیں دیتے۔ وہ مالک مکان (جو ہر دن کرایہ داروں پر ظلم و ستم ڈھاتے ہیں) انہیں دیکھتے ہی نگاہ جھکا لیتے ہیں۔

کرایہ داری کے سلسلہ میں ان کا یہ واقعہ دل چسپی کے لیے بتا دینا ضروری ہے۔ ایک بار وہ تبدیل ہو کر کسی نئے شہر پہنچے اور وہاں انھوں نے جس مکان کو کرایہ پر لیا تو وہ جہاں محل و قوع کے لحاظ سے دل کش تھا۔ وہاں اس کی مالکہ ایک جواں سال، نک سک کی درست، مست خرام اور شوخ گفتار تھیں۔ پہلی ملاقات میں ان خاتون نے انہیں جادو برساتی ہوئی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کسی قدر بے مروتی سے کہا "اڈوانس کرایہ دیجیے۔"

"اگرچہ اس روئے زمین پر آج تک ہمیں کوئی ایسا مالک مکان نہیں ملا جس نے ہم سے اڈوانس کرایہ لیا ہو یا ماہ بہ ماہ ہم سے کرایہ لیتا رہا ہو پھر بھی ہم آپ کی تمام شرائط کو اس لیے منظور کیے لیتے ہیں کیونکہ ہمیں دیارِ غیر میں آپ کی سرپرستی کی بدرجۂ غایت ضرورت ہے۔"

وہ ہماری اس بات کو سنتے ہی مسکرا پڑیں جس سے ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارا کام ہو گیا۔ ہم نے گھر میں اپنا سامان فوراً ہی پہنچا کر قبضہ کر لیا اور اپنے کاموں میں لگ گئے۔ لیکن پابندی سے صبح سویرے ان کی خدمت میں جا کر آداب ضرور بجا لاتے تھے تاکہ انھیں اطمینان رہے اور وہ یہ سمجھیں کہ ہم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں۔ غرض ہم نے چار ماہ ٹرخانے کے بعد ان کا کرایہ کامل دیانت داری سے بے باق کر دیا اور ہم نے تاخیر کی۔ دل کی گہرائی سے معذرت کرتے ہوئے ان کی انسان دوستی کو خوب سراہا بلکہ یہ بھی کہا کہ آپ نے اس تاخیر سے اکتا کر ایک دن بھی بے اطمینانی ظاہر نہیں کی۔ یقین جانیئے ہم نے آپ کی اس فراخ دلی کا تاثر بھی قبول کیا ہے۔ غرض ان سے خوب نبھی۔ ہم کرایہ دینے میں کبھی بھی پابند نہیں ہو سکے۔ لیکن ان کی عنایات و نوازشات میں دن دن اضافہ ہوتا گیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بلا مبالغہ مہینے میں پندرہ دن ہم انہیں کے ساتھ کھانا کھاتے۔ غرض اب وہ جس طرح ہمیں ٹوٹ کر چاہنے لگی تھیں اس سے ایسی صورت رونما ہو جاتی جس سے دونوں کی رسوائی ہوتی اس لیے ہم ان کا پورا حساب بے باق کر کے اپنے گھر چلے آئے۔

غرض انہیں دوست نے ہمیں ایک صاحب سے پانچ سو روپے لا کر دیئے۔ جنہیں ہم پچیس روپے کی ماہانہ قسط میں ادا کر رہے ہیں۔

اس طویل روئیداد کو سنا کر ہم آپ کو قرض لینے پر آمادہ نہیں کر رہے ہیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ قرض کی جس قدر برائی کی جاتی ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم قرض نہ لیتے تو بھوکوں مر جاتے اور بیگم سے شاید ہماری نبھنی مشکل ہو جاتی۔ ●●

"محبت زندہ باد"

جاوید صدیقی
(علیگ)

پروفیسر شرما کی کتاب "محبت زندہ باد" جب بہت زیادہ مقبول ہوئی اور اس کے کئی ایڈیشن نکلے تو اس خوشی میں پبلشر نے ایک شاندار پارٹی دی۔ اس پارٹی میں پروفیسر کے سبھی ادیب دوست شامل تھے۔ اس سے پہلے کہ کھانے پینے کا دور شروع ہو۔ لوگوں نے پروفیسر سے کتاب کے متعلق خود ان کے خیالات جاننا چاہا۔ پروفیسر اپنی میز کے پاس ہی کھڑے ہوکر کہنے لگے:

"عزیز دوستو! میں نے اپنی اس ناچیز کتاب کے ذریعہ آج کے بزرگوں کو یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ وہ آج کے نوجوانوں کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان کے جذبات کی قدر کریں۔ جیسا کہ آپ لوگوں نے اس کتاب میں پڑھا ہوگا کہ فاروق اور شمع کی محبت کے آگے آخرکار ان کے والدین جھک ہی گئے لیکن اس دوران ان کے بیٹوں کو جو تکلیف پہونچی اس سے کیا انھیں کچھ حاصل ہوا؟ میں کہتا ہوں جب ایک لڑکے کی شادی ایک لڑکی سے ہی کرنا ہے تو پھر وہی لڑکی کیوں نہیں جس سے کہ لڑکا خود چاہتا ہو! ہوسکتا ہے کہ اس میں آپ کے دل کو تھوڑی ٹھیس پہونچتی ہو لیکن اپنی چند لمحوں کی خوشی کے لیئے اپنے بچوں کی پوری زندگی تلخ بنانے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں۔ فاروق اور شمع کو تو دنیا والوں نے جو اذیتیں دیں سو دیں لیکن ان کے والدین بھی تو خوش نہیں رہ سکے۔ سب سے عمدہ طریقہ جو اس ناچیز کے خیال سے ہے وہ یہ کہ والدین کو خود اپنے بچوں سے پوچھ کر جہاں وہ کہیں وہیں خوشی خوشی شادی طے کر دینا چاہیئے۔"

پروفیسر بڑے پرجوش انداز میں بولے جارہے تھے کہ اتنے میں صاحبزادے انیل نے وہاں آکر کہا:
"بابا! شاید آج میں صحیح موقع پر آیا ہوں۔ پچھلے تین برسوں سے آپ سے ضد کر رہا ہوں کہ رادھا کو اپنی بہو بنا لیجئے، لیکن آپ نہ مانے۔ آخرکار آج ہم نے کورٹ میریج کرلی۔ اب تو اس موقع پر ہم دونوں کو آشیرواد دے دیجئے۔

انیل اور رادھا آگے بڑھے لیکن اس بیچ پروفیسر شرما کے چہرے کا رنگ اڑ چکا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک ساتھ پسینے کی بہت ساری بوندیں جھلک آئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ لوگ آگے بڑھ کر انھیں سنبھالتے، وہ فرش پر آگرے۔ کبھی نہ اٹھنے کے لئے!

ڈاکٹروں نے ان کی موت کا سبب ہارٹ فیل بتایا تھا۔

اپنے پہلے بچے کو
اس کے حق سے محروم نہ کیجئے

پہلے اور دوسرے بچے کے درمیان
تین برس کا وقفہ رکھیے

بچے کے پہلے تین برس اس کی ذہنی و جسمانی نشوونما
کے لئے اہم ہوتے ہیں۔ اس کو آپ کی پوری محبت اور شفقت
ضرورت ہوتی ہے۔
یہ آپ تبھی دے سکتے ہیں جب پہلے بچے کی نشوونما کے
ابتدائی تین برسوں میں دوسرے بچے کی ذمہ داری آپ پر
عائد نہ ہو۔

بچوں کی پیدائش میں وقفہ رکھنے
کے عام طریقے:

نِرودھ، گولیاں (پلز)
یا لوپ

مزید جانکاری کے لئے اپنے قریبی ہیلتھ کیئر سینٹر سے رجوع کیجئے۔

اپنے بچے کو تین سال
غیر منقسم توجہ دیجئے

ہاشم عظیم آبادی

گدھوں کی کانفرنس

ھوں کی کانفرنس میں شرکت کے لئے ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے گدھوں سے پورا پنڈال بھرا ہے۔ کانفرنس کی کاروائی
ہونے میں ابھی کچھ دیر ہے اس لئے گدھے گھانس چرنے یا گدھیوں پر آوازے کستے نظر آرہے ہیں اتنے میں مائک پر ڈھینچوں ڈھینچوں
ن کر سارے گدھے پنڈال کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ پنڈال میں گدھوں کے بیٹھنے کا خاص اہتمام ہے۔ جب ہر طرف خاموشی چھا
ے تو ایک سن رسیدہ گدھا مائک پر آکر مخصوص انداز میں ڈھینچوں ڈھینچوں کر کے کانفرنس کی افتتاح کرتا ہے۔ بعدہٗ کانفرنس کی
ت کے لئے خر جھنجھٹ پوری کا نام پیش کیا جاتا ہے۔ جس کی تائید خر چیشوی کرتے ہیں۔
سی صدارت سنبھالتے ہی خر جھنجھٹ پوری اظہار انکسار کے بعد فرماتے ہیں "حاضرین کانفرنس۔ جب گدھوں کی اس کانفرنس
مجھ ذرہ ناچیز کا انتخاب ہی کیا گیا ہے تو بہر حال مجھے یہ بار گراں اٹھانا ہی پڑے گا۔ لیکن مشکل یہ درپیش ہے کہ صبح سے پیٹ میں کافی گرانی محسوس
دل۔ بات یہ ہے کہ جھنجھٹ پوری سے روانگی کے وقت اسٹیشن پر کثیر مقدار میں خربوزے کے چھلکے کھانے کو مل گئے تھے۔۔۔۔ خیر چھوڑئیے
ں کو۔ اب میں کانفرنس کی کاروائی شروع کر رہا ہوں۔ لیکن پہلے یہ واضح کردوں کہ مقرر گدھوں کی جو فہرست مجھے دی گئی ہے وہ
ر طویل ہے کہ اگر یہ کانفرنس دو چار روز تک بھی چلتی رہی تو بھی سلسلۂ تقریر ختم ہونے کو نہ آئے۔ لہٰذا میں نے یہ طے کیا ہے کہ مقررین
ے صرف خر بے ڈھڑک پوری، خر ڈھینچوں اور خر چیشوی کی تقاریر کے بعد ریزولیوشن پاس کر کے کانفرنس کی کاروائی ختم کر دی جائے
ہ سب سے پہلے خر بے ڈھڑک پوری سے گزارش کروں گا کہ تشریف لاکر اظہار خیال فرمائیں۔ خر بے ڈھڑک پوری گہرافشانی فرماتے ہیں
محترم۔ معزز گدھے اور گدھیاں۔ میں اپنی تقریر کو زیادہ طول نہ دے کر صرف کام کی باتوں کی طرف اشارہ کرنے کی کوشش کروں
۔ تو حاضرین کانفرنس، اس سے بڑھ کر ہماری بدقسمتی اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہماری کوئی جماعت نہیں۔ ہمارا کوئی سنگٹھن نہیں۔ اور نہ ہماری
کا کوئی ظاہرا مقصد ہی ہے۔ یہ تو غنیمت ہے کہ ہمارے دانشوروں نے گدھوں کی یہ کانفرنس بلائی ہے۔ اگر اب بھی ہم گدھے
غفلت میں رہے اور ہم نے اپنے حالات سدھارنے اور بہتر بنانے کی کوشش نہ کی یا ہم نے اپنا کوئی مقصد حیات نہ بنا تا
رکھیں دوستو کہ ہم گدھے تھے۔ گدھے ہیں اور گدھے ہی رہیں گے۔
یئو۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے کہ اگر ہم کبھی اپنا پسندیدہ نغمہ سرِ راہ الاپنا چاہیں تو الاپ نہ سکیں۔ ہماری موسیقی اور ہمارے نغموں کی

کبھی ریکارڈنگ نہ ہونے دیا۔ کیا صرف انسان ہی کے اندر موسیقار اور گلوکار پیدا ہوتے ہیں۔ کیا صرف انہیں کو سڑکوں پہ الاپنے اور اپنے سریلے گانے ریکارڈنگ کرانے کا حق حاصل ہے اور ہم گدھے گئے چولھے بھاڑ میں۔ کیا اس طرح ہم گدھوں کی توہین نہیں ہوتی۔ ہمارا مقصد حیات یہی ہے کہ دن رات بوجھ ڈھویا کریں۔ ایسے چنداں ہمیں اعتراض بھی نہیں کیوں کہ ہماری قوم محنت و مشقت عادی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم پر کمر توڑ بوجھ لادا جائے۔ خاص کر یہ دھوبی جن سے عموماً ہمارا سابقہ پڑتا ہے نہ شقیق القلب اور بے رحم ہوتے ہیں۔ وہ ہم پر کمر توڑ بوجھ لادنے کے بعد خود بھی ہم پر سوار ہوتے ہیں۔ اب اگر ناقابل برداشت کی وجہ سے ہماری رفتار دھیمی ہو جائے تو رحم کھانے کے بدلے الٹا ہم پر ڈنڈے برسائے جاتے ہیں۔ آخر دھوبیوں کا یہ ظلم قوم کب تک برداشت کرتی رہے گی۔ کبھی انتہا بھی ہوگی اس کی یا یہ چکر یوں ہی چلتا ہی رہے گا۔"

"میرے دوستو یہاں آنے کے ایک روز قبل کی بات ہے کہ رامو دھوبی مجھ پر ناقابل برداشت بوجھ لاد کر جب خود بھی سوار ہوا تو بطور احتجاج میں نے دولتی جو جھاڑی تو رامو دھوبی نے مجھ پر اس قدر ڈنڈے برسائے کہ میں بے سدھ ہو گیا...... جی، اس پٹائی کا اب بھی اس قدر اثر ہے کہ اظہار خیال میں رکاوٹ ہو رہی ہے۔ لہذا اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کر رخصت ہو رہا ہوں"

خر بے ڈھرک پوری کے بعد جناب صدر نے خر ڈھینچوی کو دعوت تقریر دی۔

خر ڈھینچوی نے مائک پر آتے ہی گہر افشانی فرمائی "جناب صدر اور حاضرین کانفرنس۔ ابھی ابھی جناب خر بے دھڑک پوری اپنی دانشمندانہ تقریر کے دوران جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ ہمارے حالات کی صحیح ترجمان ہے۔ صاحب موصوف نے دھوبی کے ہاتھوں پٹنے کا جو تذکرہ کیا ہے ویسے حالات سے قریب قریب ہم سبھی گدھے دوچار ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو میں یہ پر مجبور ہوتا ہوں کہ کیا ہماری پیدائش کا مطلب یہی ہے کہ خود اپنے اوپر بھی اختیار نہ رہے اور ہماری زندگی انسان کی خدمت میں گزرے..... اور وہ بھی ایسے انسان کی خدمت گزاری میں جس کے نالائق چھوکرے ہمارے ساتھ ایسے ایسے ناروا سلوک روا جس کی تفصیل سے شرم آئے۔ ہم کو اس بات کا فخر ہے کہ ہماری قوم کے ہر گدھے میں گدھا پن بدرجہ اتم رہتا ہے لیکن ہر انسان انسانیت نہیں ہوتی۔ یہی انسان کے نالائق لڑکے ہمیں زبردستی پکڑ کر ہم پر سواری کرتے ہیں۔ ہمیں خوب خوب دوڑاتے ہیں کان اینٹھتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ مزید تفریح طبع کے لئے ہماری دم میں ٹین کا کنستر باندھ کر اس میں پوال رکھ کر جلا دیتے ہیں۔ ہیں کہ بے تحاشہ بھاگتے بھاگتے تنگ آجاتے ہیں۔ ہماری اچھل کود اور بدحواسی پر خوب خوب تالیاں بجائی جاتی ہیں۔"

"بھائیو۔ انسان کے بچے آزادانہ سڑکوں پر کھیل سکتے ہیں۔ دوڑ دھوپ کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ہمارے نونہال بھی سڑکوں پر یا لب سڑک ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا چاہیں تو ان کی تواضع ڈھیلوں سے کی جاتی ہے۔ انسان کے جو بچے کودن غبی اور کند ذہن ہو ہیں انہیں ان کے والدین گدھا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ اور وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس طرح ہماری کس قدر دل آزاری اور د ہوتی ہے۔ اب ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ لہذا ہم درخواست کریں گے کہ ایک ایسا ریزولیشن بھی پاس کیا جائے کہ کو انسان اپنے کند ذہن اور غبی لڑکے کو گدھا نہ کہے...... جی ہاں جی ہاں۔ مجھے وقت کی نزاکت کا پورا احساس ہے.... میں اپنی تقریر ختم ہی کئے دیتا ہوں۔"

اب خر چلتوی تشریف لائیں ــــ جناب صدر نے پکارا ــ

جناب خر چلتوی مائک کے سامنے آتے ہی ڈھینچوں ڈھینچوں کی خوش کن موسیقی کے ساتھ اپنا تازہ کلام سنانا چا تو جناب خر جھنجھٹ پوری مداخلت کرتے ہوئے کہتے ہیں ــ "کانفرنس کی ابتدا ہی میں میں نے یہ بات واضح کر دی تھ گدھوں کی یہ کانفرنس اپنے ناگفتہ بہ حالات پر غور کرنے کے لئے بلائی گئی ہے۔ تا کہ محفل مشاعرہ برپا کرنے کو۔ اگر جنا خر چلتوی اپنا کلام سنانے پر مصر ہی ہیں تو وہ تقریر کے بعد غزل سرائی کر سکتے ہیں۔ لیکن ابھی کسی بھی حالت میں اجازت دی جا سکتی ہے۔

جناب صدر کے اس اعلان سے برافروختہ ہو کر خرچیٹوی نے اپنا بیاض ہی چبا ڈالا۔ اور پھر تھوک نگلتے کے بعد کے بولے
"حاضرین۔ جناب صدر کی اجازت نہیں۔ ورنہ میں اس وقت ترنم کے ساتھ ایسی پھڑکتی ہوئی غزل سناتا کہ شور تحسین سے
ت نہیں تو پنڈال ضرور اڑ جاتا۔ بہرحال تو اب میں جناب صدر کی توجہ ایک نہایت اہم بات کی طرف مبذول کروں گا۔
ں نے ہماری قوم کی ترقی کی راہیں روک رکھی ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور حسرت ناک بات کیا ہو سکتی ہے بھائیو کہ انسان کی
ولاد اسکول اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرے اور ہماری اولاد اسکول اور کالجوں کا منہ دیکھنے کو ترسے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری
انسان کے بچوں کے ساتھ مدارس میں پڑھیں۔ میں اس قدر چاہتا ہوں کہ انسان ہمیں اتنی ہی چھوٹ دیدے کہ ہم گدھے بھی اپنا
اسکول، الگ کالج اور الگ یونیورسٹیاں قائم کریں۔ یہ تو دراصل تعلیم حاصل نہ کرنے کا ہی نتیجہ ہے کہ روز اول سے جو ہم
ے ہیں تو اب تک گدھے ہی چلے آرہے ہیں۔ اور ہاں۔ یہاں ایک یہ واضح کر دوں کہ اگر انسان ہمیں اس کی اجازت دے بھی دے
ں کہ ہماری اولاد ان کے اسکول اور کالج میں پڑھیں تو بھی یہ پیش کش ہماری طرف سے قابل قبول نہ ہوگی۔ کیوں کہ ان
کے یہاں "کو ایجوکیشن" ہے جس سے ہم گدھوں کو سخت بیزاری اور نفرت ہے۔ ہم کسی حال میں بھی یہ گوارہ نہیں کر سکتے کہ ہم
ھوں میں "کو ایجوکیشن" کا رواج جڑ پکڑے۔ کیونکہ تجربہ میں یہ بات آئی ہے کہ "کو ایجوکیشن" بہت ساری برائی اور خرابیاں
ا رہے۔ کم از کم ہم اپنے گدھوں اور گدھیوں کو اس لعنت سے محفوظ رکھنا چاہیں گے۔

بھائیو۔ آپ جانتے ہیں کہ آزادخیالی ہر حیوان کا پیدائشی حق ہے۔ تو حیوان ہونے کے ناطے ہم میں اور انسان میں فرق ہی
ا ہے۔ یہی ناکہ وہ حیوان ناطق ہیں۔ اور ہم حیوان مطلق۔ لیکن اس کے باوجود جتنی بھی پابندیاں ہیں وہ ہم گدھوں ہی کے لئے
ں ..... آپ دیکھ لیں کہ ہماری گدھیاں بن سنور کر سڑکوں پر نہیں نکل سکتیں۔ لپ اسٹک نہیں لگا سکتیں۔ اونچی ایڑی
ی سینڈلیں۔ جمپر اور بڑے پائنچوں کا فل بیلٹ نہیں پہن سکتیں۔ آخر ہماری قوم کے افراد بھی تو دل رکھتے ہیں اور دل کے
ساتھ حسرت و تمنا۔ لیکن ہم گدھے انسان کے شکنجہ میں اس بری طرح کسے ہوئے ہیں کہ اپنی پسندیدہ گدھی سے "لو میرج" کے بعد اگر
ہم ہنی مون منانا چاہیں تو ہنی مون نہیں منا سکتے۔ ہمارے لئے نہ تو کوئی سینما گھر ہے۔ نہ ہوٹل نہ کلب۔ اور نہ ناچ گھر ہی ہے۔
انتہا یہ ہے کہ ہماری حاملہ گدھیوں کے لئے کہیں ڈلیوری سنٹر بھی نہیں ہے۔"

دنیا جانتی ہے کہ ہماری قوم کے اندر ایک سے ایک خوش فکر شاعر، موسیقار اور گویے موجود ہیں۔ لیکن کبھی بھی آل انڈیا
ریڈیو سے ہمارا پروگرام نشر نہیں ہوتا۔ اور نہ ٹیلی ویژن پر ہی ہمیں آنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ لہٰذا میں جناب صدر سے
گزارش کروں گا کہ وہ ہمارے سارے جائز مطالبات پر غور فرمائیں تاکہ ہمارے حقوق ہمیں مل سکیں۔ خاص کر دھوبیوں
پر یہ پابندی لگائی جائے کہ وہ ہم گدھوں پر دس کلو سے زیادہ بوجھ نہ ڈالیں۔ اتوار ہماری چھٹی کا دن ہو۔ اور سینچر
کو ہم سے ہاف ڈیوٹی لی جائے۔ ہماری حاملہ گدھیوں کے لئے ڈلیوری سنٹر کھولے جائیں۔ ہمارے لئے جابجا پارک بنائے
جائیں اور سینما گھر بھی کھولے جائیں۔"

دوستو۔ ہم گدھے انسان کے ہاتھوں بہت اذیت اٹھا چکے۔ اور اٹھا رہے ہیں۔ لیکن امید ہے کہ گدھوں کی اس پہلی
کانفرنس کے بعد ہمارے حالات ایسے ناگفتہ بہ نہ رہیں گے۔ جس سے ہم گدھے دوچار ہیں۔ کیوں کہ اب ہماری قوم خواب
غفلت سے بیدار ہو چکی ہے۔ اور یقین ہے کہ اب ہم اپنے سارے جائز حقوق منوا کر رہیں گے ..... تو اب تقریر کے اختتام
پر چاہوں گا کہ اپنی ایک تازہ غزل پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں۔ اگرچہ میں اپنا بیاض غصہ میں چبا گیا تھا۔ پھر بھی ایک
تازہ غزل پیش کر رہا ہوں۔"

جناب خرچیٹوی نے غزل کی ابتدا ہی کی تھی کہ واہ واہ اور ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز سے پورا پنڈال گونج اٹھا۔ دوسرے
شعر پر تو گدھوں کے ساتھ گدھیاں بھی ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگیں۔ یہ آواز دور دور تک پھیلی تھی کہ وہ دھوبی جو اپنے
گدھوں کی تلاش میں تھے ڈنڈے لے کر دوڑ پڑے۔ انھیں آتے دیکھ کر گدھے ایسا بدحواس ہو کر بھاگے کہ ریزولیوشن پاس کرنے کا بھی انھیں ہوش نہ

آندھرا پردیش درخشاں مستقبل کی سمت آگے بڑھ رہا ہے

آندھرا پردیش میں وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام اور آنجہانی سنجے گاندھی کے ۵ نکاتی پروگرام کی پرجوش عمل آوری پر زور دیتے ہوئے سلور جوبلی تقاریب منائی جارہی ہیں۔ ماہ نومبر کے پہلے ۲۵ روز ریاست کے مختلف شعبوں کی ترقی کو نمایاں کرنے میں صرف کیے گئے۔

شری ٹی۔ انجیا کی قیادت کے تحت عام آدمی کے فائدے کے لئے مختلف اقدامات کئے گئے اور ان اقدامات کا مقصد کسانوں، صنعتی مزدوروں اور کمزور طبقات پر خصوصی توجہ دینا ہے۔

★ دیہی علاقوں میں روزگار کی فراہمی (غذا برائے کام اسکیم کے ذریعہ) جس کیلئے ۳۵ کروڑ روپے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔

★ بدعنوانیوں کو ختم کرنے کی کوششوں کے ذریعہ صاف ستھرے نظم ونسق لوک آیکت کے لئے قانون سازی — بدعنوانیوں کا سراغ لگانے کے لئے فلائنگ اسکواڈ کا قیام۔

★ سماج کے مختلف مذہبی اور لسانی طبقوں میں برادرانہ تعلقات کو بڑھانے اور انھیں ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے ریاستی انٹیگریشن کونسل کی تشکیل کی گئی ہے۔

سلور جوبلی سال کے دوران تمام مہینوں کو مختلف میدانوں سے تعلق رکھنے والے ترقیاتی پروگراموں میں تیزی پیدا کرنے کے لئے مختص کیا گیا ہے۔

دسمبر	مکانات کے لئے اراضیات	جون	کمزور طبقات کی بھلائی
جنوری	زرعی اراضیات	جولائی	ونامہوتسوا (شجرکاری)
فروری	قرضہ جات	اگست	باشندوں کے لئے
مارچ	دیہات کو بجلی کی سربراہی	ستمبر	بہبودیٔ خواتین و اطفال
اپریل	خاندانی بہبودی	اکتوبر	نوجوانوں کی بہبودی
مئی	مزدوروں اور کاریگروں کے لئے		

جاری کردہ: محکمہ اطلاعات و تعلقات عامہ حکومت آندھرا پردیش

مُہمل لکھنوی

حالت جو یہی نوچا کھسوٹی کی رہے گی
یہ دیش ابھی اور بھی ٹکڑوں میں بٹے گا
داناؤں کو سمجھائیے کچھ سے رہیں باز
دیوانے کو کیا ڈانٹنا دیوانہ بکے گا
بالین سے مہمل کی اُٹھے کہہ کے بصد ناز
ہم بیٹھے ہیں جب تک تو یہ مُردہ نہ مرے گا

جینا جو چاہتے ہوں میاں اس وبال میں
احساس کو لپیٹ لو گینڈے کی کھال میں
اقدار و اعتقاد کے بُت ایسے جل گئے
جس طرح آگ لگتی ہے لکڑی کی ٹال میں
ندّی جلن میں اپنے بھنور کو دکھاتی ہے
پڑتا ہے ہنستے میں جو گڑھا ان کے گال میں
نیتا کو میری فکر کہاں ہے کہ اس سے
حصّہ بٹاتے ہوں گے وہ چوری کے مال میں

غزل

حبیب الرحمٰن بزمی (درانجی)

ہر بار ناشتہ پہ قناعت کا درس ہے
کھانے کا ذکر جب کیا بولے ابھی نہیں
خوش رنگ مچھلیاں تو غضب کی ہیں شہر میں
کوئی بھی میرے جال میں لیکن پھنسی نہیں
زلفِ دراز دیکھ کے پیچھا نہ کیجئے
وہ منچلا ہے شہر کا وہ منچلی نہیں
اُردو زباں نے گرچہ منسٹر بنا دیا
اُردو کا بھی فروغ ہو یہ لازمی نہیں
بزمی تیرے وہ سیب سے رخسار کیا ہوئے
غازہ کی تہہ بہ تہہ سے بھی جھری چھپی نہیں

غزل

وجاہت اللہ حقی امید

"کرسی پہ بیٹھے ابا ہنڈی ہلا رہے ہیں"
وہ ایسے شوہر کہ بغلیں بجا رہے ہیں
بیوی گئیں ہیں آفس شوہر کے ذمّہ گھر ہے
کھانا پکا رہے ہیں بچے کھلا رہے ہیں
بچے ترس رہے ہیں روٹی کو چاند خاں کے
وہ میکدے میں بیٹھے ٹھینگا دکھا رہے ہیں
N.G کی دے کے بخشش بھوکے کو تین دن کے
دریا دلی کا اپنی ڈنکا بجا رہے ہیں
امید کیوں نہ ہوں گے سُرخ و سفید مُلّا!
صدقے کا کالا مُرغا ہر روز کھا رہے ہیں

مانی شہ

ڈنڈا کی یاد

ڈنڈا کی یاد آئی ۔ سولہ سال بعد سہی مگر یاد تو آئی ۔ اگر یاد نہ بھی آتی تو کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ اور نہ ڈنڈا اس کی خبر ہوتی ۔ کیونکہ ڈنڈا ان تمام جذبوں سے بلند ہو چکے ہیں ۔ البتہ ہمارا ہی کچھ چلا جاتا ۔ تھوڑا بہت جو ہمارے پاس ہے ورنہ ذہنی کنگالی میں ہم کسی سے پیچھے نہیں ۔

جس دن " یاد سرور ڈنڈا " کے سکریٹری محمد لطیف الدین کا خط ملا اُسی دن میں نے اُنھیں جواب دے دیا ۔ اپنے خط میں لطیف الدین نے انتظامیہ کمیٹی کے فیصلے سے واقف کراتے ہوئے مجھ سے خواہش کی تھی کہ میں سرور ڈنڈا پر کچھ لکھوں ۔ اور میں کمیٹی کے فیصلے اور اُن کے حکم کی تعمیل میں فوراً تیار ہو گیا ۔ اس لئے نہیں کہ ڈنڈا سے اپنے قریبی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے اُن شاموں یا راتوں کو یاد کروں جب ڈنڈا ساتھ ہوتے تھے ۔ یا اُن ہوٹلوں اور پکنک پارٹیوں کی منظر نگاری کروں جب ڈنڈا لطیفے سناتے تھے ۔ اُن لمحوں کو کریدوں جب ڈنڈا کسی اورینٹ ہوٹل یا نظامیہ یا بیچلر کوارٹر کے کسی کمرے میں گھنٹوں ہمارا انتظار کرتے تھے ۔ اور اس انتظار میں اپنی اہمیت اور بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے ڈنڈا کو خلیش بیک سے اُٹھا کر پھر قبر کے گہرے اندھیرے میں پھینک کر خود سامنے آجاؤں ۔ اور کہوں کہ یہ میں ہوں ــــ میں ــــ جس کے مشورے کے بغیر ڈنڈا کوئی کام نہیں کرتے تھے ۔ خواہ وہ ادبی زندگی سے متعلق ہو یا نجی زندگی سے ــــ اب کون مائی کا لال میرے بیان کی تصدیق کے لئے مرحوم کے پاس جائے گا ــــ اور جا کر واپس کیا ہوگا ؟ ۔ میں راضی ہو گیا ۔ اس لئے نہیں کہ ، بلکہ اس لئے کہ سرور ڈنڈا کی یاد ایک دور کی اور ایک عہد کی یاد ہے جب ایک تہذیب بڑی تیزی کے ساتھ مر رہی تھی ۔ اور دوسری اسی کی کوکھ سے پیدا ہو رہی تھی ۔ کھیتوں میں ہل چلانے والے کسان ، کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ، اور ملک کے لاکھوں ، اور کروڑوں انسان جو غریبی ، افلاس اور جہالت کے بوجھ تلے کسمسا رہے تھے ۔ ایک نئی صبح کا خواب لئے ہوئے اپنی آنکھیں کھول رہے تھے ۔ جس کا انھیں برسوں سے انتظار تھا ۔ آخر کار آزادی کی وہ صبح آئی ۔ بڑے انتظار کے بعد آئی ۔ لیکن اُن کے گھروں اور زندگیوں میں چھایا ہوا گہرا اندھیرا ختم نہیں ہوا ۔ سینکڑوں ، لاکھوں اور کروڑوں انسان اب بھی ننگے اور بھوکے تھے ۔ آخر وہ کون سی قوت تھی اور ہے جو اُن کے منہ کے نوالوں

کو چھین لیتی ہے۔ وہ قوت جو اُن کے کھیتوں، کارخانوں اور اُن کے ہاتھوں سے پیدا ہونے والی ہر چیز پر غاصبانہ قبضہ کر لیتی ہے۔ اور انہیں خالی ہاتھ اور خالی پیٹ سڑکوں، فٹ پاتھوں، گلی کوچوں اور گندی بستیوں میں چھوڑ دیتی ہے۔ اس تلخ حقیقت کو ڈنڈا نے اپنے دل اور روح کی تمام پاکیزگیوں اور درد مندیوں کے ساتھ نہ صرف محسوس کیا بلکہ انہیں اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ خنجر کسی اور پر چلتا تھا۔ لیکن ڈنڈا تڑپتے تھے۔ سارے جہاں کا درد وہ اپنے دل میں لئے پھرتے تھے!

حالانکہ ڈنڈا کی زندگی بڑی خوشحال تھی۔ اور وہ متوسط طبقے کے ایک خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ڈنڈا کے والد عبدالقادر خان صاحب مرحوم لوکل فنڈ کے منتظم تھے۔ اور اس زمانے میں منتظم ہونا بہت بڑی بات تھی جب کہ لوگ تیس تا ساٹھ روپے کی سرکاری ملازمت کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے تھے۔ عبدالقادر صاحب کے چار لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ اور ڈنڈا پہلی اولاد تھے۔ اس طرح پیدائش کے ساتھ ہی انہیں بزرگوں سے ڈھیروں پیار ملا۔ جو انہیں آخری سانس تک حاصل رہا۔ چادر گھاٹ ہائی اسکول میں ابتدائی تعلیم کے بعد سرور خان ڈنڈا نے کالج آف فائن آرٹس اینڈ آرکیٹکچر سے پینٹنگ میں ڈپلوما حاصل کیا۔ شادی ایک لیڈی ڈاکٹر سے ہوئی۔ پھر ایک لڑکے اور لڑکی کے باپ بنے۔ بچوں کو پالنے اور گھر کو چلانے کے لئے گتہ داری کی۔ لیکن ادب میں گتہ داری کے پیشے کو نہیں اپنایا۔ حالانکہ اس وقت ادب کی سرزمین بہت زرخیز تھی۔ اور ادب کی گتہ داری اور ٹھیکوں کے بڑے مواقع تھے۔ اگر ڈنڈا ایک چھوٹے موٹے نواب کو جھک کر سلام کر لیتے تو نہال ہو جاتے۔ لیکن ڈنڈا کی پٹھانیت نے اسے گوارا نہیں کیا۔ ایک باعزت اور بے داغ زندگی گذاری اور عین جوانی میں سب کو روتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔

ڈنڈا کی زندگی پر اس مختصر نوٹ سے یہ بات کہیں سے بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ سرور خان کو ڈنڈا بنانے والی وہ کون سی قوت تھی؟

میرا خیال ہے کہ اس کا جواب ڈنڈا کی اُن اداکارانہ صلاحیتوں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے جب وہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں اسکول اور کالج میں کھیلے جانے والے ڈراموں میں حصہ لیتے تھے۔ اور بعد میں یہی شوق انہیں عوامی اسٹیج تک لے آیا۔ کبھی مزدور، کبھی کسان اور کبھی ایک تباہ حال بے روزگار شخص کا روپ دھارتے دھارتے یقیناً انہوں نے اپنی دانست میں یہ سمجھ لیا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہیں، بلکہ ایک قلاش انسان ہیں جسے کھانے کو نہ کھانا ہے اور نہ پہننے کو کپڑا۔ یہ اداکاری کی معراج نہیں تو اور کیا ہے؟ کالج آف فائن آرٹس میں انہیں اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو پیش کرنے کا موقع ملا۔

اُن کی ذہنی صلاحیتوں کو اُبھارنے میں اُن کے وہ قریبی دوست بھی شامل ہیں جو آج ملک کے ممتاز آرٹسٹوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر سعید بن محمد نقش، اور سعادت علی خان قابل ذکر ہیں۔

محمد اکبر وفا قانی صرف شاعر اور نقاد ہی نہیں تھے بلکہ آرٹ پر بھی ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ ڈنڈا کو اکبر وفا قانی کی صرف شفقت ہی حاصل نہیں تھی بلکہ ان کے توسط سے وہ مشہور دکنی شاعر نذیر دہقانی اور اعجاز حسین کھٹا سے بھی ملے۔ اور سرور خان کے اندر چھپا ہوا شاعر جاگ اُٹھا۔ اور پھر وہ ڈنڈا بن کر فرعونوں اور جھوٹے خداؤں کے سر پر برسنے لگے۔

شاعر کی حیثیت سے ڈنڈا نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اور دوسری طرف وہ حیدرآباد اور بیرون حیدرآباد

دسمبر ۱۹۸۰ء

کے بڑے سے بڑے شاعر کے لئے ایک کھلا چیلنج تھے۔ مخدوم کو چھوڑ کر تمام شاعر ڈنڈا سے گھبراتے تھے۔ اس لئے ہر ایک کی یہی کوشش رہتی کہ ڈنڈا سے پہلے پڑھ لیں!

ایک بار ڈنڈا مائک پر آجاتے تو جلنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ امرار کے ساتھ عوام انھیں لوک گیت سنانے کی فرمائش کرتی رہتیں۔ اور عوام بار بار ڈنڈا کو سنتے اور ڈنڈا سناتے سناتے تھک جاتے۔ لیکن عوام کی تشنگی کم نہ ہوتی!

ویسے ڈنڈا نے کامیاب غزلیں بھی کہی ہیں۔ لیکن ان کی شاعری پر لوک گیتوں کا بڑا اثر ہے۔ اور اس اثر نے ان کی نظموں اور گیتوں کو ایک لب و لہجہ عطا کیا جو سننے والے کو صرف متاثر ہی نہیں کرتا۔ بلکہ انھیں اپنی پوری گرفت میں لے لیتا ہے!

سنیئے! یہ آواز جو بڑی دور سے آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن دل کے کتنے قریب ہے۔

میں کتھا سناتا ہوں بھئی چڑی مڑی غپ چپ

بھارت کے بھاگ جاگے انگریز یاں سے بھاگے
ایک ہورا قدم آگے
میں سوچ بتاتا ہوں

میں کتھا سناتا ہوں بھئی —

سرکار یہ ہماری سنکھیا کے ناد پیاری
کوڑی کو ٹیکس کی ماری میں سو سوچ بتاتا ہوں

میں کتھا سناتا ہوں بھئی —

نیش نیش سوستم کاڑے کیا رات کیا دن دھاڑے
جنتا کو زندہ گاڑے میں سو سوچ بتاتا ہوں

میں کتھا سناتا ہوں بھئی۔

یہ کتھا ابھی ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ ابھی تک یہ جاری اور ساری ہے۔ کیا کسی بھی زبان کا ادیب اور شاعر اس بڑے المیے کے خاموش تماشائی رہے گا؟

ڈنڈا نے بار بار اپنی عصری حسیت کا ثبوت دیا ہے۔ دیکھئے وہ کن الفاظ میں ہمارے ملک کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

ادے نا نا دیشم

یاں دھوتی بھی گت نیش، واں اُن کو ہے ریشم، ادے نا نا دیشم
بڑا پاپ ہے یاں پو ہنسنا ہنسانا سداں ریت ہے یاں کی رُونا رُلانا
پیچ لڑ کو مرئیں گھر گرو، ونیکیشم ادے نا نا دیشم ——

اب کوئی بتائے کہ شیخ گھرو، اور ونیکیشم آپس میں کیوں لڑتے ہیں۔ اور لڑ رہے ہیں۔ اور کیوں خون کی ندی مراد آباد سے نکل کر ملک کے دوسرے شہروں، صوبوں اور گاؤں کا رُخ کر رہی ہے؟

یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ملک کے چھوٹے بڑے رہنما، دانشور اور اعلیٰ عہدہ دار نہیں دیں گے بلکہ یہاں کی بولی اور لکھی جانے والی تمام زبانوں کے ادیب اور شاعر دیں گے۔ اور انہیں جواب دینا ہوگا۔ ورنہ وہ زمانہ دور نہیں جب عوام گلی کوچوں، فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر اپنے ادیبوں اور شاعروں سے حساب کتاب چکتا کریں گے۔ اور پوچھیں گے کہ اُس وقت جب ہم خون میں نہائے ہوئے تھے۔ اور زندگی کی تلاش میں دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے، اُس وقت جب ہمارے بیوی بچے بھوک سے چلا رہے تھے۔ اُس وقت تم ـــ تم کہاں تھے؟

سُنا کہ تم اُس وقت اپنی محبوبہ کے گیت گا رہے تھے۔ اور اُس کے انتظار میں آسمان کے تارے گن رہے تھے۔

شرم نہیں آتی تمہیں؟

ڈنڈا، اور ڈنڈا کی طرح ایماندار شاعروں کو یہ کہہ کر کسی بھی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ پروپگنڈہ شاعری ہے۔ اور شاعری میں یا ادب میں پروپگنڈہ نام کی کیا چیز ہوتی ہے اور اس کا کیا مفہوم ہوتا ہے میں نہیں جانتا لیکن ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اتنا ضرور جانتا ہوں کہ دنیا کی کسی بھی مہذب زبان کی اعلیٰ شاعری اور نثر پارے کسی خاص نظریے اور خیال کا پروپگنڈہ ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ اعتراض کرنے والے بھی اپنی تخلیقات میں اس خیال کا پروپگنڈہ کرتے ہیں کہ زندگی کا کوئی مفہوم نہیں اور یہ سب بے معنی ہے۔ اور وہ اپنے قاری یا سامع کو اندھیرے سے نکال کر پھر اندھیروں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم سب اپنے اپنے نظریوں اور عقیدوں کا پروپگنڈہ کرتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ پروپگنڈہ زندگی، سماج اور سماج میں رہنے والے انسانوں کے لئے فائدہ مند ہے یا نقصان دہ! اگر کسی کے پاس یہ کسوٹی ہے تو ڈنڈا کی شاعری کو سمجھنے میں دقت نہیں ہوگی۔

ڈنڈا نے اپنی شاعری کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ اور ایک عام آدمی تک اپنے دل اور رُوح کی بات پہنچانے کیلئے اُنہوں نے اس میڈیا کو استعمال کیا جسے ہم دکنی زبان کہتے ہیں۔ اور پھر ڈنڈا نے اُسی عام آدمی کے دل کی دھڑکن سب کو سنائی جس میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی۔

سُنیئے۔ اُس عام آدمی کی بیوی کیا کیا سوچتی ہے۔ اور اپنی زندگی کے ساتھی سے کس طرح مخاطب ہے۔

اُٹھو اُٹھو جی سیّاں صبوں ہونے کو ہے
باسناں ہور بھنڈولیا خالی پڑئیں ـــ ان پوچھے اذاں دینے آکو کھڑئیں
بچے رو رئیں تمہیں کیا جی سونے کو ہے ـــ اُٹھو اُٹھو جی سیاں ـــ
اَجلی ٹوپی کے راج کو انگار لگو ـــ ان کے کاموں کو ہر کاج کو انگار لگو
رات کا منہ بھی اَب کالا ہونے کو ہے ـــ اٹھو اٹھو جی سیاں ـــ
اُن کو قسیدث لگو، ان کو گولی لگو ـــ ان کو پیلگ لگو، ان کو جبرلی لگو
انوں پچھلا کو سنجے مسلنے کو ہے ـــ اٹھو اٹھو جی سیاں ـــ

اِس کو سے کے بعد گیت کے ختم پر وہ یوں کہتی ہے۔

ہم بھی ان کی سمجھنے لگئیں شینیاں ـــ پتھروں سے نچوڑیں گے ہم سنکیاں
ساری بستی کی بستی مچلنے کو ہے ـــ اٹھو اٹھو جی سیاں ـــ

لیکن سیاں ابھی تک نہیں اُٹھے۔ سولہ برس سے، بتیس برس سے اور کئی سو برسوں سے سیاں سو رہے ہیں عورت برابر آواز دے رہی ہے۔ اور جس وقت سیاں اُٹھیں گے اُس دن ——— اُس دن پتہ نہیں کیا ہوگا ——— یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

ڈنڈا کی یاد ایک دور کی یاد ہے۔ شہر حیدرآباد اور تلنگانہ کا ہر شخص ڈنڈا کو بھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ آخری سانس تک ڈنڈا نے اُن کے لئے گیت گائے۔ ڈنڈا حیدرآباد کی مشترکہ تہذیب کی منہ بولتی چلتی پھرتی تصویر تھا۔ جس نے مزاح کو اور طنز کو وقار بخشا۔ ڈنڈا نے دوستوں کو چاہا بھی اور اُن سے نظریاتی بنیادوں پر لڑائیاں بھی لڑیں۔ لیکن شائستگی کے دامن کو اُس نے کبھی نہیں چھوڑا۔ ڈنڈا دکن کا وہ پہلا شاعر تھا جس کے نام پر ہزاروں لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ میں نے ڈنڈا کو ستر اَسی ہزار کے مجمع میں قریب سے سُنا ہے۔ لیکن جس وقت وہ ڈائس سے اُترتا تھا تو وہ اتنا ہی مخلص ہوتا جتنا ڈائس پر جانے سے پہلے تھا۔ آخری وقت تک اُس کے قدم بڑی مضبوطی کے ساتھ زمین پر جمے رہے۔ کیونکہ ڈنڈا اس بے رحم اور تلخ حقیقت سے واقف تھا کہ جب کوئی فن کار زمین سے اپنا رشتہ توڑ کر خلاؤں میں اُڑنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ زمین پر اُلٹا واپس آجاتا ہے۔ اور اُس وقت زمین اُسے قبول نہیں کرتی !!

———— ⁂ ————

⁂ ⁂ ⁂

پورب اُردو بولے سارا پچھم اردو بولے
اُتر دکن کی اُردو تو کاناں میں رس گھولے
سداں لڑاکو پنڈت ملاں محبت پو جب آتیں
غُصّہ غُصّہ کو توی اداں سے اُردو کے گُن گاتیں
اک گھٹ ہو کو دونوں جنے اُردو میں یہ بولے
پورب اُردو بولے سارا پچھم اُردو بولے

آندھرا کی پلمّا ہو یا منجولا مہا راشٹن
کرناٹک کی ناگ منی یا گلشن بی کی سوکن
چاروں سہیلیاں پوتی نامہ اُردو ہی میں کھولے
پورب اُردو بولے سارا پچھم اُردو بولے

سادھو ہو یا سائیں ہو یا پیر پروہت چھیلا
راجے رایاں، جنگ بہادر یا کوئی نہلا دہلا
اُردو کے موتیاں کو یارو سونچ مل کو رولے
پورب اُردو بولے سارا پچھم اُردو بولے

پرویز یداللہ مہدی

سرور ڈنڈا کا دکھنی جھنڈا

(خاکہ نما مضمون)
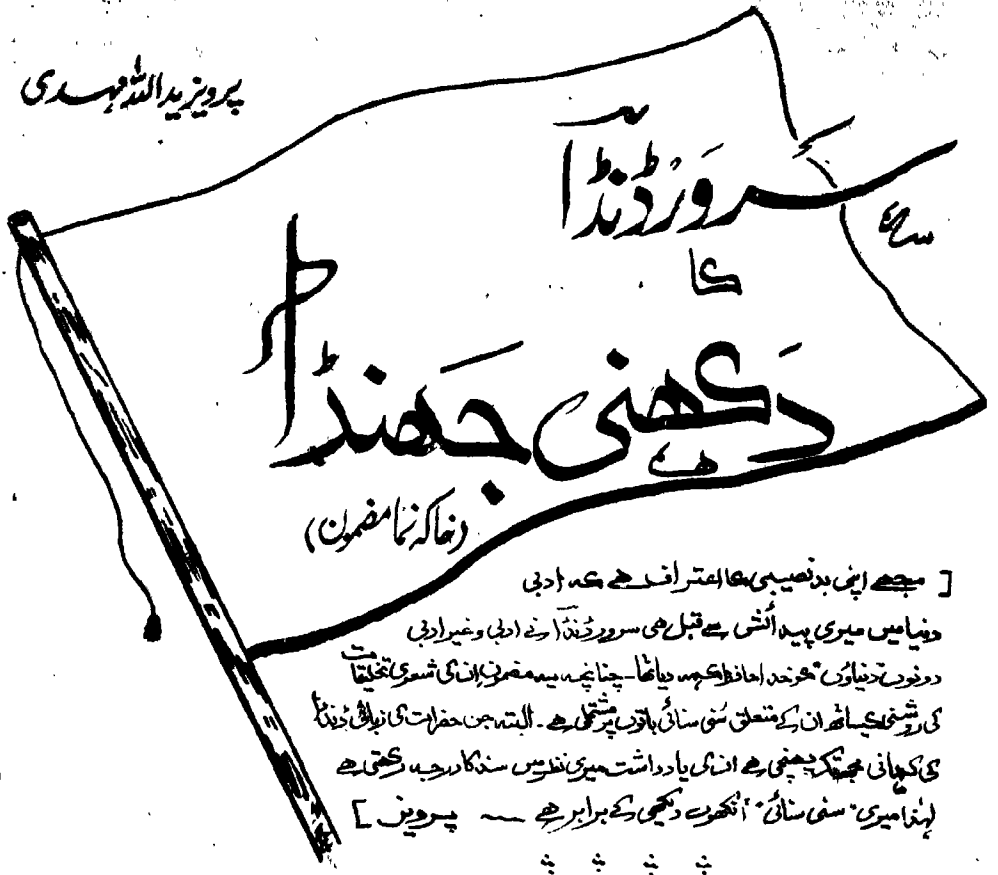
[مجھے اپنی بدنصیبی کا اعتراف ہے کہ ادبی دنیا میں میری پیدائش سے قبل ہی سرور ڈنڈا نے ادبی و غیر ادبی دونوں دنیاؤں کو خدا حافظ کہہ دیا تھا ـ چنانچہ یہ مضمون ان کی شعری تخلیقات کی روشنی کے ساتھ ان کے متعلق سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے ـ البتہ جن حضرات کی زبانی ڈنڈا کی کہانی مجھ تک پہنچی ہے ان کی یادداشت میری نظر میں سند کا درجہ رکھتی ہے لہٰذا میری "سنی سنائی" آنکھوں دیکھی کے برابر ہے ـــ پرویز]

٭ ٭ ٭ ٭

یوں تو دکھنی ادب میں بے شمار شاعروں اور ادیبوں نے اپنے رنگ برنگے جھنڈے گاڑے ہیں لیکن مزاحیہ شاعری کے "ایورسٹ" پر ایک جھنڈا سب سے اونچا نظر آتا ہے جس کا پرچم تو دیدہ زیب ہے ہی ڈنڈا بھی قابل دید و بل داد ہے ـ یہ دکھنی زبان کے نامور مزاحیہ شاعر سرور ڈنڈا کا جھنڈا ہے ـ دکھنی زبان و ادب میں جھنڈوں پر جھنڈے اڑنے والے اس زندہ دل شاعر کو اب سے پندرہ سترہ برس پہلے قدرت نے موت کی جھنڈی دکھا کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا لیکن اس کے کلام کی گونج آج تک باقی ہے اور جب تک دکھنی زبان جاننے والوں کا نقار خانہ سلامت رہے گا یہ آواز گونجتی رہے گی ـ

آئیے ! آپ ـ ہم دکھنی زبان کے چٹخارے کا لطف اٹھانے کے لئے سرور ڈنڈا کے کلام کے پنکھ لگا کر دکن کی سیر کو چلیں ـــ سرور ڈنڈا کا تخلص ڈنڈا ـ ویسے صوتی اعتبار سے بڑا بھونڈا معلوم ہوتا ہے لیکن ڈنڈا اسی "ڈنڈے" کے سہارے اپنے "مقطعوں" میں بڑی "سنوں گترا لنہ" باتیں بھی نہایت آسانی سے کہہ گئے ہیں ـــ

جو اچھی بُری مانتے نیئں چپکے اکڑتیں
ایسوں کو مٹھوں شام فقط ڈنڈا بجا تا

سرور ڈنڈا صرف شاعری ہی میں اپنا ڈنڈا نہیں بجاتے تھے بلکہ عملاً بھی ایک عدد ڈنڈا اپنے ساتھ رکھتے تھے صرف دکھانے کے لئے۔ یہ ان کے پیشے کی مجبوری تھی۔ لیکن سرور ڈنڈا صرف طالب علموں کے اُستاد شاعر نہیں تھے بلکہ عوامی شاعر تھے اور اپنے تخلص ہی کی طرح ان کی شاعری بھی منفرد تھی۔ یعنی کسی تیل پلائے ہوئے ڈنڈے کی طرح ایک دم سیدھی صاف نیچے سے اوپر تک نہ کوئی بل نہ کوئی غیر ضروری گھماؤ پھراؤ۔ ایک دم آسان دل سے نکل کر سیدھے دل میں اُتر جانے والی۔ یہی وجہ ہے کہ عوام نے انہیں زندگی ہی میں سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور یہ رتبۂ بلند ظاہر ہے کسی کسی کو ہی ملتا ہے ورنہ اکثر شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ المیہ یہ ہوتا ہے کہ شہرت اور مقبولیت کی سیڑھی لگا کر عوام الناس کے سر آنکھوں پر بیٹھنے کی آرزو میں بے چاروں کی حالت بیٹھتے بیٹھتے ایک دن حشر یہ ہوتا ہے کہ خاک کے اوپر نظر آنے والی شئے خاک یہ کہتے ہوئے تہہِ خاک پہنچ جاتی ہے ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ !

لیکن سرور ڈنڈا کے یوں زندگی ہی میں عوام الناس کے سر آنکھوں پر دندناتے ہوئے چڑھ جانے کی وجہ صرف ان کی مزاحیہ شاعری نہیں تھی بلکہ وہ زبان تھی جسے اُنہوں نے اپنی شاعری کے لئے منتخب کیا۔ سرور ڈنڈا یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ عوامی زبان، شاعری کے حق میں فائر بریگیڈ کی سیڑھی کے مترادف ہوتی ہے۔ چاہے جتنا اونچا کرتے چلے جائیے سیڑھی کے پہلے زینے کا ربط زمین سے کبھی نہیں ٹوٹتا۔ چنانچہ ڈنڈا، مصرعے کے ساتھ اپنے شعروں میں اونچی اونچی باتیں کہہ جاتے۔ اور کبھی ان کی کوئی بات، کسی فاسٹ بولر کے "بمپر" کی طرح عوام کے سر پر سے نہیں گذرتی ــــــ عوامی زبان بظاہر بڑی آسان بڑی سہل معلوم ہوتی ہے لیکن جب کوئی اُسے ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا اپنا جسمانی نظم و ضبط بگڑنے لگتا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ عوامی زبان میں تخلیق شعر و ادب کھیل نہیں۔ اس کے لئے بڑے دل گُردے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن سرور ڈنڈا کا کلام پڑھیئے تو کہیں بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ انہیں کسی مرحلے پر کوئی مشکل درپیش آئی ہو بلکہ ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا دل اور گُردہ ان کے تخلص ہی کی طرح بے حد مضبوط تھے ــــ

سرور ڈنڈا کا پورا نام غلام سرور خاں تھا۔ یہ کہنے کی قطعی ضرورت نہیں کہ وہ پٹھان تھے۔ البتہ ان کے قریبی احباب کی زبانی سنا ہے کہ اس پٹھان میں "آن" بہت زیادہ تھی اور "پٹھان پن" بہت کم۔ ویسے لوگ باگ کسی کے متعلق کچھ نہ کچھ اُڑاتے ہی رہتے ہیں لیکن سرور ڈنڈا کی پٹھانی کے تعلق سے دوستوں کا یہ تجزیہ اس واسطے بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ اگر سرور ڈنڈا میں واقعی پٹھانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی تو وہ شعر سنا کر داد وصول نہ کرتے بلکہ سود وصول کرتے ــ البتہ ڈنڈے کا استعمال دونوں صورتوں میں ہوتا مگر فرق کے ساتھ۔ شاعری کے ڈنڈے کی کشش لوگوں کو اپنی طرف یوں کھینچتی جیسے مقناطیس لوہے کو جبکہ سود خور کے ڈنڈے کو دیکھ کر ہی لوگوں کی روح فنا ہو جاتی ــ اور سرور ڈنڈا نے برسوں بلکہ صدیوں سے بدنام پٹھانی ڈنڈے کو اپنی شاعری کا لہو پلا کر محبت کی ایسی علامت بنا دیا جسے بلالحاظ مذہب و ملت، دکن کے عوام نے اپنے دل میں جگہ دی۔

سرور ڈنڈا کے کلام کا پورا پورا لطف اُٹھانے کے لئے دکھنی زبان کو اس کے مزاج کو، لب و لہجہ کو خصوص لفظیات اور اصطلاحات کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہ تفصیل میں جانے کا موقع تو نہیں تاہم دکنی زبان کی کچھ بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالنا ضروری ہے تاکہ آپ بھی سرور ڈنڈا کے کلام کا تھوڑا بہت لطف اُٹھا سکیں۔ دکنی زبان میں اسم کی جمع، واحد کے آخر میں "آں" بڑھانے سے بنتی

ہے کتاب کی جمع "کتاباں"، گھر کی جمع "گھراں" وغیرہ۔ یہاں سرور ڈنڈا کا ایک شعر نمونتہً پیش ہے جس میں دکنی قاعدے
سے شاعر نے پھول کی جمع پھولاں بنائی ہے سے

بات کرے تو پھولاں جھڑنا
بات کو منہ پھٹ نکّو رے

دکنی زبان نے سرزمین دکن کی جن دوسری مقامی زبانوں کا اثر قبول کیا ان میں مرہٹی، تلگو اور کنڑی اہمیت رکھتے ہیں
ان پر مرہٹی زبان کا اثر نسبتاً زیادہ ہے۔ مثلاً دکنی میں حرف تخصیص کے لئے "چ" استعمال ہوتا ہے جو مرہٹی زبان کا لاحقہ ہے۔
ہی، کو "تو ہیچ"، "ایساہی" کو "ایسا ہچ" وغیرہ۔ اس ضمن میں سرور ڈنڈا کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے اس میں شاعر
نرالاہی، کو دکنی قاعدے کی رُو سے "نرالا ہچ" بنایا ہے سے

قانون نرالا ہچ ہے محفل میں اُن کی آج
کمزوروں، ناتوانوں کو "اُٹ بیٹ" کرانا

نقادانِ ادب "سرور ڈنڈا کی شاعری ان کے اپنے دور کی سچی آئینہ دار ہے جس میں ان کے گرد و پیش کے ماحول کی ہر
کے خط و خال نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔" مثال کے طور پر ملاحظہ فرمائیے ان کی مشہور نظم "اِدے نامادیشم" کے کچھ
واضح ہو کہ اس نظم کا عنوان تلگو زبان میں ہے جسے شاعر نے ٹیپ کے بند کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے۔
رادیس ہے سے

سدا میرے گاؤں پو غربت کا موسم   نہ فاقوں سے فرصت نہ دم میچ ہے دم
یاں لنگی بھی گت نئیں واں اُن کو ہے ریشم   اِدے نامادیشم، ادے نامادیشم

جاں جینے پو ٹیکساں، جاں مرنے پو ٹیکساں   جاں جنور سے بدتر ہیں بے چارے انساں
جاں ملنا بی مشکل ہے بیڑی کے دو دم   اِدے نامادیشم . . . . . .

بڑا پاپ ہے یاں کو ہنسنا ہنسانا   سداں ریت ہے یاں کی رونا رُلانا
چپچپ لڑکو مرریں گھٹر و ونیکیشم   اِدے نامادیشم . . . . . .

سرور ڈنڈا کے خیالات، جذبات اور محسوسات بالکل سچے کھرے اور اسلوب و زبان و بیان بے حد سادہ اور عام فہم ہے۔
سرمائیے غزل کے دو شعر سے

دلِ ناداں سریا سپلتے پھلتے   کریا ناک میں دم سپلتے سپلتے
میرے اُمیداں کی میرے ارماناں کی   پتنگ تھاپ کھا گئی سکتے سکتے

سرور ڈنڈا نے ہنسی مذاق میں عوام الناس کے جذبات کی بڑے دلچسپ اور اچھوتے رنگ میں ترجمانی کی ہے۔
کی ہٹ ملاحظہ فرمائیے سے

پی یو، پی یو کی ہٹ نکّو رے   نکّو رے ایسی ہٹ نکّو رے

میں جو زور کیا شرم سے بولے چھوڑ مجھے چل ہٹ نکو رے

اگلے شعر میں امن کا پرچار اور جنگ کی مذمت کرتے ہیں ؎

امن کے باتاں امن سے کرنا ہات میں برچھی لٹ نکو رے

سرور ڈنڈا نے ہر ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ چاہے وہ سماجی، یا سیاسی ہو کہ انفرادی۔ آج کل کی سیاست کی صحیح ترجمانی ملاحظہ فرمایئے ؎

تعریف سیاست کی فقط اِتّی سے یارو جس کو ملیا موقع اُنے ڈھول بجانا

اگلے شعر میں آج کے دل بدلو سیاست دانوں کی غیر یقینی کیفیت ملاحظہ فرمائیے ؎

چور رستے پو پہنچے جو سیاست کی تو بولیس ملدھا ہوں مائی باپ مجے رستا بتانا

اور ان خود غرض سیاستدانوں کے ہاتھوں غریب جنتا کا حشر اس شعر میں ملاحظہ فرمائیے ؎

نہ مرنے میں شامل نہ جینے میں شامل
کئی سال گزرئیں لٹکتے لٹکتے

سرور ڈنڈا نے غزل، نظم، گیت ہر صنف میں خامہ فرسائی کی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے ان کا یہ گیت جو انہوں نے دکھنی اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور دکن کے مقبول و درد مند بادشاہ قلی قطب شاہ کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کیا ہے۔ ؎

قلی قطب باشا تھے رنگ رنگیلے رنگ رنگیلے بڑے چھبیلے

(۱) بھاگیہ ودّی سے لے کو بھاگ متی تک ممتا کے چھاؤں سے مدھر متی تک
مست مراداں الو لے تلو لے قلی قطب باشا تھے . . . .

(۲) جنتا کی سیوا میں تن من دھن سے کبھی چھن چھن سے کبھی کھن کھن سے
جنتا کی سیوا میں پاپڑ بھی بیلے قلی قطب باشا تھے . . . . .

سرور ڈنڈا چونکہ بنیادی طور پر عوامی شاعر تھے اس لئے ان کی مخاطبت ہمیشہ عوام الناس سے رہی ؎

سچی راہ پو کانٹے کا سنٹے سچی راہ سے ہٹ نکو رے
سورج بن کو جگ پو چھا جا جان کے جیسا گھٹ نکو رے

اب ایک اور غزل کے چند شعر ملاحظہ فرمائیے جس میں شاعر نے سادگی کے ہاتھوں اپنے لٹ جانے کی واردات قلم بند کی ہے ؎

ہو کو برباد اُن کے ہاتھاں سے اب بھی اُن کا خیال ہے سو ہے
ان کی قسمت میں مرغی اور مچھی میری قسمت میں دال ہے سو ہے

آخر میں سرور ڈنڈا کی ان دو مشہور نظموں کا ذکر کروں گا جو اپنے سیاسی بیک گراؤنڈ کے باعث حیدرآباد میں بے حد مقبول ہوئی تھیں اور گلی گلی گائی جاتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب موجودہ صدر جمہوریہ ہند محترم سنجیوا ریڈی صاحب آندھرا پردیش کے چیف منسٹر ہوا کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے پہلی نظم کے دو بند ؎

تمیں آندھرا کے گاماں اُو سنجیوا ریڈی ماماں
یہ تم کریں سو کاماں اُو سنجیوا ریڈی ماماں

اس نظم کا آخری بند تو اس قدر اچھوتا اور چونکانے والا ہے کہ بھلائے نہیں بھولتا۔

پولیس کی ڈائری میں ڈنڈے کی شاعری میں
فل اسٹاپ ہے نہ کاماں اوسنجیوا ریڈی ماماں

دوسری نظم جو دراصل گیت کے اسٹائیل میں ہے اس میں شہر حیدرآباد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کے سفر کا حال بیان کیا گیا ہے گویا حیدرآباد کی "بلدی حدود" کے اندر جتنے بھی سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر وقوع پذیر تھے ان میں اپنی اپنی اخلاقی، معاشی اور سماجی حدود کو متجاوز کرنے والوں کے پول کھولے گئے ہیں اور جس کی زبان سے ڈنڈا نے یہ گیت نما نظم گوائی ہے وہ عوام کے اس طبقے کا نمائندہ ہے جس کا کام ہی سڑکیں ناپنا، گلیوں کی خاک چھاننا ہوتا ہے۔ یہ ایک ٹانگے والا ہے جو روز سواریوں کو شہر کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لایا لے جایا کرتا ہے۔ گیت کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے ؎

شاہ پور واڑی سے پہاڑی میری چلی رے گھوڑا گاڑی
بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
راجا ہو جانا فٹ پاتھ پر
لالہ ہو جانا فٹ پاتھ پر

پھر گھوڑا گاڑی کے ساتھ گیت بھی آگے بڑھتا ہے ؎

(۱) یہ ہے دفتر زراعت یعنی کسانوں کی بات
جن کو جسم کو دیتیں ہاتھ بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
(۲) یہ ہے سکریٹریٹ یاں پو، کاروائیاں لیٹ
یاں پو ارماں چڑتیں بھینٹ بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
(۳) یہ ہے محکمۂ برقی جتنا بولے یہ سُرخی
اس کے کاماں سب ورقی بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
(۴) یہ ہے اسمبلی کا ہال یاں پو سیاسی ہیں دلّال
جن کی بخشی ہوئی کھال بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
(۵) یہ ہے ریڈیو اسٹیشن یعنی پریوں کا جنکشن
راگ ہوا تال میں ان بن بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر
(۶) یہ ہے دفتر انصاف یاں کی ترازو ہوگئی صاف
ٹل گئی ملزموں کی ناف بابو ہو جانا فٹ پاتھ پر

سرور ڈنڈا کے کلام کی یہی خصوصیت ان کی مقبولیت کا راز تھی، اپنے شستہ طنز اور شگفتہ مزاح کے توسط سے جہاں ڈنڈا نے سماجی ناانصافیوں کو للکارا ہے، برخود غلط سیاستدانوں کے چہروں پر چڑھی خوبصورت نقاب نوچ کر ان کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی وہیں اپنی سادہ دلی کے ہاتھوں معاشی الجھنوں میں گرفتار عوام الناس کو امید بھی دلائی کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مایوسی کے جو بادل وقتی طور

پر اُمڈ آئے ہیں ایک دن ضرور چھٹ جائیں گے لیکن افسوس ان بادلوں کے چھٹنے سے قبل عوام کو اُمید دلانے والا یہ البیلا شاعر خود موت کی وادی میں ہمیشہ کے لئے کھو گیا ہے

خدا اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

چلتے چلتے اتنا اور عرض کر دوں کہ اس مضمون میں جو چیدہ چیدہ شعر میں نے استعمال کئے ہیں انہیں چاول کے وہ چند دانے سمجھئے جنہیں دیکھ کر پوری دیگ کے پکوان کا اندازہ ہو جاتا ہے لیکن یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اتنی شاندار 'دیگ' کا مزیدار "پکوان" لقموں کی شکل میں ادھر اُدھر بکھرا پڑا ہے۔ آج تک کسی کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ سرور ڈنڈا کے بکھرے ہوئے کلام کو مجموعہ کی شکل دے سکے ـــــــ خود سرور ڈنڈا کو جانے کی اس قدر جلدی تھی کہ مجموعۂ کلام پیش کرنا تو دور وہ غالباً اُسے مرتب بھی نہیں کر سکے۔ اُنہوں نے شاید حج بیت اللہ شریف سے مشرف ہونے کے بعد یہ پروگرام طے کر رکھا تھا۔ میں سوچتا ہوں اگر سرور ڈنڈا مجموعہ شائع کروانے کے بعد حج کے لئے جاتے تو کسی کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ دکھنی ادب میں ایک قابلِ قدر مجموعے کا اضافہ ہو جاتا۔ غالباً سرور ڈنڈا کے زمانے میں حج کے لئے روانگی سے قبل بیٹا بیٹی کی شادی کے فرض سے سبکدوش ہونے کے ساتھ آج کی طرح مجموعۂ کلام بھی چھپوانے کا رواج نہیں تھا۔ آج تو جس شاعر یا ادیب کو حج کی توفیق ہوتی ہے وہ روانگی سے قبل اپنا مجموعۂ کلام چھپوا کر مفت تقسیم کر دیتا ہے ـــــــ بہرحال ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی آگے بڑھے اور سرور ڈنڈا کے کلام کو زیورِ طبع سے آراستہ کر کے دکنی ادب کی اس بجھتی ہوئی لو کو از سرِ نو زندگی و تابندگی بخش دے ورنہ اپنوں کی بے رُخی اور چاہنے والوں کی بے اعتنائی کا سرور ڈنڈا ہمیشہ گلہ کرتے رہیں گے ـــ

ایسے روشن زمانے میں ڈنڈے
اَیَّرْ اُلفت کا کال ہے سو ہے

غزل

سرور ڈنڈا

یہ رنگیں مناظر یہ دلکش نظارے — گلاشیاں لگا رئیں نا ارماں ہمارے
غریباں کی ہمت لگی رنگ لانے — اُترنے لگیں اچھے اچھوں کے پلڑے
بھری شام ہے منجے کو سو نکو تم — اِدھر پیچ رہیں گے یہ نخرے تمہارے
دکن کی دو چیزاں خزیچ نامور ہیں — بگھرا ہی بن کا و بیگن بگھارے
اِدھر میں بی غپ چپ اُدھر اُن بی غپ چپ — مگر پھر بی پلکاں پو چمکیں ستارے

حکومت ہو یا کوئی اڑیل ساٹٹو
سدا چلتئیں ڈنڈے حضت کے سہارے

اُردو کی پھگڑی پھو

مسرور [illegible]

آؤ جی بھیناں مل کو کھیلنگے ہم اُردو کی پھگڑی پھو

بھید کیا چھپ کو ہے اُردو میں بول، سہیل بول
چار حرفاں میں چھپ کو ہے نا اُردو کا سب پول

الف سے انساں ایک ہیں سارے سندر اور کریم
رے سے راز یہ ہم پو کھلیا ایک ہیں رام رحیم

دال سے دنیا ساری کرے اُردو کو تسلیم
داؤ سے وحدت اس کی ماتیں غالب اور نسیم

نگری نگری ٹھاؤں ٹھاؤں پیٹو ڈھنڈورا یہ ہر سو
آؤ جی بھیناں مل کو کھیلنگے ہم اُردو کی پھگڑی پھو

* - * - *

غزلیں

انوں لالوں کے لال ہے سو ہے
طبیعت ان کی چنڈال ہے سو ہے

ان کی وہ ہونڈی چال ہے سو ہے
جینا اپنا محال ہے سو ہے

گاڑی اپنی اُلال ہے سو ہے
دل کو اپنے ملال ہے سو ہے

چھپٹر ایسا انوں رسید کریں
اب تلک سرخ گال ہے سو ہے

مجھ کو برباد ان کے ہاتاں سے
اَب بھی ان کا خیال ہے سو ہے

اُن کی قسمت میں مرغی ہور مچھی
میری قسمت میں دال ہے سو ہے

جب بھی چاہیں گے رنگ بدلیں گے
ہم میں اِتا کمال ہے سو ہے

⁂

ہوا جب گلاں سے کری پختے چاٹیاں
جلے دیکھ کو سارے کانٹیاں لمبراٹیاں

منجے کاٹنے کو منجے گھما لنے سکو
انوں بھیج دیں پھرسے چھٹیاں چپاٹیاں

مرے گھر کے لچھن نجڑ بیچ جا رئیں
بغاوت پو تل گئیں نواسے نواسیاں

یہ ہونڈی حکومت کے ہونڈے کرم ہے
نہ دالیچ وقت پو نہ خشکہ چپاتیاں

میرے دوستاں کے خیالاں میں اب تو
اچک رئیں پھدک رئیں ہتو رئے درانتیاں

مرے غم میں انوں صبوں شام اب تو
سراں پیٹ رئیں ہور کھا رئیں کلاٹیاں

جنتا کی عرضی

سرور ڈنڈا

جنتا کی ہے یہ مرضی
وہ آندھرا کے گاما
ہم بھاگ گیے نگر والے
اب بن گئیں ڈراما
بھاگ گیے نگر میں سوتے
بے بس ہیں بے ٹھکانہ
سو بار ہم کو تولیں
ہر وقت ہم نشانہ
اب بھاگ بھی ہمارے
ایڈیو، راما، راما
بے کاری، بے روزگاری
روزگار سے لگانا
بیوپاری دھندا چھوڑیں
ٹیکسوں سے تم بچانا
تعلیم نہیں سو بچے
تعلیم فری دلانا
رشوت کی تھی یاں مستی
دفتر میں اک ہنگامہ
تقسیم جب سے بچھڑی
ہر ایک دل کو تھاما
دشمن جو تھے وہ مسٹر
نکلو یہ دوستانہ
اچھی بری گذر گئی
روتوں کو ہے ہنسانا
اک انقلاب آیا
دامن دکن کا تھاما
قسمت کے پھول کھل گئیں
آندھرا اور تلنگانہ
چنّو میاں بھی سنگم
سارے گاگا ماگا ما
پولیس کی ڈائری میں
دخل اسٹاپ نہ کاما

اگلے تمہاری مرضی
سنجیوا ریڈی ماما
طوفان جن کو پالے
سنجیوا ریڈی ماما
ہنستے ہیں نہ روتے
سنجیوا ریڈی ماما
جئے جئے ظلم کی پولیس
سنجیوا ریڈی ماما
گھبرا کے یہ پکارے
سنجیوا ریڈی ماما
یہ عام ہے بیماری
سنجیوا ریڈی ماما
دنیا سے منہ کو موڑیں
سنجیو ریڈی ماما
نکلیں گے کاں سے اچھے
سنجیوا ریڈی ماما
ہاتھوں پہ چلی دستی
سنجیوا ریڈی ماما
منّی کی ماں بھی بچھڑی
سنجیوا ریڈی ماما
اب بن گئیں منسٹر
سنجیوا ریڈی ماما
سب کی نشہ اتر گئی
سنجیوا ریڈی ماما
سو آفتاب لایا
سنجیوا ریڈی ماما
بچھڑے سو بھایاں مل گئیں
سنجیوا ریڈی ماما
خوشیاں میں گائیں سرگم
سنجیوا ریڈی ماما
ڈنڈے کی شاعری میں
سنجیوا ریڈی ماما

فضل جاوید

محمد خالد عابدی

اور

"آوازنما"

بعض صورتیں دیکھنے میں بہت معمولی نظر آتی ہیں۔ ان میں ایسی کوئی خاص بات دکھائی نہیں دیتی جو دوسروں کو اپنی
طرف متوجہ کر سکے۔ لیکن اگر کسی کو ان کے اندر جھانکنے کی بصیرت حاصل ہو تو ان کے ایسے ایسے جوہر سامنے آتے ہیں کہ حیرت
ہوتی ہے۔ محمد خالد عابدی کی شخصیت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وہ بظاہر ایک انتہائی سیدھے سادے، قناعت پسند اور معمولی
سے انسان نظر آتے ہیں۔ اگر چپ سادھ لیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بولنا آتا ہی نہیں اور اگر بولنے پہ آجائیں تو
لگتا ہے یہ چپ نہیں ہو سکتے۔ میرے خیال میں وہ جتنا زیادہ بول سکیں اتنا ہی اچھا ہے بلکہ خوب زور و شور سے
بولیں تاکہ ان کی پراسرار شخصیت پر سے پردے اٹھتے جائیں۔ نوجوان ہیں، جوش اور ولولہ ہے۔ قلم میں روانی ہے
اور منہ میں زبان بھی ——— شرط یہ ہے کہ کوئی انہیں بولنے پر آمادہ کرے۔ وہ اپنے آپ شروع ہونے والوں میں سے نہیں۔

خالد عابدی کے عزائم بہت بلند ہیں۔ وہ اگر کسی کام کا بیڑا اٹھائیں تو قلم دوات لے کر اس کے
پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ ادب کی بہت سی اصناف پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ لکھنے لکھانے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ چکا
ہے۔ آوازنما۔ روبرو۔ اعمال نامہ (طنز و مزاح نگاروں سے انٹرویو) پیکر آواز۔ اور باغ فکر معروف بہ "قطعات نساخ"
یہ سب تصانیف اسی جنون کا نتیجہ ہیں۔ کچھ اشاعت پذیر ہو چکے ہیں، کچھ ان مرحلوں سے نہیں گزرے۔ انہیں کتابیں
خریدنے اور جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ سنا ہے دیمک کے چاٹنے سے پہلے ہی یہ کتابوں کو چاٹ جاتے ہیں۔ مطالعہ
کا شوق گھٹی میں پڑا ہے۔ خالد عابدی بھوپال کے ایک ترقی پسند خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس خاندان کے افراد
نے درس و تدریس کے فروغ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ کچھ نامساعد حالات تھے جو خالد عابدی کی تعلیم کا

ہو ڈالی گئے۔ تاریخی تعلیم کے بعد ایک عرصہ تک وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی انھیں ایک ایسی ملازمت قبول کرنی پڑی جو ان کی فطرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ لیکن غم روزگار کے انتہائی پریشان کن لمحات میں بھی وہ اپنے مطالعے کے شوق کو دبا نہ سکے نتیجہ میں ڈگریوں کی دوڑ میں آگے نکلتے چلے گئے ہیں۔ اگر کسی اردو کے طالب علم سے ملاقات ہو تو اس سے اس کی تکالیف پوچھنا، جو کتابیں بازاروں میں دستیاب نہ ہوں انھیں اپنے گھر سے لا کر دینا اور پھر اعزازی طور پر اسے پڑھانا یہ سب ان کے محبوب مشاغل میں داخل ہے۔ مستعار لے کر کتابیں پڑھنے سے وہ گریز کرتے ہیں۔ اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر وہ کتابیں خرید لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے مختصر سے مکان میں کم یاب اور نایاب کتابوں کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ موجود ہے۔ ریسرچ کے طالب علم لائبریریوں سے مایوس ہو کر خالد عابدی کی اپنی لائبریری سے استفادہ کرتے ہیں۔ لکھنے کا شوق مطالعہ کے شوق سے کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ ہر صنف ادب پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ فلمی معلومات بے پناہ ہیں۔ کسی رسالہ میں کوئی غلط خبر شائع ہوتی ہے تو ان کا قلم فوراً احتجاج کرنے لگتا ہے۔ اگر کوئی اپنی غلط معلومات کو سچ جتانے پر تل جائے تو یہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ مزاح کی طرف طبیعت زیادہ مائل ہے۔ لیکن مزاح کے ساتھ طنز کو خوب صورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ کسی سے ناراض ہو جائیں تو اس کے خوب پرزے بھی اڑاتے ہیں۔ شاید آگے چل کر ان کی اس منتقمانہ عادت کو اعتدال آجائے۔

خالد عابدی ریڈیو کے لیے لکھتے رہتے ہیں۔ ریڈیو سے نشر کیے گئے اپنے آٹھ ڈرامے "آواز نما" کے نام سے شائع کر چکے ہیں اور حسن اتفاق سمجھیے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد انہیں اب ریڈیو کے محکمہ میں ملازمت مل گئی ہے۔ جواں سال خالد عابدی جو ادیب ہے طنز و مزاح نگار رہے ریڈیو ڈرامہ نگار رہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ آنے والا وقت ان کی شخصیت پر سے تہیں ہٹاتا جائے گا اور ہر تہہ کے نیچے سے خالد عابدی کا نیا نکھرا ہوا روپ سامنے آتا جائے گا۔

"آواز نما" یوں تو صرف ان کے آٹھ ہلکے پھلکے مزاحیہ ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ہے جنھیں آل انڈیا ریڈیو بھوپال نے پروڈیوس کیا۔ بھوپال کے علاوہ یہ دوسرے اسٹیشنوں اور ہوا محل سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔ لیکن اس کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے والا وہ پیش لفظ ہے جسے ڈاکٹر اخلاق اثر نے قلمبند کیا ہے۔ یہ پیش لفظ ڈاکٹر موصوف کا ایک مبسوط مضمون ہے۔ ڈرامے کے فن اس کی تکنیک اور اس کی تاریخ پر اپنا معلوماتی اور پر مغز مقالہ پڑھنے کے بعد قاری ان آٹھ ڈراموں کو انتہائی دل چسپی سے پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ جناب ابراہیم یوسف نے جن کی اردو ڈراموں پر اتنی گہری نظر ہے کہ مصنف کی بال برابر فروگذاشت بھی ان سے چھپ نہیں سکتی۔ مصنف کا تعارف لکھا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ریڈیو ڈراموں کی تکنیک اسٹیج کے ڈراموں سے مختلف ہوتی ہے۔ ریڈیو ڈرامہ کو پڑھنے سے پہلے ریڈیو پر سن لیا جائے تو دوران مطالعہ اس کے صوتی اثرات، مکالموں کا انداز اور پس منظر موسیقی کی بازگشت ایک دل چسپ تاثر چھوڑتی جاتی ہے۔ خالد عابدی کے ڈراموں کی یہ خوبی ہے کہ بعض ڈرامے اگر اسی طرح اسٹیج کر دیئے جائیں تو یہ اسٹیج کے ڈراموں کے جملہ تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ قاری انھیں پڑھتے ہوئے کرداروں میں کھو جاتا ہے۔ یہی مصنف کا کمال ہے۔ موضوعات ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود مکالمے چست اور برجستہ ہیں۔ کہیں کہیں مکالمے طویل بھی ہو گئے ہیں لیکن اپنا تاثر قائم رکھنے میں کامیاب ہیں۔ چونکہ یہ ڈرامے خاص طور سے ریڈیو کے لیے لکھے گئے ہیں اور پندرہ منٹ میں سامعین کو ہنسانا اور ان کی تفریح کا سامان مہیا کرنا

ان ڈراموں کا مقصد ہوتا ہے اس لیے ان میں تفریح طبع کے علاوہ کسی خاص مقصد کو ڈھونڈھنا بے سود ہے۔ کہیں کہیں زبان و بیان کی خامیاں نظر آجاتی ہیں لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ کاتب صاحب کو اچھلتے بھلے مکالموں میں کہیں کہیں "تصحیح" کا موڈ آگیا ہو۔ یوں تو اس کتاب کا ہر ڈرامہ تفریحی ہے لیکن ڈرامہ نگار نے خوب صورت مکالموں کے ذریعہ ہنستے ہنستے کبھی کبھی دکھتی رگوں پر بھی ہاتھ رکھا ہے۔ کبھی خود کو نشانہ بنایا ہے تو کبھی سماج کو آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ گرانی کا ذکر "محلوں کے خواب" میں اس طرح کرتے ہیں۔ ایک قصیدہ گو شاعر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی شان میں قصیدہ پڑھتا ہے۔ نواب صاحب اس سے کہتے ہیں۔

نواب صاحب : (طنزاً) لیکن شاعر اعظم تمہارے مصرعے بحر میں نہیں ہیں۔

شاعر : لیکن حضور! بندہ تو قہر میں ہے حضور! اس مہنگائی نے سب کے وزن بگاڑ رکھے ہیں۔

"آوازنما" کے ڈراموں میں "دوسرا جنم" کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے وہ اس لئے نہیں کہ یہ ریڈیو ڈرامہ کا شاہکار ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اس میں مصنف کی زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ دل چسپ مکالموں کے ذریعہ وہ مرزا کے کردار میں سامعین اور قارئین کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اپنی شخصیت کا کچھ حصہ انھوں نے اس ڈرامہ میں رکھ دیا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو

مرزا : میاں شادی سے پہلے بالکل ایسی ہی یادداشت تھی میری (لہجہ میں تاسف) لیکن میاں جب سے شادی ہوئی ہے یادداشت بہت کمزور ہوگئی ہے۔ بعض اوقات تو میں اپنا نام بھول جاتا ہوں۔ اور پھر یہ تمہاری بھابی بیگم بھی کچھ کم نہیں۔ دن بھر محلے میں میری کتابیں تقسیم کرتی رہتی ہیں۔ میری کتابیں نہ ہوئیں خدا بخش لائبریری ہوگئی۔

شاداب : یہ تم نے اپنے چاروں طرف کیا سامان پھیلا رکھا ہے؟

بیگم : ارے "یہی" ہیں۔ نہ جانے کہاں کہاں کی کتابیں، اخبار، رسالے جمع کر رکھے ہیں۔ دیمک لگ رہی ہے مگر مجال ہے انہیں ردی میں بیچ دیں۔

شاداب : ارے وہ نہیں تو تم اٹھا کر ردی میں بیچ دو۔

بیگم : (ڈرتے ہوئے) اللہ میری توبہ۔ وہ غصے میں آکر میرا زیور بیچ دیں گے۔ اری شاداب! یہ کتابیں تو ان کی جان ہیں۔ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ ڈھنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ تمام تنخواہ ان کتابوں میں ہی خرچ کر دیتے ہیں۔ اور اگر میں کچھ کہوں تو کہتے ہیں "میں کتابوں کے لیے ہی زندہ ہوں" جبکہ گھر میں کتابیں رکھنے کو جگہ نہیں ہے۔ (لہجہ میں تبدیلی) دیکھو تو اس مردوئے کی باتیں ـــــــ"

خالد عابدی کو کردار کی مناسبت سے زبان کے استعمال کا سلیقہ خوب آتا ہے۔ مندرجہ بالا مثال میں مردوئے سے زیادہ فصیح لفظ آدمی ہو سکتا تھا۔ لیکن چونکہ مکالمہ عورت نے ادا کیا ہے اس لیے آدمی سے زیادہ مردوئے اس کی زبان سے کچھ فطری معلوم ہوتا ہے۔ یوں تو "آوازنما" میں بہت سے ایسے مکالمے ہیں جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں لیکن ایک مختصر مضمون میں اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ ریڈیو ڈراموں کا یہ مجموعہ ایک اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے ڈرامانگاروں کیلیے ایک پیغام بھی ہے جن کے ڈرامے ریڈیو پر نشر ہونے کے بعد آواز ہی کی دنیا میں غائب ہو جاتے ہیں۔ اگر انہیں اسی طرح دستاویزی حیثیت حاصل ہو جائے تو سامعین کے ساتھ ساتھ قارئین سے بھی ان کا رشتہ جڑ سکتا ہے۔ آخر میں "آوازنما" کے قارئین کو ڈاکٹر اخلاق اثر کا یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ "ریڈیو ڈرامہ نگار کا یہ نقش اولیں بڑی ہمدردی سے مطالعہ کا مطالبہ کرتا ہے۔"

عمر حنیف (دھانڈروا)

نشتر

"ٹرینیں اب بھی لیٹ چل رہی ہیں۔"
— شاید ٹرینوں کے کانوں تک یہ خبر نہیں پہنچی کہ اب ان کے نئے منسٹر کیدار پانڈے ہیں۔

"میں جہاں جہاں بھی جاتا ہوں لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ آپ اس بڑھتی ہوئی مہنگائی کیلئے کیا کر رہے ہیں۔" شری راج نارائن
— کبھی داڑھی بڑھانا، کبھی داڑھی کٹوا دینا۔ کیا مہنگائی کے لئے اتنا کرنا کافی نہیں۔

"فتح گڑھ ریلوے اسٹیشن پر چار پولیس کے جوانوں نے ایک بیس سالہ لڑکی کے ساتھ زنا بالجبر کیا۔"
— کیا اب بھی حکومت ان کی تنخواہ میں اضافہ نہیں کرے گی۔

"پاکستان میں انتخابات کا وقت ابھی نہیں آیا۔" صدر ضیاء الحق۔
— اور نہ کبھی آئے گا۔

"ہم آپ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لے سکتے۔" اقلیتی کمیشن کے چیئرمن سے مراد آباد کی انتظامیہ کمیٹی کی درخواست
— اگر ذمہ داری لے لی تو لوٹ مار کون کرے گا۔

"ساتوں عدالت سنجے گاندھی کی سمادھی کا نام و نشان مٹا دیگا۔"
— یہ ڈرامے کا پہلا ایکٹ ہے۔ پتہ نہیں ابھی اور کتنے ایکٹ باقی ہیں۔

"شری مرارجی ڈیسائی کو ڈی۔ لٹ کی (آنریری) ڈگری سے نوازا جائے گا۔" گجرات یونیورسٹی کے منتظمین کا ایک اعلان۔
— جو لوگ چوری چوری گھر میں پیشاب پی رہے ہیں۔ وہ بھی کھل کر سامنے آجائیں گے۔ ایک ایک کر کے سب کا نمبر لگے گا۔

"کسان اندولن کی کامیابی کے لئے کالجوں کو بند رکھا جائے۔" جارج فرنانڈیس کی کالج کے طلباء سے اپیل۔
— ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔

"دیانتداری میں ہم سے کوئی بازی نہیں لے جا سکتا۔"
— ہم آنکھیں پھوڑنے والوں کو بھی تنخواہ دیتے ہیں۔

"آندھرا پردیش کی منسٹری میں اب ۶۰ منسٹر۔"
— جنتا "علی بابا اور چالیس چور" کے بعد فلم "علی بابا اور ساٹھ چور" کا انتظار کرے۔

"میں نے اپنی سیاسی زندگی میں سب سے بڑی دو غلطیاں کیں۔" شری ایچ۔ این۔ بہوگنا
— ایک تو آئی کانگریس جوائن نہیں کرنی چاہیئے تھی اور جب کر لی تو اپنا استعفیٰ نہیں پیش کرنا چاہیئے تھا۔

"کملا پتی ترپاٹھی کا استعفیٰ قبول۔"
— ایک اور کٹی پتنگ، جو دو سال تک فضا ہی میں بھٹکتی رہے گی۔

خرافات

(مراسلے)

■ میں نے ایک ایک کر کے زندہ دلان حیدرآباد
ہی دوستوں کو خط لکھے۔ مگر کسی ایک کا بھی جواب نہ ملنے پر میں
محسوس کیا کہ آپ لوگ باجماعت مجھ سے ناراض ہیں مگر ساتھ
ساتھ یہ بات محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ دورِ حاضر میں اگر ملت
کہیں ایسا اتحاد اور اتفاق ہے تو وہ صرف آپ کے یہاں ملتا ہے
آپ کی اس ایکتا پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں ورنہ آج
ری دنیا میں جگہ جگہ ۔ ؎
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
خدا کرے آپ سب دوست بخیریت ہوں۔

بلال سیوہاروی

■ ستمبر ۱۹۸۰ء کا شگوفہ پہلی بار نظر سے گزرا۔ آپ کا
فنی کمال ہے جو ان ناگفتہ حالات اور گرانی کے عالم میں شگوفہ کا
قدر معیار قائم رکھے ہیں۔ طنز و مزاح میں ابھی تک کوئی پرچہ
ری نظر سے نہیں گزرا۔ آپ کا یہ اقدام اولین کہوں تو شاید
بانہ ہوگا۔ رضا نقوی واہی کا بلڈیار بہت خوب ہے۔ مضامین
ں تو سبھی پسند آئے۔ منظومات میں نزاکت فیضی کی لن ترانیاں
رے حلقۂ احباب میں بہت پسند کی گئیں۔ ہنستے ہنستے پیٹ میں
رد ہونے لگا ہے۔ جس کا ہرجانہ آپ کو یا فیضی صاحب کو ادا کرنا
دگا۔ اشرف مالوی اور رشید عارف بھی خوب ہیں۔ خدا کرے
ہر اردو داں کے ہاتھ میں ایک عدد "شگوفہ" نظر آئے۔
درمیان میں جناب کے لطائف کا تو جواب نہیں۔ مبارکباد قبول
رمائیے۔ خدا کرے شگوفہ کی اور ترقی ہو۔

مشیر الدین خان ۔ اکولہ

معروف اور المعروف مصطفیٰ کمال!
غفور صاحب دہلی آئے، ہم دونوں کی
ملاقات کی خواہش کے باوجود نہیں مل سکے۔
سُنا ہے تم کپور صاحب کا ایک ریکارڈ
توڑ نمبر نکال رہے ہو۔ میں بھی چاہتا ہوں، نکالو اور
ایسا کہ اس کے بعد نمبر نکالنے کی کسی کو بھی ہمت
نہ پڑ سے۔
اور کیا لکھوں؟ نہیں لکھتا۔ تم چونکہ
مختصر خط لکھتے ہو۔ اس لئے انتقاماً میں بھی مختصر ترین
خط لکھا کروں گا۔

فکر تونسوی

■ اکتوبر کے شگوفہ میں ویسے تو تقریباً سب
مضامین قابلِ تعریف ہیں۔ مگر محمد طارق صاحب کھولاپوری نے
"لیڈر اور جنتا" لکھ کر اپنے سماج کی اچھی عکاسی کی ہے۔ اس
علاوہ ہزل گو شاعروں نے بھی کافی دھوم مچا رکھی ہے۔ جن میں
فیض الرحمٰن فیض کی "جگ خالہ" اور یوسف یکتا خوب ہیں۔
ستمبر کے شمارے میں مچھر پر یلغار نظر آئی۔ ہمارے صفدر
صاحب کو کیا سوجھی کہ مچھروں کی مدافعت ہی کر بیٹھے۔ اس کے
علاوہ اگست کے شگوفہ میں جناب محمد وحید اللہ نے بھی مچھر ہی کو
اپنا تختۂ مشق بنایا۔ ایسا لگتا ہے کہ ہماری قوم مچھروں سے
پریشان ہے۔ آپ نے دوسری زبانوں کے ترجمے شائع کر کے
واقعی ایک قابلِ تعریف قدم اُٹھایا اس کے لئے آپ مبارکباد
کے مستحق ہیں۔

عبداللہ خان ۔ امراؤتی

■ کنہیا لال کپور کے خاص نمبر کا خاص انتظار ہے واقعی
جنگ و جدل کی ماری اس دنیا میں شگوفہ برابر اپنا مثبت رول ادا کر رہا
ہے اور سوکھے ہوئے ہونٹوں کو مسکراہٹیں دے رہا ہے اس کا یہ کارنامہ
اردو ادب اور حلقۂ انسانیت میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

رؤف خوشتر ۔ گلبرگہ

(اداریہ)

...پھر ملیں گے اگر خدا لایا

۸ر دسمبر کو سرور ڈنڈا میموریل سوسائٹی کے زیر اہتمام حیدرآباد میں شاندار پیمانے پر یادِ سرور ڈنڈا کی تقاریب منائی گئیں۔ ڈاکٹر عالم خوندمیری کی صدارت میں منعقدہ صبح کے اجلاس کا افتتاح بیرسٹر اکبر علی خاں نے کیا۔ ڈنڈا کی شاعری اور شخصیت کا عاتق شاہ، احسن علی مرزا، ڈاکٹر رشید موسوی متین سروش، برق یوسفی اور ابوالفیض سحر نے اپنے مضامین میں جائزہ لیا۔ مہمان خصوصی جناب خواجہ عبدالغفور نے اپنی تقریر میں "شگوفہ" کا "سرور ڈنڈا نمبر" شائع کرنے کی تجویز رکھی۔ (چنانچہ فوری طور پر زیر نظر شمارہ میں ڈنڈا مرحوم کا منتخب کلام اور ان پر مضامین شامل کئے گئے ہیں۔ کسی موقع پر ڈنڈا نمبر بھی شائع کیا جائے گا۔) محترم غفور صاحب نے ڈنڈا کے کلام کی عدم اشاعت کی طرف بھی توجہ دلائی۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عالم خوندمیری نے اپنی عالمانہ تقریر میں "دکنی زبان" کو مزاح بنانے کے رجحان پر تنقید کی۔ اور کہا کہ اس زبان کو برتنے میں بھی احتیاط کی ضرورت ہے۔ ہم عالم صاحب کے اس نقطۂ نظر سے صد فی صد اتفاق رکھتے ہیں کہ ہمارے جدید دکنی شاعر عام طور پر دکنی زبان کے برتنے میں بے اعتدالیوں کا شکار ہیں۔ اکثر مزاحیہ شاعر خواہ مخواہ مزاح پیدا کرنے کے لئے لفظوں کو "دکنیا لیتے" ہیں۔ اچھے بھلے شستہ زبان میں شعر کہنے والے شعراء بھی غیر ضروری طور پر دکنی الفاظ استعمال کر جاتے ہیں۔ دکنی میں شعر کہنا ہے تو سارا کلام اسی مزاج کا غماز ہونا چاہیئے۔ موجودہ شعراء میں حمایت اللہ اور اشرف خوندمیری، اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ ورنہ دوسرے شاعروں کے کلام میں زبان کے معاملے میں یکسانیت نہیں ملتی۔ آدھا تیتر آدھا بٹیر والی شاعری نے دکنی کو رسوا کر رکھا ہے — ہم عالم خوندمیری صاحب کے اس خیال سے اتفاق نہیں رکھتے کہ دکنی کو مزاح کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ فکشن اور سنجیدہ شاعری کے لئے بھی دکنی زبان موزوں ہوسکتی ہے۔ لیکن مزاح نگار شاعر کو اس ضمن میں پابند نہیں کیا جاسکتا۔

ڈنڈا کے کلام کی اشاعت کے سلسلہ میں بھی غیر ضروری اُلجھنیں پیدا ہوئیں۔ دراصل اسکی عدم اشاعت کا سبب خود مرحوم کے افراد خاندان ہیں۔ جنھوں نے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے خواہشمندوں سے کبھی تعاون نہیں کیا۔ بہرحال ماضی کو بھول کر اب یہ توقع کرنی چاہیئے کہ ڈنڈا مرحوم کا کلام ان کے بچوں کی مدد سے بہت جلد اشاعت پذیر ہوگا۔

'شگوفہ' کا ہر سال جنوری کے مہینہ میں 'سالنامہ' شائع ہوتا ہے۔ لیکن اس بار اس روایت پر عمل نہیں ہوسکا۔ اس کے بجائے بدل کے طور پر کنہیا لال کپور نمبر شائع ہوگا۔

▲ ▲

S H U G O O F A

31 Bachelor Quarters, M.J. Market Hyderabad-1 Dec. 1980 Phone